

چون و سار و صاب

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دِلِّی کَا عِلْمِی دِیْنِی کَا هِنَا

بُرْکَاکُ

مَرَاتِبُ
سَعْدِیَا حَمْدِ کِسْکِ رَا بَادِی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اُس کے معانی و مطالب کے محل کرنے اور کچھ کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائقِ مطالعہ ہیں۔ لغاتِ قرآن کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی آہستگی سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لا جواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	پانچ روپے	چھ روپے	
جلد سوم	۳۳۶	پانچ روپے	چھ روپے	
جلد چہارم	۳۸۶	چھ روپے	سات روپے	
جلد پنجم	۵۰۰	آٹھ روپے	نور روپے	
جلد ششم	۳۲۴	پانچ روپے	چھ روپے	

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۶۸ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق جنوری ۱۹۶۴ء شمارہ - ۱

فہرست مضامین

- ۱۔ نطرات سعید احمد اکبر آبادی
- ۲۔ جمال الدین الاسنوی اور جناب ڈاکٹر عبد العظیم خان صاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی۔ (علیگ)
- ۱۱۔ اوکی طبقات الشافعیہ لکچر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
- ۳۔ حمادین جناب محمد نعیم صاحب صدیقی ندوی ایم۔ اے
- ۲۷۔ رفیق دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ
- ۴۔ معظم کی شنوئیاں "گلزارِ حِشّت" جناب مولانا ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب
- ۵۲۔ تصحیح و تقویم حیدر آباد دکن
- ۵۔ چند روز جاپان میں سعید احمد اکبر آبادی
- ۶۵۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منظرات بنگلہ دیش

جنوب ایشیا میں بنگلہ دیش کے نام سے ایک اور آزاد مملکت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ امر فی نفسہ مسرور کن اور خوشی کا باعث ہے۔ یوں تو رباب بصیرت کو تقسیم کے وقت ہی محسوس ہو گیا تھا کہ مشرقی پاکستان ایک نہ ایک دن مستقل آزاد مملکت بن کر رہے گا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ”ہندوستان آزاد ہوتا ہے“ میں اس کی طرف بہت واضح اشارہ کیا بھی ہے۔ لیکن یہ جو کچھ جس ڈرامائی انداز میں اور جن احوال و حوادث کے طوے پہلے وہ حد درجہ افسوسناک بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی اودہ لوگ جو مقصد ہمداری کے لیے یا اپنی شدید جذباتیت کے زریعہ اسلام کا نام بڑی بلند بانگی سے لیتے ہیں لیکن نہ ان کا فائدہ صحیح ہے اور نہ عمل درست۔ ان کے لیے یہ واقعات قدرت کی طرف سے سخت تازیانہ عبرت اور سید سبق آموز ہیں۔ اگر یہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کے بعد بھی ان لوگوں کو سوچنے سمجھنے اور اپنے انکار و خیالات پر نظر ثانی کرنے کی توفیق عطا نہیں ہوتی تو سمجھ لینا چاہیے کہ قدرت کا دست انتقام ان کی طرف دراز ہو چکا ہے اور جہنگ وہ اپنا کام پورا نہیں کر لیا واپس نہیں ہو گا!!

آئندہ نسلیں تاریخ میں اس بات کو بڑی حیرت و متعجب سے پڑھیں گی کہ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک ایسی قوم بھی تھی جس نے ملک میں جمہوریت قائم کرنے کی غرض سے عام انتخابات بڑے جوش و خروش اور جذبہ و ولولہ کے ساتھ کرائے لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریت تو کیا قائم ہوئی ملک خون اور آگ کے سمندر میں غرق ہو گیا اور آخر اس کا ایک ٹرا اور اہم بازو کٹ کر اس سے جدا ہو گیا۔ اس واقعہ کے اسباب و وجوہ کا جب سراغ لیا گیا تو آئندہ نسلوں کو ادنیٰ حیرت ہو گی اور بجز اسکے ان کے لیے کوئی اور چارہ کار نہ ہو گا کہ وہ اس ملک کے ارباب حکومت و اقتدار کی عقل و غرور اور ان کی امانت و دیانت کا ماتم کریں۔ اور ان کا نام ان مجرموں کی فہرست میں لکھ دیں جو خلافتِ ہندو و اسپین کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنے تھے۔

پاکستان اسلام کے نام پر عالم وجود میں آیا تھا لیکن گزشتہ چوبیس برس میں اسلام پاکستان کی سیاست اور وہاں کے طریقہ زندگی میں کس درجہ دخل رہا ہے؟ اس کی تفصیلات حدودِ جبرِ تکلیف وہ ہیں ماسوائے ان کو قطع نظر صرف یہ دیکھیے کہ ایک عالم اصولی سیاست اور عملی نہ جذبہ خدمتِ ملک و قوم کے ماتحت ہونا کیا چاہیے تھا اور ہوا کیا؟

پاکستان کے اربابِ اقتدار و سیاست کو پہلے ہی دن یہ محسوس کر لینا چاہیے تھا کہ پاکستان کا وجود ایک عوامی جدوجہد اور ان کی قربانیوں کا نتیجہ ہے وہ نہ کسی خاندان اور نہ کسی ایک طبقہ کی میراث ہے اور نہ کسی کا ترکہ۔ اسی بنا پر ملک کے لیے جمہوری نظامِ حکومت سے بہتر کوئی دوسرا نظام نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ ایک نظام ہے جس کے ماتحت عوام کو اپنی آزادی کا یقین ہو سکتا ہے۔ ان میں خود اعتمادی کا جذبہ ابھرنا اور ملک کے مسائل اور اسکے نیک و بد سمجھنے کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے۔ اس نظام کے ماتحت عوام اپنے جذبات، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو اور ساتھ ہی اپنے دکھ درد اور اپنے مشکلات و مصائب کو علانیہ بیان کرتے اور اپنی شکایات کو رفع کرنے کے لیے ان کا آئینی حل تلاش کرتے ہیں۔ اس طریقہ کار کے دو نتیجے بالکل واضح اور کھلے ہوئے ہیں۔

(۱) ملک کے جس طبقہ کو بھی حکومت سے شکایات ہوتی ہیں پورا ملک اور حکومت دونوں ان سے باخبر رہتے ہیں اور دونوں پر حسبِ ضرورت و موقع ان کا ردِ عمل ہوتا رہتا ہے۔

(۲) جس طبقہ کو شکایات ہوتی ہیں چونکہ اس کو بر ملا اپنی شکایات کے اظہار اور ان کے ازالہ کے لیے جدوجہد کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ایک طرف تو اس طبقہ کے دل کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے اور شکایات کا مادہ فاسدِ تحلیل ہوتا رہتا ہے اور دوسری جانب خود اعتمادی اور ملک کی وحدت و سالمیت پر یقین رکھنے کے باعث ان کا قدم ہمیشہ جدوجہد کے حدود سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے جس سے ملک ہی کے ٹکڑے ہو جائیں۔

جمہوریت متعلق یہ وہ حقائق ہیں جنہیں سیاسیات کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ پاکستان کے اربابِ سیاست براگھتی سفاہت پرستی اور غرضی کا غلبہ نہ ہوتا تو ان کو نظر آتا کہ تامل ناڈو اور اس میں ڈی ایم کے لیے

..... برسرِ اقتدار آئیے بعد یہ صوفِ ہندوستان کا
 جمہوری نظام تھا جس کے باعث ہندوستان سے مدراس الگ نہیں ہوا اور وہاں (مشرقی بنگال کی طرح) ہوا
 اور کچھ کے نام پر مرکز کے خلاف سخت ناراضگی اور بغاوت کا جو طوفان اٹھا تھا مدراس کے ساحل سے ٹکرا کر
 وہیں ختم ہو گیا حال مدراس کا ہوا۔ ناکالینڈ تیلنگانہ۔ پنجاب اور کشمیر کا بھی وہی ہوا۔ مرکز سے بغاوت اور
 اس کی مخالفت کا ایک طوفانی دور تھا جو آیا اور گزر گیا اور یہ کوئی شہ نہیں کہ یہ محض جمہوریت ہے جس کے باعث
 یہ سب کچھ ممکن ہو سکا اور یہی جمہوریت ہے جس کے باعث آج ہندوستان اس درجہ متحدہ، مستحکم اور مضبوط
 ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ علاوہ انہیں مغربی پاکستان کے اربابِ سیاست کو سمجھنا چاہئے تھا کہ
 (سابقہ مشرقی پاکستان الگ سے ایک ہزار میل سے زیادہ دور تھا ہوا ہے ان میں اور مغربی پاکستان کے لوگوں
 ممالک مذہبی رشتہ جس کی نسبت واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ سب سے کمزور اور ناقابلِ اعتبار رشتہ
 تھا) اس کے علاوہ کوئی اور اثر شک نہیں ہے۔ اور اگرچہ پاکستان کی معاشیات میں سب سے زیادہ حصہ
 مشرقی پاکستان کا ہے لیکن غور یہ لوگ پس ماندہ ہیں۔ اس بنا پر خاص مشرقی پاکستان کے ساتھ معاملہ محبت و
 چھانگت، عدل و انصاف اور دلجوئی کا ہو نا چاہئے تھا لیکن ایسا بالکل نہیں ہوا۔ پاکستان کیا باہر کے
 بھاگوں چھینکا تو اربابِ حرص و آرزو مفاد پرستوں کی بن آئی۔ شخصِ جلب زر اور عیش و عشرت
 کے سامانوں کو زیادہ سے زیادہ فراہم کرنے کی فکر میں غرق ہو گیا۔ حد یہ ہے جن علماء کی زندگی مداحوں
 میں پوری نشینی کئے گدڑی تھی۔ کراچی اور لاہور نے ان کو بھی عالی شان کوٹھیلوں، موٹر اور وسیع کاروبار
 کا مالک بنایا۔ اس افراتفری میں انھوں نے ان تمام اصولوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو ایک نوزائیدہ قوم
 کی تعمیر و تربیت کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا کہ مغربی
 پاکستان کا بننا واپس ماضی کے ساتھ نہایت حقیر و تذلیل اور بے اعتنائی و بے توجہی کا رہا۔ مغربی
 پاکستان کے لوگ جن میں اکثریت ہمارے برادرانِ پنجاب کی تھی وہ ٹوٹا ہوا، کھلنا اور چٹا کا گھ
 وغیرہ پہنچ کر دیکھتے دیکھتے امیرِ کبیر بن گئے۔ اور خود مقامی باشندے غریب کے غریب

رہاں اور کلچر میں اس وجہ توجہ جغرافیائی اعتبار سے اس قدر طویل فاصلہ اور پھر ملک میں نہایت غیر متوازن اور غیر معتدل معیشت اور معاشرت یہ سب چیزیں مادہ خالص بن کر شقی پاکستان کے دل و دماغ میں بکھری رہیں اور ایوب خاں کی ڈکٹیٹر شپ کے پتھر کے نیچے دب کر اس مادہ کو گرم ہو کر پختہ تر ہونے کا اور بھی موقع ملا۔

یہ ایک منظر تھا۔ اب دوسرا منظر ملاحظہ فرمائیے جس نے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کی کشتی کے تاجدار کو مار کر کیڑ میں ہی مایہ تھے ہی۔ سمجھ بوجھ اور فہم و فراست میں بھی کورے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۳ء میں خدا کے پاکستان میں عام انتخابات ہوئے جن میں عوامی لیگ نے مرکز اور صوبہ دونوں میں نہایت عظیم اکثریت سے کامیاب ہوئی اور اب دستور آئین کے مطابق مسند وزارت و حکومت اس کے ہی سپرد ہو نا چاہیے تھا لیکن اس پارٹی نے انتخاب جس شخص کی نامی منشور کی بنیاد پر لڑا تھا اس نے بنا بنایا سارا کھیل گماڑ دیا۔ سوالیہ یہ ہے کہ منشور پاکستان کی سالمیت کے منافی تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو صدر پاکستان کو انتخابات شروع ہونے سے پہلے ہی اسے نا منظور اور رد کر دینا چاہیے تھا اور اگر مشرف نے انکار علی بھٹو اور ان کی پارٹی کو اس پر اعتراض تھا تو ان کو اس کا اظہار اسی وقت کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر منشور پاکستان کی سالمیت کی نفی نہیں کرتا تھا — اور واقعہ بھی یہی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو متحدہ پاکستان کے لیے اس کے منشور ہونے کے کوئی معنی نہیں تھے — تو پھر ایکشن کے نتائج کے سامنے آ جانے کے بعد محض ایک شخص (مشر بھٹو) کی ضد پیشینگی اسٹیبل کے انعقاد کی تا دینحس مقرر کر کے ان کا التوا کرتے رہنا سیاسی بے بصیرتی اور جمہوریت کا گھلا گھونٹ دینا نہیں تھا اور کیا ہے؟ جمہوریت کے تو معنی یہ ہیں کہ جب انتخابات ختم ہو گئے تو اب قانون سازی کے اختیارات سب کے سب عوام کے نامزدہ حضرات کے ہاتھوں میں بیچ گئے اور اب اس سلسلہ کا جو فیصلہ بھی ہو گا وہ مجلس قانون ساز کے ایمان میں ہو گا۔ اس بنا پر اس مجلس کو بالکل نظر انداز کر کے بالاپیلا حکومت کا کسی پارٹی کے لیڈر سے کوئی سمجھوتہ کر لینا اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو مجلس سے انحصار کو منسوخ کرنا ایک ایسا فعل ہے جس کے لیے کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ ایک عرصہ دراز کی گھٹن اور جمہوریت کی خرابی

کے بعد عوام آزادی کے ساتھ اپنا ایک فیصلہ دے چکے تھے اور اس لیے اب وہ ہرگز اس پر رضامند نہیں ہو سکتے تھے کہ جمہوریت کی راہ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جس منزل کی طرف ان کے قدم اٹھ چکے ہیں وہ پھر واپس جوں اس بنا پر اس صورت حال کا نتیجہ فکٹیشنل شپ اور عوام میں شدید کشمکش کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا فکٹیشنل شپ کو اپنی فوجی طاقت پر گھمنڈ تھا اور عوام کو اپنی تنظیم و وحدت خیال اور جذبہ اشتراک و جفا کشی پر اعتماد اور بھروسہ! چنانچہ جب اس کشمکش کا ظہور عمل پذیر ہوا تو دنیا نے وہ سب کچھ دیکھا جو تاریخ ہم کو ہم ہی نظر آیا ہو گا کسی نے اپنی جیبی کرنے میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی مگر کھول گھر بے چراغ ہو گئے آبادیاں راگھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ آگ اور خون کا ایک سمندر تھا جس کی موجوں نے ہر کوئی اور کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اب تک معاملہ جو کچھ بھی تھا وہ بنگلہ دیش اور حکومت پاکستان کا تھا لیکن اس عظیم قتل و قتل کے نتیجہ میں جب لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزین ہندوستان میں آئے لگے اور ادھر بنگلہ دیش کے عوام نے اپنے ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنایا تو اب یہ مسئلہ خود ہندوستان کا ہی مسئلہ بن گیا۔ پاکستان کے ارباب سیاست کے لیے اب بھی موقع تھا کہ وہ خدا اور بٹ کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات و واقعات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے اور اس صورت حال کا حل تلاش کرتے لیکن نہایت افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ وہ اپنی خدا اور بٹ پر اٹسے رہے اور ادھر عوام اجتماعی مقابلہ سے عاجز ہو گئے تو انھوں نے گویا جنگ شروع کر دی۔ ہمارا پختہ خیال ہے کہ موجودہ صدر پاکستان مسٹر یحیٰ عارف جس کمزور فیڈریشن پر رضامندی کا اظہار کر رہے ہیں اگر وہ پہلے ہی اس فیڈریشن پر رضامند ہو جاتے تو آج ان کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ بہر حال لاکھوں پناہ گزینوں کی آمد سے جب ہندوستان کا اقتصادی ڈھانچہ زیر و بر ہو گیا اور اس نے اس کے اندر اس کے اسباب و وجوہ کے خلاف احتجاج کر کے پاکستان سے اس کے حل کا مطالبہ کیا تو اب پاکستان کی حکومت نے جنگ کی باتیں شروع کر دیں اور صدر پاکستان نے یہ فرما کر کہ ”دس دن کے بعد آپ مجھ کو فرنٹ پر بھیجیں گے“ گویا جنگ کا وقت اور اس کا دن بھی متعین کر دیا۔ اور اس پر وگراہم کے مطابق جنگ شروع بھی کر دی۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور اس کا انجام آج ہر شخص کے سامنے ہے۔

اس موقع پر بھی پاکستان کے ارباب سیاست و حکومت نے اپنی جس بے بصیرتی اور کوتاہ نظری کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ کا اتنا بڑا المیہ ہے کہ اسے قومی خود کشی کے علاوہ اور کیا کہیں؟ پاکستان کی فوج کا ایک ہندو حصہ سات آٹھ ماہ سے مسلسل بنگلہ دیش میں مصروف کار تھا اور اسکے باعث اسے بہت کچھ نقصان پہنچ بھی چکا تھا بنگلہ دیش کے عوام اسکے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ہمسایہ بھارت سے اور پھر ادھر حال یہ تھا کہ ہندوستان کی فوج تازہ دم تھی اور تعداد اور ساز و سامان کے اعتبار سے پاکستان سے پانچ گنا زائد تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بنگلہ دیش اس قدر دور تھا کہ اگر بحری راستہ سے اسکی آمد و رفت روک دی جائے تو بنگلہ دیش میں پاکستانی فوج کے لیے امداد پہنچانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ وہ واضح حقائق ہیں جنہیں ہر عامی بھی محسوس کرتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس کے بل بوتے پر پاکستان جنگ کی آگ میں بے خطر کود پڑا؟ اس سوال کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان کو چین کے ساتھ اپنی دوستی پر یوہا بھروسہ تھا کہ حسب سابق وہ اب بھی مدد کے گلا اور اتوار کرے گی پاکستان سے دوستی کا دم بھر لگاتھا کیونکہ صدر امریکہ کے خاص نمائندہ کوہلینگ پہنچنے اور وزیر اعظم چین سے اس کی راز دارانہ گفتگو کر کے کاپوشیدہ بندوبست سب پاکستان نے کیا تھا لیکن اگر پاکستان کے اقدام جھگ کا واقعی سبب ان دونوں ملکوں کی عملی امداد پر عمل اعتماد اور بھروسہ ہی تھا — اور حق یہ ہے کہ واقعتاً یہی تھا۔ تو پاکستان کی قیادت کا جتنا ماتم کیجئے کم ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کو بھول گئے کہ جن کو ان بڑی بڑی طاقتیں کہا جاتا ہے وہ سچے سچ کسی کی دوست ہیں اور نہ کسی کی دشمن۔ ان کو صرف اپنے ملکی اور قومی مفاد سے شغ ہے اس بنا پر ان کی دوستی حاصل کرنے کا راز صرف اس میں ہے کہ اپنے اندر طاقت و قوت ایسی پیدا کیجئے کہ وہ ان بڑی طاقتوں کے لیے چیلنج بن سکے۔ مگر وہ پر رحم تو آسکتا ہے لیکن اس کا دوست کوئی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جلد ماضی میں پاکستان کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ ہندوستان کا روس کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے اور اس نے امریکہ اور چین کے بے محجوب امداد کے رستہ میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے پاکستان کے ہندوستان کی اور بنگلہ دیش کی زرغیری کے ساتھ اپنے ملک کا مقابلہ و موازنہ کر سکیں نہ سوجا کہ جہاں تک قومی اقتصادی صنعتی اور نظریاتی مفاد کا تعلق ہے امریکہ اور چین کا گوشہ خاطر بنگلہ دیش اور ہندوستان کی طرف

زیادہ ہو سکتا ہے یا پاکستان کی جانب۔ اور ہاں! یہ سب کچھ ایک طرف اور سخت المناک حقیقت
ایک طرف کہ پاکستان اپنے اس جذبہ استمدادِ بالذی کی فراوانی میں اپنے عظیم شاعر و فیلسوف کی
اس نصیحت کو بھی بھول گیا کہ

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی!

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوٹاہی!!

اس میں شبہ نہیں کہ بنگلہ دیش کے نام سے ایک آزاد مملکت وجود میں آگئی اور اب پاکستان
کے ساتھ اسکا انضمام ناممکن ہے لیکن اسکو کتاب کا آخری باب قرار دینا بین الاقوامی حالات و سیاسیات
اور انسانی و تہذیبی عوامل و نفسیات سے صرف نظر کر لینا ہوگا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل حالات کا
رج کیا ہوگا۔ بہر حال اب پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ جس طرح ہندوستان نے ملک کی تقسیم کو سخت
افزیت رساں ہونے کے باوجود گوارا کر لیا تھا۔ اسی طرح وہ بنگلہ دیش کی علیحدگی کی ایک حقیقت سمجھ کر
برداشت کرے اور اپنے ہاں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم کر کے اپنی تمام صلاحیتوں کو خلوص و انہماک
کے ساتھ اپنی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر دے۔ اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کے ساتھ اگر وفاقی
تعلق پیدا ہو سکے تو اس طرح پر، ورنہ یوں بھی تعلقات کو بہتر بنا کر امن و اطمینان کے ساتھ زندگی
بسر کرنے کی راہ پیدا کرے۔ اگر ایسا ہو سکے۔ اور ہماری دہلیہ کہ ایسا ہو۔ تو پاکستان کا
یہ نقصان نقصان نہیں۔ بلکہ اس کی منفعت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ بنگلہ دیش اور ہندوستان کو
بھی سمجھنا چاہیے کہ اس جنگ کو فتح کر کے انھوں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن مستقبل
میں حاکمات ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ ان میں قول و قرار کی
پاسداری، عدل و انصاف اور ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی خیر سگالی اور رواداری برتنے کا سلیقہ
کتنا اور کس درجہ کم ہے۔ !!

انوس ہر جاری بزمِ علم و ادب کی پرانی شمعیں ایک ایک کر کے اٹھتی جا رہی ہیں۔ چنانچہ گزشتہ تارو
دسمبر کی ۱۹ کو خواجہ غلام السیدین بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم مولانا حاکی کے نواسر

تھے اور حق یہ ہے کہ اس وقت کا ہمارا مرحوم کے قدامت موندوں پر ایسا راستہ آیا کہ خاندانوں میں یہی شاہیں کم ہی ملیں گی۔ نو عمری میں ملی گڑھ کے ٹریننگ کالج کے نامور پرنسپل ہوئے۔ اس کے بعد راجپوت کشمیر اور کبھی میں حکومت کے مشیر تعلیم کے عہدہ پر فائز رہے۔ آزادی کے بعد مرکزی وزارت تعلیم میں سکریٹری ہوئے۔ اور اس عہدہ سے پنشن پائی لیکن کچھ یہ ہے کہ یہ سب عہدے ان کے ملی و اولیٰ درجہ و مقام سے فروتر تھے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ اویس تھے۔ مقرر تھے پچاسوں مقالات کے علاوہ انگریزی اور اردو میں متعدد دقیق کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ اگرچہ تعلیم اور اس کا فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا لیکن تاریخ اور مذہب سے بھی فطری لگاؤ تھا۔

بڑی بات یہ ہے کہ فکر و نظر کا اعتدال و توازن بلا کا تھا۔ وہ قدامت پرستوں میں ترقی پسند تھے اور ترقی پسندوں میں قدامت پرست۔ تحریر و تقریر دونوں میں بڑا چارو اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس بنا پر ہر طبقہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جلتے تھے۔ ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل تھی۔ چنانچہ لازم سے سکدوش ہونے کے بعد امریکہ کا ٹاڈ اور یورپ میں باہار و وینٹنگ پروفیسر ہو کر گئے۔ آخر زمانہ میں اسلامیات کی طرف انہماک زیادہ ہو گیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں جب کبھی انہیں کوئی اشکال ہوتا یا قلم لکھنے کو لکھتے تھے اور جواب سے خوش ہوتے تو اس کا اظہار ایک مستقل خط کے ذریعہ کرتے تھے۔ نہایت مہذب، خوش طبع اور کریم النفس انسان تھے۔ عمر کے لگ بھگ پائی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ اب تہذیب اور شائستگی کے ایسے نمونے کہاں ملیں گے؟

افسوس ہے ہمارے عزیز اور فاضل دوست مولانا احتشام الحسن کا اندھلوی بھی گزشتہ نومبر میں شدید علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مولانا کا ندیہ کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے لیکن ان کا مشغلہ تبلیغی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور مطالعہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ شب و روز اسی میں بسر کرتے تھے اور گفتگو کا موضوع بھی بس یہی ایک بات ہوتی تھی۔ تبلیغی جماعت

کے طریق کار سے ان کو اختلاف تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تبلیغ تو نام ہی اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کا ہے۔ مرض الوفا میں مبتلا ہونے سے ایک ماہ قبل علی گڑھ آئے اور ایک ہفتہ کے قریب قیام کیا۔ ان دنوں میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی اور ہر ملاقات میں وہ اپنے اس محبوب موضوع پر تقریر کرتے رہے ہیں۔ میں حسب عادت خاموش سنتا رہا اور بولا کچھ نہیں۔ مرض الوفا میں انھوں نے بڑی سخت تکلیف اٹھائی لیکن صبر و رضا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بڑے خلیق اور مابذراہد بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ اہمار و صلی کا مقام عطا فرمائے آمین۔

ندوة المصنفین دہلی

۱۹۷۱ء کی زیر طبع

۱۹۷۰ء کی مطبوعہ

- | | | |
|--|------|--|
| ۱۔ تفسیر مظہری اردو۔ نویں جلد | ۱۷/- | ۱۔ تفسیر مظہری اردو دوسویں جلد زیر طبع |
| ۲۔ حیات (حلاوت) سید عبدالحق | ۱۱/- | ۲۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج |
| ۳۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی افقا | ۹/- | ۳۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان |
| ۴۔ آثار و معارف | ۱۰/- | ۴۔ ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط |

ندوة المصنفین اردو ہائے اعلیٰ جامع مسجد دہلی

جمال الدین الاسنوی

اوردان کی طبقات الشافیتہ

(۶)

مناہ حافظہ الشریعہ العظیم خالصہ الم اسماء، بی، ایچ، ڈی، کچھ شریعیات مسلم اور کچھ شریعیات

الفصل الثانی فی الاسماء الزائدۃ علی الکتابین

۵۳۸۔ السیرۃ، محمد بن ملوی بن ولویہ، ابو عبد اللہ، البحرانی (م ۵۲۹) ص ۲۱۰

۵۳۹۔ الموروث، باری، محمد بن احمد بن القاسم، ابو علی (م ۵۳۲) ص ۲۱۰

۵۴۰۔ السرازی، عبد الرحمن بن ابی حاتم محمد بن ادیس، ابو محمد (م ۵۳۲) ص ۲۱۱

۵۴۱۔ السرازی، عبد الرحمن بن سلیمان (م ۳۳۹) ص ۲۱۱

۵۴۲۔ الوادی، محمد بن عبد اللہ بن جعفر، ابو الحسن (م ۵۳۲) ص ۲۱۱

۵۴۳۔ ابن رزقینہ، محمد بن احمد بن محمد بن رزق، ابو الحسن، البغدادی البزار (۳۲۵-۵۴۲) ص ۲۱۱

۵۴۴۔ ابن رامین، ابو محمد بن الحسن بن الحسن بن رامین، الاسترلابی (م ۵۴۲) ص ۲۱۲

۵۴۵۔ محمد بن محمد بن احمد، ابو زرعة [حفید ابن اسنی] (م ۴۳۳) ص ۲۱۲

۵۴۶۔ ابن نوین، عبد الوہاب بن محمد بن محمد بن محمد، البغدادی (م ۵۳۳) ص ۲۱۲

۵۴۷۔ السراوی، علی بن احمد بن علی بن عبد اللہ الطبری (م ۵۴۸) ص ۲۱۲

... روز بارہ۔ یعنی اللہ وفتح الزام المہجۃ، کی طرف نسبت ہے۔ روز بارہ بغداد کا ایک مشہور مکان ہے۔

۵۴۸۔ (م ۴۳۳)

- ۵۴۸۔ الرشیدی، کی بن عبد السلام بن حسین، ابو القاسم الانصاری (۲۳۲-۲۶۲) ص ۲۱۲
- ۵۴۹۔ الراذکی، احمد بن موسیٰ، ابو حامد الطوسی - ص ۲۱۳
- ۵۵۰۔ الرشیدی، ادیس بن حمزہ بن علی، ابو الحسن، اشامی (م ۵۰۴) ص ۲۱۳
- ۵۵۱۔ الرازی، عبد الکبیر بن علی بن ابی طالب، ابو القاسم (م ۵۵۲) ص ۲۱۳
- ۵۵۲۔ ابن الرومی، احمد بن سلامہ بن عبید اللہ، ابو العباس، البغلی الکوفی (۴۶۰-۵۵۲) ص ۲۱۳
- ۵۵۳۔ عبد اللہ، ابو محمد (۳۸۸ م) [ابن الرومی] ص ۲۱۳
- ۵۵۴۔ ابن مرد دا، المبارک بن المبارک بن احمد بن علی، ابو نصر (۳۸۸-۵۴۳) ص ۲۱۳
- ۵۵۵۔ الرستقی، عبد اللہ بن العباس بن علی، ابو الحسن، الاصبہانی (م ۵۶۱) ص ۲۱۳
- ۵۵۶۔ الرشیدی، علی بن الحسن بن علی، ابو الحسن (م ۵۶۹) ص ۲۱۵
- ۵۵۷۔ ابن الرافعی، احمد بن احمد بن یحییٰ بن حاتم بن علی بن زعم ابو العباس، الغری (م ۵۷۸) ص ۳۱۵
- ۵۵۸۔ السامری، مبشر بن احمد بن علی، ابو الرشید (م ۵۸۹) ص ۲۱۶
- ۵۵۹۔ الرضائی، الیمان بن احمد، ابو الحسن، الواسطی (م ۵۹۱) ص ۲۱۶
- ۵۶۰۔ رفیع الدین، عبدالعزیز بن عبدالواحد بن اسماعیل، ابو حامد البغلی - ص ۲۱۶

(۱) ہر میلہ (بعضہ الرءاء وفتح المیم) کی طرف نسبت ہے۔ مثلاً میلۃ بصرہ سے مکہ جتنے واسطے یہ ہے
کے ہمد ایک منزل کا نام ہو۔ بحرین کے گاؤں میں سے ایک شہر گاؤں کا نام ہے۔ سحلی کا خیال ہے کہ رسید -
بیت المقدس میں ایک گاؤں ہے۔ (معجم ۳/۷۴)

- (۲) ساخان (فتح الذال بحجۃ) کی طرف نسبت ہے اور یہ طوس میں ایک گاؤں کا نام ہے (معجم ۳/۱۳)
- (۳) سملۃ (فتح الراء وکون المیم) کی طرف نسبت ہے جو فلسطین میں ایک بیت بڑا شہر ہے (معجم ۳)
- ۴۔ قال الاسنوی: الرستقی منسوب الی جد له یقال له رستم" (طبقات ص ۲۱۳)
- ۵۔ قال الاسنوی فی طبقاتہ: الرستاقۃ بلد من اعمال واسط قریۃ منها وتطلق ایضاً علی اماکن
کثیرۃ" (طبقات الشافعیہ ص ۲۱۶)

- ۵۶۱۔ ابن زین، محمد بن حسین بن زین، ابو عبد اللہ، العامری، تقی الدین (۹۰۳-۹۸۰ھ) ۲۱۵
 ۵۶۲۔ عبد اللہ، صدر الدین (م ۵۶۹ھ) ص ۲۱۸ [ولد ابن زین]
 ۵۶۳۔ عبد اللطیف، ابو البركات، بدر الدین (۶۲۹-۷۷۱ھ) [ولد ابن زین]
 ۵۶۴۔ عبد المحسن، طار الدین (م ۷۳۳ھ) ص ۲۱۸ [حفید ابن زین]
 ۵۶۵۔ جعفر بن محمد بن عبد الرحیم، الشریف ابو الفضل القنائی، ضیاء الدین (۶۱۸-۷۹۶ھ) ۲۱۵
 ۵۶۶۔ تقی الدین ابو البقاء، محمد (۶۳۵-۷۲۸ھ) ص ۲۱۹ [ولد القنائی]
 ۵۶۷۔ فہم الدین علی، (م ۷۷۸ھ) ص ۲۱۹ [حفید القنائی]
 ۵۶۸۔ عز الدین، محمد (م ۷۷۸ھ) ص ۲۱۹ [حفید القنائی]
 ۵۶۹۔ سرفی الدین، محمد بن ابی بکر بن خلیل، العمالی، المکی (م ۷۹۶ھ) ص ۲۱۹
 ۵۷۰۔ ابن الرضعة، احمد بن محمد بن علی، ابو العباس، نجم الدین (۶۳۵-۷۷۱ھ) ص ۲۲۰
 ۵۷۱۔ الرشیدی، ابراہیم بن یاسین، برکان الدین (م ۷۷۹ھ) ص ۲۲۱

باب الزاء المعجمہ

فیہ فصلان، الأول فی الاسماء الواقعة فی الرفع والروضة

- ۵۷۲۔ الربیعی، احمد بن سلیمان، ابو عبد اللہ البصری (م ۳۱۷ھ) ص ۲۲۱
 ۵۷۳۔ الزنجانی^(۱)، محسن بن محمد بن العباس القاضی ابو علی الطبری ص ۲۲۲
 ۵۷۴۔ الزیادی، محمد بن محمد بن حمش، الوطائی (۳۱۷-۴۰۰ھ) ص ۲۲۲

(۱) نَجَّاجہ (فتح الزاء المعجمہ جیم مشددة مفتوحہ) کی طرف منسوب ہے۔ قوم کے قریب ایک گاؤں ہے اور یہ گاؤں قوم اور قنط کے امین ہے (معجم ۳/۱۳۲)

۵۷۵۔ الزنجانی، احمد بن محمد بن احمد بن زنجیہ، ابوبکر (۳۰۳-۵۰۰) ص ۲۷۳

الفصل الثانی فی الاسماء النرائیہ علی الکتابین

۵۷۶۔ الزنجانی، احمد بن محمد بن عبد اللہ، ابو عمرو (۳۸۲-۵۲۳) ص ۲۲۳

۵۷۷۔ النریات، محمد بن عمر بن محمد بن علی، ابوبکر، البغدادی (ص ۲۲۳)

۵۷۸۔ البوسیدی، القاسمی، عبد الرحمن بن محمد بن احمد بن حبیب (م ۴۱۳) ص ۲۲۲

۵۷۹۔ الزنجانی، محمد بن عبد اللہ بن احمد، ابو عمرو (۳۲۱-۵۲۲) ص ۲۲۲

۵۸۰۔ الزجاج، عبد اللہ بن عبد اللہ بن محمد بن حبیب بن مسکین، ابوالحسن المصری۔

(م ۴۲۴) ص ۲۲۲

۵۸۱۔ الزنجانی، عمر بن علی بن احمد، الجفص (م ۴۵۹) ص ۲۲۳

۵۸۲۔ الزوزی، عبد الرحمن بن الحسن بن احمد، ابو حنیفہ (م ۴۶۶) ص ۲۲۲

۵۸۳۔ الزنجانی، یوسف بن الحسن بن محمد بن الحسن، ابوالقاسم المعروف بالتفکری

(۳۹۵-۵۴۳) ص ۲۲۵

۵۸۴۔ علی بن احمد ابوالحسن۔ ص ۲۲۵

۵۸۵۔ الزنجانی، یوسف بن علی بن محمد بن الحسن، ابوالقاسم (۴۶۹-۵۵۰) ص ۲۲۵

(۱) زنجان کی طرف نسبت ہے۔ ایک بہت بڑے شہر کا نام ہے جو ابھر اور قزوین کے قریب ہے

(مجم ۱۵۲/۳)

(۲) زرد (بفتح الزاء) المعجمہ ثم الراء الساکنہ، اسفراہین میں ایک گاؤں ہے (مجم ۱۳۶/۲)

(۳) قال الاسنوی: الزجاجی بزاو معجمہ مفتوحہ وقد تظنم وراء مملہ ساکنہ

بعدها جیم۔ و زجاء قریۃ من قری بسطام

(طبقات الشافعیۃ الاسنوی ص ۲۲۲)

- ۵۸۶۔ الزبیرانی، زید بن عبد اللہ بن احمد البیہقی (ولادت ۵۱۶ھ ...) ص ۲۲۵
- ۵۸۷۔ الزیادی، الفضل بن محمد بن ابراہیم بن محمد (۳۵۸-۵۵۰ھ) ص ۲۲۶
- ۵۸۸۔ الزاہد، عمر بن محمد بن الحسین، ابو حفص (م ۵۵۳ھ) ص ۲۲۶
- ۵۸۹۔ الزنجانی، عبد الرحیم بن رستم، ابو الفضائل (م ۵۶۳ھ) ص ۲۲۶
- ۵۹۰۔ الزنجانی، ابو الحسن بن عبد المحسن بن عبد اللہ العبدی (م قبل ۵۵۹ھ) ص ۲۲۶
- ۵۹۱۔ الزنجانی، منصور بن الحسن بن منصور، ابو السکارم (م ۵۹۷ھ) ص ۲۲۷
- ۵۹۲۔ ابن الزکی، محمد بن علی بن محمد، ابو المعالی، محی الدین القرشی، العثماني (۵۵۰-۵۵۹ھ) ص ۲۲۷
- ۵۹۳۔ نرگی الدین، علی (م ۵۶۳ھ) ص ۲۲۷ (والد ابن الزکی)
- ۵۹۴۔ یوسف بن یحییٰ بن محمد بن یحییٰ، بہادر الدین (م ۵۶۸ھ) ص ۲۲۷
- ۵۹۵۔ ابن الزجاجیہ، مکی بن محمد، الدمشقی (م ۵۶۸ھ) ص ۲۲۷
- ۵۹۶۔ الزنجانی، ابراہیم بن عبد الوہاب الانصاری، عماد الدین۔ ص ۲۲۸
- ۵۹۷۔ الزرقانی، صالح بن بدر بن عبد اللہ تقی الدین (م ۶۳۰ھ) ص ۲۲۸
- ۵۹۸۔ ابن خطیب زملکا، عبد الواحد بن عبد الکریم بن خلف، ابو السکارم کمال الدین (م ۶۵۱ھ) ص ۲۲۸

(۱) زبیران (بفتح الزاء والیا) والراء کی طرف نسبت ہے جو ملکین میں شہر جنڈکا ایک گاؤں ہے۔

(مجم ۱۳/۳)

(۲) زفاد بکراور و سکون تانیہ کی طرف منسوب ہے۔ قسطنطین کے قریب ایک شہر کا نام جو (مجم البلدان ۴/۳۳۶)

(۳) زملکا۔ اس کو زملکان بھی کہتے ہیں۔ سمطانی نے لکھا ہے کہ وہ ملک کے نام میں سے ہے ایک

نواح میں ہے اور دسر دشت میں (مجم البلدان ۱۵/۲)

- ۵۹۹- علاءالدین، البکسن علی (م ۵۶۹۰) (ولد ابن خلیب زملکا)
 ۶۰۰- کمال الدین، محمد بن علی (م ۵۷۲۷) [حفید ابن خلیب زملکا]
 ۶۰۱- النعمانی، محمود بن احمد بن محمود، ابوالنشاء (م ۵۶۵۶) ص ۲۳۰
 ۶۰۲- النعمانی، محمود بن عبد الشکر بن احمد، طبر الدین، ابوالطاهر (م ۵۶۷۳-۵۶۷۴) ص ۲۲۰
 ۶۰۳- ابن زکیس، یحیی بن عبد الکرم بن محمد بن زکیر محی الدین النعمانی (م ۵۷۱۸) ص ۳۳۰
 ۶۰۴- السراکانی، عمر بن یارون بن محمد، شهاب الدین، القزوینی (م ۵۷۲۸) ص ۲۳۱
 ۶۰۵- الزنکونی، ابوبکر بن اسماعیل بن عبد العزیز، محمد الدین (م ۵۷۳۰-۵۷۳۱) ص ۲۳۱

باب السین

فیه فصلان، الاول فی الأسماء الواقعة فی الرافضی والمروضة

- ۶۰۶- احمد بن سیدار، البهمن، السماری، المروزی (م ۵۶۷۸) ص ۲۳۲
 ۶۰۷- احمد بن عمر بن شریک، ابوالعباس، البغدادی (م ۵۳۰۶) ص ۲۳۲
 ۶۰۸- الجفص، عمر، ص ۲۳۳ [ولد ابن شریک]
 ۶۰۹- الساجی، زکریا بن یحیی بن عبد الرحمن، البوکی، البغدی، البصری- (م ۵۳۰۶) ص ۲۳۳
 ۶۱۰- محمد بن الفضل بن سلمه، ابوالطیب البغدی (م ۵۳۰۸) ص ۲۳۳
 ۶۱۱- السجستانی، احمد بن عبد الله بن سیف البکر (م ۵۳۱۶) ص ۲۳۳
 ۶۱۲- متیة بن عبید الله بن موسی، ابوالطیب، البهذانی (م ۵۳۵۰) ص ۲۳۴

- ۶۱۳۔ السادہ علی، محمد بن موسیٰ، ابو الطیب۔ ص ۲۳۵
- ۶۱۴۔ الشکر علی، یحییٰ بن ابی ظہر۔ احمد، ابو زکریا (م ۳۸۸ھ) ۲۳۵
- ۶۱۵۔ الشکر علی، زاہر بن احمد بن محمد بن، ابو علی (م ۳۸۹ھ) ص ۲۳۵
- ۶۱۶۔ ابن شہر اشقہ، محمد بن یحییٰ بن شہر اشقہ، ابو الحسن، العامری البصری۔
(کائن حیات فی ۴۱۰ھ) ص ۲۲۶
- ۶۱۷۔ السنجی، الحسین بن شعیب، ابو علی، المروری (م ۴۲۷ھ) ص ۲۳۶
- ۶۱۸۔ السمعانی، منصور بن محمد بن ابی المنظر، القیمی المروری (۴۲۶-۴۸۹ھ) ص ۲۳۷
- ۶۱۹۔ الشریفی، عبد الرحمن بن احمد، ابو الفرج، دنیوث ایضاً بالرزاز (م ۴۵۴ھ) ص ۲۳۷
- ۶۲۰۔ السمعانی، محمد بن منصور، البرکری (۴۶۶-۵۱۰ھ) ص ۲۳۸
- الفصل الثانی فی الأسماء المتداخلة علی الکتابین
- ۶۲۱۔ الشریح، محمد بن اسحاق، ابو العباس، الشافعی (م ۳۱۳ھ) ص ۲۳۹
- ۶۲۲۔ السیوطی، ابو علی۔ ص ۲۳۹
- ۶۲۳۔ السجستانی، عبد اللہ بن ابی داؤد سلیمان، ابو بکر (۴۳۰-۴۱۶ھ)
(صاحب السنن) ص ۲۳۹

۱۔ سادہ کی طرف نسبت ہے۔ سادہ ہمدان اور رے کے مابین ایک خوبصورت شہر ہے اس کے ہمدان اور رے کے درمیان تیس میل کا فاصلہ ہے (مجم الجوان ۱۷۹/۳)

۲۔ شکر (بروزن ثغر) کی طرف نسبت ہے۔ مصر میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اس کے اور مصر کے مابین دو فاصلے کا واسطہ ہے (مجم ۲۳۰/۳)

۳۔ شریح کی طرف منسوب ہے۔ جو فراسان کے نواح میں ایک قدیم بڑے قہر کا نام ہے (مجم ۲۳۰/۳)

۶۲۳۔ السیستانی، علی بن الحسن بن سہقان، ابوالحسن، المروزی (م ۳۱۶ھ) ص ۲۳۰

۶۲۵۔ السیستانی، ابوالفضل ص ۲۳۰

۶۲۶۔ السیستانی، احمد بن محمد، ابوالحسن، النیسابوری (م ۳۳۹ھ) ص ۲۳۰

۶۲۷۔ السیستانی، احمد بن منصور، ابوالفضل (ولادت ۳۷۰.....) ص ۲۳۰

۶۲۸۔ السیستانی، احمد بن محمد بن علی، ابوبکر (۲۵۶-۳۷۷ھ) ص ۲۳۱

۶۲۹۔ ابن السقار، محمد بن الحسین، ابوعلی، الاسفرائینی (م ۳۰۲ھ) ص ۲۳۱

۶۳۰۔ اسمعقذی، ابوالحسن الفارسی (م ۲۳۱ھ) ص ۲۳۱

۶۳۱۔ السیستانی، احمد بن علی بن عمرو بن احمد، ابوالفضل، البخاری، البیہقی ص ۲۳۱

(۳۱۱-۴۰۴ھ) ص ۲۳۱

۶۳۲۔ السیستانی، عبدالرحمن بن محمد بن عبداللہ، ابوالقاسم، القرطبی، النیسابوری ص ۲۳۲

(م ۴۱۸ھ) ص ۲۳۲

۶۳۳۔ السیستانی، احمد بن محمد بن محمد، ابوہریرہ، القفصری (م ۴۳۹ھ) ص ۲۳۲

۶۳۴۔ ابن ابی شیبہ، عبد الرحمن، بن محمد بن سہقان، ابوالحسن، النیسابوری ص ۲۳۲

۶۳۵۔ السیستانی، زہیر بن الحسن بن علی، ابوالنضر (م ۴۵۵ھ) ص ۲۳۳

۶۳۶۔ السیستانی، ابراہیم بن محمد بن موسیٰ، ابوالحسن، (م ۴۵۸ھ) ص ۲۳۳

۶۳۷۔ السیستانی، عبداللہ بن علی بن عوف، ابو محمد (م ۴۶۵ھ) ص ۲۳۳

۶۳۸۔ السیستانی، الحسن بن محمد بن الحسن، ابوعلی (م ۴۸۸ھ) ص ۲۳۳

ابو الحسن (الحسن بن الحسن بن الحسن) کی طرف منسوب ہے۔ شہر و روئے کلاں کا نام ہے۔
ابو سب (الحسن بن الحسن بن الحسن) کی طرف منسوب ہے۔ کوہ کے اطراف میں ایک قصبہ کا نام ہے۔ (مجموعہ ۲۳۶)
شہر و روئے کلاں (الحسن بن الحسن بن الحسن) کی طرف نسبت ہے۔ شہر و روئے کلاں کا نام ہے۔ (مجموعہ جلد ۱/۳ ص ۲۱۸)

- ۶۳۹۔ السامی، عبدالرحمن، عبدالرحمن بن محمد بن علیک، ابو طاهر (م ۴۸۵ھ) ص ۲۳۴
- ۶۴۰۔ الشراعی، جعفر بن محمد بن الحسن، ابو محمد بغدادی (م ۵۵۰ھ) ص ۲۴۳
- ۶۴۱۔ السنہانی، علی بن عبد الرحمن بن محمد، ابو الحسن (م ۵۵۰ھ) ص ۲۴۴
- ۶۴۲۔ السنہانی، محمد بن الحسن، ابو جعفر (م ۵۵۰ھ) ص ۲۴۴
- ۶۴۳۔ الشتر شتر، عبد اللہ بن محمد بن محمد، ابو عبد اللہ اندلسی (م ۵۱۰ھ) ص ۲۴۵
- ۶۴۴۔ الشراج، عبد الرحمن بن محمد بن سہیل، ابو نصر (م ۵۱۸ھ) ص ۲۴۵
- ۶۴۵۔ الشیبی، عمر بن محمد بن محمد بن علی، ابو الحسن (م ۵۲۹ھ) ص ۲۴۵
- ۶۴۶۔ الشیبی، محمد بن علی بن محمد، ابو سعید، الترقی (م ۵۳۰ھ) ص ۲۴۶
- ۶۴۷۔ الشیبی، عبد اللہ بن سہیل بن عمر، ابو عبد اللہ طبرستانی (م ۵۳۲ھ) ص ۲۴۷
- (روح بنت امام الحرمین)

- ۶۴۸۔ ابن رسا، سلطان بن ابی امیر بن مسلم، ابو القاسم المقدسی (م ۵۴۵ھ) ص ۲۴۷
- ۶۴۹۔ الشراج، سہیل بن نصر بن عبد الرحمن، ابو القاسم النیسابوری (م ۵۴۵ھ) ص ۲۴۷
- ۶۵۰۔ السلطان، عمر بن علی بن سہیل، ابو سعد الدمشقی (م ۵۴۸ھ) ص ۲۴۷

طہ سجستان (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ سرقسطہ (فتح اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ و طہ مفتوحہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کا ایک شہر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

طہ شہر (کسر اولہ) ثانیہ ثم فون ساکتہ کی طرف منسوب ہے طخارستان کے ایک شہر کو نام پر (مجم ۱۹۶/۲)

- ۶۵۱۔ السنجی، محمد بن محمد بن عبد اللہ، ابو طاهر المروزی (۲۷۳-۵۵۴ھ) ص ۲۴۷
- ۶۵۲۔ السرخسی، عبد الرحمن بن محمد بن محمد بن ابراہیم، ابو القاسم، الفارسی۔
(۵۰۶-۵۵۶ھ) ص ۲۴۷
- ۶۵۳۔ ابن سعدان، احمد بن یحییٰ بن عبد الباقی، ابو الفضائل الزہری البغدادی۔
(۲۸۳-۵۶۱ھ) ص ۲۴۸
- ۶۵۴۔ السعدی، عبد اللہ بن رفاعۃ بن عذیر، ابو محمد المصری۔
(۲۶۶-۵۶۱ھ) ص ۲۴۸
- ۶۵۵۔ اسماعیلی، عبد الکریم بن ابی بکر محمد بن ابی المظفر منصور الملقب تاج الاسلام۔
(۵۰۶-۵۶۲ھ) ص ۲۴۸
- ۶۵۶۔ السلامی، محمد بن ہبۃ اللہ بن عبد اللہ (م ۵۷۴ھ) ص ۲۴۹
- ۶۵۷۔ اسماعیلی، احمد بن بدر، کمال الدین، ابو نصر (م ۵۷۵ھ) ص ۲۴۹
- ۶۵۸۔ ابن سؤید، عبد اللہ بن علی بن عبد اللہ، ابو محمد التکرتی۔ ص ۲۴۹
- ۶۵۹۔ السلفی، احمد بن محمد بن احمد بن ابراہیم بن سلفۃ، ابو طاهر الاصفہانی۔
(۲۷۳-۵۷۶ھ) ص ۲۴۹
- ۶۶۰۔ السادی، احمد بن محمد بن ابراہیم، ابو حامد (۵۷۶-۵۷۷ھ) ص ۲۵۰
- ۶۶۱۔ الشمیدی، عبد اللہ بن حیدر بن ابی القاسم القسنونی۔
(م ۵۸۲ھ) ص ۲۵۰

۱۔ سلاطین (فتح اول و ثانیہ و آخرہ میں مملکت) کی طرف نسبت ہے۔ یہ آذربائیجان میں ایک مشہور
و معروف شہر ہے۔ اس کے اور تبریز کے مابین تین دن کا راستہ ہے۔ اب اس کا اکثر حصہ ایران کی سرحد پر ہے۔
۲۔ (مجم ۳/۲۳۸)

- ۶۶۲۔ ابن حکینہ، عبد الوہاب بن علی بن عبید اللہ، ابو محمد بغدادی (۵۱۹-۵۶۷ھ) ص ۲۵۱
- ۶۶۳۔ قاضی السلیمان، ابراہیم بن نصر بن عسکر، ابواسحاق ظہیر الدین ص ۲۵۱
- ۶۶۴۔ سدید الدین، ابراہیم بن عمر بن سحاق، ابواسحاق، الاسعدی (م ۶۱۲ھ) ص ۲۵۲
- ۶۶۵۔ ابن السمعانی، عبد الرحیم بن عبد الکرم ابو المنظر، فخر الدین (۵۳۷-۶۱۷ھ) ص ۲۵۲
- ۶۶۶۔ السہروردی، عمر بن محمد بن عبد اللہ، ابونصر، البکری (۵۳۹-۶۳۲ھ)
- ۶۶۷۔ السہروردی، عبد القادر بن عبد اللہ بن محمد، ابوالنجیب (م ۵۶۳ھ) ص ۲۵۲
- ۶۶۸۔ السہروردی، عمر بن عبد اللہ، ابو حفص (م ۵۳۲ھ) ص ۲۵۲ [اوغہ]
- ۶۶۹۔ ابوالرغنی، عبد الرحیم (م ۵۶۷ھ) [ولد ابی النجیب السہروردی] ص ۲۵۲
- ۶۷۰۔ ابو محمد، عبد الطیف (۵۳۳-۶۱۰ھ) [ولد ابی النجیب السہروردی] ص ۲۵۲
- ۶۷۱۔ السنجاری، اسعد بن یحییٰ بن موسیٰ ابوالساعات (۵۳۳-۶۲۲ھ)
- ۶۷۲۔ ابن السکری، عبد الرحمن بن عبد الحل، عماد الدین (م ۵۵۲ھ) ص ۲۵۵
- ۶۷۳۔ السخاوی، علی بن محمد بن عبد الصمد، ابوالحسن، علم الدین (م ۶۴۳ھ) ص ۲۵۵
- ۶۷۴۔ سلار بن الحسن، بن عمر ابوالحسن، کمال الدین الطاربی (م ۶۷۰ھ) ص ۷۵۶
- ۶۷۵۔ ابن السامعی، علی بن نجیب بن عثمان، ابوطالب، تاج الدین (م ۶۷۷ھ) ص ۲۵۶
- ۶۷۶۔ ابن جنت الی سعد، عثمان بن علی بن یحییٰ، فخر الدین الأنصاری (۶۲۹-۷۱۹ھ) ص ۲۵۷

لئے شایستہ۔ دجلہ کے مشرقی ساحل پر موصل کے نواحی میں ایک طے گاؤں کا نام ہے۔ یہ گاؤں موصل کے بہترین اوصاف متعین میں شمار کیا جاتا ہے (مجم البلدان ۲/۲۳۴)

- ۶۷۷۔ شرف الدین محمد بن عثمان (م فی حدود ۷۴۰ھ) ص ۲۵۷ [سبط ابن بنت ابی سبیا]
 ۶۷۸۔ السوید اوسی، عمر بن احمد بن طرار، سراج الدین الخورجی (م ۷۲۶ھ) ص ۲۵۷
 ۶۷۹۔ السنہا طلی، محمد بن عبد الصمد بن عبد القادر بن صالح قطب الدین (م ۷۳۳ھ) ص ۲۵۷
 ۷۰۰۔ الشمتانی، احمد بن محمد بن احمد، علاء الدین، علاء الدولہ
 (م قبل ۷۴۰ھ) ص ۲۵۸
 ۷۰۱۔ السبکی، محمد بن عبد اللطیف، ابوالفتح، تقی الدین (م ۷۴۴ھ) ص ۲۵۸
 ۷۰۲۔ السبکی، علی بن عبد الکافی بن علی، تقی الدین ابوالحسن (م ۷۵۶ھ) ص ۲۵۸

باب الشہین المجمعۃ

- فیہ فقلان، الاول فی الاسماء الواقعة فی اقصیٰ الارض
 ۷۸۳۔ ابن بنت الشافعی، احمد بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن العباس بن عثمان بن شافع
 ص ۲۵۹
 ۷۸۴۔ الشاشی، محمد بن علی بن اسماعیل، ابو بکر اتقال الکبیر
 (۲۹۱ - ۳۶۵ھ) ص ۲۶۰
 ۷۸۵۔ الشہوی، محمد بن، عمر بن شہوید، ابو علی۔ ص ۲۶۱

لے سُوید اسی طرف نسبت ہے۔ نواحی دھنق میں حوران کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ (مجم ۲/۲۸۶)
 لے سنہا ط (فتح السین) کی طرف نسبت ہے۔ اس کو سنہوطیہ اور سنوطیہ بھی کہاجاتا ہے نواحی مصر کا
 جزیرہ تو سینا میں ایک خوبصورت چھوٹے شہر کا نام ہے۔ (مجم ۲/۲۶۱) لے شاش کی طرف نسبت ہے
 ماوراءالنہر کا سب سے عمدہ اور صاف تھل شہر ہے۔ وہاں زیادہ تر شافعی علماء و ہدایہ کے ہیں (مجم ۲/۲۸۶)
 لے شہوہ کی طرف نسبت ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ جگہ کہاں واقع ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ
 یمن کا شہر ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ عراق کے نواحی میں ایک مقام ہے۔ (مجم ۲/۳۶۳)

۶۸۸۔ نعت ابی الشبوی۔ ص ۲۶۲

۶۸۹۔ الشاشی، عبدالکریم بن احمد بن الحسن، ابوبکر، ابو عبد اللہ، الطبری۔

(م ۵۴۶۵) ص ۲۶۲

۶۹۰۔ الشیرازی، ابوالہجیم بن علی بن یوسف، ابواسحاق (۳۹۳-۵۴۶) ص ۳۱۲

۶۹۱۔ الشاشی، محمد بن احمد، ابوبکر، فخر الاسلام (۳۱۹-۵۵۰) ص ۲۶۲

۶۹۰۔ الشاشی، عبداللہ بن محمد بن احمد (۴۳۱-۵۵۲) ص ۲۶۵

۶۹۱۔ الشاشی، احمد بن محمد بن احمد (م ۵۵۲) ص ۲۶۵

۶۹۲۔ الشاشی، عمر بن احمد، ابو حفص (م ۵۵۵) ص ۲۶۵

۶۹۳۔ الشاشی، احمد بن عبداللہ بن محمد بن احمد، ابو نصر (م ۵۵۶) ص ۲۶۶

الفصل الثانی فی الالامیاء المنانۃ علی الکتابین

۶۹۴۔ ابن الشرقی، احمد بن محمد بن الحسن، ابو حامد، النیسابوری (۲۴۰-۳۲۵) ص ۲۶۶

۶۹۵۔ الشاشی، نصر بن حاتم بن بکر، ابو الیث ص ۲۶۶

۶۹۶۔ الشیرازی، الحسن بن احمد بن محمد بن الیث، ابو علی (م ۵۴۰) ص ۲۶۶

۶۹۷۔ الشیرازی، عبدالرحمن بن احمد بن محمد، ابو محمد (م ۵۴۲) ص ۲۶۶

۶۹۸۔ ابن الشحنة، شریف بن الفیاض بن المبارک، ابو العباس ص ۲۶۶

۶۹۹۔ ابن شریک الحسن بن عبد اللہ بن الحسن بن الشریک، ابو عبد اللہ (م ۵۴۶) ص ۲۶۶

۷۰۰۔ شالوس کی طرف نہایت ہی پرستان کے پرانی علاقے میں ایک فہرستہ انداس کی حیثیت سے موطرستان

۷۰۱۔ (مجم ۲/۳۱)

۷۰۲۔ شریک کی طرف نہایت ہی پرستان کے پرانی علاقے میں ایک فہرستہ انداس کی حیثیت سے موطرستان

- ۶۰۰۔ الشہابی، احمد بن محمد بن عبد الباقی (م ۴۸۲ھ) ص ۲۶۷
- ۶۰۱۔ ابو نصر محمد بن محمود بن محمد (۴۵۲-۵۳۲ھ) ص ۲۶۷ [ابن ابی الشہابی]
- ۶۰۲۔ الشہر زوری، ابراہیم بن محمد بن عقیل، ابواسحاق (م ۴۸۴ھ) ص ۲۶۸
- ۶۰۳۔ الشہابی، محمد بن علی بن حامد، ابوبکر (۳۹۷-۴۸۵ھ) ص ۲۶۸
- ۶۰۴۔ نقیہ الشاہ، ابو احمد بن عبد الرحمن بن احمد شاہ (م ۴۸۵ھ) ص ۳۶۸
- ۶۰۵۔ الشہابی، محمد بن المنظر، ابوبکر، الجوی (م ۴۸۸ھ) ص ۲۶۸
- ۶۰۶۔ الشہابی، القاسم بن المنظر بن علی، السہروردی (م ۴۸۹ھ) ص ۲۶۹
- ۶۰۷۔ قریب عبد اللہ (۳۶۵-۵۱۱ھ) [ولد الشہابی] ص ۲۶۹
- ۶۰۸۔ ابوبکر محمد المعروف بقاضی النماقتین (۴۷۴-۵۳۸ھ) ص ۲۷۰ [ولد الشہابی]
- ۶۰۹۔ کمال الدین محمد بن عبد اللہ (۴۹۰-۵۷۲ھ) ص ۲۷۱ [حفید الشہابی]
- ۶۱۰۔ جلال الدین عبد الرحمن (م ۵۵۶ھ) ص ۲۷۲ [ولد الشہابی]
- ۶۱۱۔ محی الدین (۵۱۰-۵۸۶ھ) ص ۲۷۲ [ولد الشہابی]
- ۶۱۲۔ ابن الشیرازی، احمد بن عبد اللہ بن عبد الوہاب بن موسیٰ، ابو منصور (م ۴۹۳ھ) ص ۲۷۲
- ۶۱۳۔ شہید، عزیز بن عبد الملک بن منصور، ابو المعالی، الجلیلی۔ (م ۴۹۴ھ) ص ۲۷۲
- ۶۱۴۔ الشہرستانی، ابو الفضل (م ۴۹۴ھ) ص ۲۷۲
- ۶۱۵۔ الشارقی، احمد بن محمد بن عبد الرحمن، ابو الفضل، الانصاری، المغربي (م حدود ۵۵۰ھ) ص ۲۷۳

۲۶۷ ص ۲۶۷

۳۰۷/۳ (مجموعہ)

دقال الاسنوی فی طبقاتہ: الشارقی نسبتہ الی بلدہ فی الاندلس لقال لها شارق

- ۶۱۶۔ شیردیز بن شہر دار بن شیردیز، ابو شجاع، الدلمی (۴۴۵-۵۰۹ھ) ص ۲۶۳
- ۶۱۷۔ شہر دار ابو منصور (۴۸۳.... ۴۸۴ھ) (ولد شیردیز)
- ۶۱۸۔ شیرازی، محمد بن ہبۃ اللہ بن محمد بن یحییٰ، ابو نصر (م ۵۱۶ھ) ص ۲۶۴
- ۶۱۹۔ اشاشی، عمر بن محمد بن موسیٰ، ابو حفص (۴۵۰-۵۲۷ھ) ص ۲۶۴
- ۶۲۰۔ شہرستانی، محمد بن عبد الکرم بن احمد، ابو الفتح (۴۶۷-۵۴۸ھ) ص ۲۶۴
- ۶۲۱۔ شیرفانی، عوض بن احمد، ابو ظف۔ ص ۲۷۵
- ۶۲۲۔ اشاشی، محمد بن عمر بن محمد، ابو عبد اللہ (م ۵۵۶ھ) ص ۲۷۵
- ۶۲۳۔ الخضر بن شعیب بن عبد، ابو البرکات، الدمشقی (۴۸۶-۵۰۲ھ) ص ۲۷۵
- ۶۲۴۔ الشہر زوری، عبد القادر بن الحسن بن علی، ابو السعادات حمۃ الدین۔
(۵۳۷-۵۷۱ھ) ص ۲۷۶
- ۶۲۵۔ الشیرازی، عبد اللہ بن الخضر بن الحسین، ابو البرکات، الموصلی
(م ۵۷۴ھ) ص ۲۷۶
- ۶۲۶۔ الشہر زوری، عبد اللہ بن القاسم، ابو القاسم (م ۵۷۵ھ) ص ۲۷۷
- ۶۲۷۔ اشاشی، الحسن بن سعید بن عبد اللہ بن بندار، ابو علی، علم الدین
(۵۱۰-۵۷۹ھ) ص ۲۷۷
- ۶۲۸۔ ابو شجاع، محمد بن یحییٰ بن عبد اللہ (م ۵۸۱ھ) ص ۲۷۸
- ۶۲۹۔ الشاطی، القاسم بن یحییٰ بن ابی القاسم الریمی (۵۳۸-۵۹۰ھ) ص ۲۷۸

۱۔ شاتان کی طرف نسبت ہے۔ شاتان دیا رکھیں ایک قلعہ کا نام ہے (مجم ۳۰۲/۳)

۲۔ شاطیہ کی طرف نسبت ہے۔ مشرقی اندلس میں ایک مشہور قدیم شہر کا نام ہے۔ حال کا قریبیت

محمد بنایا جاتا ہے۔ (مجم ۲۰۹/۳)

۶۱۔ الشیرازی، خضر بن احمد بن مقلد البوالفتح القضاہی (م ۵۹۸ھ) ص ۲۷۹

۶۲۔ ابن شداد، یوسف بن رافع، بہار الدین، البوالحسن، الاسعدی -

(۵۳۹ - ۶۳۲ھ) ص ۲۷۹

۶۳۔ ابن الشیرازی، محمد بن حبیبۃ اللہ بن محمد بن حبیبۃ اللہ بن یحییٰ اللہ مشقی -

(۵۴۹ - ۶۳۵ھ) ص ۲۸۹

۶۴۔ ساروشامہ، عبدالرحمن بن اسماعیل بن ابراہیم، البوالقاسم، شہاب الدین

(۵۹۹ - ۶۹۵ھ) ص ۲۸۲

۶۵۔ ابنہ زوری، علی بن محمود بن علی، یوحنا الکرودی شمس الدین (م ۶۷۵ھ) ص ۲۸۳

۶۶۔ الشیرازی، محمود بن سعید بن مصلح قطب الدین (م ۷۱۰ھ) ص ۲۸۳

(باقی)

ضروری اطلاع

نہایت افسوس کے ساتھ مطلع کیا جاتا ہے کہ کئی ماہ سے گنجائش نمونے کے باعث تبصرے
شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ انشاء اللہ فروری ۱۹۷۲ء میں تبصروں کے لیے مناسب گنجائش نکالی جائیگی
(محمد ظفر احمد میجر)

حمادین

جناب محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ایم سہ۔ رفیق دارالمصنفین اعظم گورہ
کتب سیر و طبقات، تذکرہ و تراجم اور حدیث و انساب میں "حمادین" کا ذکر اکثر اور ہمارے
اہل علم توخیر اس کی حقیقت سے باخبر ہیں لیکن ناواقف لوگ حمادین کو یا تو ایک ہی شخصیت
متصور کرتے ہیں یا پھر سرے سے وہ اس کے مفہوم کے ہمارے ہی میں الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ
دراصل دوسری صدی ہجری کے اواخر کے دو ممتاز حفاظ حدیث حماد بن زید اور حماد بن سلمہ کے
ناموں کا مخفف تشبیہ ہے۔ یہ دونوں بزرگ نہ صرف عہد اور نام ہی میں اشتراک رکھتے ہیں بلکہ علم
فضل میں بھی یکساں بلند پایہ ہیں۔ اتباع تابعین میں ان کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے۔
حماد بن زید حصول علم کے بعد دولت مینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے
حدیث و فقہ اور ثبت و اتقان میں وہ مقام پیدا کیا کہ بارائے حدیث بھی ان کے حلقہ تلمذ میں
داخل ہونے کو مایہ صد اقرار تصور کرتے تھے۔ حماد بن سلمہ کا خاص تمیز امتیاز زہد و اتقا اور تدوین
حدیث ہے بقول حافظ ذہبی "ان کا شمار سعید بن عروبہ کے ساتھ تصنیف و تالیف میں تقدم و
اولیت رکھنے والوں میں ہوتا ہے"۔ اگرچہ ان سلمہ کی کسی مدون تصنیف کا بالفعل وجود ثابت
نہیں۔ لیکن امام احمد کے فرزند عبد اللہ نیز ابن عماد حنبلی اور حافظ ابن حجر کی اتنی شہادتیں ہیں کہ
موجود ہیں کہ حماد بن سلمہ نے اول اول جمع و تدوین کا کام کیا۔ ذیل میں تاریخ علم و فن کے ان

دونوں لائقِ فخر اور زرخیز جاوید ہستیوں کے حالات و کمالات کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

حماد بن زید

نام و نسب | حماد نام اور ابو اسماعیل کنیت تھی۔ والد کا نام زید تھا۔ جریر بن حادرم کے خاندان کے غلام تھے۔ ان کے دادا درہم سجستان کی جنگ میں گرفتار کر کے غلام بنائے گئے تھے یہ ولادت ان کی ولادت اپنے وطن بصرہ میں ۹۷ھ میں ہوئی۔

شہنشاہِ حماد بن زید نے جن علمی سرچشموں سے استفادہ کیا ان میں سے چند ممتاز اسمائے گرامی یہ ہیں۔

انس بن سیرین، ابو عمران الجوفیؒ، ثابت البنانی، عبد العزیز بن صہیب، عاصم الاطالی، محمد بن زیاد قرشی، سلمہ بن دینار، صالح بن کنیان، عمرو بن دینار، ہشام بن عروہ، عبد اللہ بن عمرؒ۔

تلامذہ | احما بن زید کے منبع فیض سے جوش نگار علم سیراب ہوئے ان میں جلیل القدر تابع تابعین کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ کچھ ممتاز نام درج ذیل ہیں۔

عبد الرحمن بن مہدی، علی بن المدینیؒ، عبد اللہ بن مبارک، ابن وہب یحییٰ بن سعید القطان، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، مسلم بن ابراہیم، مدد، سلیمان بن حرب، عمرو بن عوف، ابو نعیم احمد بن القدامہؒ۔

علم و فضل | حماد بن زید کو مشہور تابعی ابوب سختیانی کی خدمت میں بیس سال تک رہنے کی سعادت

۱۔ العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۲۴۴۔ ۲۔ تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۰۶۔ ۳۔ المعبر ج ۱ ص ۲۴۴۔

۴۔ تہذیب: ج ۳ ص ۹۔ ۵۔ تذکرہ: ج ۱ ص ۲۰۶۔

۶۔ تہذیب التہذیب: ج ۳ ص ۹۔

نصیب ہوئی تھی۔ جیسا کہ خود بیان فرماتے ہیں

جالست ایوب عشمین سندہ^۱ مجھے ایوب سختیانی کا شرف صحبت میں سال تک

حاصل رہا۔

میلی کہتے ہیں کہ اس طویل مدت میں سوائے حماد کے ایوب سختیانی کا کوئی اور شاگرد حدیثوں کی کتابت نہیں کرتا تھا۔ ابن خیرہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا: ”کیا حماد لکھنا بھی جانتے تھے؟“ فرمایا

انا، آیتہ ولایتہ یوم مطرف، آیتہ ایک مرتبہ ہارش کے دن میں حماد کے پاس آیا تو میں نے
یکتب شمرینفع فیہ لیجفہ^۲ خود دیکھا کہ وہ — لکھے جاتے تھے اور پھر پھونک مار کر
اس کو خشک کرتے تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلقی نامینا نہیں تھے۔ بلکہ ان کی بینائی ایک عمر کے بعد جاتی رہی تھی۔ مگر انھوں نے اپنی نامینائی کا اثر اپنے علم و نقل پر نہیں ہونے دیا۔ بعض لوگ ان کی نامینائی کی وجہ سے ان کے حفظ و ثقاہت پر کلام کرتے ہیں۔ مگر حافظ ذہبی جیسے مستند محقق نے انہیں الامام الحافظ الجود شیخ الصاق^۳ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں: ”وہ امام عالی مقام ہیں جن کی جلالت شان اور بلندی مرتبت پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن سعد فرماتے ہیں: ”حماد ثقہ، قابل اعتماد، برہان حق اور کشیر الحدیث ہیں۔“

ائمہ کا اعتراف تمام مواصر ائمہ حدیث نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ مشہور ماہر جبرجہ و تدلی عبد الرحمن بن مہدی کا بیان ہے کہ اپنے اپنے زمانے کے ائمہ چارہ ہوا۔ کو فہم ثوری، حماد بن سلمہ

۱۔ تہذیب الاسماء واللغات، ج ۱ ص ۱۶۷ علامہ ابن حجر، تہذیب: ج ۲ ص ۱۱

۲۔ تذکرۃ الحفاظ: ج ۱ ص ۲۰۶ علامہ تہذیب الاسماء واللغات، ج ۱ ص ۱۶۷

۳۔ تہذیب التہذیب: ج ۳ ص ۱۰

شام میں اوزاعی۔ اور مصر میں حماد بن زید۔ یحییٰ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے حماد سے زیادہ حافظ روایات کسی کو نہیں دیکھا۔ فطرن حماد جہاں کہتے ہیں کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اہل بصرہ میں صرف حماد بن زید کو دریافت کیا۔ ابن معین کا قول ہے کہ "اللقان فی الحدیث میں حماد بن زید کے مرتبہ کا کوئی نہیں ہے۔"

امام احمد بن حنبل ان کا ذکر بہت ہی عظمت اور عزت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے چنانچہ امام موصوف ہیں کہ الفاظ ہیں کہ

هو من ائمة المسلمين من اهل الدين محبوب وہ مسلمانوں کے امام اور بڑے دیندار ہیں اور
آئی من حماد بن سلیہ وہ مجھے حماد بن سلمہ سے بھی زیادہ پسند اور
محبوب ہیں۔

ابن مہدی کا ایک دوسرا قول ہے کہ میں نے حماد سے بڑا عالم سنت کسی کو نہیں دیکھا اور نہ علم میں حماد، مالک اور سفیان سے افضل و اعلیٰ کسی کو پایا۔ ایک روایت میں ابن مہدی کے الفاظ اس طرح نقل کیے گئے ہیں کہ میں نے حماد سے بڑا کوئی عالم دیکھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ سفیان اور مالک کو بھی حماد سے بڑا عالم نہیں پایا۔

ابو عامر بیان کرتے ہیں کہ حماد بن زید کی حیات میں ان کی سیرت و اخلاق کے لحاظ سے دنیا میں ان کا کوئی مثل موجود نہیں تھا۔ یزید بن زریع انہیں سید المرسلین کہہ کر پکارتے تھے تبھی محمد بن مصطفیٰ کا ہمان ہے کہ انھوں نے بقیہ کو کہتے سنا

ما رأیت بالعراق مثل حماد بن زید میں نے عراق میں حماد بن زید جیسا کوئی آدمی
نہیں دیکھا۔

لے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰ لے العبر ج ۱ ص ۲۶۲ لے تہذیب ج ۳ ص ۱۰

لے تکررہ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۶ لے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۰ لے ایضاً لے ایضاً

دیکھتے ہیں ابراج کہتے تھے کہ ہم لوگ علم و فضل میں ۷۰ کو مسعر بن گئے اس سے تشبیہ دیا کرتے تھے بلکہ عبداللہ بن معاویہ کہتے ہیں کہ ہم نے حماد بن زید سے بھی حدیثیں سنی ہیں اور حماد بن سلمہ سے بھی لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو دینار اور درہم میں ہوتا ہے۔

حفظ و ضبط | قوت حافظہ کے لحاظ سے حماد بن زید معاصر ائمہ و علمائے خصوصی امتیاز رکھتے تھے۔
معلیٰ کہتے ہیں کہ حماد بن زید کو چار ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ اور ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی یہ ابن عیینہ کا بیان ہے کہ صفیان ثوری کو اکثراً میں نے ان کے سامنے۔ دو زانو بیٹھے دیکھا ہے۔
احتیاط | آپ ہم علم و فضل حماد بن زید روایت حدیث میں بہت احتیاط رہتے تھے یعقوب بن شبیبہ کا بیان ہے کہ حماد بن زید۔ حماد بن سلمہ اور دوسرے بہت سے ائمہ ثقافت سے زیادہ قابل وثوق ہیں۔ مگر ان میں کمزوری یہ تھی کہ وہ اسانید کو مختصر کر دیتے تھے۔ اور کبھی مرفوع کو موقوف بنا دیتے تھے۔ وہ غایت احتیاط کی بنا پر بڑے شکی ہو گئے تھے۔ بڑے عظیم المرتبت تھے۔ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی جس کی طرف وہ رجوع کر سکتے۔ اس وجہ سے کہیں سلسلہ اسناد کو آگے بڑھا کر حدیث کو مرفوع کر دیتے تھے۔ اور کبھی مرفوع حدیث بیان کرتے وقت بھی خون سے لرزاں رہتے تھے۔

فقہ | حماد بن زید حدیث کے ساتھ فقہ میں بھی بلند و ممتاز مقام رکھتے تھے ابوالاسامہ کہا کرتے تھے۔

کنت ان اس آیت حماد بن زید قلت
ادبہ کسی وفقیہ عن رضی اللہ عنہ
تم جب حماد کو دیکھو گے تو کہو گے کہ ان کو کبریٰ
نے ادب اور حضرت عمرؓ نے فقہ سکھایا ہے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰ ۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۱ ۳۔ تذکرۃ ج ۱ ص ۲۰۷

۴۔ تذکرۃ ج ۱ ص ۲۰۷ ۵۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۱

۶۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۰۷

ابن مہدی بیان کرتے ہیں کہ جس نے بصرو میں حماد بن زید سے بڑا فقیہ کوئی نہیں دیکھا۔
 فہمہ و دانش و نبوی امور میں بہت سرحد بوجہ رکھتے تھے۔ خالد بن خراش کا بیان ہے کہ حماد
 زید عقیلے روزگار اور دانشوران زمین میں سے تھے۔ ابن الطبرانی کا قول ہے کہ میں نے حماد بن زید سے بڑا
 عقلمند کوئی نہیں دیکھا
 وفات ۱۷۱ھ میں بصرو میں علم و فضل کی یہ شمع فروزاں گل ہو گئی تھی

حماد بن سلمہ

نام و نسب | حماد نام اور ابو سلمہ کنیت تھی۔ یہ بنو تمیم کے غلام تھے جسے
 تحصیل علم | یہ توتیہ نہیں چلتا کہ ان کی ابتدائی تعلیم کہاں شروع ہوئی۔ مگر اس وقت بصرو دینی علوم
 کا ایک اہم مرکز شمار کیا جاتا تھا۔ وہاں علوم دینیہ کے علاوہ ادب و لغت اور نحو و صرف کا بھی عام چرچا تھا۔
 اس لیے اغلب ہے کہ حماد نے بھی عام رواج کے مطابق ان تمام علوم میں ضرور کمال حاصل کیا ہو گا چنانچہ
 ابن عساکر الحنبلی رقمطراز ہیں۔

کان فصيحاً مفوهاً اماماً أئى العرنية وہ فیض، بولنے والے اور عربیت کے امام تھے۔
 امام زہبی نے دوسرے القاب کے ساتھ "النفوی" بھی لکھا ہے یہ
 شہوخ | ان کے اساتذہ کی فہرست بہت طویل ہے جس میں بے شمار ممتاز تابعین بھی شامل
 ہیں چند تابعین کے اسمائے گرامی شمار کرانے کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔
 وخلق كثير من التابعين فمن أجلهم ان کے علاوہ تابعین کے ایک کثیر گروہ سے انھوں

۱۔ تہذیب ابن حجر ج ۲ ص ۱۰ ۲۔ تذکرہ زہبی ج ۱ ص ۲۰۶ ۳۔ ایضاً ۴۔ المعراج ۱ ص ۲۴۳
 ۵۔ صفوة الصفوة ج ۳ ص ۲۴۳ ۶۔ شدات الذہب ج ۱ ص ۲۶۲ ۷۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲
 ۸۔ تہذیب لابن حجر ج ۳ ص ۱۲

نے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کے بعد کے لوگوں سے بھی۔

چنانچہ انھوں نے مختلف اساتذہ سے کسب فیض کیا اور ان کی بے شمار حدیثوں کے حافظ اور فقہ وقادی کے امین بن گئے۔ بالخصوص حدیث میں وہ مشہور تابعی شیخ ثابت البنانی اور حمید الطویل کی روایات کے خاص حامل تھے یہ

تلاسنہ زندگی کا بیشتر حصہ بصرہ میں گزرا اور وہیں انھوں نے درس و افادہ کی مجلس گرم کی۔ ان کے حلقہ درس سے بلاشبہ لاتعداد لوگوں نے فقہ و حدیث کی تحصیل کی مشہور اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

ابن جریج، شعبہ بن الحجاج، یہ دونوں حضرات عمر بن حماد سے بڑے تھے اور شعبہ تو امام قتیبہ۔ عبد اللہ بن مبارک، عبد الرحمن بن مہدی، یحییٰ بن سعید القطان، امام ابو داؤد الطیالسی۔

حدیث کے تمام مجموعوں میں حضرت حماد بن سلمہ کی روایتیں موجود ہیں خصوصیت سے ابو داؤد الطیالسی نے جو ان کے تلمیذ رشید ہیں اپنی مسند میں کئی سو روایتیں ان کے واسطے سے نقل کی ہیں۔ ایک مشہور اور طویل روایت ملاحظہ ہو۔

امام ابو داؤد طیالسی کہتے ہیں کہ ہم سے حماد بن سلمہ قیس ابن الریح اور ابو عوانہ تینوں صاحبان بواسطہ سماک بن حرب عن ابن المعمر الکنافی حضرت علی سے روایت کی ہے کہ

”جب ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مین کا قاضی بنا کر بھیجا تو ان کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ کچھ لوگوں نے شیر کو پھنسانے کے لئے ایک گڈھا کھودا اور جب شیر اس میں گرے تو اس کو دیکھنے کے لئے بڑا ہجوم ہوا۔ ہجوم میں دھکا کھا کر ایک شخص

گھسے میں گرا اور گتے وقت اس نے دوسرے شخص کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ جھٹکا کھا کر گرا چاہتا تھا کہ اس نے تیسرے کو بچڑایا اور تیسرے نے چوتھے کہ اس طرح چاروں گر پڑے اور شیر نے ان سب کو پھاڑ ڈالا اور وہ مر گئے۔ یہ اشخاص جن جن قبائل کے تھے ان میں خون بہا کے لیے شدید اختلاف ہوا اور جنگ تک نوبت پہنچ گئی حضرت علی کو اطلاع ملی تو وہ موقع پر پہنچے اور سمجھایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ چار آدمیوں کی جگہ دوسو مزید آدمیوں کا خون بہہ جائے۔ اگر تم راضی ہو تو میں فیصلہ کر دوں۔ ورنہ پھر یہ معاملہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرو۔ وہ لوگ آپ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ جن لوگوں نے گڈھا کھو دیا ہے وہ دیت ادا کریں۔ اور دیت اس طرح تقسیم ہوگی کہ پہلے شخص کے ورثہ کو پہلے دیت دوسرے کے ورثہ کو پہلے سے تیسرے کے ورثہ کو پہلے اور چوتھے کو پوری دیت چنانچہ بعض لوگ تو اس فیصلہ پر راضی ہو گئے۔ اور بعض راضی نہیں ہوئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قصیدے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا فیصلہ کروں گا۔ اسی اثنا میں ایک شخص۔ کہہ دیا کہ حضرت علی اس بارے میں یہ فیصلہ کر چکے ہیں حضور نے فرمایا "القضاء کما قضی علی" یعنی حضرت علی نے جو فیصلہ کیا وہی صحیح ہے۔

یہ تو حساد کا بیان ہے۔ اور قیس جو دوسرے راوی ہیں کہتے ہیں کہ

قاضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے فیصلہ کو نافذ فرمایا۔

اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن کے راوی محض حماد بن سلمہ ہیں وہ حدیث کے بیان کرنے میں غایت درجہ محتاط تھے۔ اسی احتیاط کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے امدادہ کر لیا تھا کہ حدیث نبوی کی روایت بالکل ترک کر دیں۔ مگر ان کے استاذ ابوب خنیفہ عالم رویا میں انہیں تحدیث کا

کلم دیا۔ تو وہ اپنے ارادہ سے باز رہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی خود حماد بن سلمہ کا قول نقل کرتے ہیں۔

ماکان من نیتی آن احدث حتی قال لی
ایوب فی النور حدث لی
حدیث بیان کرنے کا یہ ارادہ نہیں تھا حتی کہ
ابو ایوب نے مجھے خواب میں تحدیث کا حکم دیا۔
ابن الدنہ کا بیان ہے کہ یحییٰ بن زکریا کے پاس دس ہزار ایسی حدیثیں تھیں جو حماد بن سلمہ سے
مروی ہیں۔

ذریعہ خاص | امام وقت ہوتے ہوئے وہ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے مگر کس حد تک ہی منق
کفان کیے تھے چنانچہ سوار بن عبداللہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ:

كنت آتی حماد بن سلمة فی سوقة فاذا بیع فی ثوب
حبة اوجبتین شد حیویدہ و قام تلہ
میں بازار میں حماد بن سلمہ کی دوکان پر آیا کرتا
تھا جب کسی کپڑے میں ایک دو جہ فائدہ ہو گیا
وہ فوراً دوکان اٹھا دیتے تھے

یعنی جہاں سود رفت کا انتظام ہوا۔ کاروبار بند کر دیا۔

ہم عصر علمائے راے | حفظ و ثقاہت میں حماد بن سلمہ کم از کم اپنے معاصرین میں منفق و انظر تھے
مگر آخر عمر میں سود حفظ کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے بعض محدثین نے ان کی روایتوں پر جرح کی
ہے۔ امام بخاری نے ان سے روایت تو نہیں کی ہے۔ مگر ان سے مستشہاد کیا ہے۔ جس سے حماد بن سلمہ
کی ثقاہت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ امام مسلم نے ان سے متعدد روایتیں کی ہیں۔
امام بیہقی رقمطراز ہیں:

هو احدث ائمة المسلمين الا انه ثقا کبر وہ مسلمانوں کے ایک امام ہیں مگر بڑھاپے میں

مسلم حفظہ ظلہ اترکہ البخاری واما
ان کا حافظ خراب ہو گیا تھا اس لیے امام
مسلم قلیتہد و اخرج من حدیثہ
بخاری نے ان سے روایتیں نہیں کی ہیں مگر امام
مسلم نے جہتہا دیکھا اور سو حافظ سے پہلے کی جو
ثابت ماسمع سند قبل تخیرہ لہ

ان کی روایتیں ثابت النہانی کے واسطے سے ہیں
ان کو انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

کچھ تو سو حافظ کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی کتابوں میں کچھ لوگوں نے الحاق کر دیا تھا
انہی روایتیں لغو حدیث کی نظر میں مشتبہ ہو گئی تھیں سو حافظ کے بارے میں امام بیہقی کی رائے اور دیگر روایتیں
الحاق کے بارے میں امام عبد الرحمن بن سہری کا بیان ہے کہ

کانوا یقولون انھا رشت فی کتبہ
لوگوں کا خیال ہے کہ حماد بن سلمہ کی کتابوں میں
الحاق کیا گیا ہے۔

ان کا ایک ربیب ابن ابی العوجار نامی تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

فکان یدس فی کتبہ
ان کتابوں میں کچھ رد و بدل کیا کرتا تھا۔

تاہم ائمہ حدیث نے حماد بن سلمہ کے فضل و کمال کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن
حبل فرماتے تھے کہ جس شخص کو حماد بن سلمہ کی برائی کرتے دیکھو اس کے اسلام کو مشتبہ سمجھو۔ حافظ ابن حجر نے
قریب قریب یہی قول ابن عربی کا بھی نقل کیا ہے یہ

علامہ ائیں ابن عدی، عیسیٰ اور نسائی وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔ ابن عدی کے الفاظ

لاحظہ ہوں۔

وہامد من اجلۃ المسلمین و هو مفتی
اور حماد بن سلمہ اجلہ مسلمین میں تھے۔ بصرفہ

لہ تہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۱۳۳ لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۳

لہ تہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۱۵

البصری: وقد حدث عن من هو أكبر من
سناؤہ، لمحدث کثیرة واصناف کثیرة و
کے مفتی تھے۔ ان سے ان کے سن رسیدہ لوگوں نے
ریاضتیں کی ہیں۔ ان سے بکثرت اور مختلف النوع
حدیثیں مروی ہیں۔ اور ان کے مشائخ بھی لا اثنی
ذکر ہیں۔

زید و عبادت: علم و فضل کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کا سزا بردار تھا اور عبادت و ریاضت
زمرۃ تابعین اور اتباع تابعین کی ایک عام خصوصیت تھی۔ چنانچہ حماد بن مسلمہ بھی ان صفات ملکوتی
کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ شہاب بن معمر کہتے تھے کہ حماد اپنے وقت کے اہل تھے۔ ایک دوسرے
معاصر عفان کا بیان ہے کہ:

قد رأیت من هو أعبد من حماد بن
سلمیٰ ولكن ما رأیت أشد مواظبة
على الخیر وقراءة القرآن والعمل
لله من حماد بن مسلمہ
حماد بن مسلمہ سے زیادہ عبادت کرنے والوں کو دیکھا
ہے مگر ان سے زیادہ تسلسل اور کیسوئی کے ساتھ بھلائی
کرنے والا تلاوت قرآن کرنے والا حماد بن مسلمہ سے
زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔

امام عبد الرحمن بن مہدی جن کا زہد و اتقا ضرب المثال ہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ حماد بن مسلمہ
کے عمل کا یہ حال تھا کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ کل آپ کو موت آج ملے گی تو اس سے زیادہ عمل کیلئے
یہ گنجائش نہیں ہوگی۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ:

ان کا شمار مجاہد الہ عبادت عابدین میں ہوتا ہے۔ وہ

اپنے زمانہ کے اقربان میں فضل و کمال، دین و عبادت میں ممتاز
تھے۔ سنت کے سخت پابند اور اہل بدعت کے اثرات کو ختم کرنے
میں انتہائی کوشاں تھے۔

خود فرمایا کہ تھ کہ جو حدیث نبوی کو غیر ائد کے لیے (یعنی عزت و وجاہت کے حصول کے لیے) حاصل کرتا ہے۔ وہ خدا سے ذریعہ کرتا ہے لیے

وقت کی قدر ایک بار موسیٰ بنی اسرائیل نے اپنے شاگردوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں کہوں کہ بیخ من دین سلمہ کو کبھی ہنستے ہے یہ نہیں دیکھ آتو میں یہ سچ کہوں گا۔ وہ ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے تھے۔ یا تلاوت قرآن کرتے یا تسبیحات پڑھتے رہتے تھے۔ یا پھر نماز میں مشغول رہتے۔ انھوں نے پوسہ دن کو انہی کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا لیے

خدا کے عزوجل کے یہاں ان کے اعمال صالحہ کی مقبولیت ہی کی یہ علامت تھی کہ ان کا اتصال مسجد میں بحالت نماز ہوا۔ یونس بن محمد کا بیان ہے کہ:

ما ت حماد بن سلمہ فی المسجی و یصلی حماد بن سلمہ کی وفات مسجد میں بحالت نماز ہوئی۔

استغناء، اظہار حق اور اہل دنیا سے گزیرنے اور اہل دنیا سے استغناء اور اصرار کی صحبت سے گریز و مرہ تہ تابعین کی ایک عمومی خصوصیت تھی۔ حماد بن سلمہ اس خصوصیت و امتیاز میں بھی نہ صرف ان کے شریک و ہم تھے بلکہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں حدیث ابن جوزی نے ان کا ایک واقعہ بہت تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے جس سے حماد بن سلمہ کے زہد و اتقا اور خشیت الہی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اس واقعہ کی تلخیص درج کی جاتی ہے۔

مقاتل بن صالح الخراسانی کا بیان ہے کہ میں حماد بن سلمہ کے پاس گیا تو ان کے گھر میں ایک چڑائی کے سوا کچھ نہ پایا۔ وہ اسی پر بیٹھے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک چڑی کے کاٹو بیڑا جس میں ان کا سارا علم (یعنی روایات حدیث نبوی) بند تھا۔ ایک وضو کا برتن تھا جس سے وضو کرتے تھے ان کا بیان

ہے وہ ایک دن موجود تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے اپنی ٹونڈی سے کہا کہ دیکھ بیٹی کون ہے؟ وہ واپس آکر بولی کہ محمد بن سلیمان کا قاصد (غالباً یہ بصرہ کا امیر تھا) فرمایا کہ جاؤ کہہ دو کہ وہ تنہا میرے پاس آئے۔ وہ قاصد آیا اور اس نے ایک خط پیش کیا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ خط محمد بن سلیمان کی طرف سے حماد بن سلمہ کے نام۔ اما بعد۔ خدا آپ کو اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اس نے اپنے اولیاء اور اطاعت گزاروں کو سلامت رکھا ہے۔ ایک مسئلہ درپیش ہے۔ اگر آپ تشریف لائیں تو اس کے بارے میں آپ سے استفادہ کرتا۔ والسلام“

یہ خط ملا تو آپ نے بڑھ کر ٹونڈی سے کہا کہ قلم و وات لاؤ اور اس کی پشت پر یہ جواب لکھ دو۔

”اما بعد! آپ کو بھی خدا اسی طرح سلامت رکھے جس طرح اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں کو سلامتی عطا کرتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے علماء کی صحبت اختیار کی جو کسی کے پاس جایا نہیں کرتے تھے (اس لیے میں بھی معذور ہوں۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ سمجھتا ہے تو آپ خود تشریف لے آئیں اور جو دریافت کرنا چاہیں دریافت کریں۔ اور ہاں اگر آنے کا ارادہ ہو تو تنہا تشریف لائیے گا آپ کے ہمراہ خدم و حشم نہ ہوں ورنہ میں آپ کے ساتھ اور اپنے ساتھ خیر خواہی نہ کر سکوں گا۔ والسلام“

قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ٹونڈی کو حکم دیا کہ دیکھ کون ہے۔ اس نے کہا کہہ دو کہ محمد بن سلیمان! فرمایا کہہ دو کہ آجائیں۔ مگر تنہا آئیں۔ چنانچہ وہ خدمت میں حاضر ہوا۔ اور سلام کے کے بیٹھ گیا۔ اور ٹھوڑی دیر بعد بولا کہ کیا دھڑ ہے کہ جب بھی میں آپ کے ساتھ ہوتا ہوں میرے اوپر خوف و دہشت طاری ہو جاتا ہے

حماد بن سلمہ نے ثابت البنانی کے واسطے سے حضرت انس کی زبانی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب عالم اپنے علم دین کے ذریعہ خدا کی خوشنودی چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز ڈرنے لگتی ہے۔ اور جب وہ اس سے دنیا کے غزلنے چاہتا ہے تو اس سے ہر چیز ڈرنے لگتا ہے۔

محمد بن سلیمان نے پوری توجہ کے ساتھ یہ باتیں سنیں اور پھر کہا کہ یہ چالیس ہزار درہم حاضر خدمت ہیں، انہیں اپنی ضروریات میں صرف فرمائیں۔ حماد بن سلمہ نے کامل استغنا سے فرمایا کہ ان کو ملے جاؤ اور جن لوگوں پر ظلم کر کے انہیں حاصل کیا ہے ان کو دے ڈالو۔ وہ بولا کہ بخدا میں یہ اپنے خاندانی درخت سے دے رہا ہوں۔ فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں، مجھے معاف کر دو۔ خدا تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔ تم اس رقم کو تقسیم کر دو۔ وہ بولا کہ میری تقسیم یہاں اگر کسی مستحق کو نہ ملا تو وہ نا انصافی کی شکایت کرے گا۔ آپ نے اس سے پھر یہی فرمایا کہ مجھے معاف کر دیتے

اس طویل واقعہ سے حماد بن سلمہ کی زندگی کی کتنی درخشاں اور تابناک تصویر نکلا ہے۔ اسے سانس پھر جاتی ہے۔

وفات | ۶۷ھ میں بمقام بصرہ ان کی وفات ہوئی۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ حافظ ابن حجر نے ابن حبان کی روایت نقل کی ہے کہ حماد بن سلمہ کا انتقال ذی الحجہ کے مہینہ میں ہوا۔ عملی سال کے قریب پالی۔

ارلاد | حماد بن سلمہ نے متعدد شادیاں کیں۔ مگر کسی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ شہاب بن معمر کہتے ہیں کہ حماد کے اہالی ہونے کی بڑی علامت یہ ہے کہ انھوں نے ستر شادیاں کیں

لے صفحہ الصفحۃ ابن جوزی ج ۲ ص ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰

لیکن کسی سے ولاد نہ ہوئی یہ

تصنیف ادا پر ذکر ہے کہ حماد بن سلمہ کا شمار تبع تابعین کے اس زمرہ میں ہوتا ہے جنہوں نے تالیف و تصنیف کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی تصنیفات کی پوری تفصیلات نہیں ملتی صاحب شذرات الذہب نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

لہ تصانیف فی الحدیث لکھے حدیث میں ان کی تصانیف ہیں۔

ان کے متاثر شاگرد ابو داؤد الطیالسی کہتے تھے کہ حماد بن سلمہ کے پاس قیس کی کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب نہ تھی۔ اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر قسطنطینیہ لکھتے ہیں کہ کان بحفظ علمہ یعنی وہ قیس کے علم کے حافظ تھے۔

عبداللہ بن احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ قیس کی روایتوں سے انہوں نے جو مجموعہ تیار کیا تھا۔ وہ ضائع ہو گیا۔ تو وہ اپنے حافظہ سے روایت کرنے لگے بلکہ اس تفصیل سے بہر حال اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ حماد بن سلمہ نے صحیح و متروک کا کچھ نہ کچھ کام کیا تھا لیکن مکمل تفصیلات متداول تذکروں میں نہیں ملتی۔

Dr. Ismail al-Munajjaj, Derg

40352.....

2031975

۱۰ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۲ ۱۱ شذرات الذہب ج ۱ ص ۴۴

۱۲ تہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۱۵

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط

خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے وہ تمام خطوط اصل و ترجمہ یکجا کیے گئے ہیں جو خلیفہ اولؓ نے اپنی خلافت کے پہلے شوبہ اور دیگر مغیرہ دور میں حاکموں گورنروں اور قاضیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں ان کتببات اصغرین کے مطالعہ سے حضرت صدیق اکبرؓ کی لائق انتظامی خصوصیات اور طریق کار سامنے آتا ہے۔

قیمت عملدسات روپہ

معظم کی شہزادان

گلزارِ حشریت

بہ صیغہ و تقویم مولانا ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب

(۲)

حمد

۱	الہی تو عالم علام ایضوب	تو من بہین کشتا انقلاب
۲	سدا حق و تیوم قادر ہے تو	ہمہ وقت حاضر سوناظر ہے تو
۳	تو دانا تو بینا ہے صاحب کیم	تو خالق تو رازق رؤف الرحیم
۴	تو حاکم ہے حکمت میں روشن ضمیر	ہر یک ایک حکمت ترا ہے بے نظیر
۵	فلک کا مندرت خوب چھایا ہے تو	سورج چاند قندیل لایا ہے تو
۶	سورج (سول) دیکھو رز روشن کیا	رین کو ستاروں سول گلشن کیا
۷	دیاد دھرت کو دھیر پانی اوپر	دیکھو عام فوج بچا تیرا اوپر
۸	منکا حق اپنا آشکارا کروں	چھپا گنج غنی کو ظاہر دھروں
۹	اتھا گنج غنی میں مدت مدید	آتا آکے رہتے ہے جل الورید

لے ملام بہ تخفیف لام لے کشتا کا شین غیر مشدد لے مندرت خدپ کی تعویب لے برین سول
ستاروں کو گلشن کیا لے دھرت دھرت کی ترخیم زین لے دھیر دھرا افشاء لے صدر و ابتداء میں
ہر جگہ دیکھو کی یارخت۔

- | | | |
|--------------------------|-----------------------------|--------------------------------|
| ۱۰ | اتھا کج غصی میں تو شوق سون | نکل بھاسا یہ توفیق سون |
| ۱۱ | ایں آہنا ہجے آیا وکیل | ایں آہنا سب تو بولا دلیل |
| ۱۲ | احمد تھا سو برحق وہ احمد چو | وہی دیکھ احمد محمد چو |
| ۱۳ | اللہ سوں اول حق نبی کو کیا | دیکھو تب نبی کو خلافت دیا |
| ۱۴ | ایں آہنا ذوق لینے بدل | ایں خود وہ آیا ہے ہاں نکل |
| جگر مورا سخی ندارد (نعت) | | |
| ۱۵ | محمد رکھا نام لے پیا رسو | لطافت کیا (نبی) دل دار سو |
| ۱۶ | عجائب و برقعہ رسول کا لیا | چھپا راز عالم پہ نٹا ہر کیا |
| ۱۷ | نبی کو کیا دیکھ اپنا رسول | کیا سارے افعال اس کے قبول |
| ۱۸ | دیکھا جب اسے حسن الخلقین | کیا تب اسے سید المرسلین |
| ۱۹ | نبی پر کرم کہ نیا بت دیا | ادلو العزم اور خاتم الانبیا |
| ۲۰ | نبی پر مٹا کے زنت جبریل | سرا نو بہ نو حق سوں لاویں دلیل |
| ۲۱ | نبی کو بلایا ہے مسداج کو | دیا پیا رسول تخت اور تاج کو |
| ۲۲ | بلنے دیا بھیج براق کو | سنو ارا اسے ساز و براق کو |
| ۲۳ | نبی جانشین قاب قوسین کا | نبی کو دیا ملک دارین کا |
| ۲۴ | بلا لامکاں میں عزایت کیا | یہی فقر کا دلق خلعت کیا |
| ۲۵ | نبی کو دیا تاج لولاک کا | کیا بادشہ تخت اخلاک کا |
| ۲۶ | نبی کے کیا کاج ارض و ملک | نبی کے کیا کاج جن و ملک |

لے دولوں میں مصروف میں لفظ "اینا بالمد" (آہنا)۔ لے اول کا واو غیر مشدود لے اپنا بالمد (آہنا)۔
 لے برقعہ، برقعہ، رسول کا واو تخت ہے ساز و براق سو۔ ملک لے براق، جمع یاد رکھتے ہیں،
 یہاں پر تشدید رائے پہلے، کج کاج، برائے، واسطے۔

۲۷	نہی کو دے فرمانِ قرآن یو	مہدک دیا بیچِ فرقان یو
۲۸	نبی کو دے قلبِ خیر البشر	دیا معجزہ دیکھ شوقِ القلم
۲۹	نبی کو مقرب دیا چار یار	تصدق سنوں جہنم کے جہاں برقرار
۳۰	نبی کے کئے یار یو غار تھے	ابا بکر صدیق غمِ خوار تھے
۳۱	یو دوسرے دیکھو عمر خطاب ہیں	دنیا دین کے سچ وہ متاب ہیں
۳۲	یو تیسرے کئے یار عثمان تھے	اکو اکل حیا اور ایمان تھے
۳۳	چوتھے (ہیں) علی شاہِ دلدل سوار	کئے ہیں جسے صاحبِ ذوالفقار
۳۴	نبی پر کم کر نبوت دیا	علی کے حوالے ولایت کیا
۳۵	علی کے ہیں نائب ہر اک شہر ہیں	ہر اک ملک میں اور ہر یک دہر ہیں
۳۶	ہر یک اشیر میں دیکھ اصحاب ہیں	ہر یک دہر میں قطبِ اقطاب ہیں
۳۷	علی نے ملک سب دیاں کھینے	ہر یک ملک کو ایک والی کیے

جگہ موافقہ نذر (خواہد بین الدین من ہجری چشتی۔ م چھ رجب سنہ چھ سو تیس پر تین)

۳۸	دیئے ملک خواجہ کو سب ہند کا	جہا ہند کا اور جہا سند کا
۳۹	کئے توجہ ہند الولی شاہ کو	عظمتِ لقب شدہ کو درگاہ سو
۴۰	دیا تخت حق شدہ کو جمشید کا	ہے جس کے نیچے ملکِ سمیر کا
۴۱	ابھیال کو شاہ نے زیر کر	کئے تخت گرفتار نے امیر کر

لے گئے کہتے (ہیں کہ) لے دیکھو کی یافت۔ لے عمر کا میر ساکن : لے تیسرے کی یافت —
 وہ چہ تھے کا طاوخت اسی طرح صدرا جدا کا ہر وہ لفظ جو سکون نانی ہے باسقاط طے حاجائے صا یا
 متحرک لے ملک کا لام متحرک، لے نیچے کی پائے اولخت۔ لے سمیر: سمیر (بضم سین و کسریم)
 پائے پہل کے بعد لے پہل) ہندو دیو مالاکا کی رو سے زروچا ہر کا وہ پہلا جو دیوتاؤں کا سک
 ہے۔ لے ابھیال میں الف نائدہ

۴۲	شہنشاہ نے ٹھانے کیے دین کا	کیے دور بنیاد اس میں
۴۳	دیکھو توجہ بھاگا ہوا تھی راج	چلے شہنشاہ پو کچھ صلاح
۴۴	ٹھا بھائی اس کا اچھا تھا	تھر کر جادو میں بد چال تھا
۴۵	بہت کر جادو چلایا اول	نہیں سحر طہا، چلا تب نکل
۴	چلا اڑ کے جلسے کو دریا کے پار	اتکے اسے شہ نے کشاں سدا
۴۶	کرامت شہنشاہ کا دیکھ کر	دیکھو تب یو خلقت نے مانا
۴۸	کھل دی آج خواہ ہے او	دنیا دین کا دیکھو راجہ ہے او
۴۹	پرستش کریں جن (و) انسان مل	دو عالم دیکھو شہ سول باہر میں دل
۵۰	دیکھو عجب سول یو قطب روشن ہوا	ہندوستان تب سول یو گلشن ہوا
۵۱	یو قطب یو قطب اقبال ہے	دنیا دین کا سچ یو مہتاب ہے
۵۲	کتے ہندوستان یو گلشن ہوا	ہندوستان تب گلستاں ہوا
۵۳	یو برحق دس سچ ہے قطب الزماں	نماں یو تب سول یو امن و امان
۵۴	یو خلقت ہے قرآن قدرت اوپر	یو کیوں قطب یازمیں کے اوپر
۵۵	قطب دین تو نام ہے شاہ کا	اجالہ سے کھلا اوپر ماہ کا
۵۶	دلی شہر میں قطب اظہر ہوا	ہندوستان تب سول منور ہوا
۵۷	عجب نور تھا کھلا اوپر ذات کا	دسے چاند چوں چودویں رات کا

لے رہا ہے بکسر اول۔ ناقص، کم، اندک۔ یہی لفظ بیت ۱۸۹ میں بھی آیا ہے۔ تھہ طہ.... توجہ بھاگنے لگے
 تھہ سحر میں چلے جلے متحرک۔ اور آئندہ بھی صدر وابتدا کا ہر وہ لفظ جو بسکون ثانی ہے متحرک پڑھا
 جائے گا یا باسقاط تھہ اول پر تخفیف واؤ۔ تھہ امر۔ متحرک میم۔ تھہ طہ.... دلی دیکھ کر سچ لگے۔ تھہ
 تھہ ہندوستان کا داؤ بیہاں اور آگے فتا تھہ اقبال۔ بغیر رخت تھہ ہندوستان کا داؤ خشت تھہ
 داؤ خشت اللہ دلی کا لام غیر شد داسی طرح صدر وابتدا کا ہر وہ لفظ جس میں ثانی ہے تخفیف پڑ جائے۔

- ۵۸ کریں شاہِ ہر دم رو کا نہ ساز ہوا کشفِ تب شہ پہ راز و نیاز
- ۵۹ قطبِ دینِ برحق سچا پیر ہے سچا پیسے اور جہاں گہر ہے
- ۶۰ دیکھو شاہ کو خواجہ خواجہ کیے دو عالم میں دکھلا اجالا کیے
- ۶۱ مرید دیکھ حق جس کو ایسا دیا کتے زائداں میں اُسے انبیا
- جگہ معزز سرخی نزارو (شیخ فرید الدین گنج شکر ۵، محرم سنہ سات سو ساٹھ)
- ۶۲ مبارکِ عجب نام ہے شیخِ فرید مریدوں میں شہ کے بڑے محقق
- ۶۳ کچے سیر سب بڑ اور جسم کا ہریک ملک کا اور ہریک شہ کا
- ۶۴ نہ دیکھے خدا کو بیابان میں یہاں آکے دیکھے ہیں یک آن میں
- ۶۵ کمک برس لگ شیخِ جنگل پھرے مطالب یہاں آکے حاصل کرے
- ۶۶ بھوکے رہ کے جنگل پھرے سو اجر کیے شیخ اٹھی پتھر کو شکر
- ۶۷ مشرف ہوئے شیخ جب پیرسوں سوا اس قطبِ دین شہ گنہگاروں
- ۶۸ تصدق دیکھو پیر کا راز سب ہوا کشفِ رویت دیکھو وار سب
- ۶۹ جگمگائی پیر کھڑے سو اصل ہوئے جسے پیرئیں سوں وہ جاہل ہوئے
- ۷۰ پریش کیے شیخ جب پیر کا کرم تب ہوا اس جہاں گیسر کا
- ۷۱ لاکھ کہیں عرش پر اولیا بلکے زایدوں میں وسا انبیا
- ۷۲ اجرت ہو شیخ کو رنج کا ہوا تب لقب یوں شکر گنج کا
- ۷۳ اول والدہ شہ کے راشد ہوئے دیکھو شیخ تب سب کے مرشد ہوئے
- ۷۴ دیکھو چارہ پر رسول جب آئے ہیں وصلِ حق سوتب شیخ نے پائے ہیں

لے ۵:..... میانہ نماز سے دونوں مصرعوں میں "سچا" کا جیم فارسی غیر مشدد سے مرید کی یاخت
 کے شیخ اور فرید دونوں کی یاخت سے فارسی شکر کو کے شیخ اٹھی پتھر۔ غالباً خطائے کتابت ہے لے ۵: دیکھو
 سے دونوں مصرعوں میں دیکھو کی یاخت سے بلکے تحریر نام۔ بلکہ کا غنفت سے وصل کا صا و محرک۔

جگہ معرصرخی غدارد (خواجہ نظام الدین - م سترہ بیچ الاول سنہ سات سو پچیس)

۷۵	انامہ رح کرتا ہوں اس پیسہ کا	نظام دین اس شاہ گنج پیر کا
۷۶	سچا پیر شاہی نظام اولیا	سچا اولیا اور سچا آفتاب
۷۷	مشرائع تھے اور تھے بادشاہ	دنیا دین کے وہ تھے تاج شاہ
۷۸	دیکھو شاہ نظام دین برحق ولی	کیا سب پہ ظاہر خفی اور حبلی
۷۹	اتنے ہر روز درگاہ سول	اتھا روز دو لاکھ اس شاہ کول
۸۰	یوسف و شہنشاہ کا عام تھا	فراواں کنگ جس کا طعام تھا
۸۱	تصرف اتھا شاہ کا بے شمار	گلاؤنت تھے شاہ کے کئی ہزار
۸۲	جنت سرکتے شہ کے قوال تھے	ہو قوال خود مست احوال تھے
۸۳	کبھی گائیں جب وہ حسینی مقام	محال کو تب حال آدمے تمام
۸۴	کبھی شوق میں آجھاویں رہا ب	نہ رہتا تھا کچھ بھی عالم میں تاب
۸۵	کبھی مست ہو چنگ بازی کریں	اور مشاق کی کار سازی کریں
۸۶	بجاویں کہیں سول لیاؤ	کریں یا رکاز سب آشکار
۸۷	اکا بر مجالس میں راتے رہیں	سدائے محبت سول ملتے رہیں
۸۸	اتھا شاہ کے ہاتھ جم کا اوچام	پیا سو ہولے او تحصیل تمام
۸۹	اتھا ہاتھ میں شہ کے آب حیات	پیا سو وہ مرنے سول پائیا نجات
۹۰	پیا سو دیکھو تو چ فاضل ہوا	اکال ہوا اور واصل ہوا

۱۔ نظام کا الف خت ۲۔ شاہ اور نظام کا الف خت ۳۔ اس کا دوسرا مصرعہ کذا فی المخطوطہ منی واضح نہیں ہوئے ۴۔ طعام کا مین خت ۵۔ بختر - سازندہ بجانے والا کہتے ۶۔ کتنے ہی تھے جینی مقام اصطلاح کوئی پر مرود کے بارہ مقاموں میں سے دسواں مقام ۷۔ کذا فی المخطوطہ - نواٹے کے معنی معلوم نہ ہو سکے بظاہر کے معنی ۸۔ ہستی کا کوئی تار دار مضارب سے بجانے کا اگر معلوم ہوتے ہیں محض اندازہ رنگ کرنا بحیثیت کے رنگ میں رنگ ۹۔ تفصیل کی یاخت ۱۰۔ دیکھو کی یاخت

- ۹۲ عجب جام رکھتا ہے تاثیرہ او پیاسو ہوا ہے کتے پیسہ او
۹۳ اسی کام میں شاہ مشغول تھے اسی کام میں حق کے مقبول تھے
۹۴ لقب ہا کو شیخوں میں سلطان ہے یو برحق دس اظہل سبحان ہے
در بیان روانہ شد (بن) مکن (منتخب الدین) مسات ریح الاول منہ سات سو نو
۹۵ امریک دن یوں ہوا شاہ کو ہوا دیکھ ہاتھ یو درگاہ سو
۹۶ روانہ کرو منتخب شاہ کو دعائی کرو اس قول شاہ کو
۹۷ ہر یک علم میں خوب لائق ہے یو ولایت کی قوت میں فائق ہے یو
۹۸ ہٹا کر اُسے تم مقہور کرو اسے ملک کھن پہ صادر کرو
۹۹ روانہ کیے شہ نے ان کو اول فرست میں کال دیکھے بے بدل
۱۰۰ برابر دیئے شاہ نے ادلیا برابر دیئے شاہ نے اکتیا
۱۰۱ کک ملک طے کر کے یاں آئے جہ امر پیر کا سب بجالائے تب
۱۰۲ ولایت کی تشریف سب پائے تھے اُسی کچ قوت سویاں آئے تھے
۱۰۳ غمزدہ دیئے ہانگ شہ نے پکار بنج کے کیے دین کو م شکار
۱۰۴ ہوا ہانگ یو ملک میں سب نشتر نراسن کا فرمے سب پھتر
۱۰۵ بلوے میں جا کوئی نظر را کے ہمارا سخن اوچ باور دھرے
۱۰۶ کھڑو کر دین روشن کیے بنی کاچن پھر کے گلشن کیے
۱۰۷ کیے مار کر زیر کف سب خسرو کیے شاد سنسار سب
۱۰۸ ہوا غلط شاہ کا دہسہ میں ہر یک ملک میں اور ہر یک شہر میں
۱۰۹ سدا حق سول غلت اترتا تھا سدا بیا حق اُن پہ دھرتا تھا

لے ہاتھ ملا دھائے ہاتھ ملے قول : بفتح حق دسیراؤہ نیاسہ اول کا داؤغیر مشد لے دیکھے : یاے
اول خت ۵ برابر ساتھ لے نشر کا شین متوک : ط = ہوا ہانگ کا لٹج

- ۱۰۹ اترائے ہر روز گاہ سوں سدا فربہ نخلتوں شاہ کن
 ۱۱۰ اترائے کسوت سدا زری اموک رتن ہے بدل جو ہری
 ۱۱۱ طبقے کے اوشاہ سر پر دھری ایس جین کر شاہ بخش کریں
 ۱۱۲ زمیں ہونڈیاں میں ہوا نقش جب لقب تب ہوا فخر کوز بخش اب
 ۱۱۳ یوز بخش ہر باب میں خوب تھے اسی بات ہر حق کے محبوب تھے

حکایت دخترِ جمود مراد یافت

- ۱۱۴ کتے یاں کے راجہ کر مٹی تھی ایک چند سو رکھا تار شک جس کو دیک
 ۱۱۵ کتے ایک دن گھر سو باہر نکل بڑے شوق سوشہ کو دیکھیں بدل
 ۱۱۶ برادر سہیلیاں کملے ذوق سوں بدل دیکھنے شاہ کو شوق سوں
 ۱۱۷ دیوانی ہوئی دیکھ جاہ و جمال مسخر ہوئی دیکھ شہ کا جمال
 ۱۱۸ رتن جوت لے بات میں آرتی کھڑی ہو رہی شاہ پر دارتی
 ۱۱۹ سہیلیاں سب دور سے جو نک جانے کھڑی ہو رہی سامنے بات باند
 ۱۲۰ کتے ایس آواں سو خالی اتھی نہ تھا اس میں پانی کتے تک رتی
 ۱۲۱ کبھی دل میں یو بایں پانی بھرے کہوں گی بڑے پیڑیں یو کھرے
 ۱۲۲ اتھا کشف فراہ کو علام الغیوب عنایت اتھا سب کشف القلوب
 ۱۲۳ دیکھے بایں پرشہ نے بھر کر نظر اہل کر ملی بایں سنے سو بحر
 ۱۲۴ عرس کے بدل خلق آتے جتے ہنوز لک اُسے سنا ہاں کتے

لے پین کر پہن کر ملے رشک کا شین متحرک، ملے بدل، برائے ملے زن جوت، ایک پوجا کھوں کے لئے
 منیہ بھاتا ہے تارقی "بروزن آری" میں پتیل کا تھاں جس میں روشن کی ہوئی تیاں ہوں وہ طہ کھڑی
 کی بجائے "کی" خلک تہ بایں، باول ملے برے، بقیع بائے موجدہ ورائے ہولہ پھر پھر تو متب تو۔ ہاں
 لکھنا تھاں (ہے علام کلام غیر مشدود) کشف کا شین غیر مشدود ملے سنے، سنے (ہ زرد زہب) باسٹا
 مالو وشد میر لون ملے سنا بایں، سونا باولی۔

۱۲۵	بہت دیر شے کیے تب مقام	سوہدا زکیے کوچ دار اسلام
۱۲۶	وصل کا خبر شاہ نے پائے کر	شکر حق کیرا تب بجالائے کر
۱۲۷	ہلا کر نزدیک شاہ برہان کو	جہالت بھرے سیف رحمان کو
۱۲۸	گلے کو لگا کر تہا دیے	کھک راز غنی عنایت کیے
۱۲۹	دلا سادیے پیرنے پیار سوں	کرم لے کیے اپنے دلدار کوں
۱۳۰	اتانچہ کو حق سوں ہولے امر	کہہ دے (بھی) صادق سودھن اوپر
۱۳۱	کئے دین کا فوج سب سات دیے	علیم کی علیبت یہ سب بات دے
۱۳۲	روانہ کیے شاہ نے شوق سوں	چلے شاہ برہان لے ذوق سوں
۱۳۳	دیے ساتھ سارے محاسن تمام	جتنے پاس حاضر تھے خاص و عام
۱۳۴	کیس سوں دیکھو ایک فاضل آئے	اکوال اتھے اور واصل اتھے
۱۳۵	نیت خیر فدا کر پڑے اور چلے	کھک اولیا راہ میں آئے
نکلم میر علیہ السلام دینا (باں) چہا روہ صد اولیا گرفتہ آمدہ بودند		
۱۳۶	ولی چاروہ صد دیے سات میں	ادکال (اتھے) سچ ہر یک با میں
۱۳۷	بڑے دیوبے سوں چلے فوج کر	مثل سمور دیا کے جیوں موج کر
۱۳۸	لقب حق سوں جس شاہ برہان ہو	ہر یک ٹھانڈا شکل کوڑ ساں ہے
۱۳۹	برا بھگوشی ادا کیا آئے تھے	جگوں جو شہنشاہ سوں دل لائے تھے
۱۴۰	وتیاں کو کچے شاہ نے سرفراز	کئے تب سوں برہان غریب انواز
۱۴۱	نہاں میں کئے سیف برہان ہے	ہر یک بات تفسیر قرآن ہے

لے دیں وہیں۔ دن مکہ نزدیک کمال اور یادوں خست لے ہر کایم متحرک۔ لے علیم کی یافتہ فاقہ میں
 حاتم علی ساکن۔ تہ ط: مثل سودریا لے لے حکوی و جو کوئی تہ سیف، یکن تازہ تاثیر و عا شہ برہان -
 آشکارا و ظاہر یعنی دیکھا اس طرح آشکارا ہو جائے کہ انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔

۱۴۲	جتنے لڑھیں راؤ رامیاں اتنے	پُچھانے جو کوئی مرد دانا اتنے
۱۴۳	اور سبھی دھریا شاہ کی لڑھیں	تصرف کریں لاکھ درگاہ میں
۱۴۴	سُن آئے سب شہ کو راجہ تمام	جتنے راؤ دانا و پرجا تمام
۱۴۵	جتنے چتر دھاری پرستش کریں	جواہر امولگ تھلا دھریں
۱۴۶	ملک در ملک اور شہر در شہر	چلے آئے تب دولت آباد پر
۱۴۷	امر میر کا نب بجالائے ہیں	مبارک ساعت پر بیٹا آئے ہیں
۱۴۸	ہوا غفلت ملک میں شاہ کا	اُجالا ہوا اس نول مساء کا
۱۴۹	عجب نور زل اُتھا بے مثال	منور دسے چاند سوں جگ اُجال
۱۵۰	درس دیک کر اس شہر مار کا	ہوا خلق مشتاق سنسار کا
۱۵۱	جو دیکھا سوشہ کو مسخر ہوا	بہر دور ہوا پاک انور ہوا
۱۵۲	کچے وازارشہ نے وحدت کی بات	دیکھو تب یو دھن نے پایا نجات
۱۵۳	کچے کھول کر راز من عرف کا	دیئے آشنائی نقد عرف کا
۱۵۴	کھولا خلق پر حبیب (کہ) عبی تمام	ہوا کشف عالم یہ وحدت تمام
۱۵۵	ہوا بانگ سب ملک میں پیہر کا	سوا اس پیہر برہان جہاں گیر کا
۱۵۶	کنک لاکھ آکر یو اہل ہنود	دما دم کریں آکے سار (سے) ہنود
۱۵۷	ہر اہر جتنے ادلیا سات تھے	نفعی فائدہ ہوا کرا ثبات تھے
۱۵۸	دیئے ملک سب بات کر شاہ نے	سوا اس شاہ برہان جم جاہ نے
۱۵۹	شہنشاہ نے دیک سارے فقیر	ہر ایک تھار بیٹھے میں سب ہو یکے

لے ٹھویں - زمین لے سون - من چھتیں بروزن بلن - ہوا - مادی لے چتر دھاری - صاحب چتر لے امولگ
 اوقیت لے شہرہ کا لے ہنود تھوکر - لے ساعت کا الف خت لے نزل - بکسرون و فتح یم - لے غبار -
 صاف - جھ اُجال - اجلا - ملک دارہ روشن لے سنسار بروزن جنہال و شمشاد - دنیا لے دونوں مصرعوں
 میں - عرف - گارائے ہندوستان لے عہدی یعنی وحدت لے بانگ - شور - لے ط - ہاتھ کر -

۱۷۹	عنایت ہے اس شہ کو گنجِ ظلیل	دیباچہ شہنشاہ کورب الجلیل
۱۸۰	زمیں اور زماں سب یں مشتاق ہے	شہنشاہ بہ قربانِ آفاق ہے
۱۸۱	فقیروں اتھے شاہ کے کئی ہزار	کہاں لگ کرے کوئی ان کا شمار
۱۸۲	کتوں کو رہے بھیج سردار کر	کتوں کو رکھے شاہ نے پیار کر
۱۸۳	کنک یا ر اس شہ سوں دلا ر تھے	شہنشاہ سو پہل میں کے غمخوار تھے
۱۸۴	مجالس میں قوال گاتے رہیں	آپیں شاہ خود دست ماتے رہیں
۱۸۵	بجز راگ و گھر نہ کچھ کام تھا	سدائے محبت کیر احبام تھا
۱۸۶	یکانیک یک دس دینا مکار	کتے یک نزاکت سواپ نہیں مکار
۱۸۷	رکئی آ کے مسجدہ شہنشاہ کو	سو اس شاو برہان جم جاہ کو
۱۸۸	پچھالے شہنشاہ نے عیار ہے	یورنیا بڑی شوخ مکار ہے
۱۸۹	وے شہ نے دیکھے کتے اس طرف	نہ بولے کتے اس تے کچھ یک حرف
۱۹۰	قبولے نہیں شہ نے اس ہیں کو	اوبانے اتھے دل دیکھو دین سو
۱۹۱	دنیا جھانکتے دیکھ پھنکر کو پھوڑ	نکلے ہیں تب سول یونسے کے موز
۱۹۲	ہنوز لک اور ہار دیکھ جھاڑتے	کثافت او سب جھاڑ کر کاڑتے
۱۹۳	اتھا جھاڑ گنبد کے نزدیک ایک	حرج وہ گنگوروں کو دیتا ہر یک
۱۹۴	نیگے خادماں جھاڑ کرنے کو دور	ہوا خادماں کے اوپر لا ضرور
۱۹۵	عشرت کیا سبب یاں یو خرے کا جھاڑ	ایتا جھاڑ گویاں سو شٹنا اکھاڑ
۱۹۶	کتے ایک فیل پر دیکھو جھاڑ او	پھرا ہے نٹ اپنا کاڑ او

لے مکار، مکار، تجنیف کان، لے آپ نہیں، آپ سے، خود ہی سے، عین، ع، نفع ہائے ہونہ دلائل مکرور
ہیں، ہا، بکسر ہائے ہونہ، عالی، مشرک، مردود، بے حقیقت لے دیکھو کی یاخت عہ سنے پیغم ہیں ہونہ
لے ہونہ، موز کا، موکا، پودا لے لا ضرور، لا بد، عہ سنا، تلف کر دینا، بیک دینا لے دیکھو کی یاخت

دیکھو چار نرے کا جب خم ہوا	۱۹۷	سفر سے دیکھو عالم ہوا
کرامت یونٹا پر دیکھو پیر کا	۱۹۸	سواں شاہ برہاں جہانگیر کا
غنمشاہ تہجد کا کرتے نماز	۱۹۹	کیا چور نے دست پناہ دراز
دیکھو کفشی لے کر چڑیا کوہ پر	۲۰۰	فجر نہیں ہوا ایک ہوا ہے پھتر
صحن میں اتھا بھار یک بار بار	۲۰۱	دسے جیوں کے محبوب اوگل غدار
یکایک ہوا خشک دیکھو ادبھار	۲۰۲	کچے خادماں اس کو سنا اکھاڑ
لیک دن کو ادبھار ہو سبز تر	۲۰۳	لگے ہیں اُسے پھول اور یہ ثمر
ہوا ملک میں بھار کا سب نشتر	۲۰۴	ہوا بھار بھی بھر کے اوسبتر
یہ قدرت سکت دیک اس پیر کا	۲۰۵	تصدق ہوا خلق جو دھیر کا
مرے باب کی شرم ہے اُسے	۲۰۶	شہنشاہ برہان کہتے جسے
درصفت (سید یوسف) شاہ (۵)، راجو قتال حسینی قدس اللہ سرہ (۶) باغی شمال سنہ سات سو تیس پر لکھا		
شہنشاہ راجو کا کرتا ہوں میں	۲۰۷	مطالب دو عالم کے دھڑا ہوں میں
دیکھو شاہ راجو یو قتال ہیں	۲۰۸	سداق سولہ لکھ کے خوشحال ہیں
حواشہم کو شاہ نے خوب لاٹ کر	۲۰۹	ارے کو جڑوں سے کاٹ کر
کتے پانچ موزی پوسر کش اتھے	۲۱۰	کیے قتل شہنے او موزی جتے
دیکھو توج قتال القاب ہے	۲۱۱	فقیری کو سچ علم کا باب ہے
جمالت جلالت بھی دھرتے ہیں او	۲۱۲	سرفراز عالم کو کہتے ہیں او
ہے علم لدنی بو تھیل تمام	۲۱۳	چلا توج عالم میں شہ کا کلام

لے دیکھ کر یافت لے نشتر کا شین متحرک لے چودھیر چار دانگ عالم چودھار چودھیر دال مہلہ
اصل بالعم یعنی ابتداء انتہاء کنہاء سب کل لے دلی دلی ... ملک عہ حواشہ حواشہ حواشہ
کے سین کا سقوط برائے تخفیف نیز لے میت ۲۱۲ لے خوب کا داؤخت لے د... کا ذکر ملک
نے تحصیل کی یافت

- ۲۱۳ ہوا شاہ راجہ بوب نام ہے سدا حق تے ان پہ انعام ہے
- ۲۱۵ ہوا تھا کتے حق سوں شر پر امر کردار مشکوف عالم اوپر
- ۲۱۶ بنی کے ہیں ناب تمیں رہ نما نصیحت کرو کھول سب پر عیاں
- ۲۱۷ دیکھو توچ تختہ نصائح کیے امراور نہیں داڑ کر سب دے
- در بیان جن غیر شرکذانی الخطوط قدس اللہ سرہ (م۔ انیس) مغر نہ سات سوسات سنتیلا از تہیج (م)
- ۲۱۸ بڑے یار نہ کے تھے یو امیر حن شیر شعرا ہیں روشن نمیر
- ۲۱۹ شہنشاہ کا ان پیر پیار تھا کتے ان پیر بار اسرار تھا
- ۲۲۰ دیکھو شر کے فن میں کامل تھے وہ فاضل تھے اور واصل تھے
- ۲۲۱ مقرب ہوشہ سات رہتے تھے او ہر یک علم کی بات کہتے تھے او
- ۲۲۲ شعر کا نیکو کا عجیب شان ہے دیکھو توچ مشہور دیوان ہے
- در صحت پیر تین دہتری (۹)
- ۲۲۳ عجب پیر تین دہتری کتے او دہتری دیکھو حق کو اڑی کتے
- ۲۲۴ جو کوئی تین دہتری اوکر تا قبول اسی بل میں ہوتا ہے مطلب صول
- ۲۲۵ عقیدت سے جو کوئی چاہتا ہو او جو کچھ دل سے منگتا سو پاتا ہے او
- ۲۲۶ نہ گنبد قبولے نہ دیوار چہار حشرک رہنا یوں ہی ان کا قرار
- ۲۲۷ بجز حق کسی سات بولے نہیں اور میت بجز کچھ قبولے نہیں
- ۲۲۸ مقرب تھے شاہ کے یک مرید تھا نام ان کا کتے شیخ فرید
- ۲۲۹ بہت شر کہہ مارے تھے وہ حبیب مودب تھے کرتے ہیں احرب

۱۔ امیر کاہم متحرک ۲۔ ادب کا واؤخت ۳۔ منہ کی پائے ہوز متحرک ۴۔ دہتری، بالفتح، ایک پیسہ دہ
دھیلے، ایک دھیلہ، دو دہتری، ایک دہتری، دو دھیلے ۵۔ چاہتا کا الف اول غت
۶۔ شیخ کی یافت۔

۲۳۰	ہمیشہ رہیں اہل دیکھو کوہ پر	اوجھپ کر رہیں نت کھٹے کے پھتر
۲۳۱	کدی دیکھنے شہ کو آتے رہیں	دُرس دیکھ شہ کا اوجا تے رہیں
۲۳۲	سدا ان پہ لازم یہی کام تھا	بجز شہ کو دیکھیں نہ آرام تھا
۲۳۳	اتھے شاہ دولت یو در ہا۔ میں	اور بتے تھے شاہ کے پیا رہیں
۲۳۴	نہ تھا ان کو کچھ کام دُوری مئے	رہیں شاہ کی بت حضور ی مئے
۲۳۵	عجب کچھ لطافت اتھا شاہ سوں	سواں شاہ برہان جم جاہ سوں
۲۳۶	بجز شہ کو دیکھ نہ تھا کچھ اسلام	رہیں توج بل بل کے ہر صبح (و شام)
دُشنا (کے) خود میر صاحب تھیں سرہ (م) دس ربیع الآخر ۸۵۷ھ سوچو بہتر جبریدی		
۲۳۷	خلیفہ تھے شاہ کے خوند مسیر	ہر یک علم میں اوانھے بے نظیر
۲۳۸	ہر یک باب کا علم تھا مات میں	پھر اویں زمانے کو یک ساعت میں
۲۳۹	خلافت شہنشاہ سو پائے تھے	علی کا علمیت بھی سکھلائے تھے
۲۴۰	کہیں واکر شاہ رویت کی بات	کہیں کھول کر مَن عرف کا بہکات
۲۴۱	یورہ راست حق کا چلاتے تھے	ثُرت حق سوں لے جا لیتے آتھے
۲۴۲	ہر یک علم میں وہ اتھے بے بدل	ہر یک ایک شکل کو کرتے تھے حل
۲۴۳	ہر وقت شہ سوں ہم دم اتھے	شہنشاہ سوں لہجہ محرم اتھے
۲۴۴	اتھا کشف ان پر لو گنج نفی	ابیں خود ہوئے تھے وہ حق میں نفی
۲۴۵	کریں شاہ ان سوں تصوف کی بات	جو کچھ جو چھپے گنج کے (تھے) بہکات
۲۴۶	کمل ولی سب تو یو یا رہ تھے	او گنج رواں شہ کے غمخوار تھے
۲۴۷	کئے شوق رسول (اقول) کریں	ہر یک انکے نان کلبا دھریں

لے کوئے۔ کھو بات منتوج کے لہ ہاں جز مخلوط التلفظہ زیریں اناہ رکھنے کا مسطح و مستطیل لہ

لے آرام کا

۲۴۸	ہمیشہ کتے شاہ کا شرط تھا	یہی شرط تھا اور یہی بہت تھا
۲۴۹	اتھا ملن مشتاق، یو بہت دیک	اوجھش کریں سب کو پیر سے، ایک
۲۵۰	سراں ہے اس نانوہں سنبھال	لقب تب چلے یو گنج رواں
	درصفت اکمل علی عرف شاہ (۵) کالے قد (س) سترہ	
۲۵۱	یو اکمل ولی شاہ کالے اتھے	دنیا دین کے سچ اجلے اتھے
۲۵۲	جاس میں شے کے اوچوں شے تھے	مردیل منے شے کے اوچے تھے
۲۵۳	اول بل میں بچے اخلاص سوں	جہاں نارہیں شاہ کے پاس سوں
۲۵۴	اتھا علم تحصیل ان پر تمام	ہمیشہ رہیں شاہ سے ہم کلام
۲۵۵	کتے شاہ کالے تو القاب تھا	دلے کھا پر نور مہتاب تھا
۲۵۶	جلاں بھرے جیوں کی اور بقا تو	سدا حق کی وحدت میں اور حق تھے
۲۵۷	دلوں کو سے کبھی یک حرف تھے	دیکھیں بحر حق کسی کی طرف
۲۵۸	کتے یاد میں حق کی مسمود تھے	چھپے سو خزانے سوں بھر لوہ تھے
۲۵۹	کریں شاہ جس پر کرم کا نظر	دلاویں اسے ملک اور مال ور
۲۶۰	بہت گلی غنی اور دھرتے تھے	تصرف دیکھو توجہ کرتے اتھے

دو بیان حضرت موسیٰ دیو زود قد (س) سترہ (۹)

۲۶۱	بہت کفر کالے ہیں ہو رو یو د	لقب توج موسیٰ کتے دیو زود
۲۶۲	دیکھو فوج میں یو بڑے مرد تھے	خبر در ہیں اور مغرور داتھے
۲۶۳	اوغازی غزا پر کمر باند کر	اوقائم رہیں نت سدا جہد پر

لے بہت، ہتاؤ۔ حالت مرزمل۔ ملا بہت معقتین سے ماخذ ہے۔ اسم کے معنی ہیں نیک یا تحسن کا اسم اقسام
خیرات، معنی، مذہب یا نیا زو غیرہ۔ لے حرف عدا کے بدلے حرکت۔ لے دو۔ ہر دو مال جملہ۔ ف۔
ہر چار یا یہ کہ درندہ باشند لے مفرد۔ لے کے بدلے مشد۔

- ۲۸۰ دیکھو شاہ کا جب گرد (ہر) پٹھانہ ہوا مستقر میں اور زمانہ ہوا
- ۲۸۱ کیے گڑ (ہر) اوپر جب سے شہ نے تھا دیکھو تب سے دکن نے پایا اراکم
- ۲۸۲ دو عالم دیکھو تو چہ ہوتا ہے شاد دنیا دین کا شہ سوں پاتے مراد
- جگہ معر امرخی ندارد (جلال الدین گنج رواں م ۲۶ - ۱۱ - ۴۴۴ جہری)
- ۲۸۳ ازل سوں او معبود ہے مہر یاں لقب تب ہوا ہے یو گنج رواں
- ۲۸۴ کیے تخت کا شہ نے ڈونگا دیر اتھا شہ کو حق سو نچا ایسا امر
- ۲۸۵ اسی کوہ پر شہ نے باندے تلاب ہنوز لک بالاب ہر لب رنہ آب
- ۲۸۶ ضروری بلا خلق آتی اتھی بہت شہ سوں انعام پاتی اتھی
- ۲۸۷ یو عالم بہت پیٹ بھرتا اتھا چتا گنج خیمے تو سر تانہ تھا
- جگہ معر امرخی ندارد (خواجہ حسین م ۲۷ - ۸ - ۵۲۷ ہ)
- ۲۸۸ یو طالب خدا کے تھے شہ حسین بحر حق کو دیکھے نہ تھا ان کو چین
- ۲۸۹ نجات میں سید و آل رسول دعائے کیا حق نے ان کا قبول
- ۲۹۰ دیارین الدین ساجے حق چراغ کیا چشت کے خانوادے کو باغ
- ۲۹۱ اتھے نامیدہ شاہ شیراز کے اور محرم ہوئے شہ سوں راز کے
- ۲۹۲ اوشا کرا تھے پیر البیلا سوں یو شاہ برہان دین اولیا
- ۲۹۳ نبی پر کیے جہاں اپنا نشانہ خدا کا رحمان پہ تھا بے شمار
- ۲۹۴ یہاں ہلاشا شاہ تھو دتھا بنی کی شرع پساو بہر بودتھا
- ۲۹۵ رملے میں اوشہ کے قاضی تھے ایک خدا کے ظہیر اور ارضی تھے دیک

۱۔ آنام کا الف اول مقصورہ۔ ۲۔ امر کا میم متحرک ۳۔ تلاب ۴۔ تلاب ۵۔ ضروری ۶۔ مزدوری۔

۷۔ سرناء ۸۔ الف یتم ہونا ۹۔ زمین الدین ۱۰۔ الف لام تعریفی خست ۱۱۔ نامیدہ ۱۲۔ یاخت ۱۳۔ اپنا
۱۴۔ نشانہ ۱۵۔ غلے ۱۶۔ رحم ۱۷۔ حلی ۱۸۔ متحرک ۱۹۔ تفلود ۲۰۔ تفلوق ۲۱۔ الف لام ۲۲۔ امر کا میم متحرک

۳۳۱	سہناج کے جبروت میں کہ وطن	رتن بے بلکہ پانچ کر نا جتن
۳۳۲	یو خطرے بے ماہ میں چور ہیں	یو چوری نے اپنے در زور ہیں
۳۳۳	علی کی عیلت کا تعلیم دے	دیں عشق کا دے معلم کیے
۳۳۴	اتھا علم اول سوں تحصیل تمام	کہے کھول کر شہ نے حاصل تمام
۳۳۵	عنایت کیے پنج گنج کا رکلی	کیے داز شہ نے خفی اور جلی
۳۳۶	ہر یک علم میں سچ اتھے بے نظیر	ہوئے فخر کو دیکھے سوروشن ضمیر
۳۳۷	کیے جب شہنشاہ کرم کا نظر	ہو ختم ہاؤں میں خواجہ اُپر
جگہ معرا سرخی نثارو (برہان الدین غریب م ۱۳۱۰ھ)		
۳۳۸	سچا پیر بہان ہے دست گبیر	بدوں کو اپس (سول) کیا دیکھ پیر
۳۳۹	کیتک ہاوشہ آکے سر جوبیں دھریں	کیتک نعمتال دیکھتے صرف کریں
۳۴۰	دیکھو بادشاہ ہندوستان کا	سماں باغ بوستان گلستان کا
۳۴۱	کتے نام اس کہے اور نگ زیب	اد مقبول حق کا ہر بیشک و زیب
۳۴۲	لیا شہ کی گنبد کا آ کر پناہ	برکت (سول) حق شہ کے بختے گناہ
۳۴۳	کیے پیر نے جب کرم کا نظر	ہوا نقش تب ہفت کشور اُپر
۳۴۴	کتے پیر کا جس اُپر پیار ہے	دو عالم نئے سچ او دلدادہ ہے
۳۴۵	نبی اور دیکھو پیر افتد ہے ایک	ایکو کو تو ہر گز جدا کر نہ دیک
۳۴۶	امانت سلامت سودنیا صبا	یو جس کی کئی پان لینا صبا
۳۴۷	مظہم کتے قادری ہے فقیر	گنہ گار عاجز فقیر او حق پیر

لے پانچ رتن، جہاں غریب سے تحصیل کی راحت سے ملی یہ بکسراں فارسی کی دیکھی گئے باہیں۔ باہیں

۵۵ دیک کہ راحت سے ہندوستان کا وادخت سے بوستان کا وادخت سے دیکھو کی راحت

۵۵ مصرع ثانی کذا فی الخطوط۔

۳۴۸	طاہر کو مرشد ہو آہیں امیں	مرے حق پہ ماشد ہو آہیں امیں
۳۴۹	یہاں آکے طالب ہو سجد کیا	مجھے پیر میں حق دیکھا کر دیا
۲۵۰	اول چارہ سو چلایا مجھے	نبی سوں لے جا کر لایا مجھے
۲۵۱	ہو ارا ز کشوف سب آشکار	تسلّا ہوا دل نے پایا قسار
۲۵۲	اس پر یہ کا تھا سو بولا ہوں میں	چھپے راز تب لاکھ کھولا ہوں میں
۲۵۲	یو سب چار سو دیکھ اہیات ہیں	شہد سونگھیں تر ہر یک بات ہے
۲۵۴	مبارک رکھا نام "گلزارِ حشت"	پڑھے یا سنے سروہ پامے بہشت
۳۵۵	الہی یو گلزار مقبول کر	دیکھا جگ (کو) گلزار سب بھول کر
۲۵۶	معزز اسے کر ہمیشہ مدام	بجی محمد علیہ السلام
جگہ معاصر مخی ندارد (مناجات)		

۳۵۷	الہی مسکت دے زباں کو میرے	سرا تا رہوں نت نبی کو ترے
۳۵۸	او والی ہمارے عرصات کا	او حامی ہولے ہر یک بات کا
۲۵۹	تصدق ترے پانچ تن پاک کا	عفو کر خطا مجھ سے غم ناک کا
۲۶۰	غضب کو تم نے لپو ڈرتا ہوں میں	شفقت کی امید دھرتا ہوں میں
۳۶۱	رہتا ہوں اسی خوف میں رات دن	نہیں مجھ کو آرام تجھ یاد بن
۳۶۲	تصدق نبی کا یو دولت دیا	مجھے فقر کا دلق خلعت دیا
۳۶۳	یو انت نبی کا کیا ہے مجھے	مرے باپ کی لالچ ساری تھے
۳۶۴	اسی کی برکت سوں آرام دے	اسی کے تصدیق سے انعام دے

۱۔ امیں = امین الدین اعلیٰ م ۲۲-۹-۱۰۸۵ء "دیکھا کر" میں یاخت سے ٹھوس کی

پہلی یاخت سے عرفات میں ان حضرات شفقت میں قاف مشہور ہے یہاں پہلے پہن

غلو اسلفظ سے برکت کا کاف مشہور۔

۳۶۵	ترسی یاد میں نت رہوں گا دم	کروں جانفشانی تجھ پہ پہنچ دشا
۳۶۶	نبی کی مجالس میں جاتا رہوں	دلی کا سداوان پاتا رہوں
۳۶۷	عرض تجھ سوں کرتا ہوں لے کار سارا	نبی کی برکت سوں مجھ کو نواز
۳۶۸	تصدق نبی کے اے صاحب کریم	گنہ بخش میرا غفور الرحیم
۳۶۹	مناجات یارب یو کرنا قبول	بجوت محمد و آل رسول

تمت تمام شد تحریر فی التاریخ ہفتم ماہ ربیع الآخر
روز جمعہ وقت دوپہار انگرام رسید از خط خام
سید صہفر ہاشمیان
نوشتہ باند سید ہر سفید
نویسنده مانیت فرط امید

لے ط ۰۰ درشن

اہل علم کے لیے مینا ناو در تحفے

(۱) تفسیر روح المعانی :- جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط فائشائے ہوری ہے حقیقت مصر

وغیرہ کے مقابلہ میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے
آج ہی ملے دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے تاکہ بارہ جلدیں
طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۸ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔

(۲) حلالین شریف :- مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) الباب النقول

فی اسباب النزول "للسیوطی" (۲) معرفت ابن سینا و فلسفہ علامہ ابن المزم

قیمت ہر جلد میں روپے

(۳) شرح ابن قتیل :- الغیبی بن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت ہر جلد میں روپے

پتہ : ادارہ مصطفائیہ - دیوبند - ضلع سہارنپور

سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو بہار ماہ اگست ۱۹۷۷ء

چند روز جاپان میں

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

کانفرنس میں جو تقریریں ہوئیں ان کی روشنی میں فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس کے کام کو آگے بڑھانے اور یہاں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عملی صورت دینے میں دنیا کی رائے عامہ کو بھوار کرنے اور مجلس اقوام متحدہ کو ان تجاویز کی حمایت پر آمادہ کرنے کی غرض سے ایک مستقل تنظیم مذہبی کانفرنس بلے میں "کے نام سے قائم کی جائے۔ اس تنظیم کے عہدہ دار حسب ذیل حضرات ہوں گے۔

(۱) آرچ بشپ فرنانڈس (ہندوستان) صدر

(۲) شری آر آر دواکر (")

(۳) رلی موس آئزن ڈرائفٹ (امریکہ)

(۴) ڈاکٹر ڈانا میکین گرے (") نائبین صدر

(۵) ڈاکٹر محمود حسین (پاکستان)

(۶) مسٹر ڈوشیو کوائے (جاپان)

(۷) ریوڈ ڈیکھنوالو (")

(۸) ڈاکٹر ہومرک (امریکہ) سکریٹری جنرل

کانفرنس کی مجلس منتظمہ کے اراکین جو حضرات منتخب ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسٹر جاکس بی چنڈا (کینیا، مشرقی افریقہ)

(۲) ریوڈ ڈیکھنوالو (جاپان)

(۲) ڈاکٹر خواجہ غلام الہ دین (ہندوستان) (فوسس ہے گزشتہ ماہ دسمبر کی) کو انجی وفت

ہو گئی۔

(۳) ریورنڈ انا دا (جاپان)

(۵) مسٹر این مونا و سکا (پولینڈ)

(۶) مسٹر کیٹانک باگوس اوکا (انڈونیشیا)

(۷) ریورنڈ ایڈورڈ مرے (امریکہ)

(۸) سر رانہ گوپال سنگھ (ہندوستان)

سیر و سیاحت کانفرنس کی تاریخوں میں ایک دن یعنی ۱۵ اکتوبر کو سیر و سیاحت کے لیے محفوظ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس دن صبح کو ناشتہ کے بعد ہی ہم لوگ نارہ NARA کے لیے روانہ ہوئے جو کوٹے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر ہوگا۔ جاپان دنیا کا ایک عظیم مذہبی ملک ہے۔ اس بنا پر نہایت عظیم نشان مندراس کے چیمپ چیمپ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں تو جنوب مشرق ایشیا کے قدیم مذاہب بودھ مت اور ٹائوئزم (TAOISM) ہیں اور جاپان میں بھی ان مذاہب کے معابد ہر جگہ کثرت سے موجود ہیں لیکن جس کو ہم جاپان کا قومی مذہب کہہ سکتے ہیں وہ شنتوئزم (SHINTOISM) ہے۔ یہ مذہب عمر کے اعتبار سے تقریباً اسلام کے برابر ہے اس مذہب کی دو بنیادی کتابیں ہیں۔ (۱) ایک کوجیکی اور دوسری (۲) اہارائی نو کو گوبا۔ اول الذکر کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ تیسروں برس پرانی اور جاپان کی قدیم ترین تحریری دستاویز ہے۔ اس مذہب میں فطرت کو خدا مانا گیا ہے۔ جس کا نام ان کے ہاں "کن گرا" ہے۔ جاپانی میں اس کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس بودھ مت کی جگہ ملی اور جاپان کا قومی مذہب بن گیا۔ جیسا کہ ہر مذہب کی تقدیر ہے۔ ایک عرصہ کے بعد یہ شاخ در شاخ ہو گیا اور سب آج کل جاپان میں نہ پلنے اس کے متعدد ڈاؤنٹین پائے جاتے ہیں۔

دوئے غریب بودھ مذہب اور ٹائوئزم تو جاپان کے دیرینہ مذاہب ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں یہاں داندسے مذہب پیدا ہوئے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کی بانی

ایک الگ دو خواتین ہیں۔ ان خواتین نے اپنے متعلق پیغمبر یا رشتی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ اپنے آپ کو خدا کا اوتار کہا۔ ان دونوں میں سے ایک مذہب کا نام ٹنریکیو (TENRIKYO) ہے اس مذہب کی بانی کا نام مکی ناکایاما (MIKI NAKAYAMA) ہے۔ یہ خاتون ۱۸۶۷ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی طبیعت میں عبادت اور نیک کاموں کی طرف میلان شروع سے تھا۔ عمر میں اضافہ کے ساتھ یہ وصف ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء میں ایک نئے مذہب کا اعلان کیا اور اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دی۔ جو کچھ زر زمین اپنے پاس تھی وہ سب خیرات کر دی اور درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں شوہر کا بھی انتقال ہو گیا تو موصوفہ کا ایک بیٹا جس کا نام ایشوجی تھا تہہ کاریاں اور ایندھن بیچنے کا کاروبار کرنے لگا۔ پورے گھر کی گذر بسر کا دار و مدار اسی پر تھا اور زندگی عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ دس برس تک کسی نے اس نئے مذہب کی طرف رخ نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد لوگ اس طرف متوجہ ہوئے اور ملک میں اس نئے مذہب کا چچا ہوا تو حکومت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ مذہب کی بانیہ کو بار بار گرفتار کیا گیا اور سزائیں دی گئیں لیکن ملک میں مذہب کی مقبولیت بڑھتی ہی۔ اسی برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ نازلین جہاں ہم گئے تھے اس مذہب کا ایک نہایت وسیع اور عظیم الشان مندر ہے یہیں موصوفہ کی قبر ہے۔ پیر وان مذہب کا عقیدہ ہے کہ ان کی پیشوا قبر میں زندہ ہے۔ کھانا پینا اور زندگی کے دوسرے معمولات جتنور قائم ہیں اور وہ اپنے پیر وان مذہب کو ہدایات بھی بھیجتی رہتی ہے۔ ہم لوگوں نے مندر میں گھوم پھر اس کی تمام عمارتیں دیکھیں ان کا طریق عبادت دیکھا ایک بعد مندر کے قریب ہی ایک اور بڑی عمارت تھی جو اس مذہب کے لوگوں کے لیے ایک کلب کی حیثیت رکھتی ہے یہاں ہم سب بچے پر مدعو تھے۔ پہلے انجن کے صدر نے مذہب کی تاریخ اور اس کے بانی کے سوانح حیات بیان کر کے بعد ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمود حسین نے ہمارے طرف سے شکریہ ادا کیا۔ پھر کھانا آیا تو نہایت مسکلف تھا۔ یہاں مجھ کو سب سے زیادہ دو چیزیں بہت پسند آئیں۔ ایک پھلی جو یہاں کسی خاص قسم کی تھی اور اس میں وہی ذرہ تھا جو سند رک پھلی میں ہوتا ہے

یعنی ہکا بکا کہا راہن اور خوشگئی اور دوسرے خوبزہ ایہ بہت شیریں اور سورتھا اس قسم کا خوبزہ کیلی فورنیا میں کثرت سے ہوتا ہے۔ یورپ میں قیام کے زمانہ میں اکثر کھاتا تھا۔

صدر انجن نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ مسیحیو مذہب کی بانیہ کے انتقال کو ابھی چند برس ہیں اور پہلے ایک صدی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس وقت امریکہ، کناڈا، یورپ، افریقہ اور جنوب مشرق ایشیہ کے مالک ہیں اس مذہب کے سولہ ہزار معابد موجود ہیں جو لوگ اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار اور پیروان مذہب کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ اس مذہب کا مرکزی دفتر جاپان کے مشہور شہر ٹوکی میں قائم ہے اس دفتر کے زیر انتظام کنٹرولنگ ڈسٹریکٹ سے لے کر نیو یورک کی سطح تک قلیبی ادارے، شفا خانے جن میں ایک ایک ہزار مریضوں کے بستوں کا انتظام ہے یتیم خانے عجبائب گھر اور ان کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے دوسرے ادارے ملک بھر میں کثرت سے قائم ہیں۔ یہی مذہب کی تعلیمات، اس کی عبادت میں مراقبہ (MEDITATION) پر اور معاملات میں اخلاقی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ دنیا میں انسان کو حقیقی مسرت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ خدا کی تعلیم اور اس کی مرضی کے مطابق روح میں پاکیزگی اور بلندی پیدا نہ ہو۔ جاپان کے ارباب علم و قلم کا عام خیال یہ ہے کہ یہ مذہب دراصل شنوئزم کی ایک شاخ ہے لیکن خود اسی مذہب کے لوگ اس خیال کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔

100 MOTO دوسرا مذہب اوموتو ہے۔ یکم جنوری ۱۸۹۲ء کو اس کا قیام ہوا۔ اس حساب سے اس کی عمر کل ستر برس ہے۔ ایک خاتون جس کا نام "ناؤڈو گچی" (NAO DEGUCHI) ہے اس مذہب کی بانی تھی۔ ٹکو جیاما (FUKUCHI YAMA) جو جاپان کے صوبہ ٹامبا (TAMBA) میں شمال ہے اس کے ایک نہایت معمولی اور غریب گھرانہ میں ۱۶ دسمبر ۱۸۶۳ء کو اس خاتون کی پیدائش ہوئی۔ اس کا والد جس کا نام کرمورا اور ایک بڑھٹی تھا گدربسر ٹری شکل سے ہوتا تھا اس لیے ڈوگومہ نے بچپن اور آغاز شباب کا زمانہ بڑی عسرت میں گزارا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں ایک بڑھٹی سے شادی ہو گئی لیکن یہاں بھی گدربسر کا وہی عالم تھا۔ وہ میاں بیوی اور بچے

ان سب کا خچ پورا کرنے کے لیے شوہر کے ساتھ بیوی کو بھی محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ اس غربت افلاس اور تنگدستی کے باوجود ڈوگ کوچی اپنی نیکی، انسانی ہمدردی اور خدمت اور راست بازی کے باعث محلہ کے لوگوں میں بڑی عزت سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کی عمر اکیاون برس تھی کہ ساتھ برس کی عمر میں شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اب گھر کی پوری ذمہ داری تنہا ڈوگ کوچی کے سر آ پڑی جس کو اس نے بڑے صبر اور استقامت سے اٹھایا۔ اس کی طبیعت شروع سے مذہبی اور عبادت کی طرف مائل تھی، عمر میں اضافہ کے ساتھ اس جذبہ میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ نوبت بانیجا و سید کہیم جنوری ۱۹۷۷ء کو جبکہ اس کی عمر چھ برس کی تھی اس نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بہت عالی شان محل ہے، اس میں بڑے بڑے بال کمرے، برآمدے اور صحن ہیں۔ چاروں طرف بارخ اور چین ہیں۔ درمیان میں نہریا ہیں اور نواسے چھٹ رہے ہیں۔ ہال میں ایک مجلس بھی ہوئی ہے۔ صدر مجلس ایک شخص ہے جس کی شکل و صورت بڑی نورانی اور وحیہ ہے۔ وہ کوئی وعظ کہہ رہا ہے۔ یہ بھی اس مجلس میں بیٹھ گئی۔ صدر مجلس کی اس پر نگاہ پڑی اور اس نے اس خاتون کو غور سے دیکھا تو اب اس کی حالت ہی ہر گز گوں تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس نے لوگوں کو نیکی اور انصاف کی راہ پر چلنے کی دعوت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ اور ہمہ تن اس کام میں مصروف ہو گئی، اس زمانہ میں حکومت جاپان بڑی مستبد اور جبر پسند تھی عام انسانی حقوق کا احترام نہیں کیا جاتا تھا۔ امیری اور غریبی میں جو فاصلہ تھا وہ ناقابل عبور تھا اور شہنشاہیت اپنے اصل رنگ و روپ میں جلوہ نما تھی۔ اب اس خاتون نے عبادت میں غایت درجہ انہماک و استغراق کے ساتھ پہلک میں انسانی مساوات اور عدل و انصاف کا وعظ کہہ کر بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت پر بھی تنقید کرنی شروع کی تو اس کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا لیکن اسکے رویہ کو تہدیلی پیدا نہیں ہوئی ایک مدت کے بعد جب یہ رہا ہوئی تو اس نے پھر اپنے مشن کی تکمیل شروع کر دی۔ اب پہلک میں اس کی مقبولیت کا غلطہ بلند ہو چکا تھا اور لوگ کثرت سے اس کے ملکہ اوقات و عقیدت میں داخل ہونے لگے تھے۔

اس مذہب کے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ خاتون اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں تھی لیکن قید کے زمانہ

میں اس کو جو کچھ الامام ہو یا تھا اسے اپنے اپنے سید سے اور ٹیڑھے ترے خط میں وہ کہہ دیا کہ کلمہ سے قید خانہ کی دیوار پر لکھ دیتی تھی۔ بعد میں لوگوں نے ان تمام تحریروں کو یکجہ کیا تو یہی اس کی غرض تھی اور الہامی کتاب بن گئی۔ یہ مذہب دراصل عیسائیت اور بودھ مت کی پیوندکاری سے عالم وجود میں آیا ہے لیکن اسلام کی بعض بنیادی تعلیمات بھی اس میں شامل ہیں جاپان کے شہر آکیمہ (AKIBA) میں اس مذہب کی ایک عظیم الشان عبادت گاہ کی چوٹی پر پتھر کے دو کتبے لگے ہیں جن میں لکھا ہے:

(۱) دنیا کی تعمیر از سر نو ہوگی اور وہ ایک خدا کے حاکم کے ماتحت سابقہ آسمانی بادشاہت میں منتقل ہو جائے گی۔ (۲) خدا اس عالم کی ہر چیز کا حاکم اور فرماں روا ہے اور انسان زمین اور آسمان میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے جب انسان خدا سے متصل اور اس میں جذب ہو جاتا ہے تو اس میں غیر محدود طاقت و قوت اور ذمہ داری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کتبوں سے اس مذہب کی اسپرٹ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب دنیا کے پانچ بڑے مذاہب جن میں ایک اسلام بھی ہے انکو ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں مانتا اور ان سب کی مذہبی کتابوں اور ان کے بانیوں کی تعظیم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس مذہب کے لوگوں اور چین کی ایک روحانی تحریک جس کا نام ٹائو یوان (TAO YUAN) ہے اور جو ہاں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے آج چھ لاکھ سے زیادہ افراد ممبر ہیں۔ ان دونوں کے تعاون اور اشتراک سے ۲۰ مئی ۱۹۲۹ء کو پکنگ میں مذاہب عالم کے دفاق (THE WORLD FEDERATION OF RELIGIONS) کی افتتاحی تقریب عمل میں آئی۔ اور موجودہ مذاہب کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی۔

یہ مذہب انسانی برادری اور مساوات پر بہت زور دیتا ہے۔ اور اسی جذبہ کے ماتحت اسپرٹو زبان جس کو پولینیشیہ کے ایک ماہر لسنہ یہودی ڈاکٹر ال۔ ال۔ زمین ہوف (۱۸۵۹-۱۹۱۷) نے ایجاد کیا تھا اس زبان کو اوٹو مذہب کے بہت ممتاز پیشوا "اونی سا برو ڈو گیو جی" (ONI SABURU) نے جو اکی ۱۹۳۳ء میں اپنے شہر میں متعارف کرایا۔ اس مذہب کی بانی کی خوش قسمت تھی کہ اسکو نہایت مخلص اور خدا کا راواگی درجہ کے تعلیم یافتہ برابر ملتے رہے جنہوں نے حکومت کے قید و بند کو پامردی اور استقلال سے برداشت کیا اور اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے چنانچہ آج جاپان کے علاوہ یورپ۔

اگر کہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اس مذہب کے ماننے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے اپنے اسکول اور کالج ہیں۔ اخبارات و رسائل ہیں۔ عبادت گاہیں ہیں۔ آج کل بھی اس مذہب کی سب سے بڑی لیڈر ایک خاتون ہے جس کا نام مسز ناؤچی ہے۔ یہ ۱۹۰۶ء کی پیدائش ہے۔ مذہب کی بانی خاتون کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہوا۔

میں کوٹھک مذہب عالم کانفرنس جیسی کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جب کہی شریک ہوتا ہوں تو ایک طالب علم کی طرح شریک ہوتا ہوں۔ چائے پیرا لیچ اور ڈنر پر یا عالم مجلسوں میں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بے تکلف ہو کر ملتا ہوں۔ ان کے افکار و خیالات غور اور توجہ سے سنتا ہوں۔ ان سے سوالات کرتا ہوں اور اس طرح یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سائنس اور تکنالوجی کے اس دور میں جہاں تک مذہب، روحانیت اور اخلاق کا تعلق ہے، دنیا کے لوگ کس طرح سوچ رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں کیا کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس نوع کی صحبتوں اور مجلسوں سے فائدہ یک طرفہ نہیں ہوتا۔ میں ان کی سنتا ہوں تو اپنی کہتا بھی ہوں۔ چنانچہ اس مذہب کے اور دوسرے مذاہب کے کتنے ہی مرد و عورت تھے جن کی درخواست پر میں نے اسلام پر انگریزی زبان کی بعض کتابوں کی نشاندہی کی اور قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم اور سیرت پر چند کتابوں کے نام لکھ کر دیئے۔

نارا۔ کوٹھک کی طرح جاپان کا قدیم یعنی ایک ہزار برس پرانا شہر ہے۔ جاپانیوں کو قدرت نے زمین بند اور شہر کی آرائش و زیبائش کا بڑا لطیف ذوق عطا فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ شہر بھی اس ذوق کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں ایک وسیع اور کشادہ پارک ہے جو "ہرن پارک" کہلاتا ہے۔ اس میں کثرت سے خوبصورت خوبصورت ہرن ہیں اور وہ انسانوں سے اس درجہ بالوس ہیں کہ ان کو دیکھ کر دم نہیں کرتے۔ اس شہر میں ایک نہایت عظیم الشان اور بہت پرانا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، باسعادت سے ایک سو برس بعد کا تعمیر کیا ہوا مندر بھی ہے جس میں مہاتما گوتم بدھ کا تاجے کا آتما پٹا عجمہ رکھا ہوا ہے کہ دنیا میں آتما پٹا کئی ایسا عجمہ نہیں ہے۔ ہم لوگ جب اس مندر میں گھوم پھر رہے تھے اس وقت ایک اسکول کے بچے اچھے بچے تھے جن کے کپڑوں کی تعداد میں اپنے استادوں اور اساتذہ میں کے ساتھ وہاں بچک کے بچے تھے۔ ہم نے ان بچوں کو دیکھ کر شہر میں ان حضرات پر عجب ہوا حال ہے کہ بیشک یہ بچے کسی نامور اور مذہب قوم کے حکماء ہیں۔ سب ایک نہایت صاف ستھرے اور خوبصورت یونیفارم میں لباس!

جاپان کی گڑیا مشہور ہے ہی سب خوب گورے چٹے تندرست و توانا۔ سب کے چہرے شبیہ خوش طبع اور خوش مزاج اچھلتے کودتے۔ اُدھر سے اُدھر پھرتے تھے لیکن نہ کہیں پہنگامہ اور شور تھا اور نہ غل غبار نہ گندگی اور نہ غلاظت۔ ایک فوج کی طرح ڈسپلنڈ۔

شام کو نماز سے واپسی ہوئی تو پروگرام کے مطابق کوٹھ کے مندروں کو دیکھلے۔ میرے مندروں کی اتنی بڑی تعداد اور ان کا یہ اہتمام یا تو ۱۹۲۲ء میں تھائی لینڈ میں دیکھا تھا۔ یا اب یہاں دیکھلے۔ ایک مندر میں جو وہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری آمد کے موقع پر اجتماعی عبادت کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ عبادت بھی ہوئی مسلمانوں میں سے بھی دو تین حضرات شریک ہوئے لیکن میں اور باقی دوسرے مسلمان اس میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کے گراؤ پجاری نے جب مجھ سے بھی کہا تو میں نے جواب دیا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں؟“ اس نے کہا ”نہیں“ میں نے کہا ”تو پھر آپ کی عبادت میں کیوں شریک ہوں؟“ علاوہ ازیں ہم مسلمان کسی دوسرے مذہب کی عبادت میں مذہباً شریک ہو بھی نہیں سکتے۔ جب یہ اجتماعی عبادت ختم ہو گئی تو مندر کے ارباب انتظام کی طرف سے چائے پانی سے ہم لوگوں کی تواضع کی گئی۔ اس سے فراغت کے بعد یہاں سے رخصت ہو کر پل، بجے شام کو ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔

پروفیسر عبدالکبیرؒ کا دفتر، کے مقامی مندوب پروفیسر عبدالکبیرؒ واستو بھی تھے۔ یہ نو مسلم جاپانی اور لوگوں کو یونہی میں پروفیسر سے جپا۔ اور زبانوں کے علاوہ انگریزی اور فارسی بھی اچھی خاصی جانتے اور ان میں گفتگو کرتے ہیں۔ جاپان میں علمائوں کی جو ایک مختصر مذہبی تنظیم قائم ہے اسکے صدر اور سرگرم کارکن ہیں اور اس مشیت سے میں ان اقوامی اسلامی کانفرنسوں میں جاپان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اسی قریب سے میری انکی لاقادریہ اور میرے بڑے غلطے اور کم فراہ دست ہیں۔ غالباً قاسم ہوا انڈونیشیا کے کسی سفر نامہ میں جی انکا تعارف کر لیا بھی ہے۔ بہر حال اس کا نظریہ میں ان سے واقفیت ہوئی تو بڑی مستر مولیٰ حسب معمول بڑی محبت اور خلوص سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ ان کے کانفرنس کے مال سے میری اور انکی مافوق درجہ سیٹ پاس پاس ہی تھی اس لیے ان کی خوب لافعات اور گفتگو کرتی تھی۔ ایک دن میں ان سے فرمائش کی کہ میں کوٹھ کی شہری اور اندونی زندگی دیکھنا اور اس کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ سے بہتر حوالہ دگا اور فریق کون ہو سکتا ہے چنانچہ وہ خوشی سے رضامند ہو گئے۔ اس طرح ہم گئے۔

ہم سدا کا ایک نیا تحفہ

لکھ

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزاء کا زندگی بخش مرکب عرق،
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے



نمیں صحت مند زندگی پیدا کرتا ہے اور ان تمام حالتوں میں
مفید ہے جو مردوں اور عورتوں میں کمزوری کے سبب پیدا ہوتی ہیں
جیسے گھریلو زندگی میں آکٹا ہٹ یا بیڑاری، جسمانی اور
دماغی کاموں میں ٹھکن یا کام میں جی نہ لگنا، بدن میں سستی،
ہاتھ پاؤں میں لرزش، سانس پھولنا،
چہرہ زرد ہو جانا اور طبیعت میں پرمردگی وغیرہ۔

نمیں بہت تیزی سے اعضائے ریہہ اور تمام
جسمانی نظام پر اثر کرتا ہے۔ یہ اعلا درجہ کا مقوی و
محکم ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد دور کرتا ہے۔

ہم سدا

سالانہ قیمت دس روپے
فی وارچ ایک روپیہ

اُردو زبان میں
ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار دواور کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں منقسم ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۷۷۷ ہیں۔

حصہ اول: حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم: حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات اور ان کی دعوت حق کی مختلف تشریحات و تفصیلات۔

حصہ سوم: انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف و القہم اصحاب الغرہ اصحاب البیت اصحاب الکوس بیت المقدس اور ہود اصحاب الافودہ اصحاب الفیل اصحاب الجحہ ذوالقرنین اور سید سکندر کی سب ادریل عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و مفصل تفسیر۔

حصہ چہارم: حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے

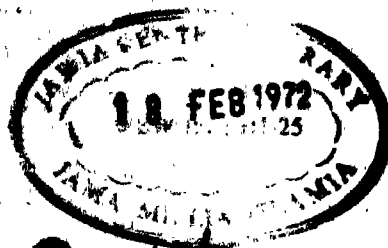
قیمت مکمل سٹاکتیس روپے۔ اجرت فی جلد فلپاچھ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان، اُردو بازار جامع مہیصل دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یو این پرنٹنگ پریس ٹی بی سٹیج کراکر دفتر بان سے شائع کیا

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دِلِّی کا علمی و دینی مآہرنا

صُورِی - جُون ۷۲



جَنَورِی کَ جُون غَالِب

بُرْہَانُ

مَرْتَبِی
سَعْدِیَا حَمْدِی سَرَاوِی

مکمل لغات القرآن

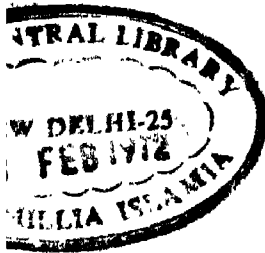
(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام معانی و جملوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جاسکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لا جواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی قطع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	"	پانچ روپے	چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	"	پانچ روپے	چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	"	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	"	آٹھ روپے	نور روپے
جلد ششم	۲۲۴	"	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی



برہان

جلد ۶۸	ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ مطابق فروری ۱۹۷۲ء	شمارہ ۲-۵
--------	----------------------------------	-----------

فہرست مضامین

۱. نظرات سید احمد اکبر آبادی ۷۳
۲. جمال الدین الاسنوی جناب حافظ ڈاکٹر عبد العظیم عالم ای پی ایچ ڈی (ملیک) ۸۱
۳. سید احمد شہید اور ان کے دیوبندی رفقاء لکچرر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب مولوی سید محبوب رضوی صاحب ۹۷
۴. تاریخ دیوبند کے زیر تالیف جبرید
۵. ایڈیشن کا ایک باب
۶. عمر خیام اور خاقانی جناب مولانا امتیاز علی خان نصا عرشی رامپور ۱۱۳
۷. ہندو تہذیب اور مسلمان جناب ڈاکٹر محمد عرفان اتا فتنہ حامد لیا اسلام آباد ۱۲۰
۸. چند روزہ جاپان میں سعید احمد اکبر آبادی ۱۲۹
۹. تبصیر س. ع. ۱۳۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظریات

بنگلہ دیش

(۲)

کہنے کو آج دنیا میں تقریباً تیس مسلمان آزاد مملکتیں قائم ہیں۔ لیکن بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ میرٹ، مسماست اور معاشرت میں مجموعی اعتبار سے یہ سب اسلام کے لئے باعثِ ہنگامہ و عار اور مایہِ مذلت اور رسوائی ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں ایک خاص حلقہ کی طرف سے جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں یہ کہا گیا کہ پاکستان کی شکست اسلام کی شکست ہے اور اس شکست سے یہ بات صاف عیاں ہو گئی کہ سیکولرزم اور سائینس کے موجودہ دور ترقی میں اسلام بحیثیت ایک نظام زندگی کے کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اسلام سے زیادہ مظلوم اور ستم رسیدہ و مجبور دنیا میں کوئی اور مذہب نہیں ہے۔ اور یہ ان لوگوں کا

جماعے نہیں۔ اتنے اس قدر مظلوم نہیں ہے جتنا ان بد قسمت انسانوں کا ہے جو اس حلقہ مجبوسِ ارادت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور چیخ و چیخ کر اس کا اعلان و عہدہ بھی کرتے ہیں لیکن ان کا دل فریدہ کافری اور ان کا ذہن گردشیوہ افرنجی ہے۔ پھر حیرت ہے لوگ اس کا ماتم کرتے ہیں کہ اسرائیل نے فلاں فلاں عرب ملکوں کی زمین کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا ہے اور اس سے دست بردار نہیں ہوتا۔ اس ہمارے کشمکشِ فتانی کہتے ہیں کہ بھلے دیش پاکستان سے کٹ کر ایک الگ۔ مستقل اور آزاد مملکت بن گیا۔ لیکن اس پوری مجلسِ ماتم اور محفلِ آہ و شیون میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو اس پر تلگین اور اداس ہو کہ یہ مسلم نام کی حکومتیں خود اسلام کو دنیا میں ذلیل و خوار اور بدنام کر رہی ہیں اور ان کا وجود اسلام کے لئے کلنگ کا ٹیکہ بن کر رہ گیا ہے

وائے گر در پس امر و بود نسد وائے

اگر کوئی ایسا حق پرست اور سچا مسلمان ہوتا تو قدرت کے قانونِ فطرت کے مطابق وہ اسرائیل پر لعنِ طعن کرنے کے بجائے خود ان عربوں کا گلا پکڑ لیتا جن کی بدولت "الحکم النکاح" کی ایک سخت عبرت انگیز مثال ہے۔ اگر کوئی ایسا مومن کامل ہوتا تو وہ شیخِ حبیب الرحمن اور اٹلیا کو برا بھلا کہنے کے بجائے پاکستان گورنمنٹ سے مواخذہ کرتا کہ اسلام دشمنی کا سب سے بڑا ثبوت اپنے عمل سے اس نے بہیم پہنچایا ہے

وہ لوگ جو کس مسلمان ملک اور اس کے عمل کو اور اسلام کو ایک سمجھتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اصل حقیقت یہ نہیں ہے اور اس بنا پر پاکستان کی شکست ہرگز اسلام کی شکست نہیں بلکہ ایک ایسے ملک کی شکست ہے جو عالم وجود میں تو آیا تھا اسلام کے ہی نام پر۔ لیکن یہ ایک نہایت بھیاںک اور خطرناک قسم کا فریب اور دھوکہ تھا۔ جو لوگ اس کے داعی اور علمبردار تھے ان کی زندگی میں اور اسلام کی تعلیمات میں ایک ناقابلِ عبور فاصلہ تھا۔ چنانچہ یہ ساری باتیں اس وقت تک تھیں جب تک ہندوستان کی تقسیم نہیں ہوئی اور پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا۔ لیکن جہاں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، اسلام کا نظامِ زندگی "قرآن کی حکومت" وغیرہ ایسے نعرے سب فہم ہو گئے۔ اب عوام کو خوش کرنے کے لئے اسلام کے فطری رسوم کو ضرور کچھ جلا بخشی گئی۔ لیکن اس کی اصل اسپرٹ اور اس کی حقیقی روح کو اس ملک سے دبیں نکالا جے دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان پر جو تباہی آئی وہ اس لئے آئی کہ پاکستان نے عموماً دوسرے مسلم ممالک کی طرح "اسلام کو اپنی زندگی پر کار فرما اور حکمران بنانے سے انکار کر دیا ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا۔ اور اس ملک نے اسلام کے نظامِ زندگی کو ایمان داری اور خلوص سے اپنایا ہوتا تو آج یہ روزِ بد اس کو ہرگز نہ دیکھنا پڑتا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس چیز کو اسلامی نظامِ زندگی یا اسلامی دستورِ حیات کہتے ہیں وہ کوئی فضا میں معلق اور ہوا میں اڑتا ہوا غبارہ نہیں ہے۔ اس

نظام کو قائم اور برپا کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ نے زبان سے اعلان فرما دیا۔ جیسا کہ پاکستان کا ہر بے ایمان اور اسلام ناشناس لیڈر اب تک کرتا رہا ہے۔ یا ملک کے دستور میں بنیادی مقاصد کے زیر عنوان۔ عوام کو جیل دینے اور ان کی زبانوں کو خاموش کرنے کے لئے۔ ایک دفعہ کا اضافہ بھی فرما دیا گیا کہ ”اس ملک کا قانون اسلامی ہو گا“ اور سمجھ لیا کہ اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظام قائم اس سے ہوتا ہے کہ آپ زبان سے کچھ نہ کہئے اور دستور میں اس قسم کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہ کیجئے۔ لیکن ملک کے عوام جو حکومت کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور ملک کے ارباب سیاست و اقتدار۔ یہ سب فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے اعتبار سے بچے بچے اور مخلص مسلمان ہوں۔ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ عمل کم و بیش سب یکساں ہوتے ہیں لیکن کسی عمل کی نوعیت کا تعین عمل کر نیوالے کے اعتقاد کی روشنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً غریبوں کی مدد کرنا۔ ایک مظلوم کی فریادرسی کرنا اور لوگوں سے حسن اخلاق سے پیش آنا۔ یہ تعلیمات اسلام، عیسائیت اور ہندو مذہب سب میں یکساں ہیں۔ لیکن ان پر عمل اگر ایک مسلمان کر رہا ہے اور اپنے مذہب کے احکام کی بجا آوری کے لیے تو اس کا یہ عمل ”اسلامی“ ہو گا اسی طرح ایک عیسائی کے لیے یہ ایک مسیحی اور ایک ہندو کے لیے ہندوئی عمل ہو گا۔ آپ بیٹے کو اعلیٰ تعلیم اور تربیت دیتے ہیں بس اب وہ جو کام بھی کرے گا اس شائستگی اور تربیت کا آئینہ دار ہو گا۔ وہ جہاں کہیں اور جس کسی مجلس میں بیٹھے گا اس کا عمل اور کردار اسی فکر و نظر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو گا جو اس کو اعلیٰ تعلیم اور تربیت نے بخشے ہیں۔ بعینہ یہی حال مذہب کا ہے۔ اگر مذہب کی تعلیمات کسی شخص کے دل و دماغ میں رچی بسی ہیں تو اب سیاست ہو یا معاشرت۔ وہ جس میدان میں بھی کام کرے گا۔ اپنی اسی مذہبی تربیت کی روشنی میں کام کرے گا اور اس بنا پر یہ کام سیاسی ہو یا کسی اور قسم کا۔ بہر حال مذہبی بھی کہلائے گا۔ پاکستان کی عمارت چونکہ محض نعروں کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ اس لیے بدقسمتی سے اس معاملہ میں بھی یہ کافی سمجھ لیا گیا کہ دستور میں اسلامی نظام کا لفظ آجائے۔ اور اس بات کو کسی نے نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں

سیاست و قیادت کی عنان ہے ان کی زندگی کو اسلام سے کتنا قرب اور کتنا تعلق ہے اور اگر قرب و تعلق نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی گردیدگی میں غرق ہیں تو پھر محض اطلاعات کو دینے سے کیا ہوتا ہے اگر تربیت صحیح اسلامی ہے تو زبان سے کچھ نہ کہئے تب بھی آپ کا مقصد حاصل ہے اور اگر تربیت ہی صحیح نہیں ہے اور اسلامی فک و نظر اور اس کے اعتقاد کا ہی وجود نہیں ہے تو ساری دنیا میں ڈھنڈو مچا دیتے پھرتے۔ اس سے کچھ نہ ہو گا۔ اور اصل مقصد کبھی حاصل نہ ہو گا۔ یہ اگرچہ بڑی صاف و واضح اور کھلی بات ہے لیکن افسوس ہے ان لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ جو اسلامی نظام سے متعلق اپنے ارادوں اور خواہشات میں خلص تھے اور اس لیے ان کی کوششوں کا دائرہ بہت بڑی حد تک قوم کی سیرت سازی کے بجائے دستور و جدید تک محدود رہا۔ اس بنا پر پاکستان کا سب سے بڑا اور بنیادی المیہ یہ ہے کہ وہاں قول و عمل کا تضاد اور صورت و سیرت کے تناقض کو (جو قرآن کے اعلان کے مطابق) اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور برا ہے، قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ زبانوں پر کوئی کمی نہیں تھی لیکن عمل میں دور تک بھی کہیں اسلام کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ میں جب کلکتہ میں تھا۔ وہاں ایک عزیز دوست جو پاکستان گورنمنٹ میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ہلے پلے پھر کے انداز میں کہا "ہماری کراچی اب پیرس سے کم نہیں ہے؟ میں نے فوراً عرض کیا "جناب والا! پاکستان جس مقصد کے لیے بنا تھا اس کے اعتبار سے اسے "کم" ہونا چاہیے تھا یا پیرس؟ اس پر وہ شرمندہ ہوئے اور بولے "جی ہاں یہی ہے جو آپ کہتے ہیں لیکن واقعہ تو وہی ہے جو میں نے کہا۔ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے حد درجہ بے اعتنائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کی گورنمنٹ پر جن لوگوں کا قبضہ رہا وہ حد درجہ میاش۔ بد عمل۔ زر کے بجاری اور خود غرض تھے۔ ان کی وجہ سے ملک میں رشوت ستانی، وغیرہ اندوزی، بلیک مار کٹنگ، اسمگلنگ، سود خواری، دھوکہ دہی، غریب کاٹا، شراب خواری، عریانی و فحاشی، غرضیکہ وہ تمام اخلاقی خرابیاں شدت و بحال پیدا ہوئیں۔ جو ایک قوم کو تباہ و برباد کر دینے کا یقینی ذریعہ ہیں۔ انہیں اخلاقی مسکرات میں اس کو بھی شامل کر لیجئے

کہ پاکستان میں مہاجر غیر مہاجر، ہندو، بلوچی اور لنگھی عسبیتوں کو فروغ دیا گیا۔ ایک نے دوسرے کو حقیر اور لپے سے کٹر جانا، ہر شخص اپنا الوسیدھا کر کے لنگھی لنگھی گنگا اور دوسروں کے لیے ملک اور قوم کے لیے اسے کیا کرنا چاہئے وہ ان سب فرائض و وظائفِ حیات سے غافل ہو گیا۔ کوئی بتائے کہ اگر پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی نظام قائم ہوتا اور اس کے ماتحت ایک مضبوط، فعال اور طاقتور محکمہ اقصا جس کو اصطلاح میں حسیب کہتے ہیں وہ بھی موجود ہوتا تو کیا یہ صورت حال پھر بھی پیدا ہو سکتی تھی ہرگز نہیں۔ مشرقی بنگال کے عوام کو جو شکایات پیدا ہوئیں اگر وہاں سچے سچے اسلامی اخوت کا عمل دخل ہوتا تو کیا شکایات پھر بھی پیدا ہو سکتی تھیں۔ اگر وہاں اسلامی نظام ہوتا تو کیا وہاں جمہوریت قائم نہ ہوتی اور کیا وہاں کے عوام اور اقلیتیں سب کو حکومت پر اعتماد نہ ہوتا؟ کیا وہاں امیری اور غربتی میں اتنے فاصلے ہوتے جواب نظر آتے ہیں؛ کیا وہاں ان اکیس یا بائیس خاندانوں کا وجود ہو سکتا تھا جنہوں نے پاکستان کی پوری معاشیات کو اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا؛ کیا پاکستان میں اسلامی نظام ہوتا تو وہاں کا بڑا چھوٹا کوئی افسر یا حکومت کا ملازم کام چور۔ فرض ناشناس اور خائن ہو سکتا تھا؛ ہرگز نہیں۔ اگر پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوتا تو یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کا ابتلاغ کرتے۔ آپ نے تیرہ برس کسی خاموشی، تحمل و بردباری اور ایثار و قربانی سے پہلے اپنی تعلیم کی اور اپنے آرگنائزیشن کو مضبوط بنایا ہے اور پھر اس کے بعد جن بد بختوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین نہیں لینے دیا ان کو لٹکرا اور ان سے جنگ کی ہے۔ اس کے برخلاف پاکستان نے پہلے دن سے ہی ہندوستان کے ساتھ دشمنی اور عناد کا دم بھرنا شروع کر دیا اور اپنی پوری سیاست و قومی تعمیر اور ملکی استحکام کی بنیاد اسی پر رکھ دی۔ اور جب کبھی عوام کی طرف سے کسی اصلاح کا مطالبہ ہوا۔ گورنمنٹ نے ہندوستان کے جارحانہ عزائم اور اس کی دشمنی کا سہارا لے کر ان کو خاموش کر دیا۔ پھر ہندوستان کے خلاف دنیا بھر کے ملکوں میں گفتنی اور گفتنی کیا گیا بائیں بازو کی گئی، اس قسم کا نقطہ سلسلہ پروپیگنڈہ نہیں کیا گیا۔ ہندوستان نے اپنی طرف سے

امن و صلح کی یقین دہانی کے لیے کتنی مرتبہ پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معاہدہ کی پیشکش کی۔ لیکن ہر مرتبہ اس پیشکش کو سر پائے استحقار و انانیت سے ٹھکرا دیا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں سفارتی تعلقات قائم تھے۔ اور ان تعلقات کے لیے ایک بین الاقوامی آئین اور ضابطہ ہے۔ لیکن پاکستان نے ہندوستان دشمنی کے جنون میں اس ضابطہ تک کی پرواہ نہیں کی ہندوستان سے ثقافتی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لیے۔ اور تجارتی نقصانات سے قطع نظر ہندوستان کے مسلمان پاکستان کی مطبوعات اور پاکستان کے مسلمان ہندوستان کی مطبوعات کو بڑے بڑے رسالوں اور مجلات کو ترسنے لگے۔ عہد و پیمان کی مراعات کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کا نہایت قیمتی ہوائی جہاز جس کو دو کشمیریوں نے اغوا کیا تھا۔ اس کو لاہور کے ہوائی اڈہ پر چلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اس کی نمائش کی گئی۔ اور مجرموں کو اس عظیم کارنامہ پر مبارکباد دینے کی غرض سے خود موجودہ صدر پاکستان لاہور پہنچے اور ان نوجوانوں کا جلوس نکالا گیا۔ یہ سب کچھ تنازعہ کشمیر کے نام پر کیا گیا۔ اور پاکستانی سیاست کے منہ بننے اس کے جواز کا فتویٰ بھی دے دیا۔ پر اے ننگون اپنی ناک کٹا بیٹھنے کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ پھر ہندوستان کی دشمنی میں سے چین سے دوستی اور محبت کی پیگ ٹھہرائی گئی۔ حالانکہ اسلام اور چین کے کیونز م میں کبھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے برخلاف ہندوستان میں سات کروڑ کے قریب مسلمان آباد تھے۔ جن کے پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ خاندانی اور نسلی تعلقات تک تھے اور ملک کی تقسیم جن اصول پر اور جو اسباب سے ہوئی تھی ان کے پیشی نظر پاکستان کا فرض تھا اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم ان مسلمانوں اور ان کے اسلامی اداروں کی خاطر ہندوستان کے ساتھ ایک ایسی پالیسی پر عمل کرتا جس سے ان مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا۔ لیکن اس نے اس کے برخلاف ایسی پالیسی اختیار کی جس سے ہندوستانی مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

اب کوئی بتائے کہ پاکستان نے یہ جو کچھ کیا کیا اس کو اسلامی نظام زندگی سے کسی درجہ میں بھی

مطابقت حاصل ہے؟ ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں! پورا قرآن پڑھ جائیے۔ اسوۂ رسول کا خوب مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے اسلامی نظام سیاست — یہ سیاست داخلی ہو یا خارجی — پانچ چیزیں اس کے ترکیبی عناصر ہیں۔

(۱) ایمان و من ممل (۲) اپنی اعلیٰ تنظیم و تعمیر (۳) محبت: قرآن میں اس کو سب سے زیادہ موثر حربہ قرار دیا گیا ہے ولا تستوی الحسنۃ ولا السيئة... الآية اسی وجہ سے اقبال نے اس کو خالقِ عالم کہا ہے (۴) عدل و انصاف! اس کی تاکید اس سے زیادہ کیا جوسکتی ہے کہ قرآن میں فرمایا ولا یحب منکره نشان قوم... الآية یعنی یہ کہ دیکھو اے مسلمانوں! کسی شخص یا کسی قوم کا بغض و عناد تم کو نا انصافی کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ نہیں! تم بہر حال انصاف ہی کرو۔ اور اس انصاف کہنے میں اپنے نفع نقصان کی ذرا پروا نہ کرو (۵) پانچویں چیز عہد و پیمان کی پابندی ہے قرآن میں جگہ جگہ اس کا حکم اور اس کی تاکید ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ عہد کی پابندی نہیں کرتے قیامت کے دن انکی کھڑ پٹری سخت ہوگی۔ اور قرآن کے ہی ارشاد اور پھر صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جو نمونہ پیش کیا۔ اس کی روشنی میں اس عہد کا دامن استفادہ دراز ہے کہ ایک مسلمان شخص یا ایک مسلمان حکومت کسی غیر مسلم کے ساتھ معاہدہ کی صورت میں اس غیر مسلم کے برخلاف اپنے کسی مسلمان بھائی کی بھی مدد نہیں کر سکتا۔

ابہ اسلامی سیاست کے ان اصول پنجگانہ کو سامنے رکھیے اور فرمائیے کہ کیا پاکستان کے ارباب اقتدار و سیاست نے اپنے ملک کے امورِ خارجہ یا امورِ داخلی سے متعلق پالیسی یا عمل میں کہیں کسی مقام پر بھی اسلامی سیاست کے ان اصول میں سے ایک اصل پر کوئی عمل کیا ہے؟ اگر نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا۔ بلکہ درحقیقت ان کی پالیسی اور ان کا عمل ان اصول اور اسلام کی تعلیمات کی ٹکڑیوں اور ٹکڑیوں پر متاثر ہے۔ تو پھر کسی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ پاکستان کی شکست اسلام کی شکست ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانہ میں اسلامی نظام پر عمل ممکن نہیں ہے۔

جمال الدین الاسنوی

امدان کی طبقات الشافیتہ

(۸)

جناب حافظ ڈاکٹر عبد العظیم خاں صاحب - ایم۔ اے - پی۔ ایچ۔ ڈی
کمپنر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

باب الصاد المہملۃ

فیہ فصلان۔ الاول فی الاسماء الواقعة فی السیفی والشیخ

۷۳۶۔ العیسیٰ بن محمد بن عبد اللہ ابو بکر البغدادی (م۔ ۳۳۰ھ) ص ۷۸۳

۷۳۷۔ العیسیٰ بن احمد بن اسحاق بن ایوب ابو بکر النیسابوری (۲۵۸-۳۳۲ھ) ص ۷۸۴

۷۳۸۔ عبد اللہ بن احمد بن اسحاق النیسابوری (م۔ ۳۵۰ھ) ص ۷۸۴ [ولد العیسیٰ]

۷۳۹۔ الصابونی، احمد، الجاسن، ص ۲۸۴

۷۴۰۔ المصطوفی، محمد بن سلیمان بن محمد، البوسہل (۲۹۰-۳۶۹ھ) ص ۲۸۵

۷۴۱۔ المصطوفی، بوسہل بن الامام ابی بوسہل (م۔ ۴۴۴ھ) ص ۲۸۶

۷۴۲۔ العیسیٰ بن عبد الواحد بن حسین بن محمد، الباقاسم (م۔ ۳۸۶ھ) ص ۲۸۷

لہ میرزا کی طرف منسوب ہے۔ یہ تصویب ایک جگہ ہے (تجمل ۲/۴۳۹)

٢٨٤- الصیدلانی، محمد بن داؤد بن محمد، البوکر، المروزی - ص ٢٨٤

٢٨٥- ابن الصبّاغ، عبد السید بن محمد بن عبد الوہاب، البونصر البغدادی

(م ٢٨٤ھ) ص ٢٨٨

٢٨٥- احمد بن محمد بن محمد، ابو منصور (م ٢٩٣ھ) ص ٢٩٠

٢٨٦- المبارک بن حمزة بن علی، ابو المنظر المعروف بابن البروزی (م ٥٥٤ھ) ص ٢٩٠

٢٨٧- ابن الصلاح، عثمان بن عبد الرحمن، ابو عمرو، تقی الدین، الشہر زوری

(م ٦٣٣ھ) ص ٢٩٠

الفصل الثانی فی الاسماء المنشدّة علی الکتابین

٢٨٨- الصفّار، محمد بن عبد اللہ بن احمد، ابو عبد اللہ - ص ٢٩١

٢٨٩- الصوفی، احمد بن محمد بن زکریا، ابو العباس، البنسوی (م ٣٩٦ھ) ص ٢٩١

٢٩٠- الصابونی، شیخ الاسلام، اسماعیل بن عبد الرحمن بن احمد، ابو عثمان

(٣٤٣ - ٣٨٩ھ) ص ٢٩٢

٢٩١- الصفّار، محمد بن الحسین بن یحیی، ابو سعد الہمدانی (٣٤٥ - ٣٧١ھ) ص ٢٩٢

٢٩٢- الصفّار، محمد بن القاسم بن حبیب، ابو بکر النیسابوری (م ٦٨٨ھ) ص ٢٩٣

٢٩٣- الصدوقی، اسحاق فقیہ البیہقی - ص ٢٩٣

٢٩٤- ابن ابی الصقر، محمد بن علی بن الحسن، ابو الحسن، الواسطی (٣٠٩ - ٣٩٨ھ) ص ٢٩٣

٢٩٥- ابن الصائغ، یحیی بن علی، القرشی الدمشقی (م ٥٣٣ھ) ص ٢٩٣

٢٩٦- منتخب الدین، محمد، (خال الحافظ بن عساکر) (٣٦٤ - ٥٣٤ھ) ص ٢٩٣

(ولید ابن الصائغ)

٢٩٧- ابن الصفّار، عمر بن احمد بن منصور بن ابی بکر بن محمد، عصام الدین، ابو حفص

(۲۶۶ - ۵۵۳ هـ) ص ۲۹۳

۶۵۸ - الصعبي، عبد الله بن يحيى، ابو محمد، ص ۲۹۵

۶۵۹ - ابن مصري هبة الله بن محفوظ بن الحسن، ابو الغنائم، المصري الدمشقي

(۵۱۱ - ۵۶۳ هـ) ص ۲۹۵

۶۶۰ - ابن الصفار، عبد الله بن عمر، ابو سعد (م ۵۰۸ - ۶۰۰ هـ) ص ۲۹۵

۶۶۱ - ابن ابی الصيف، محمد بن اسماعيل، يعني (م ۶۱۶ هـ) ص ۲۹۵

۶۶۲ - بهام بن راجي الله بن سرايا ابو الغنائم، جلال الدين :

(۵۵۹ - ۶۳۰ هـ) ص ۲۹۵

۶۶۳ - محمد بن محمد تقي الدين، ابو الفتح (م ۶۴۵ هـ) [حفيد بهام بن راجي الله]

۶۶۴ - الصنهاجي، عثمان بن سعيد بن كثير، ابو عمر شمس الدين، الفاسي -

(۵۶۵ - ۶۳۹ هـ) ص ۲۹۶

۶۶۵ - ابن الصائغ، محمد بن عبد القادر بن عبد الخالق، ابو الفاخر، الانصاري الدمشقي

عز الدين (۶۲۸ - ۶۸۳ هـ) ص ۲۹۶

۶۶۶ - الصائغ محمد بن محمد بن عبد الخالق، تقي الدين (م ۶۲۵ هـ) ص ۲۹۶

۶۶۷ - الصقلي، محمد بن محمد بن محمد، فخر الدين (م ۶۲۷ هـ) ص ۲۹۷

باب الصاد المعجمة

۶۶۸ - الضرير، اسماعيل بن احمد بن عبد الله، ابو عبد الرحمن (۳۳۱ - ۴۳۰ هـ) ص ۲۹۸

۶۶۹ - الضرير، احمد بن محمد بن علي بن تميم، ابو سعيد، الخوارزمي (م ۴۳۳ هـ) ص ۲۹۸

۶۷۰ - كمال الضرير، علي بن شجاع بن سالم، ابو الحسن، الهاشمي (۵۷۲ - ۶۶۱ هـ)

ص ۲۹۸

باب الطاء

قیۃ فصلان الاول فی الاسماء الواقعة فی السراۃ فیہ الروضة

۶۷۱۔ الطبری، الحسن بن القاسم، الطوسی (م ۳۵۰ھ) ص ۲۹۹

۶۷۲۔ الطوسی، ابو الحسن، ص ۲۹۹

۶۷۳۔ الطوسی، ابوالحسن بن محمد بن ابیہیم، ابوالحسن (م ۴۱۱ھ) ص ۲۹۹

۶۷۴۔ الطوسی، ابوبکر بن محمد بن بکر، الطوقانی (م ۴۲۰ھ) ص ۳۰۰

۶۷۵۔ بکر (ولد الطوسی ابی بکر) ص ۳۰۱

۶۷۶۔ الطبری، طاہر بن عبد اللہ بن طاہر، ابوالطیب (م ۴۵۰ھ) ص ۳۰۱

۶۷۷۔ الطبری، محمد بن عبد الملک بن خلف، ابوالخلف السلبی (م ۴۷۰ھ) ص ۳۰۱

۶۷۸۔ الطوسی، ابوالحسن، ص ۳۰۲

۶۷۹۔ الموفق بن طاہر، ص ۳۰۳

الفصل الثانی فی الاسماء السراۃ علی الکتابین

۶۸۰۔ الطوسی، محمد بن یوسف (م ۴۴۲ھ) ص ۳۰۳

۶۸۱۔ الطوسی، ابوحامد احمد بن منصور بن عیسیٰ (م ۴۴۵ھ) ص ۳۰۳

۶۸۲۔ الطوقانی، احمد بن عبد اللہ بن محمد بن اسماعیل، ابوالحسن (م ۴۶۵ھ) ص ۳۰۳

۶۸۳۔ الطوقانی، احمد بن محمد بن الحسن، ابوالنظر (م ۴۶۸ھ) ص ۳۰۳

لے طوسی کی طرف نسبت ہے۔ شام میں مرقب اور عساکے مابین ایک شہر کا نام ہے (معجم ۳۰/۴)
لے طیب کی طرف نسبت ہے۔ خوزستان اور واسط کے مابین ایک چھوٹا سا شہر ہے (معجم ۵۶/۴-۵۷)

- ۴۸۴۔ الطبری، الحسین بن عبداللہ، ابو عبداللہ ص ۳۰۴
- ۴۸۵۔ الطوسی، محمد بن یعقوب بن احمد، ابوالحسن (ص ۳۰۴)
- ۴۸۶۔ الطبری، ابوالقاسم ص ۳۰۴
- ۴۸۷۔ الطوسی، ناصر بن احمد بن محمد، ابو نصر (م ۴۶۸ھ)
- ۴۸۸۔ الطوسی، محمد بن شاذان، ابو منصور، القاضی (ص ۳۰۴)
- ۴۸۹۔ الطبری، عبدالکریم بن عبدالصمد بن محمد، ابو معشر (م ۴۸۷ھ) ص ۳۰۴
- ۴۹۰۔ الطراذنی، عبداللہ بن ابی نصر بن ابی علی، ابو بکر (م بعد ۴۹۰ھ) ص ۳۰۵
- ۴۹۱۔ ابن طاووس، احمد بن عبداللہ بن علی بن طاووس، ابوالبرکات البغدادی، الدمشقی (م ۴۹۲ھ) ص ۳۰۵
- ۴۹۲۔ الطالقانی، محمد بن احمد، ابو حفص ص ۳۰۵
- ۴۹۳۔ الطبری، احمد بن علی بن احمد، ابوالعباس (م بعد ۵۰۰ھ) ص ۳۰۵
- ۴۹۴۔ الطوسی، محمد بن حاتم بن عبدالرحمن، ابوالحسن، ص ۳۰۶
- ۴۹۵۔ ابن الطوسی، محمد بن عبد القاہر، ابوالبرکات الموصلی (م ۵۱۸ھ) ص ۳۰۶
- ۴۹۶۔ الطوسی، احمد بن محمد بن عبد الطاہر، ابو نصر الموصلی (۴۳۸-۵۱۵ھ) ص ۳۰۶
- ۴۹۷۔ الطبری، عبد الجلیل بن یحییٰ بکر (م بعد ۵۲۵ھ) ص ۳۰۶
- ۴۹۸۔ الطالقانی، منصور بن محمد بن علی، ابو المنظر (م ۵۲۹ھ) ص ۳۰۷
- ۴۹۹۔ الطبری، طاہر بن مہدی، ابو منصور (م ۵۳۲ھ) ص ۳۰۷

۱۔ جزائر (بالکسویا لفتح) کی طرف نسبت ہے۔ اسباب کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ (مجم ۲/۲۷)

۲۔ قاتقان (لفتح الطاء واللام) کی طرف نسبت ہے۔ دو شہروں کے نام ہیں ایک خراسان میں ہے اور دوسرا قزوین اور ابھر کے درمیان ہیں (مجم ۲/۲۷)

- ۸۰۰۔ الطبری، مروان بن علی بن سلامہ، ابو عبد اللہ (م ۵۵۳) ص ۳۰۷
- ۸۰۱۔ الطوسی، صاعد بن سعید بن محمد، الخطاہ، الخطار (م ۴۰۴) ص ۳۰۷
- ۸۰۲۔ الطرشیشی، محمود بن اسماعیل بن عمر، ابوالقاسم (م ۵۵۵) ص ۳۰۸
- ۸۰۳۔ الطائی، محمد بن محمد بن علی، ابوالفتوح البغدادی (م ۵۵۵) ص ۳۰۸
- ۸۰۴۔ الطبری، ابوالخطاب، احمد بن محمد بن محمد، البخاری (م ۴۹۷-۴۰۰) ص ۳۰۸
- ۸۰۵۔ الخطاب، علی بن علی بن عبید اللہ المعروف بابن البخاری (م ۵۹۳) ص ۳۰۸
- ۵۰۶۔ علی (م ۴۹۷-۵۶۵) ص ۳۰۸۔ [والد ابی طالب علی]
- ۵۰۷۔ عبید اللہ بن محمد بن عبید اللہ، ابولمظفر (م ۵۵۸) [ابن عم ابی طالب]
- ۵۰۸۔ ابوطالب، محمود بن علی بن ابی طالب، التیمی الاصفہانی (م ۵۸۵) ص ۳۰۹
- ۵۰۹۔ الطوسی، محمد بن محمود بن محمد، ابوالفتح، شہاب الدین (م ۵۹۶-۵۲۲) ص ۳۰۹
- ۸۱۰۔ الطوسی، العراقی بن محمد بن السراقی، ابوالفضائل، رکن الدین (م ۶۰۰) ص ۳۰۹
- ۸۱۱۔ الطوسی، عبدالرحمن بن محمد بن محمد بن حمدان، ابوالقاسم (م ۶۲۳-۶۲۴) ص ۳۱۱
- ۸۱۲۔ ابن الطہار، المبارک بن یحییٰ بن ابی الحسن، نصیر الدین (م ۶۲۴-۵۸۹) ص ۳۱۱
- ۸۱۳۔ الطبری، احمد بن عبد اللہ بن محمد، ابوالعباس، محب الدین (م ۶۱۵-۶۹۴) ص ۳۱۲
- ۸۱۴۔ جمال الدین، محمد (م ۶۱۲) [ولد الطبری احمد]
- ۸۱۵۔ محمد بن جمال الدین محمد بن محب الدین، نجم الدین، ابوطاہر (م ۶۵۸-۷۳۰) ص ۳۱۲
- [حفید الطبری احمد]
- ۸۱۶۔ الطوسی، عبدالعزیز بن محمد بن علی، ابو محمد، ضیاء الدین (م ۷۰۶) ص ۳۱۳

لہ طنفرہ کی طرف نسبت ہے۔ جزیرۃ ابن عمر میں ایک شہر کا نام ہے (معجم ۴/۴۳)

باب الظاہ المعجۃ

۸۱۶۔ ابن الطریف، عبداللہ بن عمر بن محمد بن الحسن البلیغی (ولید ۵۱۲ھ - ۱۰۰۰) ص ۳۱۳

۸۱۸۔ علی بن جعفر بن علی بن محمد عبدالظاہر، کمال الدین القوسی

(م ۴۰۱ھ) ص ۳۱۳

باب العین

فیہ فصلان۔ الاول فی الاسماء الواقیۃ فی المسامی فی طبرستان

۸۱۹۔ عبداللہ بن عبدان، ابوالفضل (م ۴۳۳ھ) ص ۳۱۴

۸۲۰۔ الشریف العمری، ناصر بن حسین بن محمد، ابوالفتح (م ۴۴۴ھ) ص ۳۱۴

۸۲۱۔ نصر، ابوالمظفر (۴۱۴ - ۴۷۷ھ) ص ۳۱۵ [ولید الشریف العمری]

۸۲۲۔ العراقی، ابوالفضل ص ۳۱۵

۸۲۳۔ القبادی، محمد بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباد، ابو عاصم، البہاروی۔

(م ۴۵۸ھ) ص ۳۱۵

۸۲۴۔ العبدری، ابوالحسن، علی بن سعید بن عبدالرحمن (م ۴۹۳ھ) ص ۳۱۶

۸۲۵۔ العبادی، ابوالحسن، بن الاستاذ ابی عاصم العبادی۔

(م ۴۹۵ھ) ص ۳۱۶

۸۲۶۔ صاحب الحدیث، الحسین بن علی، ابوعبداللہ الطبری والمعروف ایضاً

بامام الحرمین (م ۳۱۰ھ)

۱۔ کتاب کی طرف منسوب ہے جو مروی میں ایک گاؤں ہے (مجم ۵/۴۵)

٨٢٤ - ابو محمد عبد الرحمن (٢٧٣ - ٥٥٣) ص ٣١٤ [ولد صاحب العقدة]

٨٢٨ - ابراهيم بن عبد الرحمن بن علي بن عبد الله ابو اسحاق (٢٨٢ - ٥٢٣ هـ) ص ٣١٤
[عفيد صاحب العقدة]

٨٢٩ - ابن ابي عصرون، عبد الله بن محمد بن هبة الله بن علي بن المطهر،
شرف الدين ابو سعد التميمي، الحديشي، الموصل (٢٩٣ - ٥٨٥ هـ) ص ٣١٤

٨٣٠ - يعقوب بن عبد الرحمن، شرف الدين (م ٦٦٥ هـ) [خفيد ابن ابي عصرون]

٨٣١ - البجلي، اسعد بن محمود بن خلف، منتخب الدين ابو الفتح، الاصفهاني
(٥٤٥ - ٦٠٠ هـ) ص ٣١٩

٨٣٢ - عز الدين بن عبد السلام، عبد العزيز بن عبد السلام الدمشقي، المغربي
(٥٤٨ - ٦٦٠ هـ) ص ٣١٩

٨٣٣ - عبد اللطيف (٦٢٨ - ٦٩٥ هـ) ص ٣٢٠ [ولد عز الدين ابن عبد السلام]

الفصل الثاني في الاسماء النادرة على ائمة ائمة

٨٣٤ - عبدان، عبد الله بن محمد بن عيسى، ابو محمد المروزي (٢٢٠ - ٢٩٣ هـ) ص ٣٢١

٨٣٥ - غلام عراق، بشر بن نصر بن منصور، الباقاسم، البغدادى

(م ٣٠٢ هـ) ص ٣٢٢

٨٣٦ - ابو عمارة، يعقوب بن اسحاق بن ابراهيم النيسابورى، الاسفراينى

(م ٣١٦ هـ) ص ٣٢٢

٨٣٧ - الكركى، محمد بن بشر بن عبد الله البكرى الزنيزى

(م ٣٣٢ هـ) ص ٣٢٢

- ۸۳۸۔ العسکری، محمد بن علی ابو بکر المصیری (۳۲۹ھ) ص ۳۲۳
- ۸۳۹۔ ابو احمد بن عدی، بن محمد الجرجانی (۶۷۱-۳۶۵ھ) ص ۳۲۳
- ۸۴۰۔ العروسی، علی بن احمد بن الحسن، ابو الحسن (م ۳۷۱ھ) ص ۳۲۳
- ۸۴۱۔ العیسیٰ، محمد بن العباس بن احمد بن محمد بن عیسیٰ، ابو عبد اللہ الضبی الہروی (۲۹۴-۳۷۸ھ) ص ۳۲۴
- ۸۴۲۔ العالم، احمد بن محمد بن محمد بن جعفر، ابو بشیر الہروی (۳۲۸-۳۸۵ھ) ص ۳۲۴
- ۸۴۳۔ العباسی، جعفر بن القاسم بن جعفر، ابو محمد (۳۶۱-۴۱۵ھ) ص ۳۲۴
- ۸۴۴۔ العراقی، محمد بن اسماعیل بن محمد بن الطوسی، ابو علی (م ۴۵۹ھ) ص ۳۲۵
- ۸۴۵۔ العبدوسی، عبد اللہ بن العباس، ابو القاسم، السخسی (م ۴۶۱ھ) ص ۳۲۵
- ۸۴۶۔ العراقی، نصر بن بشیر بن علی، ابو القاسم (م ۴۷۷ھ) ص ۳۲۵
- ۸۴۷۔ العراقی، علی بن محمد بن اسماعیل، ابو الحسن (م ۴۹۸ھ) ص ۳۲۵
- ۸۴۸۔ ابن عربیہ، علی بن الحسین بن عبد اللہ، ابو القاسم (۴۱۴-۵۰۲ھ) ص ۳۲۶
- ۸۴۹۔ العدنی، محمد بن عبد ربیع بن الحسن، ابو عبد اللہ (ص ۳۲۶)
- ۸۵۰۔ ابن النکسورۃ، عبد الرحمن بن جبر بن محمد، ابو القاسم الرعینی، القیروانی (م ۵۱۷ھ) ص ۳۲۶
- ۸۵۱۔ العجلی (عثمان بن علی ابو سعید البندری) (۴۳۵-۵۲۶ھ) ص ۳۲۷
- ۸۵۲۔ العجلی، سعد بن علی بن الحسن، ابو منصور (م ۴۹۴ھ) ص ۳۲۷

لہ قال الاسنوی: "العسکری نسبة الى عسکر مصر وی حارة من مدینة مصر تسمى العسکر تزلها عسکر صالح بن علی بن عبد اللہ بن عباس" (طبقاتہ ص ۳۲۳)

لہ قال الاسنوی: "العبدوسی نسبة الى عبدوس حیدر" (طبقاتہ ص ۳۲۵)

- ۸۵۳- احمد بن علی الزمالي (۴۵۸-۵۳۵هـ) ص ۳۲۷ [ولدا لمجلی سعدا]
 ۸۵۴- محمد بن محمد بن عمرو بن الأصبغاني (م ۵۳۸هـ) ص ۳۲۷
 ۸۵۵- العراقي، محمد بن علی بن عبد الله، ابو عبد الله البغدادي (م ۴۸۰-۵۰۰هـ) ص ۳۲۷
 ۸۵۶- ابن عساکر، هبة الله بن الحسن بن حبة الله، ابو الحسن صابن الدين
 (۴۸۸-۵۶۲هـ) ص ۳۲۷
 ۸۵۷- ابن عساکر، ابو القاسم، علی بن الحسن (۴۹۹-۵۷۱هـ) ص ۳۲۹
 ۸۵۸- ابن عساکر، عبد الله بن محمد بن الحسن، ابو المنظر (م ۵۹۱هـ) ص ۳۲۹
 ۸۵۹- ابو محمد القاسم (۵۲۷-۶۰۰هـ) ص ۳۲۹ [ولدا لمجلی ابی القاسم ابن عساکر]
 ۸۶۰- ابن عساکر، عبد الرحمن بن محمد بن الحسن، فخر الدين، ابو منصور
 (۵۰۵-۶۲۰هـ) ص ۳۳۰
 ۸۶۱- ابن عساکر، الحسن بن محمد، زين العابدين ابو البركات (۵۴۲-۶۲۷هـ)
 [اخو الفخر عبد الرحمن ابن عساکر]
 ۸۶۲- العراقي، مكي بن علی بن الحسن، ابو الحزم الضريبي (م ۵۹۳هـ) ص ۳۳۱
 ۸۶۳- العراقي، ابراهيم بن منصور بن المسلمة ابو اسحاق (۵۱۰-۵۹۶هـ) ص ۳۳۱
 ۸۶۴- ابو محمد عبد الحكم (م ۳۳۱) [ولدا العراقي]
 ۸۶۵- قاضي عسکر، محمد بن الحسين بن محمد ابو عبد الله الشريف شمس الدين
 (م ۶۵۰هـ) ص ۳۳۱
 ۸۶۶- عبد العظيم، بن عبد القوي بن عبد الله، زكي الدين المنذري
 (۸۵۱-۶۵۶هـ) ص ۳۳۲
 ۸۶۷- العباسي الشريف عماد الدين، ص ۳۳۳
 ۸۶۸- منصور بن سليم بن منصور الهذلي، ابو المنظر، جميع الدين (م ۶۷۳هـ) ص ۳۳۳

- ۸۶۹- ابن ابيجیل، احمد بن موسی بن علی بن عجل، ابو العباس (م ۶۸۳ هـ) ص ۳۳۳
- ۸۷۰- ابن دقیق العید، محمد بن علی بن وهب بن مطیع، تقی الدین ابو الفتح القشیری (۶۲۵-۷۰۲ هـ) ص ۳۳۳
- ۸۷۱- صلاح الدین موسی (۶۴۱-۶۸۵ هـ) ص ۳۳۹ [اخوان دقیق العید]
- ۸۷۲- محب الدین علی (۶۵۷-۷۱۶ هـ) ص ۳۳۹ [ولد ابن دقیق العید]
- ۸۷۳- علم العراقی، عبدالکریم بن علی بن عمر علم الدین الأنصاری (م ۷۰۴ هـ) ص ۳۳۹
- ۸۷۴- العاقولی، عبدالقدیر بن محمد بن علی، جمال الدین البغدادی (م ۷۲۸ هـ) ص ۳۴۰
- ۸۷۵- العیبری، الشریف برهان الدین عبید الله الهاشمی الحسینی (م ۷۴۳ هـ) ص ۳۴۰
- ۸۷۶- ابن عدلان، محمد بن احمد بن عثمان بن ابراهیم - - - - بن عدلان شمس الدین (۶۶۳-۷۴۹ هـ) ص ۳۴۰
- ۸۷۷- العفص، عبدالرحمن بن احمد بن عبدالغفار عضد الدین (م ۷۵۳ هـ) ص ۳۴۱
- ۸۷۸- الحلای، خلیل بن کیکاری، صلاح الدین (۶۹۴-۷۶۰ هـ) ص ۳۴۱
- ۸۷۹- ابن حقیل، عبدالقدیر بن عبدالرحمن، بهار الدین (م ۷۹۹ هـ) ص ۳۴۲

باب العین المعجزة

فیه فصلات الاول فی الاسماء الواقعة فی السرافی والمرمقة

- ۸۸۰- الخزالی، محمد بن محمد بن محمد، الامام حجة الاسلام (۶۵۰-۷۵۰ هـ) ص ۳۴۳
- ۸۸۱- الخزالی، احمد بن محمد بن محمد، الجافقود محمد الدین (م ۷۲۰ هـ) ص ۳۴۵

۸۸۲۔ الغزالی، احمد بن محمد (م ۴۳۵ھ) ص ۳۴۶ [محم الغزالی محمد]

۸۸۳۔ خلف بن رحمة ص ۳۴۶ [تلمیذ الغزالی محمد]

الفصل الثانی فی الأسماء المنسوبة علی الکتابین

۸۸۴۔ صاحب النیلانیات، محمد بن عبد اللہ بن ابراہیم النوار الجیلی

(۲۶۰-۳۵۴ھ) ص ۳۴۷

۸۸۵۔ الغزجانی، عبد الرحمن بن الحسین ابوالاحمد۔ ص ۳۴۷

۸۸۶۔ الغزالی، عبد الباقی بن محمد بن عبد الواحد، ابو منصور (م ۵۱۳ھ) ص ۳۴۷

۸۸۷۔ ابن القبری، علی بن روح بن احمد، ابوالحسن النہروانی (م ۶۱۵ھ) ص ۳۴۷

باب الفاء

فیہ فصلان، الأول فی الأسماء الواقعة فی الرافعی والشریفة

۸۸۸۔ الفارسی، محمد بن الحسین بن سہیل، ابو کمر (م ۳۵۰ھ) ص ۳۴۸

۸۸۹۔ الفارسی، احمد بن میمون، ابو محمد۔ ص ۳۴۸

۸۹۰۔ القوری، عبد الرحمن بن محمد بن قوریان، ابوالقاسم (م ۴۶۱ھ) ص ۳۴۸

۸۹۱۔ الفارقی، الحسین بن ابراہیم، ابو علی (۳۳۳-۵۲۸ھ) ص ۳۴۹

۸۹۲۔ ابوالفتح ابوالفتح، عبد اللہ بن علی بن ابی عقامتہ الرعی، الیمنی، البغدادی

ص ۳۵۰

۱۔ عبد جان کی طرف منسوب ہے ایمان میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ (مجم ۲/۲۱۶)

۲۔ قوریان کی طرف نسبت ہے۔ ہندان کے قریب ایک گھاؤں کا نام ہے (مجم ۲/۲۵۹)

۸۹۲۔ الفاشانی، عبدالرحمن بن عبدالمک بن علی، ابوالفضل۔ ص ۳۵۱

۸۹۳۔ فخرالدین الرازی، محمد بن عمر بن الحسن، القرشی البکری الطبری۔

(۵۴۴-۵۶۰ھ) ص ۳۵۱

الفصل الثانی فی الاسماء المنشدۃ علی الکتابین

۸۹۵۔ عبیدویقال عبید اللہ بن عمر بن احمد، ابوالقاسم البغدادی المعروف بالفقہ

(۲۹۵-۳۶۰ھ) ص ۳۵۳

۸۹۶۔ فارس بن زکریا بن حبیب۔ ص ۳۵۳ [وہ مولد صاحب المجل فی اللغة]

۸۹۷۔ الفورکی، محمد بن موسی بن مردویہ بن فورک، ابوعبد اللہ الاصغہانی۔ ص ۳۵۳

۸۹۸۔ الفارسی، محمد بن احمد بن علی، ابوبکر (م ۳۶۲ھ) ص ۳۵۳

۸۹۹۔ ابن فورک، ابوبکر بن محمد بن الحسن بن فورک الاصغہانی (م ۴۰۶ھ) ص ۳۵۴

۹۰۰۔ القرظی، عبید اللہ بن محمد بن احمد بن محمد بن علی بن مہران البغدادی، المقری

(م ۴۰۶ھ) ص ۳۵۴

۹۰۱۔ القرظی، علی بن محمد بن خلف، ابوالحسن البغدادی (م ۴۲۰ھ) ص ۳۵۴

۹۰۲۔ ابن الفلکی، علی بن الحسن بن ابی بکر، ابوالفضل، الہندی (م ۴۲۲ھ) ص ۳۵۵

۹۰۳۔ ابن فرغانہ، احمد بن الفتح بن عبد اللہ، ابوالحسن، الموصلی (م ۴۳۰ھ) ص ۳۵۵

۹۰۴۔ الفتاکی، احمد بن محمد، ابوالحسن الرازی (م ۴۴۴ھ) ص ۳۵۵

۹۰۵۔ الفاشانی، ابوطاہر بن عبد العزیز بن احمد (۳۸۵-۴۶۳ھ) ص ۳۵۶

۹۰۶۔ الفارسی، عقیل بن محمد بن علی، ابوالفضل (م فی حدود ۴۷۰ھ) ص ۳۵۶

- ۹۰۷۔ الفاروقی، الفضل بن محمد بن علی، ابوعلی (م ۴۷۷ھ) ص ۳۵۶
- ۹۰۸۔ انقیلی، اسماعیل بن الفضل، ابو محمد، الہروی (م ۴۸۸ھ) ص ۳۵۶
- ۹۰۹۔ فارس، بن الحسین بن فارس، السہروردی البغدادی الکفی، ابو شجاع (م ۴۹۱ھ) ص ۳۵۷
- ۹۱۰۔ الفاروقی، محمد بن الفرع السلمی، ابو الغنائم (م ۴۹۲ھ) ص ۳۵۷
- ۹۱۱۔ الفاعلی، عبد الوہاب بن محمد بن عبد الوہاب، ابو محمد، الشیرازی (م ۴۱۳ - ۵۵۰۰ھ) ص ۳۵۷
- ۹۱۲۔ الفاشی، زید بن الحسین بن محمد، البغدادی (م ۵۲۸ - ۵۲۸ھ) ص ۳۵۸
- ۹۱۳۔ الفاشانی، محمد بن محمد بن یوسف، ابو نصر (م ۵۲۹ھ) ص ۳۵۸
- ۹۱۴۔ الفارسی، عبد الغافر بن اسماعیل بن عبد الغافر، ابو الحسن (م ۵۱۱ - ۵۲۹ھ) ص ۳۵۸
- ۹۱۵۔ الفراءوی، محمد بن الفضل، ابو عبد اللہ الصاعدی النیسابوری (م ۴۴۱ - ۵۳۰ھ) ص ۳۵۹
- ۹۱۶۔ الفندی، محمد بن سلیمان بن الحسن، ابو عبد اللہ (م ۴۶۲ - ۵۴۴ھ) ص ۳۵۹

۱۔ فاروقی طرف منسوب ہے۔ یہ طوس میں ایک گاؤں ہے (معجم ۲/۲۲۸)

۲۔ فامیہ کی طرف نسبت ہے۔ فامیہ ممس کے ساحلی علاقے میں ایک بڑے شہر کا نام ہے (معجم ۲/۲۲۸)

۳۔ فاش کی طرف نسبت ہے۔ فاش ملک یمن میں ایک گھاٹی کا نام ہے (معجم ۲/۲۳۴)

۴۔ فراوہ (فتح الفاء والراء) کی طرف نسبت ہے۔ فاش کے علاقے میں ایک چھوٹا سا شہر ہے (معجم ۲/۲۴۵)

۵۔ فندی (بضم الفاء و سکون النون و کسر الدال) کی طرف نسبت ہے جو مرو میں ایک گاؤں ہے (معجم ۲/۲۴۸)

۹۱۸- ابن الفراء، اہل بیت بن علی بن اہل بیت بن علی بن محفوظ السلسی، الآدی

٩١٩- الخرقى يعيش بن صدقة بن علي، البجلي القاسم (م ٥٩٣ هـ) ص ٣٤٠

٩٢٠- ابن فضلان، يحيى بن علي بن الفضل، أبو القاسم البغدادى (م ٩٩٥ هـ).

۴۲۱۔ ابو عبد اللہ محمد بن محمد بن الدین (م ۴۳۱ھ) ص ۳۶ [ولد ابن فضلک]

۹۲۲۔ عبدالرحیم بن محمد بن محمد بن یاسین، ابوالری (۵۶۸-۵۶۳ھ) ص ۳۶۲

[سید ابن فضلان]

٩٣٣- القاضي الفاضل، عبد الرحيم بن القاضي الاشرف ابي الحسن علي بن الحسن ابو علي الغضنفر،

محمی الدین (۵۲۹-۵۹۶ھ) ص ۳۶۲

٩٢٣- الفارسی، عبدالسلام بن محمود بن محمد، ظہیر الدین (م ٥٩٦ھ) ص ٣٦٢

٣٥٥ - الفارقي، علي بن علي بن سعادة البر الحن (م ٤٠٢ هـ)، ص ٣٦٣

۹۳۶۔ الفارسی محمد بن ابراہیم بن احمد، ابو عبد اللہ الشیرازی، فخر الدین۔

(م ۶۲۲) ص ۳۶۵

٩٢٤- الفارقي، عمر بن اسماعيل بن مسعود، رشيد الدين، الجفص الربيعي

۳۶۵ ص (۵۹۸ - ۵۹۷)

٩٢٠ - الفراعنة، عبد الرحمن بن ابراهيم بن سباع، ابو محمد تاج الدين، الفراءى المشقى

۳۴۴ ص (۷۴۹-۷۴۸)

۱۔ فرغانہ کی طرف نسبت ہے۔ ماوراءاتہر میں ایک بڑا شہر ہے (مجموعہ ۲/۲۵۳)

۱۳۶۶

۹۲۹۔ الفزادی، احمد بن ابراہیم بن سباع، شرف الدین (۴۳۰-۷۰۵ھ) ص ۳۶۷

[اغما الفکاح]

۹۳۰۔ برہان الدین ابراہیم (م ۷۲۹ھ) [ولد الفکاح] ص ۳۶۷

۹۳۱۔ الفاروقی، احمد بن ابراہیم بن عمر، ابوالعباس، عزالدین (م ۶۹۹ھ) ص ۳۶۸

۹۳۲۔ الفاروقی، عبد اللہ بن مروان بن عبد اللہ، ابو محمد، زین الدین

(م ۷۰۲ھ) ص ۳۶۸

۹۳۳۔ احمد بن فرج بن احمد، ابوالعباس، الغنی الاشبیلی (۶۲۵-۶۹۹ھ) ص ۳۶۸

۹۳۴۔ الفاروقی، عبد اللہ بن ابی الرضا، ابو کبر، نصیر الدین (م ۷۰۶ھ) ص ۳۶۹

لے فاروق کی طرف نسبت ہے۔ واسطہ اور مزار کے مابین دجلہ کے کنارے ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ جہاں بازار وغیرہ بھی لگتے ہیں (معجم ۲۲۹)

ندوة المصنفین دہلی

۱۹۷۱ء کی زیر طبع

۱۹۷۰ء کی مطبوعات

- | | | |
|---|------|--|
| ۱۔ تفسیر منطہری اردو۔ نوں جلد | ۱۷/- | ۱۔ تفسیر منطہری اردو دسویں جلد زیر طبع |
| ۲۔ حیات (مولانا) سید عبد الحمید | ۱۱/- | ۲۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج |
| ۳۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی روشنی | ۹/- | ۳۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان |
| ۴۔ آثار و معارف | ۱۰/- | ۴۔ ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط |

ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

سید احمد شہید اور ان کو دیوبندی رفقاء (تاریخ دیوبند کے زیرتالیف جدید ایڈیشن کا ایک باب)

از سید محبوب رحوی

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر

میں مغلوں کی قوت جس کی عظمت کا ڈھکا کابل اور قندھار سے راس کمری اور آسام تک
ٹھہرائی سو برس تک بجاتا رہا تھا، مضاعف ہو چکی تھی اور تمام صوبے ایک ایک کے مرکز سے الگ ہو گئے
تھے۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے مختلف خطوں کو باہم جوڑ کر دو سو برس میں جو عظیم الشان
سلطنت قائم کی تھی اس کی سیاسی عظمت اور برتری کا علم سرنگوں پر ہوا تھا، سلطان ٹیپو نے اس کی
رگوں میں ہر چند گرم خون دوڑانے کی کوشش کی مگر اس کو خود اپنی غدار سی اور کوتاہ اندیشی نے
موت کی نیند سلا دیا، غرض کہ اٹھارہویں صدی کے ختم ہوتے ہوئے سلطنت مغلیہ کے ساتھ
ساتھ ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہو کر انگریزی اقتدار کی صبح صادق نمودار ہو چکی تھی،
انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں تقریباً پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر اقتدار آ چکا تھا، صرف
شمال مغرب میں دریائے ستلج کے پار سکھوں کی حکومت باقی رہ گئی تھی، جس سے ملتان میں
انگریزوں نے اتحاد کا معاہدہ کیا ہوا تھا جو معاہدہ امرتسر کے نام سے موسوم ہے۔

یہ تھے ہندوستان کے سیاسی حالات، جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی عظیم تحریک عالم وجود میں آئی۔ عوامی سطح پر انگریزوں کے خلاف یہ پہلی تحریک تھی اس کا آغاز انیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہوا۔ اس تحریک کے قائد اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ اور مجاہد حضرت سید احمد شہیدؒ تھے۔ اس تحریک میں شمال و مغرب اور مشرقی ہندوستان کے بہت سے مجاہدین کے ساتھ دہلی ہند کے بھی متعدد افراد شریک تھے، جن کا ذکر کرنا یہاں مقصود ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جن لوگوں نے ملک کی بہترین خدمات انجام دی ہیں یہ حضرات ان کے ہر اول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں، ہماری ملی زندگی کو ہلاکت سے بچانے کے لیے یہ پہلا قدم تھا جو اٹھایا گیا، سید صاحب اور ان کے رفقاء کی قوتِ عمل اور ایمان و یقین کی پختگی پھیرت ہوتی ہے۔ مجاہدین کا ہر فرد اس نشے میں سرشار تھا اور اپنی اپنی بساط کے مطابق سرگرم عمل، سب ایک ہی دھن میں لگے رہتے تھے، حادثہ روزگار سے بے پرواہ ہو کر یہ لوگ جس کٹھن ماہ پر گمازن ہوئے اس سے کبھی سرمو انحراف نہ کیا، مناسب ہو گا کہ ان افراد کے ذکر سے پہلے تحریک اور اس کے سربراہ کے حالات مختصر طور پر بیان کر دیے جائیں۔

سید احمد شہیدؒ | سید احمد شہیدؒ مشرقی یو، پی میں ملے بریلی کے رہنے والے تھے۔ یہ اس خاندان کے ختم چراغ تھے جو اپنے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ شاہ علم اللہؒ کی خانقاہ بھیہ علم اللہ کے نام سے مشہور تھی، جس کے فیوض کم و بیش سو سال سے اودھ کے تشنہ لبوں کو سیراب کر رہے تھے، اسی تکیہ شاہ علم اللہ میں ہر صفر ۱۲۱۲ھ کو سید صاحب پیدا ہوئے، باپ کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ چکا تھا۔ نوجوانی میں روزگار کا تلاش میں کہنہ نہ پہنچے، جو اس وقت، اودھ کا دارالسلطنت تھا، لکھنؤ میں گوہر مقصود تاج محل نے پہلی بار رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر حضرت شاہ عبدالغنیؒ (وفات ۱۲۳۰ھ) سے بیعت کر کے کمالات روحانی حاصل کئے۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے کچھ کتابیں پڑھیں، مگر طبعی

ان کی سپاہیانہ طبیعت اور جذبہ خدمت دین نے کشال کشال ان کو نواب امیر خاں والی ٹوہنگ سے وابستہ کر دیا۔

نواب امیر لدولہ امیر خاں کا تعلق صوبہ سرحد کے آزاد قبائل سے تھا۔ امیر خاں کا دادا محمد شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں ہندوستان آیا۔ وہ اکثر روکھینڈ کی لڑائیوں میں شریک رہا اور آخر میں دہلی سنہل (مراد آباد) میں سکونت اختیار کر لی، اس کے بیٹے حیات خاں نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا، اس کے یہاں ۱۱۸۲ھ تا ۱۱۹۷ھ میں امیر خاں پیدا ہوا۔ نوجوانی میں چند رفیقوں کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا، اس زمانہ کے جاگیرداروں کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی ہم پیش آتی تو عارضی طور پر فوج بھرتی کر لیتے تھے۔ امیر خاں نے راجستھان، گجرات اور وکن کے کئی مقامات میں عارضی ملازمت کی، من چلا آدمی تھا، روپیہ دل جاتا تو اپنے ساتھیوں کو نہال کر دیتا، رفتہ رفتہ اس کی قوت بڑھتی گئی اور ہندوستان کے سرداروں میں سب سے زیادہ طاقتور بن گیا۔ ایک زمانہ میں اندوہ کے مہاراجہ جیونت ماؤ ہلکے کے ساتھ بھی رہا۔ مگر جب ہلکے نے انگریزوں سے صلح کر لی تو امیر خاں دربار اندوے پور سے وابستہ ہو گیا، ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جاں باز جمع ہو گئے تھے، ایک ہندو مصنف مومن سنہامتہ نے لکھا ہے کہ امیر خاں ایک لائق قائد اور بہادر سپاہی تھا، اس کی فوج بہت عمدہ تھی اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں سارو سامان کے لحاظ سے بہترین فوج سمجھی جاتی تھی۔

(لارڈ ہسٹنگز اور ہندوستانی مسلمان مصنف مومن سنہامتہ)

اتنی بڑی قوت کو انگریز وسط ہند میں آباد بھڑو دینے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، مگر انہیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کچھ میدان میں ٹکر لیں اس لیے ریشہ دو انڈیا کا بال بکھایا گیا، نواب کے ساتھیوں کو توڑا گیا، یہاں تک ۱۸۱۷ء میں نواب تنہا رہ گیا۔ انگریزوں نے جموں و کشمیر سے پیش قدمی شروع کی، امیر خاں گھر گیا (باقی صفحہ ۱۰۰)

سید صاحبؒ یہ نصب العین لے کر نواب امیر خاں کے پاس گئے تھے کہ اس کی عظیم الشان قوت سے وطن کی آزادی اور احمیائے اسلام کا کام لیا جائے اور مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنایا جائے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی اس روح کو از سر نو زندہ کیا جائے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے طغرائے امتیاز تھی، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو جو تیسری سے انگریزوں کے قبضے میں جا رہا تھا ان کی دست برد سے بچایا جائے۔ مگر جب ان کی یہ خوش فکرائی اندازہ و پوری نہ ہوئی اور نواب امیر خاں نے سید صاحبؒ کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو سید صاحبؒ نواب امیر خاں سے علحدہ ہو کر دہلی چلے گئے۔

ٹونک سے واپسی کے بعد سید صاحبؒ نے اپنے نصب العین کے لیے دو آپہ کاروں شروع کیا، جس میں عقائد و اعمال کی درستگی اور معاشرتی اصلاحات کے کام سے ابتدا کی گئی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ جہاد کی تیاری کے لیے جنگی تربیت دینے کا کام بھی شروع کر دیا گیا، مریدین کو ضبط و تحمل و جفا کشی اور سخت کوشی کا عادی بنایا گیا۔ دورے کے زمانہ میں رائے بریلی میں چند ماہ تک قیام رہا، اس کے متعلق سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ یہ زمانہ عجیب ذوق و شوق و لذت و صلوات اور جفا کشی کا تھا، جو مہاجرین کے قیام مدینہ منورہ سے بہت مشابہ تھا۔ سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء جن میں ہندوستان کے جلیل القدر علماء اور صاحب سلسلہ مشائخ بھی تھے۔ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے مشقت کا کام کرتے تھے، لکڑیاں چیرتے، گھاس پھیلتے، اینٹیں تھاپتے مسجدیں تعمیر کرتے، فاقہ تک کرتے، مگر ہر حال میں خوش و خرم رہتے، ان میں اچھے اچھے عالی خاندان خوش حال امیر اور رئیس زادے بھی تھے، بہت نازک طبع اور ناز پروردہ نوجوان تھے، ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، بعضوں کے سینکڑوں ہزاروں متقد و مرید تھے، مگر گھروار

(باقی صفحہ کاہ اشیر) اور اسے مجبور ہو کر انگریزوں سے صلح کرنی پڑی، معاہدہ کی رو سے صرف ریاست

ر سید احمد شہید ص ۳۳۰

ٹونک کا اقتدار امیر خاں کے پاس باقی رہ گیا

عیش و آرام، مشیت و محنت و میت سب کچھ چھوڑ کر اس دور پر چلے ہوئے تھے اور ہزاروں درجے
خوش تھے، انہیں میں شاہ عبد الرحیم صاحبؒ بھی تھے۔ عرب کے ہندوستان میں ہزار ہا مرید تھے مگر وہ
یہاں غلام سے خادم اور مراد سے مرید بنے ہوئے تھے، انہیں میں مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی
مردم جہاں اور خاندان ولی اللہ کے چشم چراغ مولانا عبد الحمیدؒ اور مولانا محمد اسماعیلؒ بھی تھے۔
اس دور سے قبل شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے اپنے تمام شاگردوں اور تمام اعزاء و
اقارب کو ہدایت کر دی تھی کہ سید صاحبؒ سے باقاعدہ بیعت کر کے کمالات روحانی سے استفادہ
کریں گے۔

جیسا کہ اعلیٰ لہر گذر چکا ہے۔ سید صاحبؒ کے مریدین میں بڑے بڑے علماء و مشائخ اور صاحب
ثروت لوگ شامل تھے۔ یہ جماعت قافلہ کے نام سے موسوم تھی، قافلہ جہاں جاتا لوگ نہایت
عقیدہ مندی کے ساتھ پیش آتے اور دعوتیں کرتے تھے۔

۱۔ شاہ عبد الرحیم مسہار نپندی (۱۲۱۵ھ - ۱۲۴۶ھ) سادات حسینی سے تھے؛
طریقہ چشتیہ میں شاہ عبد الہارمیؒ مروہی (وفات ۱۲۲۶ھ - ۱۲۸۱ھ) سے بیعت تھے۔ پھر
سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے۔ سید صاحبؒ سے بیعت کر کے وقت خود ان کے ہزاروں مرید تھے
میاں جی نور محمد جھنپھانوی (وفات ۱۲۵۹ھ - ۱۲۸۳ھ) نے جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
(وفات ۱۲۳۵ھ - ۱۲۹۹ھ) کے پیرومرشد تھے۔ شاہ عبد الرحیمؒ سے خلافت حاصل کی تھی، سفر جہاد
میں سید صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ ۱۲۷۶ھ - ۱۲۸۳ھ) میں بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔
مولانا محمد یوسف پھلتیؒ مولانا عبد الحمیدؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے حالات کی تفصیل کے لیے
مہر صاحبؒ کی کتاب جماعت مجاہدین ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ سیرت سید احمد شہید مفسر مولانا ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ ناسی پریس لکھنؤ
۱۳۲۹ھ میں ۹۷۷۷

سید صاحب اصلاح و تربیت کے سلسلے میں جہاں جہاں گئے وہاں ان کے مریدین و معتقدین کا ایک حلقہ قائم ہو گیا اور عقائد و اعمال میں بڑی اصلاح ہو گئی، چنانچہ ڈیڑھ سو برس گزرنے کے باوجود اس کے اثرات آج تک ان مقامات میں پائے جاتے ہیں، جو لوگ جماعت مجاہدین میں شامل تھے۔ ان کو عقائد و اعمال کی معمولی لغزشیں بھی گوارہ نہ تھیں، ایک موقع پر کسی مجاہد نے ایک گاؤں کے قیام میں کسی سے چھاپہ مانگ لی تھی تو جماعت کے قاضی نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے صاف طعنے کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو تمام مضابطوں کی پابندی لازم ہوگی، منظور نہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔

جذبہ اخوت کا یہ حال تھا کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دیتا تھا، بسا اوقات فاقوں کی فوجت آجاتی تھی تو جنگل کے پتے اور بڑی بوٹیاں ابال کر کھالیتے تھے مگر حرف شکایت نہاں پر نہ آتا۔ راجہ حق میں بڑی سے بڑی تکلیف کو خندہ پیشانی سے انگیز کر لیتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مجاہدین کے اعمال و کردار کو دیکھ کر قرن اول کے صحابہ کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں سید صاحب قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے، تقریباً سات سو افراد ہمراہ تھے۔ ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء میں سفر حج سے واپسی ہوئی، وطن پہنچ کر وہ ہمہ تن جہاد کے سر و سامان میں مشغول ہو گئے۔ عام خیال یہ ہے کہ سید صاحب کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا، اس لیے کہ پنجاب میں سکھ حکومت مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہی تھی، مگر حقیقت جہاد کا اصل رخ انگریزوں کی جانب تھا، اس وقت ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں انگریزوں کے خلاف مرکز ہما کر جنگ کی جائے، اسی لیے آپ نے صوبہ سرحد کو منتخب کیا وہاں پنجکوان کو افغانستان اور بخارا وغیرہ کی حکومتوں سے امداد ملنے کی توقع تھی۔ چنانچہ ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء میں قافلے کے ساتھ وطن عزیز کو خیر باد کہا اور آزاد قبائل کا امداد کیا، پنجاب کے راستے سے گذرنا مشکل تھا۔ اس لیے راجستھان کا طویل راستہ تجویز کیا گیا اس سفر کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب قافلہ گوالیار پہنچا تو مہاراجہ دولت راؤ سندھیا اور ریاست گوالیار کے وزیر راجہ چندر راؤ

نے بڑے اہتمام کے ساتھ قلعے کی دعوتیں کیں، مہارانی نے اصرار کیا کہ سید صاحب اتنی مدت گوالیار میں قیام کریں کہ لشکر کے لیے پورا ساز و سامان فراہم کیا جاسکے۔ مگر سید صاحب نے معذرت کی بلکہ

گوالیار میں سید صاحب نے ہجراہیوں کو باقاعدہ فوجی طریقے پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر جماعت کا ایک مستقل سرسکر بنایا گیا۔ قافلہ گوالیار سے روانہ ہو کر سندھ ہونا ہوتا ہوا قندھار اور کابل کے راستے سے صوبہ سرحد میں داخل ہوا، آزاد قبائل کے خوانین اور عوام کثرت سے سید صاحب کے حلقہ بیعت میں داخل ہو گئے، صوبہ سرحد میں پہنچنے پر ۱۲ جمادی الثانیہ ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء کو بالاتفاق سید صاحب کے ہاتھ پر امامت و خلافت کی بیعت کی گئی۔

سید صاحب نے وہاں مرکز قائم کرنے کے باقاعدہ حکومت کا اعلان کر دیا اور والی کابل، سلطان ہرات، شاہ بخارا، رئیس قلات اور آزاد قبائل کے سرداروں کو امداد کے لیے خطوط لکھے، ان خطوط میں جہاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا گیا تھا کہ جہاد کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے۔

اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے یہ مجاہدین کیا تھے؟ اس کا جواب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زبان سے سنئے :-

”یہ وہ بے نظیر جماعت تھی جس کی مثال اتنی بڑی تعداد میں ادا اس جامعیت و کمالیت کے ساتھ خیر القرون کے بعد بہت کم ملتی ہے، ان کی صحیح اور محتاط تعریف یہ ہے کہ وہ تیسری صدی میں مسلمانوں کا نمونہ تھے، یہ لوگ بلا مبالغہ عقائد، اعمال و اخلاق، توحید، اتباع سنت، شریعت کی پابندی، عبادت و تقویٰ، سادگی و تواضع، ایثار و خدمت خلق، غیبت دینی، شوق

جہاد و شہادتِ عبر و استقامت میں مہاجرین و انصار کا نمونہ تھے۔^۱
اس جماعت کی صحبت سے جو لوگ تیار ہوئے تھے۔ ان کی نسبت ڈبلو، ڈبلو ہنٹر نے یہ
انگریزی حکومت کی جانب سے مجاہدین کی سرگرمیوں کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا، اس شدید جذباتی
عناد کے باوجود وہ ہنٹر کو مجاہدین سے تھا ایک موقع پر مجاہدین کی بے لوث دینی خدمات اور ان کی
روحانی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ہنٹر لکھتا ہے:-

”جہاں تک میرا تجربہ ہے، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی
ہے کہ ایک وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم
خود غرض اور بے لوث ہو گا۔“

پھر آگے چل کر لکھتا ہے:-

”میں وہابی اور غدار کو ہم معنی سمجھتا ہوں، یہ وہابی سب کے سب
پیغمبر اسلام کے مذہب سے بدعات کو دور کرنے کی کوشش میں ہیں۔^۲
مصرف ہیں۔“

خود مجاہدین جہاد فی سبیل اللہ اور شوق شہادت کے جس نشے سے سرشار تھے۔ اس کا اندازہ
اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے، مجاہدین کی سب سے پہلی جنگ کے موقع پر ایک مجاہد عبدالحمید خاں
جہاں آباد کیا تھے، سید صاحب نے لشکر ترتیب دیتے ہوئے ان کا نام خارج کر دیا۔ انہیں معلوم
ہوا تو خود حاضر ہو کر عرض کیا کہ ”آپ نے میرا نام کیوں نکال دیا؟“ سید صاحب نے فرمایا ”تم بیمار ہو“

۱۔ سیرت سید احمد شہید، ص ۳۲۵، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۹ء ۱۳۵۸ھ

۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان مصنف W. W. HUNTOR

ترجمہ اردو ڈاکٹر صادق حسین۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۵۷ء ۱۳۷۶ھ

ص ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۲

بولے کہ آج پہلا موقع ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے آپ مجھے ضرور شامل رکھیں۔
ان کے اصرار پر سید صاحب نے اجازت دے دی یہ یہ معرکہ اکوٹہ میں پیش آیا تھا۔
چھرائی کے حملے میں ایک مجاہد نے جام شہادت نوش کیا، جب اس کے بھائی شیخ
بن یحییٰ دیوبندی کو اس کی شہادت کی اطلاع ملی تو نہایت صبر و ضبط سے بولے ”الحمد للہ!
میرا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب
کرے یہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں لکھا ہے کہ :-
”مجاہدین کا عجیب عالم تھا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے فرشتے زمین پر اتر
آئے ہیں یا صحابہ کرامؓ، مہاجرین اولین و انصار کا دور پلٹ آیا ہے، معمولی سپاہی
اللہ شکر ہی عباد الرحمن کا نمونہ تھا۔ بیکسر، شان، خودی، ننگ و عار کا نام نہ تھا، ایک
دوسرے کی خدمت کرتے، ہر کام میں اللہ و فی اللہ شریک ہوتے، دوسرے کا ہاتھ
بٹلتے، چکی پیستے، کھانا پکاتے لکڑی چیرتے، کپڑے دھوتے، گھاس چھیلتے، بیماروں
کی خدمت کرتے، ان کا پیشاب پاخانہ اٹھاتے، پیر دباتے، زمین پر سوتے،
پچھے پرانے کپڑے پہنتے، فحش گوئی، بدزبانی، حسد، عداوت کوئی جانتا نہ تھا،
جہاد نفس اور مجاہدہ روحانی بھی عام خانقاہوں سے زیادہ ہوتا تھا اور ان
تمام کاموں میں بڑے بڑے مخدوم اور امیر زادے شریک ہوتے تھے اور اپنی
سعادت و عزت سمجھتے تھے“ ۱۳۵

۱۳۵ سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۵۱

۱۳۶ ۱۴۱ ۱۴۲ ۱۴۳ ۱۴۴ ۱۴۵

۱۳۷ سیرت سید احمد شہید ص ۱۴۴ و ۱۴۵

۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں پنجاب کی سکھ حکومت سے مجاہدین کی معرکہ آرائیاں شروع ہو گئیں جن میں اکثر میں ان کو کامیابی ہوتی رہی۔ مجاہدین کی پہلی جنگ آکوٹہ میں ہوئی جس میں ۳۳ مجاہدین شہید اور ۳۵ زخمی ہوئے، ان کے مقابلے میں سکھ فوج کے ۱۰۰ سپاہی کام آئے پہلے ہی معرکہ میں بہادر راجہ رنجیت سنگھ کے سپہ سالار بدھ سنگھ کے پاؤں اکھڑ گئے، دوسری لڑائی حضور کے مقام پر ہوئی، اس میں بھی مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی، جو تھی شہدو کے مقام پر ہوئی جس کے بعد سید صاحب کو زہر دیا گیا، اس موقع پر سید صاحب ہلاک ہونے سے تونچ گئے۔ مگر مجاہدین کو شروع میں جو کامیابی ہوئی وہ جلد ہی شکست میں بدل گئی، مجاہدین کا ساتھ والی حملہ پکھلی کی گردھی پر ہوا، اس میں بھی وہ کامیاب رہے، اسی طرح مختلف مقامات پر ان کو فتح ہوتی رہی، یہاں تک کہ پشاور شہر پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا، پشاور صوبہ سرحد کامر کوئی مقام تھا، اب صوبہ سرحد کے ٹہڑے حصے پر مجاہدین کا تسلط قائم ہو گیا۔ سلطان محمد خاں کو سید صاحب نے پشاور کا حاکم مقرر کیا، شرعی احکام کا نفاذ کیا گیا، اور باضابطہ اعلان کر کے اسلامی نظام حکومت قائم کر دیا گیا، پولیس اور حکام مقرر کیے گئے، احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا، اس کا ایسا اثر ہوا کہ کوسوں تک ڈھوڑے سے بھی بے نازی نہ ملتا تھا۔

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ سید صاحب کی اس عظیم تحریک کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے معاشرے میں شرک و بدعات کی راہ سے جو غیر شرعی رسم و رواج داخل ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے دینی حیثیت حاصل کر لی تھی ان کی بیخ کنی کر کے معاشرے کی اسلامی طور پر اصلاح و تربیت کی جائے۔ دوسرا مقصد ملک کو اغیار سے آزادی دلانا تھا، چنانچہ جب ایک وسیع علاقے پر ان کو سیاسی تصرف حاصل ہو گیا تو فوراً اس میں شرعی نظام قائم

۱۔ سیرت سید احمد شہید ص ۲۴۷

۲۔ سیرت ، ص ۱۷۰

کر دیا گیا اور تمام معاملات کے فیصلے شرعی طور پر کیے جانے لگے۔ آزاد قبائل کے لوگوں نے سید صاحب سے جیت کرتے ہوئے یہ سمجھا تھا کہ سید صاحب بھی اس زمانہ کے دوسرے اقتدار پسند لوگوں کی طرح اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، انہیں یہ غنیمت نظر آیا کہ سکھ حکومت کے مقابلہ میں جو آئے دن تاخت و تاراج کرتی رہتی تھی، سید صاحب کے ساتھ رہ کر وہ سکھوں کے مظالم سے محفوظ ہو جائیں گے، مگر ان کی خود سراور جنگ جو طبیعتیں شرعی نظام کا تحمل نہ کر سکیں، ان کو بعض تصرفات سے دست کش ہونا پڑا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی من مانی کارروائیوں کے تمام مواقع جدید نظام سے وابستہ رہنے میں ان کے ہاتھوں سے نہ صرف نکل گئے ہیں بلکہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے بلارور عایت سزا کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں اس لیے وہ جلد سید صاحب سے بیزار ہونے لگے۔ ان کی حیلہ جو طبیعتوں کے لیے قید و بند کا یہ بہانہ کافی تھا مگر علانیہ احکام اسلامی سے سرتابی کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا۔

مولانا غلام رسول مہرنے سید احمد شہید میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباری روزنامچہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب سید صاحب جوئے سرحد میں پہنچے تو وہاں کے ایک سردار یار محمد خاں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحا کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کو زہر دے دیا تھا اور اسی شخص کی غداری کی وجہ سے ایک مقام پر مجاہدین کو شکست اٹھانی پڑی تھی۔ اہل سرحد کو اپنے گرد جمع کرنے میں سید صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے یار محمد خاں کو اگرچہ اذیت مندی پہنچا دی کہ دیا تھا مگر اس نے جب دیکھا کہ سید صاحب نے حاکمانہ حیثیت حاصل کر لی ہے تو اس کے دل میں دوسرے پیدا ہو گئے اور اس نے سکھوں کے ساتھ نامہ و پیام شروع کر دیا۔

پشاور پر مجاہدین کا قبضہ ہو جانے کے بعد پنجاب کی سکھ حکومت کے علاوہ انگریزوں کو بھی مجاہدین کے عزائم اور ان کی قوت کا احساس ہوا اور وہ خطرہ محسوس کرنے لگے۔ انگریزوں کی جانب

سے بڑی حکمتِ علی کے ساتھ دینی سطح پر سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے خلاف ایک اہم شروع کی گئی، جماعت پر جو الزام لگائے گئے ان کا حاصل یہ تھا کہ سید صاحب بدعتیہ ہیں، الحاد و زندہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہے۔ اسلام سے انہیں کوئی تعلق نہیں، ان کے عقائد تمام مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ نفسانیت کے پیرو ہیں، ظلم و تعدی کے خوگر ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بڑے شد و مد سے اس الزام کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ آزاد قبائل کی خود مسراور جنگ جو طبیعتوں کے لیے اس الزام نے بناوٹ کا راستہ صاف کر دیا۔ سب سے پہلے سلطان محمد خاں نے بغاوت پر حکم باندھی یہ وہی شخص تھا جسے سید صاحب نے اس کی درخواست پر پشاور کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس نے اچانک پشاور میں سید صاحب کے کارکنوں کو قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں پہلے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کی گئی۔ جن کو سید صاحب نے صوبہ سرحد کے پورے علاقہ کا قاضی مقرر کیا تھا، پھر ایک ایک کارکن کو نہایت بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا۔

اس صورت حال کے بعد مجاہدین کے لیے ضروری ہو گیا کہ مرکز کو صوبہ سرحد سے کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے چنانچہ سرحد کے چار سالہ قیام کے بعد بادل خواستہ سید صاحب مجاہدین کی عطا کملے کر وہاں سے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

سید صاحب کے ایک فاضل سوانح نگار مولانا غلام رسول مہر نے اس موقع پر اپنے جگر خراش تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہیں:

افسوس کہ خود مسلمانوں کی کچھ اندیشی، غرض پرستی اور ناحق کوشی کے باعث ان امیدوں کی روشنی دیکھتے دیکھتے زائل ہو گئی اور ان کی جگہ اشک ہائے حسرت اور نالہ ہائے غم باقی رہ گئے، تین چار برس کی جانفشانیوں سے جو کام سرانجام پہنچے تھے وہ برباد ہو گئے۔ بہت سے غازی بے خبی کے عالم میں خاک و خون میں تڑپے، حکمرانی کے بعد مسلمانان ہند میں سے خیرت و محبت حق کی جو بہترین اور عزیز ترین متاع ہم کی گئی تھی وہ یوسف زلی کے میدانی علاقے میں جا بجاٹ گئی۔

سید صاحب اپنے چار سالہ مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری کارگاہ کی تلاش میں نکلنے پر مجبور ہوئے، ابھی کسی جگہ جسم کر بیٹھنے نہیں پائے تھے کہ خلعت شہادت سے سرفرازی پاکر فوجی اہلی سے جا ملے۔

غرض کہ جماعت مجاہدین صوبہ سرحد سے روانہ ہو کر دشوار گزار راستوں کو طے کرتی ہوئی بالا کوٹ کے مقام پر پہنچی جو ضلع ہزارہ کا مشہور قصبہ ہے، یہاں پہنچنے پر برف باری شروع ہو گئی، راستہ مسدود ہو گیا، بالا کوٹ میں قیام کے لیے ایک ایسے میدان کا انتخاب کیا گیا جو چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، بالا کوٹ میں معلوم ہوا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ولی عہد شیر سنگھ مجاہدین کا راستہ روکنے کے لیے یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ڈیرے ڈالے ہوئے پڑا ہے۔ مگر جزائیائی طور پر یہ میدان پہاڑوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا کہ اس تک کسی بڑی فوج کے پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آگیا اور برنباری بند ہو گئی۔ چونکہ مجاہدین پر حملہ کے لیے کوئی راستہ نہ تھا، اس لیے شیر سنگھ مجبور ہو کر واپس ہونے والا تھا کہ کسی قبائلی خدار نے ایک غفی راستے کی نشاندہی کی۔ مجاہدین بالکل بے خبر تھے کہ اچانک سکھ فوج ان کے سروں پر پھینچ گئی۔ اور دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ ہر چند سید صاحب مولانا محمد اسماعیل اور دوسرے جانباز مجاہدین نے بہت دجرات کے جوہر دکھائے مگر سکھوں کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ سید صاحب، مولانا محمد اسماعیل اور سینکڑوں مجاہدین کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ بروز جمعہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۲۶ھ (۶ مئی ۱۹۰۸ء) کو تاریخ حریت کا یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا۔

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجاہدین کی اس ناکامی کا حقیقی فائدہ سکھوں کے

بھائے انگریزوں کو پہنچا۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے اٹھارہ سال بعد ۱۸۶۹ء، ۱۲۶۹ھ میں پنجاب سے سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مقبوضات کو کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا۔

جماعت مجاہدین کی للہیت۔ خلوص۔ جوش جہاد، قداکاری، عزم و ہمت اور اپنے مقصد کے حصول کی لگن کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے عظیم حادثہ کے باوجود مجاہدین کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں۔ ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ یہ ہیں:-

”یہ تحریک کسی نہ نما کی موت و حیات سے بالکل مستثنیٰ

ہو گئی تھی۔ خود سید صاحبؒ کی وفات کو بھی پر جوش حامیوں

نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک مقدس ذریعہ

بنالیا تھا۔“

جو مجاہدین بچ گئے تھے انھوں نے اپنا نظم دوبارہ قائم کیا، اس کے حکومت تو مہندہ ہی

سال میں ختم ہو گئی تھی۔ مگر اس کے جانشین انگریزوں کے لیے یہ تحریک نصف صدی تک

دہلی جان بنی رہی۔ اس کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے۔

سید صاحبؒ کے دو آہ کے دورے کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، اس سلسلہ میں سید صاحبؒ

نے اپنے ہا برکت قدم سے دیوبند کی سر زمین کو بھی سرفراز فرمایا تھا، مولانا حکیم عبدالحی نے

۱۔ تاریخ ہند ہاشمی فرید آبادی ص ۳۹۸

۲۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۴

۳۔ جماعت مجاہدین کے تفصیلی حالات کے لیے مولانا غلام رسول مہر کی تصانیف جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین سے مراجعت کی جائے۔

اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ:-

”جب حضرت سید صاحب کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تو دیوبند کے بڑے بڑے لوگ استقبال کو نکلے، شہر کے باہر ایک بزرگ کا مزار ہے۔ وہاں تک پہنچے تھے کہ سید صاحب نظر آئے، ایک ٹانگھن پر سوار تھے اور دونوں طرف دو شخص رکاب تھامے چلے آتے تھے۔ ان لوگوں نے آگے بڑھ کر ملاقات کی، اس وقت ان دونوں بزرگوں کی ظاہری وضع و ہیئت سے یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ کون ہیں، سید صاحب نے فرمایا کہ ”ان سے ملو ایہ مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالحی ہیں“

دارالعلوم دیوبند کے متصل جانب مشرق قاضی مسجد واقع ہے، اسی مسجد میں حضرت سید صاحب فرکش ہوئے تھے۔ یہاں دس روز تک قیام فرمایا۔ سید احمد شہید میں لکھا ہے کہ:-

”سید صاحب پھلت سے مظفر نگر پہنچے دیوبند پہنچے

۱۔ یہ مزار آٹھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ شاہ علاء الدین سہروردی جنگل ہاش کا ہے یہ مزار مظفر نگر سے آنے والی سڑک کے کنارے پر ہے۔ آبادی سے اس کا فاصلہ دو فرلانگ کے قریب ہے۔

۲۔ سفر نامہ دہلی اور اس کے اطراف مصنفہ مولانا حکیم عبدالحی ص ۱۱۳

مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۵۵ء

دیوبند سے الیا گئے، ان مقامات میں قاضی نجم الدین ہندو
آدمیوں کے ساتھ سید مقبول، مولوی شمس الدین قاضی عظیم
شیخ رجب علی، ان کے فرزند منور علی، حافظ عبداللہ، ان کے
بھائی نظام الدین اور کریم الدین نیز ان کے والد
امام بخش، کرامت حسین، محمد ماہ، شیخ چاند، مولوی
فسید الدین، مولوی بشیر اللہ، سید محمد حسین وغیرہ صو
نے نسبت کی ہے

لہ اہل دیوبند کے جنوب میں تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔

سید احمد شہید جلد اول ص ۱۲۵

اہل علم کے لیے تین ناور تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی، جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط وار شائع ہو رہی ہے قیمت مصری روپے

کے مقابلہ میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے

۵۳ ہی مبلغ دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے، اب تک بارہ جلدیں طبع

ہو چکی ہیں باقی ۱۸ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ جلالین شریف، مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دستقل کتابیں (۱) لباب النقول فی التبا

النزول "للسیوطی" (۲) معرفت النسخ و النسخ "لأبن الخزم"

قیمت مجلد ۲۰ روپے

۳۔ شرح ابن عقیل، الفیاض بن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت مجلد ۳۰ روپے

۲۵۔ ادارہ مصطفیٰ ایبہ۔ دیوبند ضلع سہارنپور

عمر خیام اور خاقانی

از مولانا امتیاز علی خاں صاحب فرشتی رامپور

حکیم افضل الدین خاقانی نے ایک مثنوی لکھی ہے، جس کا نام "تحفۃ العراقین" ہے۔ اس کے آخر میں اس نے اپنے والدین، دادا اور چچا کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ بچپن میں سائے پوری سے محروم ہو گیا تھا اور اس کے چچا نے اس کی تربیت کی تھی، اس لیے خاقانی نے اس کا ذکر بے حلاصہ نمندانہ کیا ہے۔

"تحفۃ العراقین" ۱۰۵۵ھ منشی ابوالحسن مدرس اول فارسی، آگرہ کالج، کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ مطبع مدرسہ آگرہ میں باانتظام پبلیشنگ کمار ناتھ چھپی تھی۔ اس ایڈیشن کے صفحہ ۱۰۷ پر ایک عنوان ہے "در مدح غم خود و عمر خیام کہ در اہتمام و تربیت او بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام جو نیشاپور کا باشندہ اعلیٰ کا بہت بڑا باغی اور بہت کا عالم تھا، خاقانی کا چچا تھا لیکن عنوان مذکورہ بالا کے تحت جو اشعار لکھے گئے ہیں، ان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :-

بگر نختہ ام زو یو بخندان	وہ سایہ عمر ابن عثمان
ہم صدر ہم وہم امام وہم عم	صدر اجل و امام اکرم
بہمانی و ہندسی مقاش	افلاک و ارسطو علیا لرش
او علمش دادہ دہر محدث	ایک ثلث بہ ہر س مثلث

آگے جلی کر لکھا ہے :-

چوں دید کہ در سخن تمام حسان عم نہاد تمام

چوں پائی ولم گنج در سوخت سالم در لبست و پنج در کوکت
چوں دید کو اہل لطف بيشم از شادی آں بجز و بيشم
اسی کتاب کا ایک اور عنوان ہے " در بیان نسبت انجانب عم کہ طبیب بود " اسکے
تحت لکھتے ہیں،

و ذہن سے مہم طبیب گوہر بقراط سخن بہ ہفت کشور
اپنے والد کے بارے میں جو شعر لکھے ہیں ان کا عنوان ہے " در مدح پدر غرض شیخ علی
نہار " اس جیسے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

از بحر خلا قسم سبک بار بر مسائدہ علی نخب بار
ایک اور موقع پر اپنے باپ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

دل در سخن محمدی بند اے پور علی زبوں علی چند
ملک الوز را جمال الدین موصلی نے خاقانی سے پوچھا ہے کہ تمہارا وطن کون سا شہر ہے اسکے جواب
میں فرماتے ہیں۔

گفتم متعلمی سخن واں میلاد من الزہاد شر واں
ایک قصیدے کا شعر ہے۔

عیب شرفاں کن کہ خاقانی ہست ازاں شہر کا تداش شہر
تحفة العراقین کے مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی علی کا بیٹا اور عمر بن عثمان
کا بھتیجا تھا جس کا یہ مطلب بھلا کہ خاقانی کے دادا کا نام عثمان تھا۔ نیز یہ کہ اس کا مولد و منشا
شہر وہاں تھا۔ چنانچہ اُسے حسان العجم خطاب دیا تھا۔ اپنے نام کے بارے میں لکھتا ہے۔

لے تحفة العراقین ۱۸۹ لے ایضاً ۱۹۲ لے ایضاً ۵۲ لے ایضاً ۳۱ لے دیوان خاقانی
چاپ پیر و زہراں ۱۳۳۷ ش ۷۵ ایضاً ۷۹۷۔

بدل من آدم ادر جہاں سنائی را بدیں دلیل پدر نام من بدیں نہاد
 رشید و عطا طے خاقانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جواب میں خاقانی نے جو
 قصیدہ لکھا اس کے شروع میں رشید کے دو شعر دیوان خاقانی میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں
 کا دوسرا یہ ہے:

افضل الدین ابوالفضل بحر فضل فیلسوف دین فرائے کفر کاہ
 دیوان خاقانی کے مجمع محمد عباسی نے اپنے دیباچے (ص ۱۷) میں مجد الدین خلیل کا ایک قطعہ
 مدحیہ نقل کیا ہے اس کا پہلا شعر ہے:

افضل الدین امام خاقانی تاجدار ممالک سخن است
 ان حوالوں کے پیش نظر خاقانی کا پورا نام ہم یوں لکھ سکتے ہیں: افضل الدین ابوالفضل
 بدیل بن علی بن عثمان خاقانی شروانی۔

دیوان خاقانی میں دو قصیدے ایسے موجود ہیں، جن میں سے ایک اس نے اپنے چچا کی
 اور دوسرا والد کی مدح میں لکھا ہے۔ پہلے کا عنوان ہے "دختر و تائم از مرگ کافی الدین
 عمر بن عثمان عمروئی خود سرودہ است" اس کے یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں:

زاں عقل بدو گفت کہ عمر عثمان ہم عمر خیامی دہم عمر خطاب
 ادیں قصا نیش بیستاشغافش داوہ نقشب در دو ہر و نفع القاب

ان شعروں میں خاقانی نے اپنے چچا کو "عمر عثمان" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ عمر کی اضافت (ابنی
 ہے، یعنی مراد خاقانی "عمر بن عثمان" ہے۔ اس کے بعد چچا کو چار عظیم المرتبہ اشخاص سے استعارہ
 کیا ہے، جو یہ ہیں، عمر خیام، عمر بن خطابؓ، اور لیس، اور مسیحی۔ علامہ قزوینی نے چہار مقالہ نظامی
 عروضی کے حاشیہ میں شعرا و اول کا یہ مطلب لکھا ہے: "یعنی ہم در علم دارای اولیں رتبہ مانسبہ

۱۔ دیوان خاقانی ۲۶ ۲۔ ایضاً ۵۳ ۳۔ چہار مقالہ نظامی تصحیح علامہ قزوینی، ۱۰، ص ۱۱۱

عمر خزام، وہم و عدل صاحبِ نمشتین و درجہ چوں عمر خطابؓ: محمد عباسی اپنے دیپلے میں اس شعر کا مطلب یہ لکھتے ہیں: فضیلتِ عمر خزام را با نبوغِ عمر خطاب در وجود خویش جمع داشت ^۱ ان دونوں فاضلوں کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عمر عثمان اور عمر خزام کو ایک نہیں دو جدا لگانے کی شخصیتیں مانتے تھے۔

خاقانی نے تحفۃ العراکین میں اپنے باپ دادا کے مخصوص ہنروں کا ذکر کرنے کے بعد چچا کے بارے میں کہا ہے یہ

درد سوئے محم طیب گوہر بقراط سخن بہفت کشور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا چچا طیب تھا، اور اس درجے کا طیب تھا کہ اس علم کو اُس کا ہنر خاص مانا جاتا تھا۔ قارئین اس بات کو ذہن نشین رکھیں۔ ایک اور قصیدے کے عنوان میں عمر عثمان کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ ”در مدحِ عمومی خود کافی الدین شروانی گوید: نسبتِ ظاہر کرتی ہے کہ کافی الدین عمر بن عثمان کا وطن شہر والی تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے۔“
خاقانی نے اپنے چچے بھائی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، اس کا عنوان ہے: ”در مدحِ امام شافع و حید الدین ابو الفاضل عمر بن عثمان بن کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی“ اس قصیدے کا یہ شعر توجہ چاہتا ہے:

ظاہر است انسابش از کافی عمر و گیر و رد می شمر تا قد سلف عثمان و ابراہیم

جہاں تک اس شعر پر بہانے فور کیا ہے، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خاقانی کے چچے بھائی کا نام و نسب یہ ہے: ”و حید الدین ابو الفاضل عثمان بن کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی“ اور اگر یہ درست ہے، تو پھر خاقانی کے چچا کا نام کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی طیب

۱۔ دیباچہ دیوان خاقانی ۲۲ ۲۔ تحفۃ العراکین ۱۸۹ ۳۔ دیوان ۷۶

۴۔ دیوان ۵۹۷

ہونا چاہیے۔

مذکورہ بالا دو تصبیروں میں سے دوسرا خاقانی نے اپنے والد کی مدح میں لکھا ہے اس کے

آخر میں ہے ۱۰

ہم بہ ثنائے پدر ختم کنم چوں مقیم نان من از خوان اوست اچائی از خان او
گز قضاے ازل عهد عمر گزشت تا بہ اید بگذرد نوبت "عثمان" او

ظاہر ہے کہ دوسرے شعر میں عمر سے مراد خاقانی کا چچا عمر بن عثمان اور عثمان سے مراد اس کا

چچا ابھائی عثمان بن عمر عثمان ہے۔

اب خیام کی طرف آئیے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اپنی بے نظیر کتاب

"خیام" میں اس فیلسوف کے متعلق سارا مسالا ایک جا کر دیا ہے۔ اس میں جن کتابوں کے حوالے

دیئے گئے ہیں، ان میں سب سے قدیم تذکرہ نگار ظہیر الدین ابوالحسن علی بن ابی القاسم زید البہیقی

ہے۔ یہ تذکرہ نگار بقول خود اپنے والد کے ہمراہ خیام کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور خیام نے

جو اس کے باپ ابوالقاسم زید کا دوست تھا، اس کا امتحان لیا تھا۔ تذکرہ نگار نے اسے ۷۵۷ھ

کا واقعہ بتایا ہے ۱۱

خیام کے داماد محمد بغدادی سے اس تذکرہ نگار کے تعلقات تھے۔ چنانچہ اس کے حوالے سے

خیام کی وفات کا یہ قلعہ لکھا ہے کہ ایک بوعلی سینا کی مشہور کتاب "الشفا" کا وہ حصہ خیام کے

زیر مطالعہ تھا، جو اہمیات سے متعلق ہے۔ دوران مطالعہ میں خیام سونے کا خلال دانتوں میں کرتا جاتا

تھا جب "باب الواحد والکثیر" پر پہنچا تو خلال ور قول کے بیچ میں رکھ کر کتاب بند کر دی، اور کہا

کہ چند سمجھ دار آدمیوں کو بلاؤ۔ میں وصیت کر دے گا۔ یہ کہہ کر اٹھا اور نسا از شروع کر دی۔ اور کچھ

کھانا نہ پیا، حتیٰ کہ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سجدے میں گیا، اور یہ دعا مانگی "اے اللہ، تو

جاتا ہے کہ میں نے اپنے امکان تک تجھے پہچانا۔ اب مجھے بخش دے، کہ میرے تجھے پہچانتا تیری بارگاہ میں میرا وسیلہ ہے۔ یہی دعا کرنے کے لئے روح پرواز کر گئی ہے

ایسا تذکرہ بھکار جو خیام کے دوست کا بیٹا اور خیام کے داماد کا دوست یا شستا سا تھا، اور خدا اپنے باپ کے ساتھ خیام کی خدمت میں حاضر بھی ہو چکا تھا، اپنی کتاب ”تمہ صوان الحکمہ“ میں جو ۵۴۵ھ کی تالیف ہے، اس عنوان کے تحت خیام کا ذکر کرتا ہے: ”الدستور الفیلسوف مجتہد الحق عمر بن ابراہیم الخیام“ علامہ سید سلیمان ندوی نے مذکورہ بالا کتاب کے آخر میں خیام کے وہ تمام رسائل نقل کر دیئے ہیں جو انہیں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ان دو خطوں پر مشتمل ہے جو قاضی ابوالنصر محمد بن عبدالرحیم النسوی اور خیام نے ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ اس مراسلت کا آغاز (حد و لغت کے بعد) اس طرح ہوتا ہے

”کتب ابوالنصر محمد بن عبدالرحیم — سنۃ ثلاث وسبعین دار لبعاتہ الی السید الاصل حجتہ الحق، فیلسوف العالم، نصرۃ الدین سید حکماء المشرق والمغرب ابی الفتح عمر بن ابراہیم الخیامی“ الخ

یہی خیام کے ذکر کے عنوان میں، اور اس مراسلت کے مولف نے اپنے دیباچے میں عمر خیام کے باپ کا نام ”ابراہیم“ لکھا ہے۔ نیز خیام کے مذکورہ بالا رسائل کے خطوط میں اگر خیام کی ولدیت لکھی گئی ہے، تو وہ صرف اور فقط ابراہیم ہے۔ کسی ایک شخص نے بھی چاہے وہ خیام کا معاصر ہو یا اس کے بعد کا تذکرہ بھکار، اس کی ولدیت بجز ابراہیم اور نہیں لکھی۔

اس اتفاق کی پشت پر خود خیام کا اپنا بیان بھی ہے۔ سید صاحب نے اس کا فارسی رسالہ نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے: رسالہ بالعجمیہ لعمر بن الخیام فی کلیات الوجود، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

تمہ صوان الحکمہ ۱۱۰ طبع لاہور۔ ۱۳۵۱ھ ۱۱۲۵ھ فیضاً ۱۱۲۵ھ خیام ۳۷۵ھ ۳۷۵ھ فیضاً ۱۱۲۵ھ

چین گوید ابو الفتح عمر بن ابراہیم الخلیفی الخ

اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش مطلق نہیں رہتی کہ خیام کے باپ کا نام ابراہیم نہیں، بلکہ عثمان تھا، اور وہ خاقانی کا چچا تھا، کیوں کہ یہ خود خاقانی کی تصریح کے بھی خلاف ہے اور خیام کے بیان سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس پر اگر اس حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے تو میرے بیان کی مزید تائید ہوگا کہ خیام کا مولد و نشا نیشا پور تھا، جو صوبہ خراسان میں واقع ہے، اور خاقانی اور اسکے باپ اور چچا شروان کے باشندے تھے جو صوبہ آذربائیجان کا ایک شہر ہے۔ اور ان دونوں میں بہت بُعد ہے۔

یہ امر بھی کم لائق توجہ نہیں کہ خاقانی نے اپنے چچا کے طبیب ہونے کا ذکر شد و مد سے کیا ہے۔ اور خیام کی شہرت طبیب کی حیثیت سے بالکل نہیں۔

لہٰذا ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ تحتہ العرائق کے مطبوعہ نسخے میں سے جو عنوان آغاز مضمون میں نقل کیا گیا ہے، اس میں لفظ عمر خیام یا تو اس نسخے کے کاتب کی اُپج ہے، جو مطبوعہ کا اصل تھا، یا اس مطبوعہ کے صحیح کو دھوکہ ہوا۔ خاقانی کا چچا عمر بن عثمان تھا، اور خیام کا نام عمر بن ابراہیم الخلیفی تھا، اور یہ دونوں جدا جدا شخصیتیں تھیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط

خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ کے وہ تمام خطوط مع اصل و ترجمہ یکجا کیے گئے ہیں جو خلیفہ اول نے اپنی خلافت کے پیرائے شوب اور ہنگامہ خیز دور میں حاکموں گورنروں اور قاضیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں ان مکتوبات کے مطالعہ سے حضرت صدیق اکبرؓ کی لاثانی انتظامی خصوصیات اور طریق کار سامنے آجاتا ہے۔

قیمت مجلد سات روپے

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو برہان جون ۱۹۷۷ء

ہندو تہذیب اور مسلمان

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاذ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ - نئی دہلی

(۳۰)

سواریاں

عرب کے مسلمان اونٹ اور ایمان و توران کے گھوڑے سواری اور باربرداری کے لیے استعمال کیا کرتے تھے لیکن ہندوستان میں آنے کے بعد اس ملک کے جزا فیائی حالات اور یہاں کے چلن اور دستور کے مطابق مسلمانوں نے ہندوستانی سوار یوں کو اپنا لیا۔ ہاتھی | غزنویوں کے دور حکومت سے ہی مسلمانوں میں ہاتھیوں کا استعمال جنگ، سواری اور باربرداری کے لیے شروع ہو گیا تھا۔ سلطان دہلی اور عہد مغلیہ میں یہ رواج عام ہو گیا تھا کہ بادشاہ کے متعلق ابوالفضل نے لکھا ہے :

”خلفے کی سواری کے لیے ہمیشہ ایک سو ایک ہاتھی جدا اور مخصوص رہتے ہیں۔ بادشاہ عالم پناہ ابتداء سے تا اس دم اس آسماں پیکر جانور پر سوار ہوتے ہیں اور اس دیونر ادھیوان کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ قبلہ عالم اس سواری میں اس قدر مشاق ہیں کہ ہاتھی کے عالمیستی میں جب نود کے دانتوں پر پاؤں رکھ کر اس پر سوار ہو جاتے ہیں جس سے تماشاخیوں کو سخت حیرت

دعوت ہوتا ہے لیکن

ہاتھیوں پر بڑی عمدہ اور دلکش عماریاں کسی جاتی تھیں جو اتنی وسیع ہوتی تھیں کہ دوران سفر میں سوار اس میں آرام بھی کر سکتے تھے ۔

سواری کے ہاتھیوں کی سجاوٹ کی جن چیزوں کا ابوالفضل نے ذکر کیا ہے ان میں سے سب سے زیادہ اہم ذیل چیزیں تھیں۔ دھترہ، لوہے، چاندی یا سونے کی ایک بڑی زنجیر، ٹوہ لنگر، ایک لمبی زنجیر جو ہاتھی کو بھاگنے سے روکتی تھی۔ گدلیہ، ایک تکیہ جس کو ہاتھی کی پیٹھ پر رکھ کر نیچے طناب سے باندھتے تھے جو آسانی، چند گھونگروں کے ساتھ گونہ کر بانات کے ایک ٹکڑے میں سی دیتے تھے اور

لے آئین اکبری (۱۰۱-۱۱۵، ۲۳۳-۲۳۴)۔ ہاتھیوں کی قسمیں، ان کی سجاوٹ کے لوازمات وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: آئین اکبری، فیل خانہ (آئین ۴۴)، ۲۱۶: ۲۲۹، رخت: ۲۳۶-۲۴۱

۵۷ عمارتی یا جودا کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو۔ برتیز (انگریزی): ۵۳ (حاشیہ ۲): ۵۴ (حاشیہ ۱) نظیر اکبر آبادی نے سواری کے ہاتھیوں کا یوں ذکر کیا ہے۔

ہاتھی جو تھے پہاڑ کی مانند تن سیاہ جن پر کسیں عماریاں درخشاں رنگ باہ

ہودوں کی بھی چمک پہ ٹھہرتی نہیں جگاہ کس عیش سے چڑھے ہوئے پھرتے تھے واہ واہ

کلیات نظیر اکبر آبادی ۵۳۶

عماریوں اور ہودوں کی ساخت اور سجاوٹ کے بارے میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو

تاریخ احمد شاہی: ۱۲۹، سیر المتاخرین (انگریزی ترجمہ) ۳۱۱ (حاشیہ ۲)

TWINING: TRAVELS IN INDIA: 36, 275-76.

HEBER: TRAVELS IN INDIA ETC. I, P. 30 VALENTIA:

VOYAGES AND TRAVELS ETC. I, P. 137.

ہفت تماشا: ۷۳

اس کو ہاتھی کے سرین اور سینے کے قریب آگے کی طرف باندھتے تھے۔ اس زنجیر سے ہاتھی کی آرائش اور اس کی شان میں نمایاں اضافہ ہو جاتا تھا۔ بہت کچھ وہ زنجیریں جو خوبصورتی کے ہاتھی کے دونوں طرف باندھی جاتی تھیں، اور گھنٹا زنجیروں میں لٹکا کر شکم کے نیچے باندھتے تھے۔ مطلقاً (تبت کے ہیل کے دم کے چھوٹے موچھل) یہ ساٹھ یا اس سے کم وزن رکھتے تھے۔ اور ہاتھی کے گلے، دانتوں، گردن، اور پیشانی پر لٹکاتے تھے۔ مٹی، پانچ لوسے کی تیلیوں کو جو ایک ایک گز لابی اور چار چار گشت چوڑی ہوتی تھیں۔ لوسے کے پھلوں سے ایک دوسرے سے باندھتے تھے۔ گج جھنت، ایک پوشش ہوتی تھی جو شان و شوکت کے لیے پانچ لوسے کے اوپر ڈالی جاتی تھی۔ یہ ولایتی ٹاٹ کو تین تہہ کر کے سیتے تھے اور باہر کی جانب اس میں چوڑے بند باندھتے تھے۔ میگھ دہلیہ یہ ایک شامیانہ ہوتا تھا جس کو اکبر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ رن بھل۔ یہ پیشانی بند تھا۔ اند بفت وغیرہ قیمتی کپڑوں کا تیار کیا جاتا تھا۔ اس کے دامن میں بہترین نادوختہ کپڑے اور موچھل لٹکاتے تھے جو ہوا میں ہلے اور خوشنما منظر پیش کرتے تھے۔ گیتیلی، چار پھلوں کو باہم ملاتے تھے اور تین تہہ ان کے اوپر اور دو حلقے سب سے اوپر جوڑ کر ہاتھی کے پاؤں میں لٹکاتے تھے جس سے اس کی شان دو بالا ہو جاتی تھی۔ پائے رنجن، چند گھونگھروں کے مجموعے کا نام تھا جو گیتیلی کی طرح پاؤں میں باندھے جاتے تھے۔

صوبہ آگرہ، صوبہ الہ آباد، صوبہ مالوہ، صوبہ بہار، صوبہ بنگال میں کثرت سے ہاتھی پائے جاتے۔

۱۔ برنیر (انگریزی) ۳۰-۳۱۔ ہودہ ایک بیضوی کرسی ہوتی تھی جس پر پھتری ہوتی تھی اور غلتا اور سنہری چیزوں سے مزین کی جاتی تھی۔ میگھ دہلیہ، کرہ، نکلا کڑی کا ایک چھوٹا سا میدان ہوتا تھا جو طبعاً اونچا ہوتا تھا۔

۲۔ آئین اکبری (۱۰ ج) ۱-۱۵: ۲۳۶-۲۳۷۔ ہاتھیوں کو طلالی کپڑے بھی پہنائے جاتے۔ مجموعہ مثنویات میرسن: ۳۷

ہاتے تھے اور مغلیہ فیل خانے کے لیے ان علاقوں سے ہاتھی منگوائے جاتے تھے یہ
شاہان مغلیہ ہاتھی کی سواری کرتے تھے۔ جہانگیر کے زمانے میں ہاتھی کا ایک طلائی تھوہاتیں
ہزار روپے کی لاگت سے تیار کروایا گیا تھا۔

شاہ جہاں بادشاہ کے کشمیر کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے برنیر نے لکھا ہے کہ دوران سفر میں
بھی بادشاہ ہاتھی پر بھی سوار ہوتا تھا جس پر میگھ ڈنبر یا ہودہ رکھا ہوتا تھا۔ سفر کا بہت
شاندار اور دلکش طریقہ تھا۔ کیوں کہ ہاتھی کی بلندی شان و شوکت، قاتل کشی لوازمات سے
بہتر کوئی دوسری چیز حاذب نظر نہیں ہو سکتی تھی۔

شاہی خاندان کی مستورات اکثر دہشتہ یا تھیں پر سفر کرتی تھیں۔ ان ہاتھیوں کے بڑے
بڑے چاندی کے گھٹے بڑے ہوتے تھے اور بڑی قیمتی چیزوں سے سجے ہوتے۔ ان کی جھولیں وغیرہ
نہایت زرق برق اور بیش قیمت اور انسانی چیزیں جو جھول وغیرہ میں لٹکائی جاتی تھیں، نہایت
حمہ زردوزی کے کام کی ہوتیں۔ برنیر کا بیان ہے ”یہ حسن و جمیل اور ممتاز بگمیں اپنے میگھ
ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی ایسی دکھائی دیتی تھیں گویا ہمایں ہریاں اڑتی جا رہی ہوں۔ ہر ایک
میگھ ڈنبر میں آٹھ عورتیں بیٹھ سکتی تھیں۔ چار ایک طرف اور چار دوسری طرف۔ میگھ ڈنبر کے
ہر ایک خانے پر دشمنیں جالی کا غلاف پڑا ہوا ہوتا تھا۔ اور جو ڈول اور تخت رقاں کی شان و
شوکت اور زرق برق سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ برنیر نے روشن آرا کی سواری کا تفصیل سے
ذکر کیا ہے جو میگھ کے ہاتھی پر سوار تھی۔

۱۵۔ آئین اکبری۔ ۱۵۔ ۱۶: ۲۲۶، خلاصۃ التواریخ: ۱۵-۱۶

۱۷۔ اقبال نامہ جہانگیری (متمد خاں، اردو ترجمہ) جس موقع پر مہابت خاں نے جہانگیر یا بادشاہ کو

لنکار کیا تھا۔ اس وقت وہ سواری خاصہ کی تھیں پر سوار تھا۔ ۲۲۹، ۲۳۰

۱۸۔ برنیر۔ ص ۳۶۰ ۱۹۔ برنیر۔ ص ۳۶۲

اورنگ زیب کے زمانے میں سواری خاصہ کے لیے ایک سو ایک ہاتھیوں کے بھائے صرف سو ہاتھی مخصوص تھے جو اپنی بندی، اور قوت کے لیے متنازع تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ہتھنیاں بھی تھیں۔ جن پر سواری کرنا بادشاہ باعث تحقیر نہیں سمجھتا تھا۔ ان ہاتھیوں کو ہندو قوں، گولوں، توپوں، چرخوں اور دوسری قسم کی آتشہازیوں کے سامنے اپنی جگہ پر جمے رہنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر ان چیزوں کا سامنا ہو تو خوف زدہ ہو کر بھاگ نہ کھڑے ہوں۔ کچھ ہاتھیوں کو اس بات کی بھی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ شیر اور تیندوے کو دیکھ کر ہراساں نہ ہوں تاکہ ایسے ہاتھیوں کو شکار کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ ہاتھیوں کی اچھی خاصی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور انکی خوراک کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان کو شراب بھی پلائی جاتی تھی تاکہ میلان جنگ میں ان کی ہمت میں اضافہ ہو جائے۔ شاہانِ مغلیہ کا یہ بھی ایک دستور تھا کہ جنم کے کارے بھروسے کے نیچے ایک ہاتھی ہر وقت ایک منتری (درہان) کی صورت میں کھڑا رہتا تھا۔ ان ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی سب سے زیادہ بلند قامت، طاقت ور اور لحیم شمیم تھا، جو ہاتھیوں کا ”سردار“ کہلاتا تھا۔ اس ہاتھی کو جب دربار میں لایا جاتا تھا تو اس پر رنگین اور بھرپور بھونڈالی جاتی تھی۔ سنہرے روپے زیورات سے آرائش پیرا سہ کیا جاتا تھا اور اس کے ہمرکاب دوسرے ہاتھی بھی ہوتے تھے اس موقع پر ہانسیاں بجل اور سنگھ بھی بکتے تھے اور اس جلوس کے ساتھ جو بنڈے بھی ہوتے تھے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر وہ منظر بڑا شاندار معلوم ہوتا تھا۔

فیضانِ خاصہ کے علاوہ چودہ سو ہاتھی اور ہوتے تھے۔ یہ ہاتھی رانیوں، شہزادیوں، اور انکی خواص کی سواروں، خیموں اور مطبخ کے برتنوں اور دیگر سامان کے لانے لے جانے کے لیے استعمال

۱۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں خوراک وغیرہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ ۲۔ مین اکبری (۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳

میں آتے تھے۔ ان باربرداروں کے ہاتھوں میں سے سب سے زیادہ قوی ہیکل ہاتھی جی کے دانت نہیں ہوتے تھے، دشوار گزار زمینوں پر توپ خانہ لے جاتا تھا۔ اور اسی قسم کی دوسری خدائیں انجام دیتا تھا۔ جب یہ ہاتھی باہر نکلتے تھے تو ان کے گھٹنے پاندہ دیبے جاتے تھے تاکہ ان کی آواز سے راگمیر ہوشیار ہو جائیں اور راستہ صاف کریں۔ کیوں کہ جب ہاتھی دوڑتا تھا یا تیز رفتاری سے چلتا تھا تو اس کو اتنی آسانی سے روکا نہیں جاسکتا تھا جتنی آسانی سے گھوڑے کو روک سکتے تھے۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں فیضان خاصہ کے نام یہ تھے۔ خالق داد، مین مبارک، خدا داد، سر و سیرت، دلی کشا، بخت بہادر، یک دانتا، دل پسند، کبرا، عظام مست، صدامست، نژاد، دل کشا، بابا بخش، نیک بخت، کٹا، کمار، بلند، سرلا، لطیف، نور سنگھ، خوب رو، فتح مبارک، دل و دلیر، شاہ عنایت، اول بخش، فتح نصرت، دائم شکوہ، دلاسا سیرت، فتح جنگ، دل سنگار، لشکر شوہرا، دشمن کش، کالا پہاڑ، عقدہ در، کشا و کشا، زلزلہ، خونی، خونناک، ملک مدھن، مہا مہین، اتم، ہاگ مار، پتہ زور، ماہ رو، ستارہ، کشا و غرور، سند گج، پائے تخت، آتش، نور لعل، ہیرا، خوش رفتار، تیز رو، مانگ صورت، بھیللا، دائم نسر، چاند کنور، تلخ شکن، کوہ شکن، خوش شکیل و غیرہ۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ دستور جاری رہا۔ عام طور پر شاہان مغلیہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلتے تھے۔ اور بالخصوص عیدین کو وہ ہاتھی پر عید گاہ جاتے تھے۔ کسی دوسرے

۱۔ منوچی ۲/ص ۳۶۳ ۲۔ منوچی ۲/ص ۳۶۲ - ۳۶۳

۳۔ سیر التاخمین (۱۔ ا۔ ت) ۲/ص ۱۳

GROSE: A VOYAGES TO THE EAST INDIES. I, PP.

۴۔ احمد شاہ بادشاہ کے متعلق لکھا ہے: "از قلعہ مبارک بر فیل سوار شدہ... تاریخ احمد شاہی ص ۶۱ الف

نیز گلدستہ منشی چندر بھان ص ۲۰، ۲۱ الف، واقعات آظفری ص ۹۱

حلقے پر فوج کشی کے لیے روانگی کے وقت اور وہاں سے فتح پابی کے بعد واپسی پر ہاتھی پہنچ آیا
جایا کرتے تھے۔

حالا نکر نادر شاہ کے حلقے کے بعد فیل خانہ تباہ و بہاد ہو گیا تھا۔ لیکن سرکار منلیہ میں دو
چار ہاتھی ضرور رہتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے سواری کے ہاتھی کا نام مولانجش تھا۔ وہ اچھے آقلے
اتنی محنت کرتا تھا کہ جس دن اس نے بادشاہ کے گرفتار ہونے کی خبر سنی، اسی دن اس کی روح
بہداد کر گئی۔

حالا نکر ہاتھی کی سواری شاہان منلیہ کا خصوصی حق تھا۔ بلا بادشاہ کی اجازت کے
کوئی سرکاری ملازم یا کوئی دوسرا شخص ہاتھی پر سواری نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن گماشتہ رہوین صدی

لے حسن احمد کے میدان میں قطب الملک عبداللہ خاں کو شکست دینے کے بعد محمد شاہ بادشاہ
جڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا۔ ہاتھی زربفت کی جھولوں، نقری و طلائی پاکھروں سے
آراستہ پیراستہ اور نشان زد نشان طلاکار زرنگار ایسے تھے کہ جن پر آنکھ نہیں جھپکتی۔ سیرت خانہ
۲/ص ۶۸-۶۹۔ ہم عصر شواہد کے لیے ملاحظہ ہو۔ وقائع اندرام غلص (قلمی) ۲/ص ۶۰ ب خانی خاں
۲/ص ۹۳۵، ۷۰۳

سے رسالہ محمد شاہ و خاندوران خاں ص ۷۲ ب، احمد شاہ کے زمانے میں فیل خانے کے ہاتھیوں
کو چار چار دن تک رات ب نہ ملتا تھا اور وہ اتنے کمزور و لاغر ہو گئے تھے کہ بار برداری کے کام کے
لیے بھی بے کار ہو گئے تھے۔ داروغہ فیل خانہ جواب دہ کہ فیلاں چہاں چہاں فاقہ می دارند، طاقت
بار کشی نخوا دارند۔ تاریخ احمد شاہی ص ۱۲۵ الف، ۱۲۶ الف نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو کے
مطالعہ سے اٹھارہویں صدی میں سرکار منلیہ کے فیل خانے کی ذبوں حالی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا
ہے۔ کلیات سودا۔ ۱/ص ۳۷۵-۳۷۸

سے امداد صابری۔ ۱۵۵۷ء کے غدار شعرا ص ۵-۱۴ لکھ برتیر لادت، ۲/ص ۳۱، ۳۰۸

میں خطیہ سلطنت کے روال، شاہان کی سفلہ پردہری، قوانین اور ضابطوں کی طرف سے بے توجہی کی بنا پر خواص و عوام سب نے ہاتھی کی سواری اپنی غفلت اور سماجی اقتدار و نام و نمود کے مظاہر کے لیے ہاتھی کی سواری کو اپنایا۔ اس سلسلے میں جہاندار شاہ کے زمانے کا ایک واقعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس بادشاہ کے زمانے میں نچلے طبقے کے افراد کو کافی عروج حاصل ہوا۔ انہیں اعلیٰ عہدے دیے گئے۔ انہیں ہاتھی، گھوڑے اور پالکیاں عطا کی گئیں اور ان پر سوار ہونے کی اہدات بھی مرحمت فرمائی گئی۔ انہی "نمردولیتوں" میں زہرہ کوہن تھی۔ وہ مادہ فیل پر سوار حرم سمر شاہی میں لال کنوڑ سے ملاقات کرنے جایا کرتی تھی۔ ایک دن فتح خاں ولد غازی الدین خاں فیروز جنگ اپنی پاکٹی میں کسی عالم سے ملاقات کرنے جا رہا تھا۔ راستے میں زہرہ کی سواری ملی اور اس کے ملازم خاں موصوف سے بدتمیزی سے پیش آئے۔ احمد شاہ بادشاہ نے مان خاں نامی مطرب، اپنے ماموں کو ہاتھی عطا کیا تھا۔ نواب ماوید خاں خواجہ سربا ہاتھی کی سواری پر باہر بھلا کرتا تھا۔

اٹھارویں صدی میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر صوبائی گورنروں نے اپنی آناؤ حکومتیں قائم کر لی تھیں مثلاً اودھ، بنگال، حیدرآباد وغیرہ مان والیاں ریاست نے اپنے آقاؤں کے گرفتار و خان و شوکت کے طرز کو اپنایا تھا اور ہاتھی کی سواری کرنے لگے تھے۔ مگر بادشاہ وقت کی موجودگی میں کوئی شخص ہاتھی پر سوار نہ ہوتا تھا۔ امرا اور والیاں ریاست کے سامنے کوئی شخص ہاتھی پر سوار نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے والی ریاست کی سواری آجائے تو فوراً سوار ہاتھی سے نیچے اتر کر دست بستہ کھڑا ہو کر مجرا ادا کرتا تھا۔

۱۔ سیرالتاخنین (۱-ت) ۲/ص ۱۳-۱۴

۲۔ تاریخ احمد شاہی۔ ص ۱۶ ب ۳۔ ایضاً۔ ص ۱۸ ب

OBSERVATIONS ETC. 148

۴۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ اہلیہ میر حسن علی۔

نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں پانچ سو ہاتھی تھے۔ عیدین کے موقعوں پر وہاں ان ریاست ہاتھی کی سواری پر عید گاہ جاتے تھے اور نوروز کے جشنوں کے موقع پر ہاتھی پر ہار بکھتے تھے۔ اہیہ میر حسن علی نوابین اودھ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

”عیدین کے دنوں میں ہاتھیوں کو ندی میں لے جا کر خوب صاف ستھرا کیا جاتا تھا۔ بعد ازیں ان کے جسم پر خوب تیل ملا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان کا جسم چمکنے لگتا تھا۔ انکی پیشانیوں کو شوخ رنگوں سے رنگا جاتا تھا۔ ان کے ہودے اور آرائشی چیزیں بے حد قیمتی اور بھڑکیلی ہوا کرتی تھیں۔ زیورات سنہرے اور روپے سے ہوا کرتے تھے۔ ان کی پیٹھوں پر نخل کی چادریں یا ہیل بوٹے سے مزین کپڑے ڈالے جاتے تھے۔“

نوابین کے حرم کی مستورات بھی ہاتھی کی سواری پر بکھتی تھیں اور ان کا طرز سفر عالمگیر اور مہار شاہ اول کے عہد کے رواج کے مطابق تھا۔

لے چہار گلزارش جاتی ص ۲۲۱ ب جب نواب آصف الدولہ شکار کے لیے روانہ ہوتا تھا تو اس کے ہمراہ کم و بیش سو ہاتھی ہوتے تھے۔ تفتیح النافلین ص ۱۱، واقعات اظفری ص ۹۱، شہزادہ عالی گہر کو نواب نے دو ہاتھی بطور نذر پیش کیے تھے۔ سیر المتاخرین ص ۱۰۳، ص ۱۰۶، عماد السلاطین ص ۶۹۔ یونانگ نے لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ کے قیل خانے میں ایک ہزار ہاتھی تھے۔

TRAVELS IN INDIA, P. 313; 168, VALENTIA I, PP. 149-51

۵۰ OBSERVATIONS ETC. 144-49. مولوی خیال الدین نے نواب کی سواری کا ان

الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اول قیلان نشان بعد ازاں تمامی لوازم امارت از قسم قیلان کہہ شکوہا معلوم ز رفعت و ہوج و عماری نقرہ۔ واقعات شاہ عالم ص ۲۸ ب۔ رقعات مرزا قلیل۔

ص ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹

MEMOIRS OF DELHI AND FAIZABAD: II, PP. 248-49.

۵۱

(باقی)

چند روز جاپان میں

سعید احمد اکبر آبادی

پروفیسر عبدالکیم کے ساتھ گھوم پھر کر کوٹھو کے باناروں، پارکوں سیرگاہوں اور اس کے گلی کوچوں کی خوب سیر و سیاحت کی۔ شام کو چائے ہم دونوں بل بدل کئے رستوران میں پتے اور وہاں کچھ دیر بیٹھ کر وہاں کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور ساتھ ہی گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے سے یہ محسوس ہوا کہ اگرچہ آج جاپان صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن اور معاشیات میں امریکہ کا سب سے بڑا حریف ہے لیکن یہ کہتا غلط ہو گا کہ وہاں غربت و افلاس اور بے روزگاری کا وجود نہیں ہے، یا وہاں امیری اور غریبی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ البتہ ایک بات جو بے خوف تردید کہی جاسکتی ہے، یہ ہے کہ جاپان کا ہر شخص مرد و عورت ہو یا لڑکا اور جوان۔ اس کو اپنی قوم اور ملک سے محبت نہیں عشق ہے اور ان کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہر وقت بخوشی آمادہ ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ایک جاپانی لڑکی سے سوال کیا کہ یہاں سرکیں اور گلی کوچے اس درجہ کیوں صاف نظر آتے ہیں؟۔ اس نے فوراً جواب دیا: "ملک ہمارا محبوب ہے اس لیے ہم اسے صاف ستھرا رکھنے کا طبعی جذبہ رکھتے ہیں"۔ اسی طرح معلوم ہوا کہ وہاں چوری اور ڈاکہ کے واقعات بھی شان و نادر ہی ہوتے ہیں۔

کوئی شخص جاپان جائے، اور اس کا دار الحکومت ٹوکیو نہ دیکھے تو اس نے وہاں دیکھا کیا۔ چنانچہ ٹوکیو بھی وہاں جانے کا ٹھکانہ تھا۔ اور کانفرنس کے مندوب ہونے کی حیثیت سے ٹوکیو جانے کا ایک موقع تھا لیکن میں نے قصداً اس سے غائر اٹھانے سے انکار کر دیا۔

صورت یہ تھی کہ ٹوکیو میں بودھ مذہب کا ایک نہایت عظیم الشان مرکز ہے۔ اس کی طرف سے کانفرنس کے مندوبین کو دعوت تھی کہ وہ ۲۱ اکتوبر کو کانفرنس سے فارغ ہو کر ۲۲ کو ٹوکیو آئیں اور مرکز کے مہمان رہیں۔ اس میں تو کوئی قباحت نہیں تھی لیکن وہاں کے پروگرام میں عبادت کا جز بھی شامل تھا۔ میرے لیے عبادت میں اول تو شریک ہونا ہی ناممکن تھا۔ اور پھر خیال یہ بھی ہوا کہ جب ہم لوگ ان کے مہمان ہوں گے اور ان کے دوسرے پروگراموں میں شریک رہیں گے تو ٹوکیو کو آزادی کے ساتھ دیکھنے اور اس میں گھومنے پھرنے کا موقع کہاں ملے گا! اس بنا پر میں نے دعوت نامہ منظور کر دی تھی۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ٹوکیو جاؤں تو کس طرح؟ ٹکٹ کا تو خیال منظم تھا ہی۔ کانفرنس نے جیو ٹکٹ دیا تھا وہ براہ ٹوکیو واپس جانے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ایک کرایہ ہی کا مسئلہ تو نہیں تھا۔ ٹوکیو میں اگر ایک دن بھی قیام کرنا ہو تو کم از کم بائچے سو روپے درکار ہیں۔ کوٹو میں جس کمرہ میں میرا قیام تھا اس کا کرایہ۔ کھانے پینے کے علاوہ۔ ڈھائی سو روپے ماہوار تھا اور گرانی کا یہ عالم کہ ناشتہ کہیں کیجئے تو دس بارہ روپے سے کم نہیں۔ لپچے اور ڈنر کو اس بہ قیاس کر لیجئے، اور ادھر ہم لوگوں کو جو اس چینیج ملا تھا وہ ڈھائی سو روپے سے زیادہ کا نہیں تھا۔ میں وہاں روپیہ قرض بھی لے سکتا تھا لیکن طبیعت اس کو گوارا نہ کر سکی اس لیے سنت ادھیڑ میں میں تھا کہ کیا کروں کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے خود بخود اس کا انتظام فرما دیا۔ ہوا یہ کہ پروفیسر عبد الکریم نے ایک روز مجھ سے پوچھا "آپ ٹوکیو تو آ رہے ہیں نا؟" میں نے کہا "جی ہاں ارادہ تو ہے لیکن صرف چند گھنٹوں کے لیے۔ میں ٹوکیو پہنچ کر اپنا سامان وہیں ایئر پورٹ پر چھوڑ دوں گا۔ اور دو تین گھنٹے شہر میں گھومنے کے بعد واپس ہو کر دوسرے جہاز سے نئی دہلی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا" عبد الکریم نے یہ سنا تو بہت بگڑے اور کہنے لگے: "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ ٹوکیو میں ایک ہفتے میں قیام کریں گے اور میرے مہمان رہیں گے۔ میں نے ہر چند محذرت کی لیکن وہ نہ مانے اور آخر مجھ کو ان کی دعوت قبول کرنی پڑی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی اس باصرار دعوت کا سبب ان کے خلوص اور محبت کے علاوہ یہ امر بھی تھا کہ میں نے ان کے

مرکز کی دعوت قبول نہیں کی تھی۔ اس عہد و بیان کے بعد عبدالکریم ۱۹ کی شام ہی کو ایک ضرورت سے ٹوکیو روانہ ہو گئے اور طے یہ پایا کہ میں ۲۲ کی صبح ٹوکیو پہنچوں گا۔

شام ۱۱ اب کوٹو میں ۲۰ اور ۳۱ کی شام خالی تھی۔ لیکن اس موقع پر بھی قدرت نے عجیب انتظام کیا۔ میں ۱۱ کو عشا کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھا کر میں نے اپنا نام بتایا تو ایک زنانی آواز نے کہا ”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں“ میں نے کہا ”آپ کا نام“ جواب ملا ”اگر آپ مجھ کو میری آواز سے نہیں پہچان سکتے ہیں تو اب میں نہیں بتاؤں گی“ میں سخت پریشان کہ یہاں اس درجہ بے تکلف کون نکل آیا۔ آخر میں نے کہا ”بہت بہتر“ ابھی آجائیے“ جواب ملا ”شکریہ“ میں ابھی آتی ہوں“ نصف گھنٹہ کے بعد دروازہ پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا تو میری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے سامنے شاما اپنے دو بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بھی مجھ کو دیکھ کر خوشی سے بے قرار ہو گئی۔ اشاما کے والد ڈاکٹر بنرجی کلکتہ میں میرے بڑے نخلص اور عزیز دوست تھے اور ان کی وجہ سے ان کے پورے گھرانہ سے میرے عزیزانہ تعلقات تھے۔ ڈاکٹر بنرجی کو تصوف کا خاص ذوق تھا اور اردو فارسی شاعری سے بھی بڑی دل چسپی تھی۔ ایک زمانہ میں کئی برس تک الہ آباد رہ چکے تھے اس لیے اردو تہذیب اور اردو زبان سے کافی مانوس تھے۔ جب میں نے کلکتہ چھوڑا ہے اس وقت شاما سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور غالباً بی۔ اے۔ میں پڑھتی تھی میرے علی گڑھ آنے کے چند برس بعد ڈاکٹر بنرجی کا تو انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کے گھر والوں نے مجھ کو فراموش نہیں کیا۔ شاما کی شادی ایک لائق اور فاضل ڈاکٹر ایس۔ این۔ بوس سے ہوئی ہے اور میاں بیوی دونوں ایک عرصے سے امریکہ اور یورپ میں دونین برس کے کنٹرکٹ پر ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں چھ سات ماہ سے کوٹو میں مقیم تھے شاما سے میری آخری ملاقات ۱۹۷۷ء میں قاہرہ میں ہوئی تھی۔ یہاں کوٹو میں اس کو کسی ذریعہ سے میرا علم ہوا تو کانفرنس کے دفتر سے معلومات حاصل کر کے مجھ تک پہنچی

منہایت خوش طبع، خوش مزاج اور بڑی لائق اور قابل لڑکی ہے۔ انگریزی میں ایم۔ اے۔ کیا ہے اس نے
مجھ کو ہمیشہ چاہا اور میں نے بیٹی کہہ کر اس کو بچا لیا ہے۔

شاما ایک گھڑی تک دنیا بھر کی باتیں اور گھنچپ کے کے واپس ہو گئی اور اب پھر وہ گرام یہ بنا
کہ جب تک میں کوٹھڑی میں ہوں یعنی صرف دو دن۔ شاما اور اس کے شوہر شام کو سات بجے میرے
ہوٹل میں آجایا کریں گے اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور میں جا پانی کھانا بھی انہیں کے ساتھ
کھاؤں گا۔ چنانچہ شاما فیملی اور میں ہم سب شام کو نکل جلتے اور کسی اعلیٰ درجہ کے ریسٹوران
میں ڈنر کھاتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں شام نے کہا: ”بچا میں ہندوستان میں فسادات
کی خبریں پڑھتی ہوں تو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ آخر یہ فسادات ختم کیوں نہیں ہوتے؟“ تو میں نے کہا
”بیٹی! اس کی وجہ یہ ہے کہ:

میں ہلاک جادوے سامی تو قتل شیوہ ۳ ذری

شاما اور بوس دونوں کو اردو شعر و شاعری کا ذوق ہے اس لیے بہت خوش ہوئے اور اقبال
کی پوری غزل مجھ سے ترم کے ساتھ سنی! ۲۱ کی شام کو میری وفرتیج اور ٹرنسے فارغ ہو کر ہم ہوٹل
پہنچے تو مجھ کو دوسرے دن علی الصباح مجھ کو کوٹھڑی سے روانہ ہونا تھا اس لیے شاما اور بوس
میرے کمرہ میں آکر بیٹھ گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب رخصت ہونے لگے تو مجھ کو شاما
نے ہانچا سورہ دینا چاہا کہ آپ کو کوٹھڑی میں ضرورت ہوگی۔ آپ وہاں کوئی تکلیف
نہ اٹھائیں۔ اس نے ہر چند اصرار کیا لیکن میں بالکل آمادہ نہیں ہوا۔ اور بے حد شکریہ کے
ساتھ معذرت کر دی۔ اب اس نے مجھ کو بطور تحفہ ایک بنڈل دیا جو میری بیوی اور بچوں کے
لیے تھا میں نے شاما کے بچوں کے لیے کچھ مٹھائیوں اور پیٹری کے ٹبے خرید رکھے تھے وہ ان کے
حوالے کیے اور رات کے گیارہ بجے کے قریب وہ رخصت ہو گئے۔

نوٹ کیو | ان سب کے چل جانے کے بعد سونے کے ارادہ سے لیٹا تو عربی کا یہ شعر مینا خد
زبان پر آگیا۔

تمتع من شمیم عیسیٰ نجد

فما بعد العشیة من عمار

ترجمہ: اے قیس! نجد کے پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں کیوں کہ آج کی شب کے

بعد پھول نہیں گئے۔ پھر اردو کا یہ شعر بھی یاد آیا۔

اے تھے ہم شبنم سیر گلشن کر چلے لے لے مالی باغ اپنا۔ ہم تو اپنے گھر چلے

اور فارسی کا وہ شعر:

”حیف و چشم ندون صحبت یا آفرشد“ — تو مشہور ہے ہی۔ وہ بھلا کیوں یاد نہ آتا

۲۲ کی صبح حب معمول علی الصباح بیدار ہو کر اپنا سامان درست کیا۔ حوائج ضروریہ، نماز اور

ناشتہ سے فراغت حاصل کی۔ پہلے بچے بس آگئی۔ ہم میں سے جو لوگ ٹوکیو جا رہے تھے ان کو لے کر

روانہ ہوئی۔ آدھ گھنٹہ میں اس کا پہنچ گئی۔ اس سفر میں روس کا وفد بھی ہمراہ تھا۔ پڑا بجے

جہاز اڑا۔ اور ایک گھنٹہ میں ٹوکیو پہنچا دیا۔ ہم (میں اور روسی وفد کے ارکان، ہا ہر آئے تو

پروفیسر عبدالکریم اپنے ایک عزیز کے ساتھ مع ان کی کار کے استقبال کے لئے موجود تھے انھوں

نے سیٹرفٹ ایشیا کلچر نامی ایک متوسط درجہ کے ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا تھا۔ ایک ڈیڑھ

گھنٹہ میں ایر پورٹ سے یہاں پہنچے۔ یہاں ہم لوگوں کے لیے جو کچھ محفوظ کرالیے گئے تھے وہ

پاس پاس تھے۔ ایک کمرہ تنہا میرے لیے تھا اور دوسرے کمرہ میں روسی وفد کے دونوں ارکان

مقیم تھے۔ ہوٹل پہنچ کر کمروں میں منتقل ہونے کے بعد پروفیسر عبدالکریم اور ان کے عزیز ہمسفر کو

ہمراہ لے کر ٹوکیو کی سیر کے لیے نکل گئے۔ سب جان اٹھ گیا شہر ہے۔ سرتاپا نفاست و لطافت

ایک مجموعہ طبعیات و عجائب! ہر شے میں شان و شوکت اور طنطنہ و طہراق کے ساتھ ایک

خاص قسم کا کھار اور جمالیاتی توازن و تناسب۔ یہاں پہنچ کر اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہمسفر

نومارک میں ہیں یا دانشگاہ میں۔ ہیرس میں ہیں یا روم میں! صرف ایک قوم کی یکساں صورت

و شکل یکساں لباس۔ اور جاپانی زبان میں تمام بورٹو۔ اشتہارات اور اعلانات، ان چیزوں

سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم جاپان کے دارالحکومت میں ہیں۔ سیر و تفریح کا رہیں نا ممکن ہے۔ اس لیے اس کو چھوڑ کر ہم کبھی ٹوئے میں بیٹھے اور کبھی مونوریلوے (یعنی وہ ریل جو صرف ایک پیہر پر چلتی ہے) کہتے ہیں اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہے اور یوں بھی جاپانی ریلوے دنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار ریلوے تسلیم کی گئی ہے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم کہ ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھ کر گھڑی ملا لیجئے۔ پھر حال ہے کہ کہیں ایک مسافر ہمدوسر مسافر گرے۔ شور و شغب اور ہنگامہ ہو۔ کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی یا میلی کھلی نظر آئے کسی مسافر کو آپ لپٹا ہوا یا اوٹکھتا ہوا انہیں ہائیں گے۔ عورت مرد جوان بوڑھے اور بچے سب اپنی اپنی سیٹ پر چسپت بیٹھے ہوئے ہیں ان میں بے کار کوئی نہیں ہے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے، کوئی میگزین اور کتاب۔ عورتیں جو کتاب یا اخبار نہیں پڑھ رہی ہیں بنے کا سامان ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ برابر حرکت میں ہے۔ دو شخص اگر بات بھی کر رہے ہیں تو آہستہ آہستہ تاکہ پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کو ناگوار نہ ہو۔ معلوم نہیں سگریٹ پینا ممنوع ہے یا نہیں! بہر حال مجھے کہیں سگریٹ کا دھواں نظر نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اپنے آپ کو بنانا چاہتی ہیں ان کے لیے جاپان ایک منظم اور منضبط اجتماعی زندگی کی ایک روشن اور قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے۔ یہ چیز نیویارک اور واشنگٹن جہاں کے لوگ کھلنڈرے اور خوش باش ہیں۔ اور جو زندگی کو ایک تہقنہ مسرت سے زیادہ کچھاد نہیں سمجھتے۔ ان میں بھی نظر نہیں آئی۔ عبدالکریم صاحب برابر بتاتے رہے کہ یہ فلاں مقام ہے یہ فلاں بلڈنگ ہے۔ یہ ہائی کورٹ ہے۔ یہ وزارتوں کے الگ الگ دفاتر ہیں۔ وغیرہ وغیرہ! لیکن ظاہر ہے کہ ان سب پر لک طائرانہ نگاہ ڈال لینے کے علاوہ اور گنجائش ہی کیا تھی! پھر کچھ دیر ہم پیدل بھی چلے۔ اسی اثنا میں ایک عظیم الشان ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پہنچ کر کچھ چیزیں خریدیں۔ مجھ کو کراچی کا بچپن سے شوق ہے۔ ایک اعلیٰ قسم کا ٹی سیٹ خریدا۔ لیکن یہ سیٹ جاپانی نہیں، امریکن تھا۔ جاپان کی خاص مصنوعات کی کچھ چیزیں بھی لیں۔ روسی احباب نے بھی خوب خریداری کی۔ ایک عجب جب ہم خریداری کر رہے تھے ہم سب کی تواضع جاپانی چائے

سے کا گئی۔ یہ چائے محض کہنے کو چائے ہے۔ ورنہ درحقیقت مرغ یا کسی اور پرندہ کا ست کھال کر اس کا پاؤ ڈر بنایا گیا ہے۔ ایک پیالی چائے کی لیجئے۔ اس میں خوب گرم پانی ڈال کر ایک چھوٹا چمچ پاؤ ڈر کا لے کر پانی میں گھول لیجئے۔ نہایت خوش ذائقہ۔ مفرح اور مقوی چائے تیار ہو گئی۔ سچ پوچھئے تو یہ کھن سوپ ہے جو کھانے سے قبل چیا جاتا ہے لیکن جا پان میں لوگ اس کو وقت بے وقت چائے کی طرح استعمال کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ چائے کسے ہیں زیادہ مفید اور صحت کے لئے سودمند ہے۔

روسی سفارت خانہ میں | تین بجے کے قریب ہوٹل واپسی ہوئی۔ لہجے کا وقت گزر گیا تھا۔ اس لیے کچھ ٹکی پھلکی چیزیں کھا کر چائے پی اور کچھ دیر آرام کیا۔ عبدالکریم صاحب گھر چلے گئے تھے۔ حسب وعدہ پانچ بجے وہ پھر ہوٹل پہنچ گئے۔ اب ہم پھر ہوٹل سے نکلے۔ عبداللہ جان (روسی دفنہ کے ایک رکن) نے کہا "روسی سفارت خانہ میں سفیر روس سے ملنا ہے۔ کیا آپ بھی ساتھ چلیں گے؟" میں نے کہا "بڑے شوق سے"۔ چنانچہ ہم سب پہلے سفارت خانہ آئے۔ عبداللہ جان نے میرا اور عبدالکریم کا تعارف کرایا۔ یہ سفیر اور ان کے فرسٹ سکرٹری جو وہاں موجود تھے بڑے اخلاق اور تہاک سے پیش آئے اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ سفارت خانہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا کم از کم میرے اوپر غیر معمولی اثر ہوا۔ اور میرے بعض خیالات کی تائید اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے کی تردید ہو گئی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ عبداللہ جان تاشقند کے مفتی ضیاء الدین بابا خان کے بھائی یا بھتیجے ہیں۔ قرآن مجید کے حافظ ہیں یا نہیں۔ یہ معلوم نہیں۔ البتہ قاری ضرور ہیں۔ قرآن مجید سے ان کو بڑا شغف ہے۔ یوں بھی وقت بے وقت ہوٹل کے کمرہ میں یا باہر لان پر بیٹھتے ہوئے میرے اکثر ان کو خوش الحانی سے قرآن پڑھتے سنا ہے۔ یہ اہل ان کے ساتھ نماز کے بھی پابند ہیں۔ کافر نس میں جب کبھی نماز کا وقت ہو جاتا ہے نماز ادا کرنے یا ہر نکل جاتے ہو فی سربہ اگر کم کو بھی میرے نماز کا بہت پابند پایا۔ اب سنئے! سفارت خانہ میں عہد

کی نالکا وقت تنگ ہو گیا تھا۔ اس لیے قاری عبداللہ جان نے فرسٹ سکر میٹری سے کہا: ”ہم نماز پڑھنا چاہتے ہیں“ فرسٹ سکر میٹری نے کہا: ”بہت بہتر! چنانچہ کوٹلی کے ایک حصہ میں انتظام کر دیا گیا۔ عبداللہ جان نے خود اذان دی اور ہم سب نے جماعت سے نماز پڑھی۔ ابھی فارغ ہو کر بیٹھے جائے بی ہی سہے تھے کہ مغرب کا وقت بھی ہو گیا۔ اگر میں تنہا ہوتا تو یقیناً میں اس نماز کو اڑا جاتا کیونکہ میں سفر میں عموماً جمع بین الصلوات کرتا ہوں۔ لیکن عبداللہ جان پھر کھڑے ہوئے۔ بڑی خوش الحانی سے اذان دی اور مجھ سے امامت کے لیے اصرار کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو عبداللہ جان نے ایک رکوع قرآن مجید کا قرأت سے پڑھ کر تم کو سنایا۔

اشوک پوٹل میں ڈنر | سفارت خانہ سے محل کر ٹو کیو کے ہانداروں میں کچھ دیر ادھر ادھر گھومے پھرے۔ اس کے بعد ہم کو ایک ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ یہاں ٹو کیو میں جنوب مشرقی ایشیا ممالک کی عظیم الشان ایسوسی ایشن کا صدر دفتر ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے صدر کو ٹو کیو میں میری آمد کی اطلاع عبدالکریم صاحب کے ذریعہ ہوئی تو اسی وقت انھوں نے میرے اعزاز میں ڈنر کی دعوت جاری کر دی۔ روسی وفد کے ارکان بھی مدعو تھے۔ ادھر ادھر گھومنے اور چکر لگانے کے بعد ہم لوگ ایسوسی ایشن کے دفتر پہنچے۔ تو جناب صدر اذان کے سکر میٹری نے ہمارا استقبال کیا۔ صدر (افسوس ہے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ اور جاپانیوں کے نام بول بھی کم یاد رہتے ہیں۔ اور اس وقت جب کہ میں یہ سطور صرف اپنی یاد سے لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس نہ میری ڈائری ہے اور نہ موصوف کا دیا ہوا تعارفی کارڈ) تمام دنیا کی کئی مرتبہ سیاحت کئے ہوئے ہیں۔ نہایت قابل خوش طبع اور شگفتہ مزاج انسان ہیں۔ ڈیل ڈول میں مولانا شوکت علی مرحوم سے کچھ کم ہونگے سگریٹ مسلسل پیتے ہیں اور بولتے بھی بہت ہیں۔ جس ایسوسی ایشن کے وہ صدر ہیں اس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا میں جتنے ممالک ہیں ان کے درمیان ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم کرنا۔ انہیں ترقی دینا۔ چنانچہ اس انجمن کی شاخیں ہر ملک میں قائم ہیں۔ موصوف سے عالمی مسائل پر عموماً اور کوٹلی کی مذہب اور امن کانفرنس پر نہ موصوف کچھ دیر خوب گفتگو ہی۔ اس کے بعد

ہم دس بٹے۔ دودھ کا انتظام ایک ہندوستانی ریسٹوران میں تھا جس کا نام اشوک ہوٹل تھا۔ امد
جس دفتر سے تھوڑے فاصلہ پر ہی تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو چند اور جاپانی خواتین اور مرد بھی مدعو
تھے۔ کھانے تمام تر ہندوستانی منسلکی تھے۔ یعنی مرغ مسلم، بھلی، بریانی، سیخ، کباب، دیہی بھجے
سموے، قسم قسم کی تڑکاریاں، پھل اور میوے۔ نوع بہ نوع صلوے اور مٹھائیاں۔ کھانے کے ساتھ
ساتھ گفتگو بھی ہوتی رہی میں خواتین نے بھی حصہ لیا۔ جاپان کی خواتین لباس اور وضع قطع
کے اعتبار سے بالکل یورپین ہیں لیکن ان میں ایک خاص قسم کا شرمیلیا پن ہوتا ہے اور وہ مسکرا
مسکرا کر بات بھی کرتی ہیں تو آنکھوں سے حیا کا انداز دیکھتا ہے۔ گفتگو میں کئی موقعے آئے جبکہ
مجھ کو اکبر الہ آبادی، غالب اور اقبال کے اشعار کا مطلب انگریزی میں بیان کرتا پڑا۔ اس
سلسلہ میں جب میں نے اکبر کی نظم "ایک مس ہمیں بدن سے کر لیا ندن میں عقد" پڑھ کر سنائی
اور اس کا مطلب اور اس کا شان نزول بیان کیا تو سب ہنستے ہنستے میدم ہو گئے۔ ایک خاتون
نے کہا "آپ ہمارے ہجان خصوصی ہیں اور کل ہی واپس ہو رہے ہیں اس لیے اکبر کی شخصیت
اور اس کے فن پر ایک تقریر کر دیجئے۔ ورنہ ہم باقاعدہ آپ کے لکچر کا انتظام کرتے۔ کھانا بہت
زیادہ کھالیا تھا اور اس وقت لکچر دینا بہت مشکل تھا۔ لیکن آخر نذر کی درخواست کا رد کر دینا
بھی آسان نہیں تھا۔ اس لیے میں آمادہ ہو گیا اور کھانے سے فراغت کے بعد میں نے کم دیش
چالیس منٹ اکبر اور ان کی شاعری پر تقریر کی۔ خواتین اس تقریر کے نوٹ لیتی اور خوب
تہنّے بھی لگاتی رہیں۔ لیکن میں نے اس وقت محسوس کیا کہ غالب اور اقبال کے اشعار کا
انگریزی میں ترجمہ کر دینا سہل ہے۔ اکبر کے اشعار کا ترجمہ شعر کی بلاغت اور اس کی رمزیت
کی رعایت کے ساتھ بہت مشکل ہے۔

لوگ سے روانگی | ساڑھے دس یا گیارہ کے قریب یہ مجلس رنگین دھڑ لطف ختم ہوئی۔ اور
میں اور روسی و فدان حضرات سے رخصت ہو کر ہوٹل واپس آ گئے۔ عبدالمکریم صاحب بھی
ساتھ تھے۔ مجھ کو دوسرے ہی دن واپس ہونا تھا۔ انھوں نے کہا بھی کیا بھی دو تین دن تو اور

قیام کیجئے۔ لیکن میں نے ان کو مزید زیر بار کرنا پسند نہیں کیا۔ جہاز میں ۲۳ مارچ کے لئے زررہوش پہنچا ہی گیا تھا۔ اب عبدالکریم صاحب رخصت ہوئے اور میں روسی احباب کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کر کے سو گیا۔ دوسرے دن ساٹھسے نو بجے کے قریب عبدالکریم صاحب اور ان کے عزیز کارلے کرسب وعدہ ہوئے پہنچ گئے۔ میں نے اپنا تمام سامان پیک کر ہی لیا تھا۔ مجھ کو توڑ تھی کہ عبدالکریم صاحب ایرپورٹ تک ساتھ چلیں گے۔ لیکن انھوں نے معذرت کی کہ چوں کہ ۳ بجے ہے اور انہیں نماز کے لیے جانا ہے اس لیے وہ ایرپورٹ ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ تجویز یہی کہ وہ اور ان کے عزیز محمد کو کار میں موٹوریلوے کے قریب کے اسٹیشن پر ریل میں بٹھا دیں گے۔ اور وہ ریل مجھ کو سیدھی ایرپورٹ پہنچا دے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت جو کچھ ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے کار کے ذریعہ بروقت ایرپورٹ نہیں پہنچ سکتے۔ جہاز کے روانہ ہونے میں اب صرف دو گھنٹے باقی تھے اور ٹوکیو ایسا لاق و دق شہر۔ ایرپورٹ ۳ گھنٹہ فاصلہ دور۔ راستہ اور اس کے نشیب و فراز نامعلوم۔ اس بنا پر خلاف توقع یہ تجویز تھوڑی دیر کے لیے تو تشویش ضرور پیدا ہوئی لیکن بیرونی ممالک میں سفر کرنے کے باعث ہر سرد و گرم سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے میں نے فوراً ہی دل مضبوط کیا اور کہا "بہت بہتر آپ نکلے کریں؟ چنانچہ روسی دوستوں اور ہوٹل سے رخصت ہو کر میں کار میں روانہ ہوا۔ موٹوریلوے کے اسٹیشن پر پہنچ کر عبدالکریم صاحب نے میری کھٹ خریدی اور کچھ تحائف لے کر آئے تھے ان کو میرے سپرد کر دیا اور بہت زور سے بنگلہ بزم کہ خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گئے۔ میں ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ روانہ ہو گیا۔ تین چار جگہ ایک ایک منٹ ٹھہرنے کے بعد جہاں مجھ کو اترنا تھا وہ اسٹیشن بھی آگیا۔ یہاں سے آگیا اور یہ اسٹیشن تھا بھی ایرپورٹ کے حدود میں۔ لیکن ٹکٹ دکھانے۔ سامان تلوانے اور سیٹ نمبر لینے کے لئے جہاں مجھ کو جانا تھا وہ جگہ کافی فاصلہ پر تھی اور اس کے لیے ایک بہت اونچے زینے کے ذریعہ ایئر کی منزل میں پہنچنا تھا۔ اور ادھر یہ عالم کہ سامان بہت کافی جس میں خود نہیں اٹھا سکتا تھا اور بھرتی اور مزدور نا پید بخت پریشانی ہوئی کہ کیا کروں ہاں

یہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک نہایت ہی خوش پوشاک جاپانی نوجوان میرے پاس آیا۔ اور
 مجھے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں کیا بات ہے؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا
 ہوں؟ میں نے وجہ بتائی تو اس نوجوان نے میرے سامان کا ایک عدد خود اٹھایا اور باقی
 سامان دونوں ہاتھوں میں میں نے لے لیا۔ اور اس طرح ہم دونوں زینہ پر چڑھ گئے سیر بھی
 بلکہ متحرک تھی اس لیے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ بس آپ جا کر نیچے کی سیر بھی بہ کھڑے ہو جائیے
 اس کے بعد آپ خود بخود اوپر پہنچ جائیں گے۔ اوپر پہنچ کر اس نوجوان نے وہاں ڈیوٹی پر جو سپاہی
 تھا اس سے کچھ جاپانی زبان میں کہا اور سپاہی فوراً ایک ٹرولی لے آیا اور مجھ سے کہا
 ”آپ اپنا سامان ٹرولی میں رکھ لیجئے اور اس کو ڈھکیلے ہوئے لے جائیے۔“ اور خود ہی اس نے
 بگنگ آفس کا راستہ بھی بتا دیا۔ میں نے نوجوان اور سپاہی دونوں کا شکریہ ادا کیا اور دلہا
 اسٹیشن کے قلیوں کی طرح ٹرولی ڈھکیلتا بگنگ آفس پہنچا تو جان میں جان آئی۔ بس اب کیا تھا!
 بٹ دکھایا۔ فوراً سامان کا وزن ہوا اور سیٹ نمبر بھی مل گیا۔ یہ سب کچھ ایک منٹ میں
 ہو گیا۔ سامان وہاں چھوڑ جو چیزیں ساتھ لینی تھیں ساتھ لے لاؤ نیچے میں آ بیٹھا۔ کچھ دیر
 یہاں بیٹھ کر سستایا تھا کہ وقت ہو گیا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے مہار نے پرواز
 کی۔ راستہ میں ہانگ کانگ اور بنگاگ قیام کیا۔ پالم اسٹیشن پر جہاز جب پہنچا ہے تو
 غالباً اس وقت شب کے بارہ ایک بجے کا عمل تھا۔

تبصرہ

فتاویٰ رحیمیہ جلد اول از مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب قادری لاہوری (انگریزی ترجمہ)
تفصیل کلاں ضخامت ۳۳۴ صفحات ٹائپ جلی اور روشن قیمت ۲۲ پتہ (۱) مکتبہ برہان۔ اردو بازار دہلی ۶
(۲) عطارستان۔ چوک بازار بسورت (گجرات)

مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب کے فتاویٰ کی جلد دوم (اردو) پر تبصرہ پہلے ہو چکا ہے۔ جلد اول (اردو) پر غلطی سے تبصرہ نہیں ہو سکا۔ یہ فتاویٰ کی جلد اول انگریزی ترجمہ کی ہے جو کتاب الایمان کتاب العلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الاذان، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الجنائز پر مشتمل ہے۔ مولانا کے فتاویٰ کی خصوصیت یہ ہے کہ عام طور پر مفصل اور مدلل مع حوالہ کتب کے ہوتے ہیں۔ اور بعض بعض جوابات تو فتاویٰ کیا اچھے خاصے رسالے بن جاتے ہیں۔ اس بنا پر عوام کے علاوہ عربی کے طلباء اور اساتذہ بھی ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ خصوصیت جلد اول کی بھی ہے۔ بلکہ غالباً اس معاملہ میں جلد اول جلد ثانی میں بڑھی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اس میں استعانت بالذیر اردو یا کسی اور زبان میں (عربی کے سوا) خلیہ تراویح وغیرہ ایسے مسائل پر مفصل بحث ہے۔ انگریزی میں ترجمہ جناب ایم۔ ایف۔ قریشی نے کیا ہے۔ اس طرح کی کتابوں کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ لائق مترجم اس فتاویٰ پر بیچ و خم سے بخلیت و عافیت اور سادگی سے گذرے ہیں۔ زبان سہل سلیس اور سنگینہ ہے۔ بعض مسائل مثلاً انگریزی تعلیم اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مولانا کے خیالات اتنا پسندام ہیں کہ ہم کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ افراط و تفریط کے درمیان کوئی معتدل ماہ پیدا کی جائے۔ اور اس کی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان خود اپنے کالج بنائیں اور وہاں اس کا اہتمام کریں یہ تعلیم کے ہر اچھے نتائج ہیں وہ حاصل ہوں۔ مثلاً تعلیم اور ڈاکٹری کم از کم یہ دو شعبے ایسے ہیں جن میں مسلم

خواتین کا ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی وہ بڑے ثمرات و اثرات نہ پیدا ہوں جن کی مولانا نے نشاندہی کی ہے۔ بہر حال علمی اور فقہی معلومات و مباحث کے اعتبار سے یہ فتاویٰ بڑے قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہیں۔ خدا کرے باقی جلدیں بھی جلد منظرِ عام پر آئیں۔

صحیفہ معرفت از ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی۔ تقطیع متوسط ضمیمہ ۳۳۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت جلد ۶/۶ روپے پتہ مدرسہ نور محمدیہ۔ قصبہ جھنجھاناہ ضلع مظفرنگر۔

حضرت شاہ العالمین شاہ عبدالرزاق صاحب دسویں صدی ہجری کے ایک بلند پایہ اور شریعت و طریقت کے جامع بزرگ تھے۔ ۹۵۹ھ میں جب کہ شیر شاہ سوری کا عہد تھا مظفرنگر کے مشہور مردم خیز قصبہ جھنجھاناہ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں آپ کا مزار مرجع عوام و خواص ہے۔ شاہ صاحب نے ایک کتاب فارسی زبان میں "صحیفہ معرفت" کے نام سے تصنیف فرمائی تھی جس میں ارکانِ اسلام نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج کے اسرار و رموز پر اور پھر مسائلِ تصوف، یعنی ترک دنیا، مجاہدہ و ریاضتِ بیعت، چلہ کشی، کشف و کرامت وغیرہ ان سب پر اس درجہ عارفانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے کہ ابنِ رشتی نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق "اجازت کے بغیر دل میں اترتی چلی جاتی ہے" اس تصنیف کا ایک مخطوطہ جو جھنجھاناہ میں دستیاب ہو گیا اس کو اردو زبان کے لائق استاد اور ادیب و نقاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کہنے کو یہ ترجمہ ہے در نہ در حقیقت زبان اس قدر شگفتہ اور جستہ دروان ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ یہی شروعات میں موصوف نے جو پیشِ نظر اور اس کے بعد شاہ عبدالرزاق صاحب کے خاندانی اور ذاتی سوانح و حالات لکھے ہیں وہ مبسوط و مفصل بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر "اضافات" کے زیرِ عنوان مولانا نسیم احمد صاحب جھنجھاناہی نے جھنجھاناہ کی مختصر تاریخ اور پھر وہاں کے اکابر صوفیاء و مشائخ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے عارفین کے لیے عموماً اور تاریخ کے اساتذہ و طلباء کے لیے خصوصاً بڑی کارآمد چیز ہے۔ تاہم میں اشاریہ اور صحت نامہ بھی ہے۔ عرض کہ کتاب ہر حیثیت سے معاملہ کے لائق ہے۔ علمی بات یہ ہے کہ شاہ صاحب طریقت و معرفت کو شریعت کے تابع مانتے ہیں اور تصوف میں اصل تعدد

انامت الی اللہ اور تزکیہ و تصفیہ ہاٹن پر دیتے ہیں۔ کشف و کرامت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں
تاریخ محمودی (کتاب الشہادت) ترجمہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۸۴
صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت جلد ۸/۸ پتہ :- مدرسہ نور محمدیہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر۔

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس کے اصل مصنف شاہ عبدالستار علوی القادری ہیں جن کا
انتقال ۱۰۶۵ھ میں ہوا ہے۔ اس کتاب میں ان جنگوں کا ذکر ہے جو سلطان شہاب الدین محمود غوری
کی دلی اور اجمیر کی سرکرہ آرائیوں سے بھی پہلے مسلمانوں اور راجاؤں کے درمیان کرناں سہارنپور
اور مظفر نگر کے اطراف و اکناف میں ہوئی ہیں۔ مصنف کا انداز نگارش وہی ہے جو ہمارے ہاں کے
قدیم فارسی مورخین (عربی زبان کے مورخین اس لعنت سے پاک ہیں) کہتے ہیں۔ یعنی جس سے خوش ہوئے
اسے آسمان پر چڑھا دیا اور جس سے ناراض ہوئے اسے تحت الشری میں پھینک دیا بغیر دم نہیں لیا۔ دنیا
بھر کا مالہ غلط سلاطین۔ اصل حقیقت کچھ ہے۔ لیکن زور قلم سے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔
ہندوستان کے فارسی مورخین کی یہ سب خصوصیات اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لائق مقرر جم
نے حسب معمول شگفتہ درواں زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ مظفر نگر میٹر اور بعض اور ذرائع
سے اس کتاب میں مندرجہ واقعات کی توثیق کے لیے کچھ سامان فراہم کرنے کی سہی کی ہے۔ لیکن
پھر بھی یہ واقعات رسرچ کے محتاج ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں جن علماء و صوفیا اور مجاہدین
کے نام آئے ہیں اور جن کے کچھ کارنامے بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور پھر حواشی کے عنوان سے لائق
مرتب نے بیستین صفحات میں جھنجھانہ اور اس سے متصل قصبات کی تاریخ ان کے مزارات و مقابر
اور ان کے علماء مشائخ اور مجاہدین پر جو نوٹ لکھے ہیں وہ تاریخ کے اساتذہ اور طلباء کے لیے
خصوصاً اور عام ارباب ذوق کے لیے عموماً بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ لائق مرتب لائق مبارکباد
ہیں کہ انھوں نے یہ کتاب مرتب کے ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ کے بعض ایسے گوشے غاہر
کرنے جو اب تک غفلت تھے اور اب وہ ظاہر ہوئے ہیں تو ضرورت ہے کہ تحقیق کے ذریعہ اسے پایہ تکمیل
تک پہنچایا جائے۔ مدرسہ نور محمدیہ جھنجھانہ کا دارالاشاعت بھی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے کہ اس کتاب

کے ذریعہ مطبوعات میں قابل قدر اضافے کر رہا ہے۔

- | | | |
|-----------------------|--|---------------------|
| ۱۔ انتخاب مضامین شبلی | ۸۰ صفحہ قیمت ۵۰/۸ | کتابت وطہامت اعلیٰ |
| ۲۔ یادگار غالب | اردو و حصہ فارسی متبادلوں کی ۴۴۳ صفحہ قیمت ۸/۸ | تفصیل خورد شائع کوہ |
| ۳۔ امیر اوجان | ۲۶۸ صفحات قیمت ۵۰/۷ | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ |
| ۴۔ گذشتہ لکھنؤ | ۴۴۸ صفحات قیمت طلبہ کے لیے ۵۰/۸ | جامعہ گگری دہلی۔ ۲۵ |

مکتبہ جامعہ نے کشمیر حکومت کے اشتراک و تعاون سے جو نہایت مفید اور ضروری کام اردو زبان کی کلاسیکل کتابیں شائع کر کے کیا ہے وہ بڑی باقاعدگی، پابندی اور خوش اسلوبی سے جاری ہے اور ملک میں اس کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ مذکورہ بالا کتابیں اس سلسلہ کی کڑی ازبند ۱۵ تا ۱۸ وجہ ہیں۔ پہلی کتاب مولانا شبلی کے ان علمی، ادبی تاریخی اور مذہبی مقالات و مضامین کا انتخاب ہے جو مقالات شبلی کے عنوان سے الگ الگ متعدد جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس انتخاب میں پچیس مقالات ہر قسم کے شائع ہیں۔ مولانا شبلی کے علمی و ادبی درجہ و مقام پر جناب رشید حسن خاں صاحب نے جو مقدمہ شروع میں لکھا ہے مختصر ہونے کے باوجود جامع اور بہت بلیغ ہے اور اس کو بھی اس کتاب کا جیسو سواں مقالہ سمجھنا چاہیے۔ دوسری کتاب مولانا حالی کی وہ مشہور معرکہ آرا کتاب ہے جس میں سب سے پہلے مرزا غالب کا شخصی مفصل تعارف کرانے کے ساتھ ان کے فن اور شاعری کا مطالعہ فاضل علمی، ادبی اور تنقیدی نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔ اور اس بنا پر اس کو غالب شناسی کی منزل میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مکتبہ جامعہ نے سہولت کی خاطر اس کتاب کا حصہ اردو اور حصہ فارسی الگ الگ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ تاکہ عام صاحب نے اسکی تسبیح و ترتیب کی ہے اور شروع میں ایک مقدمہ اس کتاب کے مرتبہ و مقام اور اس کی اشاعتی سرگزشت پر لکھا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے۔ تیسری کتاب کی ادبی اور تہذیبی اہمیت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ جیسا کہ انھوں نے خود اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے اس کتاب نے ایک رات مولانا شبلی کی نیند حرام کر دی تھی۔ یعنی جب انھوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو جب تک کتاب ختم نہیں ہوئی اسے

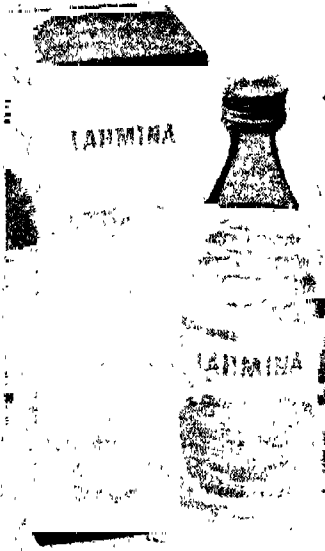
ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مولانا کے علاوہ اردو زبان کے اور بھی نامور ادیب اور انشا پرداز ہیں جنہوں نے ”فسانہ آزاد“ کی طرح زبان کی خاطر اسے بار بار پڑھا اور لطف لیا ہے۔ چوتھی کتاب مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو برسوں تک ”گلدار“ میں لکھنو“ پر شائع ہوتے رہے تھے۔ مولانا اردو زبان کے بلند پایہ ادیب انشا پرداز اور ناول نویس تھے۔ منظر نگاری اور خاکہ نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ساتھ ہی مورخ بھی تھے۔ لکھنؤ کا وطن تھا۔ اس کا عروج و زوال انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کی سرگزشت لکھنے کا حق ان کے سوا اور کس کو ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے لکھی اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا۔ لکھنؤ کی تاریخ۔ یہاں کے باشندے نوامین اور احرار۔ لکھنؤ کا معاشرہ، اس کے مختلف طبقات، ان کی بول چال، مشاغل، سیر و تفریح، رسم و رواج۔ عادات و خصائل، ان کی وضع قطع، لکھنؤ کے میلے ٹھیلے، کھیل کود، پیشے، عمارتیں، اور باغات، شعر و موسیقی، علم و فن، یہاں کی سواریاں، غرض کہ وہ چیزیں جو لکھنؤ کا طغرائے امتیاز اور نشان اعتبار تھیں ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ لکھنؤ اب مٹ گیا لیکن یہ کتاب گرد کارواں کی طرح ہمیشہ اس قافلہ گم شدہ کی نشاندہی کرتی رہے گی۔ ادب اور تاریخ کا ایسا حسین امتزاج کم ہی نظر آتا ہے۔ اردو زبان کے مشہور ادیب اور محقق رشید حسن خاں صاحب نے اس پر ”مغز مفید اور مفصل مقدمہ“ لکھا ہے۔

ہم در کا ایک نیا تحفہ

الحمیرہ

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزاء کا زندگی بخش مرکب عرق،
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے



لحمینہ صحت مند زندگی پیدا کرتا ہے اور ان تمام حالتوں میں
مفید ہے جو مردوں اور عورتوں میں کمزوری کے سبب پیدا ہوتی ہیں
جیسے گھریلو زندگی میں اکتاہٹ یا بیزاری، جسمانی اور
دماغی کاموں میں جھکنا یا کام میں جی نہ لگنا، بدن میں سستی،
ہاتھ پاؤں میں لرزش، سانس پھولنا،
چہرہ زرد ہو جانا اور طبیعت میں بڑھوتری وغیرہ۔

لحمینہ بہت تیزی سے اعضائے رئیسہ اور تمام
جسمانی نظام پر اثر کرتا ہے۔ یہ اعلا درجہ کا مقوی و
تحرک ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد دور کرتا ہے۔

ہم در

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



اردو زبان میں
ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار نیم جلدوں میں منسلک ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۱۱۰۰ ہیں۔ حصہ اول: حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم: حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات اور ان کی دعوت حق کی مقتضات تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم: انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب اکابر و ائمہ و اوصیاء و اصحاب اللہ و اصحاب النبیؐ، اصحاب الکوس، بیت المقدس اور یروشلم، اصحاب الاندلس و اصحاب البلیس، اصحاب البیت و اصحاب القریۃ اور بیت سکندری، سیدنا سلیمان علیہ السلام و طیبہ و اہل قصص قرآنی کی مکمل و مفصل تفسیر۔ حصہ چہارم: حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و اہل البیت و اصحاب کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت ہر جلد ایک دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے قیمت مکمل سٹاک آئین روپے۔ اہمیت فی جلد فی پارچہ ایک روپیہ۔ مملو فی جلد دو روپے
مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی

علیم مولوی محمد ظفر احمد رزوی پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس ڈی میں طبع کر کے فروز پور میں شائع کیا

68 - 5

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دینی و علمی دینی مآہرنا



برہان

مترجم
سید احمد کبیر آبادی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ شریفان کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ چیزوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائقِ مطالعہ ہیں۔ "لغاتِ قرآن" کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے پڑی سکتے ہیں۔ مکمل لغاتِ قرآن اپنے انداز کی وجہ سے کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	•	پانچ روپے	• چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	•	پانچ روپے	• چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۹	•	چھ روپے	• سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	•	آٹھ روپے	• نو روپے
جلد ششم	۳۲۳	•	پانچ روپے	• چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۶)

مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی



برہان

جلد ۶۸	ماہ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ مطابق مارچ ۱۹۷۲ء	شمارہ ۳
--------	--	---------

- ۱۔ نظرات سید احمد اکبر آبادی ۱۲۶
- ۲۔ جمال الدین الاسوی اور اُن کی طبقات الشافعیہ جناب جانظہر اکبر عبد العظیم خانقاہ ۱۵۲
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لکچر شعبہ
دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
- ۳۔ سید احمد شہید اور اُنکے دیوبندی رفقاء مولوی سید محبوب رضوی ۱۶۹
- ۴۔ نصاب زکوٰۃ اور صاع کی تحقیق جناب حاجی احسان الحق صاحب ۱۸۲
بجنوری مرحوم۔ علی گڑھ
- ۵۔ مخظم کی مثنویاں رسالہ شجرۃ الاتقیاء برقیح و تقدیم مولانا ڈاکٹر ۱۹۵
ابوالنصر محمد خالدی صاحب حیدرآباد
- ۶۔ ادبیات غزل فضائیں فیض ۲۱۲
- ۷۔ تبصرے س۔ ع ۲۱۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات

بنگلہ دیش

(۳)

جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک فریقین کے جذبات جنگ کی نفی کا اثر کے زیر اثر رہتے ہیں اس لئے امن اور صلح کی باتوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی جاتی۔ لیکن اب جبکہ جنگ کو ختم ہوئے کافی دن گزر گئے ہیں۔ اس جنگ کے قومی اور بین الاقوامی اثرات و نتائج بھی سامنے آ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں سنجیدگی اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس جنگ نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اور اس صورت حال کا نتیجہ مستقبل میں کیا ہو سکتا ہے؟ ان تمام معاملات و مسائل پر غور و خوض کریں۔

اس جنگ کا ایک لازمی اور قطعی نتیجہ تو یہ ہے کہ بنگا دیش کے نام سے ایک آزاد مملکت عالم وجود میں آ گئی۔ بہت سی اہم اور غیر اہم، بڑی اور چھوٹی حکومتوں نے اسے تسلیم کر لیا ہے اور اب تو مسلم ممالک نے بھی اسے تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے باقی حکومتیں بھی جلد یا بدیر تسلیم کر لیں گی۔ پاکستان میں طلباء اور مختلف پارٹیوں کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے۔ اور یہ پاکستان کو لازمی طور پر آج نہیں تو کل کرنا ہی ہے۔ کیوں کہ جب تک وہ بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کریگا اسیران جنگ وغیرہ کے معاملے پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر بنگلہ دیش کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت تسلیم کر کے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں کو غور کرنا چاہئے کہ جنگ نے جو معاملات و مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کا حل اور آئینہ ان

تینوں ملکوں کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہونا چاہئے۔ جگ نے جو مسائل پیدا کئے ہیں ان میں بڑے اور اہم مسائل یہ تین ہیں:-

- ۱۔ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ
 - ۲۔ ملک کے حدود کی از سر نو تعین و تشخیص۔
 - ۳۔ بنگلہ دیش کے بہاری یعنی غیر بنگالی مسلمانوں اور پاکستان کے بنگالیوں کا معاملہ۔
- اول الذکر دو معاملات ممکنہ ہیں۔ یعنی ایسے معاملات ہیں جن پر ہر جنگ کے بعد فریقین گفتگو کرتے ہیں اور اس کے لئے بین الاقوامی قواعد و ضوابط ہیں۔ ان کی روشنی میں اس قسم کے مسائل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کا بھی فیصلہ ہو ہی جائے گا۔

اب سب سے اہم مسئلہ بہاری مسلمانوں کا ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے ہزاروں بلکہ لاکھوں گھرانوں کے لئے اضطراب و تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان بہاری مسلمانوں میں ایک خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہوگی جنہوں نے دو قومی نظریے کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کو معقول اور صحیح تسلیم نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ اقتصادی و معاشی توقعات اور کچھ خانگی اور خاندانی حالات کے باعث انھوں نے وطن عزیز کو خیر آباد کہا اور وہاں جا بسے۔ لیکن گفتگو کو مختصر کرنے کے لئے فرض کیجئے کہ یہ سب نظریہ پاکستان کے ہی حامی تھے اور اس لئے وہ بنگلہ دیش کے حامی نہیں تھے۔ لیکن ہر تحریک میں ہوتا یہی ہے کہ جب وہ شروع ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کے موافق ہو جاتے ہیں اور کچھ مخالف اور پھر ان دونوں طبقوں میں بھی لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو بڑے فعال اور سرگرم دہر جوش ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو محض فکر و خیال کے اعتبار سے تحریک کے موید یا اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ عملاً ان کا اس سے کچھ زیادہ یا مطلق کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن تحریک اپنے اختتام کو پہنچ کر جب کامیاب یا ناکام ہو جاتی ہے تو کہنے کے لئے اس کا انتساب پوری قوم سے ہوتا ہے۔ چنانچہ

کانگریس کی تحریک آزادی اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اور ہم کو یقین ہے کہ خود سبکدوش دیش میں بھی کم عداوتیں تھیں۔ ایسے بنگالی ضرور موجود ہوں گے جو پاکستان کی سالمیت کے قائل اور اس کے حامی ہوں گے۔ لیکن جب تحریک کامیاب ہو جاتی ہے تو مخالفت بھی ——— اگر تحریک کی معقولیت کے سہرے ہی قائل نہ ہوں تب بھی ——— اس کے ساتھ موافقت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر شرافت و انسانیت اور خود ملک کے مفاد کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس ملک میں اس کی وفاداری کے ساتھ رہنا منظور کر لیا ہے ان کو شہریت کا حق دیا جائے اور محض اس بنا پر ان کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے کہ تحریک کی کامیابی سے قبل ان کا شمار مخالفین کے گروہ میں ہوتا تھا۔ یہ تو صرف ایک تحریک کی موافقت اور مخالفت کی بات تھی۔ تاریخ میں تو سینکڑوں مثالیں اس امر کی موجود ہیں کہ دو قوموں میں نہایت شدید اور بھیانک جنگ ہوتی ہے۔ دونوں طرف کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔ لیکن جب ایک قوم فاتح ہو جاتی ہے تو وہ مفتوح قوم کے پسماندہ افراد کو نہ قتل کرتی ہے نہ ان کے املاک ضبط کرتی ہے اور نہ ان کو جلا وطن ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے برعکس فاتح اور مفتوح دونوں قوموں کے افراد مل جل کر ملک کا کاروبار چلاتے ہیں۔ اس قسم کے مواقع پر فاتح قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوح کے ساتھ سیرجہی اور فیاضی کا معاملہ کر کے اس کا اعتماد زیادہ سے زیادہ حاصل کر لے اور دوسری جانب مفتوح قوم کے افراد و اشخاص اس بات کی سہی کرتے ہیں کہ وہ اپنی کارگزاری اور حسن خدمات کے ذریعہ فاتح کے دل میں گھر پیدا کریں اور اس کے دماغ سے ماضی کے نقوشِ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں۔ کہتے ہیں کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے اور سیاسی افکار و نظریات نے عالم کو ہی دیگر گوں کر دیا ہے۔ جی ہاں بالکل بجا ارشاد سہوار لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کی نفسیات اور اس کے جذبات و احساسات

کے محرکات کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ وہ آج بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اگر کل حسن سلوک اور شرافت و انسانیت کے اعلیٰ مظاہر کے باعث دشمن بھی دوست بن سکتے تھے تو آج بھی بن سکتے ہیں۔

اس ایک عام اخلاقی اصول اور تاریخی تعامل کو پیش نظر رکھ کر معاملہ زیر بحث پر غور کیجئے تو دو چیزیں صاف نظر آئیں گی۔

(۱) ایک یہ کہ دو قومی نظریہ جس کی بنیاد پر تقسیم ہوئی تھی۔ بنگلہ دیش کے نام سے ایک آزاد و مختار اور سکولر جمہوریہ بننے کے بعد بالکل ختم ہو گیا اور اس کی کوئی حقیقت اور حیثیت کم از کم موجودہ زمانہ میں عملی طور پر باقی نہیں رہ گئی ہے اور اس لئے آج ہم آپس کے ملائق و روابط کے اعتبار سے پچیس برس کے بعد پھر اسی مخلوط سوسائٹی میں پہنچ گئے ہیں جو تقسیم سے قبل پورے غیر منقسم ہندوستان میں موجود تھی۔ بیشک آج غیر منقسم ہندوستان تین مستقل اور آزاد ملکوں پر منقسم ہے۔ لیکن سیاسی تقسیم کے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہوتے کہ سوسائٹی بھی تقسیم ہو گئی۔ برلن کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن جرمن قوم جس سوسائٹی کا نام ہے۔ کیا اس کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ جہاں تک بھاری مسلمانوں کا تعلق ہے۔ یہ امر صاف ظاہر ہے کہ ان کا تعلق تینوں ملکوں سے ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پاکستان میں جا کر آباد ہوئے اور اب بنگلہ دیش میں برہمپور سے رہ رہے تھے۔ بلکہ ان میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوگی جو وہاں تقسیم سے پہلے سے رہ رہے تھے یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں صحیح طریق عمل تو یہ تھا کہ ہندوستان بنگلہ دیش اور پاکستان تینوں باہمی گفتگو کے بعد اس بات کو تسلیم کر لیتے کہ بھاری مسلمان اور اسی طرح پاکستان کے بنگالی۔ ان کو اختیار ہے کہ جس کسی ملک میں بھی آباد ہونا چاہیں آباد ہو سکتے ہیں۔

لیکن۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ اسی وقت ممکن اور لائق عمل ہو سکتا ہے جب کہ
 تینوں ملکوں میں اتحاد، دوستی اور ایک دوسرے کے ساتھ خیرگالی کے جذبات
 ہوں اور وہ بھول جاد اور معاف کردہ کی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں
 ہمیں افوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باہمی گفتگو کے لئے ہندوستان کی طرف سے
 غیر مشروط گفتگو کی جو پیش کش ہوئی ہے اگرچہ صدر بھٹو نے اس کا خیر مقدم کیا۔
 اور خوشی کا اظہار کیا ہے لیکن اس سلسلہ میں اب تک انھوں نے کوئی اقدام نہیں
 کیا۔ حالانکہ جنگ نے جو نازک مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کا بلا واسطہ اور براہ راست
 تعلق پاکستان سے ہی ہے اور ان کے حل نہ ہونے کے باعث پاکستان میں عام
 بے چینی اور اضطراب بھی ہے جو بالکل طبعی اور قدرتی ہے۔ صدر بھٹو بار بار کہہ تو یہی ہے
 ہیں کہ وہ ہندوستان سے دوستی اور امن چاہتے ہیں۔ لیکن اب تک ان کا بنگلہ دیش
 کو تسلیم نہ کرنا اور ہندوستان کی طرف سے گفتگو کی پیش کش کے جواب میں یہ کہنا کہ صدر
 امریکہ کے چین سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ اس کا جواب دیں گے۔ صدر امریکہ رخصت
 ہو گئے مگر اس کے بعد بھی ان کا خاموش رہنا، نکسن اور جو۔ این۔ لائی مشترکہ منشور میں
 چین کا کشمیر سے متعلق جنگ جو بیانہ اعلان کرنا اور پھر صدر بھٹو کا پاکستان کی افواج کی
 از سر نو تنظیم کرنا یہ سب ہندوپاک تعلقات کے لئے فالی نیک نہیں ہیں اور ان سے
 ظاہر ہوتا ہے کہ صدر بھٹو کا دماغ اس معاملہ میں اب تک صاف نہیں ہے۔ چنانچہ فضا
 میں پھر جنگ کے احساس کا دھواں پھلتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے
 پوچھنا ہے تو تجربہ کار سے پوچھو نہ کہ مرد داناسے۔ پھر اس شخص کی بد نصیبی کو کیا کہئے
 جو بار بار کے تجربے کے بعد بھی ہوش میں نہیں آتا۔ اور جو ایک بد نصیبی کے بعد دوسری
 بد نصیبی کو دعوت دینے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر صدر پاکستان کی
 عقل میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جنگ سے کسی معاملہ کا حل پہلے زمانہ میں ممکن ہو سکتا لیکن

آج یہ ممکن ہے۔ اور پھر جنگ اگر سو بھی تو اپنے بل بوتے پر باکسی بڑی طاقت کا سہارا لے کر جنگ کرنا بد قسمتی کو اپنے اوپر مسلط کر لینا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ گزشتہ پچیس برس تک ہندوستان اور پاکستان کی دشمنی کا تجربہ ہو گیا۔ ایک راستہ باہم صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کا بھی ہے۔ کچھ اور نہیں تو کم از کم اسے بھی تو آزما کر دیکھ لینا چاہئے۔ زندگی ایک فرد کی ہو یا ایک قوم کی اس میں استواری اور توانائی پیدا ہوتی ہے حقیقت نگری اور حقیقت پسندی سے۔ نہ کہ جذباتیت اور خواہشات نفس کی پیروی سے۔ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو اس کو قبول کر لینا دلیل مردانگی و بلند ہمتی ہے کوئی جذبہ یا خواہش کتنے ہی شیریں اور حسین ہوں ان کی پیروی میں حقائق سے اغماض و انحراف بردلی اور کوتاہ بینی ہے۔

پھر حال جب تک یہ باہم بے اعتمادی اور کشمکش کی فضا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قائم ہے، ان بھاری مسلمانوں کے معاملہ کے حل کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی ہائے ناموس انسانیت و شرافت کی بے چارگی دے کسی ہلاکوں انسان بوڑھے اور جوان مرد اور عورت آج موت و حیات کی کشمکش سے دو چار ہیں — لیکن سیاست کے نقار خانہ میں ان کی آہ و فریاد بھی سنائی نہیں دیتی۔

افسوس ہے گذشتہ ماہ ہمارے ثنایت فاضل دوست مولانا عبدالباری صاحب حادی نے بھی ہوائی جہاز کے ذریعہ حج کے ارادے سے جاتے ہوئے ظہران میں وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون مولانا داغباڑی (شمالی ادکاٹ) کے باشندہ تھے اور وہیں حضرت مولانا گنگوہی حضرت شیخ الہند اور مولانا مکتاوی رحمہ اللہ کے ارشد مآذہ سے علوم و فنون اسلامیہ و دینیہ کی تعلیم پائی۔ یوں تو سب علوم و فنون میں کامل درجہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور عربی ادب میں بڑا کمال حاصل تھا پہلے مختلف مدارس اور ایک

جمال الدين الاسنوى

اوزان کی طبقات الشافعیہ

(۹)

جناب حافظ و اکابر عبد العليم خان صاحب اہل علم و ادب کے لیے ایک بڑی بکھرے شیعہ دنیا میں مسلم دنیا میں بی بی علی گڑھ

باب القاف

فیه فصلان الاول فی الاسماء الواقعة فی السرافی والسادسة

۹۳۵۔ القزوينی، عبد الله بن محمد بن جعفر (م ۳۱۵ھ) ص ۳۶۹

۹۳۶۔ ابن القاص، احمد بن احمد، ابوالعباس الطبري (م ۳۳۵ھ) ص ۳۶۹

۹۳۷۔ ابن القطان، احمد بن محمد بن احمد ابوالعباس البغدادي (م ۳۵۹ھ) ص ۳۷۰

۹۳۸۔ القفال، عبد الله بن احمد بن عبد الله ابوبكر المروزي (م ۳۱۷ھ) ص ۳۷۰

۹۳۹۔ القزالي، ابو عبد الرحمن ص ۳۷۱

۹۴۰۔ القيصري ص ۳۷۱

۹۴۱۔ القزوينی، محمود بن الحسن بن محمد ابوحاتم (م ۴۴۲ھ) ص ۳۷۲

۹۴۲۔ ابوالفتح محمد (م ۵۰۱ھ) [ولد القزوينی] ص ۳۷۲

۹۴۳۔ ابوحامد، عبد الرحمن بن محمد بن ابی حاتم (۴۶۸ - ۵۲۸ھ) ص ۳۷۲

[حفيد القزوينی]

- ۹۴۴۔ القشیری، عبد الرحیم بن عبد الکیم، البونصر (م ۵۱۳ھ) ص ۳۷۲
 ۹۴۵۔ القزوينی، مکدا بن علی بن ابی عمر، ابو بکر، العمرازی (م ۵۳۵ھ) ص ۳۷۲
 ۹۴۶۔ القزوينی، ابولونس۔ ص ۳۷۴

الفصل الثانی فی الاسماء المنانہ علی الکتابین

- ۹۴۷۔ القرطبی، القاسم بن محمد بن قاسم، ابو محمد المغربی (م ۲۷۹ھ) ص ۳۷۵
 ۹۴۸۔ القرطبی، احمد بن عبد الوہاب بن یونس، ابو عمرو (م ۳۶۹ھ) ص ۳۷۵
 ۹۴۹۔ القشیری، علی بن محمد بن احمد ابو الحسن الجرجانی (م ۳۶۸ھ) ص ۳۷۵
 ۹۵۰۔ القزوينی، عبد اللہ بن علی بن الحسن، ابو محمد (م ۳۷۷ھ) ص ۳۷۵
 ۹۵۱۔ القصّار، احمد بن محمد بن احمد، ابو بکر الاصفہانی (م ۳۹۹ھ) ص ۳۷۶
 ۹۵۲۔ القیروانی، محمد بن علی ابو عبد اللہ البعلبی۔ ص ۳۷۶
 ۹۵۳۔ القصّار، علی بن محمد بن عمر، ابو الحسن، الرازی (م ۴۰۰ھ) ص ۳۷۶
 ۹۵۴۔ القزوينی، محمد بن احمد بن الفضل بن زرتارة، ابو منصور ص ۳۷۶
 ۹۵۵۔ القشّاب، اسماعیل بن ابراہیم بن محمد، ابو محمد، الشریسی، الہروی
 (م ۴۱۴ھ) ص ۳۷۶
 ۹۵۶۔ احمد القادر بالله امیر المومنین بن المقتدر بن المعتز بن الموفق بن المتوکل الہوسنی
 (۳۳۶ - ۴۲۲ھ) ص ۳۷۷
 ۹۵۷۔ القزّاب، اسحاق بن ابراہیم، ابو یعقوب (۳۵۲ - ۴۲۹ھ) ص ۳۷۷

لے قزّہ کی طرف نسبت ہے۔ مین میں ایک جگہ ہے (مجم ۳۳۵/۴)
 تے قال الاسدی: "قرمیس، لہدۃ مین حلوان دہقان"

- ٩٥٨- ابن القزويني، علي بن عمر بن محمد البراء بن البندادي (٣٦٠-٤٢٢هـ) ص ٣٤٤
- ٩٥٩- القضاة، محمد بن سلامة بن جعفر، أبو عبد الله (م ٤٢٢هـ) ص ٣٤٤
- ٩٦٠- القشيري، عبد الكريم بن هوازن بن عبد الملك، أبو القاسم (٣٤٦-٤٢٢هـ) ص ٣٤٨
- ٩٦١- القشيري، أبو سعد عبد الله بن عبد الكريم بن هوازن (٤١٤-٤٤٤هـ) ص ٣٨٠
[ولد القشيري عبد الكريم]
- ٩٦٢- القشيري، عبد الرحمن أبو منصور (م ٤٨٢هـ) [ولد القشيري عبد الكريم] ص ٣٨٠
- ٩٦٣- القشيري، عبد الواحد، أبو سعيد (٤١٨-٤٩٩هـ) ص ٣٨٠
[ولد القشيري عبد الكريم] ص ٣٨٠
- ٩٦٤- القشيري، عبداً، أبو الفتح (م ٥٢١هـ) ص ٣٨١ [ولد القشيري عبد الكريم]
- ٩٦٥- القشيري، عبد المنعم، أبو المظفر (٤٢٥-٥٣٢هـ) ص ٣٨١ [ولد القشيري عبد الكريم]
- ٩٦٦- القشيري، عبد الكريم بن عبداً، أبو المعالي (م ٥٥٦هـ) ص ٣٨١ [حفيد القشيري عبد الكريم]
- ٩٦٧- القشيري، عبد الحميد بن عبداً، ص ٣٨١ [حفيد القشيري عبد الكريم]
- ٩٦٨- القشيري، عبد الرحمن بن هبة الله بن عبد الواحد (م ٥٥٩هـ) ص ٣٨١
- ٩٦٩- القريشي، عبد الواحد بن محمد بن نصر، أبو القاسم (م ٥٢٠هـ) ص ٣٨٢
- ٩٧٠- القزالي، محمد بن الحسين بن بندار، أبو العز الواسطي ص ٣٨٢
- ٩٧١- القصري، القيس بن عبد الله بن علي بن سعيد أبو محمد (م ٥٢٢هـ) ص ٣٨٢
- ٩٧٢- القزويني، عبد الله بن عمران، أبو حامد (م ٥٨٥هـ) ص ٣٨٣
- ٩٧٣- القزويني، أحمد بن اسماعيل بن يوسف، أبو الخير، الطالقاني (٥١٣-٥٩٠هـ) ص ٣٨٣
- ٩٧٤- القزويني، أحمد بن المظفر، أبو الرضا، شمس الدين المعروف بالشيخ (٥٢٨-٥٣٦هـ) ص ٣٨٤

- ۹۷۵۔ القریظی، زید بن عبداللہ بن محمد بن ابی سالم۔ ص ۳۸۴
- ۹۷۶۔ القلیوبی، عثمان بن یوسف، ابو عمرو، محی الدین (۵۶۴ھ-۵۶۸ھ) ص ۳۸۴
- ۹۷۷۔ القلیبی، محمد بن علی البغی (ص ۳۸۴)
- ۹۷۸۔ القدسی، اسماعیل بن حامد بن ابی القاسم، ابو المہاجر، الأنصاری، الحزمی شہاب الدین (۵۴۲-۵۴۳ھ) ص ۳۸۴
- ۹۷۹۔ القسطلانی، محمد بن احمد بن علی، قطب الدین، ابو بکر (۶۱۴-۶۸۶ھ) ص ۳۸۵
- ۹۸۰۔ ابن القلیوبی، احمد بن عیسیٰ بن رضوان، کمال الدین، العسقلانی (م ۶۸۹ھ) ص ۳۸۵
- ۹۸۱۔ فتح الدین، احمد (م ۷۲۵ھ) [ولدا بن القلیوبی] ص ۳۸۵
- ۹۸۲۔ القزوينی، عمر بن عبدالرحمن بن عمر، امام الدین، النجفی (۶۵۳-۶۹۹ھ) ص ۳۸۶
- ۹۸۳۔ القزوينی، جمال الدین محمد بن عبدالرحمن بن عمر (م ۷۳۹ھ) ص ۳۸۷
- ۹۸۴۔ القزوينی، بدر الدین فضل اللہ (م ۷۹۶ھ) [عم القزوينی، عمر] ص ۳۸۷
- ۹۸۵۔ القفطی، ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن سید اکل، بہار الدین (۶۰۰-۷۹۷ھ)
- ۹۸۶۔ القفطی، احمد بن محمد بن ابی العزم، نجم الدین، ابو العباس، المکی (م ۷۲۷ھ) ص ۳۸۸
- ۹۸۷۔ القفطی، زین الدین، عبداللہ بن محمد بن ابی العزم (م ۷۴۵ھ) ص ۳۸۹

لے قلعة (بفتح القاف واللام) کی طرف نسبت ہے جو مین میں ایک جگہ کا نام ہے

(معجم ۴/۳۸۹)

۳ قفط (بکسر القاف و سکون الفاء) کی طرف نسبت ہے۔ قفط مصر کے ایک شہر کا نام ہے (مراصل الاطباء ۱۱۱۳/۳) ۳ قفط (بفتح القاف و ضم الیم) کی طرف نسبت ہے جو قفط مصر کے ایک شہر کا نام ہے (معجم ۴/۳۹۸)

- ۹۸۸۔ القولوی، علی بن یوسف بن اسماعیل بن یوسف، علاء الدین، ابوالحسن۔
(۹۸۸-۷۲۹ھ) ص ۳۸۹-۳۹۱
- ۹۸۹۔ عبد الدین ابوالشمار، محمود (۷۱۹-۷۵۸ھ) [ولد القولوی] ص ۳۹۱
- ۹۹۰۔ محمد الدین عبدالکریم (۷۲۹-۷۶۲ھ) [ولد القولوی] ص ۳۹۲
- ۹۹۱۔ ابن القماح، محمد بن احمد بن اسماعیل بن حیدر، شمس الدین، ابوعبدالله۔
(۷۵۶-۷۴۱ھ) ص ۳۹۳
- ۹۹۲۔ القزوینی، سعد اللہ بن محمد بن عثمان، سعد الدین، الغسانی (م ۷۴۹ھ) ص ۳۹۳

باب الکاف

- فیہ فصلان۔ الاول فی الاسماء الواقعة فی الساعات فی الزمّة
۹۹۳۔ الکراہی، ابو محمد، النیسابوری۔ ص ۳۹۳
- ۹۹۴۔ ابن کج، یوسف بن احمد بن کج، ابوالقاسم، الدنیردی (م ۷۴۵ھ) ص ۳۹۴
- ۹۹۵۔ الکرخی منصور بن عمر بن علی، ابوالقاسم، البغدادی (م ۷۴۴ھ) ص ۳۹۴
- ۹۹۶۔ ابوبکر، محمد (م ۷۸۲ھ) ص ۳۹۴ [ولد الکرخی]
- ۹۹۷۔ ابوالبر، ابیہیم۔ ص ۳۹۴ [خفید الکرخی]

الفصل الثانی فی الاسماء الساعۃ علی الکتابین

- ۹۹۸۔ کثیر، ابو علی۔ ص ۳۹۵
- ۹۹۹۔ ابن کلاب، عبداللہ بن سعد، ابو محمد (م بعد ۷۲۲ھ) ص ۳۹۵

۱۔ قونیۃ کی طرف منسوب ہے۔ قونیۃ روم کا ایک بڑا شہر ہے (معجم ۲/۴۱۵)۔

- ۱۰۰۰۔ الکرجی، محمد بن علی بن احمد، ابو العباس (م ۳۴۳ھ) ص ۳۹۵
- ۱۰۰۱۔ الکوازی، الحسن بن محمد بن ابراہیم، ابو علی۔ ص ۳۹۶
- ۱۰۰۲۔ الکشفی، الحسن بن احمد، ابو عبد اللہ، الطبری (م ۴۱۴ھ) ص ۳۹۶
- ۱۰۰۳۔ اکازرونی، محمد بن بیان بن محمد (م ۴۵۵ھ) ص ۳۹۶
- ۱۰۰۴۔ اکرونی، عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم بن یحییٰ، ابو محمد (م ۴۶۹ھ) ص ۳۹۶
- ۱۰۰۵۔ الکشمیہ، یحییٰ بن علی بن محمد، ابو القاسم، الحمدونی (۳۹۸-۴۶۹ھ)
- ۱۰۰۶۔ الکرجی، محمد بن عبد الملک بن محمد، ابو الحسن (۴۵۸-۵۳۲ھ) ص ۳۹۷
- ۱۰۰۷۔ الکرجی، سلیمان بن محمد بن حسین، البندنجی المعروف بالقاضی۔
- الکافی (۴۶۰-۵۳۸ھ) ص ۳۹۸
- ۱۰۰۸۔ الکرجی، ابراہیم بن محمد بن منصور، ابو البدر (۴۵۰-۵۳۹ھ) ص ۳۹۸
- ۱۰۰۹۔ ابن کرار، علی بن محمد بن عیسیٰ، ابو الحسن، الواسطی (م ۵۴۵ھ) ص ۳۹۸
- ۱۰۱۰۔ الکشمیہ، محمد بن عبد الرحمن بن محمد، ابو الفتح (م ۵۴۸ھ) ص ۳۹۸

لے کر رنج (فتح الکاف دارالار) کی طرف نسبت ہے۔ ہمدان اور صفہان کے مابین ایک شہر کا نام ہے۔ (معجم ۴/۴۱۵) لے گوار (بضم الکاف) کی طرف منسوب ہے۔ ایران میں ایک شہر ہے۔ اس کے اور شیراز کے مابین دس میل کا فاصلہ ہے (معجم ۴/۴۸۶)

لے کشف (فتح الکاف وسکون الشین البعۃ) کی طرف نسبت ہے۔ آمل طبرستان کا ایک ٹکاؤں ہے۔ (معجم ۴/۴۶۲)

لے کازرون کی طرف نسبت ہے۔ ایران میں ایک شہر ہے۔ (معجم ۴/۴۲۹)

لے کشمین (بضم الکاف وفتح الیم والحاء) کی طرف نسبت ہے۔ شہر مرو میں ایک ٹکڑے کاؤں کا نام ہے (معجم ۴/۴۶۳)

۳۱۱- صاحب الکافی، محمود بن محمد بن العباس بن ارسلان، ابو محمد، التوارذمی
(م ۵۶۸ هـ) ص ۳۹۹

۳۱۲- الکرمانی، عبد الله بن حمزة بن سادة ابو الفرج الدمشقی (م ۵۹۱ هـ) ص ۳۹۹

۱۰۱۳- الکرمی، المبارک بن المبارک، ابو طالب (م ۵۸۵ هـ) ص ۳۹۹

۱۰۱۴- عماد الدین الکاتب، محمد بن محمد بن حامد، ابو عبد الله، الاصفهانی-

(۵۱۹- ۵۹۹ هـ) ص ۴۰۰

۱۰۱۵- نجم الکبیر، احمد بن عمر بن محمد التوابع (م ۶۱۸ هـ) ص ۴۰۱

۱۰۱۶- اکروی عثمان ابو عمر و عماد الدین (م ۶۲۰ هـ) ص ۴۰۱

۱۰۱۷- الکتابی، نجم بن سالم (۵۵۹- ۶۳۳ هـ) ص ۴۰۱

۱۰۱۸- اکروی، علی بن محمود بن علی، ابو الحسن، شمس الدین السمرودی

(م ۶۷۵ هـ) ص ۴۰۱

۱۰۱۹- ابن الکتابی، عمر بن عبد الرحمن بن یونس، زین الدین-

(۶۵۳- ۷۳۸ هـ) ص ۴۰۲

باب ۲ للام

فیه فصلان - الاول فی الاسماء الواقعة فی ۲ المسام فی ۲ المفضة

۱۰۲۰- ابن لال، احمد بن علی بن احمد بن لال، ابو بکر الهذلی (م ۶۰۷- ۳۹۸ هـ) ص ۴۰۲

۱۰۲۱- ابن البیان، محمد بن عبد الله، ابو الحسین، الفرضی، البصری (م ۶۴۳ هـ) ص ۴۰۳

الفصل ۲ المشایخ الاسماء المنیة علی الکتاب

۱۰۲۲- الکتابی، هبة الله بن الحسن بن منصور، الباقاسم الرازی الطبری (م ۶۴۳ هـ) ص ۴۰۴

- ۱۰۲۳۔ ابو بکر، محمد (۲۱۹-۲۹۳ھ) [ولد الامام علی] ص ۴۴
 ۱۰۲۴۔ لیث بن الحسن بن الیث ابو الحسن السرخسی، ص ۴۳
 ۱۰۲۵۔ اللعفی، عبداللہ بن یزید بن عبداللہ المینی، الحارثی (م بعد ۵۰۰ھ) ص ۴۴
 ۱۰۲۶۔ اللباد، عبدالرحمن بن محمد بن محمد، ابو القتوح (۴۷۶-۵۳۶ھ) ص ۴۴
 ۱۰۲۷۔ صاحب کتاب التہذیب، الحسین بن محمد، ضیاء الدین الہروی ص ۵۵
 ۱۰۲۸۔ اللوزی، یحییٰ بن ابیاسیم بن محمد، ابو تراب، الکرخی (م ۶۱۴ھ) ص ۵۵
 ۱۰۲۹۔ اللغوی ابو الحسن، علی بن منصور بن عبداللہ (م ۶۲۲ھ) ص ۵۵
 ۱۰۳۰۔ اللجی ابو العقیق بن احمد بن عمر رضی الدین (م ۶۲۵ھ) ص ۵۵
 ۱۰۳۱۔ ابن اللبان، محمد بن احمد شمس الدین الدشتی (م ۶۴۹ھ) ص ۵۵-۶۰۷

باب المیم

فیہ فضلان - الاول فی الاسماء الواقعة فی السرافی و السرفیة

- ۱۰۳۲۔ المروزی، محمد بن نصر (۲۱۲-۲۹۴ھ) ص ۶۰۶
 ۱۰۳۳۔ ابن المنذر، محمد بن ابراہیم بن المنذر، ابو بکر، النیسابوری (م ۳۱۰ھ) ص ۷۰
 ۱۰۳۴۔ المردی، ابراہیم بن احمد ابو اسحاق (م ۳۴۰ھ) ص ۸۰
 ۱۰۳۵۔ الممودی، محمد بن محمود ابو بکر، المردی (م ۴۰۹ھ)
 ۱۰۳۶۔ ابو منصور بن مہران الاودنی، ص ۹۰

لے لوز (بفتح اللام) کی طرف نسبت ہے بغداد میں ایک محل کا نام ہے۔ (معجم ۲۶/۵)
 لے قال الاسنوی، "الجمی نسبة الی لجم یلام مفتوحة فم حار ساکنۃ بعد ما یم وهو یم من عمل عن"
 (طبقاتہ ص ۵۰۵)

- ۱۳۷- المروزی، احمد بن بشر بن عامر، ابو طاهر، القاضی الطاهری (م ۳۶۲ هـ) ص ۳۱۰
- ۱۳۸- ابو محمد (م ۴۱۰ هـ) [ولد المروزی]
- ۱۳۹- ابن المروزی، علی بن احمد ابو الحسن، البغدادی (م ۳۶۶ هـ) ص ۳۱۰
- ۱۴۰- المروزی، محمد بن احمد بن عبد الله، البوزید، الفاشانی (۳۰۱ - ۳۷۱ هـ) ص ۱۱۱
- ۱۴۱- الماسر حسی، محمد بن علی بن سهل، ابو الحسن النیسابوری (م ۳۸۴ هـ) ص ۱۱۱
- ۱۴۲- ابو بکر محمد (م ۳۸۹ هـ) ص ۱۱۱ [ولد الماسر حسی]
- ۱۴۳- ابن الحمالی، احمد بن محمد بن احمد بن القاسم بن اسماعیل، ابو الحسن، الضبی البغدادی (۳۶۸ - ۴۱۵ هـ) ص ۱۱۲
- ۱۴۴- ابو الفضل محمد (م ۴۷۷ هـ) ص ۱۱۳ [ولد ابن الحمالی]
- ۱۴۵- ابو طاهر یحیی، ص ۱۱۳ [حفید ابن الحمالی]
- ۱۴۶- [محمد بن احمد بن القاسم الحمالی] (۳۳۳ - ۴۰۷ هـ) ص ۱۱۳
- [والد ابن الحمالی]
- ۱۴۷- ابو الحسن احمد الحمالی (م ۳۷۷ هـ) ص ۱۱۳ [جد ابن الحسن الحمالی]
- ۱۴۸- القاسم الحمالی (م ۴۱۳ هـ) [جد بیله ای ابی الحسن الحمالی]
- ۱۴۹- ابو عبد الله الحسن (م ۳۷۱ هـ) [اخو القاسم الحمالی]
- ۱۵۰- امه الواحد سقیه [م ۳۷۷ هـ] ص ۱۱۳ (بنت ابی عبد الله الحسین)
- ۱۵۱- المسعودی، محمد بن عبد الملك بن مسعود بن احمد، ابو عبد الله المروزی (تقریباً ۴۲۰ هـ) ص ۱۱۳
- ۱۵۲- صاحب المطارحات، الحسین بن محمد بن ابو عبد الله القطان. ص ۱۱۵
- ۱۵۳- المسعودی، علی بن حبیب ابو الحسن البصری (م ۴۲۵ هـ) ص ۱۱۵

- ۱۰۵۴- الما خوافی، محمد بن عبدالرزاق، ابوالفضل (تقریباً ۳۶۰ھ) ص ۴۱۶
 ۱۰۵۵- المقدسی، نصر بن ابراہیم، ابوالفتح النابلسی (م ۴۹۰ھ) ص ۴۱۶
 ۱۰۵۶- المرود ذی، ابراہیم بن احمد بن محمد (م ۵۳۶ھ) ص ۴۱۶

الفصل الثاني في الاسماء المتداولة على كتابين

- ۱۰۵۷- المنذري ابوالحسن، ص ۴۱۷
 ۱۰۵۸- ابن مجاهد، احمد بن موسى بن العباس، ابوبكر (م ۳۲۴ھ) ص ۴۱۷
 ۱۰۵۹- الملقى المتع، ابوالطيب السوادى ص ۴۱۸
 ۱۰۶۰- المقدسى، اسماعيل بن عبد الواحد الربى ابوباشم (م ۳۲۵ھ) ص ۴۱۸
 ۱۰۶۱- المغنقى، عبد الله بن على، ابومحمد الطبرى والمعروف ايضا بالعراقى
 تقریباً ۳۵۹ھ) ص ۴۱۸
 ۱۰۶۲- المزكى، ابراہیم بن محمد بن یحیی، ابواسحاق النیسابوری
 (م ۳۶۲ھ) ص ۴۱۸
 ۱۰۶۳- ابو زكريا يحيى (م ۴۱۴ھ) ص ۴۱۸ [ولد المزكى]
 ۱۰۶۴- ابو عبد الله محمد (م ۴۲۷ھ) ص ۴۱۹ [ولد المزكى]
 ۱۰۶۵- عبد الرحمن (م ۳۹۷ھ) ص ۴۱۹ [ولد المزكى]
 ۱۰۶۶- على بن مهدى، ابوالحسن الطبرى ص ۴۱۹

له قال الاسنوى: "والماخوفى منسوب الى ماخوان بنى رعممة مضمومة وبالنون وهى قرية

من كنى مرو" (طبقاته ص ۴۱۶)

له قال الاسنوى "المزكى بكسر الكاف" طبقاته ص ۴۱۸

- ۱۰۶۷۔ المقتدر، عبداً لله بن محمد بن عبداً لله، أبو أحمد (۶۷۳-۳۶۵ھ) ص ۴۱۹
- ۱۰۶۸۔ أبو نصر المودب، ص ۴۱۹
- ۱۰۶۹۔ محمد بن عبداً لله بن محمد، أبو بکر الفارسی (م ۳۶۲ھ) ص ۴۲۰
- ۱۰۷۰۔ المقتدری، أحمد بن الحسين بن مهران، أبو بکر الأصفهانی، الزاهد۔
- (م ۳۸۱ھ) ص ۴۲۰
- ۱۰۷۱۔ المقتدری، عبد المنعم بن عبداً لله بن غلبون، أبو الطیب الحلبي۔
- (۳۰۹-۳۸۹ھ) ص ۴۲۰
- ۱۰۷۲۔ الملقی، یوسف بن اسحاق، أبو الحسن الجرجانی (م ۳۹۴ھ) ص ۴۲۱
- ۱۰۷۳۔ المنیری، عبداً لله بن محمد بن ابراهیم، أبو القاسم البزاز ص ۴۲۱
- ۱۰۷۴۔ أبو منصور المزکی ص ۴۲۱
- ۱۰۷۵۔ المستغفری، جعفر بن محمد بن المعتز بن محمد النسفی (م ۴۰۲ھ) ص ۴۲۱
- ۱۰۷۶۔ المیانجی، علی بن الحسن بن علی، أبو الحسن (م ۴۱۴ھ) ص ۴۲۱
- ۱۰۷۷۔ القاضی أبو بکر محمد (ص ۴۲۲) [ولد المیانجی]
- ۱۰۷۸۔ عین القضاة ابی المعالی عبداً لله بن ابی بکر (م ۵۲۵ھ) (نفید المیانجی)
- ۱۰۷۹۔ المکتدری، احمد بن محمد بن عبد الواحد بن احمد بن محمد بن عمر بن محمد بن المکدر
- (م ۴۲۳ھ) ص ۴۲۲
- ۱۰۸۰۔ المروزی، جعفر بن محمد، أبو الحسین (م ۴۴۶ھ) ص ۴۲۲
- ۱۰۸۱۔ ابن ماکول، الحسین بن علی بن جعفر أبو عبداً لله (۳۶۸-۴۴۶ھ) ص ۴۲۲

له قال الاسنوی: "والملقى بضم الهمزة والفتحة يمدون به المعبر (طحاته ص ۴۲۱)
له ميال في كل طرف نسبت به. جو شام میں ایک جگہ ہے (نجم ۲۳۸/۵)

- ۱۰۸۲۔ ابن المسلمة، علی بن الحسن بن احمد، ابو القاسم۔
(۳۹۴ - ۴۵۰ھ) ص ۲۳
- ۱۰۸۳۔ محمودی، طاهر بن احمد بن علی بن محمود، ابو الحسن القاتنی۔
(م ۴۶۶ھ) ص ۲۳
- ۱۰۸۴۔ المؤذن، احمد بن عبد الملك بن علی، ابو صالح النیسابوری۔
(م ۴۷۰ھ) ص ۲۳
- ۱۰۸۵۔ ابو سعد اسماعیل (۴۵۲ - ۵۳۲ھ) ص ۲۲ [ولد المؤذن]
- ۱۰۸۶۔ ابو محشر عبد الکرم بن عبد الصمد بن محمد القطان الطبری۔
(م بعد ۴۷۰ھ) ص ۲۲
- ۱۰۸۷۔ محمد بن الحسن بن الحسين بن مہر بن قشاه ابو عبد اللہ (۴۷۳ - ۴۷۴ھ) ص ۲۲
- ۱۰۸۸۔ المروزی، عبد الجلیل بن عبد الجبار بن عبد اللہ، ابو المنظر (م ۴۷۹ھ)
- ۱۰۸۹۔ المقدسی، سلامة بن اسماعیل بن جماعة، ابو الخیر (م ۴۸۰ھ) ص ۲۵
- ۱۰۹۰۔ المقدسی، الحسين بن محمد بن الحسين بن ابراهیم الدلفی (م ۴۸۲ھ) ص ۲۵
- ۱۰۹۱۔ المقیصی، علی بن محمد بن علی بن احمد، ابو القاسم۔
(۴۸۷ - ۴۸۸ھ) ص ۲۵
- ۱۰۹۲۔ المقدسی، ابو الفضل عطار (ص ۲۵)
- ۱۰۹۳۔ المنینی، عبد الرزاق بن حسن ابو الفتح المروزی (۴۱۲ - ۴۹۱ھ) ص ۲۶

۱۔ مقبضۃ کی طرف نسبت ہے۔ شام کی سرحدوں میں سے جہان کے کنارے
ایک شہر کا نام ہے۔ یہ شہر انطاکیہ اور ملک روم کے مابین اور طرس کے
قریب ہے (مجم ۱۴۲/۵)

- ۱۰۹۲- احمد (م بعد ۵۱۰ھ) - ص ۴۴ [ولدا المنی]
- ۱۰۹۵- المفسر، علی بن سهل بن العباس، ابو الحسن (م ۴۹۱ھ) ص ۲۶
- ۱۰۹۶- المرافی، عبد الباقی بن یوسف بن علی، ابو تراب (۳-۴۹۲ھ) ص ۲۶
- ۱۰۹۷- ابن المظنی، مسعود بن علی بن الحسن، ابو عمرو الارزبلی ص ۲۷
- ۱۰۹۸- غنم الیک، نصر بن ابراهیم بن نصر (م ۴۹۹ھ) ص ۲۷
- ۱۰۹۹- المدنی، عبد الرحمن بن احمد بن محمد ابو الحسن (۵-۴۹۵ھ) ص ۲۸
- ۱۱۰۰- الموصلی، محمد بن احمد بن عبد الباقی (م ۴۹۴ھ) ص ۲۸
- ۱۱۰۱- علی بن عبد الرحمن بن یارون ابو الخطاب (۹-۴۹۷ھ) ص ۲۸
- ۱۱۰۲- المروزی کامکار بن عبد الرزاق، ابو محمد - ص ۲۸
- ۱۱۰۳- الموقن بن احمد بن علی ابو نصر البغدادی (م ۵۰۷ھ) ص ۲۸
- ۱۱۰۴- المزیلی، الفیل بن عبد الحسن بن محمد (م ۵۱۲ھ) ص ۲۹
- ۱۱۰۵- ابن اخی نظام الملک، عبد الرزاق بن عبد الله بن اسحاق ابو المعالی (۵۹-۵۱۵ھ) ص ۲۹
- ۱۱۰۶- المرافی - علی بن حکو - بن ابراهیم ابو الحسن (۱۵-۵۱۶ھ) ص ۲۹
- ۱۱۰۷- ابن المسلم، عبد الله بن محمد بن احمد ابو القاسم الکبری (م ۵۱۶ھ) ص ۳۰
- ۱۱۰۸- المقدسی، سلطان بن ابراهیم بن المسلم ابو الفتح (۴۸۲-۵۱۸ھ)
- ۱۱۰۹- المقدسی - یحییٰ بن الفرج ابو الحسن اللقی (ص ۴۳۰)

۱۔ مزیلی (فتح السیم والراء) کی طرف نسبت ہے۔ جو آذربایجان کے مشہور شہروں
میں سے ایک شہر ہے (تجیم ۵/۱۱۰)

- ۱۱۱۰۔ المیثقی، یوسف بن عبد العزیز بن علی، ابو الحاج، النخعی، ص ۳۳۳۔
- ۱۱۱۱۔ المرعشی، محمد بن الحسن البکری، ص ۳۱۳۔
- ۱۱۱۲۔ الماہیانی، محمد بن احمد بن ابی الفضل، ابو الفضل (م ۵۲۵ھ) ص ۳۳۱۔
- ۱۱۱۳۔ المیصنی، اسعد بن ابی نصر بن ابی علی بن الفضل، ابو الفتح، ص ۳۳۱۔
- نحی الدین (م ۵۲۴ھ) ص ۳۳۲۔
- ۱۱۱۴۔ المقدسی، احمد بن عبد العزیز بن محمد، ابو الطیب (م ۵۲۹ھ) ص ۳۳۲۔
- ۱۱۱۵۔ المرزوی منصور بن محمد بن منصور ابو المنظر (م ۵۲۹ھ) ص ۳۳۲۔
- ۱۱۱۶۔ الموصلی، علی بن سعاده ابو الحسن الجعفی ابو الحسن السراج (م ۵۲۹ھ) ص ۳۳۳۔
- ۱۱۱۷۔ الموصلی، الحسن بن علی بن الحسن، ابو علی المعروف بابن عماد (م ۵۲۹-۵۴۴ھ) ص ۳۳۳۔
- ۱۱۱۸۔ علی بن المسلم بن محمد بن علی ابو الحسن السلسی، الدمشقی، الملقب بجمال الاسلام دلعروف بابن الشہرزی (م ۵۲۳ھ) ص ۳۳۳۔
- ۱۱۱۹۔ ابو بکر محمد (م ۵۲۴ھ) ص ۳۳۴ [ولد جمال الاسلام]

۱۔ مئورقہ (بالفتح ثم النعم وسكون العاد والراء) مشرقی اندلس میں ایک جزیرہ ہے۔ (معجم ۲۴۶/۵) اسے مرعش کی طرف نسبت ہے۔ شام اور روم کی سرحد پر ایک شہر ہے وہاں ایک قلعہ بھی ہے (معجم ۱۰۴/۵)

۲۔ ماہیان (بکسر الھاء) مرو کے ایک گاؤں کا نام ہے اس کے اور مرو کے مابین دو میل کا فاصلہ ہے (معجم ۴۹/۵) اسے میٹھنہ (بالفتح ثم السكون وفتح الھاء والنون) کی طرف نسبت ہے۔ خابران میں ایک گاؤں ہے۔ (معجم ۲۴۴/۵)

- ۱۱۳۰- البرکات (م ۵۳۲-۹۰۲) ص ۲۲۲ [حفید جمال الاسلام]
 ۱۱۳۱- المومنی، جعفر بن محمد بن حمدان، ابو القاسم، ص ۳۵
 ۱۱۳۲- المریدی، عبد اللہ بن نصر بن عبد الغزیز (م ۵۴۱-۴۸۲) ص ۳۵
 ۱۱۳۳- محمد بن احمد بن موسی الطوسی (م ۵۴۱) ص ۳۵
 ۱۱۳۴- المہدی بن حبیب اللہ بن المہدی (م ۵۴۱) ص ۳۵
 ۱۱۳۵- المصطفی، نصر اللہ بن محمد بن عبد القوی ابو الفتح الاشعری (۴۴۸-۵۴۲)
 ص ۳۵-۳۶
 ۱۱۳۶- المرغی، شرف شاہ بن مکراد، الشریف العباس (م ۵۴۳) ص ۳۶
 ۱۱۳۷- المرادی، علی بن سلیمان بن احمد، ابو الحسن الاندلسی (م ۵۴۴) ص ۳۶
 ۱۱۳۸- ابو المعالی، عبد الملک بن نصر بن عمر المعروف بشیخ المشائخ -
 (م ۵۴۵) ص ۳۶
 ۱۱۳۹- المارشی، محمد بن الفضل بن علی، ابو الفتح (م ۵۴۹) ص ۳۶
 ۱۱۴۰- المروزی، محمد بن عبدالرحمن بن عبد اللہ ابو الفتح الحمدوی (۴۶۶-۵۴۰)
 ص ۳۶
 ۱۱۴۱- المنزلی، علی بن معصوم بن ابی ذر، البرکات (۵۴۰-۵۸۹)
 ص ۳۶

لے قال الاسنوی: "المریدی منسوب الی مرید وهو احدی بلاد آذربایجان" دیکھئے :-
 طبقات الشافعیۃ للاسنوی ص ۳۵

لے مراد کی طرف نسبت ہے۔ مواد اندلس میں قرطبہ کے قریب ایک قلعہ ہے (مجم ۹۹/۵)

لے مارشک (کبیر المراءع الشیخ المہجۃ) طبرستان میں ایک گاؤں ہے (مجم ۳۹/۵)۔

۱۱۳۲۔ الماکینی، عبداللہ بن میمون بن عبداللہ المکوفی (م ۴۹۰-۵۵۱ھ) ص ۴۳۸
 ۱۱۳۳۔ المندانی، احمد بن یحییٰ راعی، ابوالعباس، الواسطی۔

(۴۶۹-۵۵۲ھ) ص ۴۳۸

۱۱۳۴۔ الماکینی، موسیٰ بن محمود بن احمد، ابو عمران، عزالدین (م ۵۶۰ھ) ص ۴۳۸
 ۱۱۳۵۔ موسیٰ بن محمد (م ۵۰۹ھ) [خفید الماکینی]

۱۱۳۶۔ محمد بن علی بن احمد بن الوزیر نظام الملک، ابونصر (م ۵۶۱ھ) ص ۴۳۹
 ۱۱۳۷۔ ابن الماسح، علی بن ابی الفضائل بن الحسن بن احمد الکلابی ابوالقاسم، الملقب
 بجمال الأئمة (۴۸۸-۵۶۲ھ) ص ۴۳۹

۱۱۳۸۔ علی بن عبدالرحمن بن مبارک (م ۵۶۲ھ) ص ۴۳۹

۱۱۳۹۔ محمد بن عمر بن احمد، ابو موسیٰ الاصبحانی (۵۰۱-۵۵۸ھ) ص ۴۴۰

۱۱۴۰۔ الموصلی، عبداللہ بن سعد بن علی ابوالفرج المعروف بابن الدهان الملقب بالمہذب
 ویرف ہا لمصی (م ۵۵۸ھ) ص ۴۴۰

۱۱۴۱۔ المقتول شہاب الدین، یحییٰ بن حسن، ابوالفتوح السہروردی۔

(م ۵۸۸ھ) ص ۴۴۱

۱۱۴۲۔ الموصلی، محمد بن محمد، ابوالبرکات الأنصاری۔

(م ۵۳۰-۵۶۰ھ) ص ۴۴۱

(باقی)

لے قال الاسنوی: "ما کان قیل اسم قرية ایضا" (طبقاتہ ص ۴۳۸)

لے قال الاسنوی: "وکون بیان مضمومہ وداوسا کنہ بعد حانون، قرية من امیود"

(طبقاتہ ص ۴۳۸)

لے۔ تاکین (بکسرکاف والین) خابور میں ایک شہر ہے (معجم ص ۴۳۷)

سید احمد شہید اور ان کے دیوبندی فقہاء (تاریخ دیوبند کے زیر تالیف جدید ایڈیشن کا ایک باب) از سید محبوب رضوی

(۲)

دیوبند کے رفقاء

دیوبند کے شیخ بلند بخت سر دھنہ (میرٹھ) میں بیعت کر چکے تھے بلکہ سید صاحب کی خدمت میں جو لوگ پیش پیش رہے تاریخ میں ان کے نام تو ملتے ہیں مگر حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ سید صاحب کا یہ دور ۱۳۳۲ھ - ۱۳۸۱ھ میں ہوا تھا جس پر ڈیڑھ سو سال سے زائد گزر چکے ہیں، اتنی طویل مدت کے بعد تفصیلی حالات کا مہیا ہونا بہت مشکل ہے۔ جن لوگوں کے حالات معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں۔

- ۱۔ سید مقبول۔ ان کا پورا نام سید مقبول عالم ہے۔ دیوبند کے خاندان سادات سے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ ہندگی سید محمد ابراہیم ہیں۔ یہ واقعہ اسطور کے ہم جہ تھے۔
- ۲۔ مولوی شمس الدین۔ مولانا عبدالخالق صاحب جنہوں نے دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر میں زبردست خدمات انجام دیں ان کے والد بزرگوار تھے۔ جامع مسجد دیوبند کی امامت و خطابت ان ہی کی اولاد میں اب تک چلی آرہی ہے۔ دیوبند کے مشہور بزرگ شاہ ولایت صاحب کے مزار کے قریب مدفون ہیں، فقہی مسائل میں ایک رسالہ "شرعیات کا لٹھ" ان کی تصنیف ہے۔

مولوی شمس الدین صاحب ابتداً برسات کی جانب مائل تھے۔ دیوبند میں سید صاحب کے ورود کی خبر سن کر مخالفت کے جوش میں ایک ہجو لکھی جو اسی وقت پچے پچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ ایک مرتبہ سید صاحب کے دوران قیام میں یہ دیکھنے کے لئے قاضی مسعود میں آئے کہ آخر سید صاحب کی جانب لوگوں کا اس قدر رجوع کیوں ہے۔ مسجور عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی۔ مولوی صاحب مجمع میں ایک طرف بیٹھ گئے، سید صاحب نے فوراً ان کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ "آپ ہی نے ہماری ہجو میں اشعار لکھے ہیں؟" سید صاحب نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں فرمائے کہ مولوی صاحب تڑپ گئے۔ اور معذرت کے بعد عرض کیا کہ "اس گستاخی پر میں شرمندہ ہوں خدا کے لیے معاف کر دیجیے اور حلقہٴ بیعت میں داخل فرمائیے" سید صاحب نے بیعت کر لیا اور مرید ہو کر بالکل سید صاحب کے رنگ میں ڈوب گئے۔

۳۔ شیخ رجب علی۔ ان کے والد کا نام شیخ خرمند تھا۔ دیوان لطف اللہ عثمانی جو امرائے شاہجہانی میں سے تھے، ان کی اولاد میں ہیں، دیوان لطف اللہ کے شاندار محفل کا بوسیدہ اور شکستہ دروازہ آج بھی اپنی عظمتِ رفتہ کی شہادت دے رہا ہے۔ دیوبند کی عید گاہ کے خطیب مولانا محمد مہین صاحب (وفات ۱۳۸۹ھ ۱۹۶۹ء) ان ہی شیخ رجب علی کے پوتے تھے، مولانا محمد مہین صاحب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی انقلابی پارٹی کے مخصوص اراکین میں سے تھے۔، پارٹی کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کام ان کے سپرد تھا۔ مولانا محمد متین خطیب عید گاہ کہ اچھی ان کے فرزند رشید ہیں۔

۱۔ زبانی روایات کے علاوہ یہ واقعہ سفرنامہ دہلی اور اس کے اطراف میں بھی منقول ہے۔ ص ۹۷، ۹۸

۴۔ مولوی بشیر احمد ان کے والد کا نام شیخ غریب اللہ تھا۔ دیوبند کے مشہور طبیب
ملک صفت احمد مرحوم کے پر واد تھے۔ یہ بھی دیوان لطف اللہ خاں کے اخلافت میں ہیں مولوی غریب اللہ
کا مکان منصفی کے نام سے موسوم ہے۔ ایٹل انڈیا کمپنی کے عہد حکومت تک اس خاندان میں منصفی
کا عہدہ قائم رہا۔

۵۔ مولوی فرید الدین۔ والد کا نام شیخ محمود بخش ہے۔ دیوان لطف اللہ کی اولاد میں
تھے، دارالعلوم کے دوسرے جتیم مولانا رفیع الدینؒ کے والد ماجد تھے، دارالعلوم کے شمالی
دروازے کے سامنے میدان میں ان کی قبر ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے تحصیل علم کی تھی۔
اپنے زمانہ کے مشہور مبلغ ہیں۔

۶۔ شیخ بلند بخت۔ مولوی فرید الدینؒ کے چھوٹے بھائی تھے، شیخ بلند بخت کے دو چھوٹے
بھائی مقصود علی اور سید احمد بھی سید صاحبؒ کے ساتھ شریک جہاد تھے۔ دیوبند کے لوگوں
میں سید صاحبؒ سے بیعت کئے والوں میں شیخ بلند بخت سب سے پہلے شخص تھے، یہ سروھند
(میرٹھ) میں بیعت کر چکے تھے۔ سید صاحب اہم معرکوں کے سر کرنے کے لئے ان کو مامور فرماتے
تھے چنانچہ کوہ کنیر ٹری کی جنگ میں لڑائی کا نقشہ کچھ بگڑ گیا تھا۔ مگر شیخ بلند بخت نے اپنی
عسکری مہارت اور جرات و ہمت سے جنگ جیت لی۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسماعیل شہید نے اپنی
جگہ ان کو جانشین بنایا تھا۔

شیخ بلند بخت شجاعت و مردانگی اور فن سپہ گری کے ساتھ فہم و دانش اور حسن
تدبیر کے اوصاف سے بھی متصف تھے، سید صاحبؒ کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ فرمایا کرتے
تھے کہ ”ڈر، موت کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں
پس ہمیں کیا ڈر ہے۔“ ان کی مہر پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

بفضل خدا گشتِ نختِ مستم بلند لہ

صوبہ سرحد میں چھربائی کی گڑھی پر حملے میں شیخ بلند بخت کے بھائی مقصود علیؒ نے دوسرے چند فادلیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا، جب ان کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو نہایت صبر و ضبط سے فرمایا۔ الحمد للہ میل بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی، ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔ چنانچہ بالاکوٹ کے معرکے میں سید صاحبؒ کے ساتھ ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ گولی کھا کر شہادت سے سرفراز ہوئے، سید صاحبؒ کے سوانح نگاروں نے لکھ لکھ کر مقصود علیؒ کو شہید بول لیتے تھے، ایک موقع پر ان کی پشت و دانی کی وجہ سے مجاہدین کو ٹھہری کا مہابی ہوئی۔

۷۔ مولوی جعفر علی بستوی نے شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے دو نام لکھے ہیں۔ شیخ بلند بخت اور سلو خاں۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ سلو خاں اصل میں سید احمد ہیں۔ سلو بچپن کا نام ہے جو بعد میں ان کی جرات و مردانگی اور تہوار کی بنا پر سلو خاں زبان زد ہو گیا۔ یہ شیخ بلند بخت کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ راقم السطور کا یہ نہایتی خاندان ہے شیخ بلند بخت اور سید احمد دونوں بھائیوں کی نسبت خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ بالاکوٹ میں دونوں نے شہادت پائی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ بالاکوٹ کے معرکے میں ایک پل کے ٹردانے کی ضرورت پیش آئی تاکہ دشمن ادھر سے حملہ نہ کر سکے، سید صاحب نے شیخ نصر اللہ خورجری اور سلو خاں کو بھیجا۔ انھوں نے پل توڑ دیا۔ معرکہ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے اُس خاص دستے میں شامل تھے جس نے نہایت جرات اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے سید صاحب کے ساتھ،

۸۔ سید صاحبؒ کے تذکرہ نگاروں نے یہ نام علی محمد لکھا ہے۔ خاندانی شجرہ کے مطابق صحیح نام مقصود علیؒ ہے۔ علی محمد شیخ بلند بخت کے کوئی بھائی نہیں تھے۔

۹۔ سید احمد شہید ص ۱۲۵ جلد دوم ص ۱۳۱ و ۱۶۶ و ۱۷۱ و ۱۷۵ و ۱۷۶ و ۱۷۷

ہام شہادت نوش کیا ہے ان کی شہادت کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس لئے کہ اس دستے کے سب ہی لوگوں نے شہادت حاصل کی، حالات بتائے والا کوئی زندہ نہیں بچا۔
خاندان میں شیخ بلند بخت اور ان کے دونوں شہید بھائیوں مقصود علی اور سید احمد کی نسبت بڑی عقیدت مندی سے چند عجیب و غریب واقعات بیان کیے جاتے ہیں انسان کی فطرت ہمیشہ غم بہ پسندی رہی ہے۔ بحیر العقول کا رنا مے، خارق عادات اور عجیب و غریب واقعات اس کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ ایسے معتقدات بحث و نظر کے لائق نہیں ہوتے، عوام کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور عجائب پرستی کی رنگ آمیزیاں بات کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہیں اسی لیے میں نے انکے بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔

۸۔ مجاہدین کے سب سے پہلے معرکہ میں جوا کوڑہ (صوبہ سرحد) میں پیش آیا۔ جس میں ۳ مجاہدین شہادت سے سرفراز ہوئے ان میں دیوبند کے ایک صاحب عبدالزاق صاحب بھی شامل تھے۔ اس واقعہ پر ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں اس لئے عبدالزاق کے حالات معلوم نہ ہو سکے تھے

۹۔ شہدائے بالاکوٹ میں دیوبند کے عبدالعزیز کا نام بھی ملتا ہے ان کے حالات کا بھی علم نہ ہو سکا۔

۱۰۔ غازی حفیظ اللہ، دیوبند کے ایک بزرگ شیخ ابوالبرکات (جن کے نام پر محلہ ابوالبرکات موسوم ہے) کی اولاد میں سے تھے۔ سید صاحب کی معیت میں شریک جہاد رہے۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کے معاشرے میں سنت کے طریقہ کے مطابق اسلام علیکم کا رواج بہت کم ہو گیا تھا۔ یہ صرف برابر والوں کے لئے مخصوص تھا۔ چھوٹے اپنے بڑوں کے لئے سلام یا آداب عرض کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ چھوٹوں کا اپنے بڑوں کو اسلام علیکم کہنا گستاخی پر محمول کیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ذریعہ سے جہاں معاشرے میں اور مفید اصلاحیں ہوئیں ان ہی میں سے ایک اسلام علیکم کا رواج عام بھی ہے چنانچہ پہلی دفعہ جب شیخ حفیظ اللہ صاحب نے اپنے والد کو اسلام علیکم کہا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ "مجھے معلوم ہے تمہیں کس نے سکھا یا ہے، میں اسے سمجھوں گا، مگر رفتہ رفتہ وہ خود متاثر ہوئے اور یہاں تک بدلے کہ بڑے کے ہاتھ پر جن کو سید صاحب سے خلافت ملی تھی بیعت کر لی۔

مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحب کے بارے میں غازی حفیظ اللہ کی متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جنگ بالا کوٹ میں آخر تک سید صاحب کے ساتھ شریک رہے۔ مہر صاحب نے لکھا ہے کہ "حفیظ اللہ دیوبندی سید صاحب کے پاس نالے میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں ان کی بائیں ۲ کچھ کے نیچے تیر لگا اور اس کا پیرکان باہر ہو گیا، میاں جی جشتی نے انہیں پن چکیوں کے پاس سایہ دار درختوں میں بھیج دیا۔ راستہ میں انہیں امان اللہ خاں لکھنوی اور چند غازی ملے۔ جو سید صاحب کے پاس جا رہے تھے حفیظ اللہ بھی ان کے ساتھ جانے لگے۔ دوسرے غازیوں نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ زخم کی وجہ سے مندور ہیں، وہ پھر پن چکیوں کے پاس پہنچے۔ اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ رہے۔ بعد میں سید صاحب کا فیل ہاں ان کا ہاتھ پکڑ کر میدان سے باہر لے گیا۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد ان پر دار فتنگی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ صاحب ٹونک میں سید صاحب کے رفقاء جمع ہوئے تو یہ بھی ٹونک چلے گئے، مگر دار فتنگی طاری تھی۔ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک مرتبہ دیوبند سے گزر رہے تھے۔ لوگوں نے دیکھا تو ان کو گھیر لیا اور اصرار کیا کہ گھر چلے، بیوی بچے آپ کی جدائی سے منہ موم اور پریشان ہیں۔ لوگ باصرار گھر لے آئے۔ دیوبند میں نازی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

دہابیت کے الزام کی حقیقت | انگریزوں کی جانب سے سید صاحب اور جماعت مجاہدین پر دہابیت کا جملہ الزام لگایا تھا ضرورت ہے کہ تاریخی طور پر اس کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت واقعہ کیا ہے؟

سید صاحب اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی نسبت بڑے شد و مد سے کہا گیا ہے کہ ان کی اصلاحی تحریک نجد کی اصلاحی تحریک سے اخذ کی گئی ہے۔ اس بنا پر جس طرح شیخ محمد بن عبد الوہاب (۱۱۱۳ھ تا ۱۲۰۶ھ) کے متبعین کو وہابی کہا جاتا ہے اسی طرح ان علماء کو بھی وہابی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو کتاب و سنت کے مطابق اصلاح عقائد و اعمال کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ مگر تاریخی عوامل سے اس الزام کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بارہویں صدی ہجری میں عرب کے صوبہ نجد میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اصلاح عقائد و اعمال سے اس کی ابتدا ہوئی۔ مگر بہت جلد اس نے سیاسی نوعیت اختیار کر لی، قرب و دھار کے مقامات پر قابض ہونے کے بعد متبعین شیخ نے خلافت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملے شروع کر دیے۔ ترکوں اور متبعین شیخ کے مابین متعدد جنگیں ہوئیں، یہاں تک کہ ۱۲۳۳ھ تا ۱۸۱۷ء میں خلافت عثمانیہ کی فوجوں نے نجد کے پایہ تخت درعیہ پر قبضہ کر لیا، شیخ محمد بن عبد الوہاب کے خاندان کے بہت سے افراد قتل ہو گئے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سید صاحبؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہید نے ایک بڑے قافلہ کے ساتھ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۶ء میں پہلی مرتبہ حج کیا۔ ظاہر ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے افکار و خیالات سے سر زمین حجاز میں روشناس ہونے کا یہی موقع ہو سکتا تھا۔ ورنہ اس دور میں انگریزوں، فرانسیسیوں اور سپہ بیگالیوں کی سمندری طاقت نے بحری سفر کو خطرناک بنا دیا تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں بحر ہند اور بحر عرب پر پرتگیزیوں اور انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے کئی مرتبہ حجاج کے جہازوں کو لوٹ لیا تھا۔ اس وجہ سے بعض حیلہ جو علماء کو عذر تراشی کا موقع مل گیا، اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ حج کے راستے میں امن باقی نہیں رہا ہے جو شرائط حج میں سے ایک شرط ہے۔ اور جب شرط باقی نہیں رہی تو شرط کی فرضیت ختم ہو گئی ہے۔

اگرچہ اسی وقت حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ حضرت مولانا محمد اسماعیل اور حضرت مولانا عبدالحی نے اپنے فتاویٰ کے ذریعہ سختی کے ساتھ اس کی تردید کی تھی۔ مگر اس کے لئے عملی اقدام کی بھی ضرورت تھی۔ سید صاحبؒ کے عزم حج میں یہ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ لوگوں کے دلوں سے ڈر اور خوف کو دور کیا جائے۔ چنانچہ اس میں کامیابی حاصل ہوئی اور حج کرنے کا جو سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ سید صاحبؒ کے حج کرنے کے بعد از سر نو جاری ہو گیا بلکہ

سید صاحبؒ کے اصلاحی و تبلیغی دورے سفر حج سے بہت پہلے شروع ہو چکے تھے، ان کا آغاز ۱۲۳۳ھ، ۱۸۱۶ء میں سید صاحبؒ کی ٹوئیک سے واپسی کے بعد ہوا۔

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھیے سید احمد شہید مصنف غلام رسول مہر جلد اول باب ۱۶۔

۲۔ سید احمد شہید جلد اول ۱۱۱

اسی زمانہ میں سفر حج سے قبل مولانا محمد اسماعیل شہید نے اپنی مشہور کتاب تقویتہ الایمان لکھی۔

ارواحِ ثلاثہ میں امیر شاہ خاں صاحب کی یہ روایت مذکور ہے،
 ”مولوی اسماعیل صاحب نے تقویتہ الایمان اول عربی میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ مولانا گگوہیؒ اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خاں خورجوئی کے کتب خانہ میں تھا۔ اس کے بعد مولانا نے اس کو اردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا۔ جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحی صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید الدین مراد آبادی، مومن خاں (مومن)، عبد اللہ خاں علوی (استاد امام بخش صہبائی، مولانا مملوک علی صاحب) بھی تھے۔

ان کے سلسلے تقویتہ الایمان پیش کی اور فرمایا میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے ہیں اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا۔

۱۔ حاجی امیر شاہ خاں صاحب خورجو کے رہنے والے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حلقہٴ مریدین میں شامل تھے، اپنے زمانہ کے بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اگرچہ عالم نہ تھے۔ مگر فہم سلیم کے ساتھ قوتِ بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے، حافظہ نہایت قوی تھا، بزرگوں کے بہت سے واقعات ان کو ازبر تھے۔ خصوصاً خاندانِ ولی اللہ کے علماء و مشائخ کے حالات کے تو گویا حافظہ تھے۔ ان کی نسبت مشہور تھا کہ جبرجوں کی زندقہ و دشمنی ہیں۔ ارواحِ ثلاثہ میں ان کی بیان کی ہوئی بہت سی روایتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ بزرگوں کا چپار سوسے اوپر روایات کا مجموعہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے طبع تعلق تھا۔ یہاں آتے اور مہینوں قیام فرماتے۔ ۱۳۵۴ھ میں بمقام منیر ہوسٹل علی گڑھ وفات پائی۔

مثلاً ان اہل حق کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت سے شور و شغب ضرور ہوگی۔ اگر میں یہاں رہتا تو ان مفہامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا۔ لیکن اس وقت میرا ارادہ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی کے بعد عزم جہاد ہے۔ اس لیے میں اس کام سے معذور ہو گیا اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اٹھائے گا نہیں۔ اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے، گو اس سے شور و شغب ہوگی۔ مگر توقع ہے کہ لڑا بھڑکا خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ میرا خیال ہے، اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو اشاعت کی جائے۔ ورنہ اسے چاک کر دیا جائے۔ اس پہ ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیے مگر غلاں غلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیے۔ اس پر مولوی عبدالحی صاحب شاہ اسحاق صاحب عبد اللہ خاں علوی دہلوی نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں اس پر آپس میں گفتگو ہوئی اور گفتگو کے بعد بالاتفاق یہ طے پایا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح شائع ہونی چاہیے۔ چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہو گئی، اشاعت کے بعد مولانا شہید حج کو تشریف لے گئے اور حج سے واپسی کے بعد چھ مہینے دہلی میں قیام رہا۔ اس زمانہ میں مولانا اسماعیل گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے۔ اور مولوی عبدالحی صاحب مساجد میں، چھ مہینے کے بعد جہاد کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ قصہ میں نے مولوی عبد القیوم صاحب اور اپنے استاد میانجی محمدی صاحب وغیرہ سے سنا ہے۔

۱۷۸۰ء۔ ارواح ثلاثہ حکایت ۵۹ توفیق الایمان مصنفہ مولانا محمد اسماعیل شہید کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ حوا ردوسیا ہے اور ۱۲۳۲ھ، ۱۸۱۶ء کا چھپا ہوا ہے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ کلکتہ کے مطبع احمدی بن نستعلیق ٹائپ میں ہے۔ سید عبدالقدان سید بہادر علی کے اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔ گویا مصنف کی زندگی ہی میں انہی شہادت ۱۲۷۶ھ، ۱۸۵۹ء سے چار سال پہلے شائع ہو چکا تھا۔ (باقی اسکے صفحہ پر دیکھئے)

مذکورہ بالا روایت سے صاف طور پر واضح ہے کہ مولانا اسماعیل غمیریہ تقویتہ الایمان
جہاز جانے سے قبل لکھ چکے تھے، اولاً یہ کتاب عربی میں لکھی گئی اور بعد ازاں اردو میں تصنیف
ہوئی۔ بعض مضامین میں شدت پیدا ہو جانے کا مصنف نے خود بھی اعتراف کیا ہے، غالباً یہ شدت
اس دور میں شرک و بدعات کے کثرت سے پھیل جانے کا نتیجہ ہے۔

مولانا شہیدان مضامین کو بتدریج آٹھ دس سال میں بیان کرنا چاہتے تھے مگر حالات
کے تقاضے ان کو عجلت پر مجبور کر دیا۔

اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ تقویتہ الایمان کے مضامین
کے سلسلہ میں مولانا شہید منفرد نہ تھے۔ بلکہ خاندان دلی اللہ کے ممتاز علما و حضرت شاہ محمد
اسحاقؒ، حضرت شاہ محمد یعقوبؒ اور حضرت مولانا عبدالحیؒ کے علاوہ مولوی عبد اللہ
خان علوی، مولوی فرید الدین مراد آبادی، حکیم مومن خاں مومن کو بھی تقویتہ الایمان
کے مضامین سے اتفاق تھا۔ اور وہ اس حق میں نہ تھے کہ تقویتہ الایمان کے مسودے کو
جاک کر دیا جائے۔

جس زمانہ میں متبعین شیخ محمد بن عبد الوہاب خلافت عثمانیہ کی فوجوں سے برسرِ پیکار
تھے ٹھیک اسی زمانہ میں سید صاحبؒ کی تحریک جہاد شروع ہوئی۔ جس کو بعد میں فطہ فی
کی بنا پر تحریک دہابیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ اس تحریک کا شیخ محمد بن
عبد الوہاب کی تحریک سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ تحریک سفر حج سے کئی برس پہلے
شروع ہو چکی تھی۔ درحقیقت اس سلسلہ میں انگریزوں کی جانب سے بڑے ہدف پر

(حاشیہ سے آگے) تقویتہ الایمان کے چھاپنے والے یہ وہی سید عبد اللہ ہیں جنہوں نے
۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں سب سے پہلے حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ کا ترجمہ قرآن مجید سالی
کیلئے، سید عبد اللہ کے والد سید بہادر علی فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تصنیف و ترجمہ سے وابستہ

طریقہ اور شد و مد سے عام مسلمانوں کو جماعت مجاہدین سے بدظن اور برگشتہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ اس کا نہایت افسوسناک پہلو یہ ہے کہ انگریزوں نے اپنے پروپیگنڈہ کا کام جس جماعت کے ذریعہ سے لیا وہ خود علماء و اہل کی جماعت تھی، اور اس طرح خود مسلمانوں کے اندر تشکیک و انفریق کی ایک عظیم خلیج پیدا کرنے کے مخالف ممالک و ممالک کو کمزور کر دیا گیا۔

اس الزام کے غلط ہونے کا ایک واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ تحریک و ہدایت کو خلافت عثمانیہ کے نہ صرف مسلک سے اختلاف تھا بلکہ وہ سیاسی طور پر بھی اس کے خلاف سرگرم پیکار تھی، اور اس کے پرجوش علم بردار عرصہ تک خلافت عثمانیہ کے مقبوضات پر حملے کرتے رہے۔ اس کے برعکس مولانا شہیدؒ کے ہم مسلک علماء نے ہمیشہ خلافت عثمانیہ کو واجب تعظیم سمجھا ہے، اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں ہمیشہ سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے رہے۔

۱۸۷۷ء تا ۱۹۱۹ء میں جنگ بلوچان، جنگ بلقان اور خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے موقع پر خلافت عثمانیہ کی مالی اور اخلاقی امداد و اعانت میں اس جماعت کے علماء نے جس جوش و غروش کے ساتھ حصہ لیا اور ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کر کے ترکوں کو اخلاقی مدد بہم پہنچائی۔ تاریخ کا ہر طالب علم اس سے باخبر ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت بھی اسی پرجوش تائید کا نتیجہ تھی!

حضرت شیخ الہندؒ نے قیام حجاز کے زمانہ میں شریفِ مکہ کی ناراضگی کی پروانہ کرتے ہوئے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس میں ترکوں کی تکفیر کی گئی تھی۔ اور خلافت عثمانیہ کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔

طرز کو دہابیت کا الزام اولاً انگریزوں کی جانب سے سید صاحب اور جماعت مجاہدین پر لگایا گیا اور پھر ان سب لوگوں کو اس کا نشانہ بنایا گیا جو مشرکانہ ادہام و رسوم کے مخالف اور کتاب و سنت کی دعوت دینے کے مدعی تھے۔

برطانوی قوم کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی مخالف طاقتوں کو پروپیگنڈے کے زور سے بدنام کر کے شکست دیتی ہے۔ جماعت مجاہدین کے ساتھ بھی یہی عمل کیا گیا۔ ان کو دہابی کہہ کر مسلمانوں میں بدنام کیا گیا اور اس طرح عام مسلمانوں کی ہمدردی اور تعاون سے محروم کر کے مجاہدین کو کمزور کر دیا گیا، اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ سید صاحب کو ایک نئے مذہب کا بانی بتلا کر سرحد کے لوگوں کو بھڑکایا گیا تھا۔ برطانوی پروپیگنڈے کا یہ افسوس سید صاحب کے خلاف کامیاب ثابت نہوا، اور بالآخر مجاہدین کی شکست کا ایک بڑا ذریعہ بنا۔

بنگال کے ایک سول انجینئر انفر ڈبلیو۔ ڈبلیو، سنٹر نے اپنی سرکاری رپورٹ ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ کے ذریعہ سے دہابیت کے الزام کی خوب تشہیر کی۔ اس شخص کو مجاہدین کی سرگرمیوں کی تحقیقات کے لئے حکومت نے مامور کیا تھا۔ چونکہ اس وقت مجاہدین انگریزوں سے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ سنٹر کا رویہ مجاہدین کے ساتھ انصاف پسندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سمجھنا کہ سید صاحب کی تحریک اصلاح اور دعوت کتاب و سنت دہابیت سے ماخوذ تھی۔ ایک ایسی بات پر یقین کرنا ہے جو پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

نصاب زکوٰۃ اور صاع کی تحقیق

از جناب حاجی احسان الحق صاحب بمبئوری مرحوم

نہایت افسوس اور شدید رنج و غم کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اگرچہ یہ مقالہ کئی مہینے ہوئے موصول ہو چکا تھا۔ لیکن اس سہینہ میں اس کی اشاعت اس وقت ہو رہی ہے جب کہ اس کا مصنف گزشتہ ماہ فروری میں اس عالم آب و گل سے رخصت ہو کر رگڑائے عالم جاودانی ہو چکا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم بمبئور کے ایک معزز اور دین دار گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم میں گروہ میں پائی تھی۔ سائنس ان کا خاص مضمون تھا۔ چنانچہ طبیعیات میں ایم ایس سی کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے خالص اور نمایاں شاگرد تھے۔ فراغت کے بعد علی گڑھ میں ہی اپنے شعبہ میں استاد مقرر ہو گئے۔ آج کل تو دیر سرج اور ڈاکٹر بریٹ بہت عام ہیں۔ اور اس کے سہارے اگر حالات سازگار ہوں۔ ایک نوجوان دس برس میں ہی لکچرر اور ریڈر کی منزلیں طے کر کے پروفیسر بن جاتا ہے۔ لیکن مرحوم کے زمانہ میں ڈاکٹر بریٹ کی یہ گرم بازاری نہ تھی اور ایک شخص کے لئے لکچرر ہونا ہی بڑی بات تھی۔ اس بنا پر حاجی صاحب مرحوم بھی عمر بھر لکچرر ہی رہے اور ~~۱۹۵۵ء~~ میں اس منصب سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن اپنے فن کے بڑے

ماہر اور مبصر تھے۔ سید بکڑوں مسلم اور غیر مسلم طلبہ ان کے سرخونچہ مدرسہ و تعلیم سے فہم یاب ہو کر ٹہے ٹہے عہدوں پہنچ گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ طہیات میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ آخر عمر تک کسی نہ کسی حیثیت میں وہ علی گڑھ اور دوسری یونیورسٹیوں سے متعلق اور اپنے محبوب فن کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مذہب ان کی فطرت اور طبیعت کا اصل جوہر تھا۔ اسلامیات کا مطالعہ خود اپنے شوق اور رغبت سے وسیع پیمانہ پر کیا تھا۔ اکابر علماء کے صحبت یافتہ اور ان کی مجلسوں کے مستقل حاضر باش تھے۔ نماز روزہ کے پابند ہی نہیں بلکہ نہایت عابد و زاہد اور پرمہنگار روتقی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت نہیں عشق تھا۔ زبان پر نام نامی آیا اور فوراً آبدیدہ ہو گئے۔ رویت ہلال اور اودان شرمیہ کی بحث سے انہیں بڑی دلچسپی اور ان کی تحقیق کی دین تھی۔ برسوں کیا! زندگی کے آخری لمحہ تک اسی لومعیر بن میں گرفتار رہے۔ راقم الحروف سے بڑے بھائی کی طرح شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ علالت اور ضعیفی و پیری کے باوجود انوار کے دن صبح کو تشریف لاتے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیچہ کر خالص علمی اور اسلامی مسائل پر گفتگو کرتے۔ عمر اسی کے قریب پائی۔ تمام معمولات باوجود کمزوری کے جاری تھے کہ اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ اور چند روز زیر علاج رہنے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اب ان کا خلوص غیر معمولی محبت اور تعلق خاطر ان کا اسلامی جوش اور ان کی باتیں وہ کہ یاد آتی ہیں تو دل میں ہنگامہ غم برپا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے عہدہ میں ان کو ہمارے مسلمانوں کا مقام عظیم عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین (الطی شہو)

اوزان شرعی کی بحث بہت ہدائی ہے۔ اس سلسلہ ہمارے
 علماء کرام میں بڑا اختلاف ہے۔ خاکسار نے اس مسئلہ پر بہت کافی
 غور و غوض اور مطالعہ کیا ہے۔ اور مختلف علماء سے تہادلہ خیال
 کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو کچھ میں سمجھا ہوں اس توقع
 سے پیش کرتا ہوں کہ اگر اس میں کوئی خامی یا غلطی ہو تو مجھے مطلع
 کیا جائے۔

قبل اس کے کہ میں اصل مضمون شروع کروں یہ بہتر
 سمجھتا ہوں کہ جتنے مکاتیب فکر ہیں ان کو لکھ دوں۔
 مکاتیب فکر کی تفصیل

مکاتیب فکر	سولے کا نصاب	چاندی کا نصاب	صاع	لصف صاع
علماء ردہلی اور دیوبند	۷۲ پ تولہ قدیم	۵۲ پ تولہ قدیم	۲۷۳ تولہ قدیم	۱۳۶ پ تولہ قدیم
علماء بریل	۷۲ پ تولہ قدیم	۵۲ پ تولہ قدیم	۲۵۱ تولہ رائج	۱۷۵ پ تولہ رائج
شیخہ حضرات	۷۲ پ تولہ قدیم	۵۲ پ تولہ قدیم	۲۷۳ تولہ قدیم	۱۳۶ پ تولہ قدیم
علماء لکھنؤ	۵ تولہ ۴ پ ماشہ	۳۶ تولہ ۵۴ پ ماشہ	۱۸۹ پ تولہ	۳۹ تولہ ۹ ماشہ

اہل حدیث	۴۰ تولہ قدیم	۵۲ تولہ قدیم	۲۲۰ تولہ	۱۱۰ تولہ
مولانا معین الدین صاحب مرحوم	۳ تولہ ۴ ماشہ	۲۵ تولہ	۱۳۰ تولہ	۶۵ تولہ

نصاب زکوٰۃ اور صاع کی تحقیق

میرے ایک اہل علم دوست نے صدقہ فطر کے بارے میں فرمایا تھا کہ پورے دو سیر گیہوں (نصف صاع) علمائے دہلی کی رائے کے مطابق دینے چاہئیں اس صورت میں وہ مقدار بھی ادا ہو جائے گی جو علمائے لکھنؤ کی تحقیق شدہ ہے اور زائد مقدار کا ثواب ملے گا یہ میں نے کہا یہ رائے معقولہ لیکن تحقیق پیش نظر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید اس کا مقتضی یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے نصاب زکوٰۃ کے سلسلہ میں مولانا معین الدین صاحب مرحوم (سابق انچارج حبیب گنج سکشن آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی) کے حساب پر کیا جائے کیوں کہ یہ نصاب سب سے کم ہے اور صدقہ فطر کے معاملے میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ کی تحقیق پر عمل کیا جائے ان کے نزدیک صاع کی مقدار چار سیر ہے چھٹا ٹک ایک تولہ (موجودہ) ہے۔ مسلک اہل حدیث و حضرات شیعہ کے مطابق جو اور گیہوں دونوں کی مقدار نفع فقرا کے ماتحت ایک صاع ہے۔

تقریباً تیس سال گزرے میرے ایک دوست جو دینیات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ نصاب زکوٰۃ و صدقہ فطر کے بارے میں علمائے فرنگی محل کے حساب کو اپنی تحقیق کے قریب سمجھتے تھے، دوران بحث میں ان سے اصولی طور پر یہ باتیں ملے جو گئی تھیں۔

(۱) حضرت عمرؓ کا فیصلہ سات مثقال برابر دس درہم اور

(۲) ایک درہم برابر چودہ قیراط اور ایک مثقال برابر ۲۰ قیراط
 (۳) شامی در مختار اور مستند کتابوں کا فیصلہ کہ قیراط برابر پانچ حو اور صاع دہ ہجاء
 ہے جس میں ماش (یعنی مونگ) یا عدس ایک ہزار چالیس درہم بھر سمائیں، اسی زمانے میں سید نے
 مختلف صوبوں کے طلبہ سے کہا کہ اپنے اپنے وطن سے مراجعت کے وقت ایک ایک پاؤ جو لیتے آنا۔
 انھوں نے اس پر عمل کیا اور اس طرح میرے پاس ہندوستان کے ہر صوبے (مدراں، بمبئی،
 بنگال، اتر پردیش، پنجاب وغیرہ وغیرہ) سے جو گئے۔ دو ہزار جو تولے گئے جن کا وزن تقریباً
 ساڑھے سات تولہ (موجودہ) ہوا (سوئے کا نصاب میں مثقال برابر ۲۰ × ۲۰ برابر ۴۰۰) قیراط
 برابر ۵۴۴۰۰ (برابر ۲۰۰۰) جو۔

میں نے بعض حاجیوں سے فرمائش کی کہ مدنیہ طیبہ سے جو اور قیراط لیتے آئیں، قیراط تولہ
 کے البتہ ایک صاحب جو لے آئے۔

۱۳۳ جو ۶۶۰۴ گرام یعنی ایک جو ۵۶۲۰۴ گرام اس لئے دو ہزار جو برابر ۸۵۱۲
 گرام یعنی موجودہ تولے سے، تولہ ۳ پڑا ماشہ ہوئے،

۱۵۷ء میں ایک اور صاحب سے جو دنیا میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے گفتگو ہوئی۔ وہ بھی
 علمائے فزعی محل کے حساب کو صحیح سمجھتے تھے انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے جو متوسط
 اور سرسید لے تھے؟ میں نے عرض کیا کہ بغیر کسی خیال کے ہر تھیلی میں نئے لے چھے اور احتیاطاً
 دونوں تھیلیوں سے خوب مسل لے چھے تاکہ بھوسی وغیرہ علیحدہ ہو جائے، وہ مطمئن نہ ہوئے
 میں نے یہ بھی کہا کہ بعض جگہ کے جو تھوڑے تھے ساڑھے سات تولے سے کم بکھے۔ بعض جگہ کے
 جو بڑے تھے ساڑھے سات تولے سے زائد بکھے۔

ساتھ ہر ایک مضمون ماہنامہ زندگی مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں مضمون
 بھارنے رتی چار جو کی مانی ہے حالانکہ رتی تین جو کی ہے اور انگریزی روپیہ ساڑھے دس
 ماشہ (۱۱) کا ماٹ ہے۔ حالانکہ روپیہ ساڑھے گیارہ ماشہ (۱۱) کا ہے۔

موجودہ درہم ۹۷۵ گرامہ اخبار دینہ بخنور میں جناب مولانا معین الدین صاحب مرحوم کا درہم، مثقالہ صاع پر مضمون شائع ہوا۔ مطالعے کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، بہت خلیق، متقی، راسخ العقیدہ اور اپنی رائے میں متغلب تھے۔ انھوں نے شکایت کی کہ تمام طور پر شرعی اوزان بدر عرفی اوزان کو ترجیح دی جاتی ہے اور کوئی شخص اس کی معقول توجیہ نہیں کرتا۔

سارے تین برس بعد ماہنامہ جہان ہایت ماہ جون ۱۹۷۹ء میں اوزان شرعی پر پھر مولانا مرحوم کا مضمون اشاعت پذیر ہوا، مولانا مرحوم کی تحقیق سے میں متفق نہ تھا خیال ہوا کہ اس مسئلے میں اپنی رائے وضاحت سے پیش کروں۔

مذہب جمہور | اوزان شرعی کے بارے میں جمہور کا حساب مندرجہ ذیل ہے۔

- (۱) درہم شرعی = ۷۰ جو اور قیراط = ۵ جو اور رتی تقریباً = ۳ جو
- (۲) درہم شرعی درہم عرفی سے چھوٹا ہوتا ہے کیوں کہ ایک درہم شرعی برابر ۱۴ قیراط اور درہم عرفی برابر سو گتہ قیراط۔ اور قیراط کا وزن ایک ہی ہے۔
- (۳) صاع شرعی صاع عرفی دونوں وزن میں برابر ہیں۔ کیوں کہ صاع شرعی ۱۰ درہم شرعی = (۱۴ × ۱۰ = ۱۴۰) قیراط اور صاع عرفی = ۱۰ درہم عرفی = (۱۴ × ۱۰ = ۱۴۰) قیراط دونوں قیراط ایک ہی ہیں اور ہوزن ہیں،

(۴) نصاب سونا، پل تولہ (قدیم)

(۵) نصاب چاندی ۵۲ پل تولہ (قدیم)

(۶) ایک صاع = ۲۷۳ تولہ (قدیم)

تولہ قدیم کی بحث | یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے تولہ قدیم بلا ضرورت تحریر کیا ہے

ایک ہلانا واقعہ سماعت فرمائیے۔ ایک صاحب سے چاندی اور سونے کے نصاب کے متعلق دوران گفتگو میں قدیم تولہ کا ذکر آیا انھوں نے دعویٰ کیا کہ تولے میں کوئی

فرق نہیں ہے۔ البتہ سیر میں فرق ہے کہ کہیں پھیلاؤ تو لے گا ہے اور کہیں نہ تو لے گا کہیں
 نہ تو لے گا، مجھے یاد تھا کہ موجودہ تولہ قدیم تولے سے چھوٹا ہے، وہ صاحب اپنے دعوے کی تصدیق
 کے لئے مجھے سناروں کی دوکان پر لے گئے۔ سب سناروں نے ان کی تصدیق کی اور کہا کہ تولے
 میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کی تائید سے معاملے میں خیر میں یہ خیال
 آیا کہ کسی بوطے سے سنار کا پتہ ملے۔ شکر خدا کہ تلاش کے بعد ایک بوطے سے سنار مل گئے انھوں
 نے ان صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ صحیح کہتے ہیں۔ یہ موجودہ تولہ پہلے تولے
 سے چھوٹا ہے۔ میں تحقیق مزید کے لئے دہلی گیا۔ وہاں بھی سناروں نے پہلے تولے کی کھا کر کوئی
 فرق نہیں ہے لیکن ایک مہر سنار نے کہا کہ یہ موجودہ تولہ چھوٹا ہے اور کہ اس نے کہا کہ اس
 موجودہ تولہ (جو انگریزی روپیہ بھر ہے) کے ساتھ ۲ یا ۳ گھونچیں یعنی رتی ملا کر پہلا
 تولہ ہوتا تھا اب تو انگریزی روپیہ کو ایک تولہ مان لیا گیا ہے۔ موجودہ تولہ ۱۰ پٹاشہ قدیم
 کے برابر ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے میں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے دو ہزار (۲۰۰۰) جھولے کر
 تولے تھے۔ سونے کا نصاب (۲۰۰ مثقال) ۱۰ پٹ تولہ موجودہ سے کچھ زائد ہوا۔
طلائے کھا کی تصریحات | قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے اپنی مشہور کتاب مالابرد میں چاندی
 کا نصاب دو ٹکروں میں (۱۴۰ مثقال = ۷۰۰) اور سونے کا نصاب ۱۰ پٹ تولے لکھا ہے اور اس وقت
 کے وزن کے حساب سے چاندی کا نصاب ۵۶ روپیہ بھر لکھا ہے۔

۱۰ پٹ ۷۰۰ = ۵۲ پٹ تولہ = ۵۶ روپیہ اس لئے روپیہ شامی سو گیا رہ (۱۱ پٹ) ماشہ کا ہوا۔
 اور صاحب حاشیہ مالابرد نے بھی اس وقت کے روپیہ کو سو گیا رہ (۱۱ پٹ) ماشہ بتلایا ہے،
 جیسا کہ میں نے خود وزن کیا۔

مظاہر حق شرح مشکوٰۃ شریف ۱۲۵۴ھ (مولفہ حضرت نواب قطب الدین
 صاحب) میں بھی یہ ہے۔ چاندی کا نصاب دوسو (۲۰۰) درہم = ۵۲ پٹ تولہ

قدیم کتاب ہے۔

مساحہ ۱۰۴۰ درہم سمانتے ہوئے ۲۷۳ تولہ قدیم کتاب ہے جس کا نصف ۱۳۶۷ تولہ قدیم ہوا یعنی ایک سیرچہ چھٹا تک موجودہ سے کم ہے۔

غایت الاوطار شرح درختار میں انگریزی روپیہ کو گیارہ ماشہ پانچ رتی لکھا ہے سابق ریاست حیدرآباد کے سکے کے متعلق ایک کتاب میں حیدرآباد کے روپے کو وہ روپے اگرین اور باہر گیا ۱۱ ماشہ تحریر کیا ہے۔

انگریزی روپیہ (بھارت کا موجودہ روپیہ = ۱۸۰) (ایک سو اسی) گری جو ۱۱ ۱/۲ (ساڑھے گیارہ ماشہ) قدیم کے برابر ہے اس کو بارہ ماشہ کا تسلیم کیا جاتا ہے۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی (مقیم حال کراچی) نے اپنے رسالہ مقادیر شرعیہ میں فتاویٰ حمادیہ اور شرح ہدایہ کے حوالے سے ۱۹۶۲ء کا واقعہ شیخ ابراہیم بن عبد اللہ تاجر ملتانی کے متعلق نقل کیا ہے کہ تاجر موصوف مکہ مکرمہ سے درہم شری دینا۔ درہم مساحہ لائے اور دہلی کی نمسال میں وزن کرایا۔ تو درہم شری برابر ۳ ماشہ ۴ ۱/۲ جو (تین ماشہ سو اچار جو) = ۳ ۱/۲ ماشہ تقریباً ہوا۔ اور حمادیہ میں ماشہ برابر سو لکھ جو لکھا ہے۔ اس طرح (۲۰۰) دو سو درہم کے چھ سو پچاس (۶۵۰) ماشے ہوئے جو چون (۴۴) تولے کے قریب ہیں اور جمہور علمائے دوسو (۲۰۰) درہم برابر ساڑھے باون (۵۲ ۱/۲) تولہ قدیم مانا ہے۔ یہ دہلی کے قریب قریب ہے۔

مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مرحوم کا حساب صحیح نہیں تو مولوی معین الدین صاحب مرحوم کا حساب بطریق اولیٰ صحیح نہیں کیوں کہ یہ اس سے بھی کم ہے۔

فتاویٰ حمادیہ میں بحوالہ ماشیہ مولانا معین الدین صاحب از غرض کہ غرض حاکم نقل کیا ہے کہ فی الواقعہ ۱۱ ۱/۲ (جس میں سے سوئے کا نصف = ۵ ۱/۲ تولے کتاب کے مطابق ہے) مولانا

معین الدین زمانہ قدیم کے بزرگی تھے) میں نے اٹھارہویں صدی کے اخیرانیسویں صدی کی ابتدا کے مابین شاہی روپے کو تولا انگریزی روپے سے وزن میں کم تھا، مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اکبر ہی روپیہ ۵ و ۱۶ گرن کا تھا اور اس کے بعد کے شاہی روپے ۱۶، ۱۷ گرن کے تھے۔
(انڈین کوائن ایکٹ نمبر ۲۳ سنہ ۱۸۷۰ء INDIAN COINAGE ACT. NO 23)

1870 AD

تیسرے | ان تمام حالات بالاسے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سونے کا نصاب ۷ پلوں قدیم اور چاندی کا نصاب ۵۲ پلوں قدیم ہے۔

تفصیل کتاب فکر | علمائے دہلی و دیوبند۔ سونے کا نصاب۔ چاندی کا نصاب ہمارے

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۲۷۳ پلوں قدیم

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۵۱ پلوں قدیم۔ بریلی۔

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۲۷۳ پلوں قدیم۔ شیعہ حضرات۔

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۱۸۹ پلوں قدیم۔ لکھنؤ۔

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۲۲۰ پلوں قدیم۔ اہل حدیث۔

۷ پلوں قدیم۔ ۵۲ پلوں قدیم۔ ۱۳۰ پلوں قدیم۔ مولانا معین الدین

صدقہ فطر میں حضرات اہلسنت (دہلی، دیوبند، بریلی، لکھنؤ) کے نزدیک نصف صاع

گیہوں یا ایک صاع جو ہیں۔

اور حضرات اہل حدیث و شیعہ کے نزدیک ایک صاع ہے جو یوں یا گیہوں۔

تحقیقی صاع و منہ صاع میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ حجاج بن یوسف کے زمانے میں صاع

فاروقی مشتبہ ہو گیا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے رسالے مقادیر شریعہ میں تحریر کرتے

ہیں کہ ایک حد حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ کے پاس تھا جس کی مسلسل سند حضرت

زید بن ثابتؓ کے ہاتھ پہنچتی ہے۔ اس کو مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے دوسرے

تولاء الطرائف" (لیکن یہ تصریح نہ مل سکی کہ مولانا نے جو یا گیمہوں یا کس چیز کا وزن کیا) "بہر حال ایک مندر (۷۰) ستر تولے ٹھیکہ ماشہ اور دو مد یعنی نصف صاع ایک سو چالیس (۱۴۰) تولے میں ماشہ اور پورا صاع دو سو اسی (۲۸۰) تولے ۶ ماشہ۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنے یہاں کے رائج سیر کے حساب سے جواب دیا (۸۰) تولہ کا تھا۔ ٹھیکہ سیر ٹھیکہ چھٹا تک کی تصریح فرمائی۔ "الطرائف"

(میرزا خیال یہ ہے کہ یہ تولہ انگریزی تھا جو ایک سو اسی (۱۸۰) گرین کا تھا لیکن اب گرام کا رواج ہے) (الطرائف والظرائف ص ۱۱۱ حصہ دوم بمصنف مولانا اشرف علیؒ)
مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) کو تجربہ فرمایا۔ نیم صاع شیر میں ایک سو چالیس (۱۴۰) روپیہ بھر جاتے تھے۔ اور ایک پختہ (۱۷۵)، روپے آٹھ آنے بھر گیمہوں آئے، (فتویٰ رضویہ صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۵)

فطرہ کی یہ مقدار بیان کرنے ہیں مولانا بریلویؒ منفرد ہیں۔ کہوں کہ بریلی کے (سورہ پیہ بھڑالے) سیر کے حساب سے مقدار پونے دو سیر کھنی بھر مولیٰ، بریلی میں چھ روپیہ بھر کم ٹھیکہ سیر گیمہوں صدقہ فطر میں ادا کرنے کا رواج ہے۔ علمی خطبہ کے بریلوی بزرگ نصف صاع دو سیر شاہ جہانی بتاتے ہیں۔ شاہ جہانی سیر چالیس (۴۰) پیسے اور پیسہ اکیس (۲۱) ماشہ، تو نصف صاع، ایک سو چالیس (۱۴۰) تولہ قدیم یعنی رائج الوقت تولے سے ایک سو چالیس (۱۴۰)

تولے یعنی پونے دو سیر تولہ ہوا۔ اس نیم صاع شیر میں مولانا بریلویؒ نے پانی بھرا جو دو سو چوبیس (۲۱۴) روپیہ بھر مرم یعنی کچھ کم کچھ رطل ہوا۔ یہ فاصل بریلویؒ کا غیر معمولی ذکاوت کا ثبوت ہے کہ پانی کو وزن کے لئے معیار قرار دے کر نصف صاع شیر میں پانی بھرا جس کے باعث جو کی کیفیت و کمیت، معتدل، تازہ، خشک، مزہ دیدہ، تخصیص مقام و غیر کی اباحت کا خاتمہ ہو گیا۔

صاحب درخت ارشامی وغیرہ دیگر حضرات نے معلوم نہیں کیوں پانی کو معیار

قرار نہیں دیا۔

ذاتی تجربہ | خاکسار نے بھی یہ عمل بتاریخ ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء کو کیا، اگرچہ یہ قابل ذکر اور غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ اور زمانہ طالب علمی سے زمانہ درس و تدریس تک برابر اس میزان (ترازو) سے واسطہ رہا ہے۔

سو (۱۵۵۷) سی سی کا ظرف لیا جس میں سو (۱۰۰) گرام پانی آتا ہے۔ اور جو تقریباً ایک سو تین (۱۰۳) ماشہ کے برابر ہے اور اس ظرف میں تھو گھیوں، اُرد، مونگ، مسور تولے،

اس ظرف میں جو — ۶۸ ماشہ آئے رائج ماشہ

گیہوں — ۸۱ " " "

اُرد — ۸۵ " " "

مونگ (ماش) — ۸۵ " " "

مسور (دھن) — ۸۲ " " "

میرے حساب میں گیہوں اور جو کی نسبت $\frac{81}{68} = \frac{119}{100} = 1.19$ ہے۔ اور فاضل بریلک

کے حساب میں $\frac{103}{100} = 1.03$ ہے اور ۱۹ اوا اور ۲۲ قریب قریب برابر ہیں۔

خاکسار نے جس زمانے میں ہر صوبے سے جو منگائے تھے۔ اس زمانے میں اوسط معتدل جو گرام میں بھی تولے تھے۔

یہ تمام اعداد یعنی —

ایک جو = ۴۲۶۳۰ گرام

سو (۱۰۰) جو = ۲۶۳۰ گرام

اس لیے ایک جو = ۲۶۳۰ گرام

ایک جو = ۰.۶۰۴۲۹۵ گرام

۰.۶۰۴۲۵۶ گرام

قریب قریب برابر ہیں۔

ستر (۷۰) جو = ۰.۶۰۴۲۹۵ گرام

اس کیلئے ایک جو = ۰.۶۰۴۲۹۵ گرام

مدینہ طیبہ کے جو

ایک سو تینیس (۱۳۳) جو = ۰.۶۰۴۲۹۵ گرام

اس کیلئے ایک جو = ۰.۶۰۴۲۵۶ گرام

اس لیے دو ہزار جو = ۰.۶۰۴۲۵۶ گرام

۰.۶۰۴۲۵۶ ماشہ موجودہ تقریباً

سونے کے نصاب کا سات گنا چاندی

کا نصاب ہے اور چاندی کے

نصاب کا ۱۵ گنا۔

صاع یعنی ۱۰۴۰ درہم کا وزن ہے (یعنی جس میں ماش یا عدس ۱۰۴۰ درہم آئے

میں نے وسط جنوری میں اور مولانا بریلویؒ نے وسط اکتوبر میں تجربہ کیا یہ تھوڑا سا فرق قسم غلہ یا تبدیلی موسم کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے۔

میرے حساب میں ایک ہزار چالیس (۱۰۴۰) درہم عدس ہے (عدس کو اس لئے لیا کہ اس کا

ذکر قرآن مجید میں ہے)

میرے تجربے میں عدس (مسور) اور گہوں، جہم اور وزن میں قریب قریب یکساں ہیں

اور عدس (مسور) اور مونگ اگرچہ حجم میں برابر ہیں۔ مگر وزن میں مختلف ہیں۔ جیسا کہ نقشہ

بالے ظاہر ہے۔ شامی اور درختا میں ہے کہ وزن میں بھی برابر ہیں۔ ممکن ہے یہ فرق

قسم اناج اور موسم کی خشکی و ترسی کے باعث ہو۔ ۱۰۴۰ = ۱۳۵۶۰ قیراط اور ایک

قیراط = ۲۰ گمین اس لیے ۱۳۵۶۰ قیراط = ۱۳۵۶۰ گمین تقریباً ۱۳۵۶۰ گمین

۱۳۵۶۰ گمین = دو سو ستر (۲۰) تولہ موجودہ تقریباً یعنی چوتن (۵۴) چٹانک

مولانا بریلویؒ نے رطل کو ۳۶ روپیہ مانا۔ روپیہ برابر ساڑھے گیارہ ایلیم ماشہ قدیم سے کہا ہے اور مالامالہ منہ میں ایلیم، ماشہ قدیم سے کہا ہے۔

اگر سیر ۱۵۲ ۛ تو لہ قدیم شاہجہانی سیر ۛ تو لہ قدیم عالمگیری سیر ۛ تو لہ قدیم۔
اگر سیر کو ۛ تو لہ عالمگیری مانی تو ایک روپیہ شاہی ۛ ۛ ماشہ قدیم کا سہنا چاہیے
اور میری تحقیق اس زمانے کے شاہی روپے کے متعلق یہ ہے کہ ۛ ۛ ماشہ قدیم کا خطا۔

مولانا سید احمد اکبر آبادی نے علی گڑھ کی سکونت ترک کر دی ہے
اس لیے اب موصوف کا آئندہ پتہ یہ ہوگا۔

انسٹی ٹیوٹ آف مہٹری آف مدلسین اینڈ میڈیکل سیرجی

ہمدرد فلیٹ - پل پہلاد - تعلق آباد - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

معظم کی مثنویاں

رسالہ شجرۃ الالقیاء

بتصنیع و تقدیم مولانا ذاکر طاب الوالہ نصر محمد خالدی صاحب دارالحدیث
(۳)

حمد

- ۱ الہی تو قادر ہے صاحب غنی ۱ تو رزاق مطلق ہے سمرت دہنی
- ۲ ترا نام قادر سزاوار ہے ۲ ترے نام کا سب کو ادھار ہے
- ۳ اسم بامستی ہے تیرا حکیم ۳ سمیع بصیر، علیم، حکیم
- ۴ تو حاکم ہے حکمت میں پورا دسا ۴ ترا نام نا کچھ ادھورا دسا
- ۵ علم غیب کا سچ پودھرتا ہے تو ۵ نئی حکمتیں تو چ کرتا ہے تو
- ۶ فلک بے ستوں تو معلق کیا ۶ ستاروں سے کیا خوب رونق دیا
- ۷ لگاؤں میں قندیل تو نور کے ۷ چراغاں لگا کر چند سور کے
- ۸ یوں رات کیا خوب بنایا ہے تو ۸ یو خلقت عجائب بنایا ہے تو
- ۹ یو خورشیدوں روز روشن کیا ۹ زین کو تو چند سوں گلشن کیا
- ۱۰ یو بستر میں کا بجایا ہے تو ۱۰ دکھا کر یو قدرت رکھایا ہے تو

برستا ہے باراں زمیں کے اوپر ۱۱ تو ہوتا ہے دنیا میں آواں نثر
 بچھائیں اوپر سفرۂ خاص دعا ۱۲ کھلاتا ہے خلقت کو آواں طعام
 بھراتا ہے دن رات گردشِ فلک ۱۳ بناتا ہے حکمت سوں جن و ملک
 وہ کرتا ہے کیا بادشاہی عظیم ۱۴ دکھاتا ہے حکمت آپیں وہ حکیم
 کئے اس کو رزاق مطلق ہے او ۱۵ مہربان بندوں پہ برحق ہے او
 کیا پیاروں سب یہ جی جان ہے ۱۶ ولیکن شرفِ ناک انسان ہے
 دیا دیک انسان کو حقِ شرف ۱۷ پہچانا اونے جب یہ اصلی حرف
 کرم کر کیا حق نے سب مور مار ۱۸ ولیکن بشر نے سمج کر دگار
 امانت یو حق کا کیا جب قبول ۱۹ کیا پیاروں حق نے اس کو جہول
 اظہار دیکھو حقِ قیوم ہے ۲۰ دہی بر اور بحرِ قلزم ہے
 ہے محیط (اور) سب میں موجود او ۲۱ ہے مطلق کئے دیک معبود او
 وہی دیکھ دریائے وحدت ہوا ۲۲ او وحدت کئے سو ہی کثرت ہوا
 ہر یک روپ میں دیکھ مظهر ہے او ۲۳ آپیں رہ دکھانے کو رہبر ہے او
 مشکا حق! آپس کو کروں آشکار ۲۴ نکل شوق سوں گنجِ مخفی کے بھار
 محمد عجب نام اپنا رکھا ۲۵ آپس کو چھپا اور رسول کو دکھا
 نبی کا اول نور اظہار کر ۲۶ کیا سب اسی نور سوں بحرِ بر
 نبی کے طفیلوں دیکھ کر دگار ۲۷ دو عالم او پر توج دھرتا ہے پیار
 اولوالعزم اور ان کو مرسل کیا ۲۸ کرم کر کیا حاتم الانبیا
 نبی کو سونائب کیا آپ نا ۲۹ نبی کو خلافت دیا آپ نا
 دیا پیار سوتا ج لولاک کا ۳۰ عطا اُس کیا تختِ افلاک کا
 دیا حق نے اپنا حکومت اُسے ۳۱ جو کچھ شان و شوکت سورتِ لائے

اُسے حق دیا بھیج فرقان یو ۲۲ عنایت کیا اس کو قرآن یو
 بلا کر اُسے رب نے معراج کو ۲۳ دیا پیار سوں تخت اور تاج کو
 یو خلعت کیا حق نبی کے بدل ۲۴ یو خلعت دیا حق نبی کے بدل
 سیادت کیرا اس کو القاب دے ۲۵ بڑے پیار سوں اس کو اصحاب نے
 مقرب نبی کے سویہ چار ہیں ۲۶ یہی یار دلدار غم خوار ہیں
 ابابکر سچ یار غم خوار تھے ۲۷ نبی کے مقرب او دل دار تھے
 نبی پر اول صدق جب لائے ہیں ۲۸ مراتب دو عالم میں تب پائے ہیں
 جگہ معرا

دو جی یار سو عمر خطاب تھے ۲۹ او صاحب صدر قطب اقطاب تھے
 سخاوت شجاعت میں غازی اچھے ۳۰ نبی کی حضوری میں قاضی اچھے
 گرم جب ہوا حق کے معشوق کا ۳۱ لقب تب ہوا اُس کو فاروق کا
 عدالت کو کیا زیب و زویر دیا ۳۲ شریعت موافق ہدایت کیا
 جگہ معرا

نبی کے بچے یار عثمان تھے ۳۳ او کامل حیا اور ایمان تھے
 اذل سوں تھے مقبول دارین کے ۳۴ یو وارث کیا حق نے نورین کے
 نبی کے امیر پر او فرقان کو ۳۵ کیے ہیں جمع دیکھ قرآن کو
 امر جیوں اٹھان کو رب الجلیل ۳۶ دیے دو نچے ترتیب آیت دلیل
 یو چھتے علی شاہ دُلل سوار ۳۷ کتے ہیں جسے صاحب ذوالفقار
 اُسے حق نے شاہِ ولایت کیا ۳۸ اُسے حق نے مہرِ ولایت دیا
 اول سوں نبی کا ہے دلبر کتے ۳۹ اُسے توہ ساقی کوثر کتے
 نبی کا کتے یار کزار ہے ۴۰ دو عالم کو برحق او آدھار ہے

اُمّ محمد ہوا خواب میں کائنات ۵۱ تو اظہار کر گنج مخفی کی بات
 عبادت میں حق کی تو مشغول ہو ۵۲ کدورت یہ دنیا کی سبیل سوں ہو
 صفت کر نبی کا دل و جان سوں ۵۳ معزز اسے جان ایمان سوں
 اَوّل پانچ تن کا ثنا بول کر ۵۴ مراتب اُن کا تو کہہ کھول کر
 نبوت ولایت کی کہ بات تو ۵۵ اتنا اُٹھ قلم لے اس بات سے
 نبی کے اُمّ پر یو بولا سوں میں ۵۶ چھپے راز کو نوچ کھولا سوں میں
 سہا محمد اُمّ خاتم الانبیا ۵۷ اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیاء
 الہی بحق محمد رسول ۵۸ یو مکتوب میرا تو کرنا مقبول
 تصدیق ترے پانچ تن پارک کا ۵۹ عفو کر خطا محمد سے نافرمان کا
 جگہ معرّا

نبوت کی مسند نبی کو دیا ۶۰ ولایت علی کو عنایت کیا
 نبوت ہے چشمہ سو آب حیات ۶۱ ولایت کے صدقے سوں آتا ہے ہات
 نبوت سو خلقت میں جو ہے شجر ۶۲ ولایت کتنے اُس کو آیا شمر
 نبوت خزانہ یو اسرار ہے ۶۳ ولایت طرف سو ہی اظہار ہے
 نبوت ولایت یو ہے یک دگر ۶۴ ولایت کتنے ہیں نبی کا امر
 نبوت مثالی کہ جیوں سور ہے ۶۵ ولایت سو اُس سور کا نور ہے
 نبوت کا زیور ولایت سو ہے ۶۶ ولایت کو قوت نبوت سو ہے
 نبوت ولایت کی یک ہے مزاج ۶۷ یو دو مل کے قدرت کو دیتے رواج
 نبوت جواہر کی جیوں کھان ہے ۶۸ ولایت سو جو ہر یو ایمان ہے
 نبوت ولایت سوں سب کام ہے ۶۹ دیکھو تو ہے خلقت کو آرام ہے
 اُمّ پر نبی کے علی شہ سوار ۷۰ ہدایت کیے صاحب ذوالفقار

نبی نے دیکھو تب مکرر کہے ۷۱ مرا اور علی کا جُند ایک ہے
 دیکھو تو چہ شاہِ ولایت یو راز ۷۲ کہے کھول عالم کو کرسر فراز
 دیا حق اسے سیف اور یہ قلم ۷۳ حوالے کیا دین کا اُس عِلْم
 علی پر کرم حق ازل سو کیا ۷۴ تو مہرِ ولایت علی کو دیا
 علی کے کتے ہات سب کام ہے ۷۵ علی کیچ قوتِ سوں اسلام ہے
 علی کے کرم سو یو ہوتے دلی ۷۶ علی سوں کھلا سب خفی اور جلی
 علی کیچ ہے ہات آبِ حیات ۷۷ علی کیچ صدقے سوں آتا ہے ہات
 اول پانچ تن پاک پیدا کیا ۷۸ اُن کے سبب سب ہویدا کیا
 نبوتِ نبی کو دیا آشکار ۷۹ علی کے دیا ہاتھ حق ذو الفقار
 نیابتِ وہ اپنا نبی کو دیا ۸۰ نبی کا سونائب علی کو کیا
 علی کیچ ناسب ہیں سارے امیر ۸۱ جہاں تک یو ہیں پیر اور سب فقیر
 ہر یک شہر میانے ہیں کئی اولیا ۸۲ ہر یک رہ دکھانے کو ہیں اتقیا
 ہر یک ملک میں دیک اصحاب ہیں ۸۳ ہر یک ملک میں قطبِ قطاب ہیں
 ہر یک ملک کو ایک والی کیا ۸۴ ہر یک باغ کو ایک مالی کیا
 وہ جس ملک پر رحم کرتا کریم ۸۵ سو اُس ملک میں ایک کیتا حکیم
 اسی وضع دکھن اوپر کر کرم ۸۶ دیا بھیج والی اپنی کر رحم
 حکمِ معرا

مبارک عجب نام ہے شاہِ باز ۸۷ محمد حسینی ہیں گیسو دراز
 اوہی خاوندہ ہے دیک چشت کا ۸۸ دیا ہات حق اس بکلی بہشت کا
 وہی دیک دکھن کو حامی ہوا ۸۹ وہی بادشا ایک نامی ہوا
 اُسی (کی) برکت سوں آرام ہے ۹۰ اُسی کے نقد سے سب کام ہے

اُسی کے لہذا سو دھن ہوا ۹۱ لقب تب یہ دھن سو لکھن ہوا
 نوازا ہے مج سار کے کئی گدا ۹۲ گدا کو نوازا کیا بادشا
 یو برحق دسا ہے بندہ نواز ۹۳ کیا دیک دھن کو سب سرفراز
 دیکھو بات رویت کی کھولا تمام ۹۴ کیا راز مکشوف سب خاض و عام
 وہی بادشاہ سب سلاطین کا ۹۵ دیا تخت حق اُس دنیا دین کا
 کمل ولی ہے قطب الزماں ۹۶ دیکھو سب ہے خلعت کو شہ کا اماں
 حکومت ولایت سو کرتا ہے او ۹۷ ولکین حمایت بھی دھرتا ہے او
 دیکھو پل میں احمد کو شاہی دیا ۹۸ سو تر لوک کے بادشاہی دیا
 ہمیشہ دیکھو کیوں او معبود سوں ۹۹ او بل عیش کرتا ہے موجود سوں
 لقب اس مستی پوشہ باز ہے ۱۰۰ عرش سو بلند اس کی پرواز ہے
 ازل (سے) اُسے حق نے شاہی دیا ۱۰۱ وہ تر لوک کی بادشاہی دیا
 ہمیشہ دیکھو کیوں وہ معبود سوں ۱۰۲ او بل عیش کرتا ہے موجود سوں
 نبی کا کتے لچ دل بند ہے ۱۰۳ علی کا تو برحق وہ فرزند ہے
 مسیحا کی تاثیر ہے بات میں ۱۰۴ دیا حق نے قدرت یوسب بات میں
 کیا بات مکشوف مَن عرف کا ۱۰۵ دیا آشنائی فقہ عرف کا
 شہنشاہ نے دولت دیئے آل کو ۱۰۶ مریداں پہ کھولے چھپے راز کو
 کیتی آل کو اپنی مسند دیئے ۱۰۷ کرامت سکنت سب غایت کیے
 مریداں دیکھو شہ کے قابل ہوئے ۱۰۸ اکیس سوں دیکھو ایک کامل ہوئے

حکِ معرا

آئے یک شہنشاہ کے پیشِ امام ۱۰۹ اتھا علم تحصیل اُن پر تمام
 کیتے نام اُن کا اتھا شہ جمال ۱۱۰ آئے مغربی اور صاحبِ کمال

ادب بیچ شاہ اُن کی رکھتے آتھے ۱۱۱ دل دجاں سوں اخلاص دھرتے آتھے
 آسقا علم تحصیل اُن پر تمام ۱۱۲ ولے علم باطن نہ تھا کچھ فہام
 کہے ایک دن آکے یو شاہ پاس ۱۱۳ زمیں کو دیے بوسہ کرا تھاس
 کیا حق نے تمنا کو بندہ نواز ۱۱۴ کرو داز کچھ مجھ پہ حق کا یو راز
 یو عالم کے تم کان میں بولتے ۱۱۵ بکوبات کر راز کو کھولتے
 یو لب کرتیں کچھ پلاتے اہیں ۱۱۶ مٹوئے سودیوں کو جلاتے اہیں
 اشارت سوں اُن کو دکھاتے سو کیا ۱۱۷ آپس بات سوں تم پلاتے سو کیا
 مریداں کو حق سوں پلاتے تمیں ۱۱۸ نبی سوں پلا کچھ دلاتے تمیں
 بہت دلیں خدمت میں رہا ہوں میں ۱۱۹ بہت شہ سو امید دھرتا ہوں میں
 تھکے سوں سب راز روشن ہوا ۱۲۰ تھکے سودھن یو گلشن ہوا
 جگہ مورا

محمد حسینی نے سُن کان دھر ۱۲۱ دیئے جواب اخلاص سوں مختصر
 شہنشاہ تب یوں اُسٹے بول کر ۱۲۲ کہے راز کی بات سب کھول کر
 اول کفر اختیار کرنا یہاں ۱۲۳ اول پا تو تل دھرتا یہاں
 اول زہد ایمان کرنا نذر ۱۲۴ جو کچھ پیار کا چیز دھرتا نذر
 یو کسی علم سب بسرنا کتے ۱۲۵ کہا پیر کا دل میں دھرتا کتے
 ترک کر کے سب کفر اسلام کو ۱۲۶ ترک کر کے سب تن کے آرام کو
 نفی توہج ہونا آپس پیر میں ۱۲۷ سو جیوں بوند ہاضم ہے دیک نہ میں
 نبی میں نفی جاننا پیر کو ۱۲۸ رسول کر کے تو ماننا پیر کو
 نبی کو نفی جاننا ذات میں ۱۲۹ بقا توہج ہوتا ہے اثبات میں
 شریعت طریقت حقیقت سوجھل ۱۳۰ دکھیو معرفت یہ ہے حق کا وصل

شرعیّت کی راہ میں ہی آرام لے ۱۳۱ کتنی حق سوں پاتا ہے اکرام لے
 طریقت سوغارت یو کامل ہوئے ۱۳۲ حقیقت سوں عاشق یو عامل ہوئے
 سمجھ معرفت حق سوں واصل ہیں دیک ۱۳۳ درس عشق کا پڑھ کے فاضل ہیں دیک
 یو صورت پرستی سے سب کام ہیں ۱۳۴ یوسپ توچ انعام اکرام ہیں
 یو طالب دپر کھول دیتے (ہیں) پیر ۱۳۵ مرید توچ ہوتا ہے روشن ضمیر
 سکھاتے ہیں باطن میں روزہ نماز ۱۳۶ مریداں پہ کھلتا ہے تبدیل کارا ز
 جو کوئی پیر نپڑا سو سلطان ہے ۱۳۷ جسے پیر نہیں اس کو شیطان ہے
 بجز راہ بر راہ پاتا نہیں ۱۳۸ بجز پیر کچھ بات آتا نہیں
 سمجھنے میں سب بات کامل تھیں ۱۳۹ ہیں عالم تھیں اور عامل تھیں
 جگہ معرا

زباں سوں سنے جب یہ خواجہ کے قتل ۱۳۰ کھڑے ہو رہے سامنے ستہ جمال
 اول لے سزا کر شہنشاہ کو ۱۳۱ سو سجدہ کیے شاہ جم جاہ کو
 تحیات کر کر بہت بے شمار ۱۳۲ دو عالم کو ہے شاہ تیرا آدھار
 ہے شاہ خدا اور خدا کا رسول ۱۳۳ اطاعت ترا سب کیا میں قبول
 قبول ہوں لے شہ تری بات کو ۱۳۴ اتا خوب پچھانا تری ذات کو
 اتا جسے کر مج مریداں میں ۱۳۵ اتا جسے کر مج کو بندیاں میں
 اتا جام دے مج کو اے کار ساز ۱۳۶ مارک ترا نام بندے نواز
 بہت شاد داں ہوا قاق کیر ۱۳۷ مرید توچ ہوتا ہے روشن ضمیر
 اول لوح پر دیکھ پھر کر نظر ۱۳۸ سو بعد از کیے پیار ان کے اوپر
 بڑے شوق سوں تب کر مرید ۱۳۹ کرم لئی کیے دیکھ یوں معتقید
 اول بات من عرف کی بول کر ۱۴۰ سو بعد از فقہ عرف سب کھول کر

کئے راز مکشوف یک بات میں ۱۵۱ دیئے پنج گنج کا کلی ہات میں
 جو کچھ بولنا تھا سو بولے تمام ۱۵۲ چھپا راز سب اُن پر کھودے تمام
 مجالس میں لے جانے سوں بلا ۱۵۳ ولایت کی تشریف ان کو دلا
 لیجا حق سوں یک بل میں دھل گئے ۱۵۴ دُرُس عشق کا دے کے فاضل کئے
 کہے تم سفر اب کتیک دن بھرو ۱۵۵ نبی کا آخر تم ہدایت کرو
 سفر ایک ظاہر تو پھرنا ہے یو ۱۵۶ سو دُسر ا خدا سوں اپڑنا ہے یو
 دیکھو ایک ہے حج آصغر کئے ۱۵۷ سو دُسر اُسے حج اکبر کئے
 سفر میں تصرف کرو پانچ گنج ۱۵۸ کرو دُور (د) عالم کے سینے سوں رنج
 یو کعبہ بنایا ہے کہتے خلیل ۱۵۹ سو دُسر ا یو کعبہ ہے رب الجلیل
 کرم کر حسین نصیحت کئے ۱۶۰ ہدایت کرو کر اجازت دیئے
 تمہارے ہیں رستے میں لئی اولیا ۱۶۱ اسی خانوادہ میں ہیں اتقیا
 تمہارا تو یونام ہے شہ جمال ۱۶۲ تمہارے سوں آکر ملا ہے کمال
 تمہارا دعا حق را جابت کرے ۱۶۳ تمہارے اُمربل منڈے چڑھے
 کئے جبر اکبر ہے اس باٹ میں ۱۶۴ بڑا کچھ خطر ہے جنگل گھاٹ میں
 سو اس راہ میں ناچ سونا کتے ۱۶۵ یو تو نشہ عمرنا پے کھونا کتے
 کتے راہ میں چار منزل ہیں دیکھ ۱۶۶ اُترتے ہیں اس ٹھار راحل ہیں دیکھ
 کتے عاشق (ن) راہ بھی چہا رہیں ۱۶۷ ہر یک راہ میں یسج اغیار ہیں
 سیدھے ہات کا راہ کیا خوب ہے ۱۶۸ جو اس راہ سوں آتا محبوب ہے
 موذی پانچ ہیں راہ میں لئی کسب ۱۶۹ اول ان کو کرنا کتے ہیں قتل
 امارہ بڑا دیو ہے راہ میں ۱۷۰ اسے مار سٹنا کتے جاہ میں
 جاس خمس یو پانچ ہیں راہ زن ۱۷۱ کتے دُور کرنا جلا کر وطن

اول سات ستیاں کو دینا ترک ۱۴۲ کتے ایک مستی سو رہنا سڑک
 اول چہار من سو گز رنا کتے ۱۴۳ شہادت یو تو حق سو پانا کتے
 حیاقی منے کر کے چینا اول ۱۴۴ کتے تو پچ پاتے ہیں حق کا وصل
 پوراہ شش جہت کتے چھوڑ کر ۱۴۵ چولا مکان پر نظر جوڑ کر
 پوچھٹھا رپڑتے ہیں غفلت کتے ۱۴۶ جو سویا سو کھویا ہے دولت کتے
 تمہارے نزد جوہراں پانچ ہیں ۱۴۷ وہ چوری منے اپنے ورزور ہیں
 اول اپنی تو حید حق بوج کر ۱۴۸ شفاعت کرے گا قدر بوج کر
 تمہارے کتے دم ہیں بار ہزار ۱۴۹ کتے یاد میں حق کی کرنا شمار
 اپس حق ہو قاضی پوچھے گا حساب ۱۵۰ عدد کر صحیح جواب دینا شتاب
 تمہارا ہے حافظ وہ جل و علا ۱۵۱ دے مرد سو شیار رہنا بھلا
 سفر کا شہنشاہ نے رخصت دیے ۱۵۲ خلافت دے اور روانہ کئے
 اسی ساعت اٹھ کر سو سجدہ کئے ۱۵۳ شہنشاہ کے پاس رخصت لئے
 مسافر ہوئے پور چلے ہیں کتے ۱۵۴ خضر آ کے راہ میں ملے ہیں کتے
 خضر جب سو آ کر مصافحہ کر ۱۵۵ دیے شہ کو مرشدہ سو بولے خبر
 ولایت یہ تمنا مبارک کہے ۱۵۶ تمہارا تو وہ یار غم خوار ہے
 دیا حق تے تمنا کو معبود نے ۱۵۷ بڑے پیار سوں تم کو موجود نے
 سفر تم کو دل کے اُس یار سوں ۱۵۸ کرو راز اظہار دل وارسوں
 بک دن کو آکر بے شہ کمال ۱۵۹ کرم ان اُپر تب کئے شہ جمال
 جمع کر مریداں ہیں ان کو اول ۱۶۰ چلے سیر کرنے یو جھگڑے جنگل
 مرید پیر پر جا فتانی کئے ۱۶۱ اُس کو کتے اس میں فانی کئے
 اُس میں اُس کی دگر ہوئے ۱۶۲ مرید پیر مل یک دگر ہوئے

کئے سیر اول خراسان کا ۱۹۳ کئے بعد ازاں سیر سیلان کا
کئے سیر ثلث عرب کا ذوق سوں ۱۹۴ عرب اور عجم کا بڑے شوق سوں
ملک در ملک اور شہر در شہر ۱۹۵ چلے سیر کرتے سوئے اور بحر
دیکھو جیوں اور اجنے بولے اتھے ۱۹۶ شہنشاہ جوں راز کھولے اتھے
کئے دو پنج سب پر ہدایت کئے ۱۹۷ امر جیوں اتھاتیوں عنایت کئے
مرید پر بل کر سودو نو بجئے ۱۹۸ کنگ دن کو پھر آئے روئے منے
سفر پھر کے جب آئے میں شہ جمال ۱۹۹ شہنشاہ کا تب ہوا تھا وصال
حینی کے غم سوں سوناب لا ۲۰۰ سنا پھوٹ جا کر سوکھا ٹا ہیا
مرید کو کہے تم خلافت کرو ۲۰۱ بیجا پور جا، تم ہدایت کرو
اتار راز عالم پہ کھو لو تمیں ۲۰۲ شہنشاہ کی بات بو لو تمیں
مرید کے اوپر (سب) یو کھولے کلام ۲۰۳ وداع ہو چلے شاہ دار السلام

جگہ معرا

بیجا پور میں جا کے صاحب کمال ۲۰۴ مسخر کئے سب کو دکھلا جالی
جیکھ راز خواجہ سوں آیا تھا چل ۲۰۵ سووہ راز کشف تھا ان پہ چل
جیکھ راز کہتے یوشہ باز تھا ۲۰۶ سووہ راز ان پر ہوا واز تھا
یو من عرف کی بات کرتے اتھے ۲۰۷ فقد عرف کا راز دھرتے اتھے
جیکھ بات رویت کی کھو لو کہے ۲۰۸ جیکھ راز شہ باز بو لو کہے
اسی وضع دکھن میں رہتے اتھے ۲۰۹ ہدایت وہ عالم کی کرتے اتھے
ہوا خلق دکھن میں سب سرفراز ۲۱۰ نقد سوں ان کے کھلا سب پر راز
نبی کے مجالس میں جاتے اتھے ۲۱۱ بلا کر ولایت دلاتے اتھے
کئے سب یو دکھن نے پایا شرف ۲۱۲ ہوا غلغلہ سب لایا چار و طرف

جگہ معرا

سناہوں روایت مجھے یاد ہے ۲۱۳ اسی بات سوں دل مرشاد ہے
 کہتے ایک حاجی مدینہ بھڑ ۲۱۲ سوتے تھے اوسر رکھ کے سیڑھی اوپر
 نبی کو میں ظاہر بلوں کر کہے ۲۱۵ سو بارہ برس ایک کروٹ رہے
 کہتے تھے کہتے رُخ بے خبری کُذُن ۲۱۶ دیوک چر گئی کھتی سو سارا بدن
 کئے استخارہ انو مستقیم ۲۱۷ جو ایسے میں آئے نبی اکرم
 کہے یار کیا ہے طلب جمع سوں بول ۲۱۸ جیکچرا زدل میں ترے ہے سو کھول
 نبی کے رکھے پاؤ پر سرفقیہ ۲۱۹ کہے یا نبی توں ہے روشن ضمیر
 مرے دل میں یہ سؤق آتا اتال ۲۱۷ جوظاہر دے مج کھٹارا حمال
 مجالس میں خواجہ رکے آتے رہنا ۲۲۱ سدا کے دیدار پاتے رہنا
 حیاۃ النبی کر کہتے ہیں تجھے ۲۲۲ دُرس کا اتادان دینا مجھے
 نبی کے برابر یوسب یار تھے ۲۲۳ مجالس کے اصحاب کُبار تھے
 نبی رحم کر (کر) کہے یا علی ۲۲۲ کردان کو بیعت خدا کے ولی
 نبی کے اُمر سوں یوسبت کئے ۲۲۵ خلافت کے اس ٹھار خلعت دیے
 نبی نے کہے اب تو پایا شرف ۲۲۱ ولے جاتا تو بجا پور طرف
 بجا پور میں ایک شہر شا پور ہے ۲۲۷ مرے دُرسوں سب وہ معمور ہے
 وہاں ٹیک دتا ہے یک دُرسوں ۲۲۸ چکتا ہے روشن مرے دُرسوں
 اسی ٹھار ظاہر ملوں گا تجھے ۲۲۹ ولے کیوں سچ تو سکے گا مجھے
 وہاں لوگ کہتے مجھے شہ حمال ۲۲۰ اتا یا درکھ خوب میرا حمال

جگہ معرا

بہت شادشاداں ہوئے تب فقیر ۲۳۱ صدق ہوئے اور رکھے ٹھوس پہ سیر

اٹھے سوں قوداں پنج راتل ہوئے ۲۳۱ کسی بات سونئیں اوکاہل ہوئے
 لئے رنج دکن کا بڑے شوق سوں ۲۳۲ بڑے شوق سوں اور بڑے ذوق سوں
 پچھلے ہیں دیکھے سے اس ماہ کو ۲۳۳ کئے آکے سجدہ ادتب شاہ کو
 عجب روزان پر یومعراف تھا ۲۳۴ عرش کے اوپر سچ مراکاج تھا
 لگا کر سینے سوں گرم کئی کئے ۲۳۵ حجاباں کئے دور نعت دیئے
 کہے تم ہمارے بہ مشتاق ہیں ۲۳۶ مدد عالم میں تم شمس عشاق ہیں
 اسی کپل میں محرم کئے راز سوں ۲۳۷ ملائے اسی روز شہ باز سوں
 مجالس میں لے جانے کے کئے ۲۳۸ دیئے بات میں جا علی کے گئے
 میراں جی اکتھانام ان کا اول ۲۳۹ لقب شمس عشاق کا کر فضل
 سچے پیر برحق دے شہ کمال ۲۴۰ اُسی روز حق کا سوکھوے وصال
 اُسی روز بے یومَن عرف سب ۲۴۱ اسی روز بے یومَن عرف سب
 اُسی روز سب راز روشن کئے ۲۴۲ اسی روز اپنا خلافت دیئے
 کہے یاں اتنا تم ہدایت کرو ۲۴۳ اتنا بے دھڑک تم خلافت کرو
 کمر میں تھاری ہیں اولاد نئی ۲۴۴ چلیں گی تھاری سوں اولاد کئی
 قبولو شرع کتھرائی کرو ۲۴۵ کیتک کام سوں اب جدائی کرو
 تڑت ایک فرزند اب ہوئے گا ۲۴۶ بڑا قطب اقطاب او ہوئے گا
 دکھیا لوح پر نام برہان ہے ۲۴۷ یلانک رکتی ظلی سبحان ہے
 اُسے راز کشوف ہو گا تمام ۲۴۸ پرستش کرے گا اُسے خاص عام
 بڑا مرد ہو گا وہ دیکھ چٹ میں ۲۴۹ او داخل کرے گا کیتک بہشت میں
 تھارے بہت بات دیکھیں ہیں ۲۵۰ اتنا تم کو فرزند لکھیں ہیں
 اُمراب ہو ہے تجھے ذوالحلال ۲۵۱ سفر بھر کے جا دیکھ قدرت کمال

یوحس روز آکر میراں جی بٹے ۲۵۲ اُسی روز فاتحہ پڑھے اور چلے
 ٹرک کر کے صحبت سوانسان کا ۲۵۲ لئے رخ جنگل بیابان کا
 میراں جی کو حق دا پنچ روشن کیا ۲۵۵ اُسی ٹیک کو حق نے گلشن کیا
 دہی ٹیک پھر جب ہوا ہے نشتر ۲۵۶ اُسی ٹھار آکر بُنا ہے شہر
 دیکھے خلق حق پر یو شاق ہے ۲۵۷ یو برحق کہے شمس عشاق ہے
 مریداں منے جمع عالم ہوا ۲۵۸ جو کوئی آملسا سورودہ) محکوم ہوا
 سوا غلغلہ سب یو چار و طرف ۲۵۹ جو کوئی آملیا سوا دپا یا شرف
 اول غل اٹھا ہے کتے شہر میں ۲۶۰ نشرب ہوا ملک اور دہر میں
 اٹھا علم ظاہر تو ان پر تمام ۲۶۱ سوا علم کشوف باطن تمام
 بہت خلق کو شاہ ہدایت کئے ۲۶۲ بہت خلق کو رازِ نعمت دیئے
 کئے سب کے اظہار باطن کے راز ۲۶۳ اُمرجیوں کئے تھے وہ بندہ نواز
 جو کوئی آملسا سودہ کامل ہوا ۲۶۴ اوفاضل ہوا اور داصل ہوا
 کتئی دیس باطن کے شاہ کئے ۲۶۵ امیر جیوں ہے تیوں رہنمائی کئے
 میراں جی شریع کو کئے ہیں قبول ۲۶۶ اُمرنیر کا اور اُمر تھار رسول
 کہئے جب وہ حامل سومریم مکاں ۲۶۷ اوعصمت پناہ مادر مہرباں
 ہوا شاہ کے گھر یو روشن چرخ ۲۶۸ کیا چشت کے خا فادے کو بلوغ
 رکھے نام بہان تب شاہ کا ۲۶۹ تجلی دس مکھ اُپر ماہ کا
 دی چاند کوئی دن کو کامل ہوا ۲۷۰ او کامل ہوا اور فاضل ہوا
 عمر جب ہوا با نژدہ سال کا ۲۷۱ ہوا شوق غالب چھپے قال کا
 ہوئی دست بخت پدرسوں کئے ۲۷۲ ہوا قلب روشن بدر (سوں) کئے
 جمع کر مریداں میں رخصت کئے ۲۷۳ کرد کر سوغتب حکم شہ دیئے

- ۲۰۴ اول والدہ پاس رخصت لئے دیکھو تب اد آتش کو سجدہ کئے
- ۲۰۵ بڑے شوق سوں شہ مسافر ہوئے وہ لٹی تن اُپر لیچ محنت لئے
- ۲۰۶ بجز رنج کوئی گنج پایا نہیں سو محنت بجز بار لایا نہیں
- ۲۰۷ سفر (سوں) کتنی نعمتاں پائے ہیں برس تین بعد از وہ پھر آئے ہیں
- ۲۰۸ بٹے پر بہت شادمانی کئے سو خلعت کئے جادو دانی دئے
- ۲۰۹ اول سو تو برحق یو مہتاب ہے کئے شاہ نے قطب اقطاب ہے
- ۲۱۰ چھپا راز سب ان پہ ظاہر کئے نبی کے مجالس سے ماہر کئے
- ۲۱۱ علی کی علمیت کا تعلیم دے دُرُس علم کا دے معلم کئے
- ۲۱۲ کئے جانشین شاہ برہان کو خلافت دیئے ظلِ سبحان کو
- ۲۱۳ اول حق کی سب آشنائی دیئے سو بعد ان کئے شاہ رحلت کئے
- ۲۱۴ رانا صفت کرتا ہوں برہان کا اد برحق دِ سا ظلِ سبحان کا
- ۲۱۵ اد حقان ہے اور متان ہے اودیان ہے اور برہان ہے
- ۲۱۶ یو کعبہ دِ سا تو چہ برحق مگتے خدا کا ارے بیتِ مطاق کئے
- ۲۱۷ جو کوئی آملا سودہ حاجی ہوا دو عالم منے پرچ وہ ناجی ہوا
- ۲۱۸ مہمرازِ اظہارِ برہان سوں جواہر پہنچتے ہیں جیوں کھان سوں
- ۲۱۹ مکمل ولی شیریز داں ہوا جلالت بھر اسیفِ برہاں ہوا
- ۲۲۰ دیا حق نے باطن کی دولت اُسے یو عصمت سکت اور کرامت اُسے
- ۲۲۱ اُسے حق کئے گنج محفی دیا اُسے حق چھپی بات ظاہر کیا
- ۲۲۲ اول تو شریعت کو دے کر رواج طریقت، اُنوکا استخا پرچ مزاج
- ۲۲۳ حقیقت اُن پر تو احوال تھا دیکھو معرفت کا یو سب قال تھا
- ۲۲۴ اول رکھو مریداں کو تاسوت میں لے جادیں کتنی دن کو ملکوت میں

سو جبروت میں اُن کو کر مستقیم ۲۹۵ دلاتے ہیں اس سٹار غلعت عظیم
 سو بعد از لے جا اس کو لاہوت میں ۲۹۶ سُلّاتیں (لحا اس کو) ہا ہوت میں
 مریداں کے سر پر او چھتر ہوا ۲۹۷ او چھتر ہوا بل کہ انسر ہوا
 خلیفے کئے شاہ کے چار تھے ۲۹۸ کئے شاہ برہاں سوں یار تھے
 نبی سوں بجا کر بلاتے تھے او ۲۹۹ ملا کر ولایت دلاتے تھے او
 وہ کیا زیب دیتے اتھے مَن عَزَّوَجَلَّ کو ۳۰۰ دکھاتے اتھے میم کے حرف کو
 مریداں دیکھو شاہ کے خوب ہیں ۳۰۱ اکیس سوں دیکھو ایک محبوب ہیں
 خدا کے چھپے راز کے جام کو ۳۰۲ پلاتے ہیں سب خاص اور عام کو
 یونہی آنا جب او کرتے ہیں واز ۳۰۳ یو خادم ہو محذوم تو سرفراز
 ہوا تو چ مشہور شدہ کا یونام ۳۰۴ دکھا شاہ کے ہاتھ جم کا او جام
 عجب جام روشن منور ہے یو ۳۰۵ یوزم زم کتے بل کہ کوٹھے یو
 پیاسو ہوا ہے اور روشن ضمیر ۳۰۶ ہوا پیریاں دیکھو کامل فقیر
 لگا ہے جسے کام اُس جام سوں ۳۰۷ اد گنوا ہے سب کفر اسلام سوں
 ازل سو میسر جیسے ہے یو جام ۳۰۸ اُسے دین دنیا میں ہے گا ارام
 ہر یک خام کو کاں میسر ہے جام ۳۰۹ ہر یک خام کو کاں یو پاتا کلام
 اُسی جام سوں خلق داتا ہوا ۳۱۰ دیکھو تو چ دکھن یونام ہوا
 پکٹے کئے دگ بندہ نواز ۳۱۱ کئے بخش برہان ان کا یوراز
 خلیفے خلیفوں کے ہیں کئی ہزار ۳۱۲ مریداں تو ہیں شاہ کے بے شمار
 کتاباں ہوے اور چلا یہ کلام ۳۱۳ بلخ اور بخارا یو سب روم شام
 شرع کے اُپر شاہ قائل تھے ۳۱۴ شرع پر بہت شاہ مائل اتھے
 زباں میں کئے شرع کا قال تھا ۳۱۵ کئے گھر مئے آل و اطفال تھا

جسے گھر میں امید ہے شاہ نے ۲۱۱ کئے یخ شادی سو جم جاہ نے
 اُسے روزِ شہ نے دیے سب خبر ۲۱۲ صفتِ سب میں کے کہے کھول کر
 خدا کا کہے شیر آتا ہے یو ۲۱۳ برابر چھپے گنج لاتا ہے یو
 کہے اب طلبِ محمد کیا ہے حضور ۲۱۴ اتنا محمد کو جانا سوا لا ضرور
 نہ یک سٹار دو بل کے پتے پتنگ ۲۱۵ نہ یک میان میں دو سکتا تے فرنگ
 کہے سراپہ ہے تمہارے خدا ۲۱۶ ہمیں لبِ تمہارے سوں ہوتے ذراع
 مریداں اتنے شاہ کے بے شمار ۲۱۷ فقیراں اتنے شاہ کے کئی ہزار
 خلیفے اتنے شہ کے سب نام دہ ۲۱۸ ولے ان میں سید تھے صاحبِ گھر
 نگہ کر کے سیدِ طرفِ دکھ کر ۲۱۹ کہے تم امیں کو سو بولو خبر
 کہے ان کو سب راز بولو تمیں ۲۲۰ امیں پر چھپی بات کھولو تمیں
 امیں علی پر یو کھولو تم مام ۲۲۱ امیں کو سہارا یو بولو سلام
 کلاہ اور شجرہ امیں کو دیئے ۲۲۲ اسی روز عالم سو رحلت کئے
 جگہ معرا

دنیا میں کنگ دن کو آیا امیں ۲۲۳ برابر چھپے گنج لایا امیں
 اُسی ٹیک پر چاند بالا سوا ۲۲۴ دنیا دین میں سب اُجالا سوا
 سو، شغلہ ملک میں شاہ کا ۲۲۵ اجالا پڑا سب پہ اس ماہ کا
 ازل سوں لے حق یو دولت دیا ۲۲۶ ولایت کی خلعت عنایت کیا
 ازل سوں لے راز کا علم تھا ۲۲۷ ازل سوں لے علم اور علم تھا
 اول سوچے بولے اتنے شہ کمال ۲۲۸ امیں ہوئے گا ایک صاحبِ جلال

(باقی آئندہ)

جناب فضا بن فیض صاحب

ادبیات

غزل

اب شہر میں کہاں رہے وہ بادخار لوگ
 ہاتھوں میں وقت کے تو کوئی سنگ بھی نہ تھا
 بیٹھے ہیں رنگ رنگ اچالے تراشنے
 اپنے دکھوں پہ طنز کوئی کیل تو نہ تھا
 یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں حالات کا شعور
 کیا قہر ہے کہ بادۂ کم ظرف کی طرح
 باد صفر روشنی بھی ہے نظر دھواں دھواں
 کچھ سادگی طبع تھی کچھ مصلحت کا جبر
 آب دہلے شہر جنوں نیز تھی بہت
 شیشے سجا رہے تھے کہ پتھر برس پڑے
 یوں بھی ہوا کہ زہر کو تریاق کہہ گئے
 پھونکا ہمیں تو نرم تنگو فوں کی اوس نے
 دل کہ خود اپنے آپ سے ہی شرمار لوگ
 کیوں ٹوٹ کر بکھر گئے آئینہ دار لوگ
 رکھ کر لہو کی شمع سر رہزار لوگ
 زخموں کو پھول کہہ گئے ہم وضدار لوگ
 رخ پر ہوا کی مڑ گئے بے اختیار لوگ
 ساغر میں دھل کے رہ گئے مشعل گسار لوگ
 پلکوں سے چن رہے ہیں نظر کا غبار لوگ
 کانٹوں کو پوجتے رہے باغ و بہار لوگ
 دامن نہیں تھے پیر بھی ہوئے تار تار لوگ
 کیا کیا ہوئے ہلاک غم روزگار لوگ
 قاتل ہیں اپنے آپ کے ہم ہوشیار لوگ
 جیتے ہیں کیسے دل میں چھپا کر شرار لوگ

غم کا وہی سرور وہی حسرتوں کی آہ
 جیسے فضائیں میری غزل کا خار لوگ

تبصرہ

از الاستاذ عبد الحمید الفراهی (عربی) تقطیع متوسط، صفحات ۵، ہم صفحات ۱ تا ۱۱
جلی اور روشن. قیمت 2/50 پتہ: کتبہ الدائرة الحمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر۔ اعظم کٹھن۔

یہ رسالہ بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ نظام الفقہ آن کا جز ہے۔ غلطہ خیر و شر۔ احوال کے اجرد
منز اور تقدیر کے مسئلہ پر متقدمین و متاخرین نے بہت کچھ لکھا اور اسی ایک موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف
کی ہیں۔ لیکن اس رسالہ کی جو سخت افہوس ہے مولانا کو دوسرے اہم رسالوں کی طرح ناتمام رہ گیا خصوصیت
یہ ہے کہ اس میں موضوع بحث سے متعلق جو آیات پورے قرآن مجید میں بکھری پڑی تھیں ان کو (ب کٹھن) لکھ کر
مولانا نے منطقی ترتیب اور اپنی تشریح کے ساتھ اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ قاری کو یہ فہم حاصل ہو جاتا ہے
کہ عالم میں تفرقات الہی کا کیا مطلب اور اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور عالم میں عروج و زوال اقوام کے
جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں اور اللہ تعالیٰ کے نظام عدل میں باہم کیا ربط ہے؟ یہ سب یہ مسئلہ
منہایت اہم ہے اور اس کے صحیح فہم پر ہی استقامت علی الدین کا دار و مدار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل غلطہ
اور سائنس نے اس سلسلہ میں جو سوالات پیدا کر دیئے ہیں اور جنہوں نے یہ ٹرڈرسل ایسے منکر خدا و مذہب
کو جنم دیا ہے۔ اس رسالہ سے ان کا جواب نہیں ملتا۔ تاہم اس باب میں قرآن کا جو نقطہ نظر ہے وہ سامنے
آ جاتا ہے اور اس کی تشریح و توضیح میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے عربی کے طلباء اور اساتذہ
کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

علی کٹھن۔ مامی و حال از پروفیسر رشید احمد مدنی. تقطیع متوسط، ہم اپ روشن صفحات

۵ صفحات. قیمت درج نہیں. پتہ: مسلم یونیورسٹی. علی کٹھن۔

یہ وہ بکچر ہے جو مصنف نے سنہ ۱۹۵۱ء میں یوم سربید کے موقع پر سرسید میموریل بکچرس کے سلسلے میں

مسلم یونیورسٹی علی کٹھن میں چڑھا تھا۔ پروفیسر رشید احمد مدنی کی تحریروں میں بلاغت و دانش کے ساتھ

حکمت و دانائی کا ایسا گہرا ربط ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے ان کو اردو شہکار و کئی بے تکلفت کہا جاسکتا ہے چنانچہ یہ پھر بھی لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے موصوف کے قلم کی اس خصوصیت کے حامل ہیں اور جس صاحبِ ذوق کے پڑھنے کے لائق ہیں۔ اس پھر میں ایک جگہ ذکر ہے کہ سر سید نے شروع میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور پھر اس کو ترک کر کے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسا کہ پروفیسر مدنی نے بھی کہا ہے سر سید کا یہ فیصلہ نہایت دور اندیشی اور وقت شناسی پر مبنی تھا۔ اس سے اردو زبان کے ان کوتاہ اندیش اور نادان دوستوں کو جس قدر ہونی چاہیے جو آج کل اردو یونیورسٹی کے لیے شور مچا رہے اور حکومت سے اس کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اگر سر سید کے عہد میں مسلمانوں کے لئے پسندیدگی کا سبب ہو سکتا تھا تو آج یہ ان کی ہلاکت کا باعث ہو گا۔

بھاشا از سید شاہ یاقوت حسین صاحب قادری ایم اے۔ تعلقہ کلاں، ضخامت ۱۹۷ صفحات
 ٹائپ مٹی اور روشن۔ قیمت ۶/۰ پتہ: بیتِ اسادات (۱۳۸-۱۴۵) محلہ الادوہ بی بی حیدر آباد
 یہ کتاب جو تصوف کے فن پر ہے۔ چار ابواب پر تقسیم ہے۔ پہلے باب میں تصوف کے لفظ کی تحقیق قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت۔ اس کا مقصد اور صوفیا کا نظامِ اُدران کے طریقِ عمل اور اس کے سلسلوں پر ہے۔ دوسرے باب میں اللہ تعالیٰ کی صفت و جود و احدیت۔ اس کی معرفت اور مختلف عوالم پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں عشقِ الہی اور محبتِ نبوی۔ ان کے حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع اور ان کی تاثیر پر کلام کیا گیا ہے۔ چوتھا باب دنیا کی زندگی کی حقیقت دے ثباتی اور عالمِ آخرت کے فیوض و برکات کے ذکر کے لئے مخصوص ہے اس بنا پر نظری اور عملی دونوں اعتبار سے کتاب مفید ہے اور اس سے رجوع الی اللہ اور ترکِ ماسوا کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن تصوف بذاتِ خود بحیثیت ایک فن کا ایک نہایت پیچیدہ اور پرانیشب و فراز شاہِ راہ ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کے تمام مسائل و مسائل پر ابابِ شریعت کا اجماع نہیں ہو سکتا مثلاً وحدت الوجود و سماع اور قیام و وجد وغیرہ جیسے مسائل ہمیشہ مختلف رہے ہیں اور ابابِ شریعت کی ایک بڑی اکثریت ان کی مکرر ہی ہے۔ غافل

معنی جو عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی میں انہوں نے حتی الوسع اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود غلبہ شوق میں بعض جگہ ان کا قلم بے قابو ہو گیا ہے اور ایک غیر کی زندگی میں جو جامعیت ہوتی ہے جس کے باعث بے بڑا دی بھی نبوت کے مقام سے فروتر ہوتا ہے وہ صحت لگائی ہے۔ علاوہ ازیں زبان و بیان بھی متعدد مقامات پر اصلاح طلب ہے۔ بہر حال جو کچھ لکھا ہے حوالوں کے ساتھ اور کافی مطالعہ کے بعد نکال ہے اس لئے جو حضرات اس فن کا ذوق رکھتے ہیں یا فنی طور پر اس سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید اور معلومات افزا ہو گا۔

ہزار انجم ادب جناب مسلم ایگازوئی۔ تقطیع کلاں، منکحات ۲۲۶ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجدد ۵/۵ پتہ: بکستبہ جامعہ ملیہ، جامعہ گزنی، دہلی۔ ۲۵۔ اور: نیار دو کتاب گھر، بی۔ ۲۔

جناب محمد رفیق صاحب سلم جو ایک گاؤں (نامک) کے باشندہ ہیں۔ مہاراشٹر کے مسلمانوں میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوفیہ زندگی کا آغاز ایک لائق و قابل استاد کی میشت سے کیا اس کے بعد کاروبار کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ پھر وطن دوستی اور قوم پروری کا جذبہ و شوق پچھن سے تھا اس لئے ملک کی اہم سیاسی اور قومی تحریکات میں سرگرم شریک کار رہے۔ ان مشابہات اور سرگرمیوں کے باوجود موصوف کا پرگرواد شیریں کلام شاعر ہوتا ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ موصوف کا ملکہ شعر گوئی فطری، طبعی اور وہی ہے جس کو اپنے ریاضات اور

محنت سے انہوں نے جلا دی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب موصوف کا مجموعہ کلام ہے جو شعر کے جلا ادب کا مقام پر مشتمل ہے۔ شاعر کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے۔ اگرچہ وہ طرز قدیم کے پیرو ہیں لیکن عہد حاضر میں میں فن نے جو ترقی کی ہے اس کے اچھے اور پسندیدہ پہلوؤں سے بے خبر نہیں اس بنا پر کلام میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور توازن پایا جاتا ہے۔ نظم کا حصہ بہت متنوع ہے اس میں قومی، ملکی، مذہبی، معاشرتی، اخلاقی اور نیم پرلہر قسم کی نظمیں ہیں اس طرح غزل میں بھی حسن و عشق کے علاوہ اور معنائیں بھی بیان ہو گئے ہیں۔ زبان کی صحت کا بڑی حد تک خاص خیال رکھا گیا ہے۔ تراکیب عام طور پر چست ہیں۔ کلام میں وزن و گلاز کے ساتھ محنت و درنائی اور چھان بینی کا عالم تسامی ہر شے میں۔ ادیبان ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کو اس سے مسرت ہوگی۔

اس کی سہیلیاں

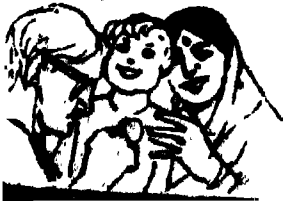
20 MAR 1972

راز کو



سیتا اپنے خاوند اور بچوں کے تئیں اپنے فرض کو
پہنچاتی ہے۔
وہ جانتی ہے کہ موت سرت کی گئی ہے۔

بچوں کی پیداائش میں وقفہ ہونے پر۔



انعامہ جانچ پڑتال کے لئے وہ بچوں کو
نریا تری مستی مرکز میں لے جاتی ہے۔

خاوند کی طرف سے ہر قسم کا
دبا جاتی ہے۔

بچے صحت مند ہوتے ہیں
میں سندست رہتی ہے۔

اس کی سہیلیاں اس پر اور اس کے گھنے پر رشک کرتی ہیں۔

ہم درد کا ایک نیا تحفہ

لحیہ

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزاء کا زندگی بخش مرکب عرق،
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے



LACTOGENA



LACTOGENA

نمینہ صحت مند زندگی پیدا کرتا ہے اور ان تمام حالتوں میں
مفید ہے جو مردوں اور عورتوں میں کمزوری کے سبب پیدا ہوتی ہیں
جیسے گھریلو زندگی میں اکٹھا ہٹ یا بیزاری، جسمانی اور
دماغی کاموں میں ٹھکن یا کام میں جی نہ لگنا، بدن میں شستی،
ہاتھ پاؤں میں لرزش، سانس پھولنا،
چہرہ زرد ہو جانا اور طبیعت میں پرمردگی وغیرہ۔

نمینہ بہت تیزی سے اعضائے رفیعہ اور تمام
جسمانی نظام پر اثر کرتا ہے۔ یہ اعلا درجہ کا مقوی و
تحرک ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد دور کرتا ہے۔

ہم درد



سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

اُردو زبان میں
ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار دارالحدیث کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۷۸۴۲ ہیں۔
پہلے اولیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی متفقہ تشریح و تفسیر

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف، زالقیم، اصحاب القریۃ، اصحاب البیت، اصحاب الکس، بیت المقدس اور یثرب، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجوہر، ذوالقرنین اور تپہ سکندری، سبا اور یثرب، یوم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و متفقہ تفسیر
حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم ساٹھ روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت مکمل سٹاک تیس روپے۔ اُجرت فی جلد فیل پارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ بُرہان، اُردو بازار جامع مسجد، دہلی

عظیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس، بی بی میں طبع کرا کر دفتر پان سے شائع کیا

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دینی و علمی دینی نگاہوں سے



برہان

مرتب
سید احمد بک آبادی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس حکیم اثران کتاب میں الفاظِ شریفان کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ جہوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ ”لغات قرآن“ کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے پڑی سکتے ہیں۔ نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد	پانچ روپے	مجلد چھ روپے
جلد دوم	۳۲۶	•	پانچ روپے	•	چھ روپے
جلد سوم	۳۳۲	•	پانچ روپے	•	چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	•	چھ روپے	•	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	•	آٹھ روپے	•	نہروپے
جلد ششم	۲۲۴	•	پانچ روپے	•	چھ روپے
(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)					

پیشہ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۶۸	صفر المظفر ۱۳۹۲ھ مطابق اپریل ۱۹۷۲ء	شمارہ ۴۴
--------	------------------------------------	----------

- ۱۔ نظرات سید احمد اکبر آبادی ۲۱۸
- ۲۔ رسالہ کشف الاذکار از شاہ شریف (ما قبل ۱۰۹۳ھ) ۲۲۵
- ۳۔ نصاب زکوٰۃ اور صاع کی تحقیق ۲۳۹
- ۴۔ معظم کی مشنیاں بہ تصحیح و تقدیم مولانا ڈاکٹر ابوالفرح محمد خالدی صاحب حیدرآباد ۲۴۹
- ۵۔ ہندو مذہب اور مسلمان ۲۶۲
- ۶۔ آثار نبی یا افکار نبی از جناب قطب الدین بختیار صاحب حیدرآباد ۲۷۶
- ۷۔ تبصرے س ۲۸۴

نظرات اردو یونیورسٹی

گزشتہ اشاعت برہن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک کتابچہ "علی گڑھ ماضی و حال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جیسا کہ پروفیسر صدیقی نے بھی کہا ہے۔ سرسید کا یہ فیصلہ (اردو کو ترک کر کے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا) نہایت دور اندیشی اور وقت شناسی پر مبنی تھا۔ اس سے اردو زبان کے ان کوتاہ اندیش اور نادان دوستوں کو عبرت ہونی چاہئے جو آج کل اردو یونیورسٹی کے لئے شور مچا رہے ہیں اور حکومت سے اس کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا اگر سرسید کے عہد میں مسلمانوں کے لئے سپاندگی کا سبب ہو سکتا تھا تو آج یہ ان کی ہلاکت کا باعث ہو گا۔

ہمارے لکھنا تھا کہ بس غضب ہو گیا۔ نکتہ چین دوستوں نے خطوط کی بھرمار اور سوالات کی بوجھار کر دی اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ذرا کھل کر گفتگو کی جائے اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ چنانچہ اردو کا بھی نہیں ہے اور آج بھی اردو زبان کی شاعری افسانہ نگاری اور تحقیق و تنقید کے میدان میں غیر مسلم حضرات کا حصہ کچھ کم نہیں ہے لیکن یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اب اردو جو کچھ بھی ہے عللاً مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ دیکھیے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی کلاسوں میں غیر مسلم طلباء کی کیا تعداد ہوتی ہے؟ اردو اخبارات کے پڑھنے والوں میں ہندوؤں اور سکھوں

کا تناسب کیا ہے؟ اس بنا پر اردو یونیورسٹی کا مسئلہ خالص مسلمانوں کا تعلیمی مسئلہ ہے اور ہم کو اسی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لینا چاہیے کہ اردو یونیورسٹی کے قیام سے مسلمانوں کو تعلیم کے اغراض و مقاصد کے پیش نظر نفع پہنچے گا یا نقصان؟ وہ ملک میں دوسرے طبقات کے ساتھ ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکیں گے یا پیچھے رہ جائیں گے؟ آئیے اب اس پر غور کریں۔

جو حضرات اردو یونیورسٹی کے قیام کے نہ صرف حامی بلکہ اس کے محرک اور داعی ہیں ان کے دلائل یہ ہیں:-

۱۔ نفسیاتِ تعلیم کا سلسلہ اصول ہے کہ کسی ایک مضمون کو ایک طالب علم جس اعتماد اور وثوق کے ساتھ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے کسی اور زبان میں نہیں سمجھ سکتا۔

۲۔ ہندی اور ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم نہ ہو۔

۳۔ اردو ایک ترقی یافتہ علمی زبان ہے اور اس میں علوم جدید کا ترجمان بننے کی صلاحیت خاطر خواہ اگر نہیں تو حسب ضرورت یقیناً ہے۔

۴۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے وہ کامیاب رہا ہے اس سے اچھے نتائج پیدا ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں دارالترجمہ حیدرآباد نے جو کام کیا ہے وہ ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔ بس یہی چار باتیں ہیں جو ہمارے حریف الٹاٹلٹ کر کہتے ہیں۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر نمبر وار کلام کر رہے ہیں۔

۱۔ مادری زبان میں تعلیم بے شبہ زیادہ مفید اور نفع بخش ہوتی ہے لیکن مطلقاً نہیں بلکہ صرف ابتدائی یعنی پرائمری اور سینڈری ایجوکیشن کے مرحلہ تک اس کے بعد علوم و فنون کی تعلیم لامحالہ اس زبان میں ہونی چاہیے جس کی آغوش میں

علم و فنون نے جنم لیا اور ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ کیونکہ ہر علم و فن کی مصطلقی اپنے ساتھ چند درجہ لغتورات اور معنوی کیفیات کی ایک ایسی دنیا رکھتے ہیں کہ دور کوئی زبان (جب تک اس کی ہی طرح ترقی یافتہ اور سمہ گیر نہ بن جائے) معنی و معہوم کی تمام وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتی۔ ہندوستان کے فن میں ایسی زبان صرف انگریزی ہے جو دنیا کی نہایت عظیم الشان نہایت وسیع اور بلند پایہ زبان ہے اور جس نے علوم جدیدہ اور سائنس اور ٹکنالوجی کے جن کھلانے میں اس درجہ اہم رول ادا کیا ہے کہ فرانسیسی اور جرمنی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو اس کے ساتھ ہمہ پری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ برصغیر میں پرانی نس کے اکابر علم و فن سب دہا تھے اور ان میں کچھ اب بھی ہیں جو انگریزی کے ذریعہ اپنے اپنے فن کی تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے اور اب آج کل کی موجودہ نسل میں جن نوجوانوں نے تعلیم میں امتیاز حاصل کیا ہے وہ بھی سب دہا ہیں جنہوں نے اگر اپنے ملک میں نہیں تو باہر جا کر ان علوم کی تعلیم انگریزی میں حاصل کی ہے جن نوجوانوں کو اس کا اتفاق نہیں ہوا ان میں تعلیمی امتیاز انہیں کے حصے میں آتا ہے جنہوں نے ابتدائی تعلیم انگلش اسکول میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم میں بھی انگریزی ان کا ذریعہ اظہار رہی ان وجوہ کی بنا پر اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں مادری زبان پر اصرار کرنا ہرگز تعلیم کے حق میں مفید نہیں بلکہ مضرب ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے مادری زبان سمجھنے کی بات بھی اب ایک فریب ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اب مسلمان بچے اور بچیاں بہ نسبت اردو کے ہندی زبان میں زیادہ اچھی طرح بول لیتے اور لکھ سکتے ہیں جو اونچا طبقہ ہے وہ مغرب زدہ ہے اس کے ہاں نہ اردو کا گزر ہے نہ ہندی کا۔ اسے اس پر فخر ہے کہ اس کے بچے آج کل کے گریجویٹ سے بھی اچھی انگریزی بولتے ہیں۔ اس وقت اردو کے مادری

زبان ہونے کا بھرم جو کچھ بھی ہے۔ پرانی نسل کے دم سے قائم ہے بس پچیس برس کے بعد اردو بولنے والے آئے میں نمک کے برابر ہو کر رہ جائیں گے جن گھرانوں میں اب بھی اردو بولی جاتی ہے ان کے نوجوانوں کا یہ عالم ہے کہ شاعروں کی زبان نہیں سمجھ پاتے۔ اردو میں خط تک نہیں لکھ سکتے۔ یہ انقلاب بڑی تیزی سے مہم ہا ہے اور اب اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

جی ہاں ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں تعلیم کا ذریعہ بن رہی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھ لیجیے کہ تعلیم کی کیا گت بن گئی ہے۔ پورا ملک چیخ رہا ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کیجیے تو طلباء میں موجود ذہنی انتشار و پرہیزگاری کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو انگریزی آتی نہیں، انگریزی میں پڑھتے نہیں۔ لکچر ہندی یا کسی علاقائی زبان میں سہتے ہیں۔ یہ زبان مضمون کو دلچسپ طریقہ پر طالب علم کے ذہن نشین کرنے سے قاصر رہتی ہے اس لئے طالب علم کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی سرگرمیوں کے لئے دوسرے میدان تلاش کرتے ہیں۔ ورنہ جس طالب علم کو اپنے مضمون میں حفظ اور لطف آنے لگے ناممکن ہے کہ وہ کسی دوسری طرف کا رخ کرے۔ پھر ارباب حکومت، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبر، لیڈرانِ کرام اور قوم کے نیا جو پبلک میں ہندی کا پرچار کرنا اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں ذرا یہ دیکھیے کہ خود ان کی اولاد بھی کیا ہندی کے ذریعہ تعلیم پا رہی ہے؟ ان میں آپ کو بہت سے ایسے گئے کہ ہندی کا کیا ذکر؟ ان کی اولاد ہندوستان میں نہیں۔ امریکہ یا یورپ میں تعلیم پا رہی ہے۔ اے کاش ملک کے غریب اور عوام محسوس کر سکتے کہ تعلیم کے میدان میں سرمایہ داری کی چونک کس بری طرح ان کے بچوں کا خون چوس رہی ہے۔

۲۔ وہی عثمانیہ یونیورسٹی کی بات! تو یہ صرف خوش فہمی اور اپنے ساتھ غیر معمولی حیرت ہے کہ وہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا جو تجربہ کیا گیا وہ کامیاب

رہا۔ حق یہ ہے کہ ہرگز کامیاب نہیں رہا اور اس سے مسلمانوں کو علوم و فنون اور سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں پیش قدمی کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ اس یونیورسٹی نے علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں جو افراد و اشخاص قابل ذکر اور ممتاز پیدا کئے ہیں وہ سب وہ ہیں جنہوں نے باہر کے ملکوں میں تعلیم کی تکمیل کی اور وہاں سے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ دارالترجمہ کا جو کام ہے اس کو علمی حیثیت سے ہرگز معیاری کام نہیں کہا جاسکتا، وہی ایک کتاب ہے اس کو اصل انگریزی میں پڑھیے تو لطف آتا ہے اور اس کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی، لیکن اسی کو اردو میں پڑھیے تو طبیعت جگہ جگہ رکتی اور متوحش ہوتی ہے ادکبر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ وضع اصطلاحات کا کام مولوی وحید الدین سلیم کے سپرد کیا گیا جو بڑے مولوی اور اردو کے شاعر اور ادیب تھے اور انگریزی زبان اور علوم جدیدہ سے نا آشنا، چنانچہ ان کی فرنگ ارباب علم کے لیے چین کی دیوار قہقہہ بن کر رہ گئی ہے۔

مسلمانوں کو جذبات پسندی سے الگ سمجھ کر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا وجہ تھی جس کے باعث سرسید ایسے حکیم دانا اور اردو کے عظیم محسن نے اردو کو ترک کر کے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا اور کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ان کا یہ فیصلہ نہایت دانش مندی اور عاقبت شناسی پر مبنی تھا۔ سرسید کو اپنے زمانہ میں جو مقام حاصل تھا۔ جہاں تک اردو زبان کے معاملات و مسائل کے فہم کا تعلق ہے وہی مقام آج پروفیسر رشید احمد صدیقی کو حاصل ہے جو اردو برادری کے سب سے بڑے بزرگ

اد حکیم دانا ہیں اور وہ بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سخت مخالف ہیں، جس کا اظہار مذکورہ بالا لکچر میں انہوں نے کھل کر کیا ہے۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کو خوش کرنے اور اردو کے اصل مسائل سے ان کی توجہ کو ہٹانے کی غرض سے اردو یونیورسٹی نام کی کوئی چیز قائم کر بھی دی تو اس کا انجام کیا ہو گا؟ جب ہائی اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم نہیں ہے تو اس یونیورسٹی کے لیے طلباء کہاں سے آئیں گے؟ اور آئیں گے بھی تو جب اردو میں علوم جدیدہ اور سائنس ملنا بوجی کی کتاب میں ہی نہیں تو پڑھیں گے کیا اور جب اردو میں ان علوم کی اصطلاحات ہی نہیں ہیں تو اساتذہ اردو میں سمجھائیں گے کس طرح؟ اور یہ سب کچھ بھی ہو گیا تو اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ملک میں کیا مستقبل ہو گا؟ ان کی علمی استعداد کیا ہو گی اور حکومت کے دفاتر میں ان کی کھپت کیونکر ہو گی؟

اردو کی ترقی اور حفاظت اس کی ترویج اور استحکام کے لیے کرنے کے بیسیوں اہم اور ضروری کام ہیں جنہیں سونا چاہئے۔ لیکن اس کی طرف نہ کسی کو توجہ ہے اور نہ ان کے کرنے کا حوصلہ و ہمت ہے۔ لیکن اردو یونیورسٹی جو سرتاسر لغو اور بیہودہ واہمہ ہے اس کے لیے ایجنڈا پیش کرنے کا حوصلہ ہر ایک میں ہے۔ یہ صورت حال حد درجہ افسوسناک اور مسلمانوں کے مستقبل اور خود اردو زبان کے استحکام و بقا کے لیے نہایت افسوسناک اور مایوس کن ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم میں تعمیری کام کی صلاحیتیں مفقود ہیں اور ہم نے جذبات کے کھوڑوں سے دل بیلانے پر قناعت کر لی ہے فاہاثر آفاہاثر آھا،

پتہ کی تصحیح

گزشتہ اشاعت برہان میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا جو جدید
پتہ درج کیا گیا تھا۔ اس میں ان کی رہائش اور دفتر کا پتہ غلطی سے
غلط ملط ہو گیا ہے اس لیے صحیح پتہ اب شائع کیا جاتا ہے ازراہ
کرم اسے نوٹ کر لیجیے۔

دفتری پتہ یہ ہے:-

INSTITUTE OF HISTORY OF MEDICINE
AND MEDICAL RESEARCH

NEW DELHI 62

مکان کا پتہ :-

سمہر د فلیٹ۔ پل پہلاد۔ بدر پور۔ نئی دہلی — ۴۲

برہان کے سلسلے کے خطوط جو مقالات و مضامین سے متعلق ہوں۔
اور خود مقالات یہ سب موصوف کے نام سے دفتر برہان کے پتہ
پر آنے چاہئیں۔

(منیجر)

ادارہ کی فہرست کتب اور برہان کا نمونہ طلب فرمائیے

رسالہ کشف الازکار

از

شاہ شریف - ب۔ ماقبل ۱۰۹۳ھ

جناب ڈاکٹر نورا السعیدہ اختر مبینی

قدیم اُردو کا بیشتر سرمایہ جس کا تعلق دبستان بیجا پور سے ہے تصوف کے سردی نعموں سے معمور ہے۔ اس مکتب کی داغ بیل شاہ میراں جی شمس العاشق (موتی ۱۰۹۳ھ) کے ہاتھوں پڑی اور اُن کے خلفاء نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ مذہب اسلام کی توسیع و اشاعت اُن کا خاص مطمح نظر تھا لہذا انہوں نے اپنی تعلیمات کو دور دراز حصوں تک پہنچانے کی غرض سے عوامی فضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام بول چال کا سہارا لیا اور اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کافی سرمایہ یادگار چھوڑا۔ جہاں پر اس سلسلہ کے کئی صوفیوں کی منظوم و منثور تصانیف در سائل کا ہیں علم ہر چکا ہے ذیل کی سطور میں شاہ شریف اور ان کی مثنوی کا تفصیلی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ شاہ شریف کے حالات زندگی کا ہمیں پوری طرح علم نہیں ہے۔ مثنوی کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے۔

”اس رسالہ کشف الازکار است تصنیف شاہ شریف“

منہرہ بالاجلے اور مثنوی کے مقطع کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا نام اور تخلص شریف تھا اور اُن کے صوفیانہ مرتبہ کی مناسبت سے ”شاہ“ کے لقب

کا اضافہ اُن کے نام کے ساتھ کیا گیا تھا۔ نصیر الدین ہاشمی نے عادل شاہی دور کے انتہی شعراء اور اُن کی تصانیف کی فہرست مرتب کی ہے اس میں شاہ شریف اور اُن کی تصنیف کا ذکر نہیں ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاہ شریف ایک بلند مرتبہ صوفی بزرگ اور سلجھے ہوئے شاعر تھے۔ انھیں شاہ برہان جاتم اور اُن کے خاندان والوں سے خاص عقیدت تھی۔

اس مثنوی کے جذباتی رائے میں جن کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاہ شریف نے حضرت جاتم سے براہِ راست ہدایت نہیں پائی بلکہ اُن کا عہد حضرت امین الدین اعلیٰ متوفی ۷۸۵ھ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثنوی کا شعر نمبر (۱۳۹) اس امر کی واضح دلیل پیش کرتا ہے۔

کہے شیخ محمود اول فارسی شریف صاف دکھنی کیا آرسی
شاہ شریف نے اپنے فارسی ماخذ کی طرف صاف طور سے اشارہ کیا ہے۔ یہاں پر محققاً یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شاہ شریف کون تھے اور اُن کا عہد کیا تھا؟ جنوبی ہند میں شاہ محمود، شیخ محمود اور صرف محمود تخلص اور نام والے کئی بزرگ گزرے ہیں۔ اس نظم میں شاہ شریف نے حضرت جاتم کے فوراً بعد شیخ محمود اور اُن کی فارسی تصنیف کا ذکر کر دیا ہے۔ لہذا اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شیخ محمود شیخ محمود عین الحق خوش دہاں محمد آبادیؒ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔

۱۔ دکن میں اردو : از نصیر الدین ہاشمی پبلیکیشن ص ۱۸۳

۲۔ سبکس : دسمبر ۱۹۷۱ء مضمون از فہیدہ بیگم رورق ۱۳۱ ابن الدین اعلیٰ مستحق

ربانی (۱۰۸۵ھ)

۳۔ سکھ انجن :- شاہ ابوالحسن قادری : — مرتبہ ڈاکٹر سیدہ

جعفر۔ صفحہ ۲۶-۲۷۔

شیخ محمود خوش دہاں شاہ ابوالحسن قادری کے حقیقی بھانجے تھے۔ آپ کے والد کا نام فتح داؤد تھا۔ جو اپنے شہر شاہ بدرالدین حبیب اللہ کے بڑے معتقد تھے۔ بجاپور کے اکابر صوفیاء میں آپ کا شمار تھا۔ قادریہ اور چشتیہ دونوں سلسلوں سے آپ کو بیعت حاصل تھی۔ آپ نے چونکہ حضرت جالتم سے فیوضِ ظاہری اور باطنی پائے تھے اس لئے آپ کو ان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی روحانی تربیت کی بنا پر آپ نے بجاپور میں بہت سے شاگردوں اور مریدوں کو علم باطنی کی دولت سے مالا مال کیا۔ ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۱۶ء کو آپ نے وصال فرمایا اور حضرت جالتم کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے شیخ محمود خوش دہاں کو صاحب تصنیف و تالیف ثابت کیا ہے۔ ان کی دو تصانیف "معرفت السلوک" اور "رویت الحق" دستیاب ہیں۔ شجرات میں شیخ محمود خوش دہاں کے نام کے ساتھ "بلطفِ محبوب" کی ترکیب بھی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر صوف لکھتے ہیں کہ "آپ فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں صاحب تصنیف ہیں آپ کے کئی رسالے ملتے ہیں۔۔۔۔۔ حضرت محمود خوش دہاں نے حضرت جالتم کے صاحبزادے حضرت امین الدین اعلیٰ کی تعلیم و تربیت میں بھی حصہ لیا ہے۔"

ان حقائق کے پیش نظر اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ شاہ شریف نے حضرت محمود خوش دہاں کے کسی فارسی رسالہ کو دکنی جامہ پہنایا۔ اس طرح تقریباً پونے مشنوی حضرت شیخ محمود کی فارسی نظم کا ترجمہ ہے اور باقی ماندہ چھپتر اشعار شاہ شریف کی تخلیق ہیں۔ چنانچہ شاہ شریف کہتے ہیں :-

۱۔ قدیم اردو مجلد اول ۱۹۶۹ء ص ۲۹۳ (ادر) قدیم اردو، دودھ دم جلد اول ۱۹۶۹ء ص ۲۷۰۔

۲۔ ایضاً۔

اول کا سبب یو مطلب تمام بحق محمد علیہ السلام [۱۵۱]
 شاہ شریف کو ایک مرشدِ کامل کی تلاش تھی۔ لہذا انھیں شاہ امین الدین اعلیٰ
 جیہ مرشدِ کامل مل گیا۔ شاہ شریف نے حضرت امین الدین اعلیٰ کو اپنے وقت کا بے نظیر
 دے عدیل قطب اور روشن ضمیر بزرگ بتایا ہے۔

زمانے کے ہے او قطب بے نظیر اسے شاہ بابا سوروشن ضمیر (۱۵۲)
 پھر ایک داعی کی حیثیت سے شاہ شریف دیگر سالکانِ طریقت کو اس بات کی
 تنبیہ کرتے ہیں کہ شریعت اور طریقت کی راہوں پر گامزن رہنے کے لئے دراصل
 مرشدانِ کامل کی رہبری ضروری ہے۔ گندم کا جو فروش پیرانِ کامل کی حیثیت نیم حکیم کی
 سی ہوتی ہے۔ ان کی رہنمائی سالک کو گمراہ کر دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے طبیبِ خام
 کے علاج سے مریض کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ شاہ شریف کے الفاظ یہ ہیں کہ
 طبیبِ خام سوں ہوئے جو کا زیاں ہوئے خام مرشدوں نقصانِ ایمان (۱۶۲)
 اس تنبیہ کے بعد انھیں اس بات کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اور
 کو اس قسم کی ہدایات کر رہے ہیں۔ حقیقت میں انھیں باری تعالیٰ کا سجدہ شکر بجالانا چاہئے
 کیونکہ انھیں امین الدین اعلیٰ جیہ پیرِ کامل مل گیا۔ جس کے گھر کا ہر فرد برگزیدہ بزرگ
 ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

نچے کام کیا کس سوں توں شکر کر جو دکھلایا حق تجہ کوں ایسا گھر (۱۶۲)

رسالہ کشف الازکار کے تفصیلی مطالعہ سے دو محققین کے بیانات کی تردید
 ہوتی ہے۔ پروفیسر عبد القادر سرفراز مرنب فہرست مخطوطاتِ اردو، فارسی اور عربی
 جامعہ ممبئی نے اس رسالے کا تعارف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس نظم کی تخلیق کے
 وقت شاہ برہان الدین جاتم بقیدِ حیات تھے۔ مضمون نگار کے نزدیک پروفیسر
 موصوف کا یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ شاہ شریف نے اس نظم میں شاہ

اور گنبد کی نشانی کا ذکر کیا ہے۔

مقام ہے اُونو کا بجا پور کن نشانی ہے گنبد کے شہر پور کن
علاوہ ازیں شاہ شریعت نے شاہ امین الدین اعلیٰ کی بلند مرتبہ شخصیت اور ان
سے براہ راست کسب فیض کا ذکر کیا ہے۔ انھیں ایمان کی صراطِ مستقیم شاہ امین الدین
اعلیٰ ہی کے توسط سے حاصل ہوئی تھی ان کا کہنا ہے۔

یہ کفر اور دوہر گمان کا کئے راست ایمان منجھ عطا (۱۲۶)
دوسرا بیان پر دفسیر اکبر الدین صدیقی صاحب کا ہے۔ انھوں نے قدیم اُردو
(۱۹۷۱ء) میں حضرت جاتم کے اقتباسات سے معمور رسائل کی فہرست دی ہے
جس میں انھوں نے کشف الاذکار کو بھی شمار کیا ہے حالانکہ اس نظم میں حضرت جاتم
کی تعانیف سے کوئی اقتباس موجود نہیں ہے۔

کشف الازکار کا موضوع :- مصنف کے نام اور ان کے مسلک سے صاف
ظاہر ہے کہ اس رسالہ کا موضوع تصوف کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا، چنانچہ
مصنف نے اپنے اس مختصر سے رسالہ میں خدا کی حمد و ثنا اور رسول کی نعت و منقبت
بیان کرنے کے بعد تصوف و سلوک کی بعض بنیادی باتوں کو اپنے مخصوص رنگ
میں واضح کیا ہے۔ بتایا ہے کہ جب خدا نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو یہ دونوں
عالم وجود میں آئے۔ سالک کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ذکرِ الہی میں مصروف
رکھے، چاہے وہ ذکرِ خفی ہو یا صلی، یہ ذکر سالک کے لئے خدا تک پہنچنے کا راستہ کھول
دے گا اور وہ منزلِ ناسوت و منزلِ جبروت سے بہتا ہوا منزلِ لاہوت میں قدم
رکھے گا اور شاہد و مشہود ایک ہو جائیں گے۔

آہن میں سالکانِ راہِ حق کو نصیحت کی ہے کہ میری باتیں کان دھر کر سنو اور اگر واقعی خدا تک پہنچنا ہے تو کسی صاحبِ دل کا دامن تھامو کیونکہ بغیر مرشد کی رہبری کے کوئی صحیح راہ کو پا نہیں سکتا۔

لسانی خصوصیات :- اس کی لسانی خصوصیات تقریباً وہی ہیں جو عام طور پر اردو دکنی تخلیقات کی ہوتی ہیں، زبان سادہ اور رواں ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ مرہٹی الفاظ بھی روپ بدل کر جگہ جگہ موجود ہیں۔ بقوت کی عام اصطلاحات کو واضح کرنے کا انداز بھی بڑا پیارا ہے ان لغوی خصوصیات کے علاوہ صوتی خصوصیات بھی تقریباً وہی ہیں جو دکنی کا اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ ہر کاری آوازوں کو سادہ آوازوں میں بدل دیا گیا ہے جیسے تجھے : تجھے کو : کوں، تو بچ : تو بچ، نام : نانوں وغیرہ۔ مصوتے بھی مختلف الفاظ میں بدلی ہوئی شکل میں ملتے ہیں۔ جیسے مانگنا = منگنا، بہت = بھوت وغیرہ۔

مخطوطے کا تعارف :- عبدالقادر سرفراز مرتب نہرست مخطوطات اردو فارسی اور عربی جامعہ بمبئی نے مخطوطہ نمبر ۳۶ سلسلہ نمبر ۵۹ میں سات چھوٹے بڑے دکنی اور فارسی رسائل کا محقق تعارف پیش کیا ہے۔ یہ رسالے ایک ہی جلد میں شریز بند ہیں۔ کسی کسی جگہ یہ مخطوطے کرم خوردہ ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے :-

- ۱۔ تحفۂ نساخ از یوسف ابوالفتح
- ۲۔ کریا سجدی از سجدی (شریازی)
- ۳۔ تاج الحقائق از وحشی۔ کتابت جان محمد مخرمی چشتی متوفی ۱۲۳۵ھ

لہ دی ڈسکرپٹو کٹلاگ آف اردو، پرشین اینڈ اربیک سنکرپٹس از عبدالقادر سرفراز، جامعہ بمبئی ۱۹۳۵ء

سبکدوش گیتا کا فارسی ترجمہ کتابت جان محمد عمری حشتی موتنی

۴۔ مرآۃ الحقائق

۵۔ رموزات

؟

شاہ شریف قبل ۱۰۹۳ھ

۶۔ کشف الاذکار

از نظام الدین اولیاء

۷۔ رسالہ ہدایت الطریقہ

؟ کتابت جان محمد عمری حشتی موتنی ۱۰۹۳ھ

۸۔ مرآۃ المحققین

رسالہ کشف الاذکار میں (۲۱۲) اشعار ہیں۔ ہر صفحے پر اُنیس شعر ہیں۔ خط نستعلیق

ہے۔ اور تاج الحقائق، مرآۃ المحققین سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا کتاب بھی جان محمد عمری حشتی موتنی ۱۰۹۳ھ ہی ہے۔

نظم کا خلاصہ :-

رسالہ کشف الاذکار کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے ۷

اول بسم اللہ بول تجبوں سرانوں ۱ کہ رحمن ہے سہر رحیم تیرنا تون

سہی الحمد للہ ثنا بے شمار ۲ سزا دار تجبوں تون پروردگار

جو ہے رب العالمین تو بچ ایک ۳ کہے پرورش تون دو عالم کون دیک

تون رحمن ہے رزق کا دینھار ۴ مسلمان کافر کون دنیا کے بھار

مسلمان کون عاقبت تون رحیم ۵ دیسے بہشت کا فراں کون جہیم

(۱ تا ۵ بہ اعتبار مخطوط)

شعر نمبر ۲ تک خدائے پاک بے نیاز کی حمد ہے۔ اس کے بعد نعتیہ اشعار ہیں

اور ان میں نور محمد کے بیان کے علاوہ شہود، شاہد اور مشہود وغیرہ کی وضاحت

موجود ہے ۷

۷ جان محمد عمری حشتی، معنون از اکبر الدین صدیقی :- اردو نامہ گراچی جنوری ۱۹۷۲ء ص ۷۷

وہی ہے تعین سواؤں ظہور ۶ وہی آرسی ہے محمد کا نور
 علم نور شہود ہور وجود بوجہ ۷ برابر ہے سب نور کے حال بھار
 زمیں ہور افلاک قدرت جیتی ۸ اسی تھی ہے ظاہر رعبہ سیتی
 اسی نور کی آرسی میں اول ۹ صفت ذات مجمل جو پاتا سنگل
 تون پاتا ہے جس وقت پس آپ کوں ۱۰ عاشق ہے اپنا اپی آپ سوں
 یہی ذکر ستری ہے با حال نور ۱۱ جو عاشق اُسی ذکر سوں ہوئی حضور
 ہی اس مرتبے تھی تعین دوم ۱۲ کیا ہے جو عیان ثابت ہجوم
 پس میں اپی تون جو تفصیل سمات ۱۳ کھی پاتا ہے اپنا صفت ہور ذات
 جو میں علم میں نور ہور میں شہود ۱۴ نہیں ہے میرے غیر کون کج وجود
 تون اس مرتبے کے جو آرس بھتر ۱۵ سوا دیکھا شاہد آپس آپ پر
 تون شاہد سوا جب جو آپس آپ سوں ۱۶ تون شاہد و شہود بھی ہے سو تون
 اشارت بھی ہے روحی ذکر سوں ۱۷ کس عارف اس میں نبوت فکر سوں
 تون اپنی صورت پر جو ناظر سوا ۱۸ تون محشوق عاشق سوا حاضر سوا
 پس کی صورت کا ہے عاشق ہے تون ۱۹ نہ دیکھیا پس باج ہی کس سوں
 تصور خیالات سوں اپنے کیا ۲۰ کہ ظاہر گردوں میرے باطن سوں لیا
 یہی ذکر قلبی ہے تج قلب میں ۲۱ اشارت ہے اس قلب کے ذکر میں
 عیاں کا جو دوسا پس میں کیا ۲۲ تو باطن فی ظاہر میں صورت دیا

(۲۹ تا ۵۵)

دو عالم یں ظاہر ہوئے آشکار ۲۳ جو ذکر طبعی ہے یہی نام دار
 خدا کا ظہور ہے یوں ذکر اس سو پنج ۲۴ کہ باطن فی لیا ہے یوں پنج گنج
 اے سالک اگر دل میں تون یوں ملے ۲۵ خدا کی کھولی باٹ تج پر انگے
 (۵۸ تا ۵۹)

اس کے بعد شاہ شریف یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ہر طریقے سے پایا جاسکتا ہے اور گمراہ لوگ
یاد الہی کے بغیر اپنی زندگی تباہ و برباد کر رہے ہیں، پھر کہتے ہیں ۵

نزدل ہے خدا کا خفی حال بھٹی ۲۶ تیرے طرف آیا بحال حبلی
تجے بھی عروج ہے حبلی ذکر سوں ۲۷ بنگے سیر کرنے خفی طرف توں

(۶۲ - ۶۳)

اس کے بعد ذکرِ روحی، ذکرِ ستری کی تشریح کی گئی ہے اور واضح کیا ہے کہ ذکرِ الہی
کس طرح کیا جائے تاکہ قلب کا گوشہ گوشہ نور کی تجلی سے منور ہو سکے۔ ذکرِ الہی کا ہر لمحہ
درِ زبان رہنا ضروری ہے۔ ۵

تو کہ اللہ اللہ ہر رات دن ۲۸ نہ غافل اچھی ذکرِ سحر اُس کہ میں

(۷۱)

ذکرِ الہی کے شغل کے بعد ایک حد الہی آئے گی کہ سالک منزلِ ناسوت تک پہنچ جائیگا
اور اس جگہ اس پر یادِ حق کے سوا سب کچھ حرام ہو گا۔ ۵

تو منزلِ ادب کا جو ناسوت نام ۲۹ بجز یادِ حق تج پہ ہو گا حرام

(۷۷)

سالک کے لئے اس کے بعد منزلِ ملکوت ہو گی۔ یہیں پر اُسے عفا کا میدان نظر
آتا ہے اور سالک کو رُوحِ قدسی کی کو لگ جاتی ہے۔ ۵

تو شام ہمیشہ دل پر جو رہے ۳۰ وہاں رُوحِ قدسی سونچے ہوئے ہے

(۸۵)

رُوحِ قدسی سے وصال کے بعد سالک منزلِ جبروت میں قدم رکھتا ہے اور اس
کے لئے اس منزل میں ہر دو عالم گم ہو جاتے ہیں۔ ۵

تو منزلِ ادب کا کہ جبروت نام ۳۱ جو وہاں ہر دو عالم ہوئے گم تمام

ہوئے عاشق پاک صادق یہاں ۳۲ پتنگ ہو پڑے جھوڑ پر ولے جان
(۸۶ - ۸۷)

مغز نور کے بیان میں لکھتے ہیں کہ ۷
یہاں منتخ جو کہ ظلمات جان ۳۳ تو شاہد ہے آبِ حیات اسمیں جان
(۹۰)

مغز نور محبی محمد ہے بیچ ۳۴ ادے ٹھاؤں ہستی کی ہے خاک بیچ
(۹۲)

روحِ قدسی کو عکس نور قرار دیتے ہوئے وہ نورِ حق کی اہمیت کاراز یوں
فاش کرتے ہیں ۷

یہاں ہوئی ظاہر محبت حضور ۳۵ کہ یو روحِ قدسی سو ہے عکس نور
خدا کا جو عشق آئے دل پر تجھے ۳۶ کھلے راز کے گنج کا در تجھے
نظروں کر یگا جو جس ٹھار پہ ۳۷ نہ دیے بجز نورِ حق تجے نظر
(۹۷ تا ۹۹)

ان حقائق کے واسطے کے بعد سالک کو منزلِ لاہوت کی راہ ملتی ہے ۷
او منزل تو پا گا کہ لاہوت نام ۳۸ تو اس ذکرِ سری سوں لے فون نام
(۱۰۲)

اس منزل کے بعد سالک کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور وہ خود کو ذاتِ الہی
میں ضم کر دیتا ہے ۷

خودی کون فنا کر ہوا اس میں نہاں ۳۹ خفی حال تجہر کروں میں سیاں
(۱۰۵)

خفی حال کے ذکر کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں ۷

شعورتوں جو دھرتا ہے دیکھتا ہونکر ۴۰ اودستا ہے منج اُس نظر کے بھتر
 یہی غیر ہے جان اُس عین باج ۴۱ فنا ہو خفی حال نیں کرتوں راج
 خفی حال سوں توں جو پاگا وصال ۴۲ تجھے قرب حق کا ہے داں بے زوال

(۱۰۸ - ۱۰۶)

قرب حق نصیب ہونے کے بعد سالک پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان
 سے اس کی زبان قاصر ہے۔

ہوئے اُس گنج مخفی میں گنج حال جو ۴۳ زبان گنگ ہوئے قبلے قابلِ او
 توں یوں وصل حق کا جو پاگ وصال ۴۴ ہووے ذوق اسکا کبھی تجکوں مدام
 (۱۱۳ - ۱۱۲)

اس بیان کے بعد شاہ شریف سالک سے مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ
 لے سالک گنج تجکوں بولیا ہوں اب ۴۵ نصیحت کے موتی پر دیا ہوں اب
 تو کر فہم اُس راز تہی حق کی باٹ ۴۶ تو ذراں سوں اُس جاسج باٹ کھاٹ
 دین بات اگر ہوش دھرتا ہے توں ۴۷ تو کر جوش اپس میں میرے پند سوں
 پکڑ دور یک صاحب دل کا جا ۴۸ کہ تا اد تجھے راہ لاوے سیدا
 (۱۱۴ - ۱۱۳)

شاہ شریف مرشدِ کامل کے حصول پر خاص طور پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے
 نزدیک اس کے بعد راہ معرفت کا طے کرنا ناممکن سا ہے۔ وہ یہاں اس بات کے مشاکی
 نظر آتے ہیں کہ ہر دور میں مرشدانِ کامل کا فقدان رہا ہے۔ لیکن وہ سالک کو تسلی و تشفی
 دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب بھی دل میں عشقِ حقیقی کا دلولہ پیدا ہوتا ہے تو از خود
 اُسے مرشدِ کامل تک پہنچا دیتا ہے تاکہ معرفت کی منزلیں اس کی راہبری میں
 طے کی جاسکیں۔

بجز مرشد نہ کوئی باٹ پائے ۴۹ خدا جس منگے اُس سیدھی راہ بلائے
 دلیکن کھان مرشداں کا ملاں ۵۰ کہ حق سوں ہوئے ادا چھ واصلان
 خدا جس وقت تیج ارادت کرے ۵۱ تو اس رہنما کیوں بجائے دھرے
 (۴۹ تا ۵۱)

شاہ شریف سالکانِ معرفت سے گویا اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل
 میں قربِ الہی کا خیال پیدا ہوا تھا نہ تو انھیں شاہ بُرہان الدین جاتمِ جلیا مرشدِ کامل
 مل گیا تھا وہ اپنے مرشدِ کامل کی خصوصیات کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں ۵
 تو آشاہ بُرہان کے دارُ اوپر ۵۲ کہ او سالکان کے جو ہے راہ پر
 شریعتِ حقیقت کے ہیں رہنما ۵۳ او کامل دلی عارفان کے ہے شا
 درست ہے صفت جو صلیبِ خدا ۵۴ دلی ولا پیروی مُصطفیٰ
 جلوئی ان کے دریک چہوسن آئے ۵۵ مراد او خدا کی پہچانت کی پائے
 ایسے خاص مرشد ہے او اس زماں ۵۶ او ختمِ الولی ہے در آخر زماں
 خدا نے کیا ظہران کو جو یاں ۵۷ کہ نفع او نوتہی لیوے مومناں
 اوپر ہے سرانے تہی اُن کا مقام ۵۸ پیغمبر کی خصلت ہے ان میں تمام
 ہوئے بختِ طالع مُنہج اس تے بلند ۵۹ جو پایا اُس انسانِ کامل سون پند
 مقام ہے او نو کا بجا پور کن ۶۰ نشانی ہے گنبد کے شہ پور کن
 کرم سون نظر شاہ دین جب کیا ۶۱ تو حق المیقین کوں او پونچا دیا
 مرے دل کے تانبے کوں او کیمیا ۶۲ کٹک فیض کا اس کیا جوں طلا
 (۱۲۵ تا ۱۳۵)

شاہ شریف نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے شاہ برہان الدین جاتمِ
 اور معرفتِ الہی کے پوشیدہ باتوں کی جو تشریح فرمائی ہے اُس کا بیان دراصل

شیخ محمود (عین الحق خوش دہاں) نے فارسی میں کیا تھا۔ اُس فارسی نظم کو شاہ شریف نے دکنی کی آرسی دکھائی۔ چنانچہ کہتے ہیں ۵۷
 کہے شیخ محمود اول فارسی ۶۳ شریف صاف دکھتی کیا آرسی
 (۱۳۹)

اس کے بعد تمام اشعار شاہ شریف کی تخلیق ہیں۔ ان کی تعداد چھٹڑ ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ۵۸

ادل کا ہوا سب یو مطلب تمام ۶۲ بحق محمد علیہ السلام
 (۱۳۹)

اتنا کہتے ہوئے شاہ شریف باری تعالیٰ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں ۵۹

اما حق کے ہیں شکر کا کچ بیاں ۶۵ ہوا پھر کہ واجب کروں کچ عیاں
 شکر کون تو حق کی نہ انت پار ہے ۶۶ ولے کچ بھی کہنا سزاوار ہے
 (۱۴۰ - ۱۴۱)

اس بیان کے فوراً بعد شاہ شریف۔ حضرت بُرہان الدین جامی کے فرزند حضرت امین الدین اعلیٰ کا ذکر چھڑ دیتے ہیں۔ ان اشعار میں اُن کا یہ اعتراف بھی موجود ہے کہ اُن کے ہادی و رہبر اور پیر و مرشد حضرت امین الدین اعلیٰ تھے ۶۰

جواو فرزند شاہ بُرہان الدین ۶۷ اتھے اُن کے بعد از خلافت نشیں
 او ہے اسم ظاہر جو شاہ امیں ۶۸ اتھے معشوقِ ربی العالمیں
 کیے کُفر او دور گمان کا ۶۹ کیے راست ایمان مُنہجر عطا
 رہے قادر پاک او مہرباں ۷۰ ہوا آپ ہادی اس منظر میں آن
 حقیقت میں ہادی لے حق ہے جاں ۷۱ ہے ظاہر محمد امین الامان

جسے آپ ہادی ادھوئے کریم ۷۲ تو دیا چھوئے رہنا مستقیم
زمانے کے ہے قطبِ ادبے نظیر ۷۳ اے شادِ بابا سوروشِ ضمیر
(۱۴۲ تا ۱۵۲)

اس کے بعد شاہ شرفتِ بارگاہِ الہی میں دستِ بدعا ہو کر کہتے ہیں ۷۴
دلے میں ہوں اندلا بھتِ ناتواں ۷۵ کرمِ سوں منجے دے رھانکیاں انکھیاں
(۱۶۷)

جو تجِ عشق کی آگ میں رہے قرار ۷۶ بھسم ہوئے سارا میرا اختیار
کنکِ دل کا کر رُوحِ سوں منجے ملا ۷۷ جلا تجِ چڑے رُوحِ منجے ہوئے طلا
(۱۶۲ - ۱۷۳)

ان اشعار کے بعد وہ آئندہ اشعار میں کی جانے والی مناجات کی شرفِ قبولیت
کے لئے دعا مانگتے ہیں ۷۸

تری ذاتِ مطلق کی حرمتِ سوں توں ۷۹ قبولِ کروتوں میری مناجات کوں
(۱۷۸)

اس کے بعد ۳۳ اشعار مناجات میں ہیں جن میں خدائے تعالیٰ کی مختلف صفات
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساکتھی ساتھ انہوں نے باری تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ
انہیں نفسِ آمارہ کی کنش سے دور رکھے۔ فتویٰ کا اختتام حسبِ ذیل اشعار پر ہوتا ہے ۸۰
سکت کوں نہیں کچ تیری انت پار ۸۱ خزانے ہے تج غیب کے بے شمار
اگر توں کرمِ سوں نوازے منجے ۸۲ کئی کیا خزانے میں ہووے تجے
گنہگار عاجزِ رزا دھار ہوں ۸۳ زار دھار کوں ہے سو آدھار توں
توں کر محض اپنی کرم کی نظر ۸۴ تیرے عشق کیئے سوں منجے مست کر
بحقِ محمد علی فاطمہ ۸۵ شرفتِ کا توں کر خیر سوں فاطمہ
(۲۱۰ تا ۲۱۴)

نصاب زکوٰۃ اور صاع کی تحقیق

(۲)

(از جناب حاجی احسان الحق صاحب بجنوری مرحوم)

تحقیقِ مد :- اب مد کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

۱۔ مولانا معین الدین صاحب کے پاس ایک مد ہے جس کا ظرف یا جوت ۸۷۷ سی سی ہے۔

۲۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے پاس ایک مد تھا جس کی سذبھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مد تک پہنچتی ہے۔ اس کا حوالہ جناب عبدالشاہ خاں شروانی انچارج عربی سکشن آزاد لائبریری نے دیا ہے۔ اس کے ابعاد ثلاثہ سے ظرف (اندرونی حجم) ۸۵ سی سی (۷۷) ہے جو تقریباً وہی ہے جو مولانا معین الدین کے پاس ہے، لیکن دونوں کے ابعاد ثلاثہ میں اس طرح فرق ہے کہ اندرونی حجم ایک ہے۔

۳۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب نافو قویٰ کے پاس ایک مد تھا جس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس کی سند حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مد سے ملتی ہے۔ مگر ان دونوں کے اندرونی حجم میں بڑا تفاوت ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کے مد کا اندرونی حجم ۸۵ سی سی ہے۔ اور مولانا یعقوب صاحب کے مد کا اندرونی حجم اگر گیموں قے میں تو ۱۰۳ سی سی ہے اور اگر جوتے میں تو ۱۲۳ سی سی ہے۔

۷۸۵ کا ادھار ۳۹۳ ہے اور ۲۳۵ اکاہائی ۴۱۲ ہے یعنی ۷۸۵ اور ۱۲۳۵ میں قریب قریب ۲ اور ۳ کی نسبت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب کا مد حضرت امام ابو یوسفؒ کے صاع (= ۵۱ رطل) کا چوتھائی ہے اور مولانا محمد یعقوب صاحب کا مد حضرت امام ابو حنیفہؒ کے صاع (= ۸ رطل) کا چوتھائی ہے۔ یعنی ۲ رطل کا ہے یہ اس صورت میں جب کہ جو تولے گئے ہوں۔ غالباً حضرت امام شافعیؒ کا صاع (= ۵۱ رطل) ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ۷۷۱ (ایک سی سی) پانی کا وزن ایک گرام ہے (۴) مولانا عبدالسلام صاحب نعمانی بناری (مصفیٰ اسلام کا نظام صدقات) کے پاس بھی ایک مد ہے جس کی سند بھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بیان کی جاتی ہے۔ مولانا بناری کو خط لکھا گیا کہ اس مد میں پانی بھر کر اس کو تولے اور پانی کا وزن لکھ دیجئے! مگر اب تک پانی کا وزن معلوم نہیں ہو سکا۔

عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مد فاضل بریلویؒ کے نصف صاع شعیری کا تہائی (۱۱) ہے مولانا عبدالسلام صاحب بناری کا یہ مد مولانا یعقوبؒ کے مد سے (اگر اس میں جو تولے گئے ہیں) مطابقت رکھتا ہے، لیکن سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ شاید مولانا تھانویؒ نے گہیوں تولے تھے تو پھر ان دونوں مد میں تفاوت ہے۔

مولانا اشرف علی صاحبؒ کے دو مد ہیں اگر گہیوں تولے ہیں تو ۱۴۰ تولہ تین ماشہ یعنی ایک مد میں ۷۰ تولہ ۱۱ ماشہ گہیوں آئے اور مولانا بناریؒ اور مولانا بریلویؒ کے مد سے (تین مد کا ایک نصف صاع) ۷۵ ۱۱ تولہ آئے یعنی ۸۵ ۱۱ تولہ گہیوں آئے اور مولانا عبدالباری صاحبؒ کے مد میں ۵۲ ۱۱ تولہ گہیوں آئے۔

اور اگر مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے جو تولے ہیں تو دو مد میں ۱۴۰ تولہ ۳ ماشہ تو ایک مد میں ۷۰ تولہ ۱۱ ماشہ ہوئے اور اگر مولانا بریلویؒ کا نصف صاع

تو عدس، ماش تولنے کو فرماتے ہیں لیکن فاضل بریلوی جو تولتے ہیں اگر صاحب در مختار یوں تحریر فرماتے کہ اتنے درہم پانی جس برتن میں آئے وہ صاع ہے تو جو کے لئے دم بڑیدہ، معتدل، خشک وغیرہ کی شرائط نیز تخصیص مقام کی شرط نہ ہوتی۔

اب اس زمانہ میں ایک کتاب کا پتہ چلا جس میں صاع پر کبھی بحث ہے یعنی منظر الفتاویٰ مصنف مفتی سید محمد افضل حسین صاحب مؤنگیری۔ یہ کتاب بریلی میں نہ مل سکی جس کا پتہ دیا مہاتما۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ امر وہمہ میں مل گئی۔

اس کتاب میں شرح وقایہ کے حوالے سے لکھا ہے جس کا ترجمہ اور مفہوم یہ ہے "اور چونکہ گیہوں جو سے بھاری ہے لہذا وہ پیمانہ جس میں آٹھ رطل یعنی (۲۰) سات سو بیس مثقال گیہوں آئیں چھوٹا ہوگا اور وہ پیمانہ جس میں آٹھ رطل یعنی سات بیس (۲۰) مثقال جو آئیں وہ بڑا ہوگا۔ اس لئے علامہ ابن عابدین شامی نے صدر الشریعہ رحمۃ اللہ علیہ (مصنف شرح وقایہ) کی اس احتیاط کو ذکر کر کے فرمایا کہ سب سے زیادہ احتیاط یہ ہے کہ جو کا اعتبار کیا جائے اور یہ بھی فرمایا بعض علماء نے حاشیہ زلیحی سے یہ نقل کیا ہے کہ حرم شریف مکہ معظمہ کے شارح موجودین اور سابقین کا عمل اور فتویٰ اس پر ہے کہ صاع کی تقدیر میں جو کا اعتبار کیا جائے۔ میرا بھی خیال ہے کہ جو ہونا چاہئے کیونکہ شروع میں جو سے ہی ناپ تول کی گئی ہے جیسے ایک قیراط برابر پانچ جو ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صاع آٹھ رطل کا ہو یا پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ عراقی رطل (۲۰) ستار کا ہوتا ہے اور حنفیہ عراقی رطل کا اعتبار کرتے ہیں اور مدنی یعنی حجازی رطل (۳۰) تیس ستار کا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عراقی صاع اور حجازی صاع دونوں برابر ہو جاتے ہیں یعنی ایک سو ساٹھ ستار کے ہو جاتے ہیں۔

مولانا معین الدین مرحوم بھی جو تولے کو فرماتے ہیں۔ مولانا معین الدین مرحوم درہم کا وزن ۸۴ جو کہتے ہیں اور شامی میں درہم کو ستر (۷۰) جو کا قرار دیا گیا ہے۔ در مختار میں ہے کہ درہم = ۱۲ قیراط اور قیراط = ۵ جو اور درہم = ۷۰ جو۔ رسالہ تحقیق الافران اور شامی میں بھی ایک جگہ درہم ۸۴ جو کا کہا ہے۔

خلاصہ کلام :- ان مختلف مباحث و شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کا نصاب ۷۰ تولہ کے قریب ہے ۵ تولہ ۲ ۱/۲ ماشہ نہیں ہے ایک اور دفعہ ۲۰۰ جو تولے تو دس (۱۰) ماشہ ہوئے یعنی دو ہزار (۲۰۰۰) جو برابر سو (۱۰۰) ماشہ موجودہ یعنی ۸ ۱/۲ تولہ موجودہ۔

ایک اور دفعہ میں نے مسلم مسور قلی تولہ ۲۵۰ سی سی (۷۷) میں برابر دو سو (۲۰۰) گرام ہوئی جس سے میرے پہلے تجربہ کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی سو (۱۰۰) سی سی (۷۷) میں ۸۲ ماشہ موجودہ مسور ہوئی اور اکیاسی (۸۱) ماشہ گیہوں ہوئے۔ میرے تجربے میں مسور اور گیہوں کا حجم اور وزن ایک ہے۔

جو قومینہ سے آگے لیکن گرام کے رواج کی وجہ سے قیراط نہیں ملے۔ اسی طرح علی گڑھ میں بھی گرام کے رواج کے باعث سناروں کے یہاں گھونگھیاں نہیں مل سکیں۔

علی گڑھ میں ایک مصری مقیم ہیں میں نے ان سے مد کے متعلق دریافت کیا انہوں نے اپنے پاس کی ایک مطبوعہ کتاب سے تحریر کرایا کہ ۱ ۱/۲ رطل کا ایک مد اور چار مد کا ایک صاع ہوتا ہے۔

رطل = ۴۴۴ گرام = ۱۴۴ درہم - ۵ ۱/۲ رطل والا صاع = ۲۳۶۸ گرام = ۷۸۷ درہم۔ اور ۱ ۱/۲ رطل والا صاع = ۵۵۲ گرام = ۱۱۵۲ درہم = ۶۱ چھٹانک اور نصف صاع = ۳۰ ۱/۲ چھٹانک یعنی ایک سیر ۱۲ ۱/۲ چھٹانک جس برتن میں پانی آئے

اس برتن میں ڈیڑھ سیر سے کچھ زائد گیہوں آئیں گے۔ دوسو (۲۰۰) درہم برابر ۵۲ ۱/۲
 قولہ موجودہ کے قریب ہوتے ہیں جو ہمارے چاندی کے نصاب کے برابر ہیں اور ۵۱ ۱/۲
 رطل والا صاع = ۴۰ چھٹانک جس کا نصف ۲۰ چھٹانک موجودہ یعنی جس برتن
 میں ۲۰ چھٹانک پانی آئے اس میں گیہوں قریب ایک سیر آئیں گے۔

چاندی اور سونے کے نصاب میں تو مصری حساب (یعنی ۲۴۴ گرام = ۱۴۴ درہم)
 مکتبہ دہلی سے ملتا جلتا ہے۔

لیکن صاع کا وزن دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ سے مختلف ہے (۱۰۰ گرام =
 ۱۰۳ ماشہ موجودہ)

یہاں صاع ۵ ۱/۲ رطل والا وہ ناپ ہے جس میں ۲۳۶۸ گرام پانی آجائے
 اور ۸ رطل والے صاع میں ۳۵۵۲ گرام پانی آئے۔ نیز درہم ۱۲ قیراط والا لیکن اگر
 ۱۶ قیراط والا درہم لیا جائے تو پھر حساب صحیح نہ ہوگا۔)

اس سلسلہ میں مولانا عبدالصمد رحمانی کی کتاب العشر والزکوٰۃ نہایت اہم و لائق
 مطالعہ ہے۔ موصوف نے تمام مسائل کو کتاب و سنت سے مدلل و مبرہن کیا ہے۔
 بخاری شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے غسل فرماتے
 تھے، آپ کے سر کے بال زیادہ تھے ان کو خوب تر فرما لیتے تھے، خاکسار نے تجربہ
 کیا کہ ایک معمولی و متوسط مسجد کا لٹا جس میں ایک سیر بارہ چھٹانک (راج) پانی
 آتا ہے اس میں تقریباً ایک سیر، چھٹانک موجودہ سے کچھ زائد گیہوں آئیں گے
 جہاں تک غسل کا تعلق ہے کم سے کم تین لوٹوں سے غسل ہو سکتا ہے اور تین
 لوٹوں میں چار سیر پانچ چھٹانک سے زائد گیہوں آتے ہیں مالا بد منہ والے صاع
 میں تین سیر چھ چھٹانک گیہوں آتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہئے کہ غسل کیلئے دونوں سے زیادہ
 کی صرفت پڑی۔ اور اگر مولانا عبدالباری صاحب کا صاع لیں۔ تو دو لوٹوں سے

کم میں غل ہو سکتا ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فاضل بریلوی کا نصف صاع شعری صحیح ہے، یعنی وہ برتن جس میں آٹھ رطل یعنی ایک ہزار چالیس درہم (۱۰۴۰) جو آج بھی تو اس برتن میں ۳۵۱ روپیہ بھر گئیوں آئیں گے یعنی چار سیر چھ چھٹانک موجودہ ایک لوٹے میں ایک سیر سات چھٹانک گئیوں، تین لوٹوں میں چار سیر چھ چھٹانک موجودہ حساب میں کسور چھوڑ دے میں پورا عدد لے لیا گیا ہے۔

ادزان کی مزید تحقیق :- رتی ۳ جو ۴ جو ۲ جو مختلف بیان کی گئی

ہیں۔ میں نے انگریزی لفظ (CARAT) پر توجہ کی کہ شاید یہ CARAT قیراط ہے۔ یہ بات صحیح ثابت ہوئی۔ اس پر متوحش نہیں ہونا چاہئے کہ یہ مغربی تحقیق ہے، یہ بات واضح ہے کہ جب دور دراز ملکوں میں سلسلہ تجارت شروع ہو کر اس میں زیادتی ہوئی۔ ہیرا وغیرہ قیراط کے ذریعہ تولا جاتا تھا اور اسی ترازو بھی تیار کر لی گئی جو ایک خٹخاس کے دسویں حصہ تک کو با آسانی تول لیتی تھی۔ اب مختلف قیراطوں کے وزن میں کافی فرق نظر آیا۔ گیارہویں ایڈیشن انسائیکلو پیڈیا یڈیٹھیکا میں مذکور ہے کہ امسٹرڈم، لندن، پیرس کے جوہریوں کی ایک میٹنگ ۱۸۷۷ء میں ہوئی اور اس میں عربی قیراط یعنی CARAT کا وزن ۲۰۵ ملی گرام مقرر کر دیا گیا۔ غالباً ۲۰۵ کی کسر چھوڑ کر ۲۰۵ لے لیا اور ۲۰۵۷۵ اوسط ہے ۱۹۵ اور ۲۱۶ کا جیسا کہ آئندہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ جمیبرس انسائیکلو پیڈیا CHAMBERS, ENCYCLOPAEDIA میں عربی قیراط کے متعلق تحریر ہے کہ مختلف عربی قیراطوں کا وزن ۱۹۵ ملی گرام سے ۲۱۶ ملی گرام تک نکلا CHAMBERS NEW EDITION 1923 AD امریکن انسائیکلو پیڈیا میں عربی قیراط کے متعلق تحریر کیا گیا ہے کہ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا وزن ایک ہجارتا ہے انگلستان میں پونڈ = سات ہزار (۷۰۰۰) گرین۔

— لہے وغیرہ والا ادارہ (Avoir) اور پونڈ = ۷۶۰ گرین سونے اور چاندی والا ٹرائے (Troy) اور گز جس مکان میں ہیں۔ اسی طرح فرانس میں کلوگرام اور میٹر جس مکان میں ہیں ان کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔ گرام اور گرین کی نسبت کے اعداد مستند ترین کتابوں سے درج ذیل ہیں۔

ایک گرین = ۰.۰۶۴۸ گرام	ایک گرین = ۰.۰۶۳۲۳۶ گرام
ایک قیراط = ۱۹۵ ملی گرام = تین گرین	ایک قیراط = ۲۱۶ ملی گرام = ۳ گرین
ایک تولہ موجودہ = ۸۰ گرین	ایک تولہ موجودہ = ۷۶۲.۵ گرام
ایک ماشہ موجودہ = ۱۵ گرین	ایک ماشہ موجودہ = ۰.۹۷۲ گرام
ایک گرام = ۲۹.۵ ماشہ موجودہ	۱۰۰ گرام = ۱۰۳ ماشہ موجودہ سے کچھ کم
ایک روپیہ = ۸۰ گرین ۵۶ قیراط	ایک روپیہ = ۸۰ گرین ۴۵ قیراط
۱۹۵ ملی گرام والی	۲۱۶ ملی گرام والی
ایک گھونگی = ۳ جو تقریباً	ایک جو = ۰.۰۲۵۶ گرام
ایک سی سی (cc) حجم میں ایک گرام بانی آتا ہے	

مندرجہ ذیل نقشہ میں ۱۹۵ ملی گرام اور ۲۱۶ ملی گرام دونوں سے حساب لگا کر سونے چاندی کے لصاب اور صلع کی تفصیلی تحقیق ہے۔

قیراط	سونے کا لصاب	چاندی کا لصاب	صلع
۲۰ مثقال = ۲۰۰ قیراط	۲۰۰ درہم = ۱۲۰ مثقال	۱۰۰ درہم = ۷۲۸ مثقال	
۱۹۵ ملی گرام	۷۸ گرام	۲۶۵ گرام	۲۸۳۹ گرام
۶ تولہ ۸ ۱/۲ ماشہ رائج	۶ تولہ ۹ ۱/۲ ماشہ رائج	۳ سیر ایک چٹا تک رائج تقریباً	
۲۱۶ گرام	۸۶ گرام	۶۰۸ گرام	۳۱۴۴۸۶ گرام
۷ تولہ ۵ ۱/۲ ماشہ رائج	۵ تولہ ۸ ۱/۲ ماشہ رائج	۲ سیر چھ چٹا تک	

قدیم حساب یعنی دہلی ایک	۱۰ ۱/۲ تولہ قدیم	۲۷۳ تولہ قدیم
قراط = اچھ رتی اور	برابر	۲۸۵ تولہ رائج
۹۶ رتی = ایک تولہ قدیم	۷۳ تولہ ۱/۲ ماشہ رائج	۳۰ سیر و چھٹانک رائج
زرنگی محل لکھنؤ	۵ تولہ ۲ ۱/۲ ماشہ	۳۶ تولہ ۱/۲ ماشہ
		۱۸۹ ۱/۲ تولہ

تخصیص مباحث گزشتہ ۱۔ میری اس تمام کاوش کا خلاصہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے نصاب میں سے وزنی قیراط (یعنی ۲۱۶ ملی گرام) تسلیم کی جائے جس کی تشریح کی جا چکی ہے اور یہ ہی علمائے دہلی کی تحقیق ہے اور صدقہ فطر کے معاملے میں صلح کے اختلاف کے پیش نظر دہلی والا صاع تسلیم کیا جائے جو لکھنؤ کے صاع سے زیادہ اور فاضل بریلوی کے صاع سے کم ہے۔ لیکن میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جب سے مجھے علامہ شامی کی احتیاط کا پتہ چلا ہے کہ جو کا اعتبار کیا جائے یعنی جس برتن میں تین سیر چھ چھٹانک کا آدھا یعنی ایک سیر گیارہ چھٹانک رائج جو آٹن تو اس میں گیسوں بھر کر دید یعنی تقریباً دو سیر ایک چھٹانک (رائج) دید تو ایک آدمی کا فطرہ ادا ہو جائے گا۔ کلو گرام کے لحاظ سے ایک آدمی کا فطرہ ایک کلو گرام اور ۵۷۵ (پانچ سو پچھتر گرام) جس برتن میں جو آٹن اس میں گیسوں بھر کر دید و جو کا اعتبار کرنے کی وجوہات یہ ہیں۔

- ۱۔ شرح وقایہ میں احتیاط کا ذکر کیا گیا ہے جس کو علامہ شامی نے مانا ہے اور کہا ہے کہ جو کا اعتبار کیا جائے کیونکہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے۔
- ۲۔ قاضی ثناء اللہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب مالا بدینہ میں لکھا ہے کہ جس برتن میں آٹھ رطل عدس یا ماش یعنی مونگ یا اسی قسم کا اناج آئے وہ ایک صلح ہے۔ ایک رطل برابر (۳۶) چھٹیس تولہ اور ہر تولہ سو گیارہ یا قدیم۔

اسی قسم کے اندج میں جو بھی آگئے گیہوں کیوں لئے جائیں جبکہ فقراء کا فائدہ جو میں ہے۔
۲۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع پانی سے غسل فرماتے تھے جسکی مقدار جو کے لحاظ سے ٹھیک بیٹھتی ہے۔ (بخاری شریف)۔

۳۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بھی جو لینے کو فرماتے ہیں (فتاویٰ رضویہ صفحہ ۱۱۲-۱۱۵)
۴۔ بعض علماء نے علامہ زلیعی کے حاشیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حرم شریف کے مشائخ کا عمل اولیٰ فتویٰ اس پر ہے کہ صاع کی تقدیر میں جو کا اعتبار کیا جائے۔ کیوں کہ ابتدا میں جو سے ہی ناپ تول کی گئی اور گیہوں کا اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

نوٹ یہ اور بات ہے کہ معظمہ میں کس صاع کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اخاف ایک صاع میں آٹھ رطل کے قائل ہیں۔

میں نے یورپ کی تحقیق تائید میں پیش کی ہے۔ کیونکہ یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ فتاویٰ حمادیہ میں ایک قیراط اچھ رتی ہے یہ تقریباً لفظوں میں کی ہے جس میں شبہ کا موقع نہیں ہے ۹۶ رتی کا ایک تولہ تحریر کیا ہے۔ ابراہیم بن عبد اللہ تاجر ملتان کی مکہ مکرمہ سے درہم، مثقال، مد وغیرہ لائے اور دہلی کی نکسال میں وزن کرایا وہ وزن دہلی کے وزن سے ملتا چلتا ہے اور لکھنؤ کے وزن سے کافی فرق رکھتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق بھی (ہندوستان کے مختلف صوبوں کے جو۔ مدینہ طیبہ کے جو۔ اور شاہانہ منل کے سکون کے وزن پر غور و خوض کے بعد دہلی کے اوزان زیادہ صحیح ہیں۔ حیرت ہے عرب سے قیراط کیوں نہیں منگائے گئے اور جو پر دار و مدار کیوں رکھا گیا اور پینے کے پانی کو معیار کیوں نہیں بنایا گیا۔ اب قیراط ملی گرام کے رواج کے باعث مشکل سے ملتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

معظم کی مثنویاں

رسالہ شجرۃ الاتقیاء

(۲)

بہ تصحیح و تقدیم مولانا ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی صاحب جدید آباد

اُسے خوب دیکھا وہ ہوجاؤلی	۳۳۲	اُسے کشف ہوگا خفی اور حبلی
اُسی دھن سوں دیکھ عالم تمام	۳۳۵	اُسی دھن سوں راز کر خاص و عام
نوازا گدا کئی مرے سار کے	۳۳۶	کیا بادشاہ ان کو اسرار کے
نظر بھرا میں کو سود کیا ہوں میں	۳۳۷	سدا ذات میں غرق بھکیا ہوں میں
سدا کیف میں مست ماتے اُتھے	۳۳۸	سدا عشق میں حق کے دہتے اُتھے
ہنگ عشق کا نیچہ کھولے کبھی	۳۳۹	بیز راز نشیں بات بولے کبھی
عوظ کھا کے وحدت کے دریا مئے	۳۴۰	ادلانے سوختے گوہراں اُن کے
اُسی کام میں شاہ مشغول تھے	۳۴۱	اُسی کام سوں حق کے مقبول تھے
زمانے کے شاہاں پرستش کریں	۳۴۲	جو کچھ مال دھن لاکے آگے دھریا
حصذی بننے حق کے وہ غرق تھے	۳۴۳	دھن سوں کبھی نیچہ وہ فرق تھے
وہ ظاہر تو کئی مست سرشار تھے	۳۴۴	دیکھیں اد باطن میں ہوشیار تھے

جگہ معرا

لاش سوں ایک سنیا سی کتے

۳۴۵

۳۴۳

سنیا سوں میں تھا وہ لدا اسی کتے

- ۲۲۶ امیں کو اُنے لاکے پارس دیا
۳۲۷ کہا تیچ محنت سو پایا ہوں میں
۳۲۸ لئے سوئے شے نے غرقاب میں
۳۲۹ ہے مشہور یو بات سب دہر میں
۳۵۰ اد پارس سٹے کر کے زاری کیا
۳۵۱ اُسے دیکھ کر شے تبسم کیے
۳۵۲ کہے شاہ جا دیکھ پانی بھتر
۳۵۳ اُسی وضع سوں بیٹھ پانی مئے
۳۵۴ دیکھا کشف شہ کا سوا معتقد

جگہ معرا

- ۳۵۵ دیکھو ایک سید بخاری اُتے
۳۵۶ امیں کو اُنو بول بھیجے ہیں یوں
۳۵۷ کریں آڈ مل کر جمعہ کا نماز
۳۵۸ دئے شاہ نے ان کو تباہوں جواب
۳۵۹ مصلاً بچھا شاہ غرق آب پر
۳۶۰ منگے شاہ پانی پہ کرنے صلوٰۃ
۳۶۱ یہ سید کو سننے بیت پڑی
۳۶۲ فخر سب ہوا راز سب شہر میں

جگہ معرا

- ۳۶۳ امیں کے مقرب اُتے یک فقیر
۳۶۴ خلیفوں مئے وہ اُتے بہرہ ور

وہ فاضل آتے اور واصل آتے
 کئے حال اور قال سب بار تھا
 وہ دیکھے آتے حق کو حیلُ الورد
 وہ ہر یک مجالس میں دُر کار تھے
 حقیقت یہ سب بول کر آؤ تم
 جو کچھ میں کہتا ہوں وہ کھولو تمام
 چھپے راز پر پونچ مائل رہنا
 عبادت کہے دو دُوبے کا آہے
 سمجھنا ہے باطن میں ذات و صفات
 کھڑیکا اُسے تو پرج حق کا وصل
 عبادت خدا کا تو نفع ان ہے
 ولیاں کا ہے باطن میں روزہ نماز
 کربن تن سوں بندگی سوا عابد کئے
 حقیقت پہ مائل سوا عاشق ہیں مان
 وہ واصل ہوئے اور کامل ہوئے
 سمجھتے ہیں حق کا یو راز و نیاز
 امانت رکھے کر کیا ہے فضل
 خدا کو یہاں دیکھنا قرض ہے
 تو سمجھے گا پرج حق کی وہ ذات کو
 امر سب نبی کا کہنے ہیں قبول
 شریعت بجز باطل بستا نہیں

۳۶۵ ہر یک علم میں خوب قابل آتے
 ۳۶۶ لڑائی کئے علم اظہار تھا
 ۳۶۷ مُردیاں آتے ان کے کئی حق رسید
 ۳۶۸ ہر یک بات میں خوب طرار تھے
 ۳۶۹ بلا کر میں نے کہے جاؤ تم
 ۳۷۰ کہے جا کے سید کو بولو سلام
 ۳۷۱ شریعت اُپر پونچ قابل رہنا
 ۳۷۲ نبی نے احادیث میں یوں کہے
 ۳۷۳ عبادت ہے ظاہر کی صوم و صلوة
 ۳۷۴ بندہ کس کو کہتے سمجھنا اول
 ۳۷۵ بنانے دیکھو کھول کر سب کہے
 ۳۷۶ کئے یک حقیقت ہے دُسر اجماز
 ۳۷۷ شریعت پہ قائم ہے زائد کئے
 ۳۷۸ طریقت برتتے سوا رفت میں جان
 ۳۷۹ کھولا معرفت اوچ واصل ہوئے
 ۳۸۰ ہیں یوں تو کرتے ہیں روزہ نماز
 ۳۸۱ بندے کو کیا حق نے بندگی بدل
 ۳۸۲ عبادت تو ظاہر کی یہ فرض ہے
 ۳۸۳ اول تو سمجھنا ہے یہ بات کو
 ۳۸۴ امر یوں کہے ہیں وہ حق کے بول
 ۳۸۵ شریعت بجز راہِ درستہ نہیں

۳۸۶	شرعیت زمیں کر سو بولے رسول	۳۸۶	امت پر یہ سب راز کھولے رسول
۳۸۷	طریقہ نبی نے کہے ہیں مخبر	۳۸۷	حقیقت سوا اس کو لگا ہے خیر
۳۸۸	کہے معرفت اس کی لذت کتبیں	۳۸۸	انہڑتی ہیں واصل موددلت کتبیں
۳۸۹	شرعیت نبی نے کہے رات ہے	۳۸۹	وہ اندھکار جیوں کہ ظلمات ہے
۳۹۰	طریقہ نبی نے بتا رہے کہے	۳۹۰	وَلے کچھ بھی دے میں تارے کہے
۳۹۱	حقیقت سو جیوں چاند اور چاندنا	۳۹۱	چکڑو رہو کے عاشق نے دل بازنا
۳۹۲	دیکھو معرفت کو کہے آفتاب	۳۹۲	چھپا راز اظہار ہو تا شتاب
۳۹۳	شرعیت ہے کشتی نبی نے کہے	۳۹۳	سوا سار سودہ سلامت رہے
۳۹۴	طریقہ کو دریا ہے کر جاننا	۳۹۴	جواہر میں بھر پور کر ماننا
۳۹۵	حقیقت صدق کی کہے ہیں رسول	۳۹۵	اسے ہاتھ لینے سے ہوتا دھول
۳۹۶	کہے معرفت ذات موتی ہے جوں	۳۹۶	اسے عاشقاں ہاتھ لیتے ہیں یوں
۳۹۷	شرعیت نبی نے کہے قال ہے	۳۹۷	طریقہ مراسم یو افعال ہے
۳۹۸	حقیقت ہے احوال حج پہ مدام	۳۹۸	دیکھو معرفت ذات سب ہے تمام
۳۹۹	بجز یوں چلے باٹ پاتا نہیں	۳۹۹	بجز راہ کچھ بات آتا نہیں
۴۰۰	سخن سن یو سید لیے سرا پر	۴۰۰	امیں کا حکم اور خدا کا امر
۴۰۱	بڑا دبہ ملک میں تیب ہوا	۴۰۱	یو برحق نبی کا قونا تب ہوا
۴۰۲	ہوا تب سوں شہرت ہے برحق دلی	۴۰۲	امیں کو کئے تو امین علی
۴۰۳	اسی بات پر شوق غالب ہوا	۴۰۳	بہت خلق اس دن سوطالب ہوا
۴۰۴	یہی بات سن کر سواہل پہلو	۴۰۴	کنک لاکھ عالم کیا آسجود
۴۰۵	کنک لاکھ دیکھا سوں زقار دار	۴۰۵	امیں کے اوپر آکے ہوئے بخار
۴۰۶	کنک لاکھ جنگم کیا آسجود	۴۰۶	کیے آکے تحقیق اپنا وجد

- ۲۰۷ یونین میں کٹا ج میں سو کون ہے؟
 ۲۰۸ اچھے پر کھے بات یو راز کیا
 ۲۰۹ چھے راز سوں جب وہ ماہر ہوئے
 ۲۱۰ میں دیکھا تھا شا یو اپنی نظر
 ۲۱۱ اگیارہ صدی میں یو ہادی ہوا
 ۲۱۲ سوا خلق اس بات پر معتقد
 ۲۱۳ امیں کو کتے خلق محذوب تھے
 ۲۱۴ ہوا تھا امیں سچ یو فانی فی اللہ

جگہ مورا

- ۲۱۵ اتا شاہ بابا (کی) تعریف کر
 ۲۱۶ امیں کا دیکھو چاند روشن ہوا
 ۲۱۷ کتے شاہ بابا اے پیار سوں
 ۲۱۸ اول سوں اے حق نے ماما کیا
 ۲۱۹ امیں کا تو برحق وہ فرزند تھا
 ۲۲۰ دنیا دین سب حق دیا تھا اے
 ۲۲۱ امیں نے حضور سوں خلافت دیے
 ۲۲۲ حضور سوں دیکھو کتنا ائی کیے
 ۲۲۳ ہوئے شہ کو فرزند امیں کے حضور
 ۲۲۴ دیکھے شاہ بابا کو قابل ہوئے
 ۲۲۵ کینیک دلیں کو شاہ بابا او پر
 ۲۲۶ دیا جن اے علم سب غیب کا
- ۲۱۵ دے گا تران ہو اکسیر زر
 ۲۱۶ زمیں اور زماں سب یو گلشن ہوا
 ۲۱۷ امیں کا تھا پیار دلدار سوں
 ۲۱۸ اے عشق میں اپنے راتا کیا
 ۲۱۹ ولیکن دو عالم (کا) دل بند تھا
 ۲۲۰ قرب دار حق نے کیا تھا اے
 ۲۲۱ مریداں کرو کر اجازت دیے
 ۲۲۲ لے تخت اور تاج اپنا دیے
 ۲۲۳ یو دلبند ہوئے سب امیں کے حضور
 ۲۲۴ امیں تب یہ دنیا سے رحلت کیے
 ۲۲۵ دیکھو حق کیا ہے کرم کی نظر
 ۲۲۶ سوار از کشت لاریب کا

- ہوا چشت کا دیکھو پھر تازہ باغ ۴۲۷
وہ برحق خدا کا ہوا ہے ولی ۴۲۸
امیں کا وہ معصوم دلدار تھا ۴۲۹
کہلاتے آتھے پیار سو اس امیں ۴۳۰
ہوا دیکھو کچن یو اکسیر سوں ۴۳۱
ہر یک علم میں خب فائق ہوئے ۴۳۲
وہ برحق علی پیر ہے دست گیر ۴۳۳
سہاتا امیں کا اُسے رخت یو ۴۳۴
مبارک یو مسند نبی کا اُسے ۴۳۵
اُسے حق سوں دولت ہدایت ہوا ۴۳۶

جگہ مہرا

- عرض توج کرتا ہوں تج شاہ سوں ۴۳۷
دیا حق کلی سب تجھے راز کا ۴۳۸
چھپے راز کی یو جو کچھ بات ہے ۴۳۹
جو کوئی آلا سو ہی وہ ور ہوا ۴۴۰
تجے راز حق تب رہوں کا دیا ۴۴۱
ترے پر یو کشوف سب رانہ ہے ۴۴۲
تجھے خلق یوسف ہے ثانی کتے ۴۴۳
تجھے حق دیا پنچ گنج کا کلی ۴۴۴
علی کا دیکھو شہ کو القاب ہے ۴۴۵
دلایت کے سبج کو آتا رہیں ۴۴۶

۲۲۷	اکھوں میں ترے شاہ اکسیر ہے	زباں میں تو عیسیٰ کا تاثیر ہے
۲۲۸	توں حاکم ہے عادل کتے قدرداں	تجھے علم باطن ہے سارا عیاں
۲۲۹	تو برحق سہارا تو سرتاج ہے	ترے بات بکڑے کی تھلاں ہے
۲۵۰	مریاں ترے تو قرب دار ہیں	کتے پانچ گنج پاکے دُرکار ہیں
۲۵۱	مرے حق پہ والی محشر ہے تو	مرے حق پہ ساقی کو شر ہے تو
۲۵۲	اے ساقی اتا جام دے پیار سوں	اتامت کر اپنے اُسرار سوں
۲۵۳	ازل سوں کیا حق نے ساقی تجھے	پلا جام اے شاہ باقی تجھے
۲۵۴	ابد تک رہوں مست ماتا ہوں میں	ترے عشق (روں) مست رہتا ہوں میں
۲۵۵	ترے بات ہے آج جم کا دہ جام	پلا جام حج کو تو ہر صبح دشام
۲۵۶	پلا کر اتا تجھ کو سرشار کر	جھپاراز سب حج پہ اظہار کر
۲۵۷	ہمیشہ ثنا صفت کرتا رہوں	ترمی یاد کا دم یو بھرتا رہوں
۲۵۸	لقدق ترے مال اور جان کا	مجھے دان دے شاہ ایمان کا
۲۵۹	مناجات کر شاہ میرا قبول	مدد تجھ خدا اور خدا کا رسول
۲۶۰	راتا کر نظر مجھ او پر پیار کا	راتا دان دے مجھ کو دیدار کا
۲۶۱	اول یا علی دیکھ ظاہر تجھے	پہچانیا ہوں برحق ہے قادر تجھے
۲۶۲	تو ہے جانشین آج بندہ نواز	معظم کو اے شاہ کہ سرفراز

جگہ سوا

۲۶۳	اتا اکھڑیوں ساقی سو جا کر عرض	اگر ہے حشر کا تجھے یو عرض
۲۶۴	اتا جام دیتا ہے آب حیات	راتا تجھ کو مرنے سو ہو گانجات
۲۶۵	عبث عمر نا چیز کھوتا ہے تو	عبث سہار دنیا کے ڈھوتا ہے تو
۲۶۶	اے دنیا تو نا چیز ہے بے وفا	راے پیار کرنے میں کیا ہے نفا

۲۶۷	طلب اسکی رکھنے میں سوتا کلاب	۲۶۷	اسے دور کرنے (میں) پاتا ہے لال
۲۶۸	دنیا کے ہیں طالب مخنت کتنی	۲۶۸	ہیں جنت کے طالب مونث کتنی
۲۶۹	جو طالب خدا کے سودہ نہ ہوئے	۲۶۹	نہ کہہ ہوئے اور بہرہ ور ہوئے
۲۷۰	اسی واسطے میں کتا ہوں تجھے	۲۷۰	میں ا دیکھنا چاہتا تھا
۲۷۱	امیں ساتھ دیکھ مرشد بلا	۲۷۱	تو مشہود ہو تجھ کو شاہد بلا
۲۷۲	اتاجھوڑ دے دل سوں غفلت کے کام	۲۷۲	اتاجام سوں کام لاقوں مدام
۲۷۳	اتاجھوڑ سب تن کی ہستی کو توں	۲۷۳	اتاجھوڑ دنیا کی ہستی کو توں
۲۷۴	اتادم کو نا چیز نا جان دے	۲۷۴	اتانفس کو دل میں نا آن دے
۲۷۵	امیں ساتھ دیکھ ساقی بلا	۲۷۵	مہربانی بخت ائے تجھ کو باقی بلا
۲۷۶	ہمیشہ اتامست سرشار ہو	۲۷۶	اتایار سوں بل کے تو یار ہو
۲۷۷	اتایار سوں بل کے تو ایک ہو	۲۷۷	ا پس سوں خدا اس کو نادر یک تو
۲۷۸	عجب جام (لے) بات میں یار کے	۲۷۸	سو اس یار جو سار دل دار کے
۲۷۹	یو جو دیکھ لے یار اس جام کو	۲۷۹	نہ کر تو عذر دیکھ اس کام کو
۲۸۰	دادم تو اس جام کو نوش کر	۲۸۰	دنیا دین کو سب فراموش کر
۲۸۱	تے یار کے ہر مستجم کا ہے جام	۲۸۱	اتاکام لا اس سوں ہر صبح و شام
۲۸۲	ہوا صبح کاذب تو کرنا شتاب	۲۸۲	پینا بیک کہتے ہیں کہنے شراب
۲۸۳	یو کموتوب کیا جھاڑ ہے بار دار	۲۸۳	دیکھو سب یو وحدت سوں آیا ہے بار
۲۸۴	اتاپانچ سو بیت بولا ہوں میں	۲۸۴	جو بولو کہے سوچ کھولا ہوں میں
۲۸۵	او قادر (ہے) غیور ڈرنا کتنے	۲۸۵	چھپی بات نا بھار کرنا کتنے
۲۸۶	معظم اتاختم کر بات کو	۲۸۶	اتارکھ قلم تو ا پس بات کو

شجرۃ الالقیاء

- ۱۔ خت = خارج از تقطیع
- ۲۔ خک = خطائے کتابت
- ۳۔ طہ = مخطوطہ
- ۴۔ () = مرتب کا اضافہ بلسلہ تصحیح
- ۵۔ ق = قیام وزن

- ۱۔ مرت بروزن غطت = س۔ قوی
- ۳۔ ظ = عروض و ضرب دونوں حکیم۔ معنی سمجھ میں نہ آئے۔
- ۵۔ علم تجرک لام۔ اسی طرح آگے بھی ہر مصدر وابتدا، نیز عروض و ضرب کا ہر وہ لفظ جو سکوں ثانی ہے متحرک پڑھا جائے گا۔ لیکن اگر وہ حرف علت ہو تو خارج از تقطع سمجھا جائے۔

- ۷۔ الوان = جج لون۔ ع۔ اسم۔ رنگ
- ۸۔ نپانا = س۔ مصدر۔ کسبہ نون دوسرا حرف بائے فارسی = پیدا کرنا۔
- ۱۷۔ دیک = دیکھ طہ = دیا تو دیک۔ تو زائد = خک
- ۲۱۔ قیام وزن کے لئے محیط کی میم مصنوم کو بالاشباع پڑھنا چاہیے۔

- ۲۵۔ رسول = واوخت
- ۲۳۔ تجے = کسبہ تائے قرشت = تیرے
- ۲۹۔ او تو چہ ساقی الخ = ط

- ۵۰۔ کو برحق اودھار ہے = ط
- ۵۱۔ مصرع آخر کی جگہ مخطوطہ میں مرا ہے۔ اس لئے کہ شعر نشان اکاؤن کا مصرع اول مکرر لکھا گیا ہے۔
- ۸۵۔ کینا = بکسر = کرتا
- ۸۶۔ م سولہ ذی قعدہ سنہ اٹھ سو پچیس ہجری
- ۸۸۔ دیک = دیکھ۔ یا ئے مجہول = خت + کلی = کیلی = کبھی =
- ۹۰۔ برکت = کات عربی مشدد = ق
- ۹۱۔ سو لکھن۔ صفت۔ س۔ سین دندانہ دار = سلچن = خوش اطوار = خوشنما
- لکھن = اسم۔ س = بالفتح و بتشدید ثانی۔ لچن (راچی) علامت = حجاز اسود نقیض نخس۔
- ۹۲۔ دکھو یا ئے مجہول۔ خت = اسی طرح آگے بھی ہر صدر و ابتداء میں۔
- ۹۸۔ سلطان احمد شاہ دہلی بہمنی م انتیس ذی الحجہ سنہ اٹھ سو انچالیس ہجری۔
- تر = بکسر اول = تین۔ لوک = دنیا۔ ترلوک = پاتال + زمین + آسمان = کائنات۔
- ۱۰۰۔ عرش = بفتح رائے محملہ
- ۱۰۲۔ یہہ بیت من و عن بیت نشان نیا فوے کی تکرار ہے۔
- ۱۰۶۔ آل کا قافیہ راز قابل توجہ ہے۔
- ۱۱۰۔ خواجہ کمال الدین بیابانی۔ سنہ وفات معلوم نہ ہو سکا۔
- ۱۱۲۔ فہام = فہم۔ ع۔ مصدر کی تہنید مع امالہ
- ۱۱۵۔ ہلو = بالفتح و بضم ثانی = آہستہ = طہ = میں کو کی بجائے حاشیہ پر کہا
- ۱۱۶۔ لب کر = لب لگا کر۔

- ۱۲۱۔ جواب = واو = خت
- ۱۲۲۔ اختیار کی یائے مجہول = خت قوش = س اسم مذکور بروزن گوش = خواہش
- لذت۔ ط = میں شد = خاک۔
- ۱۲۴۔ ط۔ می نیر = (پانی) پر لفظ اس طرح ہے کہ کوئی چاہے تو شیر (= دودھ) پڑھ سکتا ہے۔ نفی کات یہاں اور آگے بھریک۔
- ۱۲۸۔ رسول = واو = خت
- ۱۲۵۔ مرید = یائے مجہول = خت
- ۱۲۲۔ خوب = واو خت
- ۱۲۶۔ قاق کبر = کذا فی المخطوطہ = شاید خاک گیر۔
- ۱۲۹۔ ط = کیے مرید۔ مُعْتَقِدُ بَشَاعِ قَاتِ کُور = ق
- ۱۲۲۔ جہد = جہاد کی تخفیف = ق
- ۱۶۱۔ جلا = اصل عربی میں بالفتح ہے مگر اردو میں بالکسر ہے۔ دطن سے باہر کر دینا۔
- ۱۶۲۔ سڑک = ۵۔ صفت = بفتح سین و دلے ہندی = بے خودی۔ حالت سکر۔ بشار
- ۱۶۴۔ نزد = نزدیک کی ترخیم یا نزد کا دکھنی تلفظ (غالباً مزد ثا) جو فارسی میں سکون زائے معجبہ ہے۔
- ۱۶۸۔ قدر = بروزن بدل = ق
- ۱۸۰۔ عدد کمر = گن کر۔ ط = صحیح کی بجائے جا = خاک
- ۱۸۳۔ ساعت = عین = خت
- ۱۸۵۔ ط = خضر سوا کرم صفات کر
- ۱۹۲۔ سیر۔ تخفیف رائے مہملہ اور عرب کی رائے مہملہ ساکن
- ۲۰۰۔ سینا = سینہ کی تخفیف۔ ہیا = ۵۔ بالفتح = دل = قلب

- ۲۰۱۔ بیجا پور یہاں اور آگے بکڑتے یا ئے معروف
- ۲۱۶۔ دیوک = ف۔ اسم = دیک
- ۲۲۸۔ ٹیک = طہ اسم مکبر تائے ہندی۔ ٹیکرا۔ ٹیکڑا = ٹلیہ
- ۲۳۱۔ سیر = سرکا اشباع
- ۲۳۵۔ ط = مرا کی بجائے بڑا۔ غالباً یہ بھی درست ہے۔
- ۲۳۶۔ سینہ کی یا ئے معروف = خت
- ۲۴۰۔ میراں جی شمس العشاق م ۱۵۔ ۱۰۔ ۹۱۰ = تقریباً حسب بیان عبد الجبار
- ۲۵۱۔ لکھیں = شمار کیا = سمجھا = خیال کیا۔
- ۲۵۳۔ فاتحہ = جائے حلی = خت
- ۲۵۶۔ نشر ہوا۔ پھیلا۔ وسیع ہوا
- ۲۶۹۔ برہان الدین خانم = م ۱۵۔ ۶۔ ۹۵۰
- ۲۸۸۔ پٹنچا = مصدر۔ ۵۔ مکبر فون و فتح با ئے فارسی۔ پیدا ہونا۔ نکلنا۔
- ۲۹۶۔ ہوت = ع۔ اسم مہفوت = ہو + ہوتیہ =
- ۳۰۹۔ آرام بردوزن حرام = ق
- ۳۱۰۔ ماتا = صفت۔ س۔ سرشار
- ۳۱۴۔ امین الدین اعلیٰ م ۲۱ یا ۲۲ رمضان سنہ ۸۵۰ھ
- ۳۱۹۔ لازمہ = یہ لائبہ کا عجیب ترجمہ ہے عربی میں بُد بالفتح و بتشدید وال مہملہ کے معنی ہیں۔ بجاؤ۔ گزیر۔ کائبہ کا ترجمہ ہوگا بجاؤ نہیں۔ گزیر نہیں۔ اسی کو مثبت طریقہ پر کہیں گے ضروری۔ ضروری پر لافنی کا سابقہ لانے سے معنی غیر ضروری ہو جائیں گے۔ باں ہمہ دکھنی میں لازمہ کے معنی ہیں ضروری۔

- ۳۲۳۔ اس سے شائد سید محمود خوش دہاں مراد ہیں جن کا انتقال بقول عبد الجبار سنہ نو سو پینسٹھ ہجری میں ہوا۔
- ۳۲۹۔ ط = نہیں کی بجائے نہاں = خاک
- ۳۳۳۔ فرق۔ یہاں فراق یعنی جدا کے معنی میں ہے۔
- ۳۳۵۔ او اسی = بالضم بردزن صُراحی = س۔ صفت واسم مذکر = اکیلا۔ بے کس پرہیزگار۔ تارک دنیا۔
- ۳۳۸۔ غرق آب اور آگے بیت نشان تین سو اسیٹھ پر = گہرا پانی = دھن میں غرق آب کا اطلاق کسی زمین میں بارش کے پانی کی جمع شدہ اتنی مقدار جس میں ایک شخص باسانی ڈوب سکے۔
- ۳۵۲۔ کلیمہ = کلمۃ کا اشباع
- ۳۵۵۔ سید محمد بخاری م سنہ ۱۰۹۷ھ
- ۳۵۸۔ اُلیٰ = یائے مجہول = خت
- ۳۸۶۔ درکارف = اسم۔ بالفتح وَر = بالا = زبر۔ مراد کام پر پورا قابو رکھنے والا ماہر فارسی میں در بطور سابقہ جیسے ورزور، ورگوش و وزناس اور بطور لاحقہ جیسے جانور طاقت وراور نام ور۔
- ۳۷۱۔ قابل رہنا = ط = قابل۔ زیادہ مناسب عامل معلوم ہوتا ہے۔
- ۳۷۲۔ وجے = وجہہ = طرح = قسم = نوع۔ تخفیف دجے۔
- ۳۷۴۔ کھر گیا = ط = کھرنا کی اصل و نسل کا پتہ نہیں مل سکا۔ سعی حاصل معلوم ہوتے ہیں۔ والعلم عند اللہ۔
- ۳۸۶۔ امت = بتخفیف میم = ق
- ۳۸۹۔ ط = اند کرد = خاک۔ صیح اندکار = بفتح نون۔ ہ اندھکار۔ اندھارا =

اندھیرا = اندھیرا = اندھیر

۳۹۲۔ سار = سوار کی تخفیف = ق

۳۹۹۔ ط میں باط بتائے ہند کی بجائے بتائے قرشت یعنی بات ۔

۴۰۰۔ جنگم = بالفتح و دحرف نون غنہ کے بعد کاف فارسی مفتوح - س - علاقہ

کرناٹک - فرقہ لنگایت ویرشیوا یعنی شرن بسا کے پیڑوں کا وہ تارک دنیا

شخص جو عوامی خیرات پر بسر کرتا ہے۔ یہ سر کے بال نہیں مونڈتا۔ جوڑا باندھا

ہوا ہوتا ہے۔ یہ اپنے پیروں میں چین پہنے ہوئے گھنٹی بجا بجا کر خیرات

طلب کرتا ہے۔

۴۱۲۔ ط = سہا حق اس ارج اس صورت میں حق کے قاف کو مشدہ پڑھنا چاہئے

معنی بھی درست رہتے ہیں۔

۴۱۴۔ عروض و ضرب باسقاط الف لام۔

۴۱۵۔ شاہ علی بابا فرزند امین الدین اعلیٰ نیز آگے بیت نشان ۴۲۷، ۴۲۸

دیکھیے۔

۴۱۸۔ راتا = ہ - صفت = رنگین

۴۲۱۔ حصور = واوخت

۴۲۶۔ کلت = ہ - اسم - بفتح کاف و کسر لام = الفت = محبت + مدہ کلت =

سرشار عشق۔

۴۵۰۔ قرب = تجرک رائے مہملہ = ق

۴۶۵۔ کھار = ھ = بار = فارسی۔ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔

۴۶۶۔ وفا کا قافیہ نفا (= نفع) دکھنیوں کی تخفیف = "جیسا بولتے تھے ویسا

باندھتے تھے" کی ایک اور مثال۔

- ۲۶۷۔ کلاب = ع۔ اسم۔ کلب کی جمع بکسر۔
 ۲۶۹۔ ہرور بروزن بھر کر = ق
 ۲۷۷۔ ط۔ نالیک تو = اس صورت میں نالیکہ یعنی مت لکھ۔
 ۲۷۸۔ چوہ۔ اسم = چار + سار = ہ۔ صفت = قدر۔ جو سار = گراں قدر
 ۲۷۹۔ عذر بروزن بدل = ق
 ۲۸۲۔ بیگ۔ ہ۔ صفت۔ تیزی = حلبی۔ عجلت
 ۲۸۲۔ ط = بولا ہے تو = غالباً شک۔
 ۲۸۵۔ غیور = بتشدید یا ئے معروف = ق۔

اہل علم کے لیے چار نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی: جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط دار شائع ہو رہی ہے قیمت صرف ۱۲ روپے

کے مقابلہ میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے

آج ہی سبز دس روپے بیگنی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک ۱۲ جلدیں

طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۶ جلدیں حلبی طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ جلالین شریف: مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) لباب السقول فی اسباب

النزول (۲) معارف الناسخ والمنسوخ لابن الحرم قیمت مجلد ۲۰ روپے

۳۔ شرح ابن عقیل: النبی ابن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت مجلد ۲۰ روپے

۴۔ شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی سورہ بقرہ تین جلدوں میں شائع ہو رہا ہے پہلی جلد

آچکی ہے۔ نمونہ طلب فرمائیں۔

نوٹ:- ادارہ مصطفائیہ۔ دلیو بند ضلع سہارنپور

ہندو تہذیب اور مسلمان

(جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

(۳۱)

علی محمد خاں روہیلے کی سرکار کے ہاتھوں کی تعداد کا ذکر کسی عرصہ کتاب میں نہیں ملتا مگر ان کی سرکاری کافیا ہاتھی تھے۔ جس زمانہ میں محمد شاہ نے بن گلڑھ پر حملہ کیا تھا اور نواب علی محمد خاں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ ہاتھی پر سوار ہو کر آیا تھا جس پر سنہری سودا رکھا ہوا تھا۔

قائم جنگ بہادر والی ریاست فرخ آباد نے نواب وزیر الممالک عماد الدولہ کی مدد میں دو ہاتھی بطور نذر پیش کئے تھے۔

ہندوستان کے تمام دولت مند مسلمان ہاتھی کی سواری باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ بنگال میں ہاتھی کی سواری عام تھی۔ سہ نوابین بنگال اور ان کے قریب رہنے والے صاحبین اور امراء کے یہاں

۱۔ سفرنامہ غلط ص ۷۶

۲۔ ایضاً ص ۵۲ برائے شواہد ملاحظہ ہو۔

TWINING TRAVELS IN INDIA. P. 166

۳۔ خلاصۃ التواریخ ص ۷۷

سواری کے الگ ہاتھی ہوتے تھے لہ
ہاتھیوں کی سواری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے، گردس نے لکھا ہے کہ
شاہن، شہزادگان، مغلیہ، صوبائی گورنروں، یا ملک کے عہدیداروں کو ہاتھی کی
سواری زیب دیتی تھی۔ بقول مصنف بڑا، عوام کے دلوں میں رعب و دہم پیدا
کرنے کے لئے اور اپنی عظمت و شکوہ کا سکہ بٹلانے کے لئے ہاتھی کی سواری سے
زیادہ بہتر کوئی دوسری سواری نہ تھی۔ سواری کے ہاتھیوں کو بھڑکیے کپڑوں اور
زلیارات سے سجایا جاتا تھا اور پیٹھ پر عماریاں کسی جاتی تھیں۔ اس عماری پر
بیٹھا سوار شخص عظمت ظاہر کرتا تھا۔

اٹھارہویں صدی میں ڈگریزوں کے آنے کے بعد اور میدان جنگ میں بندوقوں
اور دوسرے بارود کے اسلحوں کی وجہ سے جنگ میں ہاتھیوں کا استعمال متروک
ہوتا جا رہا تھا اور مابعد ہاتھی صرف سواری کے کام آتا تھا۔
شاہن، شاہن، مغلیہ اور امراء، صاحب ثروت لوگ ہاتھی کی سواری کو بے حد
پالکی پسند کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری سوار یوں کے مقابلہ میں زیادہ آرام دہ
تھی۔ بہت سے یورپی سیاحوں نے ہاتھیوں کی ساخت وغیرہ کا تفصیلی ذکر

PROVINCE OF BIHAR STATISTIC OF BIHAR

CITY OF SAHARAM P. 498 VALENTIA. 1, P. 228-29

TRAVELS IN INDIA: 1, P. 153 ایضاً ص ۱۵۳

اچھی ہاتھیوں کو جو کوچ کی طرح ہوتی ہیں، آدی اپنے کاندھے پر لے جاتے ہیں۔ ان کے

FORSTER TRAVELS IN INDIA 312 اور شاہین ہوتا ہے۔

آئین اکبری (رات) ج ۱، ص ۲۷۳

کیا ہے۔

ٹراوریز لکھتا ہے۔ "یہ ایک قسم کی چھ یا سات فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی چارپائی ہے جس کے چاروں طرف ایک جھوٹا سا گھیرا ہوتا ہے۔ ایک قسم کے نرم بید کو کمان نما ٹیڑھا کر کے اس کے درمیان میں لگاتے ہیں جس پر کپڑا منڈھ دیا جاتا ہے یہ کپڑا ساٹن یا مکلف ہوتا ہے۔ جس رخ پر سورج کی کرنیں پڑنے لگتی ہیں تو خادم اس جانب کا پردہ گرد دیتا ہے۔ ایک دوسرا خادم بھی ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں ایک ڈھالی نما ٹکڑی کی چھتری ہوتی ہے اور جب بالکی نشیں کے منہ پر سورج کی کرنیں پڑنے لگتی ہیں تو وہ اس سے اس کی حفاظت کرتا ہے اور اُسے سورج کی تپش سے بچاتا ہے۔ بالکی کے دونوں بانسوں کے درمیان حصے کو سیدوں سے بٹن دیا جاتا ہے اور یہ پانچ فٹ لمبے ہوتے ہیں۔ ان بانسوں کے ساتھ ساتھ تین تین آدمی ہوتے ہیں جو اپنے کا ندھ پر بالکی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ان کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے کیونکہ ایام طفلی سے اس کام کی انہیں مشق کرائی جاتی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص اپنا سفر ملبدی طے کرنا چاہتا تھا تو وہ بارہ کبار بالکی اٹھانے کے لئے لگتا تھا تا کہ وہ ایک دوسرے کی وقتاً فوقتاً مدد کرتے رہیں لہٰذا

برسات کے زمانے میں ان بالکیوں پر بموم جالے کا کپڑا چڑھا دیا جاتا تھا۔ چونکہ بالکیوں کو کبار اپنے کا ندھ پر لے جاتے تھے اس لئے ابو الفضل نے کباروں اور ان سواروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کے لئے کباروں کی خدمات حاصل

TRAVERNIER = ۱, P 45

لہ

۲۵ ص / ایضاً۔

۲۹ ص / ایضاً۔

کا جاتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ ملازم بھی ایک قسم کے پیادے ہیں جو خاص ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ کبار بھاری بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہیں اور اونچے نیچے ہر طرح کے راستوں کو طے کرتے ہیں۔ یہ لوگ پاکلی، سنگھاسن، چوڈول اور ڈولی اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس فز رفتار سے چلتے ہیں کہ سوار کو کوئی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا۔ اس ملک میں کبار بہت ہیں۔ لیکن ان میں بہترین لوگ دکن اور بنگالے کے باشندے ہیں۔ شاہی آستانے پر کئی ہزار کبار خدمت کے لئے موجود رہتے ہیں۔ ان کے سردار کی تنخواہ تین سو چارسی درم سے زیادہ اور ایک سو باونے درم سے کم نہیں ہوتی۔ معمولی کبار اکیسویں درم سے لے کر ایک سو ساٹھ درم تک ماسوا تنخواہ پاتے ہیں۔" لے

سترھویں اور مالعب کی صدیوں میں ہندوستان میں پاکلیوں کی سواری کا رواج خواص و عوام ہر طبقے کے لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ ان صدیوں کے ہندوستانی ادب اور سیاحوں کے بیانات میں پاکلی کے رواج کا کثرت سے ذکر ملتا ہے۔ امراء کی سواریوں کا ذکر کرتے ہوئے برنیر نے لکھا ہے کہ بعض عمدہ ہاتھیوں پر اور اکثر مکلف پاکلیوں میں، جن کو چھ کبار اٹھاتے تھے سفر کرتے تھے۔ امراء ذریعت کا تکیہ لگا کر بیٹھتے، پان چباتے اور حقہ کے کش لگاتے، سفر کرتے تھے لے

لے آئن اکبری (۱-۲) ج ۱، ص ۳۷۲-۳۷۳، جو جز کا بیان ہے کہ بالعموم ہر ایک پاکلی کے ساتھ نو کبار لگائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ دو آدمی یا دو لڑکے مزید ہوتے تھے جو سامان اٹھاتے تھے اور مشعلیں لے کر آگے

چلتے تھے۔ TRAVELS IN INDIA PP 16-17

لے ریسر (انگریزی) ۲۱۴، ۳۷۰-۳۷۱

عہدِ مغلیہ میں پاکلی خانہ، ایک علیحدہ شعبہ ہوتا تھا۔ اس کا ناظم داروغہ پاکلی خانہ کہلاتا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے زیادہ شاہانِ مغلیہ عیش پرست تھے لہذا دیگر سواروں کے علاوہ ان کو پاکلی کی سواری زیادہ مرغوب خاطر تھی۔ محمد شاہ بادشاہ خاص طور پر پاکلی کی سواری پسند کرتا تھا۔ کیونکہ اسے فتنے کا عارضہ تھا جس کی وجہ سے اُسے ٹھوڑے کی سواری میں تکلیف ہوتی تھی۔ شاہی خاندان کی مستورات بھی پاکلیوں میں سفر کرتی تھیں۔

بادشاہوں کی طرح اس عہد کے امراء بھی عیاش اور نازک مزاج تھے۔ چھوڑ اور ہاتھی کی سواری کے بجائے پاکلی کی سواری کرتے تھے۔ ہر چہ داس نے روشن الدولہ طرہ باز خاں کی سواری کی پاکلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں اتنا زیادہ سونا لگا ہوتا تھا کہ فقراء تو لوں سونا حج کر لیتے تھے۔

۱۔ رسالہ محمد شاہ دہلی دوران، خان ص ۱۶۸، تاریخ احمد شاہی ص ۹۲ الف

INDIA AT THE DEATH OF AKBER : P. 166

۲۔ واقعات اطفری ص ۱۵۵

۳۔ برتیر ص ۳۷۲

۴۔ امراء کی پاکلیوں کے سامنے فاقہ مست اور ملازم پیشہ لوگوں کے غوغا کا ذکر کرتے ہوئے سودا نے لکھا ہے۔

ہندو و مسلمان کو پھر اس پاکلی اوپر اربھی کا توہم ہے جنازہ کا گماں ہے

ناچار ہر پھر حج ہوئے قلعہ کے آگے حج پاکلی نکلے ہے تو فریاد و فغان ہے

کلیات سودا ۱/ ص ۳۶۲-۳۶۵

”فیض اوتا بجای بود کہ پاکلی دخیل براد سوار می شد از مقیش
 طلا تیار می آمدی نمود کہ ہر روز در سواری او کھاراں و فقراہ تو لہ ہا
 مقیش از زمین می چیدن لہ
 امیرالامراء حسین علی خاں اگر پاکلی پر سوار نہ ہوتا تو اس کا قتل اتنا آسان نہ
 ہوتا جتنی آسانی سے اُسے قتل کر دیا گیا تھا لہ
 دربارِ مغلیہ سے بطور طرہ امتیاز امراء کو پاکلیاں عنایت کی جاتی تھیں۔ احمد شاہ
 بادشاہ نے اپنے ماموں مان خاں مطرب کو پاکلی جھالہ دار عنایت کی تھی لہ
 سارے شمالی ہندوستان میں پاکلی کی سواری کا عام رواج تھا لہ کشمیر میں

لہ چارنگزار شجاعی ص ۲۲۸، نیز ملاحظہ ہو کلیات نظیر اکبر آبادی

وہ پاکلی بنی تھی سہری جو زرنگار پد جھالہ پہ جس کی ہوتے تھے موتی پڑے شاہ ص ۵۳۷
 ۵ خانی خاں ۲/ ص ۹۰۳-۹۰۴، سیرالماخرین (۱-ت) ۲/۶۰۷ دربارِ معلیٰ سے اعتقاد خاں
 پاکلی پر سوار ہو کر بھاگا تھا۔ سیرالماخرین (۱-ت) ۲/ ص ۴۲۔

۵ تاریخ احمد شاہی ۱۲۱۷ اب ۱۶ اب ۱۶، رقعات مرزا قتیل ص ۷۴۔

۲ ہم عصر نوادہ کے لئے ملاحظہ ہو TWNING: TRAVELS IN INDIA PP. 54-58. 64-77
 P. 186

MRS MIR HASAN ALI OBSERVATIONS ETC. P.P. 170-172

VALENTIA - TRAVELS ETC. 1-P. 240 GROSE TRAVELS 1. P.P 153-55

HODGES - TRAVELS IN INDIA PP 100-130 -

چارنگزار شجاعی ص ۱۳۵ الف ۱۶ اب ۱۶، رسالہ محمد شاہ و خانہ دریاں خاں ۱۶ اب ۱۶ کا نامہ عشق علی الف

و قلعہ اندرام مخلص ۲/ ص ۲۰، MEMOIRS OF DELHI AND FAIZABAD
 ۱۱. P. 59

تذکرۃ الملوک ۱۱۳ الف ۲۵، سوانح اعظم خانی ۲۵ الف ۲۵، خزینہ نامہ ص ۷۷ اب ۱۶، مجالس رگین ص ۵۸

عیار الشوالہ ص ۱۹۲ الف ۱۶، واقعات اطعزی ص ۱۲۸۔

عمدہ قسم کی پاکلیاں بنی تھیں لہ پاکلی کی ساخت میں اختراعات کرنے والے کارمگروں کو شاہی انعام ملتا تھا۔

ایک مرتبہ احمد شاہ بادشاہ کے وزیر اعتماد الدولہ نے بادشاہ کی خدمت میں ایک پاکلی نذر کی جس میں کچھ اختراعات تھیں۔ بادشاہ نے اس پاکلی کا معائنہ کیا۔ کچھ مفید مشورے دیئے اور کہا روں کو سوردپے بطور انعام دیئے گئے۔

رسالہ محمد شاہ دغان دوراں میں پاکلی کے شجے کی تباہی کی داستانیں بڑے دلدور اذاز میں ملتی ہے۔ یہ سہ ہیر نے دیوان عام میں لڑائی بھوٹی پاکلیوں کا ڈھیر دکھایا تھا۔
 سہ سکھ پال اپنی ساخت میں ڈولی کی طرح ہوتا تھا لیکن صرف اتنا فرق تھا کہ
 سہ پال { اول الذکر صہامت میں ڈولی کے مقابلے میں کچھ بڑا ہوتا تھا۔ بنگال کے

لہ برتیر - ص ۲۰۲

لہ تاریخ احمد شاہ ۹۲ الف ب -

لہ رسالہ محمد شاہ دغان دوراں خاں ص ۱۶۸ ب

لہ HEBER TRAVELS ETC 1, P. 562

لہ سکھ آسن اور نگھاسن کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) ص ۲۶۲ جلد دوم ص ۱۳۲

INDIA OF AURANGZIB: PP 41-42

لہ منجی ۲/ص ۹۲ پلیٹ نمبر ۱۸۸-X مولانا عبدالحلیم شرر نے سکھ پال کی ساخت کی وضاحت اس طرح کی ہے
 "سکھ پال ان دنوں عورتوں کی نہایت سوز سوار تھی جو خالص ہندوستانی چیز اور ہندی مذاق کے
 تفکرات کا مکمل نمونہ تھی۔ یہ ایک سبز گنبد نما ڈولی تھی، ایک لمبے چوڑے کھوٹے پائیک شاندار لال برقع
 بنادیا جاتا تھا جس میں سونے چاندی کے کلس لگے ہوتے تھے۔ چاروں طرف پردے لٹکے ہوتے۔ اس میں
 بھی آگے پیچھے دو دو ایک ایک ڈنڈے ہوتے اور بہت سے کہا ران کو اٹھا کر لیجاتے یہ سواری
 عالی مرتبہ بیگمات اور محل شاہی کی خاتونوں کے لئے خاص تھی" گذشتہ لکھنؤ ص ۴۰۱-۴۰۳

کے دو تین لوگ سکھ آسن اور سکھ پال کا استعمال کرتے تھے۔ اس کی ساخت فوس ناڈولی کی سی ہوتی تھی جو اونٹ کی ادن اور ریشمی کپڑے یا گلناری رنگ کے کپڑے یا اسی قسم کے کسی دوسرے کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اُس کے دونوں جانب مختلف قیمتی دھاتوں کے تپے جڑے ہوتے تھے۔

ابو الفضل نے سکھ پال کو خشکی کی کشتی سے تعبیر کیا ہے کہ یہ اتنی کشادہ ہوتی تھی کہ دورانِ سفر میں اس میں آبِ سانی بیٹھا، لیٹا اور سویا جاسکتا تھا۔
صاحبۃ الزمانی والدہ احمد شاہ بادشاہ، دورانِ سفر میں سکھ پال کا استعمال کرتی تھی کہ شاہ عالم ثانی نے سنگھاسن کی سواری کا ذکر کیا ہے کہ
سنگھاسن، پالکی کے علاوہ بنگال کی سواریوں میں جو آگہ کی سواری کا بھی ذکر ملتا ہے
مگر برسات کے زمانے میں بالعموم کشتیوں پر سفر سہوتا تھا کہ

- ۱۔ آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) ۲/ ص ۱۲۲، نیز ریاض السلاطین (انگریزی ترجمہ) ۲۲
۲۔ اکبرنامہ (انگریزی) ۱/ ص ۲۱۵، بڑے سکھ پال اور سکھ آسن ملاحظہ ہو، اکبرنامہ (انگریزی ترجمہ) ۲/ ص ۲۱۵
۳۔ آئین اکبری (انگریزی ترجمہ) ۲/ ص ۱۳۲، بھنڈاری سنگھاسن کے بارے میں لکھتا ہے: خاصہ حکام
بارش و درخشگی بہ سنگھاسن کہ در رہ نوردی دروں آں نشستن و دراز کشیدن و خوابیدن
بنا لیستی رودہد و بر فرازان صیبت تابش و بارش گزیں سرپا ہی بر سازندہ
خلاصۃ التواریخ ص ۷۷

۴۔ تاریخ احمد شاہی ص ۴۲ ب

۵۔ ناعدات شاہی ص ۸۷

۶۔ ریاض السلاطین (انگریزی ترجمہ) ص ۲۲

۷۔ ایضاً ص ۲۲

ناکی، پالکی اور تختِ رولا کی ساخت کی طرح ہوتی تھی۔ خانی خان
 { ناکلی نے ان الفاظ میں اس کی بناوٹ کی وضاحت کی ہے۔
 ” ناکلیہا کہ بصورت تختِ رواں ترتیب دادہ بودند“

ناکی کی سواری صرف شاہانِ خلیہ کے لئے مخصوص تھی اور یہاں تک کہ شہزادے
 بھی بادشاہ کی اجازت کے بنا ناکلی پر سوار نہ ہو سکتے تھے۔ بہادر شاہ اول نے اپنے
 چاروں بیٹوں کو ناکلی پر سوار ہونے کی اجازت دی تھی۔ خانی خاں کا بیان ہے،
 ” ہر چہا را خزر بزع سلطنت را حکم سوار شدن بر ناکلی فرمودند“

ایک اور واقعہ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں اظفری بے پور
 میں وارد ہوئے تو وہاں کے راجہ نے ان کی خدمت میں ناکلی سواری کے لئے پیش کی تو
 انہوں نے جواب دیا۔

” یہ بھی آپ نے زیادتی کی کہ حضرت شاہ عالم بادشاہ سلمہ اللہ تعالیٰ
 کے حکم کے بغیر ناکلی پر سوار ہوئے۔ اس کا جرم نامہ ادا کرنا چاہئے۔ شاہزادوں
 کی یہ مجال نہیں کہ حضور کی عنایت و اجازت کے بغیر ناکلی پر سوار ہوئے۔
 مستورات شاہی ناکلی کی سواری کرتی تھیں۔ صاحب الزمانی قدسیہ یگم والدہ
 احمد شاہ بادشاہ قدم شریف کی زیارت کے لئے ناکلی پر گئی تھیں۔“

۱۔ خانی خان ۲/ص ۵۹۹، ۶۲۶، خز نامہ (قلعی) ص ۷۷، ایک مرتبہ اظفری نے
 تخت پر ڈنڈے لگا کر ناکلی بنائی تھی۔ واقعات اظفری ص ۴۳

۲۔ خانی خان ۲/ص ۵۹۹، ۶۲۶، سیر المتاخرین (فارسی) ۲/ص ۳۷۸

۳۔ واقعات اظفری ص ۸۳

۴۔ تاریخ احمد شاہی ص ۸، اب ۱۶، الف۔

نانکی خانہ کا شعبانگ ہوتا تھا اور اس کا ناظم داروغہ نانکی کہلاتا تھا۔ نانکشاہ
 کے محلے کے بعد یہ شعبہ تباہ ہو گیا تھا۔ بقول مصنف رسالہ محمد شاہ دہلی دورانِ خان۔
 ”دنانکی جسم خود را از چند قطعہ چوب آراستہ و جو ریشہ بختار د
 پیشہ بر خود اختیار کردہ مدت العمر روغن بر بدن مالیدہ و محنت و پیشکار
 نقاش بر خود چسبیدہ و از گرد و خاک پرہیز ساختہ دیری بکنج
 عزت گزیدہ“ لے

لے م سکھ پال، ڈولی اور سیانہ کی سواریوں میں غالباً چنڈول سب
 چنڈول سے زیادہ آرام دہ ہوتی تھی۔ یہ مکان کے ایک کمرہ کی طرح چاروں
 طرف سے بند اور ڈھکی ہوتی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کو ملے جڑے یا ریشی پردوں سے
 کھایا جاتا تھا۔ ریشی کپڑے کے بنے ہوئے اس میں گتے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اس کے فرش پر
 شیر کی کھال بھی بچھا دی جاتی تھی لے کچھ لوگ چنڈول کو سمیں ملموں سے مزین کرتے

لے رسالہ محمد شاہ و خانہ دورانِ خان ص ۱۶۸ ب-۱۶۹ الف، تاریخ احمد شاہی ص ۸ الف
 لے آئین اکبری (۱-ت) ۱۷، ۱۸، ص ۳۷۳۔

لے TRAVELS IN INDIA IN THE 17TH CENTURY. P. 187

الہ میرجن علی نے چنڈول کی بناوٹ کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ چنڈول یا کئی ناکہ سواری
 تھی لیکن کچھ سے زیادہ کثرت اور شاندار ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ ایک سیس چھوٹا سا کمرہ تھا جو چھوٹے
 لمبا پانچ فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا ہوتا تھا۔ یہ کمرہ چار سیس لمبوں پر ٹکا ہوتا تھا جس کو سیس کپڑے
 اٹھاتے تھے۔ مزید برآں اور کبھی کبھار ان کی مدد کے لئے ہوتے تھے۔ ایک تہائی میل مسافت طے
 کرنے کے بعد دوسرے کھار آ جاتے تھے اور پہلے والے آرام کرنے لگتے تھے کھاروں کے لباس بھی سبز کپڑے

ہوتے تھے برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ OBSERVATIONS ETC 249-51

GROSE: TRAVELS IN INDIA ۱, P. 155

نیز ملاحظہ ہو

تھے اور بعضے ان پر پھول تنبیوں کے نقش و نگار اور دوسری حیرت انگیز تصاویر بناتے تھے یا گول ملیح گیندوں سے سجاتے تھے لے مزید برآں چنڈول میں ایک خوبصورت برتن بھی لٹکا ہوتا تھا جس میں پینے کے لئے پانی ہوتا تھا۔

چنڈول میں دو بہت خوبصورت اور مزین اور موٹے بانس لگے ہوتے تھے جن کے اگلے اور پچھلے سرے بڑھے یا خم دار ہوتے تھے۔ چنڈول کو بارہ کبارہ کا بندھے پر اٹھاتے تھے تین آدمی ایک ڈنٹے کے ساتھ یعنی چھ آگے اور چھ پیچھے لے

شاہی خاندان کی مستورات چوڈول یا چنڈول کی سواری پر باہر نکلتی تھیں ان چوڈولوں کی ساخت اور سجاوٹ عام چوڈولوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی لے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمان گھرانوں میں شادی کے موقعوں پر دلہن کو چنڈول پر رخصت کیا جاتا تھا لے

۵۴ ڈولی ابتدا میں زنانی سواری کے لئے مخصوص تھی لیکن بعد میں مرد بھی اس کا ڈولی استعمال کرنے لگے تھے لے فورسٹر نے ڈولی کی ساخت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

”جنوبی ہندوستان کی سواریوں سے بالکل مختلف ایک قسم کی

۱۷ SOCIAL LIFE DURING THE MUGHAL AGE, P. 132 لے

۱۸ چنڈول کی ساخت کے لئے ملاحظہ ہو۔ منوچی م/ص ۳۲ لے

۱۹ برنیرس ۳۷۱-۳۷۲ لے

۲۰ مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۲۸، گروس ا/ص ۱۵۵ لے

۲۱ آئین اکبری (۱-ت) ج ۱، ص ۳۷۳ لے

۲۲ تذکرہ ہندی۔ تذکرہ رسوا دص ۱۰۷ لے

سواری ہے۔ لکڑیوں کے چار خمدار ٹکڑوں سے ایک ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے جو سڑکے چار فنٹ لمبا اور تین فنٹ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کے فرش پر کپڑا بچھا ہوتا ہے یا بید کی تیلیوں سے بنی ہوتی ہے۔ تین فنٹ لمبے یا نس اس ڈھانچے کے باہری لنگے اور پچھلے حصوں میں لگے ہوتے ہیں اور لوہے کے تاروں سے ڈھانچے سے کس دیئے جاتے ہیں۔ ان بانسوں کے سروں پر ڈوری بندھی ہوئی ہے درمیانی بانس کی لمبائی تین فنٹ ہوتی ہے چار آدمی اس کو کاندھے پر اٹھا کر لے جاتے ہیں لے

بالعموم عورتیں ڈولیوں پر سفر کرتی تھیں۔ انشاء اللہ خاں انشاء کا ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلا ہے آج
جائیاں میں جو کچھ کچ ڈولیوں پر ڈولیاں لے

انشاء کے ذیلی بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکٹھا رہیں صدی کے اختتام کے زمانے میں ڈولیوں کی سواری کی سماجی حیثیت گرنے لگی تھی اور رقاصاؤں کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ انشاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رقاصہ کے علامہ دد سکر مراد پور رست بھی اس کا برائے سواری استعمال کرتے تھے مگر تدریجاً تجوری وہ آجے لکھتا ہے کہ میانہ اور پٹنہ کے رواج پا جانے کے بعد بھی رقاصائیں مجلسِ کدخدائی میں شرکت کے

لہ FORSTER = TRAVELS IN INDIA II, PP. 2-3

TWINING : PP. 342-473

لہ کلیات انشاء ص ۲۰۱

لہ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ میر۔ ۱/ ص ۱۷۱، گزشتہ کھنڈ ص ۳۹۹

لہ گزشتہ کھنڈ ص ۳۹۹

لے ڈولیوں پر ہی جاتی تھیں لہ
 پاکی، نالکی، ڈولی، چندول بردار کہا روں کا لباس بھی زرق برق ہوتا تھا
 اور خاص کر شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے لباس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا
 ایک شہزادے کی برات کی پاکلیوں اور نالکیوں کے کہا روں کے لباس کا میر حسن
 دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا ہے۔

کہا روں کے زربفت کی کرتیاں
 اور ان کے دبے پاؤں کی بھرتیاں

(باقی آئندہ)

لہ دریائے لطافت (۱-ت) ۱۱ (فارسی) ص ۶-۷

خواجہ کے لئے دیکھئے

FORSTER = TRAVELS IN INDIA. II, PP 2-3

ORIGINAL LETTERS FROM INDIA, P. 140

TWINING - TRAVELS IN INDIA. P. 342

HEBER - I, P. 351

VALENTIA - I, P. 155 GROSE, I, 155

کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص ۵۳۷ سیر المتاخرین (۱-ت) ۴ (ص ۲۴۱)

مجموعہ شہنویات میر حسن ص ۳۶-۳۷ نیز ملاحظہ ہو۔ اہلبیہ میر حسن علی۔

OBSERVATIONS. P. 251

آثارِ نبیؐ یا افکارِ نبیؐ

از جناب قطب الدین صاحبِ رآباد

چہ جہاں تازہ کی افکارِ تازہ سے نچھوڑو
کہ سنگِ دشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

(اقبال)

موجودات میں ہر وجود صفاتِ ثلاثہ سے سوار اگیا ہے — زمان، مکان
ردان — حسبِ ترتیب پہلی دو صورتیں آنی و فانی اور آخری صورت، روح و روان
باقی و جاری رہنے والی ہے و یقینی وجہ سربلکِ ذوالجلالی والا کرامت۔

عالم ارواح ہر چیز کا مصدر ہے، اور عالمِ احباد منظر۔ منظر میں جب تک روح کا رُخ
ہے، وہ مؤثر ہے، اور جب روح تھی دامن ہو جائے، تو ایک سازِ شکستہ بے نعمت و
آواز ہے۔ اسلام مظاہر و آثار کو پرکھنے کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا، اس کے اولین
مقاصد میں ان شکوہوں کو مسمار کرنا ہے۔ کوہِ طور حضرت موسیٰؑ کا تجلی گاہ رہا، کیا
وہ اس مہیٹ تجلی کی علی الدوام پرستش کرتے رہے؟ نہیں اسے سنگِ میل کی طرح
پچھے چھوڑتے ہوئے منبعِ تجلی اور مشرقِ انوار کی لڑی میں تیز گامی کے ساتھ آگے نکل گئے
اور قلب و جگر کی زمزمہ پردازیاں فضا میں مرتعش ہو کر یوں سامعہ نواز ہوئیں کہ
اگر زماں برقِ بے پردا درونِ او تہی گرد
بہ چشمِ کوہِ سینا می نیرزد با پرِ کاہے

(اقبال)

مذہبِ عالم کے معتقدات کی اگر تحقیق و تدقیق کی جائے تو اصنام پرستی کی ابتدا
مجاہدین عن الحد تعظیم و تکریم ہی سے ہوئی ہے۔ جب ادب میں غلو ہونے لگتا ہے تو دی
بے ادبی کا آغاز بن جاتا ہے۔ ادب کے معنی صرف ماتھا ٹیکنا یا چو کھٹ کو چومنا نہیں بلکہ
اس کا اصل مقصد حدود کے اندر رہتے ہوئے تعظیم و تکریم کے ساتھ احکام کی بجا آوری
ہے۔ دنیا میں جتنے شکدے آباد ہیں وہ سب اسی تو غل کے برگ و بار ہیں۔ اس ظلمت کدہ
میں آباد میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو تقویرات کے آفریدہ خداؤں اور سومانوں سے
خالی ہو۔

شد سنگ آستانہ دیں ہر بتے کہ بود
ہر کس بہ وضع خویش گزارد دو گانہ را

(غنی)

انوس سلمان قوم بھی اس کا شکار ہو گئی اور ان کے ہاں ایسے صنم کدوں کی بہتات
ہے جن کا الی الان تاریخ کرنے والا کوئی غزنوی نہیں پیدا ہوا۔
کیا نہیں اور غزنوی کا رگڑ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومات

(اقبال)

اسلام نے اپنی تعلیمات سے آثار پرستی کو بخ دین سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ صرف تین
مقامات کے لئے شرعاً حال کی اجازت دی گئی ہے۔ وہاں بھی وجہ تکلیف و ترغیب
خالق کائنات کی پرستاری ہے اور پچاس ہزار سے ایک لاکھ نمازوں کے ثواب
سے نوازاجا رہا ہے۔

اللہ نور السموات والارض واللہ بکل شیء علیم
ہم کو مشکوٰۃ ازجاج کو کب، شرقی و غربی سے گزر کر مشرق انوار کی جہت رہ سہا رہنے

پراگیا ہمارا ہے

ما از پئے لومے کہ بود مشرقی الخوار
از مغربی و کوب و مشکوٰۃ گزشتیم
قدح چون دمنابا شد بہشیرانِ مجلسِ دہ
مرا بگذار تا حیراں بجانم چشم بر ساقی

(سعدی)

دل بہ کسے بناختہ باد وہاں نصاحتہ
من بہ حضور تو رسم روز شمارا میں چنین
(اقبال)

ہر موقع و محل پر اے مست سربکھ قالوا بلی کامیاق دامن گیر ہے۔

چنگ در حضرت خدائے زدہ ہرچہ اونیت پشت پائے زدہ

خوردہ یک بادہ بر رخ ساقی ہرچہ باقی ست کردہ در باقی

ہم خراباتاں و بادہ گسارانِ خکدہ اسلام صہبائے الست سے چورا اپنی سرستوں میں

احکامِ شریعت ہی کو زین و عنان کی صورت پشت و دہان کی زینت بنائے ہوئے ہیں۔

خدائے ساتھ دیوانے۔ لیکن محمدؐ سے ہوشیار محمدؐ محمدؐ کہہ کر دست افشانی کرتے

چرخ لگاتے۔ اور اپنی والہانہ سرشاریوں میں جھوم جھوم کر حلہ فشاں و پائے کوب

نئے دھرت کے خم پر خم لٹھکاتے ہیں، اور لب و لسان پر مترنمانہ پیشتر نقصاں پہتا ہے

خراباتاں سے پرستی کنید محمدؐ بگوئید و مستی کنید

یعنی غیب جی بھر کر حال کھیلو، حلہ فشاں، دست افشانی، پائے کوبی، چرخ زنی اور سوز و

نیش میں سپند آساز ارنالی کرد، اگر اہم پاک کو دیو زباں بنائے ہوئے۔ چہرہ انور پر عکسی

بانہے ہوئے، اشارہ چشم و ابرو پر جان نچا کر کرتے ہوئے، اور احکامِ شریعت کی نگاہ

در کاب تھامے ہوئے۔

”کعب جامِ شریعت“ در کفے سندانِ عشق ہر سوسن کے مذاذ، جام و سندانِ باطن

(سعدی)

باخیں زورِ جنوں پاس گریاں داشتم درجنوں از خود ز قن کار ہر دیوانہ نیت
(اقبال)

آثارِ نبی یقیناً قابلِ عظمت و تکریم ہیں، لیکن اپنے محل و مقام پر انھیں سینا کے پردوں پر لانا بازاری و کاروباری انداز پر نمائش کرنا، انھیں دولت بٹورنے کا ذریعہ بنانا عند اللہ مبخوض، حدودِ جمعیوب اور سود ادب میں داخل ہے۔ حضورِ انورؐ کے آثارِ فلکمانانہ از روئے مقصد پسندیدہ نہ بلحاظ وسائل پاکیزہ ہے۔ اگر اس میں سے محرک اصلی جذبِ منفعت اور دولت بٹورنے کے عنصر کو نکال لیا جائے، تو دیکھتے پھر کتنے مہر و ان دین و ملت اس کی خاطر اپنی توانائیاں اور کمائیاں صرف کرنے پر کمر بستہ و مستعد نظر آتے ہیں۔

آثارِ نبیؐ کی عظمت و احترام اسی میں ہے کہ وہ عام نگاہوں سے دور اور ان کی دستبرد سے مصون و محفوظ رہیں۔ چنانچہ حج و زیارت کو زندگی میں ایک ہی مرتبہ فرض گردانتے میں یہ بھی ایک اہم مصلحت ہے۔ بار بار ان مقاماتِ مقدسہ کو اپنی مطلب برآریوں اور کام جوئیوں کی جولانگاہ بنانے اور اس کے لئے کجاوے کسنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی حضورؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں صرف ایک مرتبہ حج ادا فرمایا۔ اگر کسی کو خوش نصیبی سے غامِ فراغ سے سبکدوش ہونے کے بعد ان مشاہد کے مشاہدے کا موقع مل جائے تو جیہ سائی کرنا، خاکِ آستان کو سرمہ بنانا۔ بوسہ و تقبیل اور ازین قبیل دیگر خوش عقیدگی کے اظہارات برائے شرفِ گفتن خوب است، لیکن از روئے شریعت یک لخت بے ادبی میں داخل ہے

کسیک خاکِ دلت را کند چو سرمہ بہ چشم
بہ میں چہ بے ادبی ہا بہ آستانہ کند

(عرفی)

یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ہجر اسود اور مسجد نبویؐ کی آرائش و زیبائش سے اپنے جیب و

داس کو زینت دے دے، کوئی دستاویں رکھنے کوئی زیب بگلو کرے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ روزمرہ کسی چیز کو دیکھتا ہے اور ایک کھلی تماشہ بنالیتا ہے تو اس کی قدر و منزلت دل سے نکل جاتی ہے عظمت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ نظروں سے اوجھل رہے اور دیکھنے کی تڑپ باقی رہے۔ خدا کو نہ دیکھ سکے اور سلاطین کے پہلو پر وہ رہنے درو درباں اور سراپروں کے قیود و قدغن سے خدا کو گھیر رکھنے میں ایک مصلحت یہ بھی ہے۔ جب لوگ حج کے لئے یہاں آتے تو حضرت عمر انہیں کہہ میں زیادہ عرصہ تک قیام کی اجازت نہیں دیتے اور اس کی یہ حکمت فرماتے کہ قدر کعبہ دل سے زائل نہ ہو جائے چکیاں قدر کعبہ کے دانندے۔

انسان وہاں ہوتا ہے جہاں اس کا مقصود و مطلوب ہو، جب تک مقصد غائب ہوتا ہے۔ طلب حاضر رہتی ہے اور جہاں مطلوب حاضر ہو تو طلب غائب وہ کہیں اور کھسک جاتی ہے۔ سابر زندگی سوز فراق کا سے مخرب داماں ہے سے

عالم سوز و ساس میں دھل کر بڑھ کے ہے فراق دھل میں مرگب آرزو ہجر میں لذت طلب

(اقبال)

شب امید بہ از روز عید میگذرد کما آتش بہ تمنائے آتش خفت است

(نظیری)

دل جس کی طلب میں بے سکون ہے جب ہاتھ لگے تو ایک فسوں ہے

(مومن)

دنیا کے ہر شائستہ ادب میں انسانی فطرت کے اس خاصہ کی غازی کی گئی ہے شکسیر جس کی مصنفات کو الہامی درجہ دیا گیا ہے۔ وہ اس خاصہ فطرت کو یوں بے نقاب کر رہا ہے۔

ALL THINGS THAT ARE

ARE WITH MORE SPIRIT CHASED THAN ENJOYED.

ذریعہ و تہذیباً میں بھی یہی حکمت دعوتِ فکر و نظر دے رہا ہے۔
 اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی نئے ناکارہ اور شر محض نہیں۔ ہر چیز میں نفع و نقصان
 کا پہلو ملا جلا ہے۔ اسلام اس چیز کو مستحسن قرار دیتا ہے، جس میں نفع کا پہلو غالب ہو
 وہ دفعِ مصرت کو جلبِ منفعت پر ترجیح دیتا ہے فقہیات میں ایک وسیع باب سدا ب
 ذرائع کا ہے جو ذریعہ معتمدہ کا موجب ہو، اگرچہ وہ بذاتہ مباح ہو، فقہ کے نزدیک
 ممنون و حرام ہے۔ حضرت عمر کا یہ ارشاد کہ میں کسی نکر و مے بچنے کے لئے سو مباحات سے
 دامن کشاں رہتا ہوں۔

جہاں از غافل شہی خوردی نظری زخم تیر صد نظر بصید گاہ و یک نظر بردانہ باش
 آپ ہی کے دورِ خلافت میں آثارِ پرستی کا قلع قح شجرہِ سعیت الرضوان کے انقطاع اور
 حضرت دانیال کی نقش کو نامعلوم طریق پر دفن کی صورت میں سہار حضرت معروٹ کرفی
 سے ابلیس نے کہا تھا کہ میں ننانوے دروازے نیکی کے صرف اس لئے کھولتا ہوں کہ اس صحن میں
 ایک برائی کے دروازے کو بھی وا کرنے کا موقع مل جائے۔

حصوہ اقدس کا اسوہ حسنہ آثار نہیں آپ کے پاکیزہ افکار و احکام ہیں۔ آثار تو
 سنگِ لوح مزار ہیں اور افکار دولتِ بیدار۔ موجودہ دور IDE OLD GIES کا ہے ابھر کس
 لئے آثار کے تکرارے کو سنوارا جا رہا ہے اور علی الرغم اس کے احکام کی عبادت گاہ کو
 تباہ و تاراج۔ پرستارانِ توحید کی شانِ تویہ ہے کہ طاقِ حرم کو بھی، جو مادی صورت
 میں جلوہ گر ہے ابروئے خمدار کی صورت دے کر، عبادات پر عاشقانہ رنگ چڑھا دینا
 تم اُس کا فر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

(اصغر)

خدارا! خود اپنے آپ اور مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم کیا جائے۔ دین و مذہب کے نام پر
 کتنے مکر و کذب کھیلے جاتے ہیں۔ کیوں آثارِ نبی کو اپنی کام جوئیوں کا نشانِ تجاہل بنا دیا جا رہا ہے

کیا آثارِ نبی کو یہ وہ میں پر لا کر حیاتِ طیبہ کو ظمانے کی راہ نہیں کھولی جا رہی ہے۔ تم ان معاملات میں
 کھارخانہٴ زندگی پر اپنی نظریہ دوڑاتے ہو اور خود اپنے نگارستانِ ارژنگ کا انظارہ نہیں کرتے،
 کون سی چیز ہے جو تمہارے پاس نہیں۔ بجز ان خرافات کے جو ان کے ہاں ہیں۔
 ہنٹ کٹو رہا ہے ہوتے ہوئے بے قلب و تنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے
 (اقبال)

مغربی تہذیب کا پیرن اسلامی ثقافت کے حق میں کف کا حکم رکھتا ہے۔ وہ دو کڑ بٹورنے میں
 لذت پاتے ہیں اور ہم اسکے لٹانے میں۔ وہ آفاق میں گم ہیں اور آفاق ہم میں۔ وہ نفع بازا ہیں خارہ ساز
 ہماری بے نیازی کی شان تو یہ ہے کہ تو اب آخرت کو بھی عشق الہی کے سر جو ش میں تج دیتے اور
 بہشت کو بھی دوزخ میں مھونک دیتے ہیں حضرت رابعہؓ نے ان ہی عاشقانہ جذبات سے بے قابو
 ہو کر مجر فر دزاں اور گوزہٴ آب کا نظاہرہ کیا تھا۔ بسوز سینهٴ حبت را بسوزم نہ بانگِ دید دوزخ را جو ہم نم
 سوختن ہی سے ہمارے زمین کا دامن بڑھ چکا ہے۔ ع کہ چوں آتش از سوختن ذلتیم من۔ جہاں عشق
 ہے وہاں جلا ہی حاصل زندگی ہے۔ ہر کجا عشق ست دہقاں سوختن ہم حاصل است یہ دنیا
 مرزۃ الآخر ہے یہاں زندگی بننا ہے کیفیتہٴ الادم ان کے لئے جن کا نصب العین کانا ہے۔
 طاس حمام است اس دنیا کے دوں ہر زمان در دست ناپاک دگر (طالب)
 مسلمانوں کی ساری بد بختی ذاتِ رسالت سے نسبتِ مھو کے حصول میں ناکافی ہے۔ عشقِ رسول
 آثار میں نہیں احکام رسول کے اتباع و امتثال میں ہے۔ عشقِ رسول کو اپنی حیاتِ مستعار کا سر
 سامان بنا کر دو عالم کو اپنے دامن میں سمیٹ لو۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست بحر و بر در گوشہٴ داماں اوست
 اس حق کے عاشق کو فنا ہو نہیں سکتی۔ جو آپ پہرتے ہیں وہ ہرگز نہ مریں گے۔ اسلام کے
 معنی ہی سراسر دلہانگی، سپردگی و شیخی کے ہیں۔ یہ شہادتِ گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
 گوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا؟ واحد عونا ان الحمد للہ رب العالمین

تبصرے

ترجمان القرآن جلد سویم: از مولانا ابوالکلام آزاد۔ ضخامت ایک ہزار صفحات
قیمت مجلد = ۲۲ روپے : ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی۔

ترجمان القرآن حصہ اول و دوم و چہارم پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے غلطی سے جلد
سویم رہ گئی تھی۔ اس کا تعارف اب کرایا جاتا ہے۔

یہ جلد سورہ اعراف سے سورہ یوسف تک یعنی چھ سورتوں کے ترجمہ اور تشریحی حواشی
پر مشتمل ہے۔ شروع میں خود مولانا کے قلم سے ایک دیباچہ ہے جو پرانے ایڈیشن کی جلد دوم
کے لیے لکھا گیا تھا۔ ساہتیہ اکاڈمی کے زیرِ انتظام مطبوعہ ایڈیشن میں باقی جلدوں کی خصوصیت
رہی ہیں وہ اس جلد کی بھی ہیں یعنی نہایت حلی اور روشن ٹائپ، رنگٹاپ باوقار و شاندار۔
شروع میں مضامین اور مباحث کی نہایت مفصل اور سیر حاصل فہرست، اسی طرح آخر میں
حواشی کے مضامین کی مفصل فہرست اور اس کے بعد اعلام و اسماء المکنہ و اشخاص پر مشتمل
اشاریہ۔ ان ظاہری اور صوری خصوصیات کے علاوہ ترجمان القرآن کی جو معنوی خوبیاں
اور خصوصیات ہیں وہ سب بھی اس جلد میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہیں جیسا کہ
قرآن کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ یہ چھ سورتیں قرآن مجید کی نہایت اہم سورتیں ہیں۔ ان میں
علامت احکام و مسائل، معاشرتی اور معاشی قوانین و ضوابط کا بھی ذکر ہے اور حیا اور بعض
غزوات کا بھی۔ انبیائے کرام کے قصص و واقعات بھی ہیں اور اہم ماضیہ کی سرگرمیت حیات
معبیہ۔ قوانین فطرت کا بھی بیان ہے اور اللہ کی سنت اور اس کے امام کا بھی۔ دنیا کی بے ثباتی و
بے اعتباری کا بھی تذکرہ ہے اور نعیم و عذابِ اخروی کا بھی! اور ہر موقع و محل پر تشریحی
نوٹوں میں (جن میں بہت سے نوٹ کئی کئی صفحات پر آئے ہیں) مولانا نے محققانہ اور ثوابد
نظائر کی روشنی میں اس درجہ دلائل و دلائل نشیں کلام کیا ہے کہ سچا انسان اللہ صلی علیہ وسلم سے

جائیے اور جھوٹے جائیے۔ مسلم یا غیر مسلم کوئی بھی غیر مستعجب قاری اس سے متاثر نہ ہوئے۔ اور قرآن مجید کی عظمت و رفعت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجزا ۵ اللہ جزاء خیراً۔

گل رعنا: مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع متوسطہ صفحات ۲۰۶ صفحات کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۵/۰ روپے۔۔۔ علی مجلس چھپتہ نواب صاحب فراغت خانہ دہلی۔

مرزا غالب نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اردو فارسی کلام کا ایک انتخاب "گل رعنا" کے نام سے کیا تھا۔ کلکتہ میں بگڑی خانہ دان کے ایک بزرگ مولوی کرم حسین تھے جو مرزا کے بڑے قدردان اور دوست تھے انھوں نے گل رعنا کی ایک نقل اپنے لیے بھی حاصل کر لی۔ اصل گل رعنا بخط غالب کا نسخہ تو مٹا ہے۔ لاہور میں ایک صاحب کے پاس تھا۔ ممکن ہے اب چھپ بھی گیا ہو۔ لیکن مولوی کرم حسین والا نسخہ ایک عجیب ڈرامائی انداز میں مالک رام صاحب کو مل گیا اور انھوں نے بڑی محنت اور کاوش کے بعد اپنی تحقیق و تصحیح کے ساتھ چھاپ دیا۔ شروع میں موصوف نے چالیس صفحات کا ایک محققانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں اس نسخہ کی سرگزشت ماہ ان کو کیوں کر ملا؟ اس کی دلچسپ داستان لکھنے کے بعد مرزا غالب کی حیات اور شاعری کے ان مسائل و معاملات پر گفتگو کی ہے جن پر انتخاب کے موجودہ نسخہ سے روشنی پڑتی ہے اور جن کے متعلق اب تک ناقدین طالب کی آراء مختلف تھیں۔ اسی سلسلہ میں موصوف کا یہ قیاس ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ کلکتہ کے سفر سے پہلے غالب کے فارسی کلام کی مقدار قابل لحاظ نہیں تھی۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں انھوں نے غالب کی جس فارسی عبارت کا حوالہ دیا ہے اس میں بیشک یہ تو ہے کہ مرزا نے اب تک اپنا فارسی کلام محفوظ رکھنا نہیں شروع کیا تھا۔ لیکن اس میں اس کا ذکر کہاں ہے کہ ان کے فارسی کلام کی مقدار ہی کم ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہے کہ ۱۸۴۷ء میں فارسی دیوان شائع ہوا تو کیا مرزا جیسے کم گو شاعر کا کلام سولہ سترہ برس میں ہی ایک دیوان بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا اصل طبعیت اور خالق

کے اعتبار سے اولاً فارسی کے شاعر تھے اور پھر اردو کے اس لیے یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ شروع سے ہی فارسی میں شعر نہ کہتے ہوں۔ لیکن ہاں! طبعیت لا اُبالی تھی۔ اس کے محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا۔ بہر حال ان مباحث کے علاوہ دیوان و کلیات غالب کے جو نسخے مالکِ رام صاحب کے پاس ہیں۔ ان سے انھوں نے اس انتخاب کا مقابلہ بھی کیا ہے اور جہاں جو فرق ہے اس کو واضح کیا ہے۔ آخر میں پچاس صفحے کے حواشی اسی کے لیے وقف ہیں۔ غرض کہ کتاب علمی اور تحقیقی اعتبار سے بلند اور مطالعہ کے لائق ہے۔

ہم عسروں پر غالب کا اثر از جناب ظفر ادیب صاحب تقطیع خوردہ صفحات ۴۰۵
صفحات کتاب و طباعت متوسط درجہ کی قیمت مبلد ۱۰/- بہت قدر اردو اردو بازار دہلی
یہ کتاب عنوان کے مطابق کوئی مرتب اور منضبط کتاب نہیں ہے۔ بلکہ لائق
مصنف نے غالبیات پر جو مطالعہ کیا اور اس سے غالب کی زندگی اور فن سے متعلق
جو تاثرات پیدا ہوتے رہے ان سب کو یکجا کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں جو چیزیں اپنی قائم
کردہ رائے کے خلاف معلوم ہوئیں ان پر تنقید کرتے چلے گئے ہیں۔ اسی بنا پر یہ کتاب
غالب پر لکھنے والوں کے تنقیدی جائزے کی کتاب بن گئی ہے۔ لیکن مصنف نے جو کچھ
لکھا ہے اشارتی انداز میں لکھا ہے اور کسی ایک موضوع پر کھل کر بحث نہیں کی اس
میں شبہ نہیں کہ موصوف نے غالبیات کا مطالعہ بڑی وسعت اور دلچسپی نظر
سے کیا ہے اور غالب کے فن کے بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے
جن پر یا تو جب بالکل نہیں کی گئی یا توجہ کی گئی ہے مگر کم۔ مثلاً آخر نصف میں یہ بحث کہ
غالب کے معاصران کے فن سے کس حد تک متاثر ہوئے لیکن مصنف کی سب رایوں
سے اتفاق مشکل ہے۔ مثلاً غالب کی فارسی شاعری کی نسبت جو خیالات ظاہر کیے
گئے ہیں اور حسبِ لب و لہجہ میں ان سے کوئی صاحبِ نظر جس نے غالب کی فارسی شاعری
کا مطالعہ دقتِ نظر سے کیا ہے متفق نہیں ہو سکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا اردو کے نقاد

غالب نے خود اپنی فارسی شاعری کی نسبت جو کچھ کہا ہے اسے محض نقلی کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ غالب اصلاً اور حقیقتاً فارسی کے ہی شاعر تھے اور اس میں اپنے رنگ میں مجتہد بھی تھے اور منفرد بھی۔ اردو شاعری میں ان کی انفرادیت بھی دراصل ان کے نہایت لطیف اور مجتہدانہ ذوقِ فارسی کی ممنون ہے۔ اردو کی چند غزلوں کو غالب کی عظمت کی اساس قرار دینا ہرگز غالب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ اسی طرح مومن کو غالب کے زیر اثر قرار دینا بھی عجیب سی بات ہے۔ مومن غزل کا شہنشاہ ہے اور غالب زندگی کا ترجمان! دونوں کی سمت سفر ایک دوسرے سے الگ ہے یں راہ میں دونوں کہیں ایک جگہ مل جائیں۔ یہ الگ بات ہے۔ اس کو تاثیر اور تاثر نہیں کہتے۔ بہر حال نوجوان مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے وسیع و عمیق مطالعہ کی دلیل ہے لب و لہجہ عموماً متین و سنجیدہ اور متوازن و معتدل ہے اور اس حیثیت سے کتاب لائقِ مطالعہ ہے۔

گفت و شنید از جناب ظفر ادیب صاحب۔ تقطیع خورد رضی مات ۳۰ ص ۴۰

کتاب و طباعت متوسط درجہ کی قیمت مجلد - ۶/- سہ - فقراردو۔ اردو بازار دہلی۔

یہ تیرہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ لائقِ مصنف نے موجودہ اصنافِ ادب تحقیق، تنقید، ناول، شاعری اور افسانہ میں ہر صنف کے ماتحت چند فن کار اور دانشور منتخب کر لیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر بھرپور گفتگو کی ہے اس انتخاب پر کلام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہر صنف میں ایسے حضرات موجود ہیں جو ان منتخب اشخاص سے زیادہ قصبہ کے اور جو مقام ان کو دیا گیا ہے اس کے مستحق قرار دیے جاسکتے ہیں علاوہ ان پر صنف کی بعض آرا سے بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ لکھا ہے وسیع مطالعہ اور عمیق غور و فکر کے بعد صاف و سلیس اور شستہ زبان میں لکھا ہے۔ اس لیے یہ مضامین دلچسپ بھی ہیں اور اردو زبان کے طالب علم کے لیے معلومات افزا بھی۔ شروع میں سنجیدہ گفتنی کے عنوان سے جو مقدمہ ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس میں مصنف نے تنقید کے متعلق اپنا نظریہ اور فنی نقطہ نگاہ و صافحت سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں اس میں جھجلاہٹ اور سبزیاری کا انداز پیدا ہو گیا ہے بہر حال ادبی حیثیت سے کتاب قابلِ قدر اور لائقِ مطالعہ ہے۔



چادر دیکھ کے پاؤں پساریتے

نارائن ہانتا ہے کہ اس کی آمدنی محدود ہے۔ اس لئے وہ
اور اس کی بیوی سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں۔ دیگر باتوں کے علاوہ
انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کا منصوبہ پورے غور و خوض کے
بعد تیار کیا ہے۔ کیونکہ اس پر ہی سارے کنبہ کے فلاح و بہبود
کا انحصار ہے۔

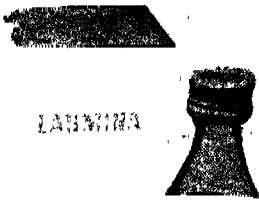
انہوں نے اپنے کنبہ کو چھوڑا رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ
وہ ہر سطح کو بہترین تعلیم دلا سکیں۔

amp 71/532

ہمدرد کا ایک نیا تحفہ

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزاء کا زندگی بخش مرکب عرق،
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے



محکمہ صحت مند زندگی پیدا کرتا ہے اور ان تمام حالتوں میں
مفید ہے جو مردوں اور عورتوں میں کمزوری کے سبب پیدا ہوتی ہیں
جیسے گھٹیا زندگی میں آکٹا ہٹ یا بیزاری، جسمانی اور
دماغی کاموں میں ٹھکن یا کام میں جی نہ لگنا، بدن میں سستی،
ہاتھ پاؤں میں لرزش، سانس پھولنا،
چہرہ زرد ہو جانا اور طبیعت میں بڑھوتری وغیرہ۔

محکمہ بہت تیزی سے اعضائے رقیہ اور تمام
جسمانی نظام پر اثر کرتا ہے۔ یہ اعلا درجہ کا مقوی و
حرک ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد و دگر کرتا ہے۔

ہمدرد

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپے



اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادوارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی تھی کہ اب چار ضخیم جلدوں میں نکلی ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۳۴۷۷ ہیں۔

حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات اور ان کی دعوت حق کی مقتضات تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف و الزبور و اصحاب القبر و اصحاب التبت و اصحاب الکوس بیت المقدس اور بہرہ اصحاب الاخدود و اصحاب الفیل و اصحاب الجحیم و باقرین اور سبیل جرم و غیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و مفقود تفسیر۔

حصہ چارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے

قیمت مکمل سٹ آئٹیم دس روپے۔ اجرت فی جلد علی بارچہ ایک روپیہ۔ معمولی جلد دو روپے

مکتبہ برہان، اردو بازار جامعہ میچل دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے بوٹمن برٹنگ پریس میں شائع کیا اگر دیکھو تو حق کی

۶۸۵

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دینی کا علمی و دینی مآہنامہ

18 MAY 1972



زُبرِ بَک

مُتَشَبِّہ
سَعْدِیٰ اَحْمَد بَسْمِ اَبَادِی

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ لغات قدراں کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی آسانی سے نکالے جاسکتے ہیں۔ مکمل لغات قرآن اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	•	پانچ روپے	چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	•	پانچ روپے	چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	•	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	•	آٹھ روپے	نہ روپے
جلد ششم	۳۲۴	•	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

پیشہ نکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۶۸	ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق مئی ۱۹۷۲ء	شمارہ ۵
--------	----------------------------------	---------

- ۱ نظرات
۲۹- سعید احمد اکبر آبادی
- ۲ جمال الدین الاسفوی اور ان کی
طبقات الشافعیہ
۲۹- ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کپڑاشیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۳ کلوروفل اور قرآن
۳۰۹- جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب
مذوی فرقانیہ اکادمی جکب آباد
نگلوناہ کھنڈہ۔
- ۴ محمد مجیب صاحب
۳۲۸- جناب نواب مشتاق احمد صاحب ایم۔ اے۔
رائس (بیسٹریٹ لا)
- ۵ ہندو تہذیب اور مسلمان
۳۴۴- جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب
استاد تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر نئی دہلی
- ۶ تجربے
۳۵۴- س۔ ع۔

منظومات

اردو یونیورسٹی

(۲)

اس مرتبہ اردو کے اصل معاملات و مسائل اور ان کے حل پر صاف صاف گفتگو کرنا ارادہ تھا۔ لیکن گذشتہ اشاعت میں اردو یونیورسٹی سے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس کے بارے میں چند خطوط موصول ہوئے ہیں، ان میں بعض خط تو ایسے ہیں جن کے لکھنے والوں نے اپنی افتاد طبع کے مطابق برا بھلا لکھنے کے علاوہ کوئی بات ڈھنگ اور قاعدہ کی نہیں لکھی، اور میں نے حسبِ عادت ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ”حبیب اللہ و نعم النکیل“ پڑھ کر انہیں ردی کی ٹوکی کی تذکرہ دیا۔ ان کے علاوہ بعض خطوط وہ ہیں جن میں برہان کے خیالات کی پرزور تائید کی گئی ہے اور اس کے ایڈیٹر کے لئے کلمات خیر کہے گئے ہیں، ان خطوط کی اشاعت بھی برہان کے مسئلہ کے خلاف ہے۔ البتہ ذیل میں دو خط درج کئے جاتے ہیں جن سے اصل موضوع بحث اور اس کے مقدمات پر مفید روشنی پرتی ہے۔ اب اردو کے اصل معاملات و مسائل پر جامع گفتگو انشاء اللہ آئندہ ماہ میں ہوگی لیجئے یہ دو خط سنئے :-

(۱) مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی :-

برادرِ م ! السلام علیکم۔

”ازہ نظرات“ کے بیشتر حصہ سے توافق ہے، لیکن ایک بات آپ کے قلم سے کیے ہوئے

ہے۔ آپ نے یہ کہا ہے کہ مولوی وحید الدین سلیم ایک نئے مولوی اور اردو فارسی کے شاعر و ادیب تھے۔ انگریزی زبان اور علوم جدیدہ سے نا آشنا اور وضع اصطلاحات کا کام انہیں کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ بات دونوں حیثیت سے نظر ثانی کی محتاج ہے اول تو وضع اصطلاحات کا کام ان کے سپرد نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ایک بڑی کمیٹی کے سپرد ہوا تھا جس کے بابائے اردو صدر۔ اور مولانا فراہی۔ نظم طباطبائی۔ مرزا کوکب حیدر آبادی (سائنس کے ماہر) اور آٹھ دس ممبر اور مختلف شعبوں کے استاد تھے۔ سلیم صاحب صرف ایک ممبر تھے اور پھر سلیم صاحب کی شاعری وغیرہ تو یوں ہی سی تھی۔ البتہ لسانیات میں ان کی استعداد و صلاحیت غیر معمولی تھی ہر شخص ان کا قائل تھا اور بابائے اردو اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (سابق صدر شعبہ عربی) دونوں ان کے معتقد! ڈاکٹر صدیقی کئی برس جرمنی میں رہ کر لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لائے تھے۔ سلیم صاحب کی کتاب اصول وضع اصطلاحات پر اب تک بہت قابل قدر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کل کسی بڑے سے بڑے ماہر (EXPERT) کی بات بھی چند سال سے زیادہ نہیں چلنے پاتی۔

آپ کی یہ رائے سو فیصد صحیح ہے کہ ترجمہ بہتر نہیں ہے اور ہو بھی تو اصل کا اس کا کیا مقابلہ!

برہان :- مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی ان چند اکابر علم و ادیب میں سے ہیں جن کے خاتمہ عربی و فارسی کی انگریزی پیکر راقم الحروف کے لفظ کلم نے چلنا سیکھا ہے اور اس حیثیت سے جو خدمت نبلی اور ابوالکلام کی راقم کے دل میں ہے، وہی مولانا موصوف کی ہے۔ برہان میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ صرف طالب علمی کے زمانہ کا ایک تاثر تھا۔ الحمد للہ کہ ایک بزرگ کی زبان سے اس کی تصحیح ہو گئی۔ ورنہ غلط بیانی کا گناہ عمر بھر رہتا۔

جناب عبد اللطیف صاحب اعلیٰ و موصوف کا خط کافی طویل ہے۔ شروع میں برہان کے ادیب کی نسبت انہوں نے جو حوصلہ افزائی لکھی اور اس کے بعد اردو یونیورسٹی خرابی کے تحت

کی تاریخ کی نسبت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو حذف کر کے اس خط کا اقتباس درج ذیل ہے۔

”اگر حکومت نے مسلمانوں کو غرض کرنے اور اردو کے اصل مسائل سے ان کی

توجہ کو ہٹانے کی غرض سے اردو یونیورسٹی نام کی کوئی چیز قائم کر بھی دی تو اس کا انجام

کیا ہوگا؟ جب ہائی اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم نہیں ہے تو اس یونیورسٹی کے طلباء

کہاں سے آئیں گے اور آئیں گے تو جب انہیں علوم جدیدہ اور سائنس سمجھنا پڑے گی

کتابیں ہیں ہی نہیں تو پڑھیں گے کیا اور جب اردو میں ان علوم کی اصطلاحات ہی نہیں

ہیں تو اساتذہ اردو میں سمجھائیں گے کس طرح؟ یہ سب کچھ بھی ہو گیا تو اس یونیورسٹی

کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ملک میں مستقبل کیا ہوگا؟

مذکورہ بالا اقتباس میں آپ نے جو اہم سوالات اٹھائے ہیں، ان کی تائید میں ایک دو باتیں

ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شروع سے ذریعہ تعلیم اردو ہے، مگر ادھر چند سال سے مختلف

ریاستوں کے، خاص طور پر یوپی کے جو مسلمان طلباء یہاں داخلہ لیتے ہیں، ان میں سے بیشتر اردو رسم

خط سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

(۲) جناب یونس سلیم صاحب مرکزی حکومت میں نائب وزیر تھے تو انھوں نے انجمن

ترقی اردو شاخ دہلی کے ایک جلسہ میں، انکشاف فرمایا تھا کہ حکومت نے طے کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی

کا ذریعہ تعلیم اردو کر دیا جائے۔ اس وقت میں علی گڑھ گیا ہوا تھا، اجماعیت میں یہ خبر پڑھنے

کے بعد میں تے یونیورسٹی کے مختلف حلقوں کا رد عمل معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک

شخص بھی نہیں ملا جو اردو ذریعہ تعلیم کا حامی ہو۔ طالب علموں کو سب سے زیادہ فائدہ اپنی ماد

کی تھی۔ استنور نے کہا کہ ایسی صورت میں ہمیں کہیں ملازمت نہیں ملے گی سائنس اور انجینئرنگ

اور میڈیکل کالج کے اساتذہ نے کہا کہ اردو میں ان مضامین کی تعلیم ایک طویل عرصے تک ممکن

نہیں ہے

۳۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس وقت ہوا سائنس تعلیم دیتے ہیں، ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی رہا ہے اور اب جو آئیں گے، ان میں سے بیشتر کا ذریعہ تعلیم ہندی ہو گا، اردو بہر حال کسی کا نہیں ہو گا۔ پھر یہ سائنس اندو میں پڑھائیں گے کیسے؟

۴۔ ابھی حال میں، ہمارے یہاں اردو کے لیکچرر کے لئے اسٹریو ہوا۔ جگسا ایک تھی اور کئی درجن امیدوار تھے، ملازمت کی مشکلات اور طویل بیماری کی وجہ سے وہ اردو سے اس قدر بیزار تھے کہ ان میں سے بیشتر نے صاف صاف کہا کہ ہم اپنی اولاد کو وصیت کر دیں گے کہ وہ چاہے جس مضمون میں بھی ایم لے کر رہیں مگر اردو میں نہ کریں۔ یہ تو صرف چند درجن کا حال تھا، اگر اردو یونیورسٹی، یہ فرض محال قائم بھی ہو گئی اور مختلف مضامین ہی کے سوچ پاس ہر سال ایم لے، پی، ایچ، ڈی پیدا کرنا شروع کر دیا تو ان کی کچھت کہاں ہو گی؟ ہندی اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے کالجوں میں تو وہ لئے نہیں جائیں گے تو کیا ان کے لئے اردو کی مزید یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔

۵۔ میں نے اردو کے ہدفی سر صاحب کے جواب میں جو مضمون لکھا تھا۔ اس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ابھی تک پاکستان میں اردو کیلئے ماحول سازگار ہے، مگر پھر بھی، بابائے اردو کی خشک کوششوں کے باوجود وہاں اردو کی یونیورسٹی قائم نہ ہو سکی۔ خود بابائے اردو نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:-

”اس مرتبہ میں نے اردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی تو اس کی تائید میں کسی

طرف سے بھی کوئی آواز نہیں آئی۔ مجھے سب سے زیادہ توقع عثمانیہ یونیورسٹی اور قیاد

دکن کے سابق طلباء سے تھی.... لیکن افسوس ہے کہ کسی نے بھی میری تائید نہ کی۔“

اسی تک اس جماعت نے اس اہم تجویز کی طرف توجہ نہیں کی، اس کے بعد دوسری جماعت

جس سے مجھے بڑی توقع تھی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اولڈ پوائنٹ ایسوسی ایشن ہے، وہ بالکل

خاموش ہے۔“ (قومی زبان (کراچی) بابت ۶ نومبر تا ۱۲ دسمبر ۱۹۶۱ء)

بایا نے اردو کی کوششوں سے کراچی میں اردو کا ایک کالج قائم ہوا ہے۔ اس کے بارے میں
اپنی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

”پہلے ہی پریشانیوں کیا کم تھیں، یہ کالج قائم کر کے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک
پریشانی اور محلے لی۔ کئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لئے آمادہ نہیں، مسندہ
یونیورسٹی نے انکار کر دیا، پنجاب یونیورسٹی کی حدود ارعنی سے باہر ہے، اب میں اس
سوج میں ہوں کروں تو کیا کروں، اب بند کرتا ہوں تو ہذا می الگ اور بچارے لڑکوں
کی اتنے دنوں کی محنت اور روپیہ بھی رائیگاں جائے گا۔۔۔ توقع تھی کہ پاکستان
ہمارے آنسو بوجھنے کا اور ہماری ہمت افزائی کرے گا۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو
یہاں کارنگ ہی کچھ اور ہے۔ کہاں تک لکھوں، بڑی طولانی داستان ہے۔“

(اردوئے مصنفہ (مجموعہ خطوط) صفحہ ۳۴۲)

اگر ان تمام دلائل اور تجربوں کے باوجود کچھ لوگ اردو یونیورسٹی کے قیام پر مصر ہیں تو سوچئے
اس کے کہ ان کے حق میں دعوئے خیر کی جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔
دے اور دل ان کو جو نہ دے غم کو زباں اور

مسلم لیگ اور جمعیتہ العلماء ہندوؤں ملک کی موقر اور با عظمت مسلم جماعتیں ہیں۔ انھوں نے
گزشتہ سہ ماہیہ دونوں جماعتوں کے صدر چند روز کے فصل سے راجھا ملک بچا ہو گئے۔ ان دونوں
مہرگوں کی وفات ایک عظیم ملی حادثہ ہے جس کی تلافی عرصہ تک نہ ہو سکیگی۔ الحاج محمد اسماعیل تہا
لائق و قابل اور بڑے معاملہ فہم اور سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ ان کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ
بارلیمنٹ میں جس کے ممبر وہ سالہائے درانہ تھے، مالیاتی اور تجارتی مسائل و معاملات پر انکی
تقریر بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد مسلم لیگ سمٹ ہٹا کر عدس اور کیرالہ میں محدود ہونے
رہ گئی تھی۔ مگر ہم اس کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک ہے مرحوم نے اس جماعت کو اس خوبی سے

چلایا کہ اس نے ملک کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے اہم سیاسی معاملات میں برابر اشتراک و تعاون کیا اور یہ ہے کہ ایک مرتبہ وزیر اعظم کی زبان سے اقرار کر لیا کہ مسلم لیگ فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے۔ انگریزی میں ان کی تقریر بڑی پر مغز مدلل اور موثر ہوتی تھی۔ یہ کمال ان کا ہی تھا کہ تقسیم ہند کے بعد مسلم لیگ کا جو مدلل نظریہ رہا ہے مروجہ تقسیم کے بعد میں اس کو بڑی جرأت و جہارت سے صریح ثابت کرتے اور ہندوؤں کے بڑے بڑے جمعوں میں اس کی معقولیت پر مدلل تقریر کرتے اور اس کے باوجود ہر طبقہ اور ہر پارٹی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان اوصاف و کمالات کے علاوہ بڑے متدین، متشعر، خوش اخلاق و متواضع اور مخلص تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

اس حادثہ کے چند روز بعد ہی مولانا سید محمد غفر الدین احمد صاحب کا حادثہ وفات پیش آیا۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا فیض حدس و تربیت ایک ابرکرم تھا جو عرب و عجم کے ہر خطے پر برپا اور ہر شخص نے بقدر جو صلہ و استفادہ اس سے استفادہ کیا لیکن مولانا حضرت شیخ کے ان چند نامزد و تربیت یافتہ حضرات میں سے تھے جو علم و عمل و ورع و تقویٰ اور فکر و نظر کے اعتبار سے اپنے استاد و شیخ کے قالب میں ڈھل گئے تھے چنانچہ ایک طرف ان کی حسین شخصیت و درس و تدریس کے مسند کی زینت تھی تو دوسری جانب زہد و ورع اور عبادت و ریاضت کے سجادہ کی مدافعت وہ ایک طرف بلند پایہ اور وسیع النظر عالمِ محدث و فقیہ تھے تو اس کے ساتھ ہی جنگ آزادی اور میدانِ آٹھ کلاں و وطن کے یہاد سپاہی اور مجاہد بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شغلہ درس و تدریس کے باوجود جمعیت العلماء سے اس کے ایک فعال ممبر کی حیثیت سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ عمر کا اکثر و بیشتر حصہ دربار شاہی مراد آباد کی خدمت میں صرف ہوا۔ شیخ الاسلام مولانا حمین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات و حشرت کمالات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث بھی مقرر ہوئے اور جمعیت علماء ہند کے صدر بھی اور آخر اسی پر دینا سے رخصت ہو گئے۔ عمر کم و بیش پچاسی برس کی پائی۔ اور چند سال

سے چند در چند عوارض و اسقام کے باعث بہت کمزور اور چلنے پھرنے سے معذور رہے ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود، اس کو ان کی روحانی طاقت یا قوت ارادی کے علاوہ اور کیا کہیے کہ جب وہ درس بخاری کے لئے بیٹھتے تھے تو گھنٹوں ایک ہی نشست سے بیٹھ رہتے تھے۔ درس اور اسی سلسلہ میں طلباء کے سوالات کے جوابات پوری حاضری اسی سے دیتے تھے اور تقریر کے وقت آواز میں بھی ضعیفی و پیری کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ طبعاً کم گو تھے۔ مگر جب ضرورت ہوتی تھی تو تقریر بہت واضح اور مدلل کرتے تھے، خود بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا پُر ہونا قحط الرجال کے اس دور میں بہت مشکل ہے۔

رحمۃ اللہ علیہم ورحمۃ واسعۃ

قابل توجہ عرضداشت: آپ حضرات ادارہ کے قدیم عمال، کارکنان ادارہ آپ سے بجا طور پر توقع تھی کہ آپ ادارہ کے حلقہائے میری اور خیراران کی توسیع کے لیے اپنے حلقہء احباب میں توجہ فرمائی گئی توسیعت سے بہت سی وہ کتابیں جو ختم ہو چکی ہیں ان کی اشاعت میں مدد ملے گی۔ نیازمند (میر)

ندوة المصنفین دہلی

۱۹۷۱ء کی زیر طبع

۱۹۷۰ء کی مطبوعات

- | | |
|-------------------------------------|---|
| ۱۔ تفسیر منطری اردو دسویں جلد ۱۷/- | ۱۔ تفسیر منطری اردو نویں جلد ۱۷/- |
| ۲۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج ۸/- | ۲۔ حیات (مولانا) سید عبدالجبار ۱۱/- |
| ۳۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان ۹/- | ۳۔ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت ۹/- |
| ۴۔ ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط ۷/- | ۴۔ آثار و محارف ۱۰/- |

ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو مارچ ۱۹۷۲ء

جمال الدین الاسنوی اور ان کی طبقات الشافعیہ

(۱۰)

جناب حافظ ڈاکٹر عبد العظیم خان صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی کچر شریعہ و نیات اسلام اینڈ لوی ٹیچنگ

بَاب المیم

فی الفصل الثانی الاسفار الزمانیة علی الکتابین

- ۱۱۴۳ المقترح، مظفر بن عبد اللہ بن علی بن الحسین، تقی الدین
(۵۶۱ - ۶۱۲ھ) ص ۲۲۲
- ۱۱۴۴ الموصی، محمد بن علوان بن مہاجر، ابو المنظر، شرف الدین
(۵۶۲ - ۶۱۵ھ) ص ۲۲۲
- ۱۱۴۵ عبد الکریم، (م ۶۳۰ھ) ص ۲۲۳ (ولد الموصی علی محمد بن علوان)
- ۱۱۴۶ المصری القطب، ابراہیم بن علی بن محمد ابوالاسحاق السلی المزنی (م ۶۱۸ھ) ص ۲۲۳
- ۱۱۴۷ الموصی محمد بن ابی الفرج بن ابی المعالی، فخر الدین، ابو المعالی، البجادی (م ۶۳۱ھ) ص ۲۲۳
- ۱۱۴۸ خطیب الجارح العقیق بمصر، ابو الطاہر، طاہر ص ۲۲۳
- ۱۱۴۹ الحمال المصری، یونس بن بدران بن فیروز، جمال الدین (۵۵۵ - ۶۱۳) ص ۲۲۳
- ۱۱۵۰ ابن المعلم، عبد الرحمن بن بدر بن سعید، الواسطی (م ۶۳۸ھ) ص ۲۲۳

- ۱۱۵۱ المہری، ابراہیم بن ابی الیشر شاکر بن عبداللہ، ابواسحاق، الدمشقی (م ۶۳۰ھ) ص ۲۵۵
- ۱۱۵۲ المعانی بن اسماعیل بن الحین، ابو محمد انصاری ولیم بن البغائب بن الحدوس
(م ۶۳۰ھ) ص ۲۵۵
- ۱۱۵۳ المرسی، محمد بن عبداللہ بن محمد، ابو محمد السلمی (ن ۵۷۰-۶۵۵ھ) ص ۲۶۶
- ۱۱۵۴ الفتح بن موسیٰ بن حماد، ابو نصر الخزرجی، الجزیری، الخفراوی، نجم الدین
(۵۸۸-۶۶۳ھ) ص ۲۶۶
- ۱۱۵۵ المرادی، ابراہیم بن عیسیٰ، ابواسحاق، الاندلسی، المہری ثم الدمشقی
(م ۶۶۸ھ) ص ۲۶۷
- ۱۱۵۶ ابن مالک محمد بن عبداللہ بن مالک، ابو عبداللہ، جمال الدین الطائی الجانی
شیخ الخاۃ (۶۰۰-۶۷۲ھ) ص ۲۶۷
- ۱۱۵۷ بدر الدین محمد (۶۸۶ھ) ص ۲۶۸ (ولد ابن مالک)
- ۱۱۵۸ المرانی، محمود بن عبداللہ بن عبدالرحمن، برہان الدین (م ۶۸۱ھ) ص ۲۶۸
- ۱۱۵۹ المقدسی، احمد بن احمد بن نعمۃ بن احمد، شرف الدین (م ۶۹۴ھ) ص ۲۶۸
- ۱۱۶۰ المقدسی، شمس الدین، محمد بن احمد بن نعمۃ (م ۶۸۲ھ) ص ۲۶۸
- ۱۱۶۱ المسودی، محمد بن عبدالرحمن بن محمد بن مسود، ابوسعید، البغدادی
(۵۲۰-۶۸۲ھ) ص ۲۶۹
- ۱۱۶۲ ابن الرطل، عمر بن کمی بن عبد الصمد، ابو حفص، زین الدین (م ۶۹۱ھ) ص ۲۶۹
- ۱۱۶۳ صدر الدین، محمد (۶۶۵-۷۱۶ھ) ص ۲۷۰ (ولد ابن الرطل)
- ۱۱۶۴ زین الدین محمد (م ۷۳۸ھ) ص ۲۷۱ (حفصہ ابن الرطل)

لے مَوسِیۃ کی طرف نسبت ہے۔ جو اندلس میں ایک شہر کا نام ہے۔ (معجم ۱۰۷/۵)

- ۱۱۶۵ ابن مکی، احمد بن حسن بن علی (بالا لام) نجم الدین، الانصاری (۶۱۷-۶۹۹ھ) ص ۵۱۴
- ۱۱۶۶ صاحب کتاب المغنی، علی بن احمد بن اسحاق، ابو الحسن، ضیاء الدین، البیہقی (م ۷۰۱ھ) ص ۵۲
- ۱۱۶۷ ابن مکی، الحسن بن الحارث بن الحسن، عز الدین (م ۷۰۱ھ) ص ۵۲
- ۱۱۶۸ المرتبی، یوسف بن الزکی عبدالرحمن بن یوسف، جمال الدین (۶۵۲-۷۰۲ھ) ص ۵۲
- ۱۱۶۹ ابن المرحل، شہاب الدین احمد (م تقریباً ۷۴۰ھ) ص ۵۳
- ۱۱۷۰ المتادی، محمد بن ابراہیم، ضیاء الدین (۶۵۵-۷۰۶ھ) ص ۵۲
- ۱۱۷۱ المتادی، ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم، شرف الدین (م ۷۵۷ھ) ص ۵۲
- ۱۱۷۲ المتادی، محمد تاج الدین (م ۷۶۵ھ) ص ۵۲ (آخر شرف المتادی)
- ۱۱۷۳ المصری، محمد بن علی بن عبدالکریم، فخر الدین (۶۹۲-۷۵۱ھ) ص ۵۲
- ۱۱۷۴ المراكشي، محمد بن ابراہیم بن یوسف، تاج الدین (م ۷۵۲ھ) ص ۵۲

باب المنون

نید فصلان الاول فی الاسماء الواقعة فی المرافعی والروضۃ

- ۱۱۷۵ النیابوری، حسان، ابوالولید، القرشی (م ۳۲۹ھ) ص ۵۵
- ۱۱۷۶ النیابوری، ابومصور محمد بن حسان (م ۳۸۶ھ) ص ۵۶
- ۱۱۷۷ النیابوری، ابوعبدالله محمد بن حسان (م ۳۸۶ھ) ص ۵۶
- ۱۱۷۸ السنوی، ابو الحسن ص ۵۶
- ۱۱۷۹ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی، صاحب الحلیۃ (۳۳۶-۴۲۳ھ) ص ۵۷
- ۱۱۸۰ المغنی، الحسن بن عبدالرحمن، ابوعبدالله (م ۸۰ھ) ص ۵۷

لہ رتبہ (کبر النعمان المکون)، کی طرف منسوب ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ گاؤں ہرات اور کراچی میں
داخل ہے۔ ترجمہ ۳۳۶/۵

- ۱۱۸۱ ابو محمد، محمد والدین عبد الرحمن بن عبد الرحمن بن عبد اللہ
(م ۵۴۲ھ) ص ۵۷۷ (اخو النبی)
۱۱۸۲ النوذی، یحییٰ بن شرف، ابو زکریا، محی الدین (۶۳۱-۶۷۶ھ) ص ۵۸۸

الفصل الثانی فی الاسماء الزائدة علی الکتابین

- ۱۱۸۳ النسانی، عبد الرحمن بن شعیب بن علی (م ۳۰۳ھ) ص ۵۹۹
۱۱۸۴ النیبابوری، عبد الرحمن بن محمد بن زیاد بن واصل، ابو بکر المعروف بابن زیار
(۲۳۸-۳۲۲ھ) ص ۵۹۹
۱۱۸۵ النقی، محمد بن علی بن طالب (م ۳۳۷ھ) ص ۶۰۰
۱۱۸۶ النیبابوری الحسین بن علی بن یزید، ابو علی (۲۷۷-۳۲۹ھ) ص ۶۰۰
۱۱۸۷ النقاش، ابو بکر، محمد بن الحسن بن محمد صاحب التفسیر (۲۶۶-۳۵۱ھ) ص ۶۰۰
۱۱۸۸ النیبابوری، احمد بن محمد بن سعید البسید الحیری (م ۳۵۲ھ) ص ۶۱۱
۱۱۸۹ النیبابوری محمد بن عبد اللہ بن زکریا ابو الحسن (۲۷۳-۳۶۶ھ) ص ۶۱۱
۱۱۹۰ النفرودی، عبد العزیز بن محمد بن الحسن، ابو الفضل (م ۳۷۰ھ) ص ۶۱۱
۱۱۹۱ النیبابوری، محمد بن محمد بن ناذر، ابو الحسین الکراسی (م ۳۷۲ھ) ص ۶۱۲
۱۱۹۲ الثقیف، ابو عبد اللہ الاصفہانی (م ۳۸۱ھ) ص ۶۱۲
۱۱۹۳ النوسی، محمد بن محمد بن ابراہیم (کان موجوداً سنة ۳۷۱ھ) ص ۶۱۲
لے لکت (بفتح النون والین) کی طرف نسبت ہے، حیون اور سرقند کے مابین ایک شہر
واقع ہے (مجم ۵/۲۸۵)

۲۵ قال الاسنوی، النفرودی بنون وضاد محجمة منوب الی حق لله لیکمال له نضرویل
رطبقاته من ۲۸۱

- ۱۱۹۲ التائی، عبداللہ بن احمد بن محمد، البراقسم (م ۳۸۲ھ) ص ۲۶۲
- ۱۱۹۵ النیبابوری، محمد بن عبداللہ بن حمدون، البوسید (م ۳۹۰ھ) ص ۲۶۲
- ۱۱۹۶ النفاوندی، احمد بن اسحاق بن حزبان، البوسید اللہ (م ۴۱۰ھ) ص ۲۶۲
- ۱۱۹۷ النعمی، محمد بن زہیر، البکر (م ۴۱۸ھ) ص ۲۶۲
- ۱۱۹۸ النیبابوری، عبدالرحمن بن محمد بن احمد بن سورة البوسید (م ۴۲۰ھ) ص ۲۶۲
- ۱۱۹۹ النعمی، علی بن احمد بن محمد بن نعیم، البحسن (م ۴۲۳ھ) ص ۲۶۳
- ۱۲۰۰ النیبابوری، احمد بن الحسین بن احمد بن اسحاق (م ۴۲۳ھ) ص ۲۶۳
- ۱۲۰۱ النفاص، اسماعیل بن احمد بن الحسن، البسریک، الناشی (ص ۲۶۳)
- ۱۲۰۲ النبی، محمد بن عبدالعزیز بن عبداللہ، البوسید الرحمن (۳۵۷ - ۴۳۰ھ) ص ۲۶۲
- ۱۲۰۳ النعمی، الحسن بن علی بن کئی بن اسرافیل بن حماد، البعلی الحمادی (م ۴۶۰ھ) ص ۲۶۲
- ۱۲۰۴ النعمی، عبدالقاہر بن عبدالرحمن، البکر الجرجانی (م ۴۶۲ یا ۴۷۱ھ) ص ۲۶۲
- ۱۲۰۵ النوفانی، الحاکم، ناصر بن اسماعیل، البعلی (م ۴۷۹ھ) ص ۲۶۵
- ۱۲۰۶ النیبابوری، اسماعیل بن عمرو بن محمد، البوسید (م ۴۹۱ - ۵۰۱ھ) ص ۲۶۵
- ۱۲۰۷ النوفانی، محمد بن المخقر بن حفص (م ۵۳۵ھ) ص ۲۶۵
- ۱۲۰۸ النعمی، عبدالرحمن بن علی بن الموفق، البوسید (م ۵۴۲ھ) ص ۲۶۵

لہ نفاوندی (بفتح النون المادوی وکسر الواو مفتوحة ولون ساکتہ و دال)
سیدان کے معرب میں ایک بہت بڑا شہر ہے اس کے اور سیدان کے مابین تین دن
کا راستہ ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کو حضرت فزع علیہ السلام نے بنوایا تھا
اسی لیے اس کا نام "فزع" اور رکھا گیا بعد میں نفاوند ہو گیا (تج ۳۱۳/۵)۔

لہ نوافان کی طرف نسبت ہے۔ فزع میں ایک قصبہ ہے (تج ۳۱۱/۵)

- ۱۲۰۹ ابراہیم بن محمد بن نجان، ابواسحاق الرقی (م ۲۳۳ھ) ص ۲۶۵
- ۱۲۱۰ النوقانی علی بن ناصر بن محمد ابوالحسن (م ۵۲۹ھ) ص ۲۶۶
- ۱۲۱۱ النصبینی، عسکر بن اسامہ بن جاح، ابو عبد الرحمن (۲۹۲-۵۶۰ھ) ص ۲۶۶
- ۱۲۱۲ مسلک النخاع، الحسن بن صافی بن عبد اللہ، ابو نزار (م ۵۶۸ھ) ص ۲۶۶
- ۱۲۱۳ النبیاءوری، مسعود بن محمد قطب الدین ابوالمعالی (۵۰۵-۵۷۸ھ) ص ۲۶۷
- ۱۲۱۴ مودود (م ۵۵۲ھ) ص ۲۶۷ (اخوا النبیاءوری قطب الدین)
- ۱۲۱۵ النوقانی محمد بن ابی علی بن ابی نصر، ابو عبد اللہ، فخر الدین (م ۵۹۲ھ) ص ۲۶۷
- ۱۲۱۶ النوقانی، فضل اللہ بن ابی سعید، ابوالمکارم (۵۱۳-۶۰۰ھ) ص ۲۶۸
- ۱۲۱۷ النصبینی، عبدالسلام بن عبد العزیز بن خلف بن محمد (ص ۲۶۸)
- ۱۲۱۸ ابو نزار، ربیعہ بن الحسن بن علی العینی، الحضرمی، الزماری (۵۲۵-۶۰۹ھ) ص ۲۶۸
- ۱۲۱۹ ابن النجار، محمد بن محمود بن الحسن بن ہبۃ اللہ ابو عبد اللہ (۵۷۳-۶۲۳ھ) ص ۲۶۹
- ۱۲۲۰ النصبینی، محمد بن طلحہ بن محمد ابوالسالم، کمال الدین (م ۶۵۲ھ) ص ۲۶۹
- ۱۲۲۱ عبد الرحمن بن نوح بن محمد شمس الدین، الترمذی (م ۶۵۵ھ) ص ۲۷۰
- ۱۲۲۲ النابلسی، خالد بن یوسف بن سعد، ابوالبقلا، زین الدین (۵۸۵-۶۶۳ھ) ص ۲۷۰
- ۱۲۲۳ نصیبین کی طرف نسبت ہے۔ جزیرہ کا ایک آباد شہر ہے اس کے اور سخار کے مابین فوسل اور موصل اور اس کے درمیان چھ دنوں کا راستہ ہے۔ (معجم ۲۸۸/۵)
- ۱۲۲۴ نابلس (بضم الباء واللام) فلسطین میں ایک مشہور شہر ہے اسکے اور بیت المقدس کے مابین دس میل کا راستہ ہے کہا جاتا ہے کہ نابلس ایک پہاڑ ہے جس پر حضرت آدم علیہ السلام نے عبادہ کیا تھا اور یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت اسحاق بھی اسی پہاڑ پر ذبح کئے گئے تھے۔ (معجم ۲۸۸/۵)

- ۱۲۲۳ ابن النابی، احمد بن محمد بن نعمتہ، شرف الدین، ابوالعباس (م ۶۸۷ھ) ص ۷۰
- ۱۲۲۴ ابن النفیس، علی بن ابی الحرزم، علاؤ الدین، المقرئ (م ۶۸۷ھ) ص ۷۱
- ۱۲۲۵ شیخ النخاع، محمد بن ابراہیم، سجاد الدین، ابوعبداللہ، الحلبي (م ۶۹۸ھ) ص ۷۱
- ۱۲۲۶ النمرادی، عبدالعزیز بن عبد الجلیل، عز الدین، المعری (م ۷۱۰ھ) ص ۷۲
- ۱۲۲۷ النشائی، عمر بن احمد بن احمد بن مہدی، عز الدین، ابو جھض (م ۷۱۰ھ) ص ۷۲
- ۱۲۲۸ النشائی، اکمل الدین ابوالعباس احمد بن عمر (۶۹۱-۷۵۷ھ) ص ۷۲
- ۱۲۲۹ ابن سید الناس، محمد بن ابی بکر بن ابی عمرو، ابو الفتح، فتح الدین، الربیعی النیری (۶۷۱-۷۳۲ھ) ص ۷۳
- ۱۲۳۰ ابن النقیب، محمد بن ابی بکر بن ابراہیم، شمس الدین (م ۷۵۷ھ) ص ۷۳
- ۱۲۳۱ النویری، محمد بن ابراہیم بن کئی، ناصر الدین الزیری (م ۷۵۷ھ) ص ۷۳
- ۱۲۳۲ النخوی، احمد بن یوسف بن محمد شہاب الدین الحلبي (م ۷۵۶ھ) ص ۷۳
- ۱۲۳۳ ابن النقیب، احمد بن لؤلؤ بن عبداللہ، ابوالعباس، شہاب الدین (م ۷۶۹ھ) ص ۷۳

باب الہماء

فیہ فصلان الاول فی الاسماء الواقعۃ فی المرافعی والمروضة

- ۱۲۳۴ ابن ابی ہریرۃ الحسن بن الحسین، ابو علی البغدادی (م ۳۴۵ھ) ص ۷۶
- ۱۲۳۵ الحاروی، احمد بن محمد بن محمد، ابوعبید (م ۴۰۰ھ) ص ۷۶

۱۷ "انشائی منوب الی نشاوی احدى بلاد العربیة من بلاد مصر طبقات

الاسنوی ص (۴۷۲)

۱۸ تویرہ کی طرف منبت ہے جو مصر میں ایک جگہ کا نام ہے، (مجم ۵/۳۱۲)

- ۱۲۳۶ الهروی، محمد بن احمد بن ابی یوسف، ابوسعید (م ۵۱۸ھ) ص ۷۷۷
 ۱۲۳۷ اکلیا اطرسی، علی بن محمد ابوالحسن، عماد الدین الطبری (م ۵۰۲ھ) ص ۷۷۷
 ۱۲۳۸ الهروی، ابوالفتح ص ۷۷۸

الفصل الثانی فی الاسماء النادرة علی الکتابین

- ۱۲۳۹ ابراہیم بن مانی بن خالد، ابوعمران الملبی، الجرجانی (م ۳۱۰ھ) ص ۷۷۸
 ۱۲۴۰ فقیہ سمدان، شعیب بن علی بن شعیب ابونصر ص ۷۷۹
 ۱۲۴۱ الهروی، محمد بن یوسف بن بشر، ابوعبد اللہ (م ۳۳۰ھ) ص ۷۷۹
 ۱۲۴۲ الهمدانی، محمد بن یحییٰ بن النعمان، ابوبکر (م ۳۴۷ھ) ص ۷۷۹
 ۱۲۴۳ الهروی، محمد بن مبارک، ابوحامد (م ۳۵۵ھ) ص ۷۷۹
 ۱۲۴۴ الهروی، محمد بن احمد بن عبد اللہ بن محمد المرزئی (م ۳۵۶ھ) ص ۷۷۹
 ۱۲۴۵ ابوعبد اللہ محمد (م ۳۵۲ھ) (ابو الهروی محمد) ص ۷۸۰
 ۱۲۴۶ التواری، عبد السلام بن بابل؟ ابوسلیمان (م ۳۸۷ھ) ص ۷۸۰
 ۱۲۴۷ الهروی، محمد بن محمد بن عبد اللہ، ابومنصور الازدی (م ۴۱۰ھ) ص ۷۸۰
 ۱۲۴۸ الهروی، سالم بن عبد اللہ، ابومعمر المعروف بجولج (م ۴۳۳ھ) ص ۷۸۰
 ۱۲۴۹ الهمدانی، ابوعبد الغفار بن عبد اللہ بن محمد ابوسعید التیمی (م ۴۳۶ھ) ص ۷۸۰
 ۱۲۵۰ الهمدانی، عبد الملک بن ابراہیم بن احمد ابوالفضل (م ۴۸۹ھ) ص ۷۸۱
 ۱۲۵۱ الهمدانی، احمد بن الحسین بن احمد بن جعفر، ابوحامد (م ۴۹۱ھ) ص ۷۸۱
 ۱۲۵۲ الهروی، مسعود بن محمد بن محمد الشریف ابوالقاسم (م ۴۴۲-۵۵۲ھ) ص ۷۸۱
 ۱۲۵۳ الهمدانی، الحسن بن الفتح بن حمزة ابوالقاسم ص ۷۸۱
 ۱۲۵۴ الهمدانی، یوسف بن ایوب بن یوسف بن الحسین (م ۵۳۵ھ) ص ۷۸۱

- ۱۲۵۵ المردی، احمد بن محمد بن احمد بن محمد البوطیح (۴۷۷-۵۰۷ھ) ص ۲۸۳
- ۱۲۵۶ الحمدانی، عبداللہ بن ابراہیم بن محمد، ابو محمد (۴۵۵-۶۲۲ھ) ص ۲۸۳
- ۱۲۵۷ الحمدانی، عبدالحمد بن عبدالرشید بن علی البوکری (م ۶۳۷ھ) ص ۲۸۳
- ۱۲۵۸ الحمدی، صفی الدین محمد بن عبدالرحیم بن محمد (۶۲۲-۷۱۵ھ) ص ۲۸۳
- ۱۲۵۹ ابن الھمام، سلیمان بن موسیٰ بن بھرام، تقی الدین السعودی
(۶۵۸-۷۳۶ھ) ص ۲۸۴

باب الحواد

فیه فصلان الاول فی الاسماء الواقعة فی المرافی والرهنة

- ۱۲۶۰ ابن الوکیل، عمر بن عبداللہ، ابو حفص و يعرف ایضاً بالباب شامی
(م بعد ۳۱۰ھ) ص ۲۸۴
- ۱۲۶۱ الواحدی، علی بن احمد بن محمد، ابو الحسن (م ۴۶۸ھ) ص ۲۸۴

الفصل الثاني فی الاسماء الزائدة علی الکتابین

- ۱۲۶۲ الوزیری، محمد بن طاهر بن محمد بن الحسن بن الوزیر بن نضر (م ۳۶۵ھ) ص ۲۸۵
- ۱۲۶۳ الواسطی، میمون بن سھل ابو طاهر و یقال ابو العجیب (م ۴۲۸ھ) ص ۲۸۵
- ۱۲۶۴ الوقی، الحسین بن عبداللہ ابو عبداللہ (م او اخر ۴۵۰ھ) ص ۲۸۵
- ۱۲۶۵ الواسطی، المبارک بن محمد بن عبداللہ ابو الحسن (م ۴۹۲ھ) ص ۲۸۵
- ۱۲۶۶ البورکی، عبد الواحد بن عبد الرحمن بن القاسم ابو محمد الزبیری (م ۴۹۵ھ) ص ۲۸۶

۱۲۶۷ دکن کی طرف نسبت ہے یہ قوم تان میں تانے گاؤں کا نام ہے مجموعہ ۳۸۵/۵

۱۲۶۸ قال الاسوی، "الورکی نسبة الى وركة بلاد مغفرة وبلاد مملكة ملكية ثم كان بعضها ملوكة قریة علی فرسخین من بغداد" (طبقاته ص ۴۸)

١٢٦٤. الوذّان، عبد الكريم بن أحمد بن طاهر البوسد الطبري (م ٢٦٩ هـ).
١٢٦٨. أبو عبد الله محمد عماد الدين (م ٥٢٥ هـ) (ولد الوذّان).
١٢٦٩. الولاحردى، عبد الواحد بن محمد بن عمر، أبو عمر (م ٥٠٢ هـ) ص ٨٤٤.
١٢٧٠. الوجيه، أحمد بن عمر بن الحسين أبو العباس الكردي (م ٥٩١ هـ) ص ٨٤٤.
١٢٧١. الواسطي، هبة الله بن علي بن أبي الفضل، أبو جعفر (م ٦٠١ هـ) ص ٨٤٤.
١٢٧٢. الواسطي، يحيى بن الربيع بن سليمان أبو علي، محمد الدين (٥٢٨-٦٠٧ هـ) ص ٨٤٤.
١٢٧٣. عبد الرحمن أبو القاسم (٥٦٠-٦٠٢ هـ) (ولد الواسطي يحيى) ص ٨٨٨.
١٢٧٤. الواسطي، علي بن يوسف بن أحمد أبو الفضائل (٥٥٩-٦٠٨ هـ) ص ٨٨٨.
١٢٧٥. الواسطي أحمد بن محمود بن أحمد أبو العباس (٥٥٩-٦١٦ هـ) ص ٨٨٩.
١٢٧٦. ابن الوزّاق، عبد الرحمن بن محمد بن اسماعيل ضياد الدين أبو القاسم (م ٦١٢ هـ) ص ٨٩٠.
١٢٧٧. الواسطي، علي بن خطاس، بن مقلد أبو الحسن الفزير (٥٦١-٦٢٩ هـ) ص ٩٠.
١٢٧٨. الواسطي، أحمد بن علي بن ثابت أبو العباس (م ٦٣١ هـ) ص ٩٠.
١٢٧٩. الواسطي، عبد الرحمن بن مقبل بن الحسين، أبو المعالي عماد الدين (٥٤١-٦٣٩ هـ) ص ٩٠.
١٢٨٠. محمد بن سالم بن نصر الله بن سالم بن واصل جمال الدين الحموي (م ٦٩٩ هـ) ص ٩١.
١٢٨١. الوجزري أحمد بن محمد بن سليمان، جمال الدين الواسطي (م ٤٢١ هـ) ص ٩١.

له نسبة إلى قرية من قرى كنكور وكنكور ناحية من هذان (طبقات الاستقوى ص ٢٤٤)

باب البياد

فيه فصلان الاول في الاسماء الواقعة في الزمان في الموضع

- ١٢٨٢ ابراهيم بن يوسف ص ٢٩٢
١٢٨٣ محمد بن يحيى ابو سعد النيسابوري (م ٥٢٨ هـ) ص ٢٩٣

الفصل الثاني في الاسماء المناسكة على الكتائب

- ١٢٨٤ النعماني، محمد بن محمد بن عبد الرحمن، ابو حامد ص ٢٩٣
١٢٨٥ النعماني، زيد بن عبد الله بن جعفر (م ٥١٢ هـ) ص ٢٩٣
١٢٨٦ النعماني، عبد الله بن عبد الرزاق بن حسن بن زاهر (م ٥٢٨ هـ) ص ٢٩٤
١٢٨٧ النعماني، سالم بن عبد الله بن محمد بن سالم (٢٥١ - ٥٣٢ هـ) ص ٢٩٤
١٢٨٨ النيزدي، علي بن احمد بن الحسين بن احمد ابو الحسن (م ٥٢٢ - ٥٥١ هـ) ص ٢٩٤
١٢٨٩ النعماني، عمار بن علي بن زيد بن نجم الدين ابو محمد (٥١٥ - ٥٦٩ هـ) ص ٢٩٥
١٢٩٠ يونس بن محمد رضى الدين (م ٥٤٦ هـ) ص ٢٩٤
١٢٩١ محمد بن يونس، عماد الدين ابو حامد (٥٨٥ - ٦٠٨ هـ) ص ٢٩٤
١٢٩٢ موسى بن يونس، ابو الفتح كمال الدين (٥٥١ - ٦٣٩ هـ) ص ٢٩٨
١٢٩٣ احمد بن كمال الدين (٥٤٤ - ٦٢٢ هـ) ص ٢٩٩
١٢٩٤ محمد بن علي الملقب بالامام بن بنت الرضى يونس (م ٦٢٢ هـ) ص ٥٠٠
١٢٩٥ عبد الرحيم بن الامام رضى الدين محمد بن عماد الدين بن يونس، تاج الدين (٥٩٨ - ٦٤١ هـ) ص ٥٠٠
١٢٩٦ جمال يحيى بن عبد المنعم جمال الدين المصري (م ٦٢٠ هـ) ص ٥٠١

فصل في جماعة أدخلتهم في الحرم لكونهم من أهل اليمن
وإن كان أكثرهم مشهوراً بما يقتضى إدخاله في غير
هذه الحرف فمنهم:-

- ١٢٩٤ أحمد بن سليمان المعروف بالحكي (م ٤٠٣ هـ) ص ٥٠١
١٢٩٨ أحمد بن علي أبو العباس المعروف بالحرازي (م ٤١٨ هـ) ص ٥٠١
١٢٩٩ أبو بكر بن عمر رضي الدين المعروف بابن الأديب ص ٥٠١
١٣٠٠ أحمد بن علي جمال الدين المعروف بالعالمي (م ٤٢٥ هـ) ص ٥٠١
١٣٠١ أحمد بن أبي الخير بن سفيان أبو العباس الحضرمي السدي
(م ٤٢٩ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٢ عبد الله بن الأحمر الشجيني (م ٤٣٤ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٣ أبو بكر بن جبرئيل رضي الدين (م ٤٠١ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٤ محمد بن علي بن أبي الحلق جمال الدين (م ٤٠١ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٥ محمد بن عيسى بن مطير (م ٤٢٢ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٦ عبد الله بن محمد بن عبد الله الحضرمي (م ٤٢٢ هـ) ص ٥٠٢
١٣٠٧ عبد الرحمن بن علي بن سفيان الشريف وجيه الدين (م ٤٢٢ هـ)
ص ٥٠٣
١٣٠٨ عبد الله بن أسعد عفيف الدين اليمني المعروف باليا فتى
(٤٠٠ - ٤٢٨ هـ) ص ٥٠٣

سلسلے کے لیے ملاحظہ فرمائیے برطان اگست ۱۹۶۱ء

کلور و فل اور قرآن

قرآن اور علم نہاتات

(۶)

از جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی، فرقانیہ اکیڈمی چک بانادر، جگور ناتھ

کلور و فل اور مفسرین | اس موقع پر قدمائے مفسرین نے لفظ "خضر" کی جو تفسیر کی ہے اس کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ جن کے ملاحظہ سے یہ نظریہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ وہ یا تو کلور و فل کی صلاحیت و کارکردگی کی کچھ سُن گئے یا چکے تھے یا پھر اس کو سمجھنے کی خاطر مختلف نظریات قائم کرنے لگے تھے۔ ہر حال مفسرین کرام نے اس لفظ کی تفسیر میں جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس کو استقرائی طور پر پانچ قسم کے نظریات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

- ۱۔ بعض نے اس لفظ کی کوئی خاص تشریح نہیں کی ہے۔
- ۲۔ بعض نے کسی خاص چیز کا تعین کیے بغیر ایک سرسبز و شاداب مادہ مراد لیا ہے۔
- ۳۔ بعض نے اس سے شگونے مراد لیے ہیں۔
- ۴۔ بعض نے اس سے شاخوں دار تنا مراد لیا ہے جو بیج سے اولین طور پر برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح بعض نے شاخوں دار ڈالیاں مراد لی ہیں۔

۵۔ اردو زبان کے معرین و مترجمین نے عموماً عام درخت اور کھیتیاں مراد لی ہیں۔

اب بالترتیب چند نمونے بھی ملاحظہ ہوں مثلاً تفسیر جلالین میں ہے۔
(فاخر جہا منہ) ای النبات شتياً (خضرًا) بمعنی الخضر
(نخرج منہ) من الخضر (حبًا متراکبًا)
(ترجمہ) (ہم نے نکالی اس سے) یعنی نبات سے ایک چیز (سبز) خضر
کے معنی میں (حب سے ہم نکالتے ہیں) یعنی سبز چیز سے (تہہ تہہ دلنے)
یہ ایک مختصر ترین تفسیر ہے جس میں نہ کوئی نظریہ ہے اور نہ کوئی خاص
تشریح ہے۔ مگر ہاں بخوبی دادی حیثیت سے اس آیت کریمہ کی جو تفسیر کی گئی ہے
وہ سو مفید صحیح ہے۔

تفسیر البوسود میں ہے:-

(فاخر جہا منہ خضرًا) ای فآخر جہا من النبات الذی لا
ماق له شتياً عَصًا خضراً۔ یقال شئاً خضراً و خضراً عَصاً
و عَصاً (نخرج منہ) صفة لخضر ای تخرج من ذلك الخضر
ترجمہ :- (ہم نے نکالی اس سے ایک سبز چیز) یعنی ان نباتات
سے جو بغیر تنے کے ہیں ایک سبز اور شاداب چیز نکالی۔ کسی چیز کی صفت
کے لیے اخضر اور خضر دونوں الفاظ لائے جاتے ہیں جیسے الخضر اور
عَصاً بولے جاتے ہیں (ہم نکالتے ہیں اس سے) بہ خضر یعنی سبز چیز کی صفت
مطلب یہ کہ ہم غلط اس سبز چیز سے نکالتے ہیں۔

لہٰذا یہ دونوں الفاظ اخضر اور خضر کے ہم وزن ہیں اور عربی زبان میں سیٹوں کا اشتقاق
عموماً مقررہ اوزان کے تحت اور باضابطہ ہوتا ہے۔

یہاں پر شیناً غصاً خفوا (ایک سرسبز اور شاداب چیز) کا فقرہ نہایت درجہ اہم ہے جو کلوروفل کی واضح خصوصیت ہے۔ اب پتہ نہیں مفسر موصوف کے نزدیک اس کا مصداق کیا تھا؟ اور ان کی معلومات کا ماخذ کیا؟ افسوس کہ یہ بھی ایک نہایت درجہ مخفّر سی تفسیر ہے جس کے باعث کوئی بھی نظریہ قائم کرنا دشوار ہے۔

اور اس موقع پر ایک غلطی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مفسر موصوف نے اس موقع پر "سرسبز و شاداب چیز" کو یہ جو بیلوں (بغیر تنے کے پودوں) تک محدود کر دیا ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اطلاق ہر قسم کے پیر پودوں پر یکساں طور پر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لغوی اعتبار سے لفظ نبات کے مفہوم میں مختلف قسم کے پیر پودے، گھاس پات اور زمین سے برآمد ہونے والی ہر قسم کی روئیدگی داخل ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ "سبز و شاداب چیز" یا کلوروفل کو محض بے تنے والی بیلوں ہی تک محدود کر دیا جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسر ابوسعود نے آیت زیر بحث میں "نبات" کے تذکرے کے بعد معاً ہی کھجور وغیرہ کے درختوں کے تذکرے کے پیش نظر اس کو ایک فلسفیانہ قسم کی تقسیم سمجھتے ہوئے "نبات" کو محض بیلوں پر محمول کر دیا ہو، جیسا کہ ان کی اس عبارت سے سمجھ میں آتا ہے

(فاخر جنانہ خفوا) شروع فی تفصیل ما أجهل من

لہ واضح رہے کہ یہ مادہ جب تک سرسبز و شاداب رہتا ہے کلوروفل کیلنا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ خشک ہو جاتا ہے "یے روح" بن جاتا ہے اور اس پر کلوروفل کا اطلاق نہیں ہوتا!

الاخراج وقد بُدئ بتفصيل حال النجم أي فأخرجنا
 من النبات الذي لا ساق له شيئاً غصناً أخضر....
 (ومن الخلل) شروع في تفصيل حال الشجر...
 چنانچہ صاحب کثاف... جو لغت وادب کے مُکمل امام ہیں اپنی تفسیر میں
 تحریر کرتے ہیں:-

(فأخرج جنابہ) بالماء (نبات كل شئ) نبات كل صنف من
 أصناف النامي (فأخرج جنابہ) من النبات (خضراً)
 شيئاً غصناً أخضر (تخرج منه) من الخضر (جاء متراكباً)
 وهو لسبيل

حاصل یہ کہ نبات کا اطلاق محض بے تنے کے پودوں یا بیوں تک
 محدود کر دینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہر قسم کے پڑ پودوں کے لیے بولا جاتا
 ہے اور "سر سبز و نشاداب چیز" ہر قسم کے نباتات سے نکلتی ہے۔
 امام رازیؒ نے اس لفظ (خضر) کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے:-
 والمراد من هذا الخضر العود الأخضر الذي يخرج أدلاً
 ويكون السبل في أعلاه۔ و قوله تخرج منه جاء متراكباً
 يعني يخرج من ذلك الخضر جاء متراكباً بعضه على بعض
 في سنبلة واحدة

۱۔ تفسیر ابوسعود بر حاشیہ تفسیر کبیر۔ طبع مصر

۲۔ تفسیر کثاف ج ۱ ص ۲۲۷ طبع مصر

۳۔ تفسیر کبیر ۱۰۶/۲

ترجمہ :- یہاں پر خضر سے مراد وہ سبز شاخ یا ٹکڑہ ہے جو پہلے پہل برآمد ہوتا ہے اور جس کے آخری سرے پر بالی یا جھٹہ ہوتا ہے اور ارشاد باری "ہم اس سے تہہ بہہ دانے نکالتے ہیں" یہ معنی رکھتا ہے کہ کسی غلے کے دانے جو ایک ہی بالی میں ایک دوسرے پر جمے ہوئے ہوتے ہیں اُسی سبز چیز سے نمودار ہوتے ہیں۔

امام صاحبؒ نے اس موقع پر "خضر" سے وہ ٹکڑے مراد لیے ہیں جو غلے کی بالیوں کے نیچے اور ان سے منقل ہوتے ہیں۔ یہ بیان واقعہ کے لحاظ سے خواہ صحیح ہو یا غلط مگر اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب کے دور میں اس لفظ کو سمجھنے اور اس کی تحقیق و تدقیق کرنے کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ "خضر" سے مراد شاخوں دار تناہوں کا نظریہ تفسیر مظہری اور تفسیر المنار میں ملتا ہے۔

"وهو ما تشعب من أصل النبات الخارج من البذر" یعنی خضر سے مراد وہ شاخوں دار تناہے جو بیج سے برآمد ہوتا ہے۔
 "وهو ما تشعب من أصل النبات الخارج من الحب كساق النجم وأغصان الشجر. فخرج منه أی من هذا الأخضر المتشعب من النبات آناً بعد آناً حبا متراكبا بعض فوق بعض وهو السنبلیہ۔"

ان دونوں اقوال میں فرق یہ ہے کہ صاحب مظہری قاضی محمد ثناء اللہ

نے اس کا مصداق محض شاخوں دار تنا قرار دیا ہے۔ جبکہ صاحب المنار علامہ سید رشید رضاؒ نے اس کے مصداق میں شاخوں دار تنے کے علاوہ شاخوں ڈالیوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اب اس بات کا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ اس نظریہ کا ماخذ کیا ہے اور یہ خیال کیوں کر پیدا ہوا ہے

مگر اس موقع پر امام رازیؒ کی ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے اس کا مصداق بالیوں سے متصل شاخوں کو قرار دے کر اس کو بہت زیادہ قابل فہم بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مواد نشائیہ (کاربوہائیڈریٹ) جو کسی بڑے یا پودے میں پھیلی ہوئی مختلف اور بے شمار فیوں میں تیار ہوتا ہے اور مختلف ڈالیوں سے گزرتا ہوا بالی سے ملی ہوئی شاخ میں داخل ہو کر بالی یا پھل میں جمع ہونے لگتا ہے۔ اور قسم ہا قسم کے غلے اور پھل وغیرہ سب کے سب اس کاربوہائیڈریٹ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جو انسان کی عبرت و بصیرت کے لیے جیسے بدل بدل کر کام دہن کے لیے لذت و ذائقہ کا سامان فراہم کرتا ہے۔

بہر حال دیگر تفاسیر میں بھی مذکورہ بالا اقوال ہی میں سے کوئی نہ قول

۱۔ مفسرین کے ان مختلف اقوال کے جائزے سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ کسی لفظ کا مفہوم اپنی فہم و بصیرت کے مطابق بلا تکلف بیان کر دیتے تھے بلا لحاظ کیے کہ یہ مفہوم سابقہ مفسرین کے خلاف پڑتا ہے یا نہیں! مگر موجودہ دور میں حال یہ ہے کہ سابق مفسرین کے اقوال سے ذرا سے اختلاف پر بھی ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ جدید تفسیر اصولی حیثیت سے کتنی ہی درست کیوں نہ ہو۔ فاعتبروا یا اولیٰ الابصار۔

ماتا ہے اور سب انہی باتوں کو دہراتے چلے گئے ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ علامہ طغطاوی جو ہر ہی مصرعے نے سبھی اس لفظ کی کوئی خاص تشریح نہیں کی ہے جو زمانہ حال کے ایک نامور مفسر قرار دیئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم سائنس میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اور جن کی تفسیر بعض حلقوں میں سائنسی علوم و افکار کے اعتبار سے تفسیر کبیر کا نقش ثانی اور ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس باب میں انہوں نے بھی بجز مفسرین کے اقوال کو دہرا دینے سے کوئی خاص تحقیق نہیں کی ہے۔ حتیٰ کہ الفاظ تک نہیں بدلے گئے۔

(فاخر جہا منہ) من النبات (خضرًا) شيئًا أخضر (تخرج منہ) من الخضر (جہًا متراکبًا) وهو السنبلیۃ
اب بلا تبصرہ اردو مفسرین و مترجمین کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔
"اور (دیکھو) وہی ہے جو آسمان سے (یعنی لمبڈی سے) پانی برساتا ہے۔ پھر اس سے ہر طرح کی روئیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر روئیدگی سے ہر سیاہری ٹہنیاں نکل آتی ہیں۔ اور ٹہنیوں سے دانے نمودار ہو جاتے ہیں۔"

"اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ ہر قسم کی نباتات اُگائی۔ پھر اس سے ہرے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیے، پھر ان سے تہہ پر تہہ چڑھے ہوئے دانے نکالے۔"

۱۔ الخواہر فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۸۱

۲۔ ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۷

۳۔ تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۵۶

”اور وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی روئیدگی کو نکالا۔ پھر ہم نے اس سے سبز شاخ نکالی کہ ہم اس سے اوپر تلے چڑھے دانے نکالتے ہیں۔“

”اور اس نے اُتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا سوا۔“

جذبہ جدید تفسیری اصول | ضمایاں پر ایک بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ مفسرین کرام کے مذکورہ بالا مختلف اقوال کے ملاحظہ سے اس بے غبار حقیقت پر بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے کہ انہوں نے اس آیت کریمہ میں لفظ ”خضر“ کی جو بھی تشریح و تفسیر کی ہے، وہ کسی منقولی روایت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے ذاتی غور و فکر اور ذاتی تفکر و تدبر کی بنا پر ہے۔ مفسرین کرام کی اس روش سے ہم کو بہت سے قیمتی اصول مل جاتے ہیں، جن کی روشنی میں ہم مزید حقیقات کے لیے اقدامات کر سکتے ہیں۔

۱۔ جہاں پر کوئی منقولی تفسیر موجود نہ ہو وہاں پر اصول صحیحہ کے تحت کوئی نیا مفہوم لیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس صورت میں قدیم مفسرین کے اقوال سے ہٹنا نا جائز نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ خود مفسرین کے مذکورہ بالا مختلف اقوال سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے پیش رو اور سابق مفسرین کے اقوال سے ہٹ کر کوئی

۱۔ تفسیر ماحدی، ص ۳۴۴۔ مطبوعہ لاہور

۲۔ ترجمہ از شیخ الہند

نہ کوئی نیا قول اختیار کر کے اپنے مابعد والوں کیلئے بھی ایک مثال قائم کر دی ہے ظاہر ہے کہ جب خود مفسرین ہی نے اس کی راہ دکھائی ہے تو پھر اب یہ چیز ناجائز نہیں قرار دی جاسکتی۔

۳۔ اصول صحیحہ اور ثابت شدہ حقائق و معارف کے تحت جو تفسیر کی جائے گی وہ "تفسیر بالرأے" نہیں ہوگی۔ ورنہ پھر خود بہت سے مفسرین پر بھی یہ الزام عائد ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک مفسر کے قول یا رائے سے ہٹنا اگر ناجائز یا تفسیر بالرأے ہوتا تو پھر مفسرین کے درمیان کسی قسم کا اختلاف ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور سب کے سب کسی ایک ہی قول پر متفق ہو جاتے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

۴۔ اب گفتگو جو کچھ بھی ہوگی وہ اصول صحیحہ کے حدود اور اس کے مبادی کے تعین میں ہوگی۔ نہ کہ اصول بالا کے حق یا ناحق ہونے میں۔

۵۔ اس قسم کے اختلافات زیادہ تر نئے نئے علوم و افکار کی تحقیق و تدوین اور تردید و اشاعت کی بنا پر پیش آتے ہیں۔

۶۔ یہ اختلافات زیادہ تر ان ہی آیات کریمہ میں پیش آتے ہیں جو بظاہر کائنات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور کائناتی علوم سے متعلق تحقیقات و انکشافات کی بدولت اس قسم کی آیات میں اختلاف رائے ایک ناگزیر چیز ہے اور زبوح کلور و فل والی آیت بھی اسی قسم کی ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ لوگ عام طور پر قدامتے مفسرین کے تفسیری اقوال کو بڑی وقعت بلکہ ایک طرح کے تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خواہ وہ غیر منقول یا اپنے ذاتی غور و فکر اور کد کاوش کا ہی نتیجہ کیوں نہ ہوں۔ مگر اس کے برعکس کسی نئی تفسیر پر اعتراضات کرنے لگ جاتے ہیں۔

خواہ وہ اصولی اعتبار سے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں۔ یہ عقلی جبر و اور قہرِ فکر کا نتیجہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علوم جب تک ارتقائی منازل سے گزرتے رہیں گے۔ اُن آیات کی تفسیر میں بھی ارتقا ہوتا رہے گا۔ جو کائنات کے نظریات اور اس کے فلسفے سے متعلق ہیں۔ لہذا اس سے نہ تو کسی قدیم مفسر کی تنقیص ہوتی ہے اور نہ جدید مفسر کی تعریف۔ بلکہ ہر مفسر دراصل اپنے ہی دور کی معلومات اور اس کے ذہن و فکر کا پابند ہوتا ہے۔ لہذا یہ تصور ہی غلط ہے کہ قدیم مفسرین نے قرآن حکیم کو ٹھیک طریقے سے نہیں سمجھا ہے جیسا کہ کوتاہ بینوں کا ادعاء ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اور قرآن حکیم میں ہر دور کے تقاضے کے مطابق ہدایت و رہنمائی کی صلاحیت موجود ہے۔ خواہ کسی دور میں شر و شاعری اور ادبیات کا غلبہ رہے یا کبھی عقلیات اور سائنس وغیرہ کا اس میں ہر قسم کے ذہن و دماغ کے مطابق دلیل و استدلال اور محبت و برہان کا پورا پورا سامان و دلیت کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کلور و فل وغیرہ قسم کے جدید انکشافات کا اظہار زمانہ قدیم میں نامناسب بھی تھا اور غیر موزوں بھی۔ اگرچہ یہ چیز اس کے خزانہ عامرہ میں بطور پیش بندی پہلے سے موجود تھی۔ تاکہ عصرِ جدید کے تقاضے کے مطابق اس کی بھرپور رہنمائی ہو سکے اور موجودہ بے مہارت عقلیت (RATIONALISM) کے مُنہ میں لگام ڈالی جاسکے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس قسم کی آیات میں کوئی بھی مفسر اپنی رائے یا تفسیر کو حرفِ آخر قرار نہیں دے سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل کا مفسر اس میں

کچھ نہ کچھ ترمیم کر ڈالے یا کسی مفہوم کو سب سے سے غلط قرار دے دے جیسا کہ مخضر
 ے تعلق مفسرین کے مختلف اقوال کے جائزے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی
 ہے۔ ایسے تمام مواقع پر قرآن کریم پر کوئی حرف آنے کے بجائے مفسرین کا اپنا ہی
 تصور فہم لازم آتا ہے کہ یہ کتاب برحق ایسے بلند اور اعلیٰ ترین حقائق پر مشتمل
 ہے کہ عقل انسانی ان حقائق عالمیہ کا کلی ادراک کر ہی نہیں سکتی اور ہمیشہ
 عاجز و در ماندہ رہے گی۔ لہذا آج کل یہ جو کہا جاتا ہے کہ سائنس کے بدلتے
 ہوئے نظریات کو بنیاد بنا کر کتاب اللہ کی تفسیر نہیں کرنی چاہیے۔ مبادا یہ نظریات
 مستقبل میں داتان ماضی قرار دے دیے جائیں تو یہ ایک موسومہ سا حدیثہ اور
 بے جا پیش بینی بلکہ حقائق و واقعات سے گریز و فرار اور سہل انگاری ہے
 ہم تو اپنے ہی دور کے حالات و وقائع کے مطابق کتاب اللہ میں غور و خوض
 کے پابند ہیں نہ کہ مستقبل کے حالات و واقعات کے۔ اس طرح کی حدیثوں
 سے ہم قیامت تک کسی بھی آیت کی تفسیر نہیں کر سکتے اور نہ کسی شرک و معاند
 کے خلاف اتمام حجت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں ایک منکر بھی قطعی
 دلائل تک کو یہ کہہ کر رد کر سکتا ہے کہ شاید مستقبل میں ان میں بھی کچھ ترمیم
 ہو جائے۔ اس قسم کی بے جا دور اندیشی کا تقاضا یہ ہو گا کہ ہم یا تو نظریہ
 کائنات سے متعلق آیات قرآنی کی تفسیر کرنا ہی چھوڑ دیں یا پھر علوم و مسائل
 کی گہرائیوں میں جانے کے بجائے ”ومن الناس من یعبد اللہ علی
 حراف“ کے بمصداق ”کنارے کنارے“ ہی رہنے کی کوشش کرتے رہیں۔ مگر
 اس صورت میں ہم باوجود مخالفت کے ایک جھوٹے کو سعی برداشت نہیں کر سکیں گے۔
 پہلے باب میں یہ بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ تبدیلی زیادہ تر
 ان ہی افکار و نظریات میں ہوتی ہے۔ جن کی حیثیت تجربہ و اختیار کی

رُف سے ثابت شدہ یا مسلمہ حقیقت کی نہیں بلکہ محض نظریاتی قسم کی ہوتی ہے اس کے برعکس کلورو فل کی حیثیت کسی نظریہ کی نہیں بلکہ ثابت شدہ حقیقت کی ہے۔ اور کسی سائنس لیپورٹری میں ہر شخص اس کا مشاہدہ و تجربہ کر کے بذاتِ خود اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ کلورو فل یا نباتات کا "سبز رنگ" اور اس کی کارکردگی ایک قانونِ فطرت یا قانونِ خداوندی ہے جس میں تغیر و تبدل کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نباتات جو کلورو فل کے حامل ہیں۔ مستقبل میں سرخ یا سیاہ بن جائیں یا ہرے رنگ کا ذرہ (CHLOROPLAST) کاربوہائیڈریٹ کی تیاری کا فصل ترک کر دے۔ یا بجائے کاربوہائیڈریٹ جیسے میٹھے اور خوشگوار مادہ کے کوئی کڑواکسیلا مادہ تیار کرنے لگ جائے۔ یا کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بجائے آکسیجن جذب کرنے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرنے لگ جائے۔ یا زائد پانی کا اخراج بجائے پتیوں کے جڑوں کی سمت سے سہونے لگ جائے یا بھول کے بجائے پھل پہلے نمودار ہونے لگ جائیں یا پانی اور کاربوہائیڈریٹ کی آمد و رفت کا نظام خلط ملط ہو جائے۔ آخر ان میں سے کون سی ایسی حقیقت ہے جس کے مستقبل میں تبدیلی ہو جانے کا امکان ہو؟ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ قوانینِ فطرت کیا ہیں اور ان میں تبدیلی کا امکان کتنا ہے؟ ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا حقائق سے متعلق کوئی فنی انکشاف سامنے آجائے۔ مثلاً کاربوہائیڈریٹ یا پروٹین وغیرہ کی ساخت و پرداخت کے متعلق کوئی نیا نظریہ سامنے آجائے۔ یا خدائیت میں موجود شدہ کوئی نیا وٹامن دریافت ہو جائے یا کلورو فل کی صلاحیت و

لے اب تک تیرہ قسم کے وٹامن دریافت ہو چکے ہیں جو پہلی صحت کے لیے بہت ضروری ہیں (سید وحید محمد جعفری)

کارکردگی پر کچھ مزید روشنی پڑ جائے۔

بہر حال یہ نہیں ہو سکتا کہ مستقبل کی سائنس موجودہ تمام حقائق کو کلی طور پر مسترد کر دے۔ اور اگر بغرض محال ایسا ہو بھی جائے تو اس سے جیسا کہ عرض کیا جا چکا۔ قرآن پر حرف آنے کے بجائے مفسر کے فہم پر حرف آتا ہے۔ بلکہ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس سے دراصل علوم سائنس ہی کا تصور لازم آتا ہے۔ گویا کہ قرآن حکیم کو کلی وحقی طور پر نہ سمجھ سکتے کا الزام مجموعی اعتبار سے پورے عالم انسانی اور اس کے کل علوم پر عائد ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی علوم اور اس کی ترقیاں جیسے جیسے بڑھتی جائیں گی قرآن حکیم کے حیرت انگیز ابہامات بھی بتدریج واضح اور روشن ہوتے چلے جائیں گے۔ مگر کوئی بھی حقیقت — جس کو علمی صداقت کہا جاسکے۔ ایسی دنیا نہیں ہو سکتی جو اس کے بیانات یا مندرجات سے متضاد ہو یا ان کو غلط ثابت کرنے والی ہو۔ چودہ سو سال کی پوری تاریخ میں اس قسم کی کوئی ایک مثال بھی سامنے نہیں آ سکی ہے اور نہ مستقبل میں کبھی آ سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا حیرت انگیز کلام اور ایسے لازوال کلیات وہی وضع کر سکتا ہے جس کا علم ماضی، حال اور مستقبل پر ہر حیثیت سے محیط ہو اور جس کی نظروں سے

لہ واندہ لکشب عزیز کا یا متید الباطل من بین ید یدہ ولا من خلفہ
تذلیل من حکیم حمید : یقیناً یہ ایک غالب و برتر (کبھی مغلوب نہ
ہونے والی) کتاب ہے جس میں باطل نہ آگے سے در آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے
جگہ پا سکتا ہے (کیونکہ یہ کتاب ایک بہت ہی دانشمند اور خوبیوں والے (رب)
کی جانب سے اتاری گئی ہے (لہذا وہ خوبیوں سے مملو ہے) (علم صحیحہ: ۱۱۴۷)

دنیا کا کوئی بھی واقعہ پوشیدہ نہ ہو۔

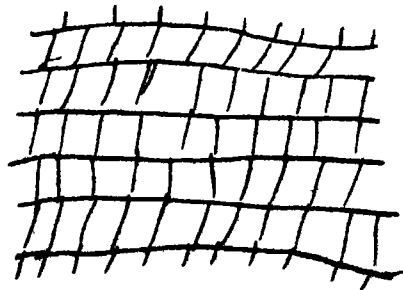
یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس عالم رنگ و بو کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور اس کی مکمل ہسٹری بیان کرنے سے پوری دنیائے سائنس جس طرح عاجز و بے بس ہے اسی طرح اس بلند و بڑے کلام کی مکمل تشریح و تفسیر بے کم و کاست بیان کر دینے سے تمام مفسرین بھی قیامت تک عاجز و درماندہ رہیں گے۔

اس جائزہ سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ عالم رنگ و بو اور یہ کلام برحق دونوں ایک ہی سرچشمہ کے دو پر تو ہیں جن کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا کارے دارد ہے۔ ان دونوں کے حقائق و معارف کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ قرآن اور کائنات کا ہر انکشاف انسان کے عجز و انکسار اور اس کے جبل ہی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کا علم و عرفان ایک مقررہ حد سے آگے کبھی نہیں بڑھ سکتا۔

حاصل کلام یہ کہ اگر بالفرض ہم اپنی کوتاہ فہمی کے باعث کسی لفظ یا کسی آیت کی غلط تفسیر کر جائیں اور وہ مستقبل کی تحقیقات کا مقابلہ نہ کر سکے تو اس کو مستقبل کا مفسر درست کرے گا۔ جس طرح کہ ہم قدامت مفسرین کی بعض غلطیوں کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ لہذا ہمیں اس بارے میں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی جذاں ضرورت نہیں ہے۔ ہم کو تو صرف اصول صحیحہ کا لحاظ رکھنا چاہیے اور بس۔

کلوروفل کی مزید توضیح | اوپر کی بحث ضمناً آگئی۔ بہر حال آیت زیر بحث کی میں نے جو کبھی تشریح و تفسیر کی ہے وہ صحیح اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے طویل عذر و خوض کے بعد کی ہے۔ خلاف اصول یا بے بنیاد

طور پر کوئی بات بیان کرنے سے قطعاً احتراز کیا ہے۔
 اس آیت کریمہ کی صحیح عظمت کو سمجھنے کے لیے بہتر یہ ہو گا کہ کلوروفیل
 کی مزید وضاحت کی جائے۔ چنانچہ یہ بات اولین طور پر نوٹ کرنے کے
 قابل ہے کہ کسی بھی پٹر پودے کی پتیاں جو بظاہر سبز اور ہری نظر آتی ہیں
 تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر ایک پتی پوری طرح سبز رنگ میں رنگی ہوئی
 ہوتی ہے۔ بلکہ ہر پتی میں چند ایسے ذرات ہوتے ہیں جو سبز رنگ کے حامل
 ہوتے ہیں اور پتی کا بقیہ حصہ بے رنگ رہتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے
 کہ ہر ایک پتی سینکڑوں ہزاروں چھوٹے چھوٹے خورد بینی خلیوں کا مجموعہ ہوتی
 ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک خلیہ (CELL) کو خنرایہ (PROTOPLASM)
 کی ایک اکائی (UNIT) کہا جاتا ہے۔ جس کے اندر ایک زندہ متحرک
 اور مسلسل تغیر پذیر مادہ بھرا رہتا ہے۔ یہ تمام خلیے ایک دوسرے سے
 الگ الگ اور باہم مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر خلیے کے چاروں
 طرف سیلولوز کا ایک دیوار ناما پردہ حائل رہتا ہے۔ خلیوں کی ساخت اور حالت
 کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل شکلیں ملاحظہ ہوں۔ جو علم نباتات (BOTANY)
 کی مختلف کتابوں سے دیئے جا رہے ہیں۔

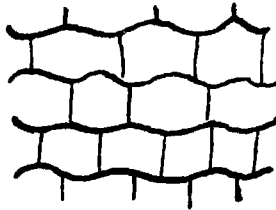


کارک

کارک کے خلیے

اس شکل میں داہنی جانب ایک کارک دکھایا گیا ہے اور بائیں جانب چند خانے۔ یہ خانے دراصل اُس کارک کے خلیے (CELLS) ہیں جو اس کو اڑا کاڑ کر خوردبین کی مدد سے ایک سو گنا بڑا کر کے دکھائی گئے ہیں۔ یہ خلیے کسی دقت زدہ تھے، مگر اب مُردہ ہیں۔ اب آپ کو خلیوں کی ساخت اور ان کی جسامت کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ کارک کے خلیے پہلی بار ایک انگریز رابرٹ ہک (ROBERT HOOK) نے ۱۶۶۷ء میں ایک خوردبین کی مدد سے دیکھے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تمام نباتات تقریباً اس قسم کے خلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جڑ، تناء، ڈالیاں، شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل وغیرہ عرصہ نباتات کا ہر حصہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے خانوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔



یہ پیاز کے ایک چھلکے کے خلیے ہیں جو خوردبین کی مدد سے بہت بڑے کر کے دکھائے گئے ہیں۔

لے کارک شاہ بلوط کے درخت کی پھال سے نکلتا ہے۔ جو بوتلوں کے منہ بند کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

A SCHOOL COURSE OF BIOLOGY, P. 134 LONDON ۱۹۴۵



اس شکل میں ایک پودے کی پتی کی نچی سطح کو خوردبین کی مدد سے بہت بڑی بنا کر دکھایا گیا ہے۔ اس میں متعدد خلیے نظر آتے ہیں جن میں کچھ مسامات بھی نظر آرہے ہیں۔ انہی مسامات کو دہن یا STOMATA کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ بیرونی ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ پتی کے اندر آتی ہے اور نائڈ پانی خارج ہو جاتا ہے۔

خلیوں کی شکل و صورت سے متعلق اس اجمالی علم کے حصول کے بعد آئیے اب ان کی اندرونی ساخت و پرداخت کا بھی کچھ مطالعہ کر لیں۔

ہر ایک خانہ (CELL) دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے

۱۔ سائٹوپلازم (CYTOPLASM)

۲۔ مرکزہ (NUCLEUS)

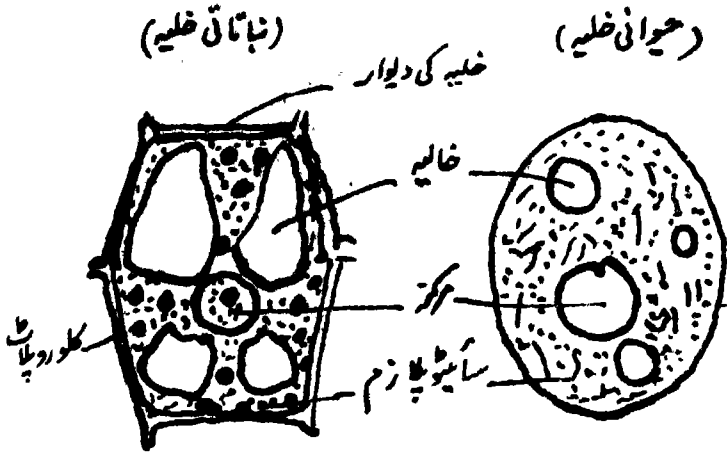
ان دونوں میں مرکزہ کی حیثیت بہت اہم ہے۔ اس میں زندگی کی

تمام سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ خلیہ میں سائٹوپلازم اور مرکزہ

کے علاوہ کچھ خالی جگہیں بھی ہوتی ہیں۔ جن کو خالیہ یا

VACUOLE کہا جاتا ہے۔ ان تینوں کی وضاحت حسب ذیل

شکلوں سے ہو سکتی ہے۔



یہاں پر دہاسی جانب ایک حیوانی خلیہ (ANIMAL CELL) اور بائیں جانب ایک نباتاتی خلیہ (PLANT CELL) کی مدد سے بہت بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ حیوانی خلیہ کی کوئی دیوار نہیں ہوتی۔ جبکہ نباتاتی خلیہ سیلولوز (CELLULOSE) کی ایک دیوار سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ نیز حیوانی خلیہ کے برعکس نباتاتی خلیہ کے سائٹوپلازم میں کچھ ننھے ننھے سے ذرات بھی بڑی مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان ذرات کو کلوروپلاسٹ (CHLOROPLAST) کہا جاتا ہے اور ہر رنگ یا کلوروخل (CHOLORPHYLL) ان ہی ذرات میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ان ہرے ذرات کے علاوہ پروٹوپلازم کا بقیہ تمام حصہ بے رنگ دکھائی دیتا ہے۔ انہی ذرات کو قرآن عظیم "خضراء" (شیئا اخضر) یا سبز چیز کہتا ہے اور انہی سبز ذرات کی بدولت بیڑ پودے ہرے بھرے نظر آتے ہیں۔

پروٹوپلازم اور سائٹوپلازم کے درمیان فرق یہ ہے کہ کس خلیہ کے

اندر موجود شدہ پورے مادے کو پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ اس کے برعکس سائٹوپلازم غلیہ کے صرف اُس حصہ کو کہتے ہیں جو خالیوں (VACUOLES) کے درمیان مختلف شکل و صورت اور حجامت میں پایا جاتا ہے۔ نباتات کے تمام سبذرات (کلوروپلاسٹ) سائٹوپلازم ہی کے جسم میں جڑے ہوتے ہیں۔ اب یہاں پر اس بات کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مذکورہ بالا تمام حقائق مشاہداتی و تجرباتی نوعیت کے ہیں اور دنیا کے سائنس میں اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ (باقی آئندہ)

اہل علم کے لیے چار نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی :- جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط وار شائع ہو رہا ہے قیمت مصر و غیرہ

کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے

آج ہی مبلغ دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک اہلین

طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۶ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ جلالین شریف :- مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) لباب النقول فی اسباب

النزول للسیوطی (۲) معرفۃ الناسخ والمسنوخ لابن الحرم قیمت جلد ۲۰ روپے

۳۔ شرح ابن عقیل :- الفیہ ابن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے۔ قیمت جلد ۲۰ روپے

۴۔ شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی سورہ بقرہ تین جلدوں میں مشائع ہو رہا ہے پہلی جلد آچکی ہے

مؤنہ طلب فرمائیے۔

پتہ :- ادارہ مصطفائیہ۔ دیوبند ضلع مہارنپور

محمد مجیب صاحب

(از نواب مشتاق احمد صاحب ایم۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا)

دہرہ دون کے کیرج اسکول میں میرا داخلہ جنوری ۱۹۱۵ء میں ہوا تھا اور پھر بورڈنگ ہاؤس کی کشادہ اور شان دار عمارت ہی کے ایک حصہ میں تعلیمی کام بھی ہوا کرتا تھا تو اس ۱۹۱۵ء کے غالباً وسط میں ایک ایسے وقت جبکہ کلاس پھر ہی تھی انکوں کے پرنسپل آر۔ ٹی۔ ڈالہی صاحب ایک دن دو نئے لڑکوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے ان میں سے ایک چودہری محمد اسحاق صاحب اور دوسرے محمد مجیب صاحب تھے بعد اس پر چلا کہ یہ دونوں۔۔۔ قریبی رشتہ دار ہیں۔ مجیب صاحب قد میں اتنے چھوٹے تھے کہ کسی معمولی سے ڈلیک پر کام کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی ایسے انہوں نے کھڑے کھڑے اپنا کام کیا۔ ڈالہی صاحب نے کسی انگریزی کتاب میں سے ایک کہانی ان دونوں کو پڑھ کر سنائی اور ہدایت کی کہ اپنے الفاظ میں لکھ کر اسکو پیش کریں اور تشریف لے گئے اس کے بعد شام میں کسی وقت انہوں نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ یوں تو دونوں نے لڑکوں نے اپنا کام اچھا کیا ہے۔ مگر مجیب صاحب کی عبارت بہت ہی اچھی ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ ہم جو نئے طلباء میں سب سے اچھی انگریزی مجیب صاحب کی تھی۔ الہ آباد اور پھر بمبئی میں جہاں ہم کو امتحان دینے جانا پڑا تھا۔ مجیب صاحب کے لیے ایک چھوٹا ڈلیک بہ طور خاص مہیا کئے جانے کے واسطے پرنسپل جٹانے پہلے ہی سے خط لکھ کر انتظام کروالیا تھا۔

انگریزی ادب کا جو چکا مجھے پڑا وہ مجیب صاحب کی۔۔۔ اور ان کا

نئی نئی خوب صورت جلدوں والی کتابوں کے پڑھنے کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ کتاب
FABLES Aesop میں نے پہلی بار عجیب صاحب ہمارے لئے کہ
پڑھی تھی اور اچھی اچھی کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا شوق عجیب صاحب کو شروع
دن سے رہا ہے۔

اسحاق صاحب تو ہم لوگوں میں اس لئے زیادہ گھل گھل گئے تھے کہ وہ میدانی
کھیلوں میں ہمارے ساتھ شریک رہتے تھے اور ہاکی ٹورنٹہ رفتہ رفتہ بہت ہی اچھی کھیلنے لگے
تھے۔ فارورڈ لائن میں رائٹ ان کھیلا کرتے تھے جبکہ احمد انصاری لفٹ ان ہوتے
تھے اور ہر سچ میں ان دونوں کا دو ایک گول کرنا ان کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔
فضل الرحمن احمدی صاحب ہمارے بڑے قابل بھر دسہ گول کسیر تھے اور گواخان
حصین۔ احسن محمد فاروقی۔ اللہ دیوسر و صاحبان وغیرہ بہت اچھی ہاکی کھیلتے
تھے۔ ہماری ٹیم کی جان منصب علی خاں صاحب تھے جو سنٹر ہاف کھیلا کرتے تھے
اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ضلع سہارن پور تو درکن اس زمانے میں دوسرے
اضلاع میں بھی دور دور تک ان کی ٹکر کا شاید ہی کوئی کھلاڑی رہا ہو۔ اگر آج
ہوتے تو آلی انڈیا ہاکی ٹیم کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے۔ لیکن عجیب صاحب
نے کتاب کے کپڑے تھے۔ یوں مارے باندھے کو ایک آدھ بار ہاکی اسٹک پکڑ
لینا کسی شمار میں نہیں آتا۔ وہ کھیل دیکھنے کو تو برابر باہر آتے تھے اور ٹیموں
کے سچ دیکھنے کو بھی ساتھ رہا کرتے تھے مگر کسی سچ میں کھلاڑی کی حیثیت سے
ان کی شرکت کم سے کم مجھے تو یاد نہیں۔ البتہ پکنک وغیرہ پر بڑے شوق سے
جایا کرتے تھے اور گپی بانی کا کوئی سفر ایسا نہیں سوا جس میں عجیب صاحب ساتھ نہ
گئے ہوں۔ حد یہ ہے کہ مصوری پہاڑ پر جانے سے کبھی نہیں ہچکچائے۔ حالانکہ
رائے پور سے مصوری تک کی یہ جڑ بھائی ہم طلباء پیدل ہی طے کیا کرتے تھے اور یہ

ان دنوں کی بات ہے جب بس اور سوڑکار وغیرہ کی موجودہ سہولتیں حاصل نہ تھیں۔ اس سلسلہ میں وہ دن مجھے کبھی بھولے گا جب ہم سب لڑکے خوش خوش بورڈنگ ہاؤس سے تانگوں میں لہ کر راج پور پہنچے اور وہاں سے کھیتے کودتے مسفوری کا پورا راستہ باتوں باتوں میں پیدل طے کر گئے اور دن بھر مسفوری پر مارے مارے بھرنے کے بعد اپنی سابقہ دھما چوڑی کے ساتھ پیدل ہی مزب کے قریب راجپور والپس آئے مگر یہاں آن کر جب پتہ چلا کہ کوئی سواری دہرہ دونے جانے کے لیے موجود نہیں ہے تو سب کا ادپر کا سانس ادپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ لیکن اب سطح سڑک کا سات میل کا یہ راستہ پیدل طے کرنے کے سوا چارہ نہ تھا پھر یہ آخری مرحلہ جس طرح ہم سب کو کھلا ہے اس کا اظہار الفاظ میں ناممکن ہے اور جب والپس گھر کی شکل نصیب ہوئی ہے اس وقت تک بہت سے لڑکوں کے ہاؤس میں چھالے آچکے تھے۔ نہ معلوم کس کام نہ دیکھ کر ہم لوگ اس دن بورڈنگ میں سوتے سے اٹھے تھے۔ والپس گودیر میں ہوئی تھی مگر ڈالہ صاحب حیران دپریشان کھڑے ہوئے نظر پڑے۔ انتہائی شفقت و محبت سے کھانا کھلویا اور دوسرے دن ہم سب کو جماعت کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا مجیب صاحب کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی زبانیں سیکھنے کا ان کو اسی زمانے سے خاص شوق تھا اپنے ساتھیوں میں اکیلا میں ہی ایسا جو نیر طالب علم تھا جو گلستانِ بوستان، انوارِ پہلی جیسی کتابیں گھر پر پڑھ کر مدرسہ میں شریک ہوا تھا اور مجیب صاحب نے شاید وہیں آن کر فارسی شروع کی تھی۔ لیکن جب کیمبرج پرلی میزے امتحان کا نتیجہ نکلا کہ جس کے لیے ہم کو الہ آباد جانا پڑا تھا تو جہان دوسرے لوگ صرف کامیاب ہوئے تھے وہاں مجیب صاحب کو آنرز ملے تھے اور کئی مضامین میں ڈسٹنکشن

اُنہی اور خاص بات یہ ہے کہ فارسی میں ان کے مارکس مجھ سے زیادہ تھے بہار
پرنسپل ڈاکی صاحب لاطینی زبان پر جان دیتے تھے اور انہوں نے اپنی پوری
کلاس پر اس زبان کو حکماً لاد دیا تھا۔ خیر اور سب تو زبردستی کی لاطینی پڑھتے
تھے مگر مجیب صاحب کو اس زبان سے بھی دل چسپی پیدا ہو گئی اور انہوں نے
یہ عقل مندی کی کہ موسمی تعطیلات میں جب گھر گئے تو لاطینی گرامر کا ایک نسخہ
اپنے ساتھ لیتے گئے اور وہاں پر پورے قواعد کو چاٹ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ
عربی کی طرح لاطینی زبان میں بھی قواعد ہی بہت کچھ منحصر ہے مجیب صاحب
اس زبان پر بھی حاوی ہو گئے۔ مادری زبان اردو کو ملا کر یہ چار زبانیں ملیں
پھر مجیب صاحب نے آگے چل کر رفتہ رفتہ فرنگی جرمن اور روسی زبانوں پر
بھی عبور حاصل کر لیا اور آج تو وہ ہفت زبانی کی منزل سے بھی آگے نکل چکے
ہیں۔ بہر حال ذکر لاطینی زبان کا چل رہا تھا۔ جب ڈاکی صاحب کی کوئی دھڑا
میری سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں بے تاثر مجیب صاحب سے اپنی مشکل حل کر لیا
کرتا تھا اور با اوقات ڈاکی صاحب کے مقابلہ پر مجیب صاحب کا بتایا ہوا
ترجمہ مجھے زیادہ بامحاورہ اور چیت معلوم ہوتا تھا اس لاطینی گرامر کے سلسلہ
میں یاد آیا کہ ایک دفعہ لفظ TUTORIAL مجھے یاد نہیں رہا اور اس کی بجائے
TERRITORIAL GRAMMER کے الفاظ میرے منہ سے نکلے تو مجیب

صاحب نے سکر اس غلطی کی اصلاح کر دی تھی۔ ایک دن کلاس میں
ALLITERATION کا ذکر آ گیا اور پرنسپل صاحب نے تفصیل کے
ساتھ بہت سی مثالیں دے کر اس پر روشنی ڈالی تو مجیب صاحب نے اس دن
سہ پہر میں جب کہ وہ آلوچ کے ایک درخت پر چڑھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے
مجھے آلوچ توڑتے ہوئے دیکھا تو ایک کڑک دار آواز نکالی کہ —

I SAY HUSHTAQ, DON'T YOU BE PLUCKING PLUMS, PLEASE۔ محیب صاحب میں ایک خاص بات میں نے یہ پائی کہ وہ کسی سے زیادہ گھلتے ملنے اور بے تکلف ہونے میں پس و پیش کرتے ہیں اور بہت ہی لیے دیے رہنے کے عادی ہیں مگر اس کے ساتھ قدرت نے ان کو بڑا مرنجان مرتج قسم کا مزاج عطا فرمایا ہے۔ ہم لوگ کیمرج اسکول میں کمیشن چار سال تک ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں مقیم رہے۔ اس دوران میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے۔ مگر میں نے محیب صاحب کو ایک دفعہ بھی کسی سے لڑتے محبکڑتے نہیں دیکھا۔ ہم لوگ اکثر آپس میں لڑا بھڑا لیتے تھے اور بعض دفعہ تو مار کٹی تک بھی لوبہ پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ جالندھر کے قاضی محمود عالم باگو صاحب سے تو تقریباً ہر قسم کے جو تھے دن میری ہاتھ پائی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن محیب صاحب اس کبھیرے سے ہمیشہ آزاد رہے۔ جب شروع شروع میں وہ اسکول میں داخل ہوئے ہیں تو کھانے کی لمبی میز پر اگر ان کو کسی بات پر سہنی آجاتی تھی تو سامنے کی رکابی کھینچ لیتے تھے اور اس پر نہایت اطمینان سے موندہ رکھ کر آہستہ آہستہ دیر تک دل کھول کر سنتے رہتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد بڑا غریب پلیٹ بدلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

مولوی محمد احمد خاں صاحب (علگ) ہمارے اسکول کے آئری سکریٹری تھے اور اس کام کے سلسلہ میں تقریباً ہر مہینہ سہارن پور سے آن کر چند روز کے لئے بورڈنگ ہاؤس میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن عبدالرحمن صدیقی صاحب مرحوم اور شبیب قریشی صاحب مرحوم ان کے پاس دہرہ دون تشریف لائے اور بورڈنگ ہی میں بٹھے۔ اس دن رات میں ڈنر کے بعد جو سب ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے۔ طلباء کو تقریر کرنے کی ترغیب دی گئی۔ ہم سب جو نیر طلباء کی

عمری تقریر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مجیب صاحب نے بھی تقریر کی۔ موضوع غالباً
 فٹ بال کا کھیل تھا۔ انھوں نے رائے دی کہ فٹ بال بہت بڑی سہتی ہے
 اس لیے اس کا سائز گھٹا دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ مجیب صاحب بھلا فٹ بال
 کی کھیلے مگر شاید انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر میں کبھی اس کھیل میں شرکت
 کروں تو فٹ بال کے چھوٹا ہوئے بغیر ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ ویسے ہی
 ایک دوسرے موقع پر شاید اردو اور انگریزی پر مباحثہ سہرا ہوا تھا تو مجیب
 صاحب نے ایک انگریزی شعر جس میں *drop by drop* کے الفاظ
 تک مجھے نہیں بھولے ایسے عمدہ لہجے اور انداز سے سنایا تھا کہ سارا مجمع کھڑک
 گیا اور بے اختیار تالیاں بجانے لگا تھا۔ مجیب صاحب عمر میں مجھ سے چھوٹے
 ہیں۔ میرے کوئی بھائی نہ تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کوئی مجھے بھائی
 کہہ کر مخاطب کرے اس لیے ایک دن میں نے مجیب سے کہا کہ تم مجھے اپنا بھائی
 بناؤ تو اس وقت سے اپنے دوسرے بڑے بھائیوں کی طرح انہوں نے
 مجھے بھی بھائی جان کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بڑے
 بھائی پر و فیروز صاحب کا انگریزی خط ایک خاص شان دل آویزی
 رکھتا ہے اور مجیب صاحب نے اسکول کے انہی دنوں میں اس طرز تحریر کی عین
 میں نقل کرنی شروع کر دی تھی اور اس میں اتنی مشابہت پیدا کر لی تھی کہ دیکھنے
 والے کو بہ یک نظر شکل سے یہ تمیز ہو سکتی تھی کہ اس میں مجیب صاحب
 کی تحریر کون سی ہے اور مجیب صاحب کی کون سی۔ مگر جہاں جب صاحب
 اپنی ابتدائی روش تحریر پر آخر وقت تک قائم رہے۔ وہاں مجیب صاحب
 نے ہفت سرسنتاد قالب دیدہ ام کے مصداق اپنے خط کو بار بار بدلا ہے
 اور وہ عیب صاحب کی روش تحریر کو آج بالکل فراموش کر چکے ہیں۔

میری بد قسمتی سے سفیر کیمزج کے امتحان میں جزافیہ کا مضمون لازمی تھا۔ مجہبی میں مغفہ اس امتحان کے موقع پر جزافیہ کا پرچہ میرے سامنے ہے اور اس میں MADAGASCAR پر ایک سوال دیا گیا ہے۔ مجھے اس مضمون سے عمر کھر کا سیر ہے اور بندہ اس میں ہمیشہ کو راہی رہا۔ برابر میں عجیب صاحب بیٹے ہوئے ہیں میں نے چکے سے دریافت کیا کہ MADAGASCAR کیا بلا ہے تو عجیب صاحب نے بلا کسی صحبک کے پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ A TRIBUTARY OF THE RIVER NILE اور میں وہی جواب ٹانک آیا۔ جس پایہ کا یہ جواب تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ اس امتحان کی جو رپورٹ کیمزج سے شائع ہوئی ہے اس میں اس جواب کا حوالہ موجود ہے۔ ایک دوسرے موقع پر عجیب صاحب کے والد بزرگوار جناب مولوی محمد نسیم صاحب مرحوم جو اودھ کے چوٹی کے ایڈوکیٹ مانے جاتے تھے لکھنؤ میں ڈالی باغ والے اپنے دولت کدہ میں تشریف فرما ہیں اور عجیب صاحب کے ساتھ اس وقت میں بھی حاضر ہوں۔ مجدد و محب سے دریافت فرماتے ہیں کہ دہرہ دون کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ صنعت و حرفت کے لیے جاپان جانے کا خیال ہے اس پر سوال پڑتا ہے کہ WHAT ARE YOUR PROSPECTS IN THAT SUBJECT. I HAVEN'T SEEN ANY PROSPECTUS AS YET. و مغفور تو یہ جواب سن کر لا جواب ہو گئے مگر عجیب صاحب کے بھوں پر جو سرکڑ نمودار ہوئی اس سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عجیب صاحب کے ساتھ ان کے ایک سن رسیدہ ملازم بھی دہرہ دون بھیجے گئے تھے۔ نام رمضان تھا اور

پوری بولی بولا کرتے تھے جو ان کے منہ سے بڑی بھلی لگتی تھی۔ بھلا اب کا ہے
کونذہ ہوں گے۔

طلباء کے لیے ایک دوسرے کی کوئی چیز چھپٹ لینا کوئی بات ہی نہیں ہے
بھر جب زندگی بورڈنگ ہاؤس میں گزر رہی ہو تب تو اس عادت میں بڑی
صفائی آجاتی ہے اور بہت سے واقعات اس سلسلہ میں سنائے جاسکتے ہیں۔
جو دل چسپی سے خالی نہ ہوں گے مگر یہاں صرف ایک واقعہ سامنے لانا کافی ہوگا
مجیب صاحب ہماری کھینچا تانی اور مار دھاڑ میں گو کبھی شریک نہیں رہے
مگر اس کے باوجود بورڈنگ کے احاطہ میں یسپی کے درختوں کا جو سرسبز و شاداب
باغ تھا اس کی لیمپوں پر مجیب صاحب کی نظر بھی پڑتی رہتی تھی اور مالی کی
نظر بھی کر ان کو توڑنے اور کھالینے میں مجیب صاحب بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے
تھے۔ یہی نہیں۔ بلکہ جب دوسرے لڑکے رات کو لیچیاں توڑ کر اپنے ٹکیوں کے
علائقوں میں بھریا کرتے تھے اس وقت مجیب صاحب اس لوٹ میں بھی اپنا حصہ
بہت احتیاط کے ساتھ آنے پائی سے چکایا کرتے تھے۔ ہم طلباء میں سے کوئی بھی
اپنے کانوں کو از خود جبش دینے پر قادر نہ تھا مگر مجیب صاحب جب چاہتے
تھے لمحہ دو لمحہ خاموش ہو کر اپنے دونوں کان ہلایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کان
اب بھی ان کے قابو میں ہیں یا نہیں۔ مگر جہاں مجیب صاحب اپنے کانوں سے
ہم کو ہرادی کرتے تھے وہاں میں بھی ان سب کو ہرادی کرتا تھا سو سے ایک تک کی
گنتی ایک سالن میں الٹی گن کر۔ میرا اور مجیب صاحب کا ساتھ دہرہ دون
کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی تین سال تک رہا۔ اس لیے وہاں کا کبھی
کچھ حال سننے چلیے۔ گو مجیب صاحب سینئر کیمبرج امتحان میں آنرز کے ساتھ
شاندار طریقہ پر کامیاب ہوئے تھے اور میں ناکام رہا تھا لیکن جب آکسفورڈ پہنچے

تو پتہ چلا کہ سنیر کمرچ کے صرف دو طلباء وہاں کے ابتدائی امتحان *RESPONSIONS* نامی سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں جنہوں نے لاطینی زبان کے ساتھ یونانی زبان بھی لی ہو۔ چونکہ محیب صاحب نے لاطینی کے علاوہ فارسی لی تھی اس لیے ہم دونوں کو یہ ابتدائی امتحان دینا پڑا اور دونوں نے فارسی کے ساتھ امتحان دیا اور صرف اس موقع پر فارسی زبان میں محیب صاحب کے مارکس مجھ سے کم آئے تھے۔ اس یونیورسٹی کے بہدستانی طلباء نے مدتوں سے اپنی ایک مجلس مباحثہ "آکسفورڈ مجلس" کے نام سے الگ قائم کر رکھی ہے۔ چنانچہ اس کا اپنا ایک دستور ہے اور عملوں کے انتخابات جو سب آئری ہوئے ہیں ہر سال سہا کرتے تھے۔ میں اس مجلس آئری ٹریڈر منتخب ہوا تھا۔ مگر جب محیب صاحب کا انتخاب آئری سکریٹری کی حیثیت سے عمل میں آیا تو ان کو مجلس کے جلسوں کی روئیداد کھنی پڑی۔ لیکن جس دن اپنی پہلی ہی تحریر کردہ روئیداد محیب صاحب نے پڑھ کر سنائی تو اس پر بڑی لمبے مدد شروع ہو گئی اور ہر طرف سے اعتراضات کی بھرمار مہینے لگی۔ بات دراصل یہ تھی کہ سابق میں اس مجلس کی روئیداد ایک بڑی روکھی پھکی اور بے جان سی چیز ہوا کرتی تھی جس میں سوائے اس کے کہ فلاں مصنون پر فلاں صاحب نے اتنی دیر تک تقریر کی اور مباحثہ کا یہ نتیجہ نکلا اور شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے شاید محیب صاحب نے خیال کیا ہو گا کہ موقع اچھا ہے۔ مقررہ ڈگر سے ہٹ کر اپنا مقام پیدا کرنا چاہیے۔ مگر وہاں اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی والا مصنون ہو گیا اور جو پہلی روئیداد انھوں نے لکھی اس میں اپنے مخصوص اور چلبے انداز میں ہر ہر تقریر اور مقرر پر دل کھول کر تبصرہ کیا اور روئیداد کے صفحات پر رنگ رنگ کے کھول کھلا دیے مگر اعتراض یہ تھا کہ اس قسم کی رنگین روئیداد مجلس کی سابق روایات کے بالکل خلاف ہے

مجیب صاحب نے آئی بلا کو یہ کہہ کر ٹالا کہ آئندہ سے ایسے کسی اعتراض کا موقع نہیں دیا جائے گا سابق میں میرا یہ خیال تھا کہ جو بات مجیب صاحب کی تقریر میں ہے وہ ان کی تقریر میں نہیں ہے اور اپنے اس خیال میں کسی زیم کی ضرورت مجھے آج بھی محسوس نہیں ہوتی۔

اگر مجیب صاحب کی نظر سے یہ سطور گزریں تو ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اسکول کے بچے کچھ چند ماحیوں کو دہرہ دون میں جمع کرنے کی کوشش کریں اور ایک REUNION کی صورت نکالیں تاکہ ڈالہی صاحب مرحوم کی روح خوش ہو اور ہم لوگ بھی ایک بار پھر اس خوبصورت مقام کی زیارت کر لیں جہاں زندگی کا سب سے اچھا اور خوشگوار زمانہ گزار آئے ہیں۔ جن چودھری محمد اسحاق صاحب کا ذکر اوپر کی ابتدائی سطور میں آچکا ہے جب ان کو پتہ چلا کہ میں نے مجیب صاحب کے اسکول پر ایک مضمون لکھا ہے تو انہوں نے اس میں جو اضافہ کیا وہ ایک گروپ فوٹو گراف کے متبرہ سے شروع ہوتا ہے جو ان دنوں کا میرے پاس محفوظ ہے اور جس کو دیکھ کر اسحاق صاحب نے بھی اپنی یاد تازہ کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ان خاتون کا نام جو مس اسمتھ کے برابر بیٹھی ہیں اور سالہائے دیرینہ میں ہماری ابتدائی جماعت کی ٹیچر تھیں مسز ڈکنسن اس گروپ میں ایک نہایت مایہ ناز اور بلند اخلاق اور ہر دلعزیز شخصیت ہمارے پرنسپل آر۔ ٹی۔ ڈالہی صاحب کی تھی جو کہ ہمارے ضروریات کے ہمہ وقت سادگی اور انتہائی محبت اور خلوص سے ہم کو پڑھایا کرتے تھے اور طلباء کی ہر عمدہ بات کو سراہتے تھے۔ چنانچہ جب ایک مین سیٹھ کے صاحبزادے پر بھائی نے خلاف وصعداری اسکول برادران ملت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گھر سے لائے ہوئے حلویے و بادام و اخروٹ و حلخوزہ جات بقدر دو مین کلاں تقوین

ہاں میں رکھ لیے۔ خود ہی لطف اندوز ہو کر استفادہ اٹھاتے اور یاد ان طریقت کے اصرار پر ان کو سمجھا دیتے کہ پائسہ لگا ہے معنت کا مال نہیں ہے۔ لہذا ایک اتوار کی صبح جب پیر بھائی سویرے کی تازگی میں چہل قدمی فرما رہے تھے اور ایک مخلص نے ان کے کان میں چپکے سے کہا کہ باغ کے فلاں گوشہ میں متہارا قفل و کٹ کی نوک سے توڑ کر مال غنیمت تمام برادری میں تقسیم ہو رہا ہے۔ تو پیر بھائی وہاں سے اڑے اور اڑ کر انہوں نے دیکھا کہ وہی دونوں ٹین کلاں جو اپنے تکلفات سے بھرپور بھولے نہیں سماتے تھے وہ آج اوندھے منہ باتے پڑے ہیں اور خاکساران اسکول کے منہ قوت شیرینی سے غیر معمولی متحرک ہیں۔ تو پیر بھائی کے جذبات ابل پڑے، اور ہماری سب کی طرف گھولنا دکھاتے ہوئے جاب پرسنل آر۔ ٹی۔ ڈاہی کی خدمت میں لپک کر حاضر ہوئے، اور قصہ بیان کر ڈالا۔ طلبی ہوئی بحالہ پوچھا گیا۔ سب خاموش کھڑے رہے۔ پھر عجیب سے اور مجھ سے پوچھا گیا عجیب نے کہا:-

"SIR, IF YOU DON'T GET ANGRY, WE WILL TELL YOU EVERYTHING."

پرسنل صاحب نے سنا اور خوش ہوئے اور عجیب کی اور ہم سب کی پیٹھ کھٹکی۔ اور پیر بھائی کو ان کی پیرانہ سالی پر سخت ملامت کی۔

یہ تو مشتاق احمد صاحب نے اپنے مصون میں ظاہر کر دیا ہوگا کہ ہمارے اس اسکول کی ابتدا مسعود عباسی اور محمد احمد صاحبان نے کی تھی۔ مسعود عباسی صاحب انجیئر تھے اور بعد کو ڈاکٹر ڈاکر حسین صاحب کے علی گڑھ میں شعبہ تعمیرات کے خاص آدمی رہے اور محمد احمد

مہربال میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہو گئے تھے۔ ان دونوں اور ڈاکی صاحب سے نہیں بنی اور ڈاکی صاحب نے جب استعفیٰ کی دھمکی دی تو یہ دونوں وہاں سے ۱۹۱۶ء میں علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں طلباء کی تعداد بارہ تھی جو کہ پھر چودہ ہو گئی اور ۱۹۱۸ء میں جس وقت کہ ہم ماہ دسمبر میں سینئر کیمبرج کا امتحان دینے میں گئے تو کل تعداد تیس ہو گئی تھی۔ اس سال امتحان کا سینئر کمبئی تھا۔

اگرچہ ہمارے اسکول میں اساتذہ کی کمی تھی۔ اور سینئر کیمبرج کی تیاری کے لیے اول و آخر زیادہ تر ڈاکی صاحب ہی تھے۔ جب کہ ابتدائی کلاس کے لیے مس اسمتھ اور مسز ڈنگن اور ایک مسٹر جان بھی تھے۔ یہ مسٹر جان ایک غیر معمولی شخص تھے اور کلاس ختم ہوتے ہی ان کا بیشتر وقت تتلیاں پکڑنے میں صرف ہوتا تھا۔ وہ اپنی مونچھوں کی لوکین درست کر کے اور DO O GEAR ہاتھ میں لے کر اسکول کپاؤنڈ اور باغ میں نکل جاتے اور بہت جاں فشانی اور محنت سے تتلیوں کو پکڑتے اور ایک خاص کڑی کے تتلی کبس میں آرائش کے لحاظ سے قطار در قطار بے چاریوں کو پن کر دیتے۔ پھر ہم لوگوں کے سامنے کبس کھول کر رکھ دیتے اور ہم مودبانہ حیرت سے ان سے پوچھتے SIR, THIS BLUE ONE HERE WITH EGG SPOTS اور وہ بتاتے THIS IS EGAY. اور یہ دیکھا کتنا چھوٹا خوبصورت ہے۔ THIS IS LADY'S FANCY اور یہ دیکھو ادھر بالکل OAK کی پتی کا مانگ اور پر رکھتا ہے تو کتنا اچھا سنہرا رنگ MAGNIFICENT THIS IS BIG OAK LEAF اور اس کے نیچے UNDER THAT BIG CAMPNER TREE میں تین دن سہا رہا تب کہیں یہ ہاتھ آئی THE SWIFTEST BUTTERFLY BLUE BOTTLE وغیرہ وغیرہ ان کا COLLECTION نہایت حسین اور دلنویس تھا اور وہ سلی نواز تھے اور فن تتلی بانگ

کے باہر، سرٹجان نے تلی بازی کی دبا لڑکوں میں کبھی پھیلا دی تھی۔ اور کئی لڑکوں کے پاس خود اپنا PAPER دے دیتا تھا۔ اور اکثر دوپہر کی چھٹی میں وہ کبھی اس ظالمانہ کھیل میں مبتلا رہتے تھے۔

مسٹر جان کے علاوہ ہمارے اسکول میں ایک ڈرائنگ ماسٹر صاحب بمبئی سے آئے تھے۔ جہاں تک خیال ہے ان کا نام عبدالقادر صاحب تھا۔ یہ تصویر کشی میں اس وقت کے اسکول فذروں کے لحاظ سے کافی اچھے تھے اور وہ بمبئی سے ایک بڑا بڈل بریڈی کا سٹو لینے تھے جو ایک یا دو ماہ کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ یوپی میں بریڈی کے نام سے بھی واقف نہ تھے جس طرح جان صاحب کا تفریحی مشغلہ تلیات تھیں اسی طرح عبدالقادر صاحب کا بیشتر وقت PENCIL SKETCHING میں گزرتا تھا۔ تصویروں کا مصنون سادہ اور مرغیوں پر محدود مرغ اور مرغیوں کے منقاری جذبات کے مناظر اور انکے ناز اور اداؤں کی عکاسی کرتے کرتے ان کا ایک چھوٹا موٹا ALBUM تیار ہو گیا تھا اس البم کو وہ کھولتے اور اپنے شاہکار کی حین مرغی اور ایک انداز سے کھڑے مرغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم لوگوں کو اپنا آرٹ تفصیل سے سمجھاتے اور داد طلب ہوتے اور ہم لوگ اس زرخ دلی سے انکی توفیقیں کرتے کہ وہ فوراً اپنی پرانی بریڈی بھیک کر ایک نئی بریڈی سلگا لیتے۔ سیز اسٹاف میں کچھ دنوں شعیب قریشی صاحب نے تاریخ پڑھائی۔ جو بعد کو سفیر روس پاکستان کے ہو گئے تھے اور فارسی اور دینیات کے ایک دیوبند کے عمر مولوی صاحب تھے۔ لیکن ان کو عفتہ زیادہ آتا تھا۔ چنانچہ جب لڑکوں نے ایک بار اس سے پوچھا کہ جناب اسلام میں سود لینا کیوں ناجائز ہے تو مولوی صاحب کو ناؤ آگیا اور ڈنڈے پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ نہ لانا تو تم کو یہ نہیں معلوم کہ سود لینا نہایت زبردست گناہ ہے لیکن یہ چند ماہ رہے اور ان کی جگہ ایک مرہٹے مسی PANIKAR شاید M.A. IN PERSIAN کچھ زمانہ تک فارسی تدریس کرتے رہے۔ مجھ کو اکثر خیال آیا کہ بعد کو یہ PANIKAR وہی ہیں

جوائیٹورنمنٹ کی طرف سے سفیر ایران اور مصر مقرر ہوئے تھے اور LINGUIST مشہور تھے۔
یہ گرامر کے متعلق پروفیسر مجیب زیادہ بہتر جانتے ہیں۔

ہمارے پرنسپل صاحب کافی سخت تھے اور اسکول کا انتظام اچھا تھا۔ اور تعلیم ایک باقاعدہ
اور ڈھنگ سے ہوتی تھی۔ اور کلاس درک اور سہم درک میں بڑی ضابطگی سے کام لیا جاتا تھا
علم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمارا B MATHS جمعی امتحان دینے گیا وہ چھ لڑکوں پر
مشتمل تھا۔ ان میں ہم پانچ پاس ہوئے اور ان پاس ہونے والوں میں ایک بزرگمیں جنکو پانچ
مضامین میں DISTINCTION ملا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پرنسپل صاحب مجیب
زیادہ مانتے تھے مسٹر ڈاکی جس طرح پڑھائی پر بہت زور دیتے اسی طرح SPORTS کو بھی
بہت اہمیت دیتے تھے۔ اسپورٹس میں فٹ بال، کرکیٹ، ٹینس اور بگ باگ سب ہی کچھ مہیا
تھے اور اتوار کو ران سواری کے لیے گھوڑے کرایہ پر راج پور سے آجاتے تھے اور ایک کوچ بھی آتا
تھا۔ اور ٹینس میں ایک بارسینیز اور جو نیئر ٹورنمنٹ بھی ہوا لیکن دہرہ دون میں ہمارا اسکول نے
ہاکی میں ایک خاص شہرت حاصل کر لی تھی اور باوجود قلیل تعداد کے ہم نے ایک ٹیم بنالی تھی۔
جب نے بعد کو کافی نام پیدا کیا۔ پرنسپل صاحب کی رہنمائی سے دہرہ دون کے وسیع میدان میں
گرجے کے سامنے ہم کو ایک ہاکی کی فیلڈ مل گئی۔ کچھ دنوں کی پریکٹس کے بعد دہرہ دون کے لپٹی
من اسکول کی ہاکی ایلیون کو ہم نے چیلنج کیا۔ یہ دہرہ دون کی سب سے مضبوط ٹیم تھی اور
ہم نے ۸-۰ سے شکست کھائی۔ دوسرے ہفتہ ڈی۔ لے وی کالج سے میچ ہوا۔ اور ہم نے
۲-۰ سے شکست کھائی لیکن جب قیرا RETURN میچ من اسکول سے ہوا تو ہمارے
اسکول نے ۳-۰ سے فتح پائی۔ پرنسپل صاحب کو ہمارے اسکول کا اتنا خیال رہا تھا کہ ان
کو جب خبر ملی کہ ہماری ٹیم کامیابی سے کھیل رہی ہے تو ہاف ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی فیلڈ پر
پہنچ گئے اور اپنے اسکول کی جیت سے اس قدر خوش ہوئے کہ ایک دن کی جھپٹی ملی۔ اور
ایک تعمیر آیا ہوا تھا اس میں جانے کی اجازت ملی اس کے بعد ہماری ٹیم کا ریکارڈ ہے کہ کسی

اسکول کالج پارپرائیویٹ ٹیم سے نہیں ہاری۔ ذیالحق انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھانجے) ہاکی کپٹن تھے اور وہ A.P. MISSION SCHOOL دہلی کے اولڈ بولے بھی تھے۔

جانبی دسمبر ۱۹۱۷ء کی چھٹیوں میں ان کے وسیلے سے ہمارے اسکول کی ہاکی ایلیون دہلی گئی اور بہت موری گیٹ میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے اسکول کے PATRON بھی تھے اور ان کے سلسلہ سے عبدالرحمن صاحب منڈی اور ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بھجوری بھی ہمارے اسکول کے PATRONS تھے اور کبھی کبھی اسکول میں آکر ٹھہرتے بھی تھے۔ ۱۹۱۷ء میں دہلی میں اسپورٹ کا چرچہ کم تھا اور اے۔ پی۔ مشن اسکول کی ایلیون دہلی کی بہتر ٹیموں میں تھی۔ سچ بہت زوروں پر ہمارا مشن اسکول کی طرف سے نذر محمد بہت اچھا کھیلے۔ لیکن ہماری ایلیون کا ہیرا سنیٹر ٹیٹن منقب دین شہر زنگ پور ۷۰۰ کارپنہ والا تھا اور ہم کو ۲۰ سے کامیابی حاصل ہوئی لیکن دوسرے دن جب اے۔ پی۔ مشن کالج سے کھیل ہوا۔ اور کالج کی ٹیم بہ نسبت اسکول کمزور تھی تو REFEREE کی اشد بے ایمانی کی وجہ سے کھیل ختم ہونے سے پہلے ہمارک گیا۔ اور ٹیمیں واپس ہو گئیں۔

بورڈنگ یعنی کھانے پینے کا انتظام محمد حسین صاحب WARDEN کیا کرتے تھے۔ محمد احمد صاحب کی طرح یہ بھی جالندھر کے رہنے والے تھے۔ جالندھر نے ایک سے ایک نامی CRICKETER پیدا کیے ہیں۔ محمد حسین صاحب نہایت فاسٹ بولر تھے اور اب جب کہ میں لٹ کر میکے سے بہ خوبی واقف ہوں میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ ۱۹۳۳ء یا اس کے بعد سوتے تو یقیناً وہ لٹ ٹیم میں لیے جاتے۔ لیکن اس وقت ان کی کوئی پوجہ نہ تھی۔ محمد حسین صاحب کا انتظام

اچانہ تھا۔ اور لڑکوں کے احتجاج پر پرنسپل صاحب نے
KITCHEN اور DINING HALL کا انتظام
لڑکوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں شتاق احمد صاحب
نے بڑا کام کیا بلکہ ایسا انقلاب ہوا کہ پھر جو غذا ہم کو ملی اس سے بہتر
غذا اسکول میں ملنا ممکن نہیں رہا۔ ناشتہ میں دیا دودھ ۲ انڈے۔ توس
کھن۔ چائے۔ پنچ میں سالن۔ کباب۔ خشک یا کھچڑی۔ ترکاری۔ دال
چپاتی۔ چائے میں توس۔ کھن۔ جام۔ جلی کبھی پیڑی۔ ڈنر میں قورمہ
کبھی مرغ کے ساتھ۔ کباب کھن کٹلس۔ خشک یا پلاؤ۔ ارہر یا دھوئی
کی دال۔ چپاتی اور پوڈنگ اور یہ سب اصلی گھی میں اور چاول وغیرہ۔
نوٹ:- یہ خط مضمون نہیں ہے بلکہ شتاق صاحب کا ہمارے
کیرج اسکول کے بارے میں ایک مضمون کسی رسالہ میں نکلنے والا ہے
اس لیے بطور یادداشت میں نے چند باتیں لکھ دیں کہ شاید ان کی یاد
سے رہ گئی ہوں اور کام آجائیں۔ رہا یہ کہ لڑکوں کی پڑھائی سوشل
SCHOOL ACTIVITIES EXCURSIONS لائف
وغیرہ وغیرہ تو شتاق صاحب نے بہ کمال خوبی اپنے مضمون میں
ضرور پیش کئے ہوں گے۔

ضروری گزارش { حضرات حیران ادارہ اور برہان کے خریداروں سے گزارش ہے کہ
ادارہ سے۔ آپ حضرات کو یاد دہانی کے جو خطوط ارسال
کے جاتے ہیں ان پر فوری توجہ دے کر یہ خطوط ارسال کرتے وقت یا مئی آمدور کو پہنچا دینا
براہ راست ادارہ کے پتے کی بجائے خریداری نمبر کا لکھنا نہ بھولیں۔ تاکہ تکمیل ارشاد
میں تاخیر نہ ہو۔

نیاز سنگھ (نمبر)

ہندو تہذیب اور مسلمان

بہل } بہل ہندی کا لفظ ہے۔ رتھ کی طرح کی یہ دو پیہ کی ایک بیل گھاڑی ہوتی تھی
 ابو الفضل کا بیان ہے کہ اکبر بادشاہ اس گھاڑی کا موجد تھا اور بقول اسکے
 ”عمدہ اور سب گھاڑی کو بہل کہتے ہیں۔ یہ گھاڑی ہموار زمین پر چلتی
 ہے اور چڑا شیخ اس میں بیٹھ کر آرام سے سیر و سیاحت و تفریح
 کر سکتے ہیں“
 مگر بھنڈاری کے بیان سے ابو الفضل کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ کیوں کہ
 اول الذکر نے لکھا ہے کہ :-

”بہل کا قدیم زمانے سے ہندوستان میں رواج پایا جاتا ہے۔ ایسی
 صورت میں بہت ممکن ہے کہ اکبر بادشاہ نے اس گھاڑی میں کچھ اصلاحیں
 کی ہوں؟“

”عزائم الیت کہ آں را بہل گویند۔ سواری آں خاصہ ہندوستان
 است۔ در گرمی و سردی و باد و باران آرام بخش سواران است۔
 چہارتن بفراغت سواری شوند گویا در وثاق نشسته و با وجود سفر

درحضر ہستند، یاد پائے سایش و آرامش تمام قطع مسافت بعیدی کنند۔
 بہل دو قسم کی ہوتی تھیں۔ چھتر دارا جس کے اوپر چار بکڑیاں یا اس سے زیادہ
 باندھ کر چھتر کو اس پر آراستہ کرتے تھے۔ اس قسم کی بہل کو "گھر بہل" کہتے تھے اس
 کے علاوہ سادہ بہل بھی ہوتی تھی۔
 بالعموم بہل کو دو بیل کھیچتے تھے۔ لیکن گھر بہل کو تیز رفتار گھوڑے بھی
 کھیچتے تھے۔

بھنڈاری نے لکھا ہے کہ گجرات کے بیل بالخصوص بہل اور
 رشتہ کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کیوں کہ وہ اپنی تیز رفتاری کے لیے

۱۔ خلاصۃ التواریخ ص ۱۷، نیز عطیہ کبری (قلی) از خان آرزو۔ ص ۲۲

۲۔ آئین اکبری (است) ج ۱ ص ۲۸۲ (آئین ۶۵)

بہل کی بناوٹ اس طرح ہوتی تھی کہ ایک کھوٹے کو دو پہیوں پر قائم کرتے پھر اس پر
 چار ڈنڈے کھڑے کر کے ایک چھتری لگا دیتے اور اس پر پردے کے لیے غلام
 ڈال دیا جاتا تھا۔

گذشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۷۱ نیز ملاحظہ ہو۔ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۳۶

HODGES = TRAVELS IN INDIA . P. 31

تیسرے کا بیان ہے کہ بالعموم بیلوں پر سرخ پردے ڈالے جاتے تھے۔ ۱/۲۲۲ ص ۵۸۳

نیز دیکھیے گروس ۱/ ص ۱۵۵۔ ٹیونگ ۱۳۵-۱۳۶

کلیات تیسرے ص ۹۵۹

۳۔ عطیہ کبری۔ ص ۲۲

۴۔ آئین اکبری (۱-ت) ج ۱ ص ۲۸۲

مشہور تھے کہ ان بیوں کے جسم پر جھولیں ڈالی جاتی تھیں۔ ان کے سنگیوں کو رنگ دیا جاتا تھا اور سنگیوں کے نوکیلے حصے میں سونے کا ملح منڈھ دیا جاتا تھا۔
 نظیر اکبر آبادی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہل میں بیوں اور گھوڑوں کے علاوہ دوسرے جانور بھی جوتے جاتے تھے۔ اس لیے ان جانوروں کے ناموں پر ہی گھاڑیوں کے نام رکھ دیئے گئے تھے۔

گھر میں، فیل، بہل، شتر بہل، راہ دار، ہرنوں کی بہل، بکری بہل، گھنٹے، گنگرودار، مالک چڑھا جو موت کی ڈولی پر ایک بار پھر بیلیاں نہ بہل نہ جھنکار نہ پکار۔
 پوچھنے والی ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور اس نے بار بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستان میں بہلوں کا عام رواج تھا کہ مرد اور عورتیں دونوں اس

۱۰ خلاصۃ التواریخ ص ۱۷۱ نیز ملاحظہ ہو، وقائع انڈرام مخلص ۲/ ص ۶۰، سفرنامہ انڈرام مخلص ص ۱۱۱ ص ۲۸۱-۲۸۰
 جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ابوالفضل نے گجراتی بیوں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ بہل کشی کے لیے خاص طور پر ان کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آئین اکبری (ارت) ج ۱

۱۱ اشرف علی خاں خاں نے بطور لطیف حکیم معصوم کو دربارِ معلیٰ میں "کھاؤ گجراتی" سے تعبیر کیا تھا۔ نکات الشرائع - ص ۷۲

۱۲ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ میونگ ص ۱۳۵-۱۳۶

۱۳ کلیات نظیر اکبر آبادی - ص ۵۳۷

۱۴ HODGES - TRAVELS IN INDIA P. 5 (F.N)

۱۵ نیز ملاحظہ ہو۔ رفقات مرزا قتیل ص ۱۲۷، گزارشہ کھنڈ ص ۴۱-۴۲

۱۶ صفحہ مقامات مظہری ص ۱۲، دیوان قانر ص ۲۱۵

پس فرقتی تھیں لے

۲۱ لے رتھ سنکرت کا لفظ ہے۔ رتھ اس گاڑی کو کہتے تھے جس میں دو یا
۲۲ لے چار پہیے ہوتے تھے۔

یہ سواری گھاڑی ہندوستان کی قدیم ترین سواریوں میں سے ہے۔ مہابھارت
میں بھی اس گاڑی کا ذکر ملتا ہے اور لکھا ہے کہ کوروں اور پانڈوؤں کے مابین جنگ کے
موقع پر کرشن بھگوان ارجن کے رتھ بان کے فالن انجام دے رہے تھے لے مرزا
قتیل نے رتھ کی بناوٹ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے:-

رتھ کی بناوٹ اس طرح کی ہوتی ہے کہ پتی لکڑیوں سے جو خوب اچھی
طرح تراش خراش کرتا رکھ جاتی ہیں، ایک برجی بناتے ہیں۔ پھر اس پر
نایاب یا ریشمی کپڑا منڈھ دیتے ہیں اور نچلے حصہ کو جوشت کے لئے
محصوص ہے، ریشم کی رنگین ڈوریوں یا سید سے بن دیتے ہیں اور تین
طرف چھوٹے چھوٹے دروازے چھوڑ دیتے ہیں یعنی دائیں بائیں اور

لے گذشتہ کھنڈ ص ۲۰۱-۲۰۲

لے البیر دینی نے اس گاڑی کی وضع کی بڑی دلچپ داستان لکھی ہے، شطرنج میں رتھ کا نام
رخ ہے۔ یونانی اس کو ٹرائی گاڑی کہتے تھے۔ یونانیوں کے نزدیک اس کو سب سے پہلے
مقالوس نے رتھیں میں ایجاد کیا تھا اور اہل رتھیں کہتے تھے کہ اس پر سب سے
پہلے رتھیں کے باشندے سوار ہوئے۔ اس سے قبل افروڈیسی ہندی نے جب وہ
مصر کا بادشاہ تھا، اس گاڑی کو مصر میں ایجاد کر چکا تھا۔ یہ زمانہ طوفان سے تقریباً
بیس صدیاں پہلے کا تھا۔ افروڈیسی نے ایسا رتھ بنایا تھا جس کو دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ بالعموم رتھ
میں چار گھوڑے جتے جاتے تھے کتاب الہند ۲/ص ۱۳۷-۱۳۸

لے ہندوؤں کے راجاؤں کے رتھوں کے تفصیلی بیان کے لئے ملاحظہ ہو، ہفت تہا ص ۱۹-۲۰

ساتنے کی طرف، لیکن پچھلے حصے کو جہاں رکھ سوار کے بیٹھنے کے لیے نکلی ہوتا ہے، اسی یا ریشی کپڑے کے پردے سے ڈھک دیتے ہیں تاکہ گرنے کا خطرہ نہ رہے۔ اس بُرجی کو اُن دو گول لکڑیوں کے پہیوں کے ڈھانچے کے وسط پر رکھ کر مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں (پہیوں کا) یہ ڈھانچہ اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ دونوں پہیوں کو جن کے درمیانی حصے میں سوراخ کر کے لکڑی کے ایک گول دھڑے پر جس کے دونوں سروں پر لہے کے ٹکڑے لگے ہوتے ہیں، اس طرح لٹق کر دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک پہیہ دائیں اور دوسرا بائیں جانب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایسا نہیں ہوتا کہ ایک پہیہ آگے اور دوسرا پیچھے ہو، اور اس پورے ڈھانچے کو ماہی پشت نما چیز پر رکھ دیتے ہیں جو پتلی لکڑیوں سے تیار کر کے چمڑے سے منڈھی ہوئی ہے اور ان دونوں دائیں اور بائیں پہیوں کے پیچھے متد کرہ پہیوں کی شکل کا ایک دوسرا ڈھانچہ لگاتے ہیں تاکہ چار پہیے ہو جائیں اور اجازت چمڑے سے منڈھے ہوئے اس ماہی پشت نما ڈھانچے کو اس پر اس طرح جمادیتے ہیں کہ ایک سرا آگے کی طرف اور دوسرا پیچھے کی طرف ہو اس ڈھانچے کے اگلے حصے میں ایک جُوا ہوتا ہے کہ صاحب رکھ کی سواری کے وقت رکھ بان اس میں دو موٹے بیل جوت دیتا ہے اور راستے پر ہانک دیتا ہے۔ رکھ پر تین آدمی بڑے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں میں رکھ کی سواری بہت زیادہ ہر و تغزیز تھی۔ اس عہد کے ادب میں رکھ کی سواری

۱۔ بہت تماشا ص ۲۰-۲۱، مگر مشہد لکھنؤ ص ۱۰۴
 ۲۔ خلاصۃ التواریخ، رکھ کہ بانوان و انکاسکی و برہاسکی قابل سواری بلکہ استعمام فوید کوادماش
 ۳۔ تجرید درغنی آید ص ۱۷

کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ غلام علی نقوی کا بیان ہے کہ نال کی شکست کے بعد جب محمد شاہ بادشاہ نادر شاہ سے ملاقات کرنے گیا تھا، تو وہ رکتھ کی سواری پر تھا۔ جہاں بادشاہ اکثر و بیشتر سیر و تفریح کے لیے رکتھ پر سوار ہو کر باہر نکلتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ وہ رات کے وقت لال کمزور کی ایک سپی کے مکان پر گیا جو شراب فروشی کرتی تھی بادشاہ نے خوب جم کر بادہ نوشی کی اور بچی کھچی رکتھ بان کے حصے میں بھی آگئی۔ واپسی کے دوران سفر میں بادشاہ نشے میں دھت بے خبر ہو گیا۔ جب محل میں رکتھ پہنچا تو ملکہ کی خادباؤں نے اٹھا کر اسے محل کے اندر داخل کر دیا مگر بادشاہ کی کسی نے خبر نہ لی۔ چونکہ رکتھ بان بھی نشے میں تھا لہذا اس نے رکتھ کو گیرج میں کھڑا کر دیا اور رات بھر بادشاہ اسی رکتھ پر سوتا رہا۔

شاہ عالم ثانی کو ناگور کے بلی بہت پسند تھے خاقی کا بیان ہے "بعد طلوع مہر پر سپہر بادشاہ بیدار شدہ محرائی حصار پائی تخت گرفتند و جوڑی نر گاؤ ناگوری آمدہ بود" بطالب علی خاں داروغہ، اصطبل و کاؤ خانہ امرشد کہ قیمت آن مستحف کنند۔ بادشاہ کے حملے کے بعد دیگر شعبوں کی طرح یہ شعبہ بھی تباہ و برباد ہوا تاکہ شاہی خاندان کی مستورات جن رکتھوں پر سفر کرتی تھیں وہ رکتھ خاص کہلاتے تھے۔

۱۔ عماد النعادت / ۲۶

۲۔ خاقی خاں ۲/ ص ۶۹۰

۳۔ وقائع عالم شاہی ص ۷۲۔ "عہد غلیہ میں" کاؤ خانہ" کا ایک علیحدہ شعبہ مہر تاجدار برائے تھیل ملاحظہ ہو۔ آئین اکبری (۱-ت) ج ۱ ص ۱۷۸۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲ رسالہ محمد شاہ و خان دوراں خاں ص ۱۱

۴۔ تاریخ احمد شاہی ۱۲۹ الف نیز ملاحظہ ہو۔ مجموعہ منویات میر جن ۱۲۸، وقائع اندرام خفص

۲/ ص ۶۰۔ چار گلزار شجائی "زن در رکتھ روانہ شد" ص ۱۹۰ الف

مؤرخہ کھنڈر ص ۱۸۱۔ کارنامہ عشق ص ۲۶ وقائع اندرام خفص ۲/ ص ۷۰، ۶۰، ۶۱

لڑائیں اور دھکے خاص شاہی محلات کی مزدورت کے لیے ہزاروں رکتیں تھیں جس زمانے
میں شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم صاحبہ فیض آباد میں بسر کرتی تھیں تو صرف ان کی سرکار میں آٹھ
لوسو رکتیں تھیں یہ

نظیر اکبر آبادی نے رکتوں کی یوں تعریف کی ہے :-
تھیں وہ رکتیں کہ بیٹھے تھے جن جن میں پھیل پھیل
بجٹے تھے زنگ اور تھے کلس اُن کے جوں سہیل

رکتہ بان نے اجل کے جوہی کر لیا دسیل

بھر کس کی چھتری پیسے کہاں اور کہاں کے پیلے

تحت رواں :- شاہ جہاں بادشاہ سفر کے دوران میں اکثر تخت رواں پر سوار ہوتا تھا اس
تخت کو کہاں اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہ تخت اپنی ساخت میں ایک قسم کا مکلف
چوبی بنکھ ہوتا تھا جس میں روغن کاری اور ملح ستون اور آئینہ دار کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ تیز ہوا
اور بارش کے دلت ان کھڑکیوں کو بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ تخت چار ڈنڈوں پر چاڑھتا تھا۔

اُن ڈنڈوں کو سرخ بانات یا کھواب کے کپڑوں سے منڈھ دیا جاتا تھا اور زری اور لثم کی
نہایت کامدار جھال سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ ہر ایک ڈنڈے کو اکٹھانے کے لیے دو کہاڑوں کی
خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ جن کے لباس خوش رنگ ہوتے تھے۔ ان کہاڑوں کے علاوہ
آٹھ اور دوسرے کہاڑوں کی مدد کے لیے بھی تعینات ہوتے تھے۔ یہ اندرام مخلص نے
تحت رواں کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

۱۔ مژشتہ لکھنؤ۔ ص ۱۰۱

۲۔ کلیات نظیر اکبر آبادی ص ۵۳۷

۳۔ برنیر (انگریزی) ص ۲۱۲-۲۱۰، گلوسٹہ منشی چندر کھان برہمن ص ۲۱ پ

” عبارتت از آن تخت کہ در سواری سلاطین می باشد و آن بدو قسم است: در ہندوستان کہ راں بردوش بر می دارند و نام آن قوم بہوئی است۔“

اٹھارویں صدی کے مغلیہ بادشاہ تخت رواں پر اکثر و بیشتر سوار ہو کر سیر و تفریح کے لیے جاتے تھے اور بعض مرتبہ لمبے سفر کو بھی اسی سواری پر طے کرتے تھے۔ محمد شاہ تخت رواں پر سوار ہو کر گڑھ مکٹسیر کی جانب سیر و شکار کے لیے گیا تھا۔ ایک بیان کے مطابق کرناں میں نادر شاہ سے ملاقات کے لیے محمد شاہ تخت رواں پر ہی سوار ہو کر گیا تھا۔

نظیر اکبر آبادی نے تخت رواں کی تعریف میں ذیل کا شعر کہا ہے۔
 وہ تخت جس پہ کل تھا جواہر جڑا ہوا کہ عیش سے چڑھے ہوئے پھرتے تھے جاگیا
 نظیر اکبر آبادی نے ذیل کے اشعار میں ہندوستان کی تمام سواریوں کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

۱۔ مرآۃ الاصطلاح (ماخوذ از سفرنامہ مخلص ص ۱۳۶)

۲۔ سفرنامہ مخلص۔ ص ۲۔ وقائع اندرام مخلص ۲/ ص ۱۶ الف

۳۔ سیرالمناظرین (۱۔ ت) ۲/ ص ۱۰۹ برائے احمد شاہ بادشاہ دیکھیے تاریخ احمد شاہی

ص ۲۴ ب، ۹۲ ب، ۱۱۲ ب

۴۔ کلیات نظیر اکبر آبادی ص ۵۳۶ شواہد۔۔ کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ احمد شاہی

ص ۲۴ ب

تاریخ شاکر خانی / ۲۰۱، واقعات عالم شاہی / ۱۶۰ ب، مجموعہ شذایات میر حسن

دہلوی ۱۵۹/ ۱۲۲ - ٹیونگ ص ۱۸۶

میانہ، محاذ، اور وہ جنڈول گھیاں وہ پینیس، وہ پوچے و چوپاٹے خوش نشان
مالک ہوا اہل کے جو کھر کھڑا یہ سوار پوچا گیا نہ ساتھ میانہ گیا میاں

۱۵۔ میانہ محاذ، بالکی نا ایک سواری ہوتی تھی جو بالعموم مستودات کے استعمال میں آتی تھی
ہیر کا بیان ہے کہ میانہ بالکی سے زیادہ خوش نما اور خوبصورت ہوتا تھا دہن کو
میانہ میں رخصت کیا جاتا تھا۔

ملاحظہ ہو آئین اکبری (۱-ت) ج ۱ ص ۱۶۴، مجموعہ مثنویات میر حسن
دہلوی، ۱۲۲، ۱۲۸۔ چہار گلزار شجاعی ۷۶ الف، ہیر ۱/ ص ۷۶ اگلا تیر
(ص ۸۷۳ - ۸۷۵)

۱۶۔ چار ہیرے کی گاڑی میں کوٹھوڑے کھینچتے تھے۔ بحاس رنگیں ص ۵۸
۱۷۔ بالکی کی ایک قسم ہے۔ رفات مرزا قتیل ص ۲۲-۲۳ گزشتہ لکھنؤ ص ۳۹۹
۱۸۔ عبدالحلیم شرر نے اس سواری کا نام بوجہ لکھا ہے یہ اپنی ساخت میں سوادار (ملاحظہ ہو
گزشتہ لکھنؤ ۳۹۹-۴۰۰) سے زیادہ باوقار تھی اس میں پیوں کے بجائے پائے ہوتے اور آگے پیچھے
فینس کے ایسے دو دو ڈنڈے ہوتے اور کم از کم آٹھ اور اکثر سولہ گہرا اس کو اٹھا کرے چلتے کیونکہ گہراؤ
کے اٹھانے کی تمام سواریوں میں سب سے زیادہ بھاری ہوتی۔ واحد علی شاہ اپنے لکھتے کے دوران قیام
میں اس کی سواری کیا کرتے تھے۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۴۰۰-۴۰۱۔

۱۹۔ ایک قسم کا ڈولا۔ ہفت تماشا / ۲۲، یار محمد خاں دستورالائے (تلمی)
۲۱۶، رفات مرزا قتیل ص ۱۵۰۔ چہار گلزار شجاعی / ۱۶۰ الف کلیات میر

(ص ۸۷۳)

۲۰۔ سیرہ ہانوں کے ساتھ ایک ہلکی بالکی۔ رفات مرزا قتیل ص ۴۰۶-۴۰۵۔

پھر لے کر آئے، رینگے، شربل اور فجر
مالک جلا جوت کے مانگے کو چھو کر
نوا، حار، بچنے وہ لونے کے گورخ
سینا گیا نہ ساتھ نہ نوا نہ گاؤں

۱۵ بڑی بلی گاڑیاں جو مال و اسباب ڈھونڈنے کے لیے استحال کی جاتی
تھیں، ہمارے زمانے میں اب بھی دیہاتوں میں ان کاموں کے لیے ان گاڑیوں
کا استحال ہوتا ہے اور دو بیل ان کو کھینچتے ہیں۔

سفرنامہ مخلص / ۲۲، تاریخ مظفری / ۱ / ص ۷۷ ب و قارح اللہ رام مخلص
۲ / ص ۶۰ خلاصۃ التواریخ / ۱۵، دریائے لطافت (ف) ۱۸، ۱۹
مثنویات مرصن دہلوی / ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰
۲۵۶ الف و یلینیشیا / ص ۱۷۹

۳۵ توپ گاڑی

۳۵ دو بیسے کی گھوڑا گاڑی جس پر چھتری بھی ہوتی ہے۔ اس میں دو آدمی
بڑے آرام سے سواری کر سکتے ہیں، رفات مرزا قتل ص ۶۷
۵۵ کلیات نظیر اکبر آبادی۔ ص ۵۳۸

(بالا قسط طباعت ختم کی گئی)

تبصرے

خواجہ میر دردؒ 'نصوف اور شاعری' ڈاکٹر وحید اختر قنطیغ متوسطہ صفی
 ۵۸۳ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت - / ۱۵ پتہ :- انجمن ترقی اردو رینہ علی گڑھ
 خواجہ میر دردؒ کی نسبت یہ سب جانتے ہیں کہ وہ اردو زبان کے بلند پایہ صوفی
 شاعر ہیں لیکن یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ وہ باقاعدہ و باضابطہ ایک خاص سلسلہ
 تصوف کے جس کا نام طریقہ محمدیہ تھا اور جس کو ان کے والد صاحب خواجہ ناصر علیؒ
 نے ایجاد کیا تھا۔ ایک بلند مرتبہ اور صاحب نسبت بزرگ تھے اور اس سلسلہ میں
 کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں علم الکتاب سب سے زیادہ ضخیم اور شریعت
 و طریقت کے بہت اہم مسائل و مباحث پر مشتمل ہے۔ لائق مصنف اردو کے
 ایک ترقی پسند شاعر ادیب اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں ڈاکٹر میر ولی اللہ
 صاحب سابق پروفیسر و صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی جو اس زمانے میں علمی
 اور علمی تصوف کے بہت ممتاز ماہر اور مصنف ہیں۔ ان کی نگرانی میں موصوف
 نے ڈاکٹر میٹ کے لیے علم الکتاب پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے اس ذیل میں شاگرد کو
 استاد سے تصوف کے نکات اور اس کے معاملات و مسائل کو سمجھنے کا موقع
 ملا تو اب ان کو تصوف سے اتنی دل چسپی پیدا ہو گئی ہے کہ اصل مقالہ کے
 علاوہ لیکن اس کی بنیاد پر انہوں نے ایک اور ضخیم اور بہمہ وجوہ و قیح کتاب
 لکھ دی جو اس وقت زیرِ تعبیر ہے۔ یہ کتاب بھی اس درجہ تحقیقی اور معلومات افزا
 ہے کہ اس پر ایک ڈگری اور بے تکلف دی جا سکتی ہے۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصہ میں خواجہ درد کے عہد اور ان کے خاندانی حالات ذکر دار اور ان کی تصانیف پر گفتگو کرنے کے بعد درد کے والد ماجد خواجہ ناصر عذیب کا مفصل تذکرہ ہے۔ کیونکہ یہ بھی بلند پایہ اور صاحب نسبت خاص بزرگ تھے۔ طریقہ محمدیہ ان کی ہی ایجاد ہے جو ان کے بقول ایک مرتبہ حالت کشف میں امام حسن رضی اللہ عنہ نے ان کو تلقین کیا تھا۔ نقیض کے مباحث پر آپ کی مستقداہم تصانیف بھی ہیں خواجہ درد اپنے والد سے بیعت اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ اس کے بعد لائق مصنف نے زیادہ تر علم الکتاب کی روشنی میں نقیض کے اہم مباحث مثلاً وحدت الوجود۔ اللہ نور السموات کی تشریح۔ تجدد امثال نسبت عشق و واسطت محمدی درمیان حق و خلق، جبر و قدر، زہد و غنا، صبر و توکل۔ اور سب سے آخر میں ہندوستان کے صوفیاء میں خواجہ میر درد کا مقام ان سب پر نہایت مفصل اور سیر حاصل بحث و گفتگو کی ہے اور پھر طعنہ یہ ہے کہ اصل موضوع پر گفتگو جس قدر مضبوط ہے اس کے تاریخی یا علمی پس منظر پر بھی گفتگو انہی ہی بھر پور ہے۔ چنانچہ خواجہ میر درد کے نظریہ توحید پر گفتگو کے ضمن میں وحدت الوجود کے نظریہ کی اور اسی طرح نقیض میں خواجہ درد کا مقام متین کرنے کے سلسلہ میں نقیض کی پوری تاریخ زیر قلم آگئی ہے دوسرا حصہ جو شاعری سے متعلق ہے اس کا پنج بھی یہی ہے۔ چنانچہ یہ حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب جو کتاب کا پانچواں باب ہے۔ شاعری میں نقیض کی روایات اور اس ذیل میں فارسی اور اردو کی صوفیانہ شاعری کی تاریخ اور اس پر تبصرہ کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے باب میں خواجہ میر درد کی تصوفانہ شاعری فارسی اور اردو کے مضامین و مشتملات کا بھر پور جائزہ لیا گیا ہے تیسرے باب میں خواجہ کے فنون پر ناقدانہ اور نکتہ پرورانہ گفتگو ہے۔ چوتھے باب میں

تیسرے سودا اور قاتب سے موازنہ کر کے تخریل میں خواجہ کی انفرادیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کتاب کا آخری باب خواجہ کے مخصوص تلامذہ کے ذکر کے لیے وقف ہے۔ آخر میں کتابیات کے زیر عنوان اردو فارسی، عربی اور انگریزی میں ان کتابوں اور محلات کی بہت طویل فہرست ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں مدد ملی گئی ہے غرض کہ علمی، ادبی اور فنی حیثیت سے کتاب بڑی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے زبان بڑی شستہ اور شگفتہ ہے اور اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ ترقی پسند ادیب اور نقاد ہونے کے باوجود موصوف نے شریعت و طریقت کے سنگلاخ مضامین پر گفتگو میں لب و لہجہ بھی متین و سنجیدہ اور محتاط رکھا ہے۔ جو یقیناً استادِ کرم کا فیضِ صحبت و اثر ہے افسوس ہے اتنی اچھی کتاب میں کتابت و طباعت کی غلطیاں کثرت سے رہ گئی ہیں اور بعض غلطیاں بڑی فاحش ہیں مثلاً صفحہ ۲۱۰ پر آخری سطر سے پہلی سطر میں لیسراؤ کا مستحقاً جو ارشاد نبوی ہے اس کے بجائے "لیسراؤ والا تفسیر د۱۲" اور پھر کوئی صحت نام بھی منسلک نہیں ہے۔

رویت ہلال کا مسئلہ از مولانا محمد برہان الدین سنبھلی تقطیع متوسط صفحات ۱۲۲ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت - / ۳ سہ - مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ یہ درحقیقت وہی مقالہ ہے جو برہان کی تین اشاعتوں میں مسلسل نکلتا رہا ہے اب چند اصنافوں کے ساتھ اسے کتابی شکل میں مولانا سید ابوالحسن علی کے مقدمہ کے ساتھ بڑے اہتمام سے چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث سے متعلق کوئی پہلو اور گوشہ نہیں ہے جس پر اس میں مفصل اور مربوط گفتگو قرآن و حدیث اور فقہ کی روشنی میں نہ کی گئی ہو۔ چنانچہ ریڈیو، ٹیلیفون، خبر مستفیض ٹیلیگرام، وارنسی شہادت اور اختلافات مطرح وغیرہ ان سب پر دلائل و براہین اور ثبوتات و نظائر کی روشنی میں جامع اور سیر حاصل کام کیا گیا ہے اور اس بنا پر رویت ہلال کے مسئلہ پر

مذکرہ میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ اس کی بنیاد پر کوئی منفقہ فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بعض مقامات پر قیاس سے کام لیکر جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں ان سے سب علماء اتفاق نہیں کر سکتے مثلاً ریڈیو کو میناروں کی روشنی یا اسی قسم کی کسی چیز پر قیاس کرنا ارباب علم و نظر میں اپنا مذاق اڑوانا ہے اسی طرح اختلافِ مطالع کی بحث میں فقہی جزئیات اور فقہاء کے اقوال کے ساتھ ہیئت جدیدہ کی روشنی میں بھی کلام کرنے کی ضرورت ہے۔

صدر یار جنگ از جناب شمس تبریز خاں صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۸۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت محلہ - ۱۰/- پتہ : مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی اپنے زمانہ کی نادر المثال شخصیت تھے قدرت نے ان کو ایسے چند در چند اوصاف و کمالات سے نوازا تھا جو بیک وقت کسی ایک شخص میں مشکل سے ہی جمع ہو سکتی ہیں۔ دولت و ثروت، عزت و وجاہت، علم و فضل و شعرو ادب، زہم و ورع، عبادت و ریاضت، حسن انتظام و ریاست۔ ان میں وہ کونسا وصف و کمال ہے جو موصوف میں ودیعت نہیں ہوا تھا۔ اس بنا پر ضروری تھا کہ موصوف کی سوانح عمری لکھی جائے تاکہ ایک طرف خود ان کا حق ادا ہو اور دوسری جانب لوگوں کو اس سے عبرت و موعظت ہو۔ یہ کتاب اسی مرگوت کی تکمیل کے لیے لکھی گئی ہے اس میں پہلے شروانی خاندان کی تحقیق اور مولانا مرحوم کے آبا و اجداد کرام کا تذکرہ ہے اسکے بعد مولانا کی ولادت، تعلیم، اساتذہ اور ذاتی اخلاق و عادات کا بیان ہے پھر مولانا کی نہایت وسیع اور ہمہ گیر اسلامی، تعلیمی اور ملی خدمات کا جائزہ تفصیل سے لینے کے بعد آپ کے سفر حج کی داستان خود آپ کی ہی زبان سے سنائی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک باب میں مولانا کے نظام الاوقات اور وفات حسراتیات جو ۳۲ برس کی عمر میں ۱۹۵۰ء میں ہوئی اس کا تذکرہ ہے۔ اسکے بعد کے ابواب میں مولانا کے دوست احباب اور معاصرین کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد مولانا کے علمی اور ادبی اوصاف و کمالات تصنیفی خصوصیات اور ذاتی خصائص کا دلچسپ مگر

موسمیت آفرین بیان و تبصرہ ہے آخر میں وہ تاثرات بھی لکھا کر دیے گئے ہیں جو آپ کی وفات پر اکابر علم و ادب نے ظاہر کیے ہیں۔ غرض کہ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے خد و خال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ شروع میں مولانا ابوالحسن علی کے قلم سے ایک طویل مقدمہ جو گویا کتاب اور صاحب سوانح دونوں پر تبصرہ ہے اور آخر میں نہایت جامع اور مفصل اشاریہ بھی ہے۔ اس حقیقت سے کتاب بہت دل چسپ، مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ لیکن یہ کوتاہی بری طرح کھٹکتی ہے کہ اس ضخیم کتاب میں مولانا رحمہ اللہ کے نادر و کمیاب کتابخانہ اور بصرف کثیر و جستجوئے بسیار مولانا کے جمع کتب کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کتابخانہ مولانا کی قبائے علم و فضل کا تکمیل ذریعہ اور ان کا سب سے عظیم باقیات صالحات ہے۔ راقم الحروف نے خود مولوی حسین الدین صاحب مرحوم سے اس سلسلہ میں چند نہایت اہم واقعات سنے ہیں۔ پھر کتاب خانہ تو موجود ہے ہی اور اس کی فہرست بھی ہے کم از کم اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی اس کتب خانہ کے بعض اہم نوادر کا تذکرہ کرنا چاہئے تھا۔ پھر ص ۳۹۵ کے آخر میں یہ لکھنا ”ڈھاکہ کے کوئی محمد اسحاق صاحب ایک علمی کتاب کے لیے موزوں نہیں۔ یہ صاحب ڈاکٹر محمد اسحاق ہیں جو اسلامیات کے بڑے فاضل اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں اسکے پروفیسر ہیں (کہیں خدا نخواستہ سبکدوش کی نذر نہ ہو گئے ہوں) انگریزی میں ان کی کتاب ”ہندوستان میں علم و حدیث“ بڑی محققانہ اور سحرکہ کی کتاب ہے بعض جگہ زبان کی غلطی بھی ہے جیسے ص ۳۹۹ پر ”اس ذوق کے بھی ادانش اس تھے“ ادانشی ذوق کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی ہے اسکے علاوہ کتابت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں مثلاً ص ۱۹۲ سطر ۱۰ کے شروع میں ”عید“ ”شعبہ کو تھی“ کے بجائے ”کوہ پٹی“ ص ۳۲۱ سطر ۱۰ ”خوشی“ کے بجائے ”ناخوشی“ ص ۳۹۸ سطر ۱۲ میں ”ادروں کے بجائے“ ”زوروں“ ص ۳۹۲ سطر ۱۷ میں ”کیا“ کے بجائے ”کہا“ ”سونا چاہیے“ پھر ص ۲۲ پر یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ ”دوسری بیوی بھی نامی نے شروانی“ نام کار کا سہوا۔ ہمارے خیال میں شروانی نام نہیں ہے بلکہ غالباً ایران کے مشہور شہر ”شروان“ کی طرف نسبت ہے اور غالباً یہ خاندان اصلاً دکن اسی شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر حال میں اس بارہ میں تحقیق نہیں ہے صرف ایک خیال ہے۔ اس خاندان کے حضرات اس پرزادہ و ذوق سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔

۱۹۷۷ء

موسم بدلتے ہی چہرے بھی بدل جاتے ہیں! کیا مہاسوں، پھنسیوں اور جلدی تکلیفوں کی وجہ سے؟ جب یہ تکلیفیں پیدا ہوں تو اُن کو صافی کے استعمال سے فوراً ختم کیجیے

مہاسے، پھنسیاں، دوسری جلدی تکلیفیں اور خسرو بھی موسم کی تبدیلی پر اکثر
ہو جاتی ہیں، کیوں کہ جگر اور فعل ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور خون میں
خرابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس موسم میں خاص طور پر صافی سے اپنے خون کو صاف
کیجیے۔ صافی، خون کو صاف کرتی ہے، خراب مادوں کو جسم سے نکالتی ہے۔
آنتوں اور گردوں کو صاف کرتی ہے اور آپ کے خون کی صفائی کا سبب
بنتی ہے۔ صاف خون کا مطلب ہے صحت مند جلد۔

۲۲ جزی بوٹیروں سے تیار کی گئی صافی تیز اثر رکھتی ہے۔ جراثیم کو مارتی ہے
اور ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے استعمال سے اجابت کھل کر آتی ہے اور
خون صاف ہوتا ہے۔ صافی سے خون کی تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔



صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

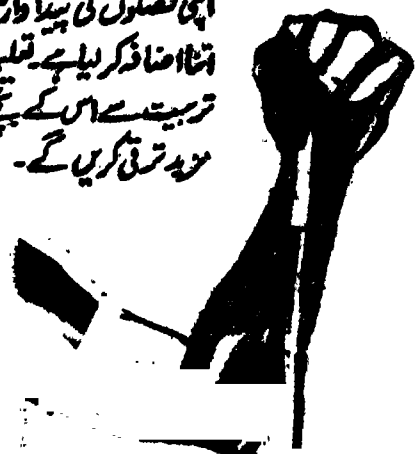
ہمدرد

برطان دہلی

کہا جاتا ہے: ”جن کی جتنی لاشیاں ان کا اتنا زور“

21/10/11

۔ لیکن راسخ کو چہ نہیں
مانتا۔ وہ جانتا ہے کہ ذلت
کے جدید طریقوں کا اور تعلیم و
تربیت کی وجہ سے اب
لاشیوں کی نہیں مارچ کی
ضرورت ہے۔ اپنی موجودگی
کے باعث ہی اس نے
اپنی نسلوں کی پیداوار میں
اتنا اضافہ کر لیا ہے۔ تعلیم و
تربیت سے اس کے بچے
مزید ترقی کریں گے۔



ہم درد کا ایک نیا تحفہ

لکھ

علامتِ حیات و قوت

چالیس اہم اجزاء کا زندگی بخش مرکب عرق
جو انسانی جسم کو بے پناہ قوت و تغذیہ عطا کرتا ہے

LAHORE



محبتِ صحت مند زندگی پیدا کرتا ہے امدان تمام حالتوں میں
مفید ہے جو مردوں اور عورتوں میں کمزوری کے سبب پیدا ہوتی ہیں
جیسے گھٹن زندگی میں آکٹا ہٹ یا بیزاری، جسانی اور
دماغی کاموں میں ٹھکن یا کام میں جی نہ لگنا، بدن میں شستی،
ہاتھ پاؤں میں لرزش، سانس پھولنا،
چہرہ زرد ہو جانا اور طبیعت میں پرمردگی وغیرہ۔

محبت بہت تیزی سے اعضائے ریئہ اور تمام
جسانی نظام پر اثر کرتا ہے۔ یہ اعلا درجہ کا مقوی و
تحرک ہے۔ مردوں اور عورتوں کی عام کمزوری کو
بہت جلد دور کرتا ہے۔

ہمدرد

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

اُردو زبان میں

ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ

قصص القرآن

18 MAY 1977

قصص القرآن کا شمار ادوار کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی تھی کہ اب چار ضخیم جلدوں میں نکلتی ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۴۰۰ ہیں۔

چھٹے اور پہلے حصہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

چھٹے حصہ دوم۔ حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات کی دعوت حق کی مختلف تشریحات و تفسیر۔

چھٹے سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف، ذوالقرنین، اصحاب القریۃ، اصحاب البیت، اصحاب الکوس، بیت المقدس اور یہود، اصحاب الافود، اصحاب الفیل، اصحاب الجحیم، ذوالقرنین اور حضرت یونس علیہ السلام، سب اوروں پر غیبیہ باتیں قصص قرآنی کی مکمل و متفصل تفسیر۔

چھٹے چارم۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و متفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے

قیمت مکمل سٹاک میں دس روپے۔ اجرت فی جلد فی پانچ روپے۔ جلد اول جلد دوم دس روپے

مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی

عظیم مولانا محمد رفیع الرحمن پور میں پرنٹنگ پریس میں شائع کر کے دہلی میں سے شائع کیا

۱۰۰

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ عَلَى كَامِلِ عِلْمِ دِينِ مَاهِنَا

۴۲

۶۸

بُرْهَان

مُتَّاب
سَعِيْدَا كِتَابِ اَبَادِي

اردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص المرسلین

قصص المرسلین کا شمار اردو کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں منسلک ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۴۳ ہیں۔

جلد اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے منسلک حالات و واقعات۔

جلد دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے منسلک حالات اور ان کی دعوت حق کی تفصیلات و تشریح و تفسیر۔

جلد سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف و الزم و اصحاب القبر و اصحاب التبت و اصحاب الکوس و بیت المقدس اور ربوہ و اصحاب الاخدود و اصحاب الغیل و اصحاب الجحیم و ذوالقرنین اور سید سکندر و سبا و رسل عرم و غیرہ باقی قصص قرآنی کی منسلک و متعلقہ تفسیر۔

جلد چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ان کے اصحاب و ان کے حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت منسلک سٹاکسٹین روپے۔ اجرت لی جلد فلپ ہارچ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۶۸ { ربیع الآخر ۱۳۹۲ھ مطابق جون ۱۹۷۲ء } شمارہ ۶۵

- | | | |
|-----|--|--|
| ۳۶۲ | سید احمد اکبر آبادی | ۱۔ نظرات |
| ۳۶۹ | " " " | ۲۔ اسلام کا حروضی مطالعہ
کیوں اور کیسے؟ |
| ۳۸۹ | جناب ڈاکٹر نور السدید اختر صاحب | ۳۔ پیرپاشا حسینی |
| ۴۰۴ | جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب
فرقانہ اکیڈمی، سیکور ناٹھ | ۴۔ کلور و فل اور قرآن |
| ۴۱۶ | جناب الحاج محمد ارار حسین صاحب فاروقی | ۵۔ جاگیر کی نصیحت نامہ |
| ۴۲۰ | س۔ ع | ۶۔ التفريط والانتقاد
مذہب اور سائنس |



اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص المرسلین

قصص المرسلین کا شمار ادوار کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس دور میں کوئی کتاب کسی زبان میں تیار نہیں ہوئی تھی کہ چار ضخیم جلدوں میں منسلک ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۴۲ ہیں۔

حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے منسلک حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے منسلک حالات اور ان کی دعوت حق کی عقائد تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف، الذاریہ، اصحاب القبر، اصحاب النہد، اصحاب الکس، بیت المقدس، اور یسوع، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجحیم، ذوالقرنین اور سب سے بڑی سبب اور سبیل عزم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی منسلک عقائد تفسیر۔

حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منسلک و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت منسلک سٹاکتیں روپے۔ اجرت فی جلد نصف پانچ روپے۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

برہان

جلد ۶۸ { ربیع الآخر ۱۳۹۲ھ مطابق جون ۱۹۷۲ء } شمارہ ۶۵

- ۱- نظرات سید احمد اکبر آبادی ۳۶۲
- ۲- اسلام کا سر وضعی مطالعہ کیوں اور کیسے؟ ۳۶۹
- ۳- پیر پاشا حسینی جناب ڈاکٹر ذوالسجدا اختر صاحب ۳۸۹
- ۴- کلود و فل اور قرآن جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ۴۰۴
- ۵- جہانگیری نصیحت نامہ فرقا نیہ اکیڈمی، سیکورز ناٹو ۴۱۶
- ۶- التفريط والانتقاد مذہب اور سائنس س - ع ۴۲۰

.....

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نظرات اردو کے مسائل و معاملات

مسلمانوں کی نا سمجھی اور ناعاقبت اندیشی کے باعث اردو زبان پر جو وقت پڑا ہے، خدا سے کبھی دشمن پر نہ ڈالے۔ آج اس کی مثال وہی ہے کہ از اسورا اندہ و دران سودر ماندہ ہو لوگ دو قومی نظریہ کے بانی اور حامی تھے ان کو ملک کے غیر منقسم ہونے کی صورت میں یہاں بس طرح۔ اسلام اور مسلمانوں کی خبر نظر نہیں آتی تھی اردو کی بھی نظر نہیں آتی تھی کیونکہ ان کے فکر میں اردو بھی اسلامی تھی اور اگر ملک تقسیم نہ ہوا تو اکثریت کی جارحانہ ذہنیت کے باعث ہر اس چیز کا وجود خطرہ میں پڑ جائیگا جس کا کوئی ادنیٰ تعلق بھی اسلام یا مسلمانوں کے ساتھ ہو، ملکیں ابھی ایک ریل صدی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دنیا نے کچھ بینی و کج اندیشی کا نہایت المناک انجام بیگمہ دلش کی صورت میں دیکھ لیا۔ دو قومی نظریہ کے عناصر ترکیبی تین ہی چیزیں تھیں، اسلام، مسلمان اور رہا اردو۔ اس بنا پر جب اس نظریہ کی نہایت عالیشان عمارت کھنڈر ہوئی تو لامحالہ اس کا اثر ان کمپوز پر ہی ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اہل بیگال کے لیے ان کی زبان ایک ایسی محبوبہ تھی جس کے سامنے مذہب کا تقدس بھی مانع نہ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اردو زبان کو بیگال میں برابر درخود تھا اور اہل بیگال نے اس کے ساتھ قدر و منزلت کا معاملہ کیا ہے۔ بیگال میں گاؤں گاؤں عربی اور دنیا کے مدرسے ہیں، عربی اور دنیا کے امتحانات، عالم اور فاضل وغیرہ ہوتے ہیں تو سینکڑوں کیا بہناروں طلباء اور طالبات ان میں شریک ہوتے ہیں، اور جس طرح ان سب اداروں میں تعلیم کی زبان اردو ہے اسی طرح امتحان کی زبان بھی یہی ہے۔ علامہ انری۔

ایسکیڈری اور اس کے بعد گریجویٹیشن کی سطح پر اردو بحیثیت ایک مضمون کے شامل ہے۔ اور ذرا سالہ قیامِ مملکت میں مغربی بنگال سے متعلق میرا مشاہدہ اور مشرقی بنگال کی نسبت مجھے معلوم ہے کہ بنگالی لڑکیوں یا لڑکوں نے اس ذریعہ سے اردو پڑھنے میں تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ غرضیکہ اردو بنگال میں رائج درگاہ نہیں تھی اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور بنگال کے مسلمان عموماً ہندوستان کے علماء اور یہاں کے مذہبی اور دینی اداروں سے وابستہ تھے اور ان سب کے درمیان بول چال کی زبان اردو ہی تھی۔ لیکن بڑا بو خداوندانِ تقسیم کی جارحانہ ذہنیت کا جیسا انہوں نے پاکستان میں اہل بنگال پر بھی بنگالی کو نظر انداز کر کے اردو کی مطلق العنان حکومت و بااں بھی قائم کرنی شروع کی۔ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے عظیم المرتبت عالم اور مورخ کی زبان سے بنگالی زبان کا رسم الخط بدلنے کی تجویزیں فقہ میں گونجنے لگیں۔

تو اب بنگالیوں کے کان کھڑے ہوئے۔ اور ان میں اردو کے خلاف معاندانہ جذبات پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ سید صاحب پر شدید حملہ ہوا۔ حکومت پاکستان کی لسانی پالیسی کے خلاف طلباء نے شدید مظاہرے کیے۔ ان میں کئی طلباء مارے بھی گئے اور اب بنگالی میں اردو سے نفرت اور اس سے عناد کا ایک مستقل محاذ قائم ہو گیا۔ اگرچہ بعد میں حکومت پاکستان نے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اردو سے جو نفرت کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ وہ بدستور قائم رہی اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اردو کے علمبرداروں نے بنگال کی سماجی اور معاشی زندگی میں جس استبداد اور جبرہ دستی کا مظاہرہ کیا اس کے باعث پنجابیوں اور ہماجرین کی طرف سے۔۔

بیزاری اور دلِ مگر خنکی کے ساتھ اردو کی مخالفت کا جذبہ بھی ترقی کر رہا ہے۔ قاعدہ ہے کہ دل میں کوئی ایک جذبہ ابھرتا اور شدید ہوتا ہے۔ تو انسان اس کی تسکین کے لیے کتنے ہی جذبات اور پیداکر لیتا ہے۔ اس بنا پر اردو اور بنگالی کا معاملہ ایک خاص لسانی معاملہ تھا۔ لیکن جب اردو کی مخالفت کا احد اس کے بالمشابہ بنگالی زبان کے ساتھ عشق کا جذبہ شدید اور قومی ترانہ اور طبعِ حید جوئے سیاست اور معاشیات کو بھی اس ایک لسانی مسئلہ کے ساتھ ہم آہنگ اور ہرگز

کر لیا۔ اور ان سب نے دل جل کر وہ قیامت برپا کی جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا۔ دنیا میں جتنی عظیم انسان امد ہوئے تاکہ ترین جنگیں ہوئیں، ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا آغاز کسی بہت ہی معمولی واقعہ سے ہوا ہے۔ اس طرح بنگلہ دیش کے عنوان سے جو کچھ ہوا، وہ اگرچہ ایک ہنگامہ محشر سے کم نہیں تھا، لیکن اس کا اصل سبب اور راز اردو والوں کی چیرہ دستی اور جارحیت پسندی ہی تھی۔ خود کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں ہندی کے پرستار اردو زبان کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی جو بات کرتے ہیں، اس میں اور بنگالیوں کو عربی رسم الخط کے اختیار کر لینے کا مشورہ دینے میں باہم کیا فرق ہے اگر وہ جارحانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے تو یہ کیوں نہیں؟ انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہی نا الفانی جس کو وہ دوسرے کے ساتھ رد رکھتا اور اس کو تیر خواہی کا نام دیتا ہے جب وہی نا الفانی "خیر اندیشی" کے نام پر اس کے ساتھ کوئی اور کرنے لگتا ہے تو اس پر احتجاج کا ہنگامہ گرم کر دیتا ہے۔ اور دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔

بنگلہ دیش کے قیام سے اسلام کو نقصان پہنچا یا نہیں مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ پرگانہ ہوا یا نہیں۔ یہاں ان سوالات سے کوئی سروکار نہیں! البتہ یہ یقینی ہے کہ اس ملک میں اردو کا جو کچھ بھرم تھا، اور کچھ اور نہیں، تو کم از کم علمی اور مذہبی طور پر اس زبان کا جو تار بنگلہ دیش کے لوگوں کے دل میں تھا، اب وہ سب ختم ہوا اور گویا اردو وہاں سے خلع البلد کر دی گئی۔ تقسیمِ بونفین و عداوت پر مبنی ہو ایک متعدی بیماری ہے کسی ایک شخص کو ہو جائے تو اسی تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیل کر دوسروں تک پہنچتی اور لگتی ہے چنانچہ بنگلہ دیش کے دوا علی اور حرکات نے پاکستان کے بچے کچے صوبوں میں بھی سر اٹھانا شروع کیا۔ اور اردو سے بیزاری اور اس کی مخالفت کی ہوائیں وہاں بھی چلنے لگیں۔ ابھی ان ہواؤں کی رفتار نرم اور آواز دھیمی دہمی ہے، لیکن اگر اربابِ حکومت و اقتدار نے اس موقع پر بھی اسی طاقت نا اندیشی اور خود...

پرستی کا مظاہرہ کیا جس کا انھوں نے بنگلہ دیش کے معاملہ میں کیا تھا۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شعلہ جو آتش فشاں نہ بن جائے گا۔ اور بنگلہ دیش میں تو اردو کا مقابلہ صرف ایک حریف سے تھا یہاں اس کو سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی بیک وقت چار پہلوؤں سے سابقہ ہو گا۔ پھر خدا ہی جانتا ہے۔ یہ دلی اور لکھنؤ کے شبستان تہذیب و ادب کی شمع فروزاں ان طوفانی ہواؤں کے مقابلہ میں کب تک اور کس طرح قائم رہ سکے گی۔ پاکستان کے موجودہ صوبوں میں اردو کی مخالفت اور اس سے بیزاری کا سب سے زیادہ زور سندھ میں ہے۔ یہاں آئے دن دونوں طرف سے۔۔۔ مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ مظاہرے کبھی کبھی تشدد کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس اردو بیزاری کی تحریک میں سندھ کی پیش قدمی کی دو وجہیں ہیں۔ ۱۔ ایک یہ کہ سندھ میں اردو کو کبھی وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو اس کو پنجاب یا کم از کم سرحد میں ہوا۔ اس عدم تعلق کی بڑی وجہ تعلیم کے میدان میں سندھ کی پس ماندگی اردو کے علاقوں سے ان کی دور افتادگی اور خود اہل سندھ کی طبعاً کم آمیزی بھی ہے۔ ۲۔ اس کے علاوہ ایک اہم اور بڑی وجہ یہ ہے کہ۔۔۔ مہاجرین کی آباد کاری کا سب سے زیادہ بوجھ سندھ کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ سندھ کا علاقہ تعلیم، صنعت و حرفت، دولت و ثروت میں ایک پس ماند علاقہ تھا۔ اب مہاجرین وہاں پہنچے تو کراچی ہر اعتبار سے دنیا کا ایک عظیم ترقی یافتہ شہر بن گیا جس کی دولت و ثروت، صنعت و حرفت اور تعلیم و تہذیب ترقی میں مہاجرین کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ یہ لوگ جوں کی توڑ کرخانہ دیرانی کے عالم میں کراچی یا سندھ کے دوسرے علاقوں میں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے چند برسوں میں امیر کبیر احمد صاحب دولت و ثروت بن گئے اور خود سندھی نیتا جوں کے توں رہے۔ ان حالات نے مہاجرین میں اور سندھ میں ایک مستقل کشمکش پیدا کر دی۔ اس کشمکش کی اصل بنیاد تو اقتصادی اور معاشی طبقاتیت تھی لیکن لفظیات اقوام کے ماتحت اس انقلابی مزاحمت کی لپیٹ میں تہذیب اور زبان بھی آ گئے۔ زبان کا معاملہ اگر منفی تھا لیکن سندھ میں اجتماعیہ پیدا کر کے اس سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر اس کی سب

سے زیادہ اچھا لگایا۔ اور اب وہاں اردو کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم ہو گیا ہے۔

پنجاب پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبہ ہے اور اس کو اردو زبان و ادب سے بہت گہرا تعلق رہا ہے بلکہ واقعتاً یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برس میں تو اس صوبہ نے بحیثیت مجموعی اردو زبان و ادب کی وہ اہم خدمات انجام دی ہیں جو دلی اور لکھنؤ والوں سے بھی نہیں بن پڑیں اور آج بھی جیسا کہ پروفیسر عبادت بریلوی نے بتایا کہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے کے امتحان میں طلباء اور طالبات کی تعداد پانچ چھ سو کے لگ بھگ رہتی ہے وہاں تعنیف و تالیف اور صحافت و رسائل کی عام زبان اردو ہی ہے۔ اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے بڑے بڑے ادارے اور اس کی تعلیم اور اس میں ریسرچ کے اعلیٰ انتظامات ہیں۔ غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں کمیٹ اور کیفیت کے اعتبار سے جو کارہائے نمایاں پنجاب یونیورسٹی لاہور نے خصوصاً اردو دوسرے اداروں نے عموماً انجام دیئے ہیں وہ نہ علی گڑھ نے انجام دیئے اور نہ دہلی نے۔ باتیں ان لوگوں نے زیادہ کیں۔ دلوئے بڑھ بڑھ کر ان حضرات کی طرف سے ہوئے لیکن کام سب سے زیادہ خوبصورت محسوس اور وسیع پنجاب کے لوگوں نے کر دکھایا۔ حالانکہ غالب سے قرب و جوار کی دراشت ان کو پہنچی ہے۔ نہ کہ ان کو جنکو کہنے والے طعنہ دیا تھا۔ دلی نہیں دیکھی تو زبان دان یہ کہاں ہیں؟

شائبش زندہ دلان پنجاب! شائبش! ابن کار ز تو آید و مردان چینی کنند
بلے شبہ پنجاب میں اردو کا یہ اہتمام اور اس کے ساتھ یہ غیر معمولی دلچسپی بڑی مسرت انگیز

۱۔ اخیر خطرات کے پیش نظر علماء میں جب کراچی میں ایک عزیز دوست نے جو وہاں کی حکومت میں افسر اعلیٰ ہیں میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کی پالیسی ہی یہ تھی کہ مہاجرین کو زیادہ سے زیادہ سندھ اور خصوصاً کراچی میں آباد کیا جائے۔ تو میں نے فوراً کہا۔ نواب زادہ نے یہ کام اچھا نہیں کیا۔ آئندہ اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اور حوصلہ افزا ہے۔ لیکن نتیجہ اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی پنجاب میں جو کچھ قدر و منزلت ہے وہ ایک اعلیٰ درجے کی ادبی ثقافتی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے ہے۔ وہاں کے لوگوں کو اس کے ساتھ دلچسپی ایسی ہے جیسے انگلستان کے لوگوں کو فرانسیسی زبان کے ساتھ ہے۔ ورنہ بحیثیت بولی یا بات چیت کی زبان کے اردو کی وہاں بھی کوئی حیثیت اور اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ صورت حال تقیم سے پہلے بھی تھی میں نے خود ڈاکٹر اقبال کو دیکھا ہے۔ جب کبھی کسی اردو داں پنجابی سے گفتگو کرتے تھے پنجابی میں کرتے تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اس صورت حال میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے۔ آزادی نے علاقائی رجحانات کو جو ہمیز کیا ہے اس سے پنجاب کیوں متاثر نہ ہوتا بلکہ پنجاب وہاں بھی اردو کو ہٹا کر پنجابی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک شروع ہو چکی ہے اور اردو کے بلند پایہ ادیب شاعر اور مصنف پنجابی حضرات اس تحریک کے حامی اور مددگار ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں اس سلسلہ میں لاہور میں جو جلوس نکلا تھا اس میں ہمارے فاضل دوست پروفیسر علاء الدین صدیقی، جاس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، لاہور، حفیظ جالندھری اور غالباً فیض احمد فیض وغیرہم یہ سب شریک تھے۔ اردو والوں کو ان حضرات سے شکایت کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اور ان کے بچوں کی مادری زبان کا معاملہ ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مادری زبان میں ذریعہ تعلیم بننے کی صلاحیت موجود ہے تو وہ اسے کیوں اختیار نہ کریں تاکہ پچھلے لاہور جیسے بین الاقوامی شہر میں جیسا کہ وہاں نہایت معتبر دوستوں نے بتایا کہ ایک دو گھروں کو مستثنیٰ کر کے کوئی ایک پنجابی گھر بھی ایسا نہیں ہے۔ جہاں اردو بولی جاتی ہو۔ اردو کے بلند پایہ ادیب اور نامور شاعر اور مصنف ہیں۔ لیکن جب کسی پنجابی سے یا گھر کے کسی فرد سے گفتگو کریں گے بیساختہ پنجابی زبان میں کریں گے۔ اگر آپ کو پنجابی زبان کی کچھ شہید نہیں ہے تو لاہور میں ٹانگو والوں اور مولیٰ۔۔۔ دوکانداروں کی بات کا سمجھنا آپ کے لیے دشوار ہے یہ سچ ہے کہ برے وقت میں کون کسی کا ساتھی ہوتا ہے۔ جب اردو غریب خود اپنے وطن میں بے وطنی اور خود اپنی جہم بھومی اجنبی ہو گئی

تو سپر پروڈیس میں اس پر جو پتا بھی پڑے اس کا شکہ کس سے کیجئے۔

یہاں تک تو اردو سے متعلق پاکستان کے عوام کے احساسات و رجحانات کا تذکرہ تھا۔ حکومت کی سطح پر اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس سوال کا جواب تو یہ ہے کہ اردو کا رشتہ اسلام کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا، اس بنا پر دیکھ لیجئے۔ اسلام پر وہاں کیا گزری؟ بس اسی پر اردو کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ زیادہ دور جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر اس سوال کا تفصیل جواب مطلوب ہو تو اس سلسلہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور) نے جو کچھ اپنے خطوط میں یا مضامین میں لکھا ہے۔ اس کو پڑھ جائیئے، اس کی ایک ٹیک سطر حسرت دیاس اور ناکامی و نامرادی کا مرقع نظر آئے گی۔ مولوی عبدالحق صاحب تقسیم کے بعد اپنی انجمن کو لے کر کراچی کن آرزوؤں اور تمناؤں کو لے کر پہنچے تھے۔ لیکن وہاں ان کا کشتا آرزو کس طرح تباہ ہوا؟ خود ان کی ذات کس طرح انہوں سے بے گانہ و شنی اور بے مہری احباب کا شکار ہوئی۔ انجمن کے کام کس طرح خاک لبر اور پر اگندہ و منتشر ہوئے اور اردو کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کے تمام منصوبوں کا انجام کس درجہ حسرت انگیز ہوا؟ یہ پوری رو بہ اردو مولوی صاحب کی تحریروں اور قومی آواز کے فائلوں میں محفوظ ہے۔ انجمن نے لیک اردو کا علاج قائم کیا تھا؟ اس نے اب تک کیا ترقی کی؟ اور متعلقہ یونیورسٹیوں کی طرف سے حوصلہ افزائی کس حد تک ہوئی؟ یا خبر اصحاب اس سے واقف ہیں۔

ادارہ کے قواعد و ضوابط اور سالانہ مطبوعات کی فہرست
طلب فرمائیے

اسلام کا معروضی مطالعہ اکیوں اور کیسے؟

سعید احمد کبیر آبادی

اب سے سو اور برس پہلے دارالمصنفین اعظم گرحہ کی دعوت
پر اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا جو جلسہ اعظم گڑھ میں ہوا تھا۔ یہ مقالہ
اس کے لیے لکھا گیا تھا ————— (سعید احمد)

تاریخ مذاہب عالم کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ جب بھی کوئی ایک مذہب عالم وجود میں آیا
ہے تو اس نے لوگوں میں خدا پرستی اور نیکی و پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کا ایک جذبہ و داعیہ
پیدا کر کے ایک سوسائٹی کی تشکیل و تعمیر کی ہے اور اس سوسائٹی نے نشو و ارتقا کے مختلف مدارج
اور مراحل سے گزر کر ایک تاریخ کو جنم دیا ہے۔ لیکن اسی تاریخ نے آگے بڑھ کر یہ وان مذہب
کی آئندہ نسلوں کو اس درجہ متاثر اور متقل کیا ہے کہ مذہب کے اصل سرچشمے اور اس کے حقیقی
ماخذ اس کے ساتھ ماند پڑ گئے ہیں یعنی اب مذہبی معاملات و مسائل کے جو فیصلہ ہوتے ہیں۔
ان کی اصل بنیاد وہ روایات اور وہ افکار و نظریات قرار پاتے ہیں جن کو تاریخ نے مختلف
فضا اور ماحول میں پیدا کیا تھا۔ اور اسی بنا پر بھی روایات اور افکار و نظریات مذہب کی تشریح و
توضیح کا معیار بن جاتی ہیں۔

غور کیجئے تو اسلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کا ظہور مکہ
میں ہوا اور ۱۱ برس کے مسلسل سفر کے بعد مدینہ میں اس کی تکمیل ہو گئی اور الیوم اکملت لکم دینکم
و اتممت علیکم نعمتی کے اعلان پر بالائے اس پر ہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس مدت میں عقائد،
عبادات اور معاملات سے متعلق ہزاروں مسائل و معاملات پیش آئے اور ان سب کا حل وحی

متلو یا غیر متلو کے ذریعہ میسر آگیا اس زمانہ میں اختلاف و افتراق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت موجود تھی۔ اور آپ کے متعلق فرمان الہی یہ تھا کہ دما لنا کسم۔ اسولہ فخذوا وما تھا کہ عنہ فانھوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ عہد صحابہ شروع ہوا تو اب اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ ایک طرف اسلام کی تعلیمات اس درجہ ہمہ گیر تھیں کہ زندگی کا کوئی شعبہ ان کے احاطہ سے باہر نہیں تھا۔ اور دوسری جانب تمام صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں اور استعداد فہم و ذکاوت میں یکساں نہیں تھے کسی نے ایک آیت سنی اور اس کا جو مطلب حضور سے سن کر یا آپ سے سے بغیر جو کچھ اس کا مطلب سمجھا اسے بیان کر دیا حضور کا کوئی قول سنایا کوئی عمل دیکھا اسے روایت کر دیا۔ کسی اور صحابی نے کوئی اور قول سنایا پہلے عمل کے خلاف کوئی اور عمل دیکھا۔ انہوں نے اسے نقل کر دیا بعضوں نے حضور کے دو قول سنے اور مختلف اوقات میں دو مختلف عمل دیکھے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو بیان کر دیا۔ پھر جب نئے مسائل و معاملات پیدا ہوئے۔ اور ان کے لیے استنباط و استوحاج کی ضرورت پیش آئی تو جس صحابی کے پاس حضور کے قول و عمل کا جو سرمایہ محفوظ تھا۔ اور اسے انہوں نے جیسا کچھ سمجھا تھا۔ اس کی روشنی میں انہوں نے جدید امور و معاملات کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دی۔ اس طرح اب اختلاف اور احکام و مسائل میں تنوع رونما ہونے لگا لیکن یہ اختلاف مترتبا سر جمعت تھا اور اس لیے دین کی وسعت سلامتی کی بنیادیں دستوار ہو رہی تھیں۔ اختلاف امتی رحمت کی روایت محکم نہیں ہے جیسا کہ محققین کی رائے ہے۔ لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے تو یقیناً اس کا مصداق وہی اختلاف ہے جو علمی اور فکری طور پر قرن ثانی میں ظہور پذیر ہوا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ارشاد گرامی ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا۔ کیونکہ اگر فردی مسائل میں صحابہ کا ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی۔ صحابہ کرام ائمہ دین تھے جن کی پیروی موجب خیر و برکت اور باعث نفع و نجات ہے اس بنا پر اگر کوئی

شخص کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کرے گا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا۔
 اس عہد کے بعد دو دینا بعین بین اختلاف کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ
 دوسری قومیں اور ملکوں کے لوگ کثرت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو رہے تھے اور یہ ان ملکوں
 اور قوموں کے افراد تھے جن کے پاس اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہبی افکار و نظریات کا عظیم
 سرمایہ محفوظ تھا۔ اب وہ دور تو تھا نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض نظر و محبت
 سے عہد جاہلیت کی تمام آلائشیں دور ہو جاتی تھیں اور قلب و دماغ کا مکمل تزکیہ اور تنقیہ ہو جاتا
 تھا۔ اس بنا پر اس عہد میں عجمی ممالک کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان سے یہ توقع نہیں
 ہو سکتی تھی کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ اپنے قومی فرائض اور طبیعت اور اس کے باعث خاص
 قسم کے میلانات و رجحانات سے یکسر پاک و صاف اور مبرا و منزه ہو جائیں گے۔ ایک طرف علمی
 ذہنی اور فکری سطح پر اس دور میں یہ تبدیلی پیدا ہو رہی تھی اور دوسری جانب خود غریبوں میں
 سیاسی اختلافات اور قبائلی عصبیت نے شدت اختیار کر لی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت راشدہ کے
 اختتام کے بعد بنو امیہ کے دور حکومت میں اسلامی وحدت فکر اور بے لوث ذہنی اجتہاد و استنباط
 کی فضا اپنی اصل شکل و صورت میں قائم نہ رہ سکی۔ اس انتشار خیال اور پراگندگی انکرونظر کے
 باعث متعدد مکاتب فکر ظہور پذیر ہوئے۔ اور ان مکاتب فکر کا دامن اتنا وسیع تھا کہ جبری اور
 فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور عقائدی مسائل و مباحث مثلاً صفات باری خلق قرآن
 جبر و قدر ایمان اور عمل کا تعلق خیر و شر کی حقیقت مرکب کبیرہ کا حکم وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بھی
 موضوع بحث بن گئیں۔ اور اس بحث و وجدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کر لی۔ اسی دور
 میں بعض سماجی سیاسی اور نفسیاتی عوامل و اسباب کے ماتحت ایک مخصوص طرز فکر و زندگی
 کی حیثیت سے نقیض بھی پیدا ہوا جو آگے چل کر ایک خاص طبقہ اور گروہ کی تشکیل کا باعث بنا۔

فرقہ بندی کا خاصہ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا رجحان و میلان اور سوچنے و غور کرنے کا ایک خاص ڈھنگ پیدا کرتی ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے لیکن ہر فرقہ کا شخص اس کی تعبیر اور تشریح و توضیح فرقہ دارانہ ذہن سے اپنے میلان و رجحان کے مطابق ہی کرتا ہے۔ اس بنا پر فرقے جتنے زیادہ ہوتے چلے جائیں گے ایک ہی حقیقت کی تعبیر و تشریح و توضیح میں اختلافات اور تنوع کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے۔ کار چنانچہ اسلام میں بھی یہی ہوا۔ قرآن ہر مسلمان کے عقیدے میں کتاب الہی اور اسلامی احکام و مسائل کا اولین ماخذ اور اصل سرچشمہ ہے لیکن اس کے فہم و ادراک معانی کی بات کہاں سے کہاں پہنچی اس کا اندازہ گو لڈزبر کی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ مذهب التفسیر الاسلامی کے نام سے عربیہ بواکتابہ سے شائع ہو چکا ہے۔ اور مصر کے فاضل محمد حسین الدہسی کی کتاب التفسیر واللفظون نے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ ان دو کتابوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے مصنفوں نے مطبوعہ تناسیر سے علاوہ بہت سی ایسی تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اب تک محض مخطوطات کی صحت میں کہیں کہیں محفوظ ہیں۔ بہر حال تفاسیر کا جو مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے اگر ان پر ہی ایک نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ تفسیر میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں انھیں مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تفسیر بالماثور یعنی قرآن کی تفسیر احادیث و آثار کی روشنی میں کرنا۔

۲۔ تفسیر بالرأے والا اجتہاد

۳۔ لغوی رجحان ————— ۴۔ قصصی رجحان

۵۔ فقهی رجحان ————— ۶۔ باطنی رجحان :- اس سے اشارہ ان تفاسیر

کی طرف ہے جو فرقہ الامامیتہ الاسلامیہ کے علماء کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ فرقہ شیعہ امامیہ کی ایک انتہا پسند اور غالی شاخ ہے اس کی نسبت اسماعیل بن جعفر صادق کی طرف سے اور صرف قرآن کے باطنی کائنات ہے۔

۷۔ مونیانہ یا اشتداری رجحان :- باطنی اور مونیانہ اشارات کو بعض حضرات ایک ہی چیز سمجھتے

ہیں لیکن درحقیقت ان دونوں میں فرق ہے اگرچہ شیخ محی الدین ابن عربی کی تفسیر میں کہیں کہیں :-
دو لفظوں کی حد میں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ صوفیانہ رجحان ان چیزوں کا
منکر نہیں ہوتا جو ظاہر قرآن سے مفہوم ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس باطنی رجحان صرف ان چیزوں
کو قرآن کی مراد اور مطلب قرار دیتا ہے جو آیات کے باطن سے مفہوم ہوتی ہیں۔

صوفیانہ رجحان کی تفسیر کے غالباً اولین نمائندہ ابو محمد سہیل بن عبداللہ بن یونس بن علی
بن عبداللہ التستری المتوفی ۳۲۰ھ ہیں۔ اکابر عارفین و صوفیائیں شمار ہوتا ہے انہوں نے
لکھا ہے۔ قرآن کی ہر آیت چار چیزوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر، باطن، حد اور مطلع۔ ظاہر تلاوت آیات
کا نام ہے۔ باطن اس کا فہم ہے۔ اور حد اس کی تحلیل و تحریم اور مطلع تو وہ یہ ہے کہ قاری
قلب راہ خداوندی تک پہنچ جائے اور اس سے عبرت پذیر ہو۔

۸۔ عقلی اور فلسفیانہ رجحان :- اس رجحان کی نمائندگی دو قسم کے حضرات کرتے ہیں۔ ایک
متکلمین اور دوسرے فلاسفہ۔ پہلے طبقہ کے سب سے بڑے ترجمان امام فخر الدین رازی المتوفی
۷۰۱ھ ہیں ابو نصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ کی بعض وہ تفسیریں تشریحات ہیں جو قصوص الحکم
میں موجود ہیں یا شیخ بوعلی بن سینا متوفی ۴۰۰ھ کی سورہ اخلاص اور مخوضتین کی تفسیریں یا
ابن رسائل اس دوسرے طبقہ کے تفسیری رجحان کا مظہر ہیں، پھر انھیں فلاسفہ میں ایک اور
بقعہ ہے جو انتہا پسند ہے۔ اس کی نمائندگی اتھان الصفا کرتے ہیں جن کے رسائل میں تفسیری
مباحث جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔

۹۔ کلامی یا فرقہ وارانہ رجحان :- اس رجحان کی عظیم نمائندہ وہ تفسیریں ہیں جو شیعہ یعنی امامیہ
نشریہ، زیدیہ، خوارج یا معتزلہ سے تعلق رکھنے والے حضرات نے لکھی ہیں بشیوہ تفسیر کے
برط اور مفصل علم کے لیے ایران کے نامور محقق اور فاضل کاغذ بگ، مظہرانی کی کتاب النہجۃ
فالتعانیف الشیعہ، دکنی چلیبیہ جو متعدد ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس طرز تفسیر کا آغاز
پہامدی کے اور پھر سی بی بیگم کی تفسیر جبار الجندی متوفی ۷۲۸ھ کی۔

بیان کی جاتی ہے جواب دستیاب نہیں ہے۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اس طرز پر کثرت سے تفسیریں لکھی گئیں۔ ان تفاسیر کا انداز اگرچہ تفسیر بالمأثور کا ہے۔ لیکن باہمی تشبیہ عقاید و مسلک کی ترجمان کیونکہ ان میں خاص قسم کی روایات ہیں جن کا سلسلہ استاد اہل بیت اور ان سے تعلق رکھنے والے بزرگوں تک پہنچتا ہے یہ امامیہ اثنا عشریہ کی تفاسیر کا حال ہے زید یہ فرقہ جو حضرت زید بن علی سے منسوب ہے ان کی تفاسیر میں معتزلی رجحان پایا جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت زید بن علی کو داصل بن عطاء سے تلمذ کی نسبت تھی۔ زید یہ فرقہ کی تفاسیر تشبیہ فرقوں میں اہل سنت کی تفاسیر سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ ان میں مقابلتہ توازن اور اعتدال زیادہ ہے۔ یہ فرقہ حضرت علی کی افضلیت کا قائل ہے۔ لیکن تشیع کی خلافت کو جائز تسلیم کرتا ہے خوارزم کا ذخیرہ تفاسیر محدود ہے۔ تاہم ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔ (۱) تفسیر عبدالرحمن بن رستم الفارسی جو تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ (۲) تفسیر ابو دین حکم الہواری یہ بھی تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور (۳) تفسیر ابو یعقوب یوسف بن ابراہیم الورطانی متوفی ۵۷۰ھ ان سب تفاسیر میں آیات قرآنی سے خوارزم کے معتقدات اور ان کے مسلک کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس میدان میں مختصر کہ کیوں کسی سے پیچھے رہتے چنانچہ خود اس فرقہ کے بانی داصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ نے خود ایک تفسیر معالی القرآن کے نام سے لکھی اور اس کے بعد اسی نقطہ نظر سے یعنی مسلک اعتزال کی تائید و توثیق کے لیے ابو علی الجبائی متوفی ۳۰۳ھ اور ابو ہاشم الجبائی متوفی ۳۱۲ھ جو اعتزال کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے تفسیریں لکھیں۔ لیکن یہ اب ناایاب ہیں لیکن قاضی القضاۃ عبد الجبار اسد آبادی متوفی ۴۱۵ھ کی تفسیر تفسیر القرآن من الطائف اور شریف مرقفی متوفی ۴۲۶ھ کی تفسیر امالی اشرفیہ المرقفی یا غرر الفوائد و درر القلائد کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ابو مسلم محمد بن سحر الاصغانی کی تفسیر اب اگرچہ نہیں ملتی۔ تاہم امام رازی

جایا اس تفسیر کو نقل کرتے اور مصنف کی وقتِ نظر کی داد دیتے ہیں۔ محترمی مسلک کی آج سب سے بڑی اور نہایت اہم تفسیر وہ ہے جس کو عربی کا ہر طالب علم تفسیر الکشاف کے نام سے جانتا ہے۔

اب تک ہم نے تفسیر میں تو قسم کے رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہمارا موجودہ زمانہ سائنسی علوم جدیدہ اور سیاسی افکار و آرا کی غیر معمولی ترقی اور ان کے حوض کا زمانہ ہے اس بنا پر کہ جو ممکن ہے کہ اس عہد کے علمی اور سیاسی نظریات و افکار کا اثر فنِ تفسیر پر نہ ہوتا۔ چنانچہ جو ہر مطلقاوی کی تفسیر جو اہل القرآن پر سائنس اور اس کے علوم کا اثر پایا جاتا ہے۔ مفتی محمد عبدک اور سید رشید رضا کی تفسیر التارخ جدید سماجی علوم اور ان کے پیدا کیے ہوئے فکرِ نو سے متاثر ہے اور مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیری کاوشوں پر جدید سیاسی افکار و آرا کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا رجحانات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف اور قرآن سے قرین۔ رحمان نمبر ایک یعنی تفسیر الماثور ہے۔ کیونکہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور آپ ہی کا منصب اس کی تبیین ہے۔ اس طرزِ تفسیر کا سب سے بڑا منظر تفسیر ابن جریر طبری۔ متوفی ۳۰۷ھ ہے۔ اس کے بعد معالم التنزیل للبخاری اور نہاد المسیلا بن الجوزی بھی۔ اسی ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن محققین علماء نے تفسیر الماثور کی خامیاں اور کمزوریاں حسب ذیل بیان کی ہیں، دلی، وضعی اور جعلی روایات کی کثرت! ان روایات کے باعث تفسیر کا فن خود کتنا بدنام ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ امام احمد بن حنبل کے اس مشہور قول سے ہو سکتا ہے۔ شلاقتہ لیس لہا اصل: التفسیر بعد الملاحم۔ والمغانی لہ

(۲) اسرائیلیات کی بھرمار۔ اور (۳) حذف اسناد: مہد صحابہ میں اسناد کے بارے میں کچھ زیادہ تشدد نہیں برتا جاتا تھا۔ البتہ حضرت عمر گواہ ضرور طلب کرتے تھے۔ لیکن مہد عثمانی کے فتنہ کے بعد اسناد کا مطالبہ سختی سے ہونے لگا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی صورتِ حال قائم

میں پناہ اس دور میں جو تفسیریں لکھی گئیں مثلاً تفسیر سفیان بن عیینہ اور تفسیر وکیع بن الجراح ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس عہد کے بعد جو مفسرین لکے انہوں نے عام طور پر اس اند کو خدشہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اس راہ سے بے شمار عملی افعال تفسیر بالماثور میں اس طرح داخل ہو گئے کہ صحیح اور غیر صحیح، ضعیف اور موزوع کا پہچانا سخت مشکل ہو گیا۔

جب تفسیر بالماثور حسن کارواج عہد صحابہ و تابعین میں تھا اس کی بے اعتباری کا یہ عالم ہے تو پھر اس کے علاوہ جو تفسیری رجحان اچریان کے لگے ہیں۔ ان کی روشنی میں جو تفسیری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کا پایہ اعتبار کس درجہ کا ہو سکتا ہے؟ وہ ظاہر ہے؛ چنانچہ احمد امین فخر الاسلام میں لکھتے ہیں۔ عہد صحابہ و تابعین کے بعد جو دور آیا اور اس میں جبر و قدر وغیرہ ایسے مباحث پیدا ہوئے تو تفسیر دل کا حال یہ ہو گیا کہ ہر مفسر جس عقیدہ و خیال کا پوتا تھا۔ وہ قرآن کی تفسیر اس کے ہی مطابق کرتا تھا۔ لہ احمد امین تو عہد جدید کے آدمی ہیں ان سے بہت پہلے ابن قتیہ نے تاویل مختلف الحدیث میں حکامین کے متعلق لکھا تھا۔ دفسر والقان باعجب تفسیر ویدو ان یردوا الی مذہبہم ویجعلوا الناس علی غلظہم مفتی محمد عبدہ لکھتے ہیں

تفسیر جو ہماری مطلوب ہے وہ دراصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کو اس طرح پر سمجھا جائے کہ وہ لوگوں کے لیے ان کی دنیوی اور اخروی دونوں زمینوں میں صلاح و سعادت کو باعث بنے پس قرآن کا یہی مقصد اعلیٰ ہے۔ باقی اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے وہ اس کے تابع ہے یا اس کے حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔^{۱۵} اس کے بعد کہتے ہیں۔

قرآن مجید ایک ترازو ہے جس میں ہر کو اپنے عقائد کے پیمانے اور ان کے وزن کے ساتھ

۱۵۔ فخر الاسلام ص ۲۶۔ تاویل مختلف الحدیث ص ۴۰۔ تفسیر المآثر ص ۱۵

تو نے چاہئیں۔ اگر ہم بغیر کسی تحفظات ذہنی و دماغی (Mental Reservations) کے قرآن میں تدبر اور غور و فکر کریں گے تو ہدایت یاب ہوں گے۔ ورنہ گمراہ ہو جائیں گے۔ اور اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ "القرآن حجتہ لک اور علیک" اور اسی وجہ سے اس کو "ہدٰی للمتقین" کہا گیا ہے یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ تفسیرِ قرآن سے متعلق تھا۔ اب حدیث کو لیجئے تو بعض روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ عہدِ صحابہ میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کی روایت اور نقل میں کچھ زیادہ محتاط نہیں تھے۔ اور یہ کوئی امر مستحکم نہیں تھا۔ کونکہ کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں فکرو نظر عمل و کردار اور اخلاق و شمائل کے اعتبار سے سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ اور حکم ہمیشہ اکثریت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ۔۔۔ بشیر العدوی نامی ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں آئے اور قال رسول اللہ کہہ کر روایت بیان کرنی شروع کی۔ لیکن حضرت ابن عباس نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ بشیر نے کہا: حضرت! میں آپ کے سامنے رسول اللہ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور آپ اسے سنتے تک نہیں ہیں۔ اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایک زمانہ تھا جب ہم سے کوئی شخص قال رسول اللہ کہتا تھا تو ہم اس کی طرف ہمت نہ کرتے تھے۔ لیکن جب سے لوگوں پر شائد اور فساد کا زلزلہ پڑا ہے ہم محتاط ہو گئے ہیں اور اب ہم صرف انہیں روایات کو قبول کرتے ہیں جنہیں ہم پہچانتے ہیں۔ اسی طرح سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں ایک تحریر پیش کی گئی جس میں حضرت علی کا کوئی فیصلہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اُسے دیکھا تو اس کے ایک حصہ کو منادیا۔ یہ صورت حال عہدِ صحابہ میں تھی۔ لیکن جب اسلام کا داروہ فحش و سخیلہا اور اب دوسری قوموں اور ملکوں کے لوگ جوق در جوق حلقہٴ جوشِ اسلام ہو کر مسلم معاشرہ میں گھل مل گئے تو اب بعض لوگوں نے اپنے خاص مقاصد کے پیش نظر دفعہ حدیث کو پناہ پیش بالیلہ یہ ہے۔ شبہہ لوگ تھے جو قرآن کے ارشاد و حلالہ و حلال الایمان فی ظہر و باطن صدق تھے۔ یا وہ مسلمان ہی اس لیے ہوتے تھے کہ اپنی رائیہ دہانی سے اسلام کی علیا رہیں۔

نہیں پیدا کریں۔ چنانچہ ابن عدی کا بیان ہے کہ عیب عبدالمکریم بن ابی العوجاء الوضلع کو قتل کرنے کی غرض سے گرفتار کیا گیا تو اس نے کہا کہ لقد وضعت فیکم اسباعہ الا ان حدیث احرم فیہا واطلالت یہ شخص مہم بن زائدہ کا مامول تھا۔ اور اس پر مانوی مذہب کی پیروی کا الزام تھا۔ یہ وضع حدیث کا فتنہ کس درجہ شدید تھا۔ اس کا اندازہ اس سے چلا سکتا ہے کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کی روایات یا فتنہ سچے لاکھ حدیثوں میں سے صرف سات ہزار حدیثوں کا انتخاب فرمایا جو ان کے نزدیک صحیح تھیں۔ اور ان سات ہزار حدیثوں میں بھی تین ہزار حدیثیں مکروہ ہیں اس وضع کے اسباب ایک دو نہیں بلکہ چند در چند تھے جو ارباب علم و تحقیق پر مخفی نہیں اور یہاں ان کو بیان کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ موقع۔ پھر جیسا کہ معلوم ہے بعض اوقات وضع حدیث کی غرض ترغیب یا ترہیب بھی ہوتی تھی۔ اور بعض حضرات اس کو ناجائز نہیں جانتے تھے۔ ان عام موضوع روایات کے علاوہ اسرائیلیات کے نام سے روایات کا ایک مستقل ذخیرہ تھا۔ جو عہدِ عباسی سے مستقل ہو کر عہدِ بعد چلا آ رہا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین کرام کی ایک جماعت نے تعہدِ محمد اللہ بالافراد و جمعة و بر و ہضجہم و وقت کے اس عظیم فتنہ کا بڑی جرأت و ہمت، طاقت و قوت اور باطنی نظر سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے اصول تئیں کیے۔ اسلئے اور رجال پر۔ کثرت سے کتابیں لکھیں اور حضرت اسحاق بن راہویہ کے بقول ان لوگوں تک کی روایات رد کو ان جن کی روحیں جنت میں سبز لباس میں ملبوس ہوں گی۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت عظیم کارنامہ ہے جس سے ان حضرات نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دیا۔ اسلام اور سلطان دولوں پر ان علماء کا یہ عظیم احسان ہے جسے خراوش کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ اس کی بے قدرتی کی جاسکتی ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ محدثین میں بھی سب بخاری اور مسلم نہیں تھے۔ اور آج حدیث کا عظیم وسیع ذخیرہ صرف صحیحین یا صحاح مشدہ یا صحاح امام مالک یا بخاری یا مسلم نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ صحیح ضعیف اور موضوع و مطعون کی تحقیق و تشخیص ضروری ہے لیکن ضعیف

دشمنیہ اور موضوع احادیث دینا سے نا پید نہیں ہوئیں۔ اور وہ ہمارے اسلامی لٹریچر کا
جز بن گئیں۔ اور تفسیر و حفظ و تدکیر۔ تذکرہ و تاریخ اور معرفت و تعارف کی کتابوں میں
علامہ کتب حدیث کے پھیلے ہوئے ہیں۔ فرقہ بندی جبک اشقی بھی دلیصیح کے مطابق انسان کو
ہر اس چیز سے استدلال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس سے اس فرقہ کے مروجات یا معتقدات
کی توثیق ہوتی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن جوزی اور ملا علی قاری نے جن روایات کو اپنے
تذکرہ الموضوعات میں شامل کیا ہے ان میں سے کتنی روایات ہیں جن کو مختلف فرقوں کے۔
حضرات علماء نے بطور دلیل استعمال کیا اور ان پر اپنے مسلک کی تعمیر کھڑی کی ہے۔ علامہ ازیں
کتنی ہی موضوع روایات ہیں۔ جو زبان زد وظائف بن گئی ہیں۔ اور اچھے اچھے ثقہ عالم اپنی
تحریروں اور تقریروں میں ان سے کام لیتے ہیں۔ روایات کا عموم و خصوص و شیوع و قوم کے مزاج اور
طبیعت پر شعوری یا نیم شعوری طور پر لازماً اثر انداز ہوتا ہے۔ اور مزاج اور طبیعت جب اثر
پذیر ہوتے ہیں تو مکرر ذہن اور نتیجہ عمل اور اخلاق کا متاثر ہونا ایک امر ناگزیر ہے۔ روایات
اگر صحیح درست اور مضبوط و توانا ہوں گی تو ان کا اثر بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر وہ سقیم۔ مجروح
کمزور اور ضعیف ہوں گی تو ان کا اثر بھی ناخوشگوار ہوگا۔

حدیث کے بعد اب فقہ پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوا کہ فقہ کے ماخذ بنیادی طور پر چار
ہیں۔ حدیث طوی نے تو وہ ہم لکھے ہیں۔ اور وہ ہیں۔ کتاب۔ سنت، اجماع اور قیاس اور ان
چاروں میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے کتاب یعنی قرآن میں عام خاص مطلق، مفید، مشترک
ظاہر۔ ضمنی، مفسر حکم، جملی، متشابہ و غیرہ الفاظ و عبارات کی قسمیں ہیں۔ اس بنا پر
ایک فقہ قرآن کے ایک مکتب کو عام سمجھتا ہے اور دوسرے کے ہاں وہ خاص ہے ایک کے نزدیک
ایک حکم مطلق ہے اور دوسرے خیال میں فقہ اگر علوی کے نزدیک عقیدہ ہی ہے تو پھر اختلاف اس
بات میں عقیدہ امتروزی ہے یا اتفاق اصل فقہ کی کتابیں بڑھ جاتی ہیں سب اس نوع کے اختلافات سے پر
ہیں۔ ان میں قرآن مجید کے کسی ایک مسئلہ یا کسی ایک عبارت کے معنی مفہوم اور صدق تین کے لئے مجتہد
کسی سنت سے کام لیتا ہے۔

کبھی اجتماع سے اور کبھی قیاس سے اسنت میں احادیث اور آثارِ صحابہ دونوں شامل ہیں۔ اور اتحاد کا اطلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال یا آپ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا اور اس پر آپ نے اظہارِ پسندیدگی یا ناپسندیدگی فرمایا۔ ان سب پر ہوتا ہے۔ اور ان سب میں جو تنوع ہے وہ حدیث کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ اگر صرف ایک ہی حدیث ہے اور اس کے معارض کوئی دوسری حدیث یا اثر نہیں ہے۔ تب بھی دو مجتہدوں میں اختلاف اس بات پر ہو سکتا ہے کہ ایک کے نزدیک حدیث میں حضور کا جو فعل یا قول بیان کیا گیا ہے وہ مطلق اور عام ہے اور دوسرے کے خیال میں مقید اور مبنی بر علت و مصلحت خاص ہے اس بنا پر تیراں کے کسی لفظ یا آیت کا مفہوم متعین کرنے میں جب سنت سے مدد لی جاتی ہے۔ تو اس میں بھی اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اب اجماع کو دیکھیے تو ظاہر ہے ہر جزی اور فردی مسائل میں اجماع نام تو مشکل سے ہو سکتا ہے۔ البتہ اجماع ناقص ہوگا مثلاً علمائے حجاز کسی ایک بات پر متفق ہوں گے اور علمائے عراق کسی اور پر۔ اور علمائے اور انہر کا اتفاق کسی اور چیز پر اور پھر ان میں سے ہر گروہ کے وجہ اتفاق اور مسئلہ کے دلائل و براہین الگ الگ ہوں گے۔ بہر حال اس صورت میں بھی اختلاف کا دروازہ کھلا ہوا رہا۔ اگرچہ یہ اختلاف قیوں اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ کے عالمگیر مذہب ہونے کی بنا پر ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ امام مالک بن انس کا مشہور واقعہ ہے کہ جب خلیفہ وقت (منصور یا ہارون رشید) نے ان سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ المدینہ و فتنہ الگبوی کو خانہ کعبہ میں آدیناں کر کے یہ اعلان کرنا چاہتا ہے۔ کہ تمام ممالک محروسہ اسلامیہ میں فقہ مالکی پر عمل کیا جائے تو امام عالی مقام نے خلیفہ کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ اور اس کی وجہ یہ قرار دی کہ ہم اہلِ حجاز ہیں۔ اور اس میں دوسری قوموں سے الگ تھلک ہیں لیکن علمائے عراق کا واسطہ ان ملکوں سے ہے جن میں القوام و ملل مختلف باہم دگر ٹلی جلی ہیں۔ اور اس بنا پر ہاں اس قسم کے جو مسائل اور معاملات پیدا ہو گئے ہیں ہم اہلِ حجاز ان سے نا آشنا ہیں۔ اس بنا پر وہ لوگ ہمارے فقہ پر عمل کرنے کے بجائے کسی طرح مجبور

کہ جاسکتے ہیں۔

اب آخر میں قیاس کو لیجیے جسے ہم رائے بھی کہہ سکتے ہیں۔ قیاس میں ایک مقیاس علیہ ہوتا ہے اور ایک وجہ قیاس۔ اس بنا پر اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل طور پر مذکور ہے جب ہم تحقیق مناط، تتبع مناط اور خروج مناط کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ زوجت پہنچتی چلی جاتی ہے موضوع گفتگو تک پہنچنے تک چلے آتے ہیں اور کسی ایک چیز پر سب کا متفق ہونا ناممکن ہو جاتا ہے مثلاً حارث کی حرمت ربو اسب کے سامنے ہے لیکن اس حرمت کی علت نہیں ہے۔ تقاضا یا تجانس اور یاد دوزں پھر یہ دونوں ہیں تو برسیل مافقت الحجج یا برسیل مافقتا لفظوں اس سلسلہ میں جو طول طویل بحثیں ہیں وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہیں۔

علاوہ بریں ایک مجتہد جب قیاس سے کام لیتا ہے تو اس کا قیاس صرف شرعی نہیں ہوتا۔ یعنی۔ لغویں اور نظائر شرعیہ تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ بر بنائے لغت و قواعد بھی ہوتا ہے مثلاً آیت عدت میں المطلقات اینتر بمعنی بالفلسفہ ثلاثہ تفرع جو فرمایا گیا ہے تو امام شافعی کے نزدیک تفرع سے مراد طہر ہے کیونکہ ثلاثہ جب منوث ہے تو اس کی تفسیر مذکر ہونی چاہیے۔ اس کے برخلاف ابو حنیفہ کے ہاں اس سے مراد حیض ہے کیونکہ عدت کا جو مقصد ہے یعنی استبراء رحم وہ اسی سے حاصل ہوتا ہے اور پھر ثلاثہ کا لفظ ایک عدد میں پر دلالت کرتا ہے اور طہر کی صمدت میں بسا اوقات پورے تین نہیں ہو سکتے۔ کم ہونگے یا زیادہ اسی طرح قیاس کبھی عقلی بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ مدت رضاعت میں یہ اختلاف کہ وہ دو برس ہے یا پڑھائی برس۔ یا تین برس ظاہر کرتا ہے یا مثلاً یہ بات کہ امام شافعی کے نزدیک نکاح مثلین کے ہے۔ اور امام اعظم کے ہاں ایسا نہیں ہے اس ایک نقطہ نظر میں اختلاف کے باعث کتنے مسائل اور احکام برزیہ مختلف ہوتے چلے گئے ہیں فقہ کی کتابوں میں ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ علاوہ ان میں مجتہد کے اجتہاد اور استنباط میں عرف و عادت و مصالح عامہ اور اہل و عورت و مکان کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر ایک مجتہد کسی ایک مقام پر ایک بات کہتا ہے اور جب وہ دوسری جگہ پہنچتا ہے تو پہلی بات سے رجوع کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب امام شافعی

جب عصر پہنچے تو اپنے متعدد فیصلوں سے رجوع کیا اور کبھی ایک ہی مقام پر رہتے ہوئے اپنے سابعہ تنفیلاً کو واپس لے لیتا ہے چنانچہ متعدد مسائل ہیں جن سے امام اعظم ابوحنیفہ کا رجوع ثابت ہے یہ حال فقہ کے ان ماخذ اربعہ کے چند و چند وجوہ درایا ہیں جن کے باعث مکاتب فقہ چند و چند ہو گئے ہیں مورخین علماء نے ان کی تعداد انیس میں بتائی ہے جن میں سے چار مکاتب کو فروغ ملا اور قبل عام کی سند نے انہیں مشہور کر دیا۔ باقی جو تھے وہ دستبرد زمانہ کا شکار ہو گئے۔ اگر آج وہ بھی ہوتے تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ استنباط و استخراج احکام اور اجتہاد کی راہیں کس حد تک وسیع ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک اصول دین ارکان اسلام اور شریعت کی اساسی تعلیمات کا تعلق ہے اختلافات ان میں نہیں ہوا بلکہ فروعی اور جزئی مسائل میں اور بعض بنیادی تعلیمات سے متعلق اصولی تشریح و توضیح میں ہو گا گویا تشبیہ کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن و حدیث دونوں کی حیثیت ایک متن کی تھی۔ اور حکمین و محدثین اور فقہاء کی بحث و تمحیص کی حیثیت شرح و توضیح کی تھی۔ قرآن اہل اہل کے مسالوں نے ان اختلافات کو اسی درجہ میں رکھا اور اس بنا پر ان میں وہ تخریب اور تشیع پیدا نہیں ہوا جو فکری اور علمی طور پر ان کو اسلام کی اصل تعلیمات اور قرآن و حدیث کے بنیادی تھاغصا اور مطالبات سے نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر انحراف پر مجبور کر دے۔ لیکن زمانہ کے امتداد کے ساتھ اختلاف خلافت و نزاع کی شکل اختیار کرتے رہے۔ اور آخر لوہب بانیارسید کہ یہ اختلافات ہی اصل دین بن گئے۔ یعنی قرآن و حدیث کا درجہ اب بھی ہوتا ہے۔ اور انہیں کو سرچشمہ اسلام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہر فرد کو خواہ وہ کلامی ہو یا فقہی پورا قرآن اور سارا ذخیرہ حدیث اسی کے معتقدات و موعومات سے بھر چکا نظر آتے تھے۔

اقبال نے امت موجودہ کے اسی مرض کو روایات میں کھوجنے کے بغیر کیلئے ظاہر ہے یہ روایات صحیح یا غیر صحیح وقت اور حالات کی پیداوار ہو سکتے ہیں یا صرف کلامی حقیقتیں اسی نے ان میں ابدیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور ان سے ٹکروں کو وہ نہ سمجھا کرتے تھے جو قرآن و سنت کا اولین مقصد تھا۔ جب ٹکروں کو اس روشنی سے محروم ہو جائے تو پھر اہل انسانی اور احکام و

کردار کی بندی کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اقبال نے اس خاصہ فکر و نظر کا ماتم اس طرح کیا ہے

دل سوز سے غالی ہے نظر پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

ایک اور نظم میں اقبال نے ملت مرجمہ کو یاد دلایا۔

آتی ہے دم صبح صد اعوشش بریں کھو گیا کس طرح ترا جو ہر اور اک

کس طرح ہو اکند ترانہ تر تحقیق ہوتے نہیں کیوں تجھ سے تامل کھو گیا

اور سب سے آخر میں ان تمام ہی سامانیوں اور کوتاہ دستیوں کا سبب بیان کرتے ہیں۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ منیری اسے قیدی سلطانی و ملانی و پیری

ذرا غور نہ مائیے! آخر اس کا کیا سبب ہے کہ قرآن میں خبر و قدر کی جو آیات ہیں وہ صحابہ

کرام بھی پڑھتے تھے لیکن کبھی ان میں انتشار خیال پیدا نہیں ہوا اور اس بنا پر ان کے عملی جوش

و خروش اور دلولہ جہد و جد پر اداسی طاری نہیں ہوتی۔ لیکن ہم ہیں کہ ہر قسم کی جدوجہد سے

منہ موڑ کر تنہا بقدر اور قیمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

بھی کرتے اور مانگتے تھے لیکن اس طرح کہ عرصہ بدر میں عین اسی وقت جب کہ معرکہ کھارنہ لگ رہا ہے

سر مبارک بارگاہِ خداوندی میں جھکا ہوا ہے۔ اور آپ مصروفِ دعا ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ہماری

زندگی کے سارے کاروبار کا انحصار دعاؤں، خوابوں، توفیق گنڈوں، نذر و نیاز ختم بخاری اور

توہتِ نازلہ پر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور پھر بھی یہ مرض برحقار ہا جوں جوں دوا کی کا عالم ہے آخر

اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے قرآن مجید میں انسان کے لیے تسخیر کائنات کی آیات پر مبنی

قوانین نے علوم و فنون کفرانے کھنگال لیے لیکن ہم کو چاند پر انسان کے پیچھے کی خبر ملتی ہے

نرم و متوسل اور سراپا سے ہوا جاتے ہیں۔ اس کی توجیہ کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام کا اس کے دور و وقت

میں سابقہ دنیا کی بڑی بڑی ایجادوں اور تقاضوں سے بڑا لیکن کس اس کی گردن خم نہیں ہوئی۔

اصلاح تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے نقطہ و طریق نے اسے مرعوب اور غافل نہ بنایا ہے۔

اس کو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نقطہ ذہن اور خیالات، معاشیات اور تہذیب و تمدن

کے سیکڑوں ہزاروں نے مسائل و معاملات آئے۔ انہوں نے سب کا جراتمند مقابلہ کیا اور ان کا حل بتایا۔ لیکن ہم ہیں کہ آج ہر نئی چیز پر دھشت ہوتی ہے۔ اور آج تک ہم رویت ہلال شخصی قوانین میں جزوی ترمیم و تفسیر، بینک انٹرنسٹ اور انٹورنس وغیرہ جیسے مسائل کا حل تلاش نہیں کر سکے۔ غور کیجیے تہی سامانی اور کوتاہ دستی کے ان حسرت ناک مناظر و مشاہد کا دواحد سبب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہم اسلام یعنی تشران مجید، حدیث اور فقہ کا درس و مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر فرقہ دارانہ ذہن کے ساتھ اور روایات و معتقدات کے حصار میں بند ہو کر۔ یہ طالعہ غیر معروضی ہے۔ ضرورت ہے کہ اب اسلام کا مطالعہ معروضی طور پر کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مطالعہ کا کیا طریقہ ہے۔ اور یہ کس طرح ہونا چاہیے؟۔ گزارش یہ ہے کہ ایک شخص جب تیر اندازی کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ شبست باندھتا ہے۔ نشانہ سیدھا کرتا ہے۔ ذر نہ کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ کیسے تیر انداز ہو سیدھا کر لو تو تیر کو یہ اس بنا پر ہمیں سب سے پہلے اپنا نقطہ نظر (Approach) درست کرنا ہو گا۔ اور ہمیں یہ تسلیم کر کے کہ دین کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی حیات میں ہی ہو گئی تھی یہ تصور کرنا ہو گا کہ گویا ہم خود حضور کے عہد میں موجود ہیں۔ یا یہ کہ حضور خود ہمارے عہد میں تشریف فرما ہیں۔ اور قرآن کا نزول ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ بازی نہ صاحب کشاف

تو اس سے مراد یہ ہے۔ اس طرح ذہن کو ہر قسم کی کلاسی، فقہی یا صوفیانہ سمجھت سے پاک و صاف کر کے اور براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ و استفادہ کا انداز (Attitude) اختیار کر کے ہم کو قرآن، حدیث و فقہ کا درس و مطالعہ کس نئے پرکنا چاہیے؟۔ لے۔ غیب خدا کا انسان چاند پر ابھی آباد کیا بساے کا لام شروع کرے اور اسے ہم آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے سلمیٰ سے نہیں کہنے کہ ایک شہر کا رویت کس شہر کا خبر ہوگی اور نیزہ کی لکڑی کی جگہ سے ہم کو کھانا ملے گا۔ یا! ایک ہم ہیں کہ ہمارے اچھے بڑیاں کو بس ایک وہی کر نہیں چاہے کہ وہی ہوں گے۔

اب ہم منبردار اس کو بیان کرتے ہیں۔ قرآن کے لیے حسب ذیل چیزیں ضروری ہیں۔
 ۱۔ اس سلسلہ میں سب سے مقدم اور ضروری عربیت کا صحیح اور اصلی ذوق ہے جس کے باعث قرآن کے پڑھنے
 میں کم از کم وہ لطف اور مزہ آئے جو ایک صاحب ذوقی لطیف کو اپنی مادری
 زبان کے کسی بہترین ادبی شاہکار کے مطالعے میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علمی اقوام نے اسلام کی
 نقیض و تالیف کی راہ سے جو خدمت کی ہے وہ عربوں نے بھی نہیں کی، ممکن ہے یہ صحیح ہو
 تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عجمیوں نے اسلام کو نقصان بھی بہت عظیم اور ناقابلِ تلافی پہنچایا
 ہے چنانچہ لغت اور بھانت بھانت کے فرقے اور ان کی بولیاں بڑی حد تک علم کی پید اور میں
 اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے عربی میں لکھنا پڑھنا سیکھا لیکن عربیت فقہ کا مذاق پیدا نہ ہوا۔
 ۲۔ قرآن کے الفاظ مفرہ کے اصل حقائق اور معانی کا فہم و ادراک؛ کسی مکہ تہذیب و تمدن میں
 ترقی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ تغیر و تبدل
 ہے جس سے ہمارے زمانہ کا ایک بالکل نیا علم (SEMANTIC STUDY OF WORDS) یا Science of meaning
 یا Meaning of The meaning بحث کرتا ہے قرآن
 کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ نزول قرآن کے وقت اس لفظ کا معنی و مفہوم کیا تھا
 ۳۔ اسباب نزول متہرآن اور قرآن کے اسالیب بیان سے حتی المقدور واقفیت؛ اس لئے
 کہ علم الاطراب اور علم الاسالیب یعنی المعانی والبیان میں بصیرت و مہارت۔
 ۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت کا علم
 ۵۔ عرب قبل اسلام اور عہد نبوی کی تہذیبی، تمدنی اور مذہبی تاریخ کا علم؛ حضرت عمرؓ سے ایک
 روایت ہے کہ اسلام میں جیسے کبھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو جاہلیہ سے واقف نہیں ہوں گے
 تو وہ اسلام کا شیرازہ منتشر کر دیں گے لہٰذا اس کی تائید میں متنبی کا مشہور مصرعہ
 وضدھا تبیین الاشیاء بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

۱۔ علم احوال بشر: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انسان کی پوری سرگذشت بیان کی ہے کہ وہ کس طرح پیدا ہوا، اور اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہدایت و ضلالت کے کتنے مرحلوں سے گزرے ہیں اس کی مزاج اور طبیعت میں کیا کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے، اور اس پوری مدت میں سنت الہیہ کیا رہی ہے۔

۲۔ مطالعہ قرآن کے دقت و مانع کو علم کلام اور فقہ کی جزئی تفصیلات و تشریحات سے بالکل فارغ رکھا جائے۔

اس طرح کے مطالعے کی اگر مثال یا کوئی نمونہ درکار ہو تو ہم عصر جدید میں مصر کے مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور ہندوستان کے مولانا عبد الحمید الفراجی اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفاسیر کا نام لے سکتے ہیں۔

اب حدیث کو لیجئے، اس کے لیے اہم ذیل کی رعایت ضروری ہے۔

۱۔ قرآن مجید کا ایک حصہ محکمات پر مشتمل ہے اور ایک حصہ متشابہات پر۔ اب جو احادیث محکمات قرآنی کے لیے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہیں، اور جو ہر اہل بیت کے تعالیٰ نے ان کو سند قبول بھی عطا کی ہے۔ وہ ہمارے نزدیک احادیث متواترہ کے حکم میں ہیں اور اس بنا پر وہ قطعی الثبوت قطعی الدلائل اور واجب العمل ہیں۔

۲۔ احادیث کا مطالعہ کرتے وقت اسناد اور متن کی جرح و تعدیل اور ان کی تحقیق و تنقید کے لیے علمائے جو اصول وضع کیے ہیں ان پر سختی سے عمل کیا جائے اور اس میں کسی کے ساتھ کوئی رد رعایت نہ برتی جائے۔

۳۔ مدارس عربیہ میں کتب حدیث کے درس کا اہتمام تو بہت ہوتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ کتب حرج و تعدیل، اصول حدیث اور تاریخ تدوین و ترتیب حدیث اور محدثین کے حالات و سوانح اور ان کے نظام و مرتبہ کے ساتھ بھی خاطر خواہ اعتنا کیا جائے۔

۴۔ اور سب سے آخر میں مگر سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ مزاج و طبیعت نبوی سے

آشنا ہونے کی کوشش کی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک امر کے بائبل ایک حکم ارشاد فرمایا۔ اور اسی کے متعلق کسی دوسرے موقع پر کوئی اور حکم دیا اس سلسلہ میں مزاج نبوی سے آشنا ہونے کے بعد ہم ان قدروں کا سراغ لگا سکیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ہیں۔ اور جن کے باعث حکم مختلف ہو گیا ہے۔ اسی طرح ہم دو مختلف حدیثوں میں مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان قدروں کی بنیاد پر جدید احکام بھی مستنبط کیے جاسکتے ہیں۔

اب رہا فقہ تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کی حیثیت ایک دستور constitution جیسی ہے اور احادیث جو احکام سے متعلق ہیں ان کی حیثیت اس دستور پر یعنی Laws کی اور اس کے بعد مختلف مکاتب فقہ میں جو کچھ ہے اس کی حیثیت BY Laws کی ہے جو کسی جماعت یا گروہ یا کسی خاص قسم کے احوال و ظروف زمانی و مکانی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یا ان کی حیثیت PRECEDENTS یعنی نظائر کی ہے۔ اس بنا پر کسی ایک خاص مکتب فقہ کا اس طرح پابند ہونا کہ کسی حالت میں بھی اس سے ملل نہ کیا جائے نہ شرعاً ضروری ہے اور نہ دنیا کے موجودہ حالات میں مناسب اور قابل عمل ہے۔ علاوہ ازیں فقہ کے وسیع و عریض ذخیرہ اور اصول فقہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ جن اصول و مناشی فقہ کی بنیاد پر فقہائے کرام نے احکام مستنبط کیے تھے ان کی روشنی میں ہم بھی جدید مسائل کے لیے احکام مستنبط کر سکیں یا جدید حالات میں ان پر ان احکام میں ہی حسب ضرورت و مصلحت کوئی مناسب ترمیم و تنسیخ کر سکیں۔ بشرطیکہ یہ احکام اپنی قانونی نوعیت و بنیت کے اعتبار سے اس کی گنجائش رکھتے ہوں۔

ابن خلدون نے "المقدمہ" ص ۳۷۵، لکھتے ہیں کہ مغرب اور اندلس کے لوگ ہجرت

کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اس حضارت سے سائنس و فنون کے سوا کوئی اور شغل نہ تھا۔ اس بنا پر وہ علماء و مجاز کی طرف زیادہ مائل اور مائل تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے مذہب

ماہی کو اختیار کر لیا تھا۔ ابن خلدون کے اس قول سے ظاہر ہے کہ کسی ملک میں کسی ایک خاص مذہب فقہ کے قبول و رواج میں دخل اس ملک کے تہذیبی و تمدنی حالات کا بھی ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے اس قول سے اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ اگر تاریخ کے کسی دور میں دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کو ایسے جدید تہذیبی و تمدنی حالات سے سابقہ پڑے جو فقہائے سلف کے عہد میں کہیں بھی موجود نہیں تھے۔ تو اس صورت میں علما کے لیے اس امر کی اجازت ہوگی کہ وہ فقہائے متقدمین کے اصول استنباط کی روشنی میں جدید احکام وضع کریں تاکہ الدین فیسخر کی نعمت و نذرت سے یہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں

پھر حال اس مقصد کے پیش نظر ضروری ہے کہ مدارس عربیہ کے نصاب فقہ میں کسی ایک امام کا ہی نہیں بلکہ ائمہ اربعہ کا فقہ بھی اونچی جماعتوں میں پڑھایا جائے۔ اور جو تلامذہ پیش کی گئی ہیں اگر ان پر عمل کیا گیا تو اس طرح ہم سلام کا معروضی مطالعہ کر سکیں گے اور اس سے خود ہم کو فائدہ پہونچے گا اور دوسروں کو فائدہ پہونچا سکیں گے۔

نمبر ۱۔ ادارہ مذوق المصنفین کے زیادہ سے زیادہ ممبر بننے آپ کو اس شرط خصوصی توجہ دلائی جاتی ہے۔

نمبر ۲۔ اور برہان ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کے خریدار بننے سالانہ چندہ ۱۰/۱

نوٹ :-

مدت خریداری و مدت ممبری ختم ہوتے ہی رقم کا مخی آرڈر بھیج دیا کریں۔ اور یہ تاکید ہے کہ مخی آرڈر کو بن پر اپنا پورا پستہ لکھا کریں۔ یہ نہایت ضروری ہے

پیر پادشاہ حسینی

ڈاکٹر نذر السعید اختر

۱۰۳۳ھ تا ۱۴۳۳ھ

”حیات و کلام“

ڈاکٹر سیّد جعفر نے دکن کو بجا طور پر اُجالوں کے شہر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ شمیم نقّوٹ کی نگار یوں سے مرغزارِ دکن ایک عرصے تک آئینہ معرفت بنا رہا۔ نقّوٹ کے سرمدی نغمے دکن کی داد یوں میں ابرِ رحمت کی طرح گلگشت کرتے رہے۔ ذاتِ بات، بھید بھاؤ اور مذہبی امتیاز و تفاوت کو دور کرنے کا بیڑہ یہاں کے صوفی شعرا نے اٹھایا تھا۔ اُن کا دوسرا لاکھ عمل یہ تھا کہ اسلام کی توسیع و اشاعت کی جائے۔ پیر پادشاہ حسینی بھی صوفیوں کے اسی زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاہ تراب علی ترابِ حِشتی مریدِ پیر پادشاہ حسینی نے اپنی تمام تصانیف میں کہیں نہ کہیں اپنے پیر و مرشد کا ذکر کیا ہے۔ شاہ ترابِ حِشتی نے ”گیان سرود“ جو ترجیع بند کی شکل میں۔ ۱۵۵۸ء بندوں پر مشتمل ہے پیر پادشاہ حسینی کی قریف و توصیف میں کہی ہے۔ اپنی طویل نظموں کے علاوہ محقر نظموں، قصائد اور غزلوں میں بھی ان کی مدح سرائی موجود ہے۔

سناوٹ مرزا صاحب نے ۱۹۶۰ء میں ”دلیوان سید شاہ حسینی کے زیر عنوان“ سہ ماہی ”ادبِ ادب“ میں ایک مضمون شہرِ قلم کیا تھا۔ یہ مضمون دراصل پیر پادشاہ حسینی سے متعلق ہے۔ اہل مضمون میں پیر پادشاہ حسینی کے محقر دلیوان کے تعارف کے علاوہ ان کے عہد اور سوانح پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سناوٹ مرزا صاحب کے بیان کے مطابق پیر پادشاہ حسینی ۱۵۷۳ء میں

محمد عادل شاہ میں بیجا پور میں پیدا ہوئے تھے۔ شاہ تراب چشتی نے "ظہورِ سکتی" اور "گلزارِ وحدت" میں پیر پادشاہ حسین کا خاندانی شعبہ پیش کیا ہے۔ ان دونوں شجروں کا حوالہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے شاہ تراب کی نظم "من سمحاون" کے مقدمے میں صفحہ نمبر ۳۴، اور ۳۵ پر دیا ہے شاہ تراب کی ایک نودریافت نظم "چہار پیر دچودہ خالوادہ" میں بھی پیر صاحب کا شعبہ موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اون کے لختِ جگر نورِ بھر	شاہ بُرہان بادی رہبر
اون کے فرزند جانشینِ دلی	شاہ شامان امین الدین علی
اون کے فرزند نورِ عینی ہے	حضرت بابا شاہ حسین
اون کے فرزند جانشینِ حق	ہیں علی پیر بادی مطلق !
اون کے فرزند جانشینِ ہزار	پیر پادشاہ مرشدِ ممتاز
جس کا فیضِ کلام ہے مشہور	بادی خاص دعا ہے مشہور

شاہ تراب چشتی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام میں پیر پادشاہ حسین سے متعلق کئی توصیفی اشعار موجود ہیں جو اس امر کے غماز ہیں کہ پیر صاحب کو رمل، نجوم، منطق، فلسفہ، تقوٰت اور حکمت پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ انھیں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اہل ہندو کے مذہبی عقائد اور فلسفے پر بھی دستگاہ حاصل تھی۔ اس امر کی تائید شاہ تراب کے اس بند سے ہوتی ہے :

ارے سنگھ دیلپ بتائے	ہور ایگلا پنکلا دیھلائے
ہور اوپتتی سب سمجھائے	او موکشو تو م کی رہ پائے
ہاں گرما کر دے، سکھائے	دیودت دھنغیہ بسرائے
چہرِ حسینِ پیارا ہے	اے تراب اوس بلھارا ہے

۱۔ چہار پیر دچودہ خالوادہ، ارشدہ تراب چشتی نقل ملوک محزون، نگار شعر نمبر ۴۴ تا ۵۵

یہ امر مسلم ہے کہ پیر پادشاہ حسینی ۱۱۱۵ھ تک بقید حیات تھے۔ کیونکہ اسی سن میں انھوں نے شاہ تراب چشتی کو خرقہ خلافت سے سرفراز کیا تھا۔ یہاں ایک امر کی وضاحت بھی ضروری ہے ڈاکٹر مسیدہ جعفر نے "پنجبدہ" سے مراد پچاس سال ہی ہے۔ حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ معنون نگار نے پنجبدہ دیکھ صد ہزار سے مراد ۱۱۱۵ھ لی ہے جو زیادہ صحیح ہے۔

اودلی عصر مُرشد نامدار

درس پنجبدہ دیکھ صد ہزار

روز جمعہ ماہ رجب وقت شام

دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام

د ظہور گئی: شاہ تراب باب نمبر ۱۹،

اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور موفیانہ طرز زندگی کا جو مشن
میران جی شمس العشاق نے شروع کیا تھا پیر پادشاہ حسینی نے

پیر پادشاہ حسینی اور
شاہ تراب چشتی

اسی مشعل سے اپنے مریدین کی رہبری کی۔ انھیں دیگر مقامات کی طرف روانہ کیا تاکہ ان کے
پیغامات کی توسیع ہو سکے۔ اسی قسم کا حکم انہوں نے شاہ تراب چشتی کو بھی دیا تھا۔ شاہ تراب
نے اپنے مُرشد کے حکم کو شعری جامہ اس طرح پہنایا ہے کہ

جو تیری خدمت کرے گا استوار

اور رہے گا تا قیامت استوار

جا کے کرنا ملک میں ہو تکیہ نشین

محرم راز امیر المومنین !

جس سے توں راضی خدا راضی ہے

توں نہیں راضی توں اوجہ راضی ہے (ظہور گئی: شاہ تراب چشتی)

لے من سجادون مرتبہ ڈاکٹر مسیدہ جعفر ص: ۱۹

اُپنشد کی تعلیم کے مطابق، مگر وہ یعنی پیر و مرشد کی ہستی خدا کے مترادف ہے اور مقلد
قلب کے لیے انتہائی ضروری سمجھی گئی ہے۔ شاہ تراب بھی ہیں بھی اسی قسم کا آثار موجود ہے۔ مثنوی
گلزارِ وحدت میں شاہ تراب کے مندرجہ ذیل اشعار قابلِ غور ہیں۔

خدا ہے پور محمد پور علی ہے کریں سب اس کو سجدہ پیر پور امیر

اتھا حضرت علی کا نور دیدہ اور حضرت پیر پادشاہ حق رسیدہ

تراب نقش پائے آں دلی ہے کہ جس کا جسد امین الدین علی ہے

شاہ تراب چشتی اپنے پیر و مرشد کی محبت میں حد درجہ سرشار تھے۔ انہوں نے پیر

پادشاہ چشتی کو "ثانی حیدر"، "حسینی پیر" کے القاب سے بھی یاد کیا۔ انھیں "ثانی امین الدین

علی" اور "دلی خدا" تصور کیا۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ جو بھی "شہید ناز" صاحبِ حق میں سرشارِ راہِ معرفت

کی تلاش و جستجو میں پیر پادشاہ حسینی کے پاس پہنچا، اُسے انہوں نے دصالِ یار سے مشرک کیا

شہید ناز جو اس پاس آیا دصالِ یار دے اس کو جلایا

یگانِ سرور پ" میں شاہ تراب چشتی نے پیر پادشاہ حسینی کی ذات کو گلِ ترے تشبیہ

دی ہے۔ جس کی عرفانی مہک سے شاہ تراب کا گلشنِ ہستی مسور ہو گیا تھا۔ شاہ تراب کے ان

اشعار سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ پیر پادشاہ حسینی اپنے وقت کے جید عالم اور صوفی کامل تھے

ان کی شہرت گلی گلی اور کوچے کوچے تک پہنچی ہوئی تھی۔

پیر پادشاہ صاحبِ بڑے دلی ہے داداجن کا امین علی

جیوں خوشبو پھول کی کھل کھل یوں مشہور ہے اد گلی گلی

۱۔ گلزارِ وحدت: از شاہ تراب چشتی، مرتبہ معنون نگار

۲۔ یگانِ سرور پ: از شاہ تراب مرتبہ معنون نگار، بند بئر ۴

تھل اور تھل کی تمام باریکیوں سے پیر بادشاہ حسینی نے اپنے خاص الخاص مرید شاہ تراب کو پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ تراب کے 'من کو حسینی پیا' بھاگیا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

پیر پاشا صاحب اولیاء
میں ان سے حال اور قال لیا
اودامی اپنا کرم کیا!
من بھایا میر سے دہی پیا
میں درشن کا جو شراب پیا
تن من کا جھگڑا مچکا دیا

جو پیر حسینی پیا رہا ہے
اے تراب اوس بلجا رہا ہے

شاہ تراب جستی کی فارسی شکر کا اقتباس مضمون نگار کو حال ہی میں دستیاب ہوا ہے
یہ اقتباس کئی اعتبار سے غور طلب ہے ملاحظہ ہو۔

روزے مرشد حقیقی کعبہ تحقیق حضرت پیر بادشاہ حسینی قدس اللہ سرہ العزیز
در باغِ آشتی جلوسِ رقص فرمودند و ہمہ خلفا و مریدان در مجلس حاضر بودند
دریں حالت میاں — صاحب پس منعرف گنج بخش
سوال نمودہ کہ یا مرشد نا اصل حضرت خمس
چہ چیز است، ان قبلہ برحق کعبہ مطلق
اس غلام می فرمودند کہ اے گنج الاسرار

۷۔ عیان سرود پادشاہ تراب مرتبہ مضمون نگار ریند نمبر ۴۹

جواب پسر منصرف گنج بخش دریاب
 و حضرت خمس بگو غلام بموجب حکم
 سجد با سجا آورده و گفت میالضاح
 اگر عالم غیب می پرسی این بیت کافی است
 در گوش تو محمد است از آن دانستم
 که بنا گوش تر بوسه زور آب نشد

اگر حقیقت عالم شهادت خواہی
 کہ شمع تیغ و شرہ خنجر و نگہ الماس شہادت ارطبی دشت کردار عبادات
 و اگر عالم ارواح بگویم این بیت کافی است
 چه گویم و صف آن زمینہ بینی اگر بینی دگر خود را نہ بینی
 و در حقیقت عالم مثال این حال شاید قال است
 سرشتیہ خضر است دہانیکہ توداری ماہی است در آن چشمہ زبانیکہ توداری
 و در مرتبہ عالم اجسام این اشارہ بس است
 حیث باشد در وفا کم بودن از رنگا چنا عمر آن بہتر کہ دریائے نگار آخر شود
 باز حضرت پیر و مرشد این غلام ہمہ (۶) آفرین و تحسین فرمودند و ارشاد کردند
 در نیاید عالی پختہ بیچ عام پس سخن کوتاه باید و السلام یعنی
 مرتبہ جامع کہ انسان کامل است منظر آسمان الہی کلی است چنانچہ پیر و مرشد حق
 میفرمایند

مراتب ہفتین انسانی است مرذات منظر رحمانی است فہما سن فہم تل

سند ولادت اور وفات :-

سماوت مرزا صاحب پیر یا دشاہ حسینی کی تاریخ ولادت سے متعلق رقمطراز ہیں کہ :-
بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب بیجا پور میں سلطان علی عادل شاہ
ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری عہد میں پیدا ہوئے۔ مثلاً فرماتے ہیں :-

جب سوں کہلے تہ تجھ پو فضل علی

تب سوں پایا حسینی اوطان کوں

اوطان وطن کی جگہ ہے۔ اس سے مراد مدد و معاش، عطیات، سلطانی اور یہ لفظ اب

بھی انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور محکمہ مالگزاری حیدر آباد کی تو مشہور عام اصطلاح
ہے۔ دوسرے شعر میں علی عادل شاہ ثانی کی شاعری کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

ہوا تھا شوق محبوں طبع تیری آزمائے کا

نہیں ثانی ترا جگہ میں تو نادیدہ زمائے کا

چنانچہ علی عادل شاہ ثانی "استاد عالم" کے نام سے مشہور تھا۔ اور دکنی شعرا کے

کلام کو سننا اور اصطلاح بھی دیتا تھا۔ دوسری جگہ حسینی فرماتے ہیں :-

تجہ پو حسینی فضل علی کا ہوا اتال

تب تو کھیا ہے دل سوں فی الفور پو سخن

بندہ صادق علی نے فضل سوں اپنے

حسینی کو دیا ہے علم مخفی حسنائے کا

• آخر الذکر میں علی سے مراد ان کے والد ماجد حضرت علی پیر ہیں۔

سماوت مرزا صاحب نے اپنی تحقیق کے بموجب پیر یا دشاہ حسینی کی تاریخ ولادت ۱۷۷۲ء

متین تھی ہے۔ شاہ ترابِ حشمتی کی تصانیف سے خصوصاً جگزارِ وحدت کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ پیرِ پادشاہِ حسینی ۱۱۷۲ھ تک بقیدِ حیات تھے۔ یہ نظم بھی اسی سنہ میں مکمل ہوئی۔ لہذا اسنادِ مرزا صاحب کی قیاس آرائی بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اب۔ بل پیرِ پادشاہِ حسینی کے سنہ وفات کا سوال! اس سلسلہ میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ پیرِ پادشاہِ حسینی نے طویلِ عمریائی تھی، وہ یقیناً ۱۱۷۲ھ تک زندہ رہے اور اسی سنہ کے۔ اس پاس انہوں نے اس جہانِ خانی کو لبیک کہا۔ شاہ ترابِ حشمتی نے نظمِ گمانِ سروپ میں پیرِ پادشاہِ حسینی سے عالمِ خواب میں رہبری حاصل کی ہے جو اس بات کی بینِ دلیل ہے کہ اُس وقت پیرِ پادشاہِ حسینی دصالِ پانچے تھے۔ درنہ شاہ تراب اپنے پیر و مرشد سے متعلق اس طرح کیوں کر ایسے نظمِ گمانِ سروپ کے سنہ تصنیف کی تحقیق نہ ہو سکی ورنہ اس مسئلے کی عقدہ کشائی میں ہیں ایک ٹھوس ثبوت فراہم ہو جاتا۔ شاہ تراب کا بند ملاحظہ کیجئے۔

میں پسے میں تھا تمام رات پیرِ پادشاہ صاحب پکڑے کلمات
کہ ہتھیارِ کج کون کہلے بات جو ہمسکرت کو بنا نکالت
سب عارف پاویں ذاتِ تنہا اور قائم دائم میرے سات

جہ پیرِ حسینی پیارا ہے
اے تراب اس باہارا ہے

بحیثیت شاعر:- ڈاکٹر سیدہ جعفر من سجادین کہ مقدمے میں پیرِ پادشاہِ حسینی کی شاعرانہ عظمت پر اس طرح اظہارِ خیال فرماتی ہیں:-
”پیرِ پادشاہِ حسینی اپنے زمانے کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کا بیان

دیوان حسینی کے نام سے ایسٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے ان کی قادر الکلامی اور ان کی شعری صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی غزلیں، سراج اور نگار، آمادی، وکی، عاجز اور یقین کی یاد دلاتی ہیں۔ پیر بادشاہ حسینی کی غزلوں میں بڑی سلاست، روانی، گھلاوٹ، تنگنکی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ۱

پیر بادشاہ حسینی کی شاعری سے متعلق سخاوت مرزا کی یہ رائے ہے کہ: حسینی ایک دکھن شاعر تھے، ان کے کلام میں کیفیت نمایاں ہے۔ اور یہ دہری زبان ہے جو سراج اور نگار آبادی اور عارف الدین خاں عاجز کی ہے۔ کلام میں سوز و گداز ہے اور تقویت غالب ہے۔ بعض عاشقانہ اشعار غزل کی مایا پر اور غزل تیر و فشر ہیں۔ مثلاً

نہیں دنیا لہ چشم پر دیر رہے لوٹ کر کاٹنا حکم میں ۲

در اصل پیر بادشاہ حسینی کی غزلیں تقویت کی چاشنی سے بھر پور ہیں۔ انہوں نے غزل کے روایتی انداز کو برسرِ آر رکھا۔ ان کے یہاں فارسی اور سنسکرت کی دقیق ترکیب کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ البتہ عربی آیات اور احادیث کے جا بجا اشارے موجود ہیں۔ پیر بادشاہ حسینی کا کلام ان خصوصیات کا اس لیے حامل ہے کہ انہوں نے اپنے صوفی باطنیت دادا اور صوفی صافی والد کے ہاتھوں تقایم و تربیت پائی تھی، علوم ظاہری اور باطنی میں انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے براہِ راست کسبِ علم کیا تھا۔ اور وہ ان کے مرید و خلیفہ بھی تھے۔

دستیاب کلام کی فہرست

دیوان پیر بادشاہ حسینی تین خطوطِ حین کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

۱۔ دیوان حسینی محلو کہ ایسٹ لائبریری حیدرآباد۔ یہ دیوان خطِ نسخ میں لکھا ہوا

۱۔ منجد دیوان پیر بادشاہ حسینی، مرتبہ سیدہ جینز، ص ۲۷

۲۔ دیوان پیر بادشاہ حسینی، دیوانِ ادب کو حیدرآباد، ص ۲۸

ہے یہ نسخہ ناقص الاخر ہے۔ اور اس کا غزل دی ہے۔ مرتب فہرست نے اس کا نسخہ تصنیف مابعد ۵۵۵ھ لکھا ہے۔ اس دیوان میں قدیم اردو میں ۶۴۴ اور فارسی میں چار غزلیں ہیں۔ قدیم اردو کی ۲۵ رباعی غزل کا صرف ایک مطلع درج ہے۔ اس پر ابتدائی عبارت یہ ہے۔

حسینی بادشاہ ابن برہان الدین شاہ بن علی پیر بن پادشاہ حسینی ابن امین
الدین علی بیجا پوری داز شجرہ بیجا پور (مرید و خلیفہ علی پیر جد آن (از محقق الامین)
یہ دیوان اس شعر پر تمام ہوتا ہے

آج کرتا ہے بات کچھ کا کچھ خوبرو مجھ سنگات کچھ کا کچھ

رب، دیوان حسینی کا ایک مخطوط کتب خانہ انجمن ترقی اردو کا خزانہ ہے۔ اس مخطوط کا اندراج ۵۴۹۰ء دوادین کے تحت ہے مضمون نگار نے اس مخطوط کا مطالعہ کیا ہے انوس ہے کہ یہ مخطوط بری طرح کرم خوردہ ہے۔ اس میں ایک شعر بھی مکمل پڑھنا دشوار ہے۔ دیوان حسینی کا تیسرا نسخہ پاکستان میں موجود ہے۔ اس مخطوطے تک مضمون نگار کی رسائی نہ ہو سکی۔

ایک علیحدہ غزل | یہ غزل مضمون نگار کو کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں حاصل ہوئی
تھی۔ یہ غزل سب رس کے شمارے میں (مئی ۱۹۶۱ء) شائع ہو گئی ہے۔

مثنوی مرعین و ملا ہے | یہ دونوں غزلیں شاہ تراب چشتی کی مثنوی مرعین و ملا
اخذ کردہ دو غزلیں | میں موجود ہیں۔ مثنوی مضمون نگار کے زیر ترتیب ہے اور عنقریب کسی
موقر ادبی جریدے میں شائع ہوگی۔ غزلیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سرودی کا عجیب نادر گلا ہے کہ جس پر مجید عالم مبتلا ہے
اور سبھی کیوں ہر یکہ آفانہ کشیں کہ یہ بھروں سری اہلین گلا ہے
کے تشنیں سپر تشکابی کر کر کہیں سپر میک کا چھایا ملا ہے

تھی سوزات بن کر آپ سولوز فواج روح اور دعا ملا ہے
 ادسی خواہش سستی ہر ایک اثر میں بشوقِ ماہیت یک دلو ملا ہے
 اسے اس دفعہ سوں تبدیلِ ماز کہ فیضِ ذات سے جنوں سلا ہے
 حسینی جس کے تیں آواز کھتے سو ہر چھری منے او تر ملا ہے
 یوں یوھیں دل بے مشقت اسکو پایا جو کوئی عالم کتبِ ہستی میں لایا
 معانی کے چمن میں غنچہ لفظ ! کھا دل جیوں ہو ضمّش کلا یا
 کیا میں اوس سبب زہر دریائی سراسر مگر پھر عجبکو دس آیا
 مسگر کیا سچ میں تبدیلِ ناسل جو کیتا صبح سوں اور چامی مچایا

برائے دیدن دیدارِ جاہاں نا

اوپر کر پاؤں ناسر کو لڑایا

فارسی غزلیں | پیر بادشاہ حسینی فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ اُن کے دیوان میں فارسی کی چار
 غزلیں پائی جاتی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ یہ غزلیں نازک خیالی اور ندرتِ تشبیہ کا بہترین نمونہ ہیں

۱۔ ہر اونچے می نمایاں خیال است تو — خود را چه حال است
 توئی ناظر توئی منظور اسحق نظر در — بمثال است !
 نظر درستی خود چوں شود خصم در آخا خود بخود عینِ فعال است
 نمی بینم کسے ما خود نمائی چہ جای نماید قیل و قال است

بغیر از شاہدِ خود نیست کارے

حسینی را ازو ذوقِ کمال است

۲۔ صنم بطعنہ مرا یاد میکند چکنم دل شکستہ ما نشاد میکند چکنم
 بغیر یاد تو یاد دگر مباد مرا دلم ز عشق تو فریاد میکند چکنم
 جبار زلفت گرفتار کردہ دل ما ز ہمارے منتہم بجا د میکند چکنم

بہر عارضت کہ بخار دی است دل شکس را کہ داد گر ہمہ بر باد میکند چہ کنم

نزد عشق فرستادہ است حسینی را

بر غزما ہمہ ارشاد میکند چہ کنم

۳۔ در دم دلدار دارم انتظار کیستم جاں بدست یار دارم جانثار کیستم

خوردہ ام مے از لب یارم ؟ دل مت گشت عاشق و معشوق خویشم بے قرار کیستم

سرخ دہیتم من عکس رخ یار من است لالہ ام صباغ وصلت دامن دار کیستم

ز لب دارم رسا کند صید خاتم گشتہ است مرغ جاں چوں شد اسیر ننگا کیستم

اے حسینی جز خیال یار در دل جامدہ

صحبت دلدار دارم آہ یار کیستم !

۴۔ بہت بر ایدے تو خال بیدائے نازین قصد صورت داشتہ رنگے رسید از راہ مین

ز لب یار زنجیر قدرت دارم بار بار سبہ موج بحر ہستی عشاق یا مئے عنبر میں !

از نگاہ دیدہ پر آشوب نشا ہنشاہ جن فتنہ بار خفاستہ بردیدہ خوش رہے عشق

سر دہستان عدن یا قامت نخل مراد یا قدرت راتقی ز قدرت آفریدہ اینچنین

اے حسینی اونگہ صدیج و تابے خورد

پس نزاکت درد آنحوئے میان کتریں

مخمس۔ منظر جانِ جانال کے شاگرد انعام اللہ خاں یقین کی غزل جس کا مشہور مطلع یہ ہے

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے

کیا کام کیا دل نے دیو اسنے کو کیا کہئے

اس کے توغری مصرعہ پر پیر بادشاہ حسینی نے ایک عارفانہ مخمس کہا تھا جو مخزن الامین تصنف

۵۔ دیوان حسینی۔ اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد
مخزن الامین (دکن) مکتب خانہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) تصنیف

امین الدین ثانی ابن پیر پادشاہ حسینی درج ہے۔ یہاں ہماری معلومات میں اس قدر اضافہ ہوتا ہے کہ پیر پادشاہ حسینی کے فرزند ارجمند صاحب زادہ سید امین الدین ثانی بھی صاحب تعریف و تالیف تھے۔ یہ عارف کامل تھے۔ ان کی تین تصانیف دستیاب ہیں۔ پیر پادشاہ حسینی کے محسن کے بند ملاحظہ ہوں۔ ۷۰

تجہ عشق کے سودے سوں آرام نہیں محکوں
بے کل ہوں ترپنے بن کچھ کام نہیں محکوں
انکھیاں کے بجز مسکن بسرام نہیں محکوں
حبشہ شامی شاہد کے انجم نہیں محکوں
کیا کام کیا دل نے دیو آنے کو کیا کہئے

جب لڑکے دریا میں یک رنگ ہو جا دے گا
امواج سخن سرکوں ہستی سوں اوجا دے گا
سقا ہے سولی چڑا پس کو سزا دے گا
تب راز حسینی گنج مخفی کا بتا دے گا
کیا کام کیا دل نے دیو آنے کو کیا کہئے
نور یافت کلام

انجن ترقی اردو علی گڑھ ایک مخطوطہ ۱۹۶۱ء میں پیر پادشاہ حسینی کے نہایت چہیتے۔۔
شاگرد شاہ تراب حسینی کا بیسیر کلام موجود ہے۔ اسی مخطوطے میں "ارشاد پیر پادشاہ حسینی، صاحب
قلل کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل کلام موجود ہے۔
غیب کے پردے سے عدت کے تئیں کوٹھکا دریاں دھڑاں چار کیتا اعتبار

منہتی ہوئے سیوں عدد ان کے وہم و غم ۹ اس سبب ہے ذات پر یعنی احد کامل قرار
 ہے سبب اعداد کے انبات ہونے میں تمام واحدیت کی گجریں اعتبارات چہار
 اتفاق کہ ہے اس طرح تین کیے تینوں ہورقین ادیس پھر اس کوں کہتے ہیں تینا
 بیٹے دار کوں کہتے جیسے تین دو بھی اس سبب اول نقطہ سول دایرہ پہ تھا
 خط کرتے کہتے تین سیدھی صاحب دیاں بعد دایرہ ہی نقطہ سول خط ہوا ہے بولہا
 حضرت ما اس سبب بولے تین چہار جہ تک میں سطح تب تک کیوں طے داکر کھیا
 ہا لالہ لاک ادس کی شان میں مرقوم ہے جس کے چہرے پہ ہے دائم مشوقیت کا بہار
 عین ہو کر کن کے عدنی میں ایک ہے سبب کلیم کوں اس سبب ہستی میں لایا اخبار
 اندازہ عین نے کیا دائرہ پایا ہے غیب جس نے دستے میں سب یو عین ہو کر استوار
 مرد مک ہو کر دے غیب ہویت کا نقطا اوس نقطہ نگہ کوں برزخ کبرا مجھ
 اوس نے خط نگہ کوں برزخ کبرا مجھ کیوں نہ اس سطح پو رہیں اول دیکھ ہم سیم
 سطح کوں واجب اگر بولوں بجا ہے مگر تیز سطح کوں واجب اگر بولوں بجا ہے مگر تیز
 یوں ہے اس تن دل کے اوپر ہم حسنی فی القل یوں ہے اس تن دل کے اوپر ہم حسنی فی القل
 دل مضبوط گندیا گلدستہ حسن عدم ۱۰ دل مضبوط گندیا گلدستہ حسن عدم ۱۰
 دونوں پیمانے کنارے کو نیا سرستی حسن کے گلشن کے میں سیراب کرنے مدیم
 اس کہانی لٹ مٹے شلے سیلے پن سے سینے یک موز پایا اگرچہ کھویا سب جنم
 صفحہ کل پر غلامی خط دیا سنبھل نے لگ دیک کر رخسار پر اوس زلف کے تین لاہرم
 خذر کامل ہے نہیں یا آفتاب صبح خیر مطلع الازار ہے یا مٹے حسن قدم
 تشق ہے اوس جتہ پر یا فرد اوپر جن کے اسم ذاتی کا الع ہے ازید قدرت رقم
 گوشیاکان سمع یا شاہد دے عرش بریں یا صدق ہے جس نے دروازہ کھلتے ہیں جم

کیوں نہ ہو توں قزح در افواجِ منتقل
 رشتک سیں ابرو کے ہے سب فرنگستانِ عثم
 نخلِ تند و لبرِ باکے ملکِ ترکو توں نچھارے
 بار دو بادام سوں ابرو کے ہو رہے شلخِ غم
 چکل شاہین ہو رہتے ہیں خرگاں دراز
 صید آں ہو رہے اگر چہ ہے بجا مرغِ دلم
 جس کا شاگرد ادنیٰ عینِ سحر سامری
 اے دل او میں چشمِ سیاہ کا دیکھ ہے مقتم
 نکتہ جیمِ جہل اللہ دستِ امر دمک
 ہے نکتہ یوں اوس نے جوں نود ذاتی در ظلم
 واحدیتِ احدیت کے پیچہ وحدتِ ناسکہ؟
 فی الحقیقت میں یو بینی (۱۹۷۷ء) دیکھو بنفستہم
 گر تبسم میں دیکھاوے سو گر تو کیا عجب
 کہ نے دہرتے ہے کالے او صنمِ اعجازِ جم
 کیوں رہے ہو کر ننگتہ گلشنِ معنی کی کل
 جب تک آوے نہ ہو شیریں معنی غنچہ فم
 ہے عرقِ رخسار پر یا ہے گلاب از گلِ جدا
 یاکل خورشید ہے کا حق کے شبنم سوں نم
 گر چہ صد یوسف نہ زکناں آویں اوس کے دیکھوں
 اس دلِ فشان کے ہو کر دسیں سب بقتلِ بخت
 صاف سینہ میں در بستانِ یا جابِ بحرِ حسن
 گد نایاں گاہ کم چشمِ تو ہم ہیں کسر
 نقشِ فامین ہو رہے سب گُلِ خاں بیا کے
 اے صنم دیکھے اگر چہ تجرِ نزاکت کا خرم
 یک بیک اود کبریا ہدمِ حسینی سوں ہوا
 ہے سراپا جس نے صد شیوہ لطفِ و کرم
 یاد و نشاہِ نازنین ہیں کرو فرینِ بیشِ و کم
 یا اداؤں کا چنڈرا چکر نہیں دستِ بے ہم
 دیک کر اوس کے قدم میں جس کا قائمِ پدم
 کیوں نہ دور ہیں تجو جلو میں سر و گلزارِ ارم
 ہے سراپا جس نے صد شیوہ لطفِ و کرم

جناب سخاوت مرزا صاحب نے ہاشمی بیجا پوری (۱۱۰۹ھ)، شیخ محمود بکری (۱۱۲۰ھ) متعلق

ولی دکنی (۱۱۹۷ھ متوفی)، عزت اللہ (۱۱۹۷ھ)، عارف الدین خاں عاجز (۱۱۷۸ھ)، سراج
 اورنگ آبادی (۱۱۹۷ھ)، میر عبدالحی کتاباں منظر جان جاتاں (۱۱۹۷ھ)، اور انعام اللہ
 خاں یقین (۱۱۹۷ھ) کو زیر بادشاہِ حسینی کے ماضی میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ حسینی
 کی شاعری ان شخصوں کی خوشہ حسینی ہے۔

کلوروفل اور قرآن

قرآن اور علم نباتات

(۷)

ارجناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی فرقانہ اکاڈمی منگلور نارندہ

”حضرت“ روبیت کا ایک شاہکار | غرض انہی ہرے رنگ کے ذرات کی بدولت جن کو آپ چاہے ”حضرت“ کہیے یا کلوروفلاسٹ - پیڑ پودوں کی پتیاں سبز دکھائی دیتی ہیں اور یہی وہ مشین قسم کے حیرت ناک ذرات ہیں جو فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور زمین سے پانی جذب کر کے سورج کی روشنی کی مدد سے شکر بوبائیڈریٹ سے بھرپور ہر قسم کی غذا تیار کر دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انتہائی درجہ حقیر اور ننھے ننھے ذرات جو صرف کسی خوردبین ہی کی مدد سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ دنیا کی بڑی سے بڑی مشین تک کو سزا دینے والے ملکہ درحقیقت ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی اور عظیم الشان مشینیں بسا اوقات ناکارہ ہو کر

۱۔ اس قابل یا عمل باہمی کو نباتات کی اصطلاح میں ”شعاعی ترکیب“ یا PHOTOSYNTHESIS کہتے ہیں۔ کاربونیڈریٹ کی تیاری کا یہ عمل صرف دن کے وقت اور سورج کی روشنی ہی میں ممکن ہے۔

یا کسی خرابی کی بنا پر رک جاتی ہیں۔ مگر کارخانہ قدرت کی یہ ننھی مٹی اور حیرت انگیز نشین بغیر کسی خرابی کے، بغیر کسی شور و غل کے، رُکے بغیر، ٹھکے بغیر، نہایت درجہ خود کارانہ طریقے سے مہینوں اور برسوں مسلسل اور لگاتار مصروف عمل رہ کر "لاڈلے اور پیارے" انسان اور دیگر مخلوقات کی غذا تیار کر دیتی ہے۔ مگر یہ لاڈلا اور پیارا بے کجاستے لکڑی کے لپٹے رازق اور رب کریم کی طرف ملتفت ہوتا اور اس کا شکریہ ادا کرتا۔ اُلٹے اس کے وجود ہی کا انکار کر کے ناشکری کا مرتکب ہوتا ہے کبھی تو کہتا ہے کہ اس کارخانہ فطرت کا کوئی خالق و ناظم ہی نہیں ہے اور یہ سارے دقیق اور حیرت انگیز انتظامات آپسے آپ چل رہے ہیں اور کبھی اس کو فلاں اور فلاں دیوی دیوتا کا صدقہ بتاتا ہے۔ یا کبھی طرح طرح کے عذر لنگ بیان کر کے اپنا دامن چھڑانا چاہتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّبَكَ بِمَلِكِ الْمَكْرِيِّ الَّذِي خَلَقَكَ وَفَوَّضَ

مَعَهُ لَكَ۔

اے انسان تجھے کس چیز نے برگشتہ کیا اپنے اس مہربان رب سے جس نے تجھ کو پیدا کیا پھر تیرے اعضا کو درست کیا پھر (تیری خلقت میں) اعتدال بخشا (الانفطار: ۶-۷)

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ۔ إِنَّا صَبَّأْنَا الْمَاءَ صَبًّا۔ ثُمَّ شَقَقْنَاهُ

لَهُ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ الْإِبْرَاهِيمَ وَالْحَبْرَ وَرَقَّاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْصِيلًا۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو یقیناً عزت بخشی اور انہیں بر دیگر میں سوار یا ان عطا کی اور (خور و نوش) کی عمدہ عمدہ چیزوں سے انہیں نوازا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں مکی فضیلت بخشی (بنی اسرائیل: ۷۰)

الارض مشقاً۔ فانبتنا منها حباً۔ وعنباً وقضباً وزيتوناً ونخلاً
وحدائقاً غلباً وفاكهةً دأباً۔ متاعاً لكم ولعالمكم۔

پس انسان کو اپنے کھانے کی طرف نظر کرنی چاہیے (کہ وہ کس طرح اس کے
ہاتھوں تک پہنچتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ) ہم نے عجیب طریقے سے (خوب پانی
برسایا۔ پھر زمین کو بھجوا ڈالا، پھر ہم نے اس میں غلہ، انگور، ترکاری، زیتون، کھجور
اور گنجان باغ، میوے اور چارہ سب کچھ پیدا کر دیا۔ تمہارے لیے بھی اور تمہارا
مواشی کے لیے بھی (عس: ۲۵-۳۲)

برگ درختان سبز در نظر ہو شمار
ہر دتے دفترے است معرفت کردگار

کلوروفل اور علم انسانی +۔ واضح رہے کہ پروٹوپلازم کی تحقیق کا آغاز
اٹھارویں صدی کے اختتام کے قریب ہوا ہے۔ جبکہ پروٹوپلازم پر مشتمل خلیوں
(CELLS) کی اصل شکل و ساخت دوسائس دانوں کی کوششوں کی بدولت
منظر عام پر آئی۔ مگر پروٹوپلازم کی اصل ماہیت اور ایک زندہ و متحرک مادہ
کی حیثیت سے اس کا تعارف پہلی بار ۱۸۵۸ء میں ایک جرمن سائنس دان
(HUGO VON MOHL) نے کرایا۔ اور اسی نے اس مادہ کا نام پروٹو
پلازم تجویز کیا۔ جس کو مادہ حیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ پروٹوپلازم پر جب
مزید تحقیق ہوئی تو کلوروفل اور کلوروپلاسٹ کے حقائق بھی سامنے آئے۔ جو

۱. SCHOOL BOOK OF BIOLOGY, P 134, LONDON. 1945

پروٹوپلازم کے لغوی معنی: پہلی شکل کے ہیں جو کہ یہ زندگی کی پہلی اور ابتدائی شکل ہے اس لیے
اس کو یہ نام دیا گیا۔ اس کا ترجمہ: خرمایہ کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔

باتاتی پروٹوپلازم کا جزو ہوتے ہیں، جیسا کہ تفصیل گزر چکی۔
 بہر حال انیسویں صدی سے قبل پروٹوپلازم اور کنکورو پلاسٹ کے حقائق
 علم انسانی سے مستور یا عالم غیب کی بات تھے اور ان اسرارِ سرلبستہ تک انسان
 کی رسائی صرف سو اسو سال قبل ہی ہو سکی ہے۔ مگر کتاب برحق میں اس ازلٰی حقیقت
 کو چودہ سو سال قبل ہی پوری طرح بے نقاب کیا جا چکا ہے۔ جو اس کے کلام الہی
 ہونے کا ایک زبردست اور ناقابل انکار ثبوت ہے۔

فَذَرْنِي دَمِن مَكْذِبٍ هَذَا الْحَدِيثُ مِنْسْتَدِرْجُهُمْ مِنْ
 حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ :-

ہی جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں ان کو اسی حال موجودہ پر رہنے دو۔
 ہم ان کو بتدریک (عذاب کی طرف) لیے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو
 خبر بھی نہیں (قلم: ۲۲)

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ :- بعض کاہل اور کوتاہ بینوں کا کہنا ہے کہ
 قرآن مجید تو محض ایک سیدھی سادی اور سہل فہم کتاب ہے جس کو علوم و
 حقائق سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے۔ اس میں کائنات کے
 اسرار و رموز کی تلاش فضول ہی نہیں بلکہ ذہنی عیاشی سمجھی ہے۔ مثلاً ایک صاحب
 رقمطراز ہیں :-

”قرآن شریف میں۔ مناظر و مظاہر قدرت، چاند، سورج، ستارے،
 دریا، سمندر وغیرہ اور ان کے حرکات و فوالد کا مفہوم بس اتنا ہی ہے کہ جیادہ
 بظاہر نظر آتے ہیں۔ طبیعیات، ہیئت اور دیگر علوم قرآن کے موضوع سے باہر
 ہیں۔ موجودہ علوم سے ان کی تاویل میں سمجھتا ہوں کہ محض جولائی طبع کا مظاہر
 ہے جس طرح اگلے زمانے میں قدیم یونانی فلسفہ اور سائنس کے مفروضے پر آیات قرآنی

کی تفسیر اور تشریح میں اپنا وقت ضائع کیا گیا تھا۔ اسی طرح آج یہ کوشش بھی ایسی ہی ہے۔ مثال کے طور پر یونانی فلسفہ ”عقلِ اول“ کو نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (اول ما خلق اللہ لازمی الحدیث کی بنیاد پر) بنایا گیا تھا۔

سادات، عرش و کرسی اور افلاک کی تشریح بھی اسی انداز میں کی گئی تھی کہ
”اللہم احفظنا“ اس وقت اسماعیل میرٹھی کی حمد کا ایک شعر یاد آیا ہے۔

پیروں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی

اور سر پر لا جو ردی کیا سائبانِ بنایا

اگر کوئی صاحبِ فرشِ خاکی اور لا جو ردی سائبان کی سائنسی تشریح کرنے بیٹھ جائے تو اسماعیل میرٹھی اور ان کے شر پر کتنا ظلم ہو گا۔ بلا تشبیہ قرآن کے ساتھ بھی ماضی میں اور آج بھی ایسی ہی زایدتی ہو رہی ہے۔ حسبِ پر زائد از زائد نیک نیتی کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور کوئی ان امور پر ٹوکنے والا سامنے نہیں آتا بلکہ عام مسلمان یہ پڑھ کر بہت خوش ہوتا ہے کہ ”اچھا ہمارے قرآن میں سائنس نے آج کل جو معلومات حاصل کی ہیں وہ سب موجود ہیں۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔“

اتنا وقت، اتنا پیسہ اور اتنی ذہنی کاوش کسی خلائی کارنامہ کسی سائنسی ایجاد میں صرف ہوتی۔ کوئی مسلمان فرد یا ادارہ یا ملک کوئی نئی ایجاد کرتا، کوئی نیا نظریہ پیش کرتا تو بڑا کار خیر ہوتا۔ سائنس دانوں کی دریا فتوں اور ایجادوں کو خواہ مخواہ قرآن اور حدیث میں بھٹونے کی کوشش میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنا میری دانست میں محض ذہنی عیاشی ہے۔

خود کھانا، خود پڑھا اور خود ہی خوش ہو لیے۔ نہ تو دنیا کو کوئی فائدہ پہنچایا اور نہ مسلمانوں کو اور نہ ہی اس سے کسی غیر مسلم کو اسلام کی روشنی ملی۔

قافلے منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں، اور ہم لوگ گرد قافلہ کی قرآنی تشریح پر مقالے ایک جگہ بیٹھ کر لکھ رہے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ پھر کوئی قافلہ گزرے اور ہم حالات قلم بند کریں۔

میں نے پچھلے اور اگلے صفحات میں جو کچھ بھی تحریر کیا ہے ان کے بغور مطالعہ سے اگرچہ مذکورہ بالا غلط فہمیاں خود ہی رفع ہو جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی تنقیح کے طور پر جذباتوں کی مختصر طور پر وضاحت کی جاتی ہے۔ اور فضیلہ اہل علم والصفات پر چھوڑا جاتا ہے۔

۱۔ موصوف نے اس موقع پر فلسفہ اور سائنس کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ حالانکہ ایک طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ فلسفہ محض قیاسات اور ظنیات پر مبنی ہوتا ہے، جس کا تجربہ و مشاہدہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس سائنس اُس علم و فن کا نام ہے جو مشاہدہ و تجربہ اور استقراء (INDUCTION) کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ اگرچہ سائنس میں بھی بعض چیزیں (جیسا کہ تفصیل گزر چکی) نظری (THEORETICAL) ہوتی ہیں۔ جن میں اکثر رد و بدل ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس کے زیادہ تر مسائل وہ ہیں جو تجربہ و اختیار میں پوری طرح ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا موصوف نے ”عقل اول“ وغیرہ جن چیزوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان کا تعلق فلسفہ سے ہے، سائنس سے نہیں۔ نیز اس سلسلہ میں اگر کچھ قداماد اور مفسرین نے غیر محتاطانہ طور پر قرآن اور حدیث کے کچھ نصوص کی غلط تاویل و تعبیر کر دی ہے تو اس کی سزا ہم کمیوں بھگتیں؟ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ ماضی کی خامیوں اور فرد گزشتہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے اصول صحیح (لغت، عربیت، اور تفسیری ضوابط) کا رُوء سے صحیح انداز اور صحیح طریقہ اختیار کریں۔ صحیح اصولوں کے تحت جو تفسیر کی

جائے گی۔ اس کے غلط ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

۲۔ اسمعیل میرکھی نے اپنی کسی کتاب میں اگر شاعری کی سہ تو کی ہو مگر کلام ربانی پر اس قسم کا اطلاق ایک بہت بڑی حبارت اور نامعقول بات ہے جس کا ارتکاب سوائے مشرکین مکہ کے غالباً اب تک کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔ علماء اور محققین کے نزدیک تو قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ ملکہ ایک ایک حرف تک قابل استدلال ہوتا ہے۔ آخر ہم کس بنیاد پر کلام اللہ کو بھی ایک انسانی کلام اور وہ کبھی شاعری پر قیاس کر لیں؟ حالانکہ خود قرآن کریم ہی اس قسم کی خام خیالی کی تردید اس طرح کرتا ہے۔

”وما هو بقول شاعر“ (یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

بلکہ اس نے تو شاعروں کی مذمت میں یہاں تک کہہ دیا ہے۔

والشراء يتبعهم الغادون۔ الم تر انهم في كل دأبھيون
وانهم ليقولون ما لا يفعلون۔ اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ
چلا کرتے ہیں کیا تم کو خبر نہیں کہ وہ (خیال آرائیوں کے) ہر میدان میں حیران د
سرگردان بھرا کرتے ہیں؟ اور زبان سے وہ باتیں نکالتے ہیں جو کرتے نہیں
(شراء : ۲۲۴ - ۲۲۶)

کیا اس تقریر و تردید کے بعد بھی قرآن حکیم کو شاعرانہ قسم ہی کا کلام
قرار دینے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

۳۔ یا پھر کیا شاعرانہ قسم کے کلام سے یہ مراد ہے کہ اس میں بجائے حقائق
و معارف کے اظہار و انکشاف کے محض صمیمہ فطرت کی حمال آرائیوں پر زور
دیا گیا ہو یا مناظر قدرت کے حسن و جمال کا حال بہتر سے بہتر تشبیہات و استعارات
اور خوشنما الفاظ میں قلمبند کر دیا گیا ہو کہ لوگ مناظر فطرت کو دیکھیں پھر ان کی

رہنماؤں کا بیان قرآن میں بہتر سے بہتر الفاظ میں پڑھ کر سردھننے لگ جائیں کہ واہ واہ کیا خوب کلام ہے اور کتنے چپت استعارے لائے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر آخر اس قسم کی آیات کا کیا مقصد ہے؟
حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے آپ کو حقائق و معارف کی ایک بلند پایہ کتاب قرار دیتا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:-

قل انزلنا الذی یعلم السر فی السموات والارض:- کہہ دو کہ اس (کتاب) کو اس نے نازل کیا ہے جو زمینوں و آسمانوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ (فرقان: ۶)

اولیس اللہ با علم بما فی صدور العلمین: تو کیا اللہ کائنات کے سینے میں موجود شدہ (اسرار کا) جاننے والا نہیں ہے؟ (عنکبوت: ۱۰)
الم تر ان اللہ یعلم ما فی السموات وما فی الارض: اے مخاطب! کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ زمین و آسمانوں کی تمام چیزوں کو جانتا ہے۔
(مجادلہ: ۷)

غور فرمائیے ان آیاتِ کریمہ میں کون سی حقیقت بیان کی جا رہی ہے اور کس راز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے؟ ان آیات سے بطور اشارۃ النص اور دلالت النص ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں صحیفہ فطرت کے راز ہائے سرستہ بھی موجود ہیں (اس قسم کی اور بھی آیات ہیں) جن کا اظہار سفریہود ۲ نیتنا فی الافاق و فی انفسہم الخ کے مطابق آفاقی و انفسی دلائل کے روپ میں ہوتا رہتا ہے۔ اس بنا پر قرآن حکیم میں مظاہر کائنات سے قرص کیا گیا ہے اور اس وجہ سے قرآنی آیات میں تفکر و تدبر کو ایک محمود و مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے۔

کے مسائل چھڑتے ہیں تو صوفیاء اخلاق و سلوک کی آیات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جدید ترین علوم مثلاً سائنس، نفسیات اور اجتماعیات وغیرہ کے ماہرین بھی اس سرچشمہ ہدایت سے اپنے اپنے طرف کے مطابق سیراب ہو سکتے ہیں ان میں سے کسی بھی علم و فن کی تحقیر نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی علم کو محض سطحی اور شاعرانہ قرار دیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب حکمت میں جتنی گہری نگاہ ڈالتے جائیے حقائق و اسرار کے دروازے اسی قدر کھلتے چلے جائیں گے جن کی انتہا نہیں ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں ہے۔ "ولا تنقص عباد کُلباً" اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔

قرآن حکیم کے متعلق یہ کہہ دینا کہ موجودہ علوم و مسائل سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ وہ چودہ سو سال قبل کی ایک پرانی اور فرسودہ کتاب ہے۔ جو نہ تو موجودہ معاشرہ اور موجودہ تہذیب و تمدن پر منطبق ہو سکتی ہے اور نہ وہ عصری تقاضوں کے مطابق کوئی رہنمائی کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہر دور کے لیے ایک رہنما کتاب ہے جس میں کسی بھی دور میں پیدا ہونے والے ذہنی و قلبی امراض کا کافی و شافی علاج موجود ہے اور یہ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ ہر دور کے حالات و تقاضوں کے مطابق (بتقاضائے بکلموا الناس علی قدر عقولہم) قرآن حکیم سے نئے نئے مسائل کا استنباط کر کے موجود الحاد و لادینیت اور خدا بیزاری و آخرت فراموشی کے سیل رواں کا مقابلہ کریں اور نکرین و معاذین پر (بتقاضائے وحاد لہم بالقرھی احسن) تمام حجت کریں۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم میں قیامت تک کی ضرورتوں کے مطابق

شرعی مسائل موجود ہو سکتے ہیں۔ تو پھر مگر اسیوں کے استیصال اور فکر و نظر کی اصلاح کے لیے تکوینی (نیچرل) مسائل کیوں نہیں ہو سکتے؟ حالانکہ شرعی مسائل پر عمل پیرائی سے پہلے تکوینی امور میں فکر و نظر کی اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے۔ یعنی ایک عملی انقلاب یا فتۃ ثانیہ سے پہلے ایک فکری و نظریاتی انقلاب برپا کرنا بہت ضروری ہے۔

وہ زمانہ لد گیا جب لوگ محض کسی معجزہ کو دیکھ کر یا کسی کی سیرت اور حسن اخلاق سے متاثر ہو کر ایمان لے آیا کرتے تھے۔ اب اخلاق و کردار تک کوئی معیاری چیز نہیں رہے۔ بلکہ اس کو بھی فرسودگی کی علامت یا بورژوائی ذہنیت کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے۔ عصر جدید کی ذہنیت اور اس کا عقلی معیار یہ ہے کہ صرف اُسی چیز کو قبول کیا جائے جو خالص سائنٹفک نقطہ نظر سے ثابت ہو یا جو عقل کے معیار پر پوری اترنے والی ہو۔ اس لحاظ سے موجودہ ذہن و

۱۔ مثلاً امام شافعیؒ کا قول تھا کہ دینی امور میں جو بھی مسائل و حوادث پیش آئیں گے ان تمام کا حل اور ان کے دلائل بھی کتاب اللہ میں مل جائیں گے۔ اور ابن عباسؓ کا دعویٰ تھا کہ اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو میں اس کو کتاب اللہ میں ڈھونڈھ نکالوں گا۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں تم سے کوئی بھی بات کہوں تو اس کی تصدیق کتاب اللہ میں دکھا سکتا ہوں۔ ملاحظہ ہو: ۱۔ لسان فی علوم القرآن ج ۲ ص ۱۶۶ مطبوعہ مصر اور حدیث شریف میں ہے: لن نقنلوا ما تمسکتہم بھما: جب تک تم کتب و سنت کا دامن تھلے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔

۲۔ ”ڈانز“ نے اس ذہنیت کو مزید سہادی ہے۔

داغ میں جو سوالات سمائے ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ کائنات کیا ہے؟ کیوں اور کس لیے وجود میں آئی؟ انسان کا اس کائنات کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اس کی اصل پوزیشن کیا ہے؟ آیا انسان اور کائنات کا کوئی متعین انجام بھی ہو گا یا یہ کارخانہ یوں ہی چلتا رہے گا؟ یہ اور اس قسم کے سوالات ہیں جو موجودہ فکر و نظر کا محور بنے ہوئے ہیں۔ اب اس استدلالی ذہن و فکر کو متاثر و مطمئن کرنے کے لیے خالص سائنٹفک دلائل کی ضرورت ہے۔ نقل و روایت یا تاریخ و جغرافیہ سے اب کام نہیں چلے گا۔ موجودہ ذہنیت کا مقابلہ اور اس کا قوط صرف دی مذہب کر سکتا ہے جو اس معیار پر پورا اترنے والا اور علمی و سائنٹفک دلائل کے ذریعہ پوری نوع انسانی پر اتمام حجت کرنے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں کائنات کے حقائق اور ان کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عصری تقاضوں کے مطابق علمی و سائنٹفک دلائل کا استنباط کیا جاسکے اور اس قسم کے دلائل کو جو قرآن کی روح اور اس کے فلسفہ سے مطابقت رکھنے والے ہوں، آفاقی و انفسی دلائل کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور موجودہ مادہ پرستی کا ذہنی آپریشن صرف ان ہی دلائل سے ممکن ہو سکتا ہے۔

جہانگیری نصیحت نامہ

(از مولانا الحاج محمد ابراہیم صاحب فاروقی)

عدل جہانگیری تاریخ کا وہ روشن باب ہے جو کسی تفصیل و تقریر کا محتاج نہیں ہے۔ شہنشاہ کی پوری زندگی اسی روشنی میں گزری مشہور ناہر تاریخ و سیاست علامہ بلخی کا قول ہے

لا ملک الا بالعدل ولا عسکر الا بالمال ولا مال الا بالعاقب ولا عاقب الا بالعدل
و ترجمہ بغیر شکر کے ملک نہیں، بغیر مال کے لشکر نہیں، بغیر آبادی کے لشکر نہیں اور بغیر انصاف کے آبادی نہیں
اوپر کے کلیہ کو اگر منطقی مسئلہ صغریٰ اور کبریٰ میں تجزیہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بغیر
عدل و انصاف کے ملک کا وجود محال ہے جس کے لیے مندرجہ بالا چار عنصر ہیں چوتھا عنصر عدل
و انصاف ہے جو تمام عنصروں کا سر تاج یا ملک کے وجود کا ضامن ہے۔ حالیہ واقعہ بنگلہ دیش
اس کا شاہد حادل ہے۔ ناخاندان وادی الاحیاء اسی انصاف و عدل کی شہنشاہ جہانگیر اپنے
ہر شاہزادہ ہر امیر اور افسر کو تاکید کرتا تھا۔

زیر عنوان نصیحت نامہ اسی عدل کا آئینہ دار ہے جس کو شہنشاہ نے اپنے بیٹے پر وزیر کے
نام اپنے پیرانہ شفقت سے ۱۰۲۱ھ میں اس وقت لکھ کر بھیجا تھا جبکہ صوبہ برار کی حکومت اس
کے سپرد کی تھی اور اپنے درباری امیر کبیر خان جہاں لودی کو اس کا اتالیق بلکہ مشیر
خاص مقرر کر کے ساتھ کیا تھا۔ مذکورہ صدر نصیحت نامہ کو خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ حبیب اللہ
مروم نے اپنی تاریخ بنام۔

” تاریخ خان جہانی و مخزن اقبالانی “

کے باب ششم میں جیسے ۱۰۲۱ھ تک کے شہنشاہ جہانگیر کے سوانح ہیں نقل کیا ہے اور لکھتا ہے
کہ شاہزادہ پر وزیر حبیب مستقر صوبہ برار بنام ایلمچور پہنچ گیا جس کے نواح میں اسکو جاگیر

ہی عطا کی گئی تھی۔ تو بقول مورخ مذکور الصدر

بندگان حضرت بالشفقات بادشاہ نے یاد آوردہ (شاہزادہ را)
بر نصیحت نامہ جہانگیری کہ عنوان اس بدستخط خاص بود۔

ممتاز ساختند

اسی کے ساتھ اسی تاریخ کو دوسرے فرمان کے ذریعہ سے:

”سر دپائے عامہ دیک قبضہ شمشیر“

”تاریخ خاں جہانی و غزن افغانی“ (کلمی)

سے سرخراز فرمایا گیا تھا۔

تاریخ خاں جہانی کے مورخ خواجہ نعمت اللہ جو کافی عرصہ تک دربار جہانگیری کا واقعہ
نہیں بھی رہا اور اس کے بعد وہ امیر خان جہاں لودھی کی سرکار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اسی..
دائستگی کی بنیاد پر افغانوں کی یہ بیسوطا تاریخ جس کا آغاز ماقبل تاریخ سے ہے اور اختتام صدی
خاندان پٹہ سے جو گویا پٹھانوں کا ہندوستان میں آخری حکمران خاندان تھا۔ اپنے مرنے والا ہے..
سرپرست امیر کبیر خاں جہاں لودھی کے ایک ماتحت سردار بیت خاں کا کرکی فرمائش پر بقول
خود ملکالہ (محبوبہ برادر کن) میں۔

”یہ تاریخ بہتم ماہ ذی الحجہ ۱۰۷۵ بروز جمعہ بود نماز عصر..... اقام نمود“

اس میں ایک مقدمہ۔ سات الباب۔ اور ایک خاتمہ ہیں (۱۶) الباب میں صرف افسانہ

۱۰ تاریخ ہے اور ساتویں باب میں — شہنشاہ جہانگیری کی چھ سالہ سوانح ہیں۔

بہر حال اس باب کے آخر میں اس حد تک یہ نصیحت نامہ بھی نقل کر دیا ہے جس کے متعلق

مختلف تاریخ اپنی تہذیب کو جو نصیحت نامہ ہے پہلے اس نے لکھی اس صراحت پر ختم کرتا ہے۔

”یہ نصیحت نامہ کافہ نامہ ہر خاص و عام بہ تحریر ان اقدام نمود تا فیض کمال

نہیں یگانہ گم نہ دقت جہانگیر قلم سے غایت فائز و بہ توجہ فیض آں بادشاہ جہانگیر۔“

اسلام توفیق رفیق حال کار آگاہاں دایلی ایمان گرداناد دفر و نماز
کارگار در میدان اخلاص شمار آں داد ستور اصل روزگار خود ساختہ سرمائے
سلوک خود دانند۔

اس کے بعد کیفیت نامہ کے آخرین چند دعائیہ جملے لکھ کر گویا اس باب ہفتم کو یوں ختم کرتے ہیں
۱۰ لاقہ انام رادر ظل عدالت آں بادشاہ اسلام سیر جاہ شریعت نبوی و بر اطلاق
دفر مانبر واری ثابت دارد۔ و در تہمید قوانین اسلام در و ان شرع مصطفیٰ علیہ
الصلوۃ والسلام راسخ قدم و ثابت دالاد۔

(باب ہفتم تاریخ خان جہانی و مخزن اخلاقی قلمی)

ترجمہ اردو نصیحت نامہ جہانگیری

دنیا ناپائیدار ہے۔ طلب میں جس قدر بھی کدے اسی قدر بہتری ہوگی۔ قبل اس کے کہ دنیا
تھکوکھائے۔ تم اس کو ہضم کر جاؤ۔ سو سال کی عمر کو بھی نابود سمجھو کیونکہ آخر کار موت ہے تم آگاہی
نیک کاری۔ اور بر داری کو اختیار کرو۔ اپنے چوٹے سے سلوک کو قیچہ اپنے بڑے سے توقع
کرنے ہو۔ جو کچھ بونگے وہی کاٹو گے۔ فقشان اٹھا کر پشیمانی سے کچھ فائدہ نہیں۔ مصیبت زدوں
سے عبرت اور سبق حاصل کرو۔ فضول غم نہ کرو۔ اپنے تئیں تہمتہ خوش رکھو۔ اللہ کے عطیہ
قیمت پر خوش ہو کر شک کر دو۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرو بدی اور نیک قوی کو مت اختیار کرو۔
بدی پر غصہ نہ کرو بلکہ نیکی پر کرو۔ جو اپنے لیے پسند نہ کر دے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو
نیک نامی اور سچائی کو اختیار کرو۔ اگر تو انگریز چاہتے ہو تو قحط اور فحشی کو اپنا سر بایں نہ
دے (بقول شاعر) قحط سے انسان مالدار ہوتا ہے۔ کام شروع کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر
غور کر لیا کرو۔ جس کام کو شروع کرو اس سے باہر نکلے گا مگر پہلے ہی سوچ لو۔ بلائے دور ہو
اور اپنے تئیں بھلا میں مبتلا نہ کرو۔ کار گذار دل اور خوشیابوں کو کام سپرد نہ کرو۔ تجربہ کار کو مت
آزمائو۔ اور نا تجربہ کار کے ساتھ نہ اختیار کرو۔ اپنے حق کو ایسی محبوب چیز پر قربان نہ کرو جیسا کہ

اپنے تن پر بند رکھو۔ اسی طرح دین اس پر قربان نہ کرو بلکہ اس کو دین پر قربان کر دو۔ اپنی قسمت
خود پہنچاؤ اور شناخت کی خصلت پیدا کرو۔ اصحاب دولت سے کینہ نہ رکھو۔ حکمران سے ڈرتے رہو
اگر کمزور بھی ہو تو اس کو طاقت نہ سمجھو۔ جو بادشاہ نہیں وہ کامیاب نہیں جس کے پاس مال نہیں
اس کے پاس بخشش بھی نہیں جس کی اولاد نہیں وہ خوش نہیں اور جس کے پاس یہ تینوں چیزیں
نہیں وہ بے غم ہے۔ بادشاہوں سے نزدیک رہ کر بھی ان سے دور رہو۔ اپنی لذتی کھاؤ اور
اپنی بات کہو۔ ٹوٹے پھٹے اور چوری گئے سامان پر غم نہ کرو۔ کسی کے گھر میں بغیر اجازت مت
داخل ہو۔ برے مہمایہ اور برے لوگوں سے دور رہو۔ بے آدابوں کی صحبت میں نہ بیٹھو اور
بے ادب کو قابل خدمت نہ سمجھو۔ ہمارے دوستوں کے لیے فضول تکلیف نہ اٹھاؤ۔ کسی دوسرے
کی زمین پر نہ کاشت کرو اور نہ اس پر دخت لگاؤ۔ بدکرداری کو اپنا شعار نہ بناؤ۔
غلط کار کو ذلیل نہ کرو۔ بے شرم اور بے ہمت کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ بددیانت چغل خور اور بے
وفائے امید و فائدہ نہ رکھو۔ عیسائی دالوں سے دوستی نہ کرو۔ کینے اور بداصلی کی دھڑے شنادی
نہ کرو۔ جھوٹی لڑائی کی ثبوت پر غم نہ کرو۔ محدثوں کے کہنے پر نہ چلو اور ان کے مکر و حیلے سے
غافل نہ رہو جو ان محدثوں سے شنادی کرو تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کی عزت کرو اور بڑے لوگوں سے ڈرتے
رہو جو مخلوق کی امن امن سے نہ ڈرتے اس سے ڈرتے رہو۔ ملاقات اور مجاہدے سے کوئی تحفہ نہ لو۔ لوگوں
نہ بڑھو ہر شخص سے دوستی سے پیش ہاؤ چٹک چٹک جنگ میں بھی دوستی کو طوطا رکھو۔ اندوختے سے قریبی نہ لو بے وطن
کو زبردستی جنگ نہ دیجو۔ ہر لونینز بہادر سے بہادری کی امید نہ رکھو۔ اپنے دشمن کو برا جانو اور بولی صدق
دشمن کو حقیر اور بے چارہ نہ سمجھو بے گناہوں کو اپنے سے بے خوف رکھو بے گناہ کو اگلا نہ سمجھو جائزہ اور
کئی دھڑکیوں کا لحاظ رکھو۔ آں کا نام لے کر نہ مجھو۔ کسی کی غیبت نہ کرو۔ بلکہ اس کو سبھائی
— سے یاد کرو۔ آٹھ شربان پیٹ اور جسی خورشید کی حفاظت کرو۔ بے وقعت کی
تم سے محض دیاں بیت ہم عمر ہے۔ لاسٹ میں جلدی نہ کرو جس جگہ ملاقات کرنی چاہیے
وہاں پہنچ کر۔ بڑھتی ساری اپنی طرح پہنچاؤ۔ عجولان کے ساتھ محبت نہ کرو۔ آٹھ تھکے
(بانیہ خطوایہ ص ۲۱۹)

التقریظ والا انتقاد

مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس از مولانا عبدالہدی ندوی نقیضہ کلان ضخامت ۲۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت بجلد ۵۰۔ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۔ لکھنؤ۔

یورپ کی موجودہ علمی تدریج کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جب وہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی نے انسانوں کی قدیم نرم فکر و خیال کو درہم برہم کیا تو مذہب و فلسفہ کی سر زمین میں گویا زلزلہ آگیا۔ اور ایک طرف پادری صاحبان اور دوسری جانب فلاسفہ دونوں سائنس کا چیلنج قبول کرنے کی غرض سے نقد و جرح کے میدان میں آکھڑے ہوئے۔ علاوہ ازیں دنیا میں کئی علمی نظریہ بھی جامد نہیں ہوتا۔ بلکہ تجربہ و مشاہدہ اور علم میں ترقی کے ساتھ اس میں بھی تغیر و تبدل اور اضافہ و ترمیم ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ سائنس کے نظریات میں بھی گزشتہ ایک صدی میں نہایت اہم اور دور رس تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اس صورتِ حالی نے مذہب اور فلسفہ کے مروجہ میدانِ جامدوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف سائنس برق رفتاری کے ساتھ ترقی کرتی اور اُس کے بڑھتی رہی دوسری جانب سائنس پر تنقید کا بادِ سر چوش بھی تیز تر ہوتا چلا گیا۔ اور تجربہ یہ ہے کہ آج انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں سائنس پر تنقید کا ایک نہایت عظیم ذخیوہ جمع ہو گیا ہے۔ اور کوئی دن نہیں جاتا کہ اس میں اضافہ نہ ہوتا ہو۔

سائنس نے جلیب الطبیعیاتی افکار و آراء اور سماجی اور اخلاقی قدروں میں جو بوجھان عظیم پیدا کیا تھا اس کے اثرات عالمِ حقے چنانچہ اسلام بھی اس کے متاثر ہو رہا ہے اور بر مغیرہ

د پاکستان کے مسلمانوں پر بھی اس کا شدید رد عمل ہوا۔ لیکن یورپ میں اور ہم میں ایک بڑا فرق
یہ ہے کہ یورپ کے علماء کے مذہب اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرتے
ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علوم جدیدہ اور سائنس سے بھی پورے طور پر باخبر اور
آگاہ ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں کا مذہبی طبقہ نہ مغرب کی کسی زبان سے آشنا ہوتا
ہے اور نہ علوم جدیدہ سے واقف! اس فرق کے باعث یورپ کے مذہبی علماء سائنس اور اس
کے کسی نظریہ پر تنقید کرتے ہیں تو اس میں وزن ہوتا ہے۔ جان ہوتی ہے اور سنجیدہ دماغوں پر
اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے علماء جو باتیں کہتے ہیں وہ محض جوائی اور جذباتی ہوتی
ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سامانِ تفریح سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ اس بنا پر مولانا عبدالباقی
صاحب ندوی کا یہ جذبہ دولولہ اور وصلہ و محبت لائق تحسین و ستائش ہے کہ موصوف فلسفہ جدید
کے نامور استاد اور مصنف تو پہلے سے تھے ہی۔ اب اس شخص نے ادھیری میں سائنس پر تنقید اور
اس کی تاریخ اور تقاضا مطالعہ بھی دوست و گہرائی سے کر بیٹھے اور سالہا سال کے مطالعہ و غور و فکر
اور تلاش و جستجو کے بعد زیرِ قلم کتاب لکھی۔ کتاب کے نام سے ذہن کا انتقال اس طرف ہوتا
ہے کہ اس میں سائنس اور مذہب کے بعض مشترک مسائل و مباحث پر گفتگو ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے
بلکہ دماغوں پر سائنس کی جو حریت چھائی ہوئی ہے جس کے باعث مذہب اور اخلاق اور روحانیت
کے مطالعے میں بھی اس کے فیصلے کو حجتِ مطلق مانا جائے گا ہے۔ اس حریت کو دور کرنا کتاب کا
بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ شروع میں مولانا نے اس پر بحث کی ہے کہ آدمیت اور اصل ہے کیا؟ اس
سوال کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ انسانیت ہم سبھی درمیان میں ہے جس کو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے
کیونکہ کسی حقیقت کے وجود کے انکار پر وہ اٹھتا ہے۔ تو اس جیسے ہزاروں اور پورے مسائل پر تھانے
ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن عالمِ غیب کی پرہ کشائی کے سلسلے میں سائنس اب تک جو کچھ کر سکی
ہے کیا وہ انسان کے دماغی و فطری حقیقت کی تسکین کے لیے کافی ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔
لہذا سائنس کی گزشتہ تین سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ مٹا دی گئی کے میدان میں اس علمِ حیات

انجیز ترقی پیش رفت کے بامقصد کائنات کی تخلیق اور اس کی تھیں و تھیں اب میں نظر آتی۔
 طور پر اب تک سائنس کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکی ہے جس کو عرب آخر کہا جاسکے چنانچہ اس کی
 گزشتہ تاریخ افکار و نظریات میں تغیر و تبدل کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی اور نہایت
 اہم تغیرات و تبدلات کیا ہیں؟ کتاب کا بڑا حصہ سی ایک سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔ ان
 اہم تغیرات کو برصغیر ہند پاک کے مشہور ماہر ریاضیات و سائنس ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔
 صدیقی والس چائلز پینڈا دیوینی و رشی پاکستان مجنوں نے اس کتاب کا مبسوط و مفصل اور
 بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ خدا ان کی زبان سے نیلے فرماتے ہیں۔

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر بنی
 انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہا تھی، عین اسی زمانے میں بے درپے
 چند ایسے حیرت انگیز اور متضاد ہوتے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور مسلم
 طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا اس مادہ اور توانائی - ذرہ اور موج،
 جہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصورات ہی سے
 سے بدل گئے اور قد قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لایا جانے لگا۔ ان تغیرات
 نے نیوٹن اور لکیسول کی طبیعیات کے بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس
 کی بنیاد کو انٹیم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے (ص ۱۷۷)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وضاحت سے بتایا کہ انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی
 ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک حجم شے ہے جو
 ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے
 جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ
 خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی حجم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے بلکہ
 جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے۔ اور جہر و موج کے ہمیت ہو گیا ہے

کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی توانائی مادہ میں کسی مادی شے کی کیت منتقل نہیں۔ بلکہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور قدر کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح ایٹم (جو سہرے کے متعلق ۱۸۹۵ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے چھوٹے ذرے ہوتے ہیں جن کو الیکٹرون۔ پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ذرہ اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور چند معین مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح ویسے طاقت ہوتا ہے جیسے سداغ اس کے سیلابوں کے درمیان ایکمیائی عناصر سے متعلق رابطہ تصور یہ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے مادہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ان کی ہیئت اور ماوریت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے جیسے ہائیڈروجن۔ آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ جیڈ برس پہلے تک یہ خیال تھا کہ ایسے کیما کی عناصر کی تعداد بالفاظہ ۹۲ ہے۔ اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا محال ہے۔ لیکن آج کل یہ کیما گری تجربہ خانہ میں ہر وقت کی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن تجربہ خانہ میں نئے عناصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گزشتہ تیس برسوں میں یورینیم کے علاوہ تقریباً پندرہ نئے عنصر اہل بنائے جا چکے ہیں۔ زمان و مکان کے تصور کا مریض بھی نہایت اہم ہے اس کی روئندو کی سن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن کے نظریاتی اور تجرباتی دونوں قسم کے۔ رجحانات کی بنیاد پر اعلان کیا کہ مطلق زمان اور مطلق مکاں کا تصور میں کو نیوٹن اور اس سے قبل علامہ اور حکماء نے پیش کیا تھا۔ اب قابل قبول نہیں رہا۔ آئن سٹائن نے مسلسل تجربات کے بعد دیکھا کہ زمان میں وقت کوئی مطلق شے نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی متغیر ہے۔ گلیکس کے لئے جو واقعات ہم وقت میں منظر ہر نہیں کہ گلیکس کے لئے بھی وہ ہم وقت ہوں۔ بلکہ بے حد بڑے گلیکس کے لئے بھی یہ صورت ہے بلکہ وقت کے بہاؤ کی شرح کا بھی ان دونوں کے لئے یکساں ہوتا ہوا نہیں ہے زمان کی مانند مکان میں بھی مطلق نہیں۔ بلکہ اضافی ہے۔ کچھ نہ کہ دو حرکت متغیر

کے درمیان فاصلہ کے کوئی معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس خاص وقت کے لیے یہ فاصلہ ناپا جا رہا ہے۔ اور کونسا مشاہد اس فاصلہ کو ناپ رہا ہے۔ اب چونکہ وقت خود اضافی ہے اس لیے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے، لازماً اضافی ہوگا۔ اسی بنا پر نظریہ اضافیت کی رو سے زمان و مکان مطلق اور ایک دوسرے سے آزاد نہیں بلکہ اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور کائنات میں دو مختلف چیزیں مکان اور زمان نہیں۔ بلکہ ایک ہی شے مکان۔ زمان "پائی" جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی تک دنیا کا جو سہ ابعادی تصور رائج تھا اس کے بجائے اب چار ابعاد (DIMENSION) تسلیم کر لیے گئے ہیں۔

علامہ ایزن ہوٹن نے قوت کو بھی مطلق تصور کیا تھا۔ لیکن آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کو اور وسعت دے کر ثابت کیا کہ زمان۔ مکان اور کیمیت کی طرح قوت بھی اضافی مفہوم ہے بلکہ اور آگے بڑھ کر بتایا کہ قوت کا علیحدہ تصور ہی بیکار ہے۔ مختلف تجربات اور مشاہدات کے بعد آئن سٹائن نے کہا کہ ہم جس چیز کو قوت کہتے ہیں وہ کوئی الگ اور مستقل بالذات چیز نہیں۔ بلکہ صرف مکان۔ زمان کی ہی ایک خاصیت ہے۔ نظریہ اضافیت کے انکشاف سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ فضا لامحدود ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن آئن سٹائن نے بتایا کہ کائنات متناہی ہے۔ اور اس کے دو نقطوں کے درمیان کا فاصلہ متعین ہے۔ لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گولہ کی شکل کی ہے اس لیے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کر سکتے ہیں۔ زمان و مکان، مادہ اور توانائی، عنصر اور قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے طبع و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی تسبیح آگیا ہے۔ نیوٹن کی میکینکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی۔ میکینکس کا یہ مسئلہ تھا۔ جو مادہ پرستوں کے لیے حکم فیصلہ کا کام دیتا ہے۔ اور جس کی بنا پر وہ کسی حالت کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنیاد پر بد غیر

ہائی زن برگ نے ۱۹۲۷ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں یقین یا جبر نہیں۔ بلکہ عدم یقین۔ جاری و ساری ہے۔ اس کے بعد سے طبعی سائنس کا رویہ اور مسئلہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ پر تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر یقین نہیں ہے اس طرح قوانین قدرت یقینی (DETERMINISTIC) نہیں۔ بلکہ اوسطی یعنی (STATISTICAL) ہو جاتے ہیں۔

سائنس کی دنیا نے فکر و خیال میں ان اہم اور بنیادی انقلابات کا تذکرہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ دراصل ہائی زن برگ کے اصول عدم یقین PRINCIPAL of INDETERMINACY کے انکشاف سے قبل ہی بعض مشہور سائنس دان اس امر کا اعتراف کر رہے تھے کہ سائنس کے طریقوں سے اشیا اور مظاہر کی انتہائی حقیقت یا غایت کو نہ تو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ یہ چیزیں سائنس کے دائرہ عمل میں آتی ہیں ۱۹۲۲-۲۳ء کے بعد جب نیلس بوہر (NEILS BOHR) کے کیٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۲۶-۲۷-۱۹۲۵ء میں نئی کیٹم میکینکس کی بنیاد رکھے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر یقین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری حاکمیت اور حقیقت معلوم کرے۔ بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیا اور مظاہر میں۔ باہمی ربط اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مکمل کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ ”برق کی حقیقت اور حاکمیت کیا ہے؟“ بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے؟ (ص ۵۵)

انہیں اس سلسلہ کی سب سے کام اور اساسی بات بھی خود ڈاکٹر صاحب کی زبان سے کہنی چاہیے:

”آگے چلے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصور میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما

جہاں یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے بنیادی قوانین استقرائی (INDUCTIVE) نوعیت کے تھے۔ مثلاً قانون تجاذب کو ہی نے لیجے۔ یہ قانون خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منکس یا منعطف یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے۔ لیکن ۱۹۰۵ اور ۱۹۱۵ء میں آئن اسٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لیے جو قانون یا مفروضے (POSTULATES) اختیار کیے وہ استقرائی نہیں بلکہ علیاتی (EPISTEMOLOGICAL) یعنی فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔ چنانچہ یہ مفروضے جن پر نظریہ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے۔ استقرائی نہیں بلکہ علیاتی ہیں۔ اسی طرح ہائیڈروجن برق کا عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکینکس کا دار و مدار ہے۔ استقرائی نہیں بلکہ علیاتی ہے۔ پروفیسر ریڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں فرض کرو ایک سائنسدان کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ۲۰ پہلے تو بزم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے۔ مگر اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے۔ مگر اس قانون کو اخذ کرنے کے لیے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام قاتے ایک انچ طول کے ہیں۔ شروع میں ہی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے۔ کہ اس حوال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جاسکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔ بہر حال سائنس میں اس نئی تحریک کا مطلب یہ ہوا کہ قوانین قدرت کی تشکیل کے لیے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دور رس اور دیر پا قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ استقرائی قانون تو ایک بھی قانون مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ نیوٹن کا قانون جواب اس کو اس لیے مسترد

کرنا پڑا۔ کس قانون کی بنا پر ستیادہ عطار دکا جو مدار محسوب کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کیے ہوئے مدار کے مقابلہ میں غلط ہے۔

ایک مشہور سائنس دان کے قلم سے طبیعی علوم کی ترقیوں اور سائنس کے افکار و نظریات میں اہم رد و بدل کی جو مختصر و مکمل مذکورہ بالا سطور میں بیان ہوئی ہے۔ اس کو متن سمجھنا چاہیے مولانا کی کتاب اسی متن کی شرح ہے لیکن یہ شرح فنی اور ٹیکنیکل نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ موصوف سائنس کے طالب علم کبھی نہیں رہے۔ بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اوپر سائنس میں جس تغیر و تبدل کا ذکر ہوا ہے۔ مولانا انہیں کا تذکرہ اکابر سائنس و فلسفہ مثلاً ائن سٹائن ہائی زین برگ سر جیمز جینیس سر آر تھر ریدھنگٹن۔ فلپ فرانک برکلی۔ برٹنڈسلی وغیرہم کی زبان سے مع ان کے مکمل جوابوں کے سناتے چلے گئے ہیں۔ اور آخر میں مولانا نے بتایا ہے کہ جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انہوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ وہ ٹوٹ گیا اور کم از کم ایک آفاقی ذہن (UNIVERSAL MIND) کا تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا تو اب کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لیے خدا کی ہستی پر ایمان لانے کی نئی راہیں کھل گئیں۔ چنانچہ مولانا نے گفتگو اس پر ختم کی ہے یہ آفاقی ذہن کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اور اس کے صفات کیا ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب قرآن ہی دے سکتا ہے جو منزل میں اللہ ہے۔ اور ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے کسر محفوظ و مامون ہے اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ کتاب بڑی مفید، مفکرانہ اور معلومات افزا ہے اور بقول فاضل مقدمہ نگار کے ان اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کڑھکا کا نشانہ ہو رہے ہیں۔ یقیناً حکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان ہے۔ لیکن تبصرہ نگار اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا۔ اگر فاضل مصنف کی توجہ اور ذہیل کی طرف مغلطہ نہ کرانے۔

سائنس میں جو تغیرات جو تبدیلیاں ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ علت و معلول کا تصور بھی

بدلا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب اپنی محتاط اور علمی زبان میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

”ان دو مکان ملوہ اور توانائی، عنصر اور قوت جیسے بنیادی تقویدات بدلنے کی وجہ سے

علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔“ (ص ۴۳)

لیکن مولانا اسی بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”مجھے عقل و فلسفہ کی دنیا میں علت و معلول کا جو قانون ازلی اور ابدی حیثیت سے مسلم چلا آ رہا تھا بیسویں صدی کی سائنس نے اس کا بھی نیچہ ادا کر دیا۔ (ص ۲۹) آگے چل کر اس سلسلہ میں فرماتے ہیں اور اس حلیک (کلی و قطعی علیت کو) خیر یاد رکھ دینا پڑا کہ بعض وصال سائنس خصوصاً ریڈیو گیس جیسی مسئلہ شخصیت کا زیادہ زور اسی پہ ہے کہ قانون علیت ختم ہو چکا ہے اور اب اس کو ترک ہی کر دینا چاہیے۔“ (ص ۱۱۱)

مگر دانش یہ ہے کہ قرآن مجید کی جا بجا تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ پورا نظام نہایت مربوط و منظم اور مرتب ہے اس میں کہیں کوئی رخسہ اور بے ترتیبی نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بے شبہ یہ سب کچھ صانع عالم کی تخلیق ہے۔ اور اسی لیے اس کے وجود اور اس کی صفات پر دال ہے لیکن جو کچھ تلبہ وہ نہایت نظم اور ترتیب سے بنا ہے۔ اس بنا پر اشتیاء میں علت و معلول کی نسبت کا ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دو چیزوں میں علت و معلول کا جوڑہ ہے۔ اس کا علم کلی انسان کے لیے حاصل ہونا ضروری نہیں چنانچہ سائنس بھی اس سے اب تک عاجز ہے۔ اس بنا پر اسے قدم قدم پر دھوکہ ہوتا ہے۔ آج جس چیز کو وہ کسی کے لیے علت قرار دیتی ہے کل معلوم ہوتا ہے کہ وہ علت ہی نہیں تھی یا تھی! لیکن اس کی علت کی بنیاد وہ چیز ہی نہیں تھی جن کو اب تک وہ علت کی بنیاد سمجھتی رہی تھی۔ یا سرے سے سائنس نے علیت اور علت کا جو مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا وہ ہی غلط تھا۔ بہر حال قرآن مجید کی تصریحات کی روشنی میں ہمارے نزدیک صحیح تعبیر بیان وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ علت و

مطلوب کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ مولانا کے الفاظ سے دھوکہ ہوتا ہے کہ اب علت و معلول کا قصہ ہی ختم ہو گیا۔ یہ چیز خالق کائنات کے کمال صناعتی اور قرآن مجید کے بیان کے خلاف ہے۔
۳۔ مادہ اور مادیت کا جب طلسم ٹوٹا تو سائنس نے تصویریت کے دامن میں پناہ لی۔ اور یہ تسلیم کیا کہ عالم میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف ایک آفاقی ذہن ہے۔ اور اس طرح ذہن سے باہر کسی شے کا وجود خارجی ہے ہی نہیں چنانچہ مولانا اس سلسلہ میں علمائے سائنس کے بیانات نقل کر کے لکھتے ہیں۔

مطلب یہ کہ صورت، شکل، روپ، رنگ، طول و عرض، اور سختی وغیرہ کے جس مجموعہ کو ہم عام بول چال میں چیز کہتے ہیں۔ اور جانتے ہیں۔ ایسی کسی چیز کا خود ہمارے ذہن سے باہر سائنسی طور پر قطعاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہی حال زمین سے آسمان تک کی دوسری ساری موجودات کا ہے جن سے دن رات ہم اپنی زندگی میں

دوچار رہتے ہیں (دس ۱۷۹)

مولانا نے سائنس کے اس انکشاف کا بڑی فراخ دلی سے خیر مقدم کیا ہے۔ حالانکہ اگر یہ صحیح ہے تو یہ وہی بات ہوئی ہے وحدت الوجود والے کہتے ہیں۔ اور جس سے عبد و معبود، خالق و مخلوق کا فرق اور مذہب کے احکام و مسائل اور اس کی تعلیمات کی بنیاد ہی بدم ہو جاتی تھی۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں سے بھی مترشح ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ سائنس کے نزدیک پہلے سب کچھ مادہ ہی مادہ تھا۔ اس عالم میں کار فرمائی اور کارگزاری اسی کی تھی۔ لیکن اب یہ پردہ درمیان سے اٹھا لو نظر آئے کہ اب تک جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا۔ بلکہ حقیقت ایک آفاقی ذہن ہے جو کائنات میں کار فرما ہے اور یہ عالم ارض و سما اسی کی ہی صناعتی کالیکٹوئی کرشمہ ہے۔ ہر شے کا وجود و دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وجود ذہنی اور دوسرا وجود خارجی۔ اور کسی شے پر بننے بجھنے، نرم و سخت اور سیاہ و سفید وغیرہ ہونے کے جو احکام لگتے ہیں وہ اس کے وجود خارجی پر ہی لگتے ہیں۔ سائنس اگر ترقی کے اس عظیم دور میں ملا دے، یا غیب اور غایب

فروق کی سطح پر اتر آئی ہے۔ تو پھر کوئی بتائے کہ ہل اور علم میں اب حدِ ماضی کیا ہے ؟
۳، مولانا نے بعض مقامات پر علمائے سائنس یا سائنس کے بعض نظریات کی نسبت
استہزا اور تمسخر کی جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ ایک علمی کتاب کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔
اگر یہی انداز دوسرے لوگ ہمارے مذہب اور اس کے علماء کی نسبت استعمال کریں تو ہم
کس منہ سے اس کی شکایت کر سکتے ہیں ؟ اور یوں بھی یہ طرزِ قرآن مجید کا حکم و لافِ تاجِ دوا
بالا لہاب کے خلاف ہے ۔

۴، کتاب میں تکرار مضامین اس درجہ ہے کہ خدا کی پناہ ! ایک ہی بات کو بار بار پڑھتے ہوئے
سر میں درد ہونے لگتا ہے ۔

۵، ہمیں معلوم ہے کہ مولانا صرف فلسفی نہیں بلکہ اردو زبان کے بلند پایہ ادیب اور شگفتہ قلم
بھی ہیں لیکن انوس ہے کہ جب سے انہوں نے نقشب سے رشتہ جوڑا ہے ان کا طرزِ نگارش
بھی بالکل بدل گیا ہے۔ شگفتگی، بیان کی جگہ غیر ضروری طوالت، کثرتِ مرادفات اور ثولیبہ
بیانی نے لے لی ہے اور یہ اردو زبان کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے۔ اس جدید طرزِ بیان کا ایک
پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا ایک ہی لفظ کی تکرار بے موقع اور بے محل کرنے لگے ہیں مثلاً اگر
لکھتے ہو کہ ”زید نے پانی پیا“ تو مولانا اس طرح لکھیں گے ”زید نے پانی ہی پانی پیا“ یا ۔
”دیکھنے پانی پیا ہی پیا“ مولانا خود سہ ماہیں ۔ یہ کون سا اسلوبِ بلاغت و انشا د ہے ۔
یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ راقم الحروف کو مولانا سید مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہانگاہ
میں ان کے غیر معمولی شفقت بزرگانہ کے باعث جو بے تکلفی حاصل تھی ۔ اس کی وجہ سے ایک
دن عرض کیا ۔

مولانا ! اگر آپ اپنے طرزِ تحریر کی اصلاح کر لیں تو اس کی افادیت سچہند ہو جائے اب
تو حال یہ ہے کہ میرا ایسا آپ کا معتقد بھی آپ کی کوئی تحریر از اہل نا آخود لمبھی کے ساتھ
نہیں پڑھ سکتا ۔ مولانا نے یہ سنکر اپنے خاص انداز میں منبرمایا ۔

• جہاں اہم لوگ شہلوی انداز تحریر کے مارے ہوئے ہو۔ میں اس انداز نگارش کو بچری کہتا ہوں۔ مولویانہ طرز تحریر وہی ہے جو میر لہے مولانا کے اس ارشاد کے بعد مزید کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ میں اور مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی) ایک قہقہہ لگا کر خاموش ہو گئے۔ تو کہیں مولانا عبدالباری صاحب کا یہ جدید طرز نگارش اسی قسم کے تاثر کا نتیجہ نہیں ہے ؟

بہر حال کتاب بہت قابل قدر۔ دقیقہ نگار اور لائق مطالعہ ہے۔ بجز اللہ جزا فیہ۔

جہانگیر کی نصیحت نامہ - بقیہ ص ۱۹

اعتبار سے خرچ کرو۔ نامعلوم کاموں سے دور رہو۔ پہلے نئے درخت لگاؤ اس کے بعد پلانے درخت کھودو۔ اپنی چادر کے موافق پیر پہناؤ۔ بری صحبت سے بچو تاکہ بدنام نہ ہو۔ بے وقوف ماں، دیوانہ اور دست کو نصیحت مت کرو۔ بلکہ ماننے اور سننے والوں کو نصیحت کرو۔ ماں باپ کے حق کو ہمیشہ ملحوظ رکھو اور اس کو ادا کرو۔ نامزدوں اور کمینوں سے دوستی نہ کرو۔ لوگوں کے مال پر طمع کی نظر نہ رکھو۔ شراب اور کھانا تہانہ کھاؤ۔ جوانی میں ہی بڑھاپے پر نظر رکھو اور بڑھاپے کا کام جوانی میں ہی ٹھیک کر لو۔ عجوبی قسم نہ کھاؤ۔ اس دنیا کو تائت پر تیریاں کر دو۔ اسٹگم کی بیرونی میں کوتاہی نہ کرو تاکہ نجات ملے۔

”والسلام علی من اتبع الهدی“

مندرجہ بالا عربی دعائیہ جملہ پر نصیحت نامہ ختم ہے۔



آدمی کس کے سہارے زندہ ہے ..

زندہ رہنے کے لئے صرف روٹی ہی کافی نہیں۔ پیارا اور مہربانی
 سوجھ بوجھ بھی ضروری ہے۔ زندگی سے احساسات اور خواہشات کا بھلنا
 گہرا تعلق ہے، جتنا کہ دل کا۔ بیٹا ایک فن ہے اور حضورؐ بڑا ہی اس کا
 بنیاد۔ جب ہم دوسرے معاملات میں حضورؐ بندھی کہ اہمیت کو تسلیم
 کرتے ہیں تو انہیں سمجھنے کے لئے کہیں اس کا سہارا کیوں دلیں۔

زندگی میں، قیامت، اللہ کے رسولؐ کے لئے ہے.....
 خدائی حضورؐ کے لئے ہے۔

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس حکیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت بھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اپنی علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ لغاتِ قرآن کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حاملے بڑی آہستگی سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لا جواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	•	پانچ روپے	• چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	•	پانچ روپے	• چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	•	چھ روپے	• سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	•	آٹھ روپے	• نو روپے
جلد ششم	۳۲۳	•	پانچ روپے	• چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

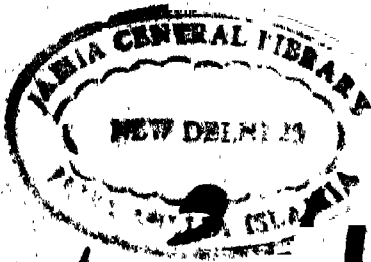
مکتبہ بریلان اردو بازار جامع مسجد دہلی

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دینی و علمی دینی مآہرنا

19 JUL 1972



بریک

منشی
شیخ عبد الباقی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص المرآء

قصص القرآن کا شمار ادارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۴۳ ہیں۔

حصہ اول بہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم بہ حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانحیات اور ان کی دعوت حق کی متفقانہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم بہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف والرحمہ اصحاب القبرۃ اصحاب التبت، اصحاب الرقص، بیت المقدس اور یثرب، اصحاب الاخدود، اصحاب البقیع، اصحاب الجحیم ذوالقرنین اور سب تو سکنندہ ری، سبا و یثرب، عرم و غیبہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و متفقانہ تفسیر۔

حصہ چہارم بہ حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و علیہ السلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم ساٹھ روپے جلد چہارم نو روپے

قیمت مکمل سٹ آئینس روپے۔ اُجرت فی جلد فی پاورچ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان، اُردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۶۹ ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ مطابق جولائی ۱۹۴۲ء شمارہ ۱-۵

فہرست مضامین

۱	نظرات اُردو کے معاملات	سعید احمد اکبر آبادی	۲
۲	مسائل - (۲۵)		
۳	مقالات: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	" " "	۱۱
۴	مولانا ابوالکلام آزاد (ایک جائزہ)	جناب محمد شعیب صاحب عمری بھٹنور	۲۶
۵	فارسی شاعری میں لطافت و ظرافت	جناب خان محمد عاطف صاحب طبع آبادی	۴۴
		دانش گاہ تہران	
۵	جنوبی افریقہ کے مسلمان	جناب احمد ثبات صاحب	۵۶
۶	تہذیب کا دورِ جدید اور اجتہاد	جناب ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان	۶۱
	کی ضرورت		
۷	تبصرے	س ع	۶۷
۸	اشعار و نثر		۷۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

اُردو کے معاملات و مسائل

اب وہ حضرات جنہوں نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کو اردو کی حفاظت کا قلعہ بنایا تھا۔ وہ فرمائیں کہ کیا حفاظت اسی طرح ہوتی ہے؟ اور کیا اسی کو قلعہ کہا جاتا ہے۔ پورے پاکستان میں یوپی اور بہار کے جاہلین کا ایک طبقہ ہے جو اردو زبان کو اب تک سینے سے لگائے بیٹھا ہے۔ اور جس کی عورتیں اور بچے اُردو میں بولتے اور گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اُدل تو اس طبقہ کی بڑی آبادی گراچی میں ہے۔ اس لئے اردو بحیثیت ایک بولی کے ایک شہر میں نہیں بلکہ اس کے بھی بعض علاقوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اور پھر دہاں بھی ماحول بدل رہا ہے۔ سوسائٹی کے طور طریق تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور فضا روتہ ہر روز متغیر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کو اپنے جدید ہم وطنوں کی طرف سے اپنی زبان اور تہذیب پر وقتاً فوقتاً جلی کٹی باتیں بھی پڑ رہی ہیں۔ اس بنا پر پاکستان کی مرکزی حکومت میں اُردو کو ریاستی زبان تسلیم کر لینے کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل اس کا انجام کیا ہو گا؟ مہاجرین کے بوڑھے بڑے مرد اور عورتیں آج جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ کل ان کی آئندہ نسلیں بھی اس زبان میں گفتگو کر سکیں گی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا بہت مشکل ہے۔

یہ تلخ اور بے مزہ داستان اس لئے دہرائی گئی ہے کہ مسلمانوں میں اقصائے نفس اور خود اپنے اوپر تنقید کا جذبہ اور مادہ پیدا ہوا اور وہ یہ محسوس کریں کہ انہوں نے خود اپنے اوپر اپنی زبان اور اپنی تہذیب پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ بد قسمتی سے ہم عادی اس بات کے ہو گئے ہیں کہ اپنا کام خود

بگڑائیں اور دوسروں سے (خواہ وہ حکومت ہند ہو یا ہندوستان کی اکثریت) جس کا ذکر آ رہا ہے، پاکستان کی حکومت اور وہاں کی اکثریت، اس کی توقع قائم کریں کہ وہ ہماری بگڑی کو بنا دیں گے۔ اور جس جامہ کو اپنے دست جنوں سے ہم نے تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے اس پر بخیر گری کر کے ہمیں دے دیں گے۔ جو قوم اس درجہ کی شست و سرور۔ کام چور۔ دوسروں کی چشم کرم کی محتاج (PARASITE) ہو وہ نہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور نہ اپنی زبان اور تہذیب کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔ صحیح عمل کی شرط یہ ہے کہ انسان میں خود شناسی پیدا ہو اور وہ کھلے دل سے اپنے انکار و خیالات احساسات و جذبات اور اپنے افعال و اعمال کا جائزہ لے اور اگر ایک مدت کے تجربہ اور مشاہدہ کے بعد اس کو یہ محسوس ہو کہ اس نے ایک غلطی کی تھی جس کا نتیجہ بد آج اس کو اس صورت میں دیکھنا پڑ رہا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ وہ اب تک جس راستہ پر چلتا رہا ہے اسے ترک کر کے تلافی یافتہ کے لئے ایک نیا قدم اٹھائے۔ محض گردش روزگار کا تماشائی بنے رہنے سے ذہن کی تقدیر نہیں بدلتی!!

یہ تو اردو کی سرگزشت تھی۔ اس ملک کی جس کو مسلمانوں نے اردو کے لئے ایک حفاظتی قلعہ کی حیثیت سے بنوایا تھا۔ اور جہاں کی وہ حکومتی اور قومی زبان تھی بھی! اب آئے آپ اپنے ملک میں دیکھیں کہ گزشتہ ایک ربع صدی سے اس پر کیا گند رہی ہے۔ اور کیوں بتامیخ مسلمانوں اور ہندوؤں کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی کہ ایک نے زبان کا دامن مذہب سے وابستہ کر کے اس کی دستوں کو محدود اور صرف ایک مذہبی گروہ کے اندر اس کو مقید کر دیا اور اس کو ملک کی تقسیم کے اسباب و داعی میں سے ایک داعیہ بنایا اور دوسرے نے جواب ترکی تہریک کو اپنا دستور بنا کر اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا کہ اوٹ پانگ کسی کے کہنے کا اعتبار! اردو تو درحقیقت خود ان کی اپنی ہی زبان ہے اور اس کے پروان چڑھانے میں ان مدعیان خود کام کے علاوہ ان کے اپنے بزرگوں کا بھی بڑا قابل قدر حصہ ہے۔ ایک گھر اگر دو شخصوں میں مشترک ہے اور ایک شخص باہل ہو کر چمخانا شروع کر دے کہیے گھر تو میرا ہے۔ تو اس صورت میں شریک ثانی کی عقل مندی اہم

حقیقت شناسی کا تقاضا کیا ہونا چاہیے، یہ کہ وہ بھی پاگل بن جائے اور انتقام کے جذبہ میں اس گھر کو ہی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے جسے جن کرنے لگے۔ یا یہ کہ کم از کم اپنے حصہ کی نگہداشت کرے اور اسے برباد نہ ہونے دے۔ اُردو کے معاملہ میں بد قسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ اس ملک کی اکثریت نے جذبہ انتقام سے لبریز ہو کر اُردو زبان سے نہ صرف اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ بلکہ اس کو اس ملک کی زبان تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اور یہ افکار اس زور و شور اور قوت کے ساتھ کیا گیا کہ اکثریت میں جو لوگ انصاف پسند تھے۔ ان کو یا تو اس کی تردید کی جہات نہیں ہوئی اور اگر کسی نے اِکاؤ کا اس کے خلاف آواز اٹھائی بھی تو وہ انہو اکثر کے شور و غل میں دب دیا۔ کہہ گئی اس صورت حال نے اُردو کی اصل پوزیشن ہی بدل دی۔ حد یہ ہے کہ اب مرکزی حکومت یا بعض ریاستی حکومتیں اُردو کے لئے کچھ کر بھی رہی ہیں تو اس لیے نہیں کہ یہ ایک اہم قومی مسئلہ ہے۔ بلکہ اس نیم شعوری تخیل کے ساتھ کہ یہ مسلمانوں کا معاملہ ہے اور حکومت ان کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔ یہ درحقیقت اُردو کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ بلکہ نا انصافی ہی کی ایک دوسری انصاف نامشکل ہے اور اس لئے اُردو کو اس پر خوش یا مطمئن ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ ذکر تو یہاں غمنا آگیا۔ ورنہ آگے اپنے موقع پر گورنمنٹ کے ان کارناموں پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ بہر حال تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں اُردو لاوارث۔ بے یار و مددگار اور زبون حال ہو کر رہ گئی۔ اس کا نقش وجود خطوں میں پڑ گیا۔ اور چاروں طرف سے اس پر مخالفانہ یورش ہونے لگی۔ ظاہر ہے جب اپنے بھی کترانے لگے ہوں۔ تو اس کے بقا کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی۔ لیکن بحیثیت ایک علمی اور ادبی زبان کے اُردو کی بھائی، دلکشی، اور جاذبیت اور اس وجہ سے اس کی صلاحیت تربیت و بقا کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان سخت مایوس کن اور دل شکست حالات میں بھی علم و ادب کی جانی پہچانی منزلوں میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس میں اس کی ترقی کا قدم رکھا ہو اور وہ برابر آگے نہ بڑھتی رہی ہو۔ اگرچہ شاعری کے میدان میں بھی

اس نے پیش رفت کی ہے اس میں نئے تجربے ہوئے۔ اور کچھ نئے آہنگ سناؤ دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر زمانہ کی شاعری اس زمانہ کے سماج کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس بنا پر ان کچیس برسوں میں یہاں شاعری کا جو ذخیرہ پیدا ہوا ہے اس میں مجموعی حیثیت سے ناکامی درماندگی کا احساس قنوطیت، جھجلاہٹ، تلخی، بد مزگی، نراہیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ بے شبہ غم اور سوز و گداز شاعری کی جان ہے۔ لیکن صرف وہ غم جو زیست کا ارمان بن گیا ہو اور وہ سوز و گداز جو حوصلہ و عشق و محبت کی جبین کا نور ہو۔ لیکن نئی نسل کی شاعری میں غم اور سوز و گداز دونوں اپنی اس صفت سے محروم ہیں۔ اس بنا پر اس شاعری کی آواز گھمی گھٹی اور لب و لہجہ پھیکا پھیکا سا ہے۔ یہ شاعری سماج کی ترجمانی ضرور کرتی ہے۔ لیکن اسے کوئی راہ نہیں دکھاتی غم کی کہانی سنانا ہی ہے لیکن غم کو حاصل زیست بنا لیں گے حوصلہ نہیں بخشی۔ یہ سرمایہ داری طبقاتیت اور سماج میں ادنیٰ نیچ کی مرثیہ خواں ہے۔ لیکن جو عشق آتش نمرود میں بے خوف و خطر کود پڑتا ہے اور جوشن مطلق و مجرور کہ محیط کائنات اور راز کن نکال ہے۔ ان دونوں کی طرف سے اس شاعری کی آنکھیں بند ہیں۔ اس بنا پر یہ شاعری ہنگامی اور وقتی ہے اور اس میں وہ ابدیت نہیں ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کو تروتازہ اور زرمندہ و پائندہ رکھ سکے۔ ہماری پرانی نسل کے شاعر جواب خدای رہ گئے ہیں۔ ان قدروں کو اب تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور یہ ان ہی کے انفاس گرم کا صدقہ ہے۔ کہ تقسیم کے بعد بھی یہاں اردو شعرو شاعری کے باغ میں خزاں نہیں آئی۔ جدید شاعری کے عنوان سے جو نئے تجربے ہو رہے ہیں ان کا مستقبل ابھی غیر یقینی ہے۔ اب تک اس کو قبول عام کی سند نہیں ملی۔ اس لئے اس کے متعلق ابھی پیش گوئی کرنا قبل از وقت ہے

شاعری سے قطع نظر علم و ادب کے ہر میدان میں اس کی تاحیت جاری ہے تقسیم سے پہلے جوا لہدے قائم تھے شوق دار المصنفین اعظم گوشتہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ انجمن ترقی اردو دہلی انجمن اسلام آباد اور سیرت انسٹیٹیوٹ ممبئی۔ ان دواڑوں میں کام کی رفتار اور نوعیت وہی ہے جو

پہلے ترقی۔ ان کے علاوہ چند چھوٹے موٹے اور نئے ادارے بھی کھلے ہیں جو اردو میں کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ روزنامے، رسرورڈز اور ہفتہ وار اخبارات و جرائد اور ماہانہ مجلات و رسائل جن میں معیاری بھی ہیں اور غیر معیاری بھی تقسیم سے پہلے کی طرح اب بھی نکل رہے ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ خود اردو زبان کے ادب پر تحقیق و تنقید اور اس کے درس و تعلیم کا جو اہتمام اب ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد کی نسبت سے اگرچہ بہت کم (تاہم متعدد یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں اور پانچ چھ یونیورسٹیوں میں اس کی پروفیسر شپ بھی ہے ان شعبوں کے ماتحت تعلیم و تدریس اور تحقیق و ریسرچ کے کام ہو رہے ہیں یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان یونیورسٹیوں نے دہلی، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ، گورکھپور، کشمیر، حیدرآباد، بمبئی اور مدراس وغیرہ میں ایسے لائٹ و فاضل نوجوانوں کا ایک حلقہ پیدا کیا ہے جنہوں نے اردو زبان میں تحقیق و تنقید کا معیار بلند کر دیا۔ اور بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں۔ اسی سلسلہ میں خاص انسانیات اور دکنی زبان پر جو کام ہوا ہے۔ وہ بڑا قابل قدر اور امید افزا ہے اس نے زبان کا علمی وقار بڑھا دیا ہے۔ لیکن جو موضوع ہمارے ادیبوں اور مصنفوں کا سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہا ہے وہ فن تنقید ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان پچیس برسوں میں اسی موضوع پر کتابوں اور مقالات کی وہ بھرمار ہوئی ہے جو کسی اور موضوع کے حقہ میں نہیں آتی لیکن تنقید ہر ادب کا ایک ایسا بازار ہے جہاں کھوٹا اور گھرا سب کی کھپت ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ خوشی کی بات ہے اس سلسلہ میں جو لیکچر پیدا ہوا ہے اس میں معیار کی ادھر کھڑے ادب کا پلہ بہ نسبت کھوٹے اور غیر معیاری کے بڑھا ہوا ہے۔ اور یہ ان اساتذہ کی کوششوں اور توجہ کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اردو کے نوجوان ادیبوں اور مصنفوں کی تربیت کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو پروردان چڑھانے میں خون جگر پیایا ہے۔

اردو کی اس ترقی کے سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں (۱) ایک یہ کہ اس زبان کی علمی اور ادبی دلکشی اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی ترقی اور پیش رفت میں اردو دانوں کے ساتھ ان حضرات کا بھی بڑا قابل قدر حقہ ہے جو دوسرے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اردو

فارسی کے ساتھ توخیر اس زبان کا شروع سے ہی چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اور اس کے میر کا رد ان عربی اور فارسی کے اساتذہ ان دونوں زبانوں کے ماہر رہے ہیں۔ عہد جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ ان دو زبانوں کے علاوہ جن حضرات کا اصل اور اساساً تعلق انگریزی زبان کے ادب اور لٹریچر سے ہے۔ یا جو فلسفہ انفسیات، تاریخ اور سیاسیات وغیرہ سے متعلق ہیں انہوں نے بھی اردو زبان کے ادب میں اپنی تحقیق و تنقید سے گراں قدر اضافہ کیا اور کر رہے ہیں، اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ گذشتہ پچیس برس میں اردو میں جو تحقیقی۔ تنقیدی یا شعری سرمایہ پیدا ہوا ہے اس میں بے شبہ ان ہندو۔ بلکہ بعض سکھ نوجوانوں کا بھی معتد بہ حصہ ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور اس میں روز بروز اضافہ کر رہے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے ایک صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ سائنس کے ڈاکٹر ہیں اور اب ان کو شوق ہوا تو یورپ کی کسی یونیورسٹی سے اردو میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں

علاوہ ازیں اردو کے جمال و لغت کی جہان تابی کا یہ عالم ہے کہ اپنے ملک سے باہر مشرق و مغرب کے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو بھی اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنالیا ہے۔ چنانچہ آج امریکہ یورپ۔ مشرق وسطیٰ۔ افریقہ اور اس کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ ریسرچ کا بندوبست ہے اور مختلف قسم کے منصوبے ہیں جن کی تکمیل پر لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ ہو رہے ہیں۔ اور میر و غالب کی مغربی مشیکسٹر اور ملٹن کے وطن میں گل اندامان مغرب کا رہے ہیں۔ ہندوستان میں گذشتہ سو برس کی تاریخ کا کوئی شبہ ایسا نہیں جس پر ریسرچ اور اردو زبان کو سیکھ بڑھ کر ہو سکے۔ اس بنا پر جن غیر ملکی یونیورسٹیوں میں روٹوچی کے ڈپارٹمنٹ قائم ہیں ان کے ماتحت اردو کی تعلیم کا بھی اعلیٰ بندوبست ہے۔ اردو کی بھی وہ خدمات ہیں جن کے باعث وہ اپنے وطن کے ماہر بان دوستوں کو خطبہ کر کے کہہ گئی ہے

لہذا اگر توئی تازہ میں گھر کو میں

آپ کو حق ہے۔ اردو کی اس عظمت شان و رفعت مقام پر قننا بھی خوش ہونا چاہئیں ہو نیچے۔
 لیکن اس انقلاب رد و کار کا کیا کہنے کر کل تک پورا ملک جس زبان کا وطن تھا۔ آج پچیس کروڑ ان لوگوں کی
 آبادی میں کوئی ایک علاقہ بھی ایسا نہیں جس میں وہ اکثریت کی زبان نہ ہو۔ اقلیت ہی کی زبان
 یعنی نمبر ۱ تسلیم کی گئی ہو۔ ہندوستان میں اردو جس کی عوامی بولی کا نام ہندوستانی ہے، کے سوا
 کوئی اور زبان ایسی نہیں ہے۔ جو اپنے وطن اصلی کے علاوہ ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اور
 اس طرح گویا بین الصوبہ جاتی زبان ہو۔ لیکن اسی خصوصیت اور وسعت کے باوجود آج سرکار کے
 کسی دفتر میں اس کا گزر نہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے۔ ایک ربیع صدی بیت گئی۔ اس مدت میں کیا کچھ
 نہیں ہوا! ہر چیز ترقی کر کے کیا سے کیا ہو گئی! دیرانے عظیم الشان شہر اور کھنڈرات محل بن گئے۔
 لیکن یہ ایک اردو ہے جسے اسی ملک میں کہیں کوئی ایک ٹھکانہ ہی میسر نہیں!

سادن آئے پھول کھلے ایک افسردہ بول اٹھا: جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھاکب ہوتی ہے
 دستور نے جن چودہ زبانوں کو ملک کی زبان تسلیم کیا ہے ان میں ایک اردو کا بھی نام ہے
 لیکن کس علاقے کی سرکاری زبان ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں
 کھوٹ ہوتا ہے تو انسان بڑی سے بڑی بے انصافی کے لئے بھی جواز کی کوئی دلیل پیدا کر لیتا ہے۔
 لیکن اردو کے ساتھ یہ نا انصافی ایک ایسا کہلا اور دافعی جرم ہے جس کا جواز کسی دلیل سے بھی
 ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس ملک میں ایسی ساری اقلیتیں بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے عزم و ہمت
 استقلال و اختیار سے صوبوں کی تقسیم کرا کے اپنی زبان کے لئے ایک الگ صوبہ بنوا لیا ہے۔ لیکن
 اردو کی بد قسمتی! اس کے پجاری وہ بہادر ہیں جو اردو کو کارپوریشن تو کیا کسی میونسپلٹی کی زبان بھی
 نہیں بنوا سکے۔

حکومت کے دو حربے بہت سخت اور ساتھ ہی اب تک نہایت موثر ثابت ہوئے ہیں۔

ایک ہے دباؤ (PRESSURE) اور دوسرا ہے بہاؤ اور پھسلا۔

(PERSUASION) بھی وہ دوحربے ہیں جن سے اس نے ناکا لینڈ اور کشمیر کو فتح کیا۔

اور ان کے حالات کو بدل کر رکھ دیا۔ حکومت بھی دوحربے شروع سے اُردو کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اردو تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ اور جنہوں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں دستور کی ایک دفعہ کے ماتحت بیس لاکھ دستخطوں کا ایک سیورڈم ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ابھی بہار کے گورنر بھی تھے۔ ان میں کیسا انقلاب پیدا ہو گیا؟ اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے شروع میں میں نے انجمن ترقی اُردو منٹری بنگال کے صدر کی حیثیت سے کلکتہ میں ایک عظیم الشان انڈوپاک مشاعرہ کا اہتمام کیا اور اس کے ساتھ ہی انجمن کی دعوت پر کل ہند انجمن ترقی اُردو کی سالانہ کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ ان دنوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کلکتہ آئے ہوئے تھے سابقہ نیاز مندی کے تعلق سے ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انجمن ترقی اُردو کی سالانہ کانفرنس اور انڈوپاک مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست پیش کی لیکن بھلا سخت بالائی ہوئی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے درخواست کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے ازراہ معذرت فرمایا اب میں اردو کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔ واپس آکر دوستوں کے مشورے سے ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے۔ وزیر اعلیٰ منٹری بنگال کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی درخواست پیش کی۔ موصوف بے چون و چرا فوراً رضامند ہو گئے۔ لہذا جو حضرات اس کانفرنس میں اس وقت موجود تھے۔ انہیں یاد ہو گا کہ ڈاکٹر رائے نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اُردو میں تقریر کی اور اردو کے کارکی حمایت میں بڑی حوصلہ افزا باتیں کہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس وقت گورنر تھے۔ اس کے بعد وہ بلا پر بلند ہونے چلے گئے یہاں تک بلندی کا کوئی اور رینہ ہی نہ رہا۔ یوں وہ کے علاوہ اردو تحریک کے ابتدائی دور کے چند اور حضرات ہیں جن کو حکومت کی نظر حمایت کا ٹھکانا تھا۔

بہر حال حکومت نے اب تک پھلاؤ پھلاؤ کی جو پالیسی اختیار کی ہے۔ اب مرکز میں ترقی
اُردو بورڈ اور اتر پردیش میں اردو اکاڈمی اور اُردو بورڈ وغیرہ کا قیام یہ سب اسی کے فٹنہ خاستے
ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اردو والے اس ہم رنگ زمین دام میں گرفتار ہو گئے تو اُردو کا قصہ ہی ہمیشہ
کے لئے ختم ہو جائے گا۔ آج اگر مرزا غالب ہوتے تو ان ترقی اُردو بورڈوں اور اکاڈمیوں کے قیام
پر بمیاختہ فرماتے۔

مجھ تک کب ان کی نرم میں آنا تھا دودھ جام

ساتی نے کھ ملانہ دیا ہو شراب میں

چنانچہ خدا بھلا کرے مسلمانوں کی۔۔۔ نام نہاد قیادت کا! حکومت کی اس نظریات پر
بہت مسرور اور مطمئن نظر آتی ہے۔ حالانکہ کچھ دنوں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے یہ فرما کر
”اُردو کے علاقائی زبان ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اُردو کے حق میں منرائے موت یا کم
از کم جلا وطنی کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ لیکن کوئی پوچھے اس اعلان کے بعد بھی اُردو تحریک کا اس
ملک میں کوئی وجود ہے؟“ (باقی آئندہ)

ضروری گذارش

حضرات ممبران ادارہ اور برہان کے معزز ناظرین سے گذارش ہے کہ ادارہ
کی جانب سے آپ حضرات کی خدمت میں یاد دہانی کے جو خطوط ارسال
کیے جاتے ہیں۔ ان پر فوری توجہ فرما کر دفتر کو اپنی ہدایات سے مطلع فرما دیا
کریں۔

خطوط ارسال فرماتے وقت یا مئی آرڈر ارسال کرتے ہوئے کوپن پر
اپنی ہدایات۔ اردو اور انگریزی میں ملکی پتہ اور چٹ پر لکھا ہوا اپنا خریداری
نمبر درج فرماتا نہ بھولیں۔
(نیازمند (شیر)

مقالات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

فرض کیجئے آپ نے اپنا ایک گھر بڑی تمناؤں اور آرزوں سے بنایا ہے جن میں موجودہ زمانہ کی تمام سہولتیں اور آسائیاں فراہم ہیں۔ یہ مکان بنایا تو دراصل آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کی آسائش و راحت کے لئے تھا۔ لیکن آپ کے تعلقات وسیع تھے۔ اس لئے آپ کے دوست احباب جو ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ ان کے لئے اس مکان کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ یہ لوگ آتے تھے اور بے تکلف تھوڑے بہت دن یہاں مقیم ہو کر مکان کی آسائشوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکان بہر حال آپ کا تھا۔ اس کا درد سب سے دیکھ بھال اور نگرانی یہ سب آپ کی تھی۔ آپ اس حالت میں کس اطمینان اور خود اعتمادی سے رہتے تھے۔ لیکن ایک دن صبح کو جب آپ کی آنکھ کھلی تو اچانک معلوم ہوا کہ ملک میں انقلاب آگیا ہے۔ جاگیر جائداد اور املاک کے قاعدے اور قانون بدل گئے ہیں اور ان قوانین کے ماتحت آپ کے مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہو گیا ہے آپ رہیں گے اب بھی اسی مکان میں وہ مکان ہوگا۔ اب بھی آپ کے نام سے منسوب بلکہ آپ اس مکان میں پہلے سے زیادہ وسعت اور آرام کا و آسائش کا سامان ہوگا۔ فریج بھی پہلے سے زیادہ قیمتی اور با فراخ ہوا ہوگا۔ لیکن دوست اور اس کا انتظام کسٹوڈین کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو ہو سکتا ہے کہ آپ کا بھائی بند ہی ہو اور غیر نہ ہو۔ فرمائیے، اگر آپ کے مکان ساتھ یہ معاملہ پیش آئے تو آپ کو کبھی طور پر صدمہ اور رنج ہوگا یا نہیں؟ ہوگا۔ اس بنا پر ہم کو مشورہ میں ہی یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ عملی نقطہ

مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) بل ۱۹۷۹ء سے جو حال میں ہی پارلیمنٹ سے منظور ہو کر صدر کی تصدیق و توثیق کے بعد نافذ ہوا ہے۔ مسلمانوں کو عام طور پر مایوسی ہوئی ہے اور اس یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ جو ان کو گہرا تعلق اور جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ اس کو شدید ٹھیس لگی ہے جس سے وہ بلبلا اٹھے اور سرسید و منقرب ہو گئے ہیں۔ لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا۔ وہ بدلتا ہے۔ تو سماج کی قدریں بدلتی ہیں۔ رہن سہن اور آپس کے علائق و روابط کے قاعدے قانون اور ضابطے بدلتے ہیں اور اس وقت وہی لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو وقت کی دیوار پران لیکروں کو پڑھ کر جدید دور کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کی کوشش پیدا و مغزی اور روشن دماغی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی اور وہ زمانہ کے ساتھ آگے بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا بل موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے تاریخ کا ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ اور ان کی آئندہ نسلوں پر اس کے بہت دور رس اثرات پڑیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان جذباتیت سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی نظر سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس یونیورسٹی کے مافیہ اور حال کا جائزہ لیں اور اس کی روشنی میں یہ طے کریں کہ مستقبل میں جو امکانات ہیں۔ ان سے کس طرح عہدہ برا ہو سکے ہیں زمانہ کا آہنگ بدلا ہے تو انہیں بھی اپنے نغمہ کے لیے ایک ایسی تلاش کرنی ہوگی جو اس آہنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ قومی مسائل و معاملات کبھی جذباتیت کی راہ سے طے نہیں ہوتے۔ ترجان حقیقت نے اسی لئے کہا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہونظر

تیراز جان ہونہ سکے گا حریف سنگ

اب آئیے پہلے اسی یونیورسٹی کے مافیہ کا جائزہ لیں۔

سرسید کا نصب العین | اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ سرسید نے جو

ایم ادا کا نام کیا تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں پر کبھی بند نہیں ہوا۔ چنانچہ سرسید کی زندگی

میں اس کالج سے جو ایک سو بیس طلباء گریجویٹ ہوئے ان میں ۹ مسلمان تھے اور باقی ۲۳ ہندو۔ لیکن اس کالج کے قیام کا اصل مقصد مسلمانوں کو تعلیم ہدیہ سے بہرہ یاب کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے ۱۹۵۷ء کے حوادث و واقعات کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا تھا۔ انگریزوں کے جذبہ انتقام اور غیظ و غضب کا نشانہ سب سے زیادہ ہی بنے تھے۔ ان کا کوئی پرسن حال نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی پسماندگی کا منظر نہایت درد انگیز اور تشویش افزا تھا۔ اس لیے سرسید نے اپنی زندگی مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور ان کی تشکیل نہ کے لئے وقف کر دی۔ فرقہ پرستی اور قوم پروری میں صرف ایک باریک فرق ہے اگر سرسید یہ سب کچھ اس نیت اور اس ارادے سے کرتے کہ انہیں مسلمانوں کو ہندوؤں کا ہم مقابل اور برابر کا حریف بنانا ہے تو وہ فرقہ پرست کہلاتے۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ جسم کا اگر کوئی ایک عضو کمزور رہ جائے تو پورے جسم کو تندرست نہیں کہا جاسکتا۔ تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کا یہ عمل قوم پرورانہ نہیں تھا۔ اور اس سے پوری ہندوستانی قوم اور ملک کو فائدہ پہونچنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید کی پوری زندگی ان کے اسی بلند اور نیک ارادہ و مقصد کی ترجمان ہے۔ اس زمانہ میں جو انصاف پسند ہندو تھے وہ سرسید کی اس عظمت، فکر و عمل کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریکچی ہال کی دیواروں میں جن چندہ دیئے والوں کے نام کندہ ہیں، آپ کھیں گے ان میں ہندوؤں کے نام بھی ہیں ایک طرف سرسید کی بلند نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں کو اپنی ایک آنکھ کھتے تھے۔ اور دوسری جانب ہندوؤں میں سرسید کی پذیرائی اس درجہ تھی کہ جالندھر میں جب ان کو ہندوؤں کی طرف سے استقبال دیا گیا تو ڈریس میں صاف طور پر اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ سرسید صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی لیڈر ہیں۔ بہر حال سرسید نے یہ کالج اصلاً اور حقیقتہً مسلمانوں کے لیے بنایا تھا اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ عمل آج کل کے اصلاحی معنی میں فرقہ پرستانہ تھا۔

چونکہ مسلمان مذہب کے بغیر نہ رہ سکتے اور اس کا تحفظ اور اس کے احکام کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اس بنا پر سرسید نے کالج میں انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ دینیات اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب و روایات کے تحفظ و بقا اور ان کی نشوونما کے لئے جو چیزیں ضروری تھیں ان کے بھی انتظامات کئے اور اس طرح انہوں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی تربیت کو بھی ان کی تعلیم کا لازمی جز قرار دیا۔ انہیں وجہ کی بنا پر سرسید کے نزدیک تعلیم کے لئے اقامتی زندگی ناگزیر تھی۔ سرسید نے ایک موقع پر بڑی منغائی اور قوت سے کہا ہے کہ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے انہیں ان مسلمانوں پر سخت غصہ آتا تھا۔ جو اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں بھیجتے تھے کہ وہاں تعلیم خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور عمدہ ہو۔ لیکن بچے اپنے دین سے منحرف ہو جاتے تھے۔ ایک لکچر میں کس سوز و گداز اور درد سے کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم لگاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی دیکھو ان کا

مجموعہ میں ۱۵۸

سرسید کا یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھا۔ بلکہ درحقیقت انیسویں صدی کے ربح آخر میں ایک ایسی ہمد گیر ادنیٰ نہایت توانا تحریک تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا اور ان کی حیات ملی و قومی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا۔ جو اس تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو۔ عجب اتفاق ہے سرسید نے جب اپنی تحریک شروع کی تو یہ زمانہ عالم اسلام میں بحران کا زمانہ تھا چنانچہ اسی زمانہ میں ترکی، مصر، انڈونیشیا، ایران اور مراکو اور نا بکیر یا میں بھی اصلاحی تحریکیں اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح پیدا ہوئے۔ لیکن سرسید نے جن حالات میں تحریک شروع کی۔ اس کو جس طرح کامیاب بنایا اور اس تحریک نے مسلمانوں میں جو انقلاب عظیم برپا کیا۔ اگر ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر سرسید کا موازنہ

اس زمانے میں عالم اسلام کے دوسرے مفکرین و مصلحین سے کیا جائے۔ تو بے مبالغہ مجموعی حیثیت سے سرسید سب سے زیادہ قد آور ثابت ہوں گے، یوں تو اس دنیا کی ریت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی حیات مستعار کی ہر راحت و آسائش قربان کر کے ایک چیز ایجاد کرتا ہے پوری دنیا اس ایجاد سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے مرجانے کے بعد تاریخ کی چند کتابوں کے علاوہ دنیا اس شخص کا نام تک بھول جاتی ہے اس لیے اگر آج سرسید کو بھی لوگ بھول گئے تو اس پر حیرت اور اسی کا شکوہ کس سے اور کیوں کر کیجئے۔

سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا تصور | سرسید ایسا حوصلہ مند شخص یونیورسٹی سے کم کس چیز پر قانع ہو سکتا تھا! چنانچہ ان کا اصل ارادہ یونیورسٹی ہی قائم کرنے کا تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ سید محمود نے جو اسکیم، ارفوری سے شروع کو کیٹی میں پیش کی تھی۔ اس میں انہوں نے صاف صاف اس بات کی تصریح کر دی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام محمدن اینسٹیکوٹ اور ٹیل کالج فنڈ کیٹی رکھا ہے۔ اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے۔ اور اردو میں بجائے مدرسہ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے۔ (حیات جاوید جلد اول) اس یونیورسٹی کی نسبت سرسید کے عزائم اور مقاصد کس درجہ بلند اور اعلیٰ تھے۔ اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو گا فرماتے ہیں:-

”یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہے اس کو کہا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اور اس پر قناعت کرتے ہیں۔ اسے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنے قوی علوم بھلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے ہاتھ میں ہو گا۔ سائنس ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ

محمد رسول اللہ کا تاج سر پہ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو بھرنباتی ہے ؟

اس کے بعد نہایت صفائی سے فرمایا۔

اے دوستو! میں خود بھی انہی میں ہوں۔ کیونکہ مجھ کو ایک یونیورسٹی نے ال۔ال۔ ڈی۔

کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی نہیں گئے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی ؟
 سرسید کی یہ تقریر اور اس کے علاوہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس سب کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سرسید جس قسم کی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل تھیں۔

(۱) یہ یونیورسٹی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر ہوگی۔ اس بنا پر اس کے لئے اقامتی کردار اس کا جزو لا ینفک ہوگا اور اس کا معیار تعلیم وہی ہوگا جو ان یونیورسٹیوں کا ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہوگا کہ ان یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد اور مغربی تہذیب کی تعلیم ہوتی ہے اور اس یونیورسٹی میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے گی۔ اور اس کی فضا اسلامی تہذیب کی ہوگی۔

(۲) اس مقصد کے پیش نظر مغربی علوم و فنون اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ

یہاں اسلامی علوم و فنون اور دینیات کا درس بھی ہوگا۔

(۳) یونیورسٹی حکومت کے کنٹرول اور اس کی مداخلت سے بالکل آزاد ہوگی۔

(۴) اس یونیورسٹی کا انتظام تعلیم تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اس معاملہ میں وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے۔

(۵) اس مقصد کے لئے یونیورسٹی کے تمام اخراجات کا مکمل مسلمانوں کو خود کرنا

چاہیے۔ گورنمنٹ کی امداد پر بھروسہ کرنا یونیورسٹی کے مقاصد سے انحراف برتا ہے۔

تعلیمی خود مختاری و آزادی ان دھات میں ہمارے مقصد کے پیش نظر وہ دھات

(۳۔۴۔۵) زیادہ اہم ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی حکومت کی

مداخلت سے آزاد ہوگی۔ مسلمان اپنی تعلیم کے خود مالک اور اس کے اخراجات کے خود متکفل ہوں گے۔ درحقیقت سرسید کی یہ رائے تعلیم سے متعلق اسلامی فکر کی باطل صحیح ترجمان ہے۔ اسلام میں تعلیم دین کی ہو یا امور دنیویہ کی ایک نہایت مقدس اور ضروری فریضہ انسانی ہے اس بنا پر اس کو بالکل آزاد اور حکومت وغیرہ کے دباؤ سے محفوظ ہونا چاہئے۔ اور ساتھ ہی خدمتِ نبی نوعِ ان کے علاوہ اس کو ذریعہ معیشت بنانا ایک مشہور مثل کے مطابق کشمیر کی بنی ہوئی ایک نہایت قیمتی مثال سے جوتوں کے صاف کرنے کا کام لینا ہے۔ پوری تاریخ اسلام میں تعلیم سے متعلق اربابِ علم اور اصحابِ درس و تعلیم کا تعلق اس امر کی بین شہادت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی نظام کو حکومت کے اثر سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے۔ چنانچہ اسی علی گڑھ کالج سے دو تین برس پیشتر دیوبند میں مدرسہ قائم ہوا تو اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے مدرسہ سے متعلق اپنے وصیت نامہ میں جواب تک محفوظ ہے۔ مدرسہ کے ارباب انتظام کو سخت تاکید کی کہ مدرسہ کا تعلق حکومت سے (چاہے اپنی ہویا غیروں کی) ہرگز کسی قسم کا نہ ہو۔ اور نہ گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ منظور کی جائے۔

۱۔ الحمد للہ دارالعلوم دیوبند آج بھی جب کہ اس کا سالانہ بجٹ تیرو لاکھ روپے ہے اپنی اس وضع پر قائم ہے میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ سرمیاں محمد شفیع اور سرمیاں فضل حسین جو اس زمانے میں دائرہ میں کی انز کو کونسل کے ممبر تھے۔ دیوبند تشریف لائے ان کے اعزاز میں مدرسہ کے نو درہ میں ایک جلسہ ہوا۔ سرمیاں محمد شفیع نے مجھے اب یہ یاد ہیں کہ دونوں حضرات ساتھ آئے تھے۔ یا یکے بعد دیگرے) نے اپنی تقریر میں مدرسہ اور اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی اور پھر حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے فرمایا۔ گورنمنٹ کی بڑی خواہش ہے کہ وہ مدرسہ کو گرانٹ دے۔ یہ گرانٹ بغیر کسی شرط کے ہوگی۔ اس سے مدرسہ کو ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ طلباء کو ریوے کنسیشن مل جائے گا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ بات بھی کہی جو آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقلیتی کردار کے حافظ عام طور پر کہتے ہیں (بقیہ صفحہ ۱۸)

سرسید کے دل کی پی پکارت تھی جس کا اظہار ان کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی زبان سے اس وقت ہوا جب کہ سنہ ۱۸۷۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کرتے ہوئے آپ نے علی گڑھ کی جامع مسجد میں فرمایا۔

”ضرورت اس کی ہے کہ وہ (جدید) تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوا اور انیاء کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار ادب و معاش و اطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے دامنوں میں غلام پیدا کرتے ہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے“
(جوہر جامعہ جوہلی نمبر ص ۱۵۳)

بقیہ حاشیہ معطل انہوں نے کہا: آپ حضرات کو گورنمنٹ سے گرانٹ لینے میں تامل کیا ہے؟ گورنمنٹ آپ کو جو روپیہ دے گی یہ تو وہی روپیہ ہے جو وہ آپ سے وصول کرتی ہے۔ اس تقریر کے جواب میں مدرسہ کی طرف سے حضرت الاستاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے ایک نہایت شفیق و مبلغ اور پُر مغز تقریر کی اور مدرسہ کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے شفیق کی بات کے رد میں فرمایا: جی ہاں آپ نے بجا فرمایا کہ گورنمنٹ گرانٹ کی صورت میں جو روپیہ ہم کو دے گی وہ دراصل ہمارا یعنی ملک و قوم کا ہی روپیہ ہوگا۔ لیکن یہ روپیہ جن ہاتھوں سے ہم کو ملے گا اس میں ان ہاتھوں کے اثر کا آجانا ضروری ہے۔ اور ہم مدرسہ کو اس اثر سے محفوظ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں، سب جانتے ہیں۔ مولانا ایک نہایت بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے روپیہ میں ہاتھوں کے اثر کا فلسفہ ایسے موثر اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا کہ حاضرین ہراس کا بشا اثر ہوا اور شفیق پھر کچھ بکھڑکے اور اپنے منہ میں ناکام واپس ہوئے۔ یہ واقعہ انگریزوں کے زمانہ کا تھا۔ اب آزادی کے بعد کارِ تعمیر معطل ہے۔

ایک عبرت انگیز واقعہ | قومی حیست و غیرت، عزت نفس اور خودداری کا بھی وہ مقام رفیع و بلند تھا کہ جب کبھی ہم نے اسے نظر انداز کیا ہے، غیروں سے بے محابا طعنے سننے اور ذلتیں اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حالی نے ایک سخت عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے، ماہیس کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:-

”جب دوسری بار سید محمود (فرزند سر سید) تفریحاً انگلستان کو گئے اور کیمرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور آج کل ۱۲ لاکھ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸ کا) ایک واقعہ سنئے۔ غالباً ۱۳۵۷ھ کا زمانہ تھا۔ اس وقت آئرلینڈ میں سپورٹانڈجی ذریعہ تعلیم تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور راقم الحروف ہم تینوں سپورٹانڈجی سے ملاقات کے لئے ان کے مکان پر گئے، حسب معمول بڑے تپاک سے ملے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اب جب کہ ملک آزاد ہو گیا اور ایک قومی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی گرانٹ پر اغراض نہیں ہونا چاہئے۔ مولانا محمد طیب صاحب نے فوراً جواب دیا ”سپورٹانڈجی اگر حکومت سلاٹوں کی بھی ہوتے ہیں ہم مدرسہ کے بانی کی وصیت کے مطابق کوئی گرانٹ منظور نہیں کر سکتے، ہمارا اصول ہی یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہر قسم کے بیرونی اثر اور دباؤ سے آزاد رہے۔ اس کے بعد صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد ذریعہ تعلیم دیوبند تشریف لے گئے۔ لیکن الحمد للہ مدرسہ آج تک اپنی اسی وضع پر قائم ہے۔ درحقیقت یہ بھی وہ خاک راہ جہاں ہیں جن کی نسبت مولانا شبلی نے فرمایا تھا:-

اے کہ پرسی کہ کسانیم و پرمان داریم + آنچہ یا سچ نیز و بجان آن داریم
 - مانہ آنیم کہ بر شیوہ ارباب حشم + روئے دراپے جد و دولت سلطان داریم
 خاک راہ جہاں جہاںیم و ز اسباب جہاں + بود یا نیست کہ در کلیہ آسمان داریم

یہ ہو رہا ہے کہ چرب متعلقہ ٹریڈی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت عظیم اٹان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے بسبیل تذکرہ اپنے دوست سے کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسہ العلوم (علی گڑھ) ہی کی امداد کے لیے دے دیں۔ ان کے دوست نے کہا: ”ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟“ سید محمود نے کھا، چھہ کر ڈر، وہ (انگریز دوست) سن کر نہایت متعجب ہوا۔ اور یہ کہا: ”جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہوں کہ چھہ کر ڈر آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو!“ (حیات جاوید ج ۱ ص ۱۵۸)

یہ نوٹ کر لیجئے کہ آج بھی ہندوستان میں مسلمان کچھ زیادہ چھہ کر ڈر ہی ہیں۔ اور بد قسمی سے ان کے تعلیمی مسائل آج بھی وہی ہیں جو مدرسہ العلوم علی گڑھ کی تاسیس کے وقت تھے۔ وائے ما ماندگی شوق دہی دامانی آرزو! تو میں کہاں سے کہاں پیوچ گئیں بہر ان تیرنگام کی گرد گلاہاں بھی نظر نہیں آتی اور ہم پوری ایک صدی کے بعد بھی آج وہیں ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا!

ہر پھر کے ایک ہی دائرہ میں رکھتا ہوں میں قدم

آئی کہاں سے گردشیں پر کار پاؤں میں!!

سر سید کی مایوسی اور ناکامی | یہ وہ وقت تھا جب کہ کوئی شخص قلم بھی حکومت کی اجازت کے بغیر نہ توڑ سکتا تھا۔ یونیورسٹی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ حکومت اگر اس کو تسلیم نہ کرے تو اس کا وجود ہی معتبر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یونیورسٹی اور اس کے مقاصد سے متعلق گورنمنٹ کو لکھا گیا۔ لیکن اس نے مسلم یونیورسٹی کے نام سے یونیورسٹی کے قیام کی اجازت اور اس کو گرانٹ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا قالی لکھتے ہیں: ”لوکل گورنمنٹ سے

اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی مڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے۔ تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی، یا وجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا۔ تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی، لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا آسان کام نہ تھا نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونیوالا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں۔ قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی متقنی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے سے فوہی نو عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہو گئی۔

یونیورسٹی کا خیال انہوں نے بالکل چھوڑ دیا۔

(حیاتِ جاوید ج ۱ ص ۱۷۳-۱۷۴)

درستہ العلوم علی گڑھ کا قیام | سرسید کو اپنے تصور اور جذبہ و دلولہ کے مطابق یونیورسٹی کے منصوبہ میں اگرچہ مایوس اور ناکام ہونا پڑا تھا، لیکن وہ حالات سے بد دل ہو کر جی چھوڑ دینے والے انسان نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سخت مجبور کن اور صبر کا زمانہ حالات میں بھی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ کرنا چاہئے اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہئے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:-

ما لا یبدون کلہ ولا یترون کلہ، یعنی جس چیز کو تہما نہ حاصل نہیں کیا جاسکتا اس کو ہتما نہ ترک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ انہوں نے بقول مولانا حالی کے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہے کہ:-

نہ ہوتا بچہ و اندر گر آسمان تک، تو وہاں تک اڑیں پور سائی جہاں تک

اور ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم قائم کر دیا۔ جو بعد میں مسلم ایٹھو اور نیشنل کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج میں سرسید کو مجبوراً کورس تو دہی اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا مجوزہ اور ان کے ہاں رائج تھا لیکن ایک اس کورس سے قطع نظر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یونیورسٹی کے سلسلہ میں سرسید کا اور جو کچھ منصوبہ تھا اس کو انہوں نے کالج کی راہ سے مکمل کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ سرسید کے سامنے یونیورسٹی کا جو ایک اعلیٰ منصوبہ تھا، اس کا ایک جز یہ بھی تھا کہ گورنمنٹ کے اثر سے اس کو آزاد رکھا جائے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے مولانا حالی کی زبان سے ابھی سنا اس وقت کے مسلمانوں کے پیش نظر ان ہونی بات تھی۔ اس لئے سرسید نے جب یونیورسٹی کا خیال ترک کیا تو اب گورنمنٹ سے بے تعلقی کے بارے میں بھی اپنا نقطہ نظر بدل لیا کہ شیخ سعدی رح ایسے ناصح مشفق کی نصیحت ہے۔ ”زمانہ باتوں سازد تو بلزمانہ بسازد“۔ چنانچہ کالج کے سلسلہ میں سرسید نے جو کچھ کیا اس کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا مقصد تین چیزیں ہی نظر آتی ہیں۔

۱۔ کالج میں اگرچہ کورس وہی ہو گا جو اور یونیورسٹیوں میں اور خصوصاً الہ آباد یونیورسٹی میں مروج ہے لیکن اس کورس کی تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ ہونی چاہیئے اور اگر اس کے لئے بیش قرار تنخواہوں پر یورپین اسٹاف درکار ہو تو اس میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۔ کالج کے لئے گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ایک طرف گورنمنٹ کی آمد و اعانت سے کالج ترقی کرے اور اس کے کام آگے بڑھیں۔ اور دوسری جانب کالج کے فارغ التحصیل طلباء کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں سہولت اور آسانی ہو اور وہ حکومت کے معتقد علیہ بن سکیں۔

۳۔ کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ دینیات اور اسلامی شعائر اور روایات کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ علوم جدیدہ کے اثر سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقائد متزلزل نہ ہوں۔ اور

وہ کردار اخلاق اور عمل کے اعتبار سے کچے سچے مسلمان رہیں۔
راہ کی مشکلات | لیکن سرسید کا کام آسان نہیں تھا۔ راہ میں سخت مشکلات اور دشواریاں
 مائل تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مشاعرہ میں انگلستان کے سفر سے واپس آنے کے دو ماہ بعد
 ہی انہوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام
 سے جو رسالہ جاری کیا تھا اس میں ان کے قلم سے ایسے متعدد مذہبی مضمون شائع ہو چکے
 تھے جنہوں نے ان کے مذہبی افکار و عقائد سے متعلق مسلمانوں میں طرح طرح کے شکوک و
 شبہات اور غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ چنانچہ سرسید کی طرف سے کالج کی
 سکیم کا شائع ہونا تھا کہ ان کی مخالفت کا طوفان اُٹھ پڑا۔ ان کی تذلیل و تنقیص میں کوئی
 دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا اور عام طور پر کہا یہ گیا سرسید یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو عیسائی
 بنانے کی غرض سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ علماء سرسید سے کس درجہ بدگمان تھے؟
 اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اُسے
 درخواست کی گئی کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا انتظام اپنی صوابدید سے کریں تو
 مولانا نے جواب دیا کہ سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں تب
 مذہبی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد صاحب
 منگھوری باب پنجم میں ۲۱۶)

جذہ کی فراہمی | لیکن سرسید کو یقین تھا کہ ایک وہ قوم جو عرصہ دراز سے جمود ذہنی اور
 اس کے باعث جہالت و عقبیت میں گرفتار ہو اس کی اصلاح پھولوں کی سیج نہیں ہے۔
 اس راہ میں قدم قدم پر ان کو عوائق و موانع سے سابقہ ہو گا۔ سرسید نے ان سب پر غور و خوض
 غور و بجزم کر لیا تھا۔ چنانچہ غنائتوی کے ان طوکانوں میں وہ مدرسہ العلوم کے لئے
 جدہ کرنے کے واسطے علی کھڑے ہوئے۔ اور کالج کی لگن میں انہوں نے اپنی صحت کا
 خیال کیا۔ نہ اچھے برے کا امتیاز برتا۔ نہ لوگوں کے سب و شتم اور ان کے حسن و کجی پر دیا

کی۔ جہاں کہیں جاتے درہ دل کی کہانی اسی سوز و گداز سے سناتے۔ مگر مخالفوں کے دل بھی نرم ہو جاتے تھے۔ کالج کے قیام کا ایک جنون تھا جو ان کے دل و دماغ پر سوار تھا۔ اور جس نے ان کو پارہ صفت مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔ سفر کے درمیان لوگ ان کے اعزاز میں دعوتیں اور پارٹیاں کرنی چاہتے تھے تو دعوت کے بجائے اس کے خرچ کا روپیہ بھی چندہ میں وصول کر لیتے۔ شادی بیاہ کی تقریب میں دو لہا کو جو روپیہ ملتا وہ مدرسہ فنڈ کے لیے پیتا لیتے۔ حد یہ ہے اس کا ذخیرہ کے لئے انہوں نے ایک ٹانگ بھی کر ڈالا اور یہیں خود سوانگ بھی بھرنیکی کا کام بہر حال کارنیک ہے اس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ چنانچہ چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور عیسائیوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بہر حال اسی طرح دن رات ایک اور اپنے آپ کو فنا کر کے —

بیس برس کی مدت میں سات آٹھ لاکھ (جواب یقیناً ایک کروڑ سے کم نہیں) کی عمارت تیار ہو گئی اور کالج کی سالانہ آمدنی انشسی ہزار تک پہنچ گئی یہی وہ عمارت ہے جس کو دیکھ کر ایرانی سیاح نے کہا تھا: خدا کی قسم یہ تو معجزہ معلوم ہوتا ہے جو کام سلطنتوں سے نہیں ہو سکتا ہے۔ تنہا ایک شخص نے کیسے کر دکھایا: (حیات جاوید ص ۵۸، ۱) لیکن سب کچھ بعد میں ہوا۔ ۱۹۴۳ء کو جب مولوی محمد کریم ڈپٹی ملکٹر علی گڑھ کی صدارت میں اس مدرسہ کا افتتاح اور چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں ایک ماہ بعد ہی یعنی یکم جون کو مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو اس وقت کچھ بھی پاس نہ تھا۔ سرسید اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ پوری فضا تیراقتار تھا۔ اسی وقت کون کہہ سکتا تھا کہ آج جس مدرسہ کا آغاز اس بے سرو سامانی کے عالم میں ہو رہا ہے۔ گندہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی ہو گا۔

سرسید کی انتہا پسندی اور بے اعتدالیاں | اس میں کوئی شبہ نہیں جو سکتا کہ سرسید کا یہ گمان نامر اس دورہ عظیم الشان انقلاب آفریں اور تاریخ ساز ہے کہ مٹی دنیا تک ان کا نام روشن رہے گا۔ اور تاریخ کے صفحات ان کی شخصیت کو لازماً روشن نہیں کر سکیں گے

لیکن آج جب کہ ہم سوہرس کی مسافت طے کر چکے ہیں اور اس مدت میں یہاں کیسے کیسے انقلابات آتے رہے اور یہ مدرسہ نشیب و فراز کی کیسی کیسی دادیوں سے گزرتا رہا۔ ایک ناقد مورخ کا فرض ہے کہ ان سوہرسوں کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ مدرسہ نے اپنے اس طویل سفر میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ کہاں اس سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ اور کیوں؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ آج ہندوستان کے مسلمان تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں۔ فہم بعیرت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک وہ اپنے ماضی کا جائزہ اشخاص و افراد کی رُو رعایت کے بغیر دیدہ وری کے ساتھ نہیں لیں گے۔ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ ملک کی تقسیم نے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے فن تاریخ نویسی کو بھی بہت نقصان پہنچایا ہے اور اس فن کے لئے جس معروضی (OBJECTIVE) نقطہ نظر کی ضرورت ہے وہ مجروح ہو گیا ہے۔ چنانچہ تقسیم کے بعد سے اب تک سرسید کے عہد سے متعلق ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں معروضی نقطہ نظر کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ پاکستان کا مورخ سرسید کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گو یا وہ قومی نظریہ کے بانی مہانی وہی تھے۔ اور ان کے تمام کام ہندوؤں کے بالمقابل مسلمانوں کو ادنیٰ کرنے کی غرض سے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہندوستان کے مسلمان مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید ایک فاضل ہندوستانی اور نیشنلسٹ تھے انہوں نے جو کچھ کیا ہندوستانی قوم کے لئے کیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سرسید کی جدوجہد یا مردانہ وطن کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر انہوں نے جو راہ اختیار کی اس کا تذکرہ زبانِ قلم پر لاتے ہوئے ان کو شرم آتی یا ڈر لگتا ہے۔ ان میں ایک ہندو دشمنی کا میزبوں ہے اور دوسرا احساسِ کسری کا شکار! یہ غیر معروضی طریق تاریخ نویسی جن کے ساتھ انصاف ہے۔ نہ سرسید کے ساتھ اور نہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ!!

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک جائزہ

از جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور

امام الہند مولانا آزاد کے ساتھ ارحم الہامی پر چودہ سال گزر گئے، غور کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کل یہ حادثہ پیش آیا ہو۔ دقت کی رفتار کا بھی عجیب حال ہے۔ چودہ سال ہوں یا چودہ دن، جب گزرنے پر آتے ہیں تو اس سرعت کے ساتھ گزر جاتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کس طرح گزر گئے بلاشبہ مولانا آزاد کی رحلت، تاریخ کا ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ جس کے درد انگیز اثرات و نتائج امتداد زمانہ کے باوجود آج بھی نہاں خانہ قلب میں موجزن ہیں۔ لیکن رنج و الم کے یہ تاثرات صرف اسی بنا پر نہیں ہیں کہ مولانا نے انتقال فرمایا، بلکہ اس بنا پر ہیں کہ ان کی ذات گرامی میں مختلف علوم و فنون اور اوصاف و کمالات کی جو دولت سمٹ آگئی تھی۔ وہ بھی انہی کے ساتھ سپرد خاک ہو گئی اور دنیا اس اصول اور بے مثال خزانہ سے محروم رہ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا عرض کروں، مولانا کی یاد تازہ کیا ہوئی کہ میرے دل کی آرزو و خدیوں میں ایک تلامذہ پا ہو گیا اور مجھے اختیار چاہئے لگا کہ ان کے اوصاف و کمالات اور علوم و فنون کی جامعیت پر اپنے معلومات کو صفحہ ہائے قرطاس پر بھیج دوں، مگر جب آمادہ تحریر ہوا تو بڑی دشواری پیش آئی کہ ایک طرف حقائق و معارف اور مطالب و مفاہیم کی وسعت، مباحث کی گہرائیاں اور موضوع کی پیچیدگیاں، ایسی نکل آئیں، جو شرح و املاب کے بغیر قلم بند نہیں ہو سکتیں۔

طرف، دائرہ بیان کی تنگنائی اور الفاظ کی نامساعدت اس درجہ مشکب آڑا ثابت ہوئی کہ قدم پر عثمان قلم کھینچی ہی پڑی۔

قلم را آن زباں بود کہ سب عشق گوید باز ۳۰ بردن از حد تقریر مست شرح آرزو مندی
اس عجیب صورت حال کے پیش نظر میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ موضوع کی وسعت کو محدود کر کے، تعبیر بیان کے لئے انہی الفاظ کی وساطت اختیار کروں۔ جو خود بخود سطح ذہن پر ابھرائیں۔ چنانچہ میں نے اسی طریقہ کار کو اختیار کیا۔

مولانا آزاد و بحیثیت | مولانا آزاد، کتبہ ارضی کے ان عالم رجال والا بر علم و فضل میں سے
جامعیت علوم و فنون | ایک تھے جن کی زندگی کو نیرنگ ساز ازل نے رنگارنگ علوم و فنون
اور گونا گوں اوصاف و کمالات کے ایسے روشن اور تابناک جوہروں سے گزرا تھا کہ جن کی
شعاعیں ان کے نامیہ امامت پر صوح کی طرح چمک رہی تھیں۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا آزاد ایک ایسا خزینہ تھے جس میں مختلف اور متضاد
علوم و فنون کی پوری ایک دنیا سمٹ آگئی تھی۔ یعنی وہ بیک وقت، تحریر و تقریر کے شہنشاہ
تھے۔ تو علم و حکمت کے سلطان بھی، بحر شریعت کے ماہر عوارض تھے تو رموز حقیقت اور اسرار
طریقت کے عارف کامل بھی۔ عظیم النظیر مفسر قرآن تھے تو بے مثال محدث بھی بلند پایہ مورخ
تھے تو جلیل القدر سیرت نگار بھی۔ ادیب و اریب تھے تو حبیب عاقد بھی، انشا پر داری کے
امام تھے تو سیاست کے سپہ سالار بھی، مخیر العقول مفکر تھے تو حیرت انگیز مدبر بھی، ایہ نادر فلسفی
تھے تو چوٹی کے منطقی بھی، تعین و تالیف کے بادشاہ تھے تو صحیفہ نگاری کے رہبر کامل بھی،
غرض کہ عظیم دھنوں کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کو مولانا کی تاجدار ہی میں رہنے کا شرف حاصل نہ

ہو۔ **ولیس علی اللہ یستکون ان شیخ العالم فی ولجہ**

نور کوٹا نے بھی بروہ شامس کے اس عیضات خاص کا اظہار فرمایا ہے۔

”محب علوم و فنون، ادب، ان و شاعری۔ کوئی راوی ایسی نہیں جس کی

بے شمار نئی راہیں مبداء و فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی
ہوں اور ہر آن دہر لحظہ بخششوں سے مالا مال نہ ہوا ہو۔ یکدیکہ ہر روز اپنے
آپ کو عالم معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر مقام کی کرشمہ سنجیاں
بکھلی منزلوں کی جلوہ طازیاں مانڈ کر دیتی ہیں۔" نقش آزاد صفحہ ۱۵

بلاشبہ مذکورہ حیرت انگیز کمالات اور جملہ علوم و فنون میں ہمہ گیری، محض کار فرمائے
غیب ہی کی بخشش خاص تھی۔ جس سے آپ نوازے گئے چنانچہ مولانا نے بطور تحدید نہایت اعتراف فرمایا۔
”جو کچھ پایا ہے، صرف بارگاہ عشق سے پایا ہے، جتنی رہنمائیاں ملیں صرف
اسی مرتبہ فیض و ہادی طریق سے ملیں، علم کا دروازہ اسی نے کھولا غل کی
حقیقت اسی نے بتلائی معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے۔
حقیقت کے خزانے اس کے دست کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وہی
مُسلم تھا، طریقت کے شیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کے بھید اسی نے
بتلائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی۔ دل اس نے بخشا،
کون سی مشکل تھی جو اس کی ایک سلجھی ہوئی نظر سے سلجھ نہ گیا، اور یہ جو کچھ کہا گیا
تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اپنے میوں کو بھی ہنر بنا کر دکھانا مقصود ہے جس عالم میں
ہنر کو بھی ہنر سمجھنا معصیت ہو۔ وہاں غیب کو ضن بنانے کا وہ ہم بھی گزرے تو کفر
سمجھا جائے۔ مقصود تو صرف یہ تھا کہ

وَكَمْ لِلَّهِ مِنَ لَطِيفَاتِ الْخِطَابِ
يَذُوقُ خِفَاتُهَا عَنْ فُهُمَاتِهِ كَيِّ (مذکرہ)

در حقیقت مولانا آنا آؤ، اپنے بے پناہ علم و فضل اور اوصاف و کمالات کے تنوع کے
اعتبار سے ان فوق الفطرت اہل ان تھے، قدرت نے انہیں جو اوصاف بخشے تھے۔ ان میں
سب سے زیادہ نمایاں وصف ان کا اجتہاد و فکر و نظر تھا، چنانچہ علم و فن کی ہر دہی میں
ان کے مجتہدانہ تخیل نے جدت و نوورت کی جو کھل کاریاں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ تعریف و

تحریر جتنی کہ مجلس گفتگو کے میدان میں بھی انہوں نے ملحوظ انداز و اسلوب بیان، الفاظ و ترکیب کے استعمال، مطالب و ادوار مطالب، ترتیب دلائل و مواد، اور انداز استدلال و اخذ نتائج، اپنی شاہراہ آپ بنائی، لیکن کبھی انہوں نے کسی پیش رو کی تقلید کی اور نہ متابعت مولانا آزاد کی مجلس گفتگو | جن خوش قسمت افراد کو مولانا سے قرب حاصل تھا، وہ اس امر

سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی زندگی، بالعموم سیاسی میدانوں کے حوادث سے گھری رہتی تھی۔ شاید ہی کوئی دن ان پر ایسا گذرا ہو، جس میں وہ سیاسی جدوجہد کے بے کیف اشتغال سے بے تعلق رہے ہوں، لیکن بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے کہ عین اس عالم میں جب کہ ان کے قیمتی لمحات، سیاسی گفتگو کے سلجھانے میں گذر رہے ہوتے۔ ان کا کوئی ہم ذوق و ہم نفس اچانک آپہنچتا، تو ان کی بے کیف طبیعت کا رنگ، نہایت حیرت انگیز طریقہ سے بدل جاتا اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب ہو جاتا جیسے ان کے کیف و ذوق میں راحت و سرور کی ایک نئی لذت سما گئی ہو، مثنیٰ کا مجلس صاف طور پر محسوس کرتے کہ مولانا اگر وہ پیش کے تمام حالات سے کنارہ کش ہو کر، عالم باغ و بہار میں جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے ہم ذوق کی طرف، ہر تن متوجہ ہو کر کوئی موضوع چھیڑ دیتے تو محسوس ہوتا، چستان ہزار رنگ کھل گیا ہے، جب مسلسل بولنے لگتے تو حقائق و معارف کے رنگارنگ پھول جھرنے لگتے۔

ادب و انشاء اور شعر و سخن کے مباحث نکل آتے تو معلوم ہوتا، اگر اخلاقی فرما رہے ہیں۔ قرآن حکیم اور حدیث کے معارف و حکم بیان کرتے لگتے تو محسوس ہوتا، اخلاقی و جواہر کی بارش ہو رہی ہے اس وقت مولانا کی گفتگو کا شیریں طرز، انہام و تفہیم کا دلنشین انداز اور ان کے نگاہوں کی پُر اثر کیفیت، مشاہدہ کی خاص چیز ہوتی، دیکھنے اور سننے والے تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ سب کو دیکھ کر وہ جانتے تو ساتھ ہی اپنی روح کے ایک ایک گوشہ میں حیات تازہ کی ہر کوہ و درختے ہوئے بھی پاتے۔ اس طرح چند گھنٹوں تک، ان کے انوار و تجلیات علوم سے بزم سخن منور رہتی اور جب اختتام پہنچتی تو ہر شخص مولانا مسعود عالم ہندی

مرحوم کی طرح، یہ پائے کر لٹھتا کر :-

”ابوالکلام ایک جہتِ نظرِ عالم ایک نکتہ شناس ادیب، لہذا آہنگِ خطیبِ دربارے مثلِ نشاہِ دراز ہیں ان کی مجلس گفتگو تقریروں سے زیادہ موثر اور سادہ و سلیس انشا و الہال کے خطیبانہ مقالات سے زیادہ دل نشین ہوتی ہے۔ ان کے ادبی نکتے، دو سروں کی تصنیفوں پر بھاری اور اچھوں اچھوں کی سرمایہ نازِ تحقیقات ان کے علمی چٹکوں کے سامنے گر دہیں۔ اس خصوص میں مولانا عبدالمجید صاحب دریا بادی کی شہادت ملاحظہ فرمائیے علوم و فنون میں عودِ نازِ ادبی ہمہ گیری کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”خطِ معلوم کتنے مختلف علوم اور متعدد فنون کے خزانے و ناخ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت مستضر طیب ہو کہ الہیات، نقد ہو یا کلام شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاست، جس فن سے متعلق جو بھی موضوع جو بس گفتگو چھڑنے کی دیر تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقعہ کار ہی نہیں ماہر فنِ تقریر کر رہا ہے اور تقریر بھی ایسی دل آویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے غضب کا مائدہ تھا اور غضب کی خوش دماغی“

دخند یادیں۔ صدقِ جدید مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء

مولانا کی خطابت | مولانا کی خطابت بھی نہ صرف جلوۂ صدر نگ ہوتی تھی بلکہ عنایتِ جلال و جلال کے حسین مظاہر کا ایک دل کش مجموعہ ہوتی تھی۔ وہ تقریروں سے بالعموم گریز کرتے تھے، اور یہ ان کی طبیعت کی خاص بات تھی۔ انہیں تقریر کے لئے آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا تھا، لیکن جب وہ آمادہ ہو جاتے اور ان کی روح پرور تقریر کا اعلان کر دیا جاتا تو اس کی جاذبیت و کشش کا یہ عالم ہو گا کہ جس طرح بدوائے روشنی کی طرف کچے پلے جاتے ہیں، شبک اسکا طرح جزا و انہوں کے ذل اطراف و جہانِ ملک سے بے اختیار کچے پلے آتے تھے۔

مولانا تقریر شروع کرتے اور زمانہ تقریر میں جب ان پر جانی رنگ غالب ہوتا تو یہ صورت
 لے مولانا سعود عالم ندوی مرحوم۔ ابوالکلام۔ سیکرٹری عظیم الشان

کے سامنے ایسا سماں طاری ہوتا جیسے جلالِ ربانی کے شعلے ان کی نگاہوں سے نکل رہے ہیں۔ سمندروں میں طوفانِ بپا ہے، بارش اور ابرو باد ہنگامدار ہیں، بادل گرج رہے ہیں۔ اور بکلیاں کوک رہی ہیں، لیکن جوں ہی ان کی خطابت، جمالِ زیبائی اور حسنِ ددلِ آویزی کے ایک نئے پیکر میں نمایاں ہونے لگتی تو ایسا منظر طاری ہوتا جیسے نور الہی کی کرنیں، اُن کی نگاہ سے چین چین کر نکل رہی ہیں، صبحِ تجلی نمودار ہو کر ہر آنکھ کو بینا بنا رہی ہے سورج اپنی تام بوقلمونیوں کے ساتھ طلوع ہو کر دنیا کے گوشے گوشے کو زیورِ طلائی پہنارہا ہے، پہاڑ اپنی بلندی و عظمت کے ساتھ دقار اور استقامت کے پیکر بنے ہوئے ہیں، زمیں کا گوشہ گوشہ، روئیدگی و سرسبزی سے مالا مال ہو کر نہایت و سرورِ بخش رہا ہے، شاخیں و جہد میں آکر جھوم رہی ہیں، کلیاں مسکرا رہی ہیں تو بھول اپنی رنگین اداؤں کے ساتھ جھک رہے ہیں آپ رواں ترنم ریز ہے تو طیورِ نغمہ سنج ہیں۔ بہ الفاظِ فقر و مولانا کی خطابت مظاہرِ جلال و جمال کا ایسا حسین مرقع ہوئی جس کا ہر منظر ویدہ بعیرت کے لئے مہشت زارِ جہاں ہوتا جس کا ہر نغمہ گوشِ حقِ یوش کے لئے ملکوتی ترانہ ہوتا اور جس کی ہر نو فردوس کی ہواؤں کی طرح عطرِ میز ہوئی۔ سامعین جب مجلسِ تقریر سے اٹھتے تو نہ صرف لذتِ سماع کی محویت سے بے خود ہو کر اٹھتے بلکہ لذتِ مشاہدہ اور لذتِ عمل کے حصول کا بے تاب دلدل بھی لے کر اٹھتے، نیز زبانِ حال سے پکاراٹھتے:

لطفِ کوسوناز میں تیرے لبِ عجاز پر مجو حیرت ہے ثریا رفعت پر واز پر
مولانا کی یہ عظیم اثرانِ تقریریں، اُس روشن دور کی ہیں، جب کہ ان کی شوکت و عظمت کا آفتاب آسمانِ قبول پر درخشاں تھا۔ یہ دور وہ تھا جب کہ فقہ، معاشرت، خواہدہ تھا۔
مبارک سیاست حکومتِ انگریز نے یہ کے آؤ کلاد نہ بنے تھے اور حکومتِ وقت کے الجوان
دلیل می زور پر تھے۔ لیکن حکومت نے مولانا کے عظیم المرتبت وجود کو خطرہ محسوس
کرنے کے بعد ہر طرح سے ظلم و ستم کا آغاز کیا تھا اور حریفانِ سیاست نے بھی

ان کی ذات گرامی پر طرح طرح کی تہمتیں اور نوعِ نبوع کے المناہات عائد کر کے مسلمان عوام کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل نہ کیا تھا۔ نیز ان کی امامت و خطابتِ عیدین کے مقاطعہ کا تصور بھی مخالفین و ماسدین کے ذہن میں پیدا نہ ہوا تھا۔ اس مقام پر رشتہ سخن دراز ہے، لیکن جو باتیں عرض کی گئی ہیں وہ از قبیل اشارات ہیں۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ تاریخِ ہند کے ان المناک واقعات کی توضیح و تفصیل کے لئے لمحاتِ فرصت نصیب ہوں تو ایک مستقل مضمون حوالہ قلم کروں۔

مولانا کی نگارشات | مولانا کی تحریروں میں بحیثیت جامعیت و ہمہ گیری، معنی خیزی، سحر آفرینی اور اثر انگیزی وہ تمام محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جو ان کی مجلسی گفتگو اور تقریریں میں جلوہ افروز تھے۔

دیدہ درانِ علم و ادب اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مولانا کی تحریریں، علم کی گہرائیوں کے ساتھ ادب و انشاء کی گلکاریوں، علمی لالہ کاریوں اور زبان و بیان کی لطافتوں کا ایک ایسا حیرت انگیز مجموعہ ہوتی ہیں کہ ان میں بحیثیت اوصاف و خصائص، فرق و امتیاز قائم کرنا کہ فلاں تحریر فلاں تحریر پر فوقیت رکھتی ہے۔ ایک نہایت کٹھن کام ہے۔ لیکن میں نے اس تعلق سے جس حد تک غور کیا ہے محسوس کیا کہ ان کی ہر نگارش اپنے مرکزی مقصد کے اعتبار سے جن مخصوص اوصاف کی مقتضی ہوتی تھی ان سے متصف ہو کر ان تمام اوصاف و کمالات کو بھی اپنے وسیع دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو ان کی دیگر تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ البتہ مولانا نے اپنی نگارشات اور تصانیف میں جن اوصاف و خصائص کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا تفحص و استقراء ممکن ہے۔ چنانچہ میں نے ان نگارشات اور تصانیف پر اس غرض سے غائرانہ نظر ڈالی تو درج ذیل اوصاف و محاسن نظر افروز ہوئے۔

ادصاف و خصائص تحریر | در، ہر فن اپنا خاص رنگ رکھتا ہے اور وہ رنگ اسی وقت نمایاں ہو رہا ہر سکتا ہے۔ جب کہ اس کا ایک ایسا خاص اسلوب ہو جو اس کو دیگر فنوں

کے رنگ و صنگ سے ممتاز کر دے۔ چنانچہ مولانا کے ذوقِ سلیم نے علوم و فنون کے اس نظری تقاضے کو محسوس کیا، اور ان کے مجتہدانہ ذہن نے علمِ دین کے تنوع کے اعتبار سے کئی ایسے اسلوبِ نگارش تخلیق کئے، جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، یعنی جو فن جس اسلوبِ خاص کا متقاضی تھا، مولانا نے وہی اسلوب اُس کو عطا کر دیا، لیکن انہوں نے ہر نگارش کے لئے ایک ہی قسم کا اسلوب جیسا کہ تمام اہلِ قلم کا تیرہ ہے۔ کبھی اختیار نہ کیا۔

(۲) ایک عجیب مگر لطیف خوبی جو مولانا کے ہر اسلوب میں غیر محسوس طور پر جلوہ افروز رہتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا ہر اسلوب مجرد اسلوب نہیں ہوتا بلکہ اس میں دلیل بھی مغمم رہا کرتی ہے معنی وہ ہر فن کے تقاضے کے مطابق جو اسلوب اختیار کرتے تھے اس کی دل نشینی و اثر آخرینی اس غضب کی ہوتی تھی کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی اور مخاطب کے ذہن کو بے اختیار دلیل کی طرف مائل کر کے اس طرح مطمئن کر دیتی کہ اس کو صحیح تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہوتا۔

بلاشبہ مذکورہ حیرت انگیز خوبی قرآنِ حکیم کی ہے۔ مولانا نے اس کو قرآنِ حکیم ہی سے انداز کیا ہے اور یہ بات عرض کی جائے تو اس کو کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے گا کہ ان کی شخصیت کی تکوین و تخلیق اور تزیین و آرائش میں قرآنِ حکیم ہی کی روح کار فرما رہی۔ انہوں نے اپنی تمام خدا داد صلاحیتوں اور دل کے کامل اخلاص کے ساتھ قرآنِ حکیم کا اس طرح عمیق اور وسیع مطالعہ کیا کہ اس کی روح ان کے قلب و دماغ کے ایک ایک ریشہ میں جذب ہو گئی، چنانچہ انہوں نے قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ پر جس انہماک و توجہ خاص کے ساتھ غور و فکر کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”قرآنِ حکیم شب و روز کے محروغ و غمگین کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک صورت ایک ایک مقام، ایک ایک آیت ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں

قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے کئے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتیٰ الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے سہاہل کیا ہو۔

(ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۱۹ مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور)۔

مولانا کی اس مخلصانہ سعی و عمل کا ثمرہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآن حکیم کے بیشمار معارف و حکم اور ان گنت اوصاف و کمالات کے دروازے کھول دیے اور ان کے قلب و نظر کو اس کی روشنی سے منور کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

”فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا مخصوص احسان اس عاجز پر یہی ہے کہ اس نے تفسیرِ مالِ رائے کی آلودگی سے پاک رکھ کر حقائقِ قرآنیہ کو منکشف کر دیا۔
وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم“

دالبلاغ ۲ ص ۱۳

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

”اگر تم کہو کہ... حقائق و معارفِ قرآن کی طرف رہنمائی ایک فضلِ مخصوص ہے جس کے انکشاف کے لئے خدا تعالیٰ نے اس عاجز و درمادہ قلب کو چن لیا تو یہ فی الحقیقت سچ ہے

وَبَالِغَتْ قَوْمِي يَفْلَحُونَ بِمَا عَزَمْتُ دِينِي وَجَعَلْتَنِي مِنَ الْكُتُبِ الْعَمِيمَةِ“ (ابونعیمہ)
حاصل کلام یہ کہ مولانا کا مزاج چونکہ قرآنی ادب و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا تھا اس لئے ان کے حقیقت نگار قلم نے اردو ادب کے دامن کو قرآنی حقائق و معارف کے بھونچے سے بھر دیا اور اس کے بد شوکت با عظمت اور دل آویز اسلوبِ ادب بوجہ کو علم و ادب کی تمام قسموں میں منتقل کر دیا۔

ایں سعادت بنور باز نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(۳) مولانا کی تحریر میں متعدد پیراگرافوں سے اس طرح مرکب ہوتی ہیں کہ ہر پیراگراف اپنے سابق و لاحق پیراگرافوں سے مربوط ہو کر مرتب مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ اکثر پیراگراف اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں، یعنی ان کو نفس مضمون سے علیحدہ کر دیجئے تو وہ اپنے مفہوم کی توضیح میں محتاج ماقبل و مابعد نہیں ہوتے۔

(۴) مولانا آزاد کے طرز نگارش کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسے بلند پایہ حکیمانہ جملے بکثرت جلوہ آ رہتے ہیں، جو بحیثیت معنی خیزی، اثر انگیزی اور سبق آموزی اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں اگر ان روشن اور تابناک جواہر پاروں کو اخذ کر کے مختلف عنوانوں کے تحت مرتب کیا جائے تو اس کام کے لئے کئی دفتر مطلوب ہوں گے۔ لیکن یہ خدمت بے انتہا مفید ثابت ہوگی۔ الحمد للہ راقم الحروف نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔

(۵) مولانا کی تحریروں میں ایک حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ان کے اکثر پیراگراف اور جملے اس قدر جامع و مانع اور وجیز ہوتے ہیں کہ ان کے مفہوم کو صغیر قریاس پر پھیلا دیجئے تو ان کا ایجاز اخطاب سے بدل کر مستقل مضمون کی شکل اختیار کر لے گا۔ چنانچہ مولانا نے اس حقیقت پر ایک دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

”مباحث و معارف کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا مگر نوک قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا

اب کتاب کے صفحے پر وہ ایک جملہ ہی رہے گا، لیکن اہل نظر چاہیں تو اپنے ذہن و فکر میں پھر اسے ایک دفتر کی صورت میں پھیلا دے سکتے ہیں“

(ترجمان القرآن دوم)

کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد، ایجاز کے نہیں۔ اخطاب کے بادشاہ تھے، لیکن مولانا نے سبز نگار قلم نے ایجاز نگاری میں بھی غیر معمولی کمالات کو اجاگر کر کے ثابت کر دیا ہے

کہ وہ بلاشبہ دریب ایجاز کے بھی بادشاہ ہیں۔ یہاں ضرورت مثالوں کی ہے لیکن چونکہ مثالیں تفصیل و توضیح کی طالب ہیں۔ اس لئے اختصار کے پیش نظر قارئین کی توجہ کو ترجمان القرآن کی طرف مبذول کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ بلاشبہ ترجمان القرآن، ایجاز نگاری کی سب سے زیادہ روشن اور تابناک مثال ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت نہایت جہاں و زیبائی کے ساتھ بے نقاب ہوگی کہ اس کے ایک ایک صفحہ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک سطر میں ایجاز کا رنگ بجز کمال جلوہ آرا ہے۔ چنانچہ خود مولانا آزاد تفسیری نوٹ کے تعلق سے رقمطراز ہیں

”یہ نوٹ عبارت میں مطول نہیں ہو سکتے تھے اور مطول نہیں ہیں، لیکن معانی و اشارات میں مفصل ہو سکتے تھے اور پوری طرح مفصل ہیں اور اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی سطر تفسیر کا ایک پورا صفحہ بلکہ بعض حالتوں میں ایک پورے مقالہ کی قائم مقام ہے“ (ترجمان القرآن جلد دوم)

درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”یہ (نوٹ) قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں۔ اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہیں۔ مقاصد و وجوہ سے پردے اٹھاتے ہیں۔ دلائل و شواہد کو روشنی میں لاتے ہیں۔ احکام و نواہی کو مرتب و منضبط کرتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی و معارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں۔“

(ترجمان القرآن جلد دوم)

نیز طریق بیان کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”ایسا طریق بیان اختیار کیا گیا کہ لفظ کم سے کم ہیں لیکن اشارات زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیے گئے ہیں۔ جس چیز کی لوگ کمی پائیں گے وہ صرف مطالب کا پھیلاؤ ہے، نفس مطلب میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی ان کے ہر لفظ اور جملہ پر جس قدر غور کیا جائے گا مطالب و مباحث کے نئے نئے دفاتر کھلے

جائیں گے۔ (ترجمان القرآن جلد اول)

(۶) مولانا آزادؒ کے گنجینہٴ دماغ میں اردو، عربی اور فارسی کے حسین، شان دار اور پُر سکونہ الفاظ کے کتنے ذخائر موجود تھے۔ اس کا علم کسی کو نہیں حتیٰ کہ خود انہیں بھی نہیں تھا۔ لیکن جوں ہی ان کا اٹھبپ قلم برق رفتاری کرنے لگتا، اور مطالب و معانی کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے حافظہ سے جس میں اعلیٰ درجہ کی تنظیم و ترتیب کے ساتھ الفاظ ہمیشہ صفا آ رہتے تھے۔ مناسب اور موزوں لفظ نکال لیتے اور اس کو عبارت میں اس کی مناسب جگہ پہاڑ کی سی منصوبی کے ساتھ جمادیتے تھے۔ الفاظ کی اس نشست کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہر لفظ اپنے سابق و لاحق لفظ سے اس قدر مربوط ہو جاتا کہ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہ تھی اور نہ حذف و اضافہ کا امکان۔

(۷) مولاناؒ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی ترکیبیں سبک اور بے وقار نہیں ہوتیں، بلکہ اس قدر دل آویز، دل فریب، حسین اور شگفتہ ہوتی ہیں کہ نکتہ شناسان علم و ادب اور دیدہ و دران حسن و جمال جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ نادر اور بدیع ترکیبوں میں ایسا ترنم، حسن و اثر جلوہ افروز رہتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

(۸) قدحِ نعت نے مولاناؒ کو جن خصائص سے نوازا تھا۔ ان میں ان کے حافظہ کی دولت سب سے بڑی نعمت تھی۔ پورا قرآن مجید ان کے حافظہ میں ہر موضوع اور ہر عنوان کے تحت بالترتیب ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ جب وہ دینی یا مذہبی مضمون لکھنا شروع کرتے تو ہر موقع اور محل کی مناسب آیتیں ان کے بے مثال حافظہ سے بالترتیب اُبھر آتیں اور ان کے حقیقت نگار قلم کی نوک پر آ کر اس عمدگی و نفاست کے ساتھ بیوستہ عبارت ہو جاتیں کہ گویا عبارت اپنے ظاہری و باطنی مقتضیات کی تکمیل کے لیے ان آیات کو ہمہ کی محتاج تھی۔ اس طرح پورا مضمون قرآنی جواہرات سے مزیں ہو کر مزین و عظیم بن جاتا، پڑھنے والے اس کے اعجاز اور اثر سے اس قدر متاثر

ہوتے کہ انہیں محسوس ہوتا کہ ان کے دل و دماغ کے بند دروازے کھل گئے ہیں اور ان میں قرآنِ حکیم کے علوم و معارف کی روشن شمعیں جگمگا اٹھی ہیں۔

(۹) مولانا آزاد جب نثر میں شاعری کرنے لگتے۔ اور ان کا جو اہر نگار قلم منو، قرطاس پر دوڑنے لگتا تو معلوم ہوتا۔ نہایت بے ساختگی کے عالم میں۔ الفاظ فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن جوہی معانی و مطالب کی مناسبتیں اُبھرنے لگتی ہیں تو وہ اپنے عجائب خانہ ذہن سے جس میں قدیم اساتذہ فن کے بہرِ نواع اور ہر قسم کے بلند پایہ اشعار کا ذخیرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ موقع اور محل کی کامل مناسبت سے جس شعر کی ضرورت ہوتی، فوراً نکال لیتے اور اس کو نثر سے اس طرح مخلوط و مربوط کر دیتے۔ جس طرح بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جاتا ہے۔ اس ترکیبی عمل کا قدرتی اثر یہ ہوتا کہ وہ شعر نثر کے مطالب سے جڑ کر نفسِ مطلب کا ایک لازمی جز بن جاتا اور عبارت بھی ایک جمالِ تازہ کے ساتھ حسن و رعنائی کا جلوہ گاہ بن جاتی۔ فی الحقیقت نظم و نثر کا ایسا حیرانگیز اور دل آویز ارتباط و اختلاط، مولانا آزاد کی تحریر کی ایسی خوبی ہے جس میں ان کا سہیم و شریک کوئی نہیں۔

(۱۰) مولانا کی تحریریں۔ ادب و انشاء کے محاسن سے اس طرح مرصع اور مزین ہوتی ہیں۔ جیسے معلوم ہوتا فصاحت و بلاغت کی طلائی و نقرئی جدولیں، نہایت حسین و لطیف امتزاج کیفیت کے ساتھ بکھا کھا کرد و زربہ ہیں تو استعارات کی نیرنگی و دل ربائی، تمثیلات کی خوب روئی و دل آویزی تشبیہات کی رعنائی و زیبائی کا روح پرور جلوہ بھی اس کے ہر پہلو میں نظر آفرور ہے۔

(۱۱) مولانا کی تحریریں صوری و معنوی محاسن کا جمال آفرور مرقع ہوتی ہیں۔ یعنی الفاظ کے شکوہ اور ان کی جگمگاہٹ، فقرات کی چمک دکھ اور سج و سج کے ساتھ معانی و مطالب اور علوم و معارف کی اس قدر فراوانی ہوتی ہے، جیسے زمین کی تہہ میں آج شہرِ مہر کی

سوتیں بہہ رہی ہیں تو اس کی سطح ہلہاتے ہوئے کھیتوں، طرح طرح کے پھلوں اور رنگا رنگ پھولوں سے لدی ہوئی ہے یعنی حفرات مولانا کے طرزِ تحریر پر اَدق، منطقی اور پُر تکلف انشاء، پردازی کا طعن توڑتے ہیں لیکن خطابت اور انشاء پردازی کے اداسناس اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ الفاظ اور تراکیب کے سہل و منطقی اور فصیح و غیر فصیح ہونے کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر نہایت سلیقہ اور عمدگی سے مناسب اور اور موزوں مقام پر ان کا استعمال کرنا ہے، یعنی اَدق سے اَدق تراکیب اور مشکل سے مشکل الفاظ بھی نہایت حسن تناسب کے ساتھ بر محل مستقل ہوں تو وہ صحیفہ ادب بن جاتے ہیں اور اداء مطالب میں کوئی بیچ و خم نہ ہو تو عبارت میں حیات تازہ کی روح دوڑنے لگتی ہے چنانچہ مولانا کی تمام تحریروں کا یہی حال ہے، مطالعہ کیجئے گا تو آپ پر مذکورہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہوگی اور آپ محسوس کریں گے کہ مشکل سے مشکل الفاظ اور اَدق سے اَدق ترکیبیں بھی ان کے خداداد کمال اور وہی اَدق کی بدولت اس طرح شگفتہ ہو گئی ہیں کہ تحریر کے ہر لفظ میں فصاحت و بلاغت کی روح اپنی کوششوں کے ساتھ بولنے لگی ہے نیز ہر ایہ بیان کی معنویت جس قدر ہمہ گیر ہے۔ اسی قدر الفاظ نے بھی ترجمانی کا مکمل حق ادا کر دیا ہے یعنی معانی کے نمود کے لئے الفاظ کا مناسب، موزوں اور بر محل استعمال اس حسن و دل آویزی سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ مولانا نے ایک طرف الفاظ میں معانی و مطالب کے فنا و سرور روشن کر دئے ہیں تو دوسری طرف فقر و بی بخت و کشش سے بھرپور دل کے ٹکڑے پھیلادیئے ہیں۔ اس خصوص میں صاحب طرز ادیب مولانا عبدالمجید صاحب دلیا باری۔ البتال کے خصائص و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ و تراکیب کی جدت و ندرت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عصا ہائے سخن نے اور بھاری بہر کم نطرت اندنی و کیس نی تشبہیں

نئے استعارات اور نئے اسلوب بیان، ہر ہفتے اس ادبی و علمی
مہینے سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم کہ نیکے
ہی سکندر راج اوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سرچشمی
رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو اسب ہائیں
کرتے رہ گئے، (چند یادیں، صدق جدید ۴ مارچ ۱۹۵۸ء)

د (۱۳) مولانا آزاد کے طرز نگارش کا ایک کمال یہ ہے کہ موضوع اگر سہل انداز بیان
کا متقاضی ہو تو وہ نہایت سلیس، زور و فہم، معنی خیز، حقیقت فرما اور دل آویز زبان
اختیار کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس انداز بیان میں بھی ایک مسیما نفس کی طرح زندگی پیدا
کرتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں تو علوم و معارف کے رنگارنگ
بھول منہ ہائے قرطاس پر بکھرنے لگتے ہیں۔ نیز ایک عجیب دل کش اور اثر آفریں
طرز سے معانی و مطالب کو ٹھوس اور مستحکم دلائل و برائیں کی روشنی میں اس طرح منضبط
کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ نگاہیں علم و حکمت کے یوٹی جن رہی ہیں۔
اس سلیس طرز نگارش کی سب سے زیادہ روشن مثال ان کی عظیم النظیر تفسیر
”تو جان القرآن“ ہے، چنانچہ خود مولانا نے ترجمہ کے سہل اور عام فہم مہنے کے تعلق سے فرمایا۔
”میں حقیقت پیش نظر ہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت
کا مزید درجہ ہیں، ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لئے
متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے میں نے تجربہ کے سے سورہ بقرہ کا جو
ترجمہ کیا جو وہ پندرہ برس کے لڑکے کو دیا جو اردو کی آسان کتابیں روحانی کے ساتھ
لے لیتا ہے، پھر ہر مقدمہ سوالات کر کے جانچا۔ جہاں تک مطلب سمجھ
لینے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی نہ اٹکا اور تمام سوالوں کا جواب دیتا گیا
پھر ایک دوسرے شخص پر تجربہ کیا جس نے بڑی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے

اور ابھی اس کی استعداد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اردو کے تعلیمی رسائل پڑھ لیتا ہے۔ یہ تین جگہ فارسی لفظوں پر انکار کیا لیکن مطلب سمجھنے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی، میں نے وہ الفاظ بدل کر نسبتاً زیادہ سہل الفاظ رکھ دیئے۔

(ترجمان القرآن جلد اول)

(۱۴) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ معقولات، فلسفہ اور اجتماع ایسے خشک موضوع ہیں کہ جن کی نگارش میں زبان و بیان کی شگفتگی، رنگینی، دل کشی اور لطافت و حلاوت کا جلوہ گر ہونا ایک امر مستبعد ہے۔ لیکن مولانا کے معجز نگار قلم نے نہایت مؤثر فصاحت اور طرز نو و اسلوب جدید اختیار کر کے اس خشک وادی کو بھی گلستان ہزار رنگ میں تبدیل کر دیا ہے، چنانچہ مولانا کی فلسفیانہ تحریروں پر نظر ڈالئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان میں بیج دھم ہے اور نہ الجھاؤ بلکہ ان کا ایک ایک فقرہ ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ ایسا صاف روشن اور دل نشین ہے جیسے معانی کا نگینہ ہے جو انگلیٹھی میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ جڑ دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد اس نوع کی نگارشات کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اہلالِ موزہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۱ء میں ایک نئے باب کا عنوان ”فلسفہ“ افتتاح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”اس باب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کے تحت جس قدر مضامین شائع

ہوں گے، انہیں ہر طرح کے مذہبی معتقدات و آراء سے الگ رکھا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ محض فکر و نظر فلسفہ و اجتماع ہو۔

نہایت امر یہی پیش نظر رہے گا کہ اجتماعی و فلسفی مباحث کے لئے

ایک نئے طرز بیان و انشاء کا نمونہ پیش کیا جائے، بہت سے لوگوں کا

خیال ہے کہ فلسفیانہ مضامین وہی ہو سکتے ہیں جن کی عبارت نہایت

ردھی ہوگی۔ اھ بے مزہ ہوا اگر ایسا نہیں ہے تو اسے فلسفیانہ استدلال

دفتر سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ قلمی
پست ہمتی کم از کم ان لوگوں کے لئے تو جائز نہیں رکھی جاسکتی
جنہیں خدائے تعالیٰ نے اپنے ہر طرح کے افکار کو بہتر لفظوں
اور موثر فصاحت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت دے
دی ہے۔ وَذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ اور ان پر بلاغت
قرآنی کے درس و افادہ سے فیضانِ بیان کا ایک ایسا
دروازہ کھول دیا ہے کہ دقیق سے دقیق خشک مطالب کو
بھی وہ حسن و عشق کی دل چسپ داستان بنا کر دے سکتے ہیں۔
اُس نیست کہ صحرائے سخن جاہ نہ دارد
داژدں روشن کج نظری را چہ کند کس؟

(۱۵) مولانا آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت مرقع نگاری ہے، ان کا سحر نگار قلم مدہا
رنگینوں اور حُسن آرائیوں کے ساتھ جس دل کش اور موثر طریقہ سے قدرتی مناظر اور
بزم و رزم کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچتا ہے۔ اس پر عقل حیران ہے۔
ان کا حقیقت نگار قلم اگر بزم و سخن کی تصویر کشی کرنے لگے تو چشم تصور کے
سامنے اس غفل کا سارا ماحول اور جملہ مناظر گھومنے لگتے ہیں۔ اور اگر ان کے
اشبہ قلم کی ہاگ رزم کی طرف مڑ جائے تو معلوم ہوتا ہے اعلیٰ درجہ کی عسکری تنظیم
ترتیب کے ساتھ مجاہدین صف آرا ہیں، بے نیام تلواریں اپنی چمک دیکھنے لگا ہوں
کو خیرہ کر رہی ہیں۔ موت و زلیلت کی قیامت خیز جنگ شباب پر ہے۔ لاشیں
مڑپ رہی ہیں۔ مقتولین کے حلق پریدہ سے خون کے فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ تو
زمینوں کے جسم سے خون اُبلا رہا ہے۔

مولانا آزاد نے واقعات و مناظر کی بھرپور مصوری کے لیے جس خوبصورت

سلیقہ سے مناسب، موزوں اور حسنِ انشا و بیان سے مزین الفاظ۔ نادر اور برجستہ ترکیبوں، اُچھوتی مثالوں اور اشاروں کا استعمال کر کے اس نوع کے محاکاتی طرزِ نگارش کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ (۱۶) مولانا آزاد کے طرزِ نگارش کی ایک لطیف خوبی یہ ہے کہ وہ ”اَلْكَفَايَةُ مُبْلَغُ مِنْ الْمُصْرَحِ“ کے مطابق اپنی زندگی کے حالات و واردات کو نہایت دھیے اشاروں اور دھندلے کنایوں میں اس جدت و ندرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شاعرانہ اعجازِ بیان تمام تفصیلات کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔

اس نوع کی تحریروں کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کا جادو نگار قلم بلاغت کے جوش اور فصاحت کی مستی کے ساتھ رقص کرنے لگا ہے تو اس سے جنتانِ عبارت میں رنگارنگ اور نوعِ بنوع کے پھول کھل گئے ہیں اور معانی و مطالب اپنی اصلی شکل و صورت کے ساتھ الفاظ و تراکیب کے آئینہ میں اس طرح جلوہ گر ہو گئے ہیں کہ سارا ملکِ تانِ ادب ان کی جگہ گاہٹ سے روشن ہو گیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا نے اپنی حیاتِ زریں کی تیس سالہ سرگزشت کو پردہِ مجاز میں بیان کر کے نثر میں جو وجدِ آفریں شاعری کی ہے وہ ان کے کمالِ نگارش کا ایسا روشن پہلو ہے جس کی مثال موجودہ دنیائے علم و ادب میں نہیں ملتی۔
(باقی آئندہ)

(تصحیح)

مئی ۱۹۷۲ء کے برہن میں محمد حبیب صاحب کے عنوان سے درجِ مخموم میں مشاق احمد صاحب کے نام سے چھپا ہوا ردِ جواب لکھا گیا ہے۔ قارئینِ کرام محبت فرمائیں۔

فارسی شاعری میں لطافت و ظرافت

خان محمد عاطف ملیح آبادی دانش گاہ تہران

لطافت و ظرافت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ اس سے دوسروں کے ادبی ذوق اور خوش مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ بذلہ سنجی اور لطافت و ظرافت کے ذریعہ کبھی قوم کی ذہنیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ جواب چھینتا ہوا ہونا چاہیے۔ ذرا سا بھونڈا پن پورے محبوبوں کو حدودِ ادب سے خارج اور سامع کی طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے اور ذہنی نانی ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے لوگ حاضر جواب، پر مذاق اور نکتہ رس ہوئے ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جو دنیا نے ادب کو بقائے دوام عطا کرتے ہیں۔ عربی و فارسی ادب میں حاضر جوابی، لطافت و ظرافت اور بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اہل فارس کے استاد عرب ہیں۔ عربوں نے اس میدان میں بہت زیادہ ترقی کی اور اس فن کو معراج کمال تک پہنچایا۔ شاگردوں نے اسلئے کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس میدان میں ترقی کی راہیں طے کیں۔

لطافت و ظرافت آزادانہ فضا اور ماحول کی دین ہے۔ آزاد اور با ذوق درباری ماحول میں ہی ظرافت اور بذلہ سنجی پروان چڑھتی ہے۔ جابرانہ اور استبدادی نظامِ حکومت ذہنوں کو کند اور تنگی عطا کرتا ہے، ساتھ ہی انسان رواداری کے اعلیٰ جذبہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور وسیع النظری پیدا نہیں ہو سکتی۔ وسیع النظری کا پہلا ذریعہ رواداری کا جذبہ ہے اور رواداری کے بغیر وسیع النظری کا تصور ہی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ فارسی ادب کا زریں عہد ہندوستان (برصغیر) میں سلطنتِ اسلامیہ کا قیام اور

مخل بادشاہوں کی قدر دانی اور علم پروری کا مہر منسوب ہے یہی وہ عہد ہے جب ہنس فارسی زبان و ادب میں اعلیٰ پایہ کا مذاق، اندکہ سنجی، حاضر جوابی اور لطافت و ظرافت کے لطیف و نازک اشارے ملتے ہیں جو ذوق سلیم کے عین مطابق، باذوق، اور رسلطینوں کے لیے لذت کا سامان فراہم کرکے کبھی سکرانے لے کر کبھی تہقہہ لگانے کا موقع عطا کرتے ہیں میدانِ ظرافت میں فارسی لوب کو ایک خاص مقام حاصل ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس ادب میں تنوع اور وسعت خیال کی کمی ہے لیکن منظوم لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں فارسی اس دنیا کے کسی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ظرافت و لطافت کو صنفِ شاعری میں پیش کیا گیا ہے، ایک تو حاضر جوابی اور لطافت دوسرے قالبِ شعری! اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل فارس کے مزاجوں میں شاعری اور مزاح رچ بس گئے تھے اور ان کے ذہن طبع رسا اور مزاج موزوں کا تقاضا یہی تھا کہ ہر بات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر اس کو بقائے دوام عطا کر دیں۔

اچھے اور ستھرے مزاجیہ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرہ میں آزادیِ خیال کے ساتھ ہی ساتھ، احساس کا شدید جذبہ موجود ہو۔ لیکن یہ جذبہ حدودِ اعتدال کو نہ پار کرے۔ وسعتِ نظر تنگ نظری کے پردوں میں گم نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ وسیع النظری کے بغیر خوش طبعی کا تصور ناممکن ہو جاتا ہے اور آزادی کے بغیر یہ جو ہر نمایاں نہیں ہوتا۔ مزاح کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور فلاحی ریاست کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کے بغیر عیاری مزاح پیدا نہیں ہو سکتا۔ طنز و مزاح اور لطافت و ظرافت کے درمیان فرق پیدا کرنا مشکل امر ہے طنز ہی دراصل مزاح ہے اور لطافت و ظرافت اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ یہ بات مزاح نگار پر تکیہ کرتی ہے۔ یا اس کی نازک طبعی پر منحصر ہے کہ وہ تلوار کی طرح کام کرے یا کندو و زنگ آلود چاقو کی طرح تڑپائے۔ ذرا سا بھونڈا پن یا بھوٹن مزاح کو جہادِ ادب سے گزاد کر اعتدال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ قومی آزادی کی جنگی کے ساتھ ہی ساتھ اعتدال و وسعتِ نظر قوموں میں پیدا ہو جاتی ہے جن کو کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وقت

کے ساتھ ساتھ قومی آزادی کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں جو معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی جاتی ہے اور عوام کو سماجی سکون و تحفظ اور افکار گندم و خوف و دہشت نجات ملتی جاتی ہے۔ طنز و مزاح میں بلند گی افکار اور اعتدال پیدا ہوتا جاتا ہے اور اس سے ہر طبقہ کو لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

مزاح اور جذبات لطیف کا اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب با اقتدار اور حکمران طبقہ اور درباری ماحول اعتدال پسند رہا ہو۔ اگر حاکم سخت گیر، جابر اور آمرانہ ذہن کا مالک ہو اور وہ دوسرے کی بات سننے پر گرائی محسوس کرتا ہو یا لوگوں کو اس کی ہیبت سے زبان پلانے کی جرأت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ خوش مزاجی کا ماحول پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور حاضر جوابی کا گلا گھسٹ کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر بادشاہ اور امراء خود با ذوق اور شوخ طبع ہوں اور خوش مزاجی اور شوخی طبع کو پسند کرتے ہوں تو درباری ماحول حاضر جوابی، مزاح و لطیف و نازک جذبات و خیالات کا مرکز بن جاتا ہے۔ بلندی افکار اور بذلہ سنجی پورے ماحول پر چھا جاتی ہے۔ ہر بات میں نکتہ اور ہر نکتہ میں کام کی بات نکل آتی ہے۔

عرب فطرتاً جوی، بہادر اور نڈر تھے۔ اس لیے حاضر جواب بھی تھے۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں عربوں کا مرتبہ انتہائی بلند رہا ہے۔ اہل فارس عربوں کے شاگرد تھے، اسلامی نظریات اور آزادی خیال ان کو ورثہ میں ملے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب لطافت و نازک خیالی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں دنیا کے دوسرے ادبیات سے بہت آگے ہے۔

شاہی درباروں، بادشاہوں اور اہل تخت گیر کی موجودگی میں ایک شاعر و ادیب ایسے جیتے ہوئے اشعار و فقرات چست کرتا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

سلطان محمود بیکتگیں کے زمانہ میں صوبہ قبا پر یونین طوغان حکمران تھا اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت اس کے پانچ بیٹوں کے حصہ میں آئی۔ محمود سلطنت حکمرانی

میں انتہائی محنت گیر تھا۔ اس نے جب سمرقند اور طرانکینیا فتح کر لیا تو حکم دیا کہ پانچویں
بھائیوں کو باجگذاری پر مجبور کیا جائے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مندرجہ
ذیل اشعار جواب میں لکھ بھیجے۔

پانچ برادر از قبا ئیم دریادل و آفتاب را ئیم
مالک زمیں ہمہ گرفتیم اکسوز بتفکر سما ئیم
گر چرخ بگام مانگردو چنبر زہمش فرد کشا ئیم

ترجمہ:- ہم پانچوں بھائی اہل قبا۔ دریادل ہیں اور آفتاب کی طرح روشن ہیں۔
ہم نے تمام زمین کی سلطنت حاصل کر لی ہے اور اب آسمان کی فکر میں ہیں۔
اگر آسمان بھی ہماری موافقت نہ کرے تو اس کو بھی کیسے کر گردن کے بل گرا دیں گے۔

ان کو سزا دینے کے لیے بادشاہ نے ایک لشکر روانہ کیا اور درباری شاعر
النزاری سے خط لکھنے کو کہا۔ جسے النزاری نے اس طرح شروع کیا۔

نمرود بہ عہد پور آذر می گفت خدای خلق ما ئیم
جبار بنیم پشہ اورا خوش داد سزا بوما گوا ئیم

ترجمہ:- نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھا اور کہتا تھا کہ میں خالق
مخلوق ہوں، لیکن ایک چھپر اس پر غالب آیا۔ اس کو کیسی اچھی سزا ملی
ہم اس کے شاہد ہیں۔

اب ان کو ہوش آیا اور مندرجہ اشعار روانہ کیے۔

پانچ برادر از قبا ئیم در قحط دنیا ز مبتلا ئیم
شاہ تو عزیز مہر جودی داخوان گناہگار ما ئیم

اما جماعتی است نرجات شرمندہ حضرت شما ئیم

بہالت تار و ناخشا ئی از فضل و کرم کہ با ئیم

ترجمہ: ہم پانچوں بھائی اہل قباحت اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اے شاہ تو عزیز مر ہے یعنی یوسف علیہ السلام ہم تیرے گنہگار بھائی، کرم کے طالب ہیں۔ ہمارے پاس تھوڑی سی پونجی ہے۔ ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ ہماری حالت اچھی نہیں ہے ہم بے نواؤں پر فضل و بخشش کر۔

یہ جواب سن کر بادشاہ مسکرایا اور ان کو باغکداری سے معاف کر دیا۔ ان اشعار میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر کے خاص قسم کی لذت پیدا کر دی ہے جس کو سن کر آدمی بے اختیار مسکرا دے پہلے جواب میں دون کی ہانکنے کے بعد عز و انکساری کو ایک لطیف پیرائے میں بیان کرنا لطافت و نزاکت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس پر بادشاہ کا مسکرا کر انھیں معاف کر دینا یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا ماحول پیدا کرنے میں خوشناتاہن وقت کس قدر دل چسپی لیتے تھے۔ وہ عفو و درگزر سے کام لے کر دوسروں کو موقع دیتے تھے تاکہ لوگوں کی ذہنی صلاحیتیں آزاد و فضا اور آزاد ماحول پا کر وسعت خیال کا روپ دھار سکیں۔

عبداللہ خان از کب رستم کے مقبرہ کے پاس سے نکلا اور یہ شعر پڑھا

سرا ز خاک بردار و ایراں بییں بکام دلیرانِ توراں زمین

ترجمہ: خاک سے سرا اٹھا اور ایران کو دیکھ جو دلیرانِ توراں کے قبضہ میں

آچکا ہے۔

عبداللہ خاں کا وزیر ساتھ تھا اس نے کہا اگر رستم زندہ ہوتا تو میں جاتا

ہوں کہ کیا جواب دیتا۔ عبداللہ خاں نے پوچھا کیا جواب دیتا؟

اس نے کہا رستم کا جواب یہ ہوتا ہے

جو ہمیشہ تھی ماند زوۂ شیر شغالانِ ہمیشہ در آید دلیر

ترجمہ: جب کبھی شیروں سے خالی ہو گیا تو گیدڑ دلیرانہ طور پر پھٹے آئے۔

شامی درباروں میں شعرو شاعری کا ایک ماحول پیدا ہوا تھا بادشاہوں

کی شاعر نوازی، درباروں میں ذہنی آزادی، اچھی اور بہتر بات کو شعر کے قالب میں جمال
کرنی البدیہہ کہنے پر جس طرح شاہان کج کلامہ شاعروں کو فواز تے تھے۔ اس نے ایسی فضا
پیدا کرنے میں مدد دی تھی۔ خود شاہوں اور ان کے حرم میں شاعرانہ ہنسی مذاق اور نوک
چھونک کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ جہانگیر اور نور جہاں کی ادبی نوک چھونک بہت شہرت
رکھتی ہے۔ ایک بار جہانگیر نور جہاں کے ساتھ بالاخانہ پر کھڑا تھا۔ نیچے ایک بوڑھا
آدمی کمر جھکائے جا رہا تھا۔ جہانگیر نے اس کو دیکھ کر کہا:۔

چرا خم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ
ترجمہ: بوڑھے آدمی کمر جھکائے کیوں گھومتے ہیں۔

نور جہاں نے جواب دیا:۔

بہ زیر خاک می جویند ایام جوانی را
ترجمہ: میں میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو تلاش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ نور جہاں باغیچہ میں ٹہل رہی تھیں اتفاقاً ایک شاعر سے سامنا ہو گیا
اسے دیکھتے ہی نور جہاں نے مذاق کے طور پر کہا:۔

زمین تر قید و پید شد سر خر
ترجمہ: زمین بھی اور گدھا ظاہر ہوا

شاعر نے فی البدیہہ کہا:۔

شمیدہ بوی مادہ آمدہ خر
ترجمہ: مادہ کی بو پر نرا آ گیا۔

لیکن ملکہ نور جہاں نے اس جواب کو بھی برداشت کیا اور کوئی سزا نہ دی۔ اگر شاہی
درباروں میں گھٹن کی فضلیہ اور حوائی اور شاعروں، ادیبوں اور دوسرے لوگوں کو
آزادانہ طور پر اپنی بات کہنے کی اجازت نہ ہوتی تو ادبی نکات ظاہر نہیں ہو سکتے تھے۔

اور میری طنز و مزاح کا ماحول پیدا ہو سکتا تھا۔

خاقانی نے منوچہر شیردانی شاہ کو یہ شعر روانہ کیا ہے

دشقی دہ کہ در ہرم گیرد یاد ساقی کہ در پریش گیرم
ترجمہ :- ایک لونڈی عطا کر کہ وہ میری بخل میں بیٹے یا حاملہ اونٹنی کہہ میں اس کی
کوکھ میں بیٹھوں۔

لفظ "یا" نے خاقان کو ناراض کر دیا۔ اس نے سوچا کہ میری سخاوت پر شک کیا ہے۔
شاعر سے کہلا بھیجا کہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ خاقانی نے شاہی قاصد کی موجودگی میں کبھی کی
طرف دیکھا اس کی "ٹانگ" اور "پر" کاٹ لیے اور کہلا بھیجا کہ میں لفظ "یا" لکھتا تھا "یا" نہیں
لیکن یہ بدبخت کبھی آگئی روشتائی تم تھی جس کی وجہ سے دو نکتے ہو گئے۔ خاقان اس جواب
سے بہت خوش ہوا اور اسے معاف کر دیا۔

شاہوں کا ادبی ذہن و مزاج کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ اورنگ زیب جیسا شخص جو شعر و
شاعری کو پسند نہیں کرتا تھا بعض اوقات مجبور ہو جاتا تھا کہ شعر و شاعری میں دل چسپی لے
ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ادبی ذوق کا مالک نہیں تھا یا شعر و سخن سے لگاؤ نہ رکھتا تھا
اصل بات یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا دقت ہی نہ تھا کہ وہ شعر و سخن کی محفلیں جاتا اور
دلو سخن دیتا۔ اس کی ساری عمر گھوڑے کی پیٹھ پر گزرتی رہی۔ اورنگ زیب کے زمانے
میں ایران سے ایک مصرع بھیجا گیا۔ اورنگ زیب نے شاعروں سے اس پر گرہ لگانے
کو کہا لیکن جب کوئی مصرع اس سے پسند نہ آیا تو اس نے اپنی بیٹی کو بلا کر اس پر
مصرع لگانے کو کہا۔

زیب النساء نے کہا آپ کا حکم نہیں ہے کہ شعر و شاعری کروں۔
اورنگ زیب نے اجازت دی۔ تو مصرع کے بارے میں پوچھا بادشاہ نے مصرع بتایا۔
کہ آسمان رو دو کار آفتاب کنند

زیب النساء نے اس پر گرہ لگائی۔ ع
اگر بڑا نظر ہو تو راب کند کہ آسان رود و کار آفتاب کند
ترجمہ:- اگر بڑا نظر ہو تو راب یعنی حضرت علیؑ ذرہ کو محبت کی نظر سے دیکھ لیں تو
وہ آسان پر ہنچکر مثل آفتاب چمکنے لگے۔

شعر و شاعری کا تبادلہ باپ اور بیٹوں کے درمیان بھی بھی ہوا کرتا
تھا۔ نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت نظام دکن، اچھے شاعر تھے۔ ان کا
دربار شعراء سے بھر رہا تھا۔ ناصر جنگ شہید آصف جاہ کے بیٹے تھے۔ وہ بھی شعر
کہتے تھے۔ باپ بیٹے کے درمیان شری مونگا فیاں چلتی رہتی تھیں۔ ناصر جنگ نے
ایک شعر باپ کی خدمت میں روانہ کیا۔

مرنجان خاطر جاننا مزاجی ناز کی دارم تو گرا ز حسن مغروری من از عشق تو مغرورم
ترجمہ:- میری جان مجھے دکھ نہ دے۔ میں انتہائی نازک مزاج ہوں۔ تو اگر اپنے
حسن کا غرور رکھتا ہے تو میں بھی اپنے عشق پر مغرور ہوں۔

نواب آصف جاہ نے شعر دیکھنے کے بعد کہا کہ قباحیت یہ ہے کہ عاشق کے لیے مغرور
ہونا اچھا نہیں اس پر بیٹے نے کہا بجز حضرت کے میرا عاشق و مشوق کا کوئی رشتہ موجود
نہیں اور یہ میں نے حضرت کے بارے میں کہا ہے۔ یہ کہا اور روانہ ہو گئے۔

آصف جاہ نے ناصر جنگ کو یہ مصرع روانہ کیا۔

اند کی بگزار تا سیر تجل می کنم

ترجمہ:- تھوڑی دیر بھر تاکہ میں تیرے جمال کا نظارہ کروں۔

اس کے جواب میں ناصر جنگ نے یہ مصرع روانہ کیا۔

گر تو استغنا کنی من ہم تغافل می کنم

ترجمہ:- اگر آپ نے بے پروائی کا اظہار کیا تو میں بھی چشم پوشی کروں گا۔

اس طرح کی آزاد فضا میں فارسی علم و ادب کی ترقی جاری تھی۔ آدابِ شاہی خوردگی و بزرگی باپ و بیٹے کا حجاب، درباری رسم و رواج اور آدابِ بالا کے طاق رکھ دیئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موضوع پر آپ کو فارسی اشعار ملیں گے۔ نازک خیالی، لطافت و نزاکت، ہجو و لطائف، مبالغہ آرائی، پہیلیاں، ایک ہی لفظ کے مختلف معنی لینا اور شعر کے مطلب کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا، فارسی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔

خواجو کرمانی اور عصمت ہم عصر تھے۔ ایک دوسرے سے شاعرانہ رشک و حد بھی رکھتے تھے۔ بادشاہ کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ کبھی کبھی دونوں میں ٹوک جھونک کر ادیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ اور عصمت ایک جشن میں شریک تھے خواجو آگیا۔

بادشاہ نے عصمت کو مخاطب کر کے کہا: "لو تمہارا دوست آگیا۔ کیا تم اس سے ملو گے نہیں؟"

عصمت نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

خواجو نگر، خواجو نگر، خواجو زکرمان آمدہ

کرمان زگرہ بیرون شوند این گہ زکرمان آمدہ

ترجمہ: خواجو کو دیکھو! خواجو کو دیکھو! خواجو کرمان سے آیا ہے۔ کرمان (کڑوا)

کبھی گھورے میں چلے جاتے ہیں اور کبھی باہر آ جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ بادشاہوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے

ادب لطیف کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

ظرافت کے لغوی معنی تو خمندی اور خمی کے ہیں۔ ایسا شخص جس کی

تقریر میں خمی و دانائی پائی جائے اسے ظرافت اللسان کہتے ہیں۔ ساتھ ہی خمی و خمی

اور لاشت کا پہلو بھی رکھتی ہو جو لوگوں پر گراں نہ گزرے۔ لیکن ایسی گفتگو جو سہنی اور مذاق سے پر ہو مگر بے معنی ہو، لطافت و ظرافت کہے جانے کی مستحق نہیں۔ اس طرح کے جملے یا اشعار محض استہزاء محول یا ٹھٹھوں کا نمونہ ہونگے اخلاقی دنیا میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

مزاح کی تاریخ دراصل طلوع اسلام سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے عرب مزاح کے مستحل نہیں ہو سکتے تھے۔ ذرا سا مذاق یا خوش طبعی تلوار زنی میں بدل جاتی ہے۔ اسلام نے چہروں کی خشکی اور رکھائی کو دور کر کے خوش طبعی میں بدل دیا۔

ظرافت کے لیے ذکاوت اور حاضر جوابی ضروری ہے۔ لیکن فحش نہیں، دائرۂ اخلاق کے اندر رہ کر حاضر جوابی کے جوہر دکھانا ہی دراصل ظرافت ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں قدیم رنگِ ظرافت نہیں بھاتا۔ موجودہ عہد کی سیودہ اور مضحک باتوں کو ظرافت کی سحران اور فن مانتے ہیں۔ قدیم ظرافت میں کچھ فحش باتیں آگئی ہیں۔ لیکن زیادہ باتیں کام کی ہیں تو ہتھ دیب سکھاتی ہیں۔ آدابِ محفل سے روشناس کراتی ہیں۔ بات کرنے کا ایک اچھا تاثریہ معلوم ہوتا ہے۔ حاضر جوابی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ طرزِ معاشرت کے لیے اصلاحی پہلو تلاش کرتی ہیں۔ لیکن موجودہ عہد میں بے ہودہ افانوں اور فرضی عاشقوں کو افانوں کی شکل دے دینا ظرافت کا معیار بن گیا ہے۔ اس طرح سے جو ادب پڑا جڑھ رہا ہے اسے لطافت و ظرافت تو کہا نہیں جاسکتا۔ ظرافت روحانی سکون عطا کرتی ہے۔ اس کو مجروح نہیں کرتی۔

جنوبی افریقہ کے مسلمان

از جناب احمد ثبات صاحب

بـاعظم افریقہ کے اقصی الجنوب میں جنوبی افریقہ کا (ساؤتھ افریقہ) ملک واقع ہے اس کا رقبہ تقریباً پانچ لاکھ مربع میل ہے مورخین کے قول کے مطابق یورپین قومیں ۱۶۵۲ء مغربی طرف سے آئیں اور حبشی اقوام شمال کی طرف سے آکر آباد ہوئیں اور بعض حبشی قومیں پہلے سے آباد تھیں ہندی قومیں ۱۸۶۰ء مزدورانہ حیثیت سے لائی گئیں اور اس کے بعد صوبہ گجرات سے بعض قومیں تاجرانہ حیثیت سے آکر آباد ہوئیں اور ان سب کے اختلاط سے ایک دوسری قوم جو کلر دکھلاتی ہے ہستی میں آئی۔

حبشی ایک کروڑ دس لاکھ ہیں جن میں کھوٹے مسلمان ہیں جو مشرقی افریقہ سے یہاں کام کرنے آئے ہیں اور بعض یہاں اسلام قبول کرتے ہیں۔ یورپین چالیس لاکھ۔ ملائی کچھ ہزار (جو ملایا سے غلام حیثیت سے لائے گئے تھے) کلر و پندرہ لاکھ اور ہندی چھ لاکھ ہیں ہندی میں مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ تقریباً چار حصہ ہندو ہیں اور ایک حصہ مسلمان۔ ہندوؤں میں زیادہ تر سدراہی علاقہ سے ہیں اور تقریباً ایک تہائی دہلی بہار وغیرہ علاقے سے آئے ہیں جو نکر یہ لوگ کلکتہ بزرگاہ سے آئے ہیں اس لیے کلکتہ اور ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ گجرات کا کھٹیا وارڈ کے ہندو بنیا کہلاتے ہیں۔ سدراہ کے بہت سے ہندو عیسائی ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں میں اکثریت حیدرآباد کے مسلمانوں کی ہے گجرات کے بوہرہ (سنی) اور کاٹھیا وارڈ کے مہمن ہیں۔ گجرات کا کھٹیا وارڈ کے علاوہ تمام قومیں اپنے آبائی وطن سے بالکل انجان ہیں۔ کوئی رشتہ تعلق باقی نہیں ہے۔

اور نہ دل چپا ہے۔ یہ تمام قومیں اسی کو اپنا وطن سمجھتی ہیں۔ اور یہاں جینا مرنا پسند کرتی ہیں۔ یورپیوں اور حبشیوں میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ یورپین غالب آئے انکی حکومت قائم ہو گئی اور اب تک قائم ہے لیکن دنیا کے تغیر اور تبدل سے حبشیوں کو انکے علاقے میں دستوری حکومت (یورپیوں کے زیر سایہ) دینا شروع کیا ہے۔ ہندی مزدورانہ حیثیت سے آئے مزدوری کا عہد پانچ برس پورا کرنے کے بعد آزاد کر دیئے گئے بہت سے اسی کاموں میں ہیں۔ بعضے زمیندار ہو گئے اور بعضے تاجر۔ گجرات، کاٹھیاواڑ کے ہندو اصل سے تجارت میں ہیں اور زیادہ تر انہیں کا قبضہ ہے۔ ہندیوں کو انکی آبادی، دلتے ٹاؤنوں (آبادیوں) میں ممبری کا حق ملا ہے اور مرکزی شاؤرنی کمیٹی بھی پچیس ممبروں کی بنائی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومت میں نہ انکی نمائندگی ہے اور نہ آواز۔

اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نعمتوں سے نوازا ہے سونا ہیرے لوہا کوئلہ وغیرہ معدنیات بڑے پیمانہ پر نکالے جاتے ہیں موسم معتدل ہے اس لیے زراعت بہت کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے یورپین قوموں نے محنت و کوشش سے تعلیم اور سائنس کی روشنی میں حذا داد قابلیت کے ساتھ اس ملک کو بہت آباد، شاداب اور خوش حال بنا کر اس ملک کو رشکِ ارم بنادیا ہے اور جانفشانی اور فیاضی سے دن بدن آبادی میں اضافہ کر کے افریقہ کا سب سے آباد سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ اور سب سے مضبوط طاقتور ملک بنادیا ہے اور یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کے زمانہ میں اگر امریکہ کے برابر نہیں تو اس کی صف میں تو ضرور کھڑا رہ سکتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ آج کی دنیا کے ماشدہ یورپین قومیں ہیں گو کہ انہوں نے ایشیا اور افریقہ کو آزاد کر دیا ہے لیکن زندگی کی ضروریات میں بالخصوص سائنس میں ایشیا اور افریقہ ان کے دستِ نگر ہیں۔ اس ملک کو یورپیوں نے اپنی والہانہ کوششوں سے صرف آباد اور مضبوط ہی نہیں بنایا بلکہ اپنے اثر و اقتدار سے حبشی اور ہندی قوموں

کی کایا پلٹ دی ہے گو کہ یہ ملک افریقہ کا حصہ ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یورپ کا حصہ ہے یا امریکہ کا کنارہ ہے۔ یورپین قومیں بچپن ہی سے تعلیم تربیت نہایت کوشش انہماک اور جانفشانی سے کرتی ہیں۔ بلند ہمتی عالیٰ ہوشی، مہمزدی، ظاہری و صغاری، انصاف، قوم و وطن کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنا، اپنے حصول مقصد میں جان و مال کی پرواہ نہ کرنا، نمود نام آوری میں جان کھپانا، وقت کی پابندی، قوانین کی تاجداری، اپنی مثال آپ ہیں ہمارے ہندی قوم کے آبا و اجداد سیدھے سادے بھولے بھالے ان پڑھ تھے۔ مدراس کا مزدور اور گجرات کا تاجر اس میں برابر تھے لیکن ان کی اولاد آج وکیل، ڈاکٹر، ریس، ٹیچر، کلرک، غیرہ نامور تاجروں کے بیوپاری، فیکٹری اور کارخانہ جات والے کھیتی ہو گئے ہیں یورپیوں حبشیوں اور ہندیوں کے سکول الگ الگ ہیں مگر بچپن ہی سے وقت کی پابندی اصول کی تاجداری، سرداروں کی اطاعت، قوانین ملک کی رعایت، انسانیت کی خیر خواہی کھلائی جاتی ہے اور العزیز شغف جانفشانی محنت عرق ریزی ان کا خمیر ہوتا ہے نام نمود آوری اور حصول مادیات ان کی طبیعت بن جاتی ہے۔ بڈل ایٹ (مشرق وسطی) اور ہندوستان کی میری مسافری میں یہ فرق صاف صاف نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ ہندی قوم چونکہ طبعاً عقل و ذکا، اور وفاداری میں دوسری قوموں سے بڑھی ہوئی ہے طبعاً اثر قبول کر لیتی ہے اس لیے تعلیم تربیت اور ماحول کے اثر سے اس کی اصلیت، مشرقیت سے مغربیت اور روحانیت سے مادیت میں تبدیل ہو چکی ہے سکولوں کی پابندی تو عام ہے لیکن تجارت میں اوقات کی پابندی کارخانوں میں عملی الصلاح ہندی جو اس لڑکے لڑکیں سرعت اور پابندی سے جاتی ہیں اور ان کی روزانہ زندگی اور کاروبار میں اسی تعلیم تربیت اور ماحول کا اثر ہے اور یہی سب وہ عمل ہے جس سے روزی میں فراخی معیشت اور معاشرہ کے طریقوں میں تنوع اور جدت اور بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ رہائش دزیائش کے حصول میں کوشش اور شغف خور و نوش نہیں وغیرہ میں

تنوع مادیت کے حصول میں اپنی پوری کوشش خرچ کرتے ہیں اور ساتھیوں سے میل جول میں ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ جب یہاں کا ہندی اپنے مادر وطن جابا کرتا ہے تو اس کو ہر چیز نئی اور انوکھی اور انسان بھی دوسری دنیا کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ الغرض یہاں کا ہندی اپنے آباء و اجداد جیسا ہندی نہیں ہے بلکہ اکل و شرب لبس و زینت گفتار و رفتار بود و باش معاش و معاشرہ میں پورا مغربیت سے بھر سوا ہے اور الناس علیٰ ادین ملوکھھ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اصول مغربیت کے مطابق لڑکے لڑکیاں ساتھ مخلوط تعلیم حاصل کرتے ہیں کارخانہ میں ساتھ کام کرتے ہیں سینما کھیل کو دسیر و تفریح سب کا جز و زندگی ہے کانفی دفتروں میں ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہاں کا ہندو نہ تو کڑا مہاسماجائی ہندو ہے اور نہ مسلمان پکا سرحدی مسلمان بلکہ سب کے مد نظر حصول مادیت ہے۔ بدنی اعضاء ہونٹ، رخسار، پلک، مہوں، سر کے بال آگے اور پیچھے کا حصہ وغیرہ سب کو خصوصیت سے زیادہ خوبصورت بنانا اور لباس ایسا پہننا جس میں بدن زیادہ جھلکے اور مسلمان زیادہ بڑھے۔ مکانات کی سجاوٹ، حصول مال و صباہ و تفریح قلب منتہا نظر مقصود ہے۔ باادقات لوگوں کو اکل و شرب سے زیادہ کوسٹیک (پاؤڈر کریم عطر وغیرہ) میں خرچ کرتے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ستمبر ۶۷ء میں دربن فٹ بول ٹیم کی جو ہانسبرگ ٹیم کے ساتھ میچ جو ہانسبرگ میں ہوا۔ دربن سے جو ہانسبرگ چار سو میل سے زیادہ دور ہے۔ کھلاڑی سب یورپین تھے۔ ہندیوں کو یورپیوں کے ساتھ کھیلنے کا قانوناً حق نہیں ہے۔ صرف دیکھنے کے لیے اور اپنی طبیعتی دل چسپی کے لیے جو ہانسبرگ جانا چاہتے تھے۔ پندرہ سو ٹکٹ آئے اور کب گئے پھر اور زیادہ دو سولے ان کی خریداری کے لیے دوسرا ہندی جمع ہو گئے۔ قریب تھا کہ طوفان مچ جاتا۔ دیکھنے کے لیے خاص عزت و راحت کی جگہ نہیں ہوتی۔ صرف دیکھنے کے لیے اتنا لمبا سفر کیا۔

مزید برآں ٹکٹ نہ ملنے کے باوجود مزید پندرہ سو اور پہنچ گئے۔ عورتیں بھی گئیں۔ موٹر کے
 اکیڈم میں دو موتی بھی ہوئیں۔ بس وغیرہ کے حادثوں میں کئی زخمی ہوئے۔ ص
 قیاس کن نوگلتاں سن بہار مرا

اللہ کے فضل و کرم سے ہر مسلم بستی میں مساجد و مدارس ہیں علماء و اساتذہ الہ و
 مبلغین کی حضرات سے مسلمان مسلمان تو ہے۔ بستی کے تناسب کے اعتبار سے یہاں کے
 مسلمان خصوصاً جوان طبقہ اور رچے میں دنیا میں رکوڑ ہے اور اپنی اولاد کو اعلیٰ
 دینی تعلیم دینے کے لیے ہندوستان بہت کافی تعداد میں بھیج رہے ہیں لیکن دینی
 تعلیم دن بدن کمزور ہو رہی ہے بعض عربی زبان دانوں کے شوق میں قرآنی تعلیم کھو رہے
 ہیں یہاں زبان انگلش ڈچ اور زولو ہے سب کا رو بار اسی میں ہوتا ہے ایسے
 گجراتی اردو زبان ختم ہو گئی ہے بہت سے مدارس میں انگلش میں مسائل سکھائے جاتے
 ہیں۔ کھوڑی بہت اردو پڑھتے ہیں وہ مدرسہ چھوڑنے پر استاد کو واپس کر کے آجاتے
 ہیں۔ ملائی مسلمان خور و نوش لباس و زینت رہائش و زیبائش سیر و تفریح تمام
 اصول زندگی میں پورا مغربیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ان میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی
 ہے کہ ایک داماد مسلمان دوسرا ہندو تیسرا عیسائی ہے۔ رفتار زمانہ سے معلوم ہوتا
 ہے کہ چونکہ ہندی مسلمان اسی رو میں بہہ رہا ہے اس لیے اس کا انجام بھی وہی ہوگا
 یہاں قانوناً یورپیوں کے ساتھ سادگت وغیرہ منح ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان
 ہے ورنہ کب سے ہماری ہندیت اور اسلامیت ختم ہو جاتی۔ یہاں ہندو مسلمان لڑکے
 لڑکیاں سب ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہیں تعلیم اور زیادہ عام اور اعلیٰ بنائی جا رہی
 ہے۔ عورتیں کارخانوں دکانوں اور زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لے رہی ہیں پہلے
 ہندی جہاں جاتے رہ سکتے تھے لیکن ہندیوں کے لیے الگ شہر بسائے جا رہے ہیں
 ہندو مسلمان سب ساتھ بود و باش کر رہے ہیں اخبار و رسائل ہر روزانہ کی زندگی

ریڈیو جز ولائینک ہے سینا کوئی عیب نہیں ہے اس اثر میں مسلمان اولاد میں اسلام اور دوسرے مذاہب سے فرق اٹھاتا ہے۔ سب مذاہب میں برابر ہیں صرف اسلام ہی سچا مذہب نہیں ہے آخرت کی نجات اور قبولیت اعمال کے لیے صرف اسلام شرط نہیں ہے۔ مسلمان عورت اپنا لباس بدل چکی ہے تنگ و باریک نیم عریاں لباس عام ہو رہا ہے۔ محفل رقص و سرود میں شرکت انتخاب حسینہ اور انتخاب خوبصورتی لباس میں شرکت مسلمانوں میں عام ہو چکی ہے اور ان باتوں کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھا جاتا اپنا شوہر خود پسند کرتی ہے۔ بلکہ تلاش کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ نکاح سے پہلے منگیت کے ساتھ آزادانہ اختلاط عام ہو رہا ہے۔ روک تھام بسا اوقات سنگنی لڑنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہنی مون (شب وصال) گھروں کے بجائے ہوٹلوں میں ہو رہا ہے اس سے زیادہ یہ ہے کہ ہندی مسلمان اپنا سورتی، مین، سیٹھ، حیدر آبادیت و قبائلیت تو کھو چکا ہے لیکن اب مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو مسلمان کا فرق بھی اٹھا رہی ہیں۔ بہت سے مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو لڑکا لڑکی پسند کرتی ہیں اور ہندو بن کر تہذیب کے موافق نکاح کرتی ہیں یا گورنمنٹ کے قانون کے موافق نکاح رجسٹرڈ کرالیتی ہے یا بغیر نکاح کے ایسے ہی ساتھ رہتے ہیں ماں باپ اور قوم کی ناراضگی اور احتجاج بے سود ہوتا ہے پسند کی عورت اور نکاحی زندگی مغربیت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ سودی لین دین عام ہے خود کشی بڑھ رہی ہے گھوڑ دوڑ عام ہے شراب نوشی اور عام ہو رہی ہے اور اس کی تجارت کا پروانہ بھی ہندی کو مل رہا ہے الغرض معاشرہ مغربیت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ حالات صرف جنوبی افریقہ کے نہیں ہیں بلکہ ہر اس ملک کے ہیں جہاں مسلمان یورپنی قوموں کے زیر اثر رہتے ہیں۔ چنانچہ مغربی جہاز میں ایک مسلمان اپنے مہان سے تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے بیٹے مغربی مسٹر ٹائیڈ وہیں۔ دینی تعلیم کی کتابیں انگلش میں بہت کم ہیں

لہذا ضرورت ہے کہ عقل و نقل کی روشنی میں انگلش میں کتابیں شائع کی جائیں کہ اسلام کیا مذہب ہے؟ دوسرے مذاہب سے کیا تعلق ہے؟ اسلامی تہذیب کچھ معاشرہ کیا ہے؟ مسلمان دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کہاں تک مخالفت کر سکتا ہے؟ غیر مسلموں کو اپنے گھر لانا۔ اس کے گھر جانا کیا ہے؟ غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کرنا حکم کیا ہے؟ مسلم عورت کا ستر کیا ہے؟ لباس کیا ہے؟ سینا رقص و سرود اتھا؟ حسینہ میں شرکت، نکاح سے پہلے منکبیر کا حکم و اسلامی اخلاق و تہذیب معاشرہ کیا ہے؟ مغربی تہذیب کے مطابق محبت کرنے کے بعد نکاح کرنا کیا ہے؟ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے؟ یہ تمام امور وضاحت کے ساتھ رازی و غزالی کے فلسفوں میں تفصیل سے بیان کیے جائیں۔

بعض باتر صاحب خیر کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کر اگر چھپوا کر ثانوی درجہ کے لصاب میں داخل کرانا چاہتے ہیں اس عظیم الشان تبلیغی خدمت کی طرف ارباب علم و فضل اہل فہم و فراست صاحب تحقیق و بصیرت حضرات کو دعوت دیکھائی؟

ابن کار از تو آید و مردان چنی کنند

اے اللہ! لا یضیع اجر المحسنین

ندوة المصنفین دہلی

۱۹۷۲ء کی مطبوعات

۱۹۷۲ء کی مطبوعات

۱۔ تفسیر اردو جلد دہم مجلد ۱۲۔۔۔

۱۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم مجلد ۱۷۔۔۔

۲۔ بیاری اور اسکا روحانی علاج ۱۱۔۔۔

۲۔ حیات مولانا سید عبدالحی ۱۱۔۔۔

۳۔ خلافت راشدہ اور سنیوتان ۹۔۔۔

۳۔ احکام شریعہ میں حالات و ۹۔۔۔

۴۔ ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط ۷۔۔۔

زمانہ کی رعایت مجلد ۱۰۔۔۔

۵۔ قواعد و ضوابط کی کاپی اور فہرست المصنفین

۴۔ ماثر و معارف ۱۰۔۔۔

ندوة المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

تہذیب کا دور جدید اور اجتہاد کی ضرورت

از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب

تقریباً پچاس ہزار سال قبل انسان نے موجودہ شکل و صورت اختیار کی۔ اس زمانے میں وہ زیادہ تر کچے گوشت پر گزارہ کرتا تھا۔ یہ حجری دور کہلاتا تھا۔ جو تقریباً چالیس ہزار سال تک کم و بیش یوں ہی قائم رہا۔ اس دور کا سماجی ڈھانچہ شکار کی تہذیب (HUNTING CIVILIZATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن تقریباً دس ہزار سال قبل اس زمانے کے انسان کو اس کا احساس ہوا کہ وہ محض شکار پر گزارہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک طرف انسانی آبادی بڑھ رہی تھی اور دوسری جانب انسانی آبادی کے تناسب سے ان جانوروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی جن کے گوشت پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ اس وقت انسانی جان کی قیمت اسی کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ ہونے لگی بنا پر اس نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دھیرے دھیرے قدیم تہذیب کے مقابلے میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جائے۔ جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے ان جانوروں کو پالا جائے جو انسانی سے پالے جاسکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھڑے ہی دفن میں بھیر اور بکریوں کے رویڑ پالے جانے لگے۔ اب شکار کے لیے کم اور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال پر زیادہ وقت صرف کیا جانے لگا اور رویڑوں کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں لے جایا جانے لگا۔ اسی صورت میں ایک دوسرا ہی سماجی ڈھانچہ بنا جس کو عام بدوش تہذیب (NOMADIC—CIVILIZATION) کہا جاتا ہے اس دور میں جنگی اناج کے استعمال رول بھی عام ہو گیا۔

مگر انسانی آبادی میں اضافہ نے اس طریق زندگی پر بھی دباؤ ڈالا اور بالآخر یہ معاشی نظام بھی روز افزوں انسانی آبادی کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے انسان نے کاشتکاری کی جانب رخ کیا۔ ابتدا میں اس نے پہاڑوں کے دامن میں دریا یا جھیل کے کنارے باقاعدہ کاشت شروع کر دی۔ جگہ کا انتخاب اس لحاظ سے کیا گیا تھا کہ پہاڑی اور جھیل یا دریا میں شکار کھیل جائے اور جنگلات کے میدان یا اس کے گرد پالتو جانوروں کو چرایا جائے گا۔ مگر یہ حکمت عملی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی اور بالآخر انسان کو کھلے میدانوں میں آکر وسیع پیمانے پر کاشت کرنی پڑی۔ اس پیشہ کے اختیار کرنے سے جو سماجی ڈھانچہ بنا اس کو زراعتی تہذیب (AGRICULTURE CIVILIZATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا پھر احساس ہونے لگا کہ انسانی آبادی کے اضافہ کا دباؤ بڑھ رہا ہے اس دباؤ کا اثر زیادہ تر سرد علاقوں میں بسنے والوں پر ہوا۔ نتیجہ سرد علاقے کے لوگوں کو زراعتی تہذیب کو خیر یاد کہنا پڑا۔ ان لوگوں نے بتدریج ایک نیا ذریعہ معاش ڈھونڈ نکالا۔ نت نئے کارخانے وجود میں آنے لگے جن کا تیار کردہ سامان دور دراز علاقوں میں بھیجا جانے لگا۔ جس جگہ ایک کارخانہ قائم ہوا۔ اسی کے قریب دوسرا کارخانہ قائم ہونے میں زیادہ آسانی ہوئی۔ اس طرح صنعتی شہر آباد ہونے لگے اور آبادی کا علاقے سے صنعتی شہروں میں منتقل ہونے لگی اس طرح جو سماجی ڈھانچہ بنا اس کو صنعتی تہذیب (INDUSTRIAL CIVILIZATION) کہا جاتا ہے۔

اس طرح انسانی تہذیب کو چار واضح تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر جب بھی ایک قدیم تہذیب کے افراد نے ترقی یافتہ تہذیب کی سمت میں قدم اٹھانے کی کوشش کی ہے تو ان کو دو قسم کی طاقتوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ ایک ان کے اندر افراد کی مخالفت جو اپنی پارینہ تہذیب کی برتری کا ناگ الاپتے ہیں اور دوسرے

زمانے سے بے نیاز ہو کر اسی تہذیب کے احیاء کے لیے اپنی تمام قوت ضائع کرتے رہتے ہیں دوسرا مقابلہ بیرونی محاذ پر غالب تہذیب کے افراد سے ترقی کے ہر میدان میں ایسی حالت میں مقابلہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ان کو کسی طرف کی سہمدی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں قدیم تہذیب کے وہی افراد کامیاب ہوتے ہیں جو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ بلند قوت ارادی کے مالک ہوں اور مصائب سے نبرد آزما ہونے میں تکلیف کے بجائے لذت محسوس کرتے ہوں۔ یہ بھی قدرت کا دائمی قانون رہا ہے کہ ہر زمانے میں وہی قوم حاکم رہی ہے جو علمی سماجی فوجی اور سیاسی میدان میں برتر رہی ہے۔ جو قومیں ایک زمانے میں ان شعبوں میں برتری حاصل کر چکی ہوں اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی برتری پر قرار نہ رکھ سکی ہوں ان کی تعمیرات محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دی جاتی ہیں اور ان کے افراد ترقی کے ہر میدان سے نکال باہر کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے اب تک چل رہا ہے۔ تاریخ میں کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ہے کہ قدیم تہذیب جدید دور میں بالکل اسی شکل میں دوبارہ غالب ہوتی ہو۔ لہذا یہ قدرت کا قانون معلوم ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کو جو کٹھنوں واپس لانے کی کوشش قوت اور دقت کا زیاں ہے۔

مسلمان عام طور سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کے ہر موڑ پر ایک پیغمبر کی بحیثیت ہوئی ہے مگر اسلامی تاریخ اور موجودہ کھدائی کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکار اور خانہ بدوش تہذیبوں میں کسی ایک پیغمبر کی بھی بعثت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زراعتی تہذیب میں جب انسان نے باقاعدہ پیڑوں کے دامن میں کاشت شروع کر دی تھی کسی پیغمبر کی بعثت نہیں ہوئی۔ حضرت نوح کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب انسان کھلے میدان میں کاشتکاری کرتا تھا۔ مگر وہ اس زمانے میں کھاد میں کاشت کلدی کرتا تھا۔ جہاں کھیتوں کو جو تھانہ تھا بلکہ سیلاب کے آجاتے والی مٹی پر بیج ڈال دیتا تھا لہذا اس دور کے انسان کو مسلسل سیلابی طوفان کا

کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس دور کے خاص دیوتا دریا اور پانی کے دیوتا تھے۔ حضرت ابراہیم کا وہ دور تھا جب لوہے کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور انسان نے باقاعدہ بھابھریں کاشت شروع کر دی تھی وہ زمین کو لوہے کے اوزار سے اچھی طرح جوت کر بیج ڈالتا تھا۔ مگر اس دور کا خاص دیوتا سورج تھا کیونکہ اس کی وجہ سے خشک سالی کا خطرہ رہتا تھا۔ اس دور میں عام طور سے زراعتی پیداوار میں باقاعدہ اضافہ ہوا جس کی وجہ سے دور دراز علاقوں سے تجارت کا موقع فراہم ہوا اور تجارتی کارواں آنے جانے لگے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم نے کافی سفر کیا۔ حضرت موسیٰ کے دور میں کاشتکاری اپنے عروج پر تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھابھریں زمین میں باقاعدگی کے ساتھ کاشت کے علاوہ نہروں کا بھی رواج ہو چکا تھا جس سے انسان زیادہ تر وقتی بارش پر قناعت کرنے کے بجائے آبی وسائل پر بہت حد تک قابض ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں گائے کا مقام بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا اور گائے کی پرستش عام ہو چکی تھی حضرت موسیٰ کی کوشش کے باوجود گائے کی عزت انسان کے دل میں گھر کیے ہوئے تھی کیونکہ زراعتی تہذیب میں یہ بہت بڑی دولت تھی ایک طرف اس سے دودھ ملتا تھا اور دوسری طرف بیلوں سے کھیت جوتا جاتا تھا نیز ان کے ذریعہ اناج دیہات سے قصبوں و شہروں میں پہنچایا جاتا تھا اس کے علاوہ اس کے گوشت کو بطور کھاد کے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے دور تک یہ صور حال کم و بیش قائم رہی۔ آخری پیغمبر کے دور میں زراعتی تہذیب بہت ہی اچھی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن جس علاقے میں پیغمبر کی بعثت ہوئی وہاں اس وقت تک خانہ بدوشی کی تہذیب غالب حیثیت رکھتی تھی اور تجارت پیشہ کی وقعت بڑھ رہی تھی۔ لہذا اسلامی تہذیب نے خانہ بدوشی تہذیب میں جنم لیا۔ اس پر دھیرے دھیرے زراعتی تہذیب کا غلبہ بڑھا۔ یہ تہذیب اپنے آخری دنوں میں بڑی حد تک صنعتی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ مگر یہ رنگ

کافی حد تک محدود علاقے میں رہا لہذا موجودہ دور میں اسلام کی ایک ہی تہذیب نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص (اسلامی) تہذیب ہے۔

مسلمانوں کی تہذیب نیم شکار گاہی تہذیب سے نیم صنعتی تہذیب تک پھیلی ہوئی اور خصوصاً ایک زراعتی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب صنعتی دور میں کسی صورت میں بھی اپنی قدیم شکل میں غالب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مسلمان اپنی قدیم تہذیب کے احیاء کے لیے جتنی کوشش کریں گے اسی حد تک ان کی غلامی کی زنجیریں بھی مضبوط ہوتی جائیں گی۔ ترقی یافتہ مسلم ممالک کو اس پیچیدگی کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک طرف ایسی تمام تحریکوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی تہذیب کو جدید ترین صنعتی تہذیب میں تبدیل کرنے کے کوشاں ہیں مگر دوسرے غیر ترقی یافتہ مسلم ممالک ان کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کا مسئلہ ایسے ممالک میں اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ مشترک حاکم ہیں اور حکومت میں ان کی شرکت یا تو کمزور درجہ کی ہے یا غالب حیثیت رکھتی ہے ایسے ممالک میں ترقی یافتہ مسلمان بحیثیت ایک فرد کے اجتہاد کرنا ہے اور ترقی کے میدان میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے ایک نیا راستہ نکال لیتا ہے جس کو عموماً پس ماندہ مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی اس طرح ان دونوں میں قربت کے بجائے بعد پیدا ہو جاتا ہے اور عام طور سے مسلمان اپنے مسلم حاکم سے بھی انصاف تک حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

یہ صورت حال بہت ہی تشویشناک ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے بہترین ہو گا کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات مل کر بیٹھیں اور ملک کے حالات اور وقت کا صحیح تجزیہ کر کے ایک حدیث طریقت زندگی کی نظر میں رہنمائی کے لیے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ہیں جو براہ راست قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر سکتے ہیں ان لوگوں کی شرکت پر بھی بہت ضروری ہے

ایسا کیا جانا ایسے ضروری ہے کہ ایک طرف علم کا میلان کافی وسیع ہو چکا ہے اور سماجی ڈھانچہ کافی پیچیدہ ہو گیا ہے دوسری طرف نہ علماء حضرات کا حلقہ نہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حلقہ الگ الگ اس لائق ہے کہ صحیح اجتہاد کر سکے جب معاملہ کی نزاکت یہ ہو تو کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک فرد خواہ وہ علماء و حضرات کے حلقہ کا ہو یا جدید تعلیم یافتہ حضرات کے حلقہ کا صحیح اجتہاد کر سکے اور کسی معاملہ میں صحیح فتویٰ دے سکے مگر جس طرح جان بچانے کیلئے حرام کھانے کی بھی اسلام میں اجازت ہے اسی طرح موجودہ دور میں واضح اسلامی تقاضوں کی عدم موجودگی میں ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر اجتہاد کرے اور ایسا رویہ اختیار کرے جس سے انسانیت کی کھلائی ہو سکے۔

سبرھان :- فاضل مقالہ نگار نے جو سائنس کے مستند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خدا کے فضل و کرم سے بڑے دیندار و صالح بھی ہیں ان کا یہ مضمون ہم نے اسی لیے شائع کیا ہے کہ ہم اس پر بحث شروع کرنا چاہتے ہیں۔ یوں تو آجکل یہ کہنا ایک فیشن بن گیا ہے کہ زمانہ اب بدل گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے سماجی اور معاشی قدریں بدل گئی ہیں ایسے اسلام کو بھی بدلنا چاہیے چنانچہ اس میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ جی ہاں! زمانہ بدل گیا اور تہذیب بدل گئی بالکل درست فرمایا۔ لیکن اب ماضی یہ بھی بتائیے کہ تہذیب کے اسی دور جدید کے وہ کون سے تقاضے ہیں جن کے باعث اسلام کے احکام میں تبدیلی ناگزیر ہے کیا اسے تقاضے یہ ہیں کہ سوائی میں عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط و ارتباط ہو جائے کلبوں کی چل پل ہو شراب نوشی اور جئے پرفتن ہو ان ن عبادات کو ترک کر دے اور زندگی میں مکمل آزادی ہو یا اس کے تقاضے یہ ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم ہو۔ یونیورسٹیاں ہوں تجربہ گاہیں ہوں ایجادات اور اختراعات ہوں صنعت حرفت اور زراعت و فلاح میں علوم جدید سے فائدہ اٹھایا جائے اور معیار زندگی بلند ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ فاضل مقالہ نگار ان مسائل پر کھل کر بحث کریں گے جن میں ان کے نزدیک تہذیب کے دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر علمائے اسلام کو اجتہاد کی ضرورت ہے ہم ان کے یہ مضامین بڑی خوشی سے برہان میں شائع کریں گے اور اس کے بعد جو خود اپنی حروف و حروف پیش کریں گے۔ بہر حال اب وقت آ گیا ہے کہ بات گول گول نہ ہو جو پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ ہو۔ تاکہ ہم کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکیں :-

تبصرے

نقدِ ابوالکلام اور ڈاکٹر رضی الدین احمد تقطیع کلاں ضخامت ایک ہزار پڑھ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد درج نہیں۔ شائع کردہ رجسٹر افسری و کمیشنور یونیورسٹی ترویجی نمائندہ۔

فاضل مؤلف مذکورہ بالا یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔ یہ نہایت ضخیم کتاب وہ تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر کی ڈگری دی ہے اور یہ کتاب جیسی بھی یونیورسٹی کی طرف سے ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ان کے بقول اگرچہ نام نقدِ ابوالکلام ہے لیکن حقیقت یہ کتاب اردو کے انانیتی ادب کا ایک تفصیلی اور تقابلی مطالعہ ہے۔ چنانچہ کتاب جو چھ ابواب پر مشتمل ہے اس کے باب اول میں نہایت مبسوط و مفصل بحث ”انانیت“ پر کر کے بتایا گیا ہے کہ اس کی کیا تعریف ہے؟ اس کے طبعی اور نفسیاتی اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اس کے غاصر ترکیبی کیا ہیں۔ ان میں سے ہر عنصر کی کیا خصوصیت ہے۔ ادب میں اس کا ظہور کس طرح ہوتا ہے اور اس کے کیفیات و مزایا کیا ہیں؟ لائق مؤلف نے اس بحث میں انگریزی اور فرانسیسی ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ باقی پانچ ابواب میں موصوف نے سر سید احمد خاں، میر تقی میر، مرزا غالب، اور ڈاکٹر اقبال۔ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ ایک مستقل باب میں کلام کر کے ان کے انانیتی رجحانات کو پیش کیا اور ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان ابواب میں بھی اردو زبان کے ان ارکان اربعہ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا حوالہ دیتے گئے ہیں۔ لیکن آخری

باب مولانا ابوالکلام کے لیے مخصوص ہے جو کتاب کا اصل موضوع ہیں اور اس میں انانیتی ادب میں مولانا کی انفرادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب درحقیقت ایک نہیں بلکہ پانچ اساطین ادبِ اردو کے انانیتی رجحانات کے مفصل تذکرہ و تبصرہ پر مشتمل ہے اور یہی وجہ اس کے اس درجہ ضخیم ہونے کی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت سے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور بلیغ ہے۔ فرماتے ہیں :-

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نقلاً ابوالکلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جس پر قلم اٹھانے وقت کوئی نقاد اس معیاری تصنیف سے بے نیاز رہ سکے۔ پھر کیوں نہ تصنیفِ اردو تنقید میں ایک ممتاز اور معیاری جگہ پائے۔ اس تنقیدی کاوش سے انانیتی رجحانات پر جس قدر روشنی پڑتی ہے اور پہلی مرتبہ اس کے جتنے پہلو سامنے آگئے ہیں وہ فاضل نقاد کی تنقیدی صلاحیت اور صحتِ نظر کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم صدر جمہوریہ ہونے کے علاوہ اردو زبان کے نامور ادیب اور نقاد بھی تھے اور انہوں نے صرف رشتا نہیں بلکہ مسودہ کتاب پر نظر ڈال کر لکھا ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہو سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کے انانیتی ادب پر یہ پہلی کتاب ہے جو نہایت جامع اور مربوط ہے۔ لائقِ مبالغہ ہے جو کچھ لکھا ہے بے لاگ اور صاف لکھا ہے۔ اس سے تنقیدی شعور کے علاوہ موصوف کی جرأت و جبارت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ البتہ اول تو انانیت شعر کی طرح ایک ایسی انتزاعی صفت ہے جس کی حدِ تمام ممکن نہیں ہے اور پھر اس کے حدود اور ان کی قدریں متعین کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس بنا پر ایسی ضخیم کتاب میں ایسے مقامات بھی کافی ہیں جہاں لائقِ مبالغہ کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اردو لٹریچر میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ زبان و بیان بھی شگفتہ و دلچسپ اور موثر ہے

آخر میں پچاس صفحات اشاریہ کے لیے وقف ہیں۔ شروع میں فہرست مضامین ہے لیکن تعجب ہے فہرست ماخذ کہیں نظر نہیں آئی۔ حالانکہ تحقیقی مقالہ اس فہرست کے بغیر بے وقعت ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود بہ از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب۔ ایم۔ اے۔ تعلیم متوسط صفحات ۱۲۸ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت درج نہیں ہے پتہ :- دار المصنفین اعظم گڑھ۔

جیسا کہ لائق مرتب نے دیا چہ میں خود کہا ہے۔ یہ درحقیقت کوئی کتاب نہیں بلکہ ان ذاتی تاثرات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات پر معارف کی دو قسطوں میں ظاہر کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ وہ مسلمانوں کی اس پرانی نسل کے ایک جلی سرسید تھے جن کو قدرت نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اسلامی اخلاق و فضائل، دینی جذبہ و کردار اور ملی و قومی دردمندی سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور اس بنا پر انہوں نے اپنی زندگی ملت اسلامیہ اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو دار المصنفین سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ دہاں جاتے تو کئی کئی دن قیام کر کے اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتے اور چونکہ لائق مرتب بھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب سے ہی مافوس اور مشاخر تھے اور اس لیے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اور خود ڈاکٹر صاحب سے جو کچھ سنا وہ سب دل چسپ انداز اور مؤثر زبان میں ان اوراق میں قلم بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تحریک خلافت سے لے کر کانگریس کی تحریک آزادی تک اور اس کے بعد بھی مختلف جماعتوں میں شعبہ اول کے رہنماؤں میں رہے ہیں اس بنا پر اس داستان میں ڈاکٹر صاحب کی

زبان سے بہت سے اکابر ملک و قوم کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔ جو دل چسپ بھی
ہے اور بعض مواقع پر عبرت انگیز و سبق آموز بھی امید ہے اس کتاب کو عام
طور پر قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

سید احمد خاں شاہد پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۱۹۶ صفحات
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت
اطلاعات و نشریات، ٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۔

حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کے ماتحت جدید ہندوستان کے محار
کے زیر عنوان مختلف اکابر ملک و قوم پر الگ الگ کتابیں شائع کرنے کا جو منصوبہ بنایا
گیا ہے اور جس کے جرنل ایڈیٹر جناب آر۔ آر۔ دوکر ہیں۔ اس کے سلسلہ میں پروفیسر خلیق
احمد نظامی نے یہ کتاب دراصل انگریزی میں لکھی تھی، جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے
زیر تبصرہ کتاب اس کا شگفتہ اور رواں اردو ترجمہ ہے جو جناب اصغر عباسی صاحب
نے کیا ہے۔ پروفیسر نظامی عصر حاضر کے مشہور مورخ ہیں اور پھر یہ کتاب انھوں نے
لکھی ہے علی گڑھ میں بیٹھ کر جہاں مولانا آزاد لائبریری کے ماتحت سرسید سے متعلق
ہر قسم کی معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ محفوظ ہے اور اس کے لیے ایک شعبہ ہی الگ قائم
ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب مختصر مہرے کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ سرسید کی زندگی
کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں رہا۔ یوں تو سرسید پر کتابوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کتاب
کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی ترتیب و تالیف میں سرسید
کے ان خطوط اور دستاویزات سے بھی مدد لی ہے جو علی گڑھ میں محفوظ ہیں اور اب
تک عام نہیں ہوئیں۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیمے ہیں جو سرسید اور ان کے عہد پر حقیقی

کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ پہلا ضمیمہ حیات سید احمد کے فویر
عنوان سرسید کے تمام واقعات و حالات کے سنین اور تاریخ پر مشتمل ہے۔ دوسرا ضمیمہ
جو کتابیات پر ہے اس میں پہلے سرسید کی تصنیفات و تالیفات کی ایک طویل فہرست
ہے۔ اس کے بعد سرسید پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی اور پھر ان مزید کتابوں کی جو اس
تصنیف کے وقت فاضل مصنف کے پیش نظر رہی ہیں۔ غرض کہ کتاب بہت مفید و پراثر معلوم
اور لائق مطالعہ ہے۔

اسباب بغاوت ہندوستان سرسید احمد خاں مرتبہ جناب فوق کریمی۔ تقطیع خورد۔
۱۷ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد تین روپیہ۔ پتہ:۔ کتب خانہ انجمن
ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

سرسید کی یہ وہ مشہور اور محرکہ آرا کتاب ہے جو انہوں نے ۱۸۵۸ء کے ہنگامہ کے
اسباب و دداعی سے متعلق بڑی جبارت اور بیباکی سے لکھی تھی اور جس نے اس وقت
کی بڑا فویری پارلیمنٹ کے ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسی اہم کتاب ایک ہی مرتبہ
چھپ کر رہ گئی تھی۔ عرصہ سے بالکل ناپید تھی۔ اب یہ بہت خوب ہوا کہ لائق مرتبے نے
اس کو دوبارہ اہتمام سے شائع کر دیا ہے اور اس پر اسی صفحات کا ایک طویل مقدمہ
لکھا ہے جس میں الیٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اس کے اثرات اس ملک میں منلیہ سلطنت
کے حالات ملک کی سماجی اقتصادی اور اخلاقی حالت ۱۸۵۷ء کے وچ اسباب سرسید
کے سوانح حیات ان کی خدمات وغیرہ ان سب پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اصل
کتاب تو نہایت اہم ہے ہی اس کا مقدمہ بھی فکر انگیز اور لائق مطالعہ ہے۔



بچے ہم پر امید لگائے ہوئے ہیں

ہاں۔ ہمیں ان کا خیال رکھنا چاہئے۔

انکی پرستش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ہم پر ہی ہے۔ ابھی
نوراک ماچھے کپڑے اور اچھی تعلیم ان کا حق ہے۔ بڑا چوکرا نہیں اچھا منکر
بھی بننا چاہئے۔ لیکن اگر بچے زیادہ ہوں تو کیا ہم ان کی تمام ضروریات
پورا کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے..... چھوڑا گئے۔ کنبہ ہوتا
چھوڑا ہوا اتنا ہی ہر گز گز زیادہ پیار دینے کا۔

نقصت مشورہ اور عورت کے لئے فیملی ویلفیئر ورک سوسائٹی

پروگرام جمعہ ۱۹۷۳ء

بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی ۱۔ ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ذیل میں جمعہ ۱۹۷۳ء کے لیے جہازوں کی روانگی کا عارضی پروگرام پیش کرتے ہیں۔

بمبئی سے روانگی (قبل رمضان) جدہ سے روانگی
۱۔ ایم۔ وی۔ اکبر ۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء ایس۔ ایس۔ مظفری ۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء (بعد رمضان)

۱۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء	ایم۔ وی۔ اکبر	۲۷ جنوری ۱۹۷۴ء
۲۔ ایس۔ ایس۔ سعودی	۱۵ نومبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ سعودی	۲۹ جنوری ۱۹۷۴ء
۳۔ ایس۔ ایس۔ مظفری	۲۰ نومبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ مظفری	۴ فروری ۱۹۷۴ء
۴۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲۵ نومبر ۱۹۷۳ء	ایم۔ وی۔ اکبر	۱۱ فروری ۱۹۷۴ء
۵۔ ایس۔ ایس۔ سعودی	۱ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ سعودی	۱۸ فروری ۱۹۷۴ء
۶۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۸ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایم۔ وی۔ اکبر	۲۴ فروری ۱۹۷۴ء
۷۔ ایس۔ ایس۔ مظفری	۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ مظفری	۲۶ فروری ۱۹۷۴ء
۸۔ ایم۔ وی۔ اکبر	۲۱ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایم۔ وی۔ اکبر	۱۰ مارچ ۱۹۷۴ء
۹۔ ایس۔ ایس۔ سعودی	۲۷ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ سعودی	۱۲ مارچ ۱۹۷۴ء
۱۰۔ ایس۔ ایس۔ مظفری	۳۰ دسمبر ۱۹۷۳ء	ایس۔ ایس۔ مظفری	۱۵ مارچ ۱۹۷۴ء

رجسٹرڈ شپنگ ایجنٹ کے تحت روانگی کی یقین تاریخوں کا اعلان ہر جہاز کی روانگی سے پندرہ دن پہلے کیا جائے گا۔

پلگرم پاس ہر عازم حج کے لیے پلگرم پاس (حج پاسپورٹ) حاصل کرنا ضروری ہے جو بمبئی میں حج کمیٹی کے دفتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ عازمین حج کی سہولت کی خاطر پلگرم پاس اور دیگر خدمات کی فیس سب سے چھوٹے روپے کی حاجی حج کمیٹی کے حق میں کرایہ جہاز کے ساتھ ہی وصول کرنی جائے گی۔

جہاز کا کرایہ :- بمبئی، جدہ، بمبئی کے سفر کا کرایہ مندرجہ ذیل ہے۔ صرف والی ٹکٹ جاری کیے جانگے

فرسٹ کلاس	کرایہ حج خوراک	محالی خدمت و دیگر اخراجات	پلگرم پاس	مجموعی رقم
۲۲۱۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۳ روپے	۲۳۶۳ روپے	۴۷۱۲ روپے
۱۱۰۵ روپے	-	۴ روپے	۱۱۹ روپے	۱۲۲۹ روپے
۹۵۷ روپے	-	۱۴ روپے	۹۷۱ روپے	۱۹۸۲ روپے

بمبئی میں بکنگ کے وقت فرسٹ کلاس کے ہر عازم کو مجموعی کرایہ کے علاوہ فرسٹ کلاس کے کرایہ کی پندرہ فی صد ہرج و مرج و فاریٹ ٹرانزیشن ٹیکس کے لیے ادا کرنی ہوگی۔

اسپیشل ڈیپ کلاس :- یہ انتظام بالائی ڈیپ میں مزید سیولٹوں مثلاً اسلام آباد، لاہور (دن ایم۔ وی۔ اکبر میں) اور چھوٹا بڑا بستروں کے علیحدہ علیحدہ کمپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

کرایہ خوراک	محاصل خدمات جبرہ	پگرم پاس و دیگر خدمات	مجموعی رقم
بانج	۸۵۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۰۰۳ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۲۵ روپے	-	۲۳۹ روپے
بچے ۱ تا ۳ سال	۳۸۰ روپے	-	۳۹۲ روپے

ڈیک کلاس

بانج	۸۰۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۲ روپے	۹۵۳ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۲۰۰ روپے	-	۱۲ روپے	۲۱۲ روپے
بچے ۱ تا ۳ سال	۳۵۵ روپے	-	۱۲ روپے	۳۶۹ روپے
ایک سال سے کم	-	-	۱۲ روپے	۱۲ روپے

سال محرومیت کے جن عازمین کا کرایہ مغل لائن کے پاس جمع ہے وہ لپیٹے حوالہ نمبر کے اندراج کے ساتھ صرف مزید درکار رقم کا ڈرافٹ روانہ کریں۔

حکومت ہند نے عائد ہونے والے مفاد عامہ اور ان کی بھلائی کے پیش نظر بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔ لہذا عازمین رج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان عائد کردہ پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ کر درخواست دیں۔ حوالہ ذیل عازمین کی درخواست ناقابل قبول ہوگی۔

- الف :- وہ بچے جن کی عمر ۵ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوگی
- ب :- قبل رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس ۱۲۰ روپے اور بعد رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس ۱۳۰۰ روپے سے کم رقم ہو۔
- ج :- وہ افراد جو گزشتہ ۵ سال یعنی ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ کے درمیان ہندوستان کے کسی بھی حصہ سے فریضہ حج ادا کر چکے ہوں۔ ایسے افراد حج بدل پر بھی نہ جا سکیں گے۔
- د :- وہ خواتین جنہیں جہاز پر سوار ہونے وقت ۵ ماہ یا اس سے زائد کا حمل ہو۔
- ۴ :- درج ذیل بیماریوں اور معذوریوں میں مبتلا افراد
 - ۱۔ دماغی امراض
 - ۲۔ تپ دق یا اسل
 - ۳۔ قلبی امراض
 - ۴۔ شدید دہم
 - ۵۔ سختی جدام
 - ۶۔ دیگر شدید
- سختی بیماری یا جسمانی معذوری۔

مثلاً یہ بیماری یا خاتون کے حمل پر شبہ کی حالت میں جبھی میں ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا۔ لہذا عازمین غلط بیانی سے درخواست نہ دیں۔ ہر عازم کے لیے لازمی ہے کہ وہ مقررہ درخواست نام پر ہی درخواست دیں اور ہر درخواست کی دو کاپیاں مکمل طبی کے ساتھ شدہ طریقہ پر روانہ کرے۔ نامکمل درخواستیں ناقابل قبول ہو سکتی ہیں۔

طبعات :- درخواستوں کا اندراج درج ذیل طبقہ کے مطابق کیا جائے گا۔

- ۱۔ عورتیں و بچے کی درخواستیں۔

- ۲۔ عازمین جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا ہے اور جن کی درخواستیں
محرم ۱۴۰۵ سال میں تین بار مسترد ہو چکی ہیں
۳۔ عازمین جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا ہے اور جن کی درخواستیں
محرم ۱۴۰۵ سال میں دو مرتبہ مسترد ہو چکی ہیں۔
۴۔ عازمین جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا اور جن کی درخواست
برائے حج ۱۹۷۲ء نا منظور ہو چکی ہو۔
۵۔ جو درخواستیں مذکورہ بالا طبقات کے تحت نہیں ہوں (پہلی بار)

عازمین حج بطور خاص خیال رکھیں

- ۱۔ ایک لفاظہ میں مختلف طبقات کی درخواستیں نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر ہر طبقہ کی درخواست کے لیے علیحدہ لفاظہ اور غلغولہ درافٹ ہونا چاہیے۔
- ۲۔ درخواستوں کو فقیہ کے ساتھ اندراج نہیں کیا جائے گا تا وقتیکہ گزشتہ نامعلوم درخواستیں حج ۱۹۷۲ء کی درخواست کے ساتھ تعلق نہ کی جائیں۔ اصل مسترد کردہ درخواستوں کی بجائے ان کے حوالہ نمبر یا دیگر کاغذات بھیجا غرضقید ہوگا۔
- اگر ایسا نہ کیا گیا تو لفاظہ میں بھیجی گئی تمام درخواستوں میں سے جو درخواست سب سے آخری طبقہ کی سہگی تمام درخواستوں کو اسی طبقہ میں شامل کر لیا جائے گا۔

درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ

سب کی اطلاع کے لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے دفتر کے کاؤنٹر پر کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ تمام درخواستیں مذکورہ بالا طریقے کے مطابق ہر طرح سے مکمل رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ کی جائیں جو کمپنی کے رجسٹرڈ آفس پر ہم ۱۱ اگست ۱۹۷۲ء یا اس سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد پہنچنے والی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اسے پیچھے دلنے کو واپس لوٹا دیا جائے گا۔

قرعہ

الف :- اگر کسی بھی ریاست کی کسی بھی طبقہ میں وصول شدہ درخواستیں انہیں ریاست کے اسی طبقہ کے مقرره کوٹہ سے زائد ہوں تو مطلوبہ تعداد بذریعہ قرعہ لی جائے گی۔

ب :- درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ کے تقریباً ایک سہفتہ بعد قرعہ اندازی ہوگی۔ قرعہ انداز کے فوراً بعد نتیجہ کارڈ لفاظہ بھیجنے والے شخص کے حق پر جمع دیا جائے گا اور جو درخواستیں قرعہ میں کامیاب نہ ہونگی انہیں جس قدر حلقہ ممکن ہو ڈرافٹ وغیرہ کے ساتھ لفاظہ بھیجنے والے (اور ضرورت استحال نامزد کردہ شخص یا وارث) کو لوٹا دیا جائے گا۔

جہاز احرام کی تبدیلی :- قبل رمضان کے عازمین حج کو بعد رمضان اور بعد رمضان تاہم بعد رمضان کے ایک جہاز سے دوسرے جہاز کی تبدیلی کی درخواستیں صرف غیر معمولی حالات میں

موز کیا جائے گا۔ مگر تبادله کی درخواست کے ساتھ تحریری ثبوت پیش کرنا ضروری ہو گا۔ مزید مع خیالی رکھیں کہ نام یا انخاص کے تبدیلی کی قطعاً اجازت نہیں دی جائے گی۔

ج ۱۹۷۳ء کے لیے درخواست فارم صرف ملازمین ج کو انکی گزارش پر بلا قیمت مغل لائن مہیا کرتی ہے۔ اس لیے ملازمین ج کو چاہیے کہ

ج ۱۹۷۳ء کے لیے پیچھے ہونے والے فارم کا استعمال کریں۔ یہ بات خاص طور سے یاد رکھنی چاہیے کہ فارم مہیا کرنے والے درخواستیں اور کرایہ کی رقم قبول کرنے یا اسی طرح کا کوئی کام انجام دینے کے لیے مغل لائن نے اپنی کوئی شاخ، نمائندہ یا ایجنٹ مقرر نہیں کیا ہے۔

عدالتی کارروائی :- ج کے مذکورہ بالا طریقے کے سلسلہ میں کوئی تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں عدالتی کارروائی کا اختیار صرف شہر ممبئی ج کی عدالتوں کو ہو گا۔

مندرجہ بالا عبارت مغل لائن کے اعلامیہ برائے ج ۱۹۷۳ء کا اختصار ہے مکمل تفصیلات اور درخواست فارم کے لیے لکھیے۔

دی مغل کائن لمیٹڈ ٹیلیگرام :- "مغل ممبئی"

۱۶ بینک اسٹریٹ فوٹ :- ۲۵۶۸۳۵ ٹیلیکس :- ۴۰۴۹-۱۱

اہل علم کے لیے چار نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی :- جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط دار شائع ہوئی ہے قیمت معرودہ نیر کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے آج ہی سب سے دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک ۱۴ طلبہ طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۶ طلبہ طبع ہر جائیں گی۔

۲۔ تفسیر علین شریف :- مکمل مہری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱۵) لہذا بقول فی اسباب النزول للبیہقی (۲۲) معرفۃ الناس والناسخ والمسنوح "لا ین الحزم" قیمت محلہ اردو

۳۔ شرح ابن عقیل :- الفیاض مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت محلہ ۲۰ روپے

۴۔ شرح زادہ حاشیہ بیاضی سورہ بقرہ تین جلدوں میں شائع ہو رہا ہے۔ پہلی جلد آگیا ہے۔ نوٹ :- طلب فرمائیے۔

پتہ :- ادارہ مصطفیٰ ریلوے ضلع سہارنپور

موسم بدلتے ہی چہرے بھی بدل جاتے ہیں! کیا مہاسوں، پھنسیوں اور جلدی تشکیفوں کی وجہ سے؟ جب یہ تشکیفیں پیدا ہوں تو اُن کو صافی کے استعمال سے فوراً ختم کیجیے

مہاسے، پھنسیاں، دوسری جلدی تشکیفیں اور خسرو بھی موسم کی تبدیلی پر اکثر ہو جاتی ہیں، کیوں کہ جگر اور فعل ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور خون میں خرابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس موسم میں خاص طور پر صافی سے اپنے خون کو صاف کیجیے۔ صافی، خون کو صاف کرتی ہے۔ خراب مادوں کو جسم سے نکالتی ہے۔ آنتوں اور گردوں کو صاف کرتی ہے اور آپ کے خون کی صفائی کا سبب بنتی ہے۔ صاف خون کا مطلب ہے صحت مند جلد۔

۲۲ جلی بوتلیوں سے تیار کی گئی صافی تیز اثر رکھتی ہے۔ جراثیم کش ہے اور ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے استعمال سے اجابت کشکلاتی ہے اور خون صاف ہوتا ہے۔ صافی سے خون کی تمام خرابیاں دُور ہو جاتی ہیں۔



صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

ہمدرد

Registered No. 11. 800

JULY 1972

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



محمد رفیع الرحمن، سربراہ، قومی لائبریری، اسلام آباد

مدوّۃ المصنفین دینی کا علمی و دینی مآہرنا

18 AUG 1972

زُبرِ کمال

مترجم
سید احمد بک آبادی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادراہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۴۲ ہیں۔ حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی مقتضات تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اصحاب الکہن و الزعماء اصحاب القریٰ اصحاب التبت، اصحاب الکوس، بیت المقدس اور یروش، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجحہ ذوالقرنین اور تیسکندری، سبا و یثیل، عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و معتقظہ تفسیر۔ حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم ساٹھ روپے جلد چہارم نو روپے قیمت مکمل سٹاک تیس روپے۔ اُجرت فی جلد غل ہارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

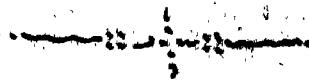
مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی



جلد ۶۹ مالاہدیچ الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق اگست ۱۹۷۲ء شمارہ ۲

فہرست مضامین

- ۱- نظرات اردو کے محاملات و مسائل (۳) سید احمد اکبر آبادی ۷۴
- ۲- مقالات علی محمد مسلم پونیورسٹی (۲) ۸۳
- ۳- حافظ زکی الدین المنہزیؒ جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب رفیق ۹۹
- ۴- عہد زمانا شاہ کا ایک گنم شاعر جناب ڈاکٹر نواز السید صاحب اختر بھٹی ۱۱۶
- ۵- مولانا ابوالکلام آزاد (ایک جائزہ) جناب مولوی محمد شعیب صاحب عمری بنگلور ۱۳۰
- ۶- ادبیات و تنقید ادبیات (غزل) جناب شمیم عثمانی صاحب ۱۳۸
- ۷- تنقید س-ع ۱۳۹



نظرات

اردو کے معاملات و مسائل

(۳)

مرکز میں ترقی اردو بورڈ اور اتر پردیش میں اردو اکادمی، اردو زبان و ادب کو فروغ دینے اور علمی و ادبی حیثیت سے ان کو ترقی دینے کے لیے قائم ہوئے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان اداروں نے اب تک کیا کام کیا ہے؟ اور جن حضرات پر یہ ادارے مشتمل ہیں۔ ان کی گزشتہ زندگی کی بے علمی اور آرام طلبی کے پیش نظر ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ حکومت کا یہ اقدام فی نفسہ مستحسن ہے۔ اسی طرح پچھلے دنوں حکومت کی طرف سے اردو کی ترقی اور اس کی مشکلات پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے جس کے ارکان سولہ افراد ہیں۔ اٹھ بیاسات سرکاری اور باقی غیر سرکاری۔ اس کمیٹی نے ادب، صحافت اور تعلیم وغیرہ سے متعلق چار ذیلی کمیٹیاں بنائی ہیں جو اپنی سفارشات مرتب کریں گی۔ اس کمیٹی نے جو وزیر مملکت شری اندرکار گجرال کی صدارت میں ہونے کے باعث گجرال کمیٹی کے نام سے معروف ہے اردو کے ارباب فکر و نظر سے وہ تجاویز طلب کی ہیں جو ان کے نزدیک اردو کی ترقی کے لیے ضروری نہیں پہلے ان سفارشات اور تجاویز کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۵ ارجون تھی۔ ان سطور کی تحریر کے وقت نویس کر کے ۵ ارجو لائی تک اسے بڑھا دیا گیا ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے "الخزیر یثبث بکل حشیش" اردو میں اس کا صیغہ ترجمہ: ڈوبتے کوئی کے کا سہارا بھی اسی طرح مشہور ہے۔ اسی مثل کے مطابق مرکزی حکومت یا ریاستی حکومت کی طرف سے اس قسم کا جو اقدام بھی ہو اس کے ساتھ اردو والوں کی بے خیانتی

کرنا چاہیے۔ لیکن اس کرم گستری پر اردو کہہ سکتی ہے ۵

چلے ہیں بہر پریشش وہ پس مرگ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اردو زبان قانونی حیثیت سے علاقائی زبان نہیں بنتی اور اس بنا پر جب تک اردو والوں کا احساس کمتری نہیں دور ہوتا اور ان کے ساتھ دفتری اور حکومتی معاملات میں جواہتیا زاد رتصوب برتا جاتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔ اس وقت تک آپ کروڑوں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر ڈالیے۔ بڑے بڑے لغات تیار کر دیجیے۔ اردو کے مصنفوں اور ادیبوں پر اپنی نوازشات کی بھرمار کر دیجیے۔ ان سب کا یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اردو زبان کے لٹریچر میں وسعت پیدا ہوگی۔ اور اس کے ذخیرہ ادبیات میں اضافہ ہوگا۔ لیکن جب تک خود زبان کی جڑیں اس ملک میں مضبوط نہ ہوں گی اور ایک چھوٹے سے علاقہ سے بھی محروم ہونے کے باعث اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد زبردست کم ہوتی رہے گی۔ اردو زبان میں کتابوں کے اس انبار کی حیثیت دی ہوگی جو عربی فارسی یا فرنگی اور جرمنی میں کتابوں کی ہو سکتی ہے یہودہ احساس ہے جس کے باعث حکومت کی طرف سے بلند بانگ دعاوی کے باوجود ان اداروں کا ملک میں خاطر خواہ خیر مقدم نہیں ہو رہا ہے اور اردو کے حلقوں میں اس نوع کی خبروں کو لوگ سنتے بھی ہیں تو اس طرح گویا یہی شخص نے ان کی تمام مال و متاع چھین لی ہے اور اب اس کے ضمیر نے لامت کی تو تلافی نکالت کے لیے اسے کچھ دلا سادے رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ادارے وہ خواب آور گولیاں ہیں جن کے ذریعے حکومت اردو کے اصل معاملہ کی طرف سے لوگوں کو غافل کرنا چاہتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبہ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے آرگن ہماری زبان میں لکھتے ہیں۔

”اردو کا مسئلہ کمیٹیوں، اکیڈمیوں اور بورڈوں کے قیام سے حل نہیں ہو گا۔ یہ سب غفلتیں ہیں۔ حکومت ہند اردو کے بارے میں کوئی پروگرام نہ رکھتی اور نہ غائب

رکھنا چاہتی ہے۔ اُردو کا بنیادی مسئلہ ایک اقلیت کی زبان کی سرکاری حیثیت کے تعین اور اس کے نظامِ تعلیم کی تنظیم کا مسئلہ ہے۔ اس اصل مسئلہ کی طرف سے پہلو تہی برتنے کے باعث اردو کی حالت کس درجہ ناگفتہ بہ ہو گئی ہے؟ اس کی درد بھری داستان موصوف کی ہی زبان سے سنئے۔ لکھتے ہیں: ”پچھلے چند سال میں اردو کا مسئلہ ایک بحرانی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ آزادی کے پچیس برس اردو کے لیے ستم قاتل ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا تعلیمی نظام درہم برہم ہو چکا ہے اس کی نئی نسل کی زبان بدل چکی ہے یا بدل رہی ہے۔ اس عبوری دور میں اردو گھرانہ کا بچہ اچھی طرح نہ ہندی سے واقف ہے نہ ننگو سے اور نہ انگریزی سے۔ وہ اپنی قوتِ انہار کھو چکا ہے اور نتیجہً ذہنی صلاحیتیں بھی موجود نسل ایک گونگی بہری نسل ہے، چالیس سال سے اوپر کی نسل اب تک اردو کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ لیکن ان کے بھی بہت سے کفن بردوش، زیر کفن ہونے جا رہے ہیں کچھ مذہب میں پناہ تلاش کر رہے ہیں، شاعر ہے تو اسے سارح نہیں ملتا، ادیب و ناشر ہے تو اسے قاری نہیں ملتا، طالب علم کو کتاب نہیں ملتی، قلم کار کو انعام مل جاتا ہے مگر قدر انہیں ملتا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی موجودہ زبوں حالی اور ابتری کی بڑی بلیغ عکاسی کی ہے اس تیرہ تار یک ماحول میں اُردو کا دم گھٹا جا رہا ہے اور وہ مولانا احمد رفیع خاں صاحب بریلوی کی زبان سے کہہ رہی ہے۔“

اے دل یہ سلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اُٹھ

دم گھٹنے لگا ظالم کیا دھوئی رُمائی ہے

تنگ آمد جنگِ آملے کے مطابق موصوف اپنے مضمون کا خاتمہ ان لفظوں پر کرتے ہیں۔

• اہل اُردو کے سامنے اب دو ہی راستے ہیں۔ تحریک یا تحزیب! بہر صورت اپنی نئی پود

کے دہن میں ایک نہ ایک زبان دینا ہے۔ اسے زیادہ عرصہ تک گونگا بہرہ نہیں رکھا

جاسکتا۔ جلد فیصلہ کیجیے یہ یا وہ؟ ع

وقت برہنہ گفتن ست من بہ کنایہ گفتیم

(ہماری زبان مورخ ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء)

اس مقالہ کے ایک ماہ بعد ہماری زبان (مورخ ۲۲ جون ۱۹۷۲ء) میں پی علیگرہ مسلم یونیورسٹی اور اردو کے زیر عنوان فاضل موصوف نے جو گرائنڈر مضمون لکھا ہے اس میں پھر لکھتے ہیں۔

”یہ پی اور بہار کی ریاستی سرکاروں کی اردو نواز پالیسی کی بدولت اردو نظام تعلیم کا جو حشر ان ریاستوں میں ہوا ہے اس سے ہر اردو گھرانہ واقف اور متاثر ہے پچھلے پچیس سال میں اردو کے لاکھوں بیٹوں اور بیٹیوں کو ان کی مادری زبان سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اردو والوں کی کوئی ایسی سیاسی تنظیم بھی نہیں جس کا دباؤ پڑ سکے اور دوم درجہ کے سیاست دان صرف سیاست کی زبان سمجھتے ہیں۔ قومی نقطہ نظریا مفاد ان کے اُفقِ ذہن سے کوسوں دور ہے چنانچہ اردو کی ترقی کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جو نہ کرنے سے عبارت ہے۔ اس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تنظیم سے قبل اس میں مختلف علوم پر کتابیں لکھوانے کے لیے ایک ایسا بورڈ قائم کر دیا گیا ہے جسے نہ اپنی حدِ کبر کی خبر ہے اور نہ حدِ اصغر کی جب اردو میں یونیورسٹی سطح کی کتابوں کی تیاری لا حاصلی کا احساس ہوتا ہے تو اپنے حدودِ تفویض کے برابر عظم منظور شدہ رقم کا محد بہ حصہ بچوں اور بالعموم کی کتب کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ اکیڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن کی کارگزاری انعامات عطا کرنے اور کتابیں بانٹنے تک محدود رہتی ہے۔ کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جن کی سبھی لا حاصل چند ایسی سفارشات کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جن پر غور کرنا مقصود نہیں ہوتا۔“

ان سب لا حاصل اور بے نتیجہ اردو نوازی کے بجائے جو اصل کام کرنے کا ہے اس کے متعلق موصوف لکھتے ہیں۔

اردو کے سلسلہ میں نہیں کام نہوتا تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کس مہر سی کی قانونی اور سرکاری حیثیت کا تعین دستور کی دفعہ ۷۴ کے مطابق صدر جمہوریہ کے ایک اعلامیہ کے ذریعہ کر دیا جائے اس اعلامیہ کے بعد ہی ریاستی حکومتیں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گی اور انہیں قانونی طور پر اس کے نظام تعلیم کی تشکیل کرنا پڑے گی، وزارت تعلیمات میں اردو کے صیغے کھولنا پڑیں گے اور اردو کے اداروں کو درسی کتابوں اور استادوں کی فراہمی کے احکامات جاری کرنا ہوں گے:

اس نتیجے اور حقیقت افزہ مضمون کا آخری پیرا گراف اور سن لیجے لکھتے ہیں :-
 ”بدقسمتی سے اس وقت ہمارے ملک کی سیاست اور معیشت محض ”نہروں“ اور ”لہروں“ کے سہارے چل رہی ہے، میرے خیال میں ہماری جمہوریت کے لیے سب سے خطرناک رجحان آمریت کی وہ زریں لہر ہے جو چودہ دروازوں سے داخل ہو کر ہم سے ہمارے حق احتجاج کو چھین لینا چاہتی ہے اور اپنی سہولت کے مطابق مختلف ٹھپے لگا کر ہمارے مستند افراد کو اداروں کو اور تحریکوں کو مذموم (۹) کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ جی دھڑکتا ہے کہ کسی دن اہل اردو کی مانگوں کو کبھی لسانی ظلمت ہندی سے موسوم نہ کر دیا جائے۔
 ”دروغ راست نمائے کہ داسشتی داری“

پروفیسر سودھن خاں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت و واقعیت کا آئینہ دار ہے، لیکن ہم کو جس امر کا بے حد افسوس اور قلق ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سارا الزام حکومت کے سرعام کر دیا جاتا ہے اور اردو کے نقیب کبھی ایک لمحہ کے لیے گریبان میں نہ ڈال کر یہ نہیں دیکھتے کہ اردو کو کس کس کا طبعی حق دلانے کے لیے انھیں جو کرنا چاہیے تھا، وہ انھوں نے کیا یا نہیں؟ مرکز ی وزیر جناب فخر الدین احمد صاحب نے چند ماہ ہوئے، دہلی میں جمعیتہ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا تھا کہ ہاں بے شک حکومت اب تک اردو کے لیے وہ نہیں کر سکی ہے

جواسے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ لوگوں نے بھی اردو کے واسطے وہ نہیں کیا جو آپ کا فرض تھا۔

وزیر موصوف نے اس کی تشریح تو نہیں کی کہ اردو کے لیے کیا کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم کو اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر آج اردو تحریک زندہ ہوتی، فعال اور متحرک ہوتی اور اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے گزشتہ ربع صدی میں جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ کرتی تو آج اردو کا معاملہ صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا۔ بلکہ ایک نہایت اہم قومی اور ملکی معاملہ ہوتا۔ یہ صرف ایک زبان کا مسئلہ نہ ہوتا، بلکہ ایک قومی تہذیب کا مسئلہ ہوتا اور قریباً غالب یہ ہے کہ چونکہ آج مرکزی حکومت جس درجہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اس کے اقتدار اور سطوت کا یہ عالم ہے کہ نہایت سخت سے سخت اقدام کرتی ہے اور اس میں کامیاب رہتی ہے۔ رائے عامہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جن سنگھ ایسی دو چار جماعتیں اس کی مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن ملک میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اولاً آخر کار کچھ دن شور و غل مچا کر وہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس بنا پر اگر ملک میں اردو تحریک نے اردو کے لیے قومی سطح پر ایک مناسب فضا پیدا کر دی ہوتی تو آج حکومت کو اردو کا حق طبعی دینے پر رضامند کر لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوتی۔ حکومت کی مخالفت یا جن لوگوں کا دین اور ایمان ہے وہ بے شبہ چپختے چلاتے اور شور مچاتے لیکن حکومت کو ان کی پروا نہ ہوتی اور وہ یہ اقدام کر گزرتی۔ اگر خدا نخواستہ موجودہ حکومت کے دور اقتدار میں بھی اردو کو اس کا حق نہیں ملا تو پھر کبھی ملے گا بھی یا نہیں؟ اس کی پیش گوئی کوئی نہیں کر سکتا۔

اردو کے نام پر چھوٹی بڑی بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں اور ختم ہو گئیں لیکن اردو تحریک کی سب سے بڑھا ذمہ داری انجمن ترقی اردو (کل ہند) کے سر عام ہوتی ہے۔ یہ انجمن جولائی ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی تھی، درحقیقت اردو زبان میں علمی اور ادبی کتبوں کی

اشاعت کا ایک ادارہ بھی تھی اور ساتھ ہی — بلکہ اس سے زیادہ — اردو تحریک کا ایک مرکز بھی دنیا جانتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی شب و روز کی مصروفیت ایشار و قربانی، محنت و مشقت اور جرأت و حسارت سے اس انجمن کے دونوں مقاصد کی کس طرح تکمیل کی اور اسے کس طرح تحت الثریٰ سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ تقسیم کے بعد اردو کے مسائل و معاملات نہایت پیچیدہ اور ابتر ہو گئے تھے اور اب ضرورت تھی کہ نوار اتیز ترمی زن جو ذوقِ نغمہ کم یا بی کے مطابق انجمن کو بھر کوئی اور عبدالحق ملتا جو انجمن کو پہلے سے زیادہ متحرک اور فعال بناتا۔ بد قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ تقسیم کے بعد بھی انجمن نے اپنا علمی اور ادبی وقار قائم رکھا چنانچہ اس کی طرف سے اچھی اچھی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی صحت کا اہتمام خاطر خواہ نہیں ہوتا اور کتابت و طباعت کی افسوسناک غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اس کا پندرہ روزہ آرگن اور سہ ماہی اردو ادب بھی معیاری ہیں لیکن انجمن اردو تحریک کے میدان میں کچھ نہ کر سکی۔ کسی تحریک کو چلانے کے لیے ابتدائی شرط یہ ہے کہ اس کی شاخیں ہوں اور مرکز کے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہو یاں یہ عالم ہے کہ متعدد مقامات پر قواب تک کوئی شاخ ہی قائم نہیں اور جہاں تھوڑی بہت کچھ شاخیں ہیں بھی تو اولیٰ تو ان کو مرکز کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں ہے اور پھر حیدرآباد وغیرہ دو چار جگہوں کی شاخوں تک۔ مستثنیٰ کر کے کوئی ایک شاخ بھی سرگرم عمل اور پر جوش نہیں ہے معلوم ہوتا ہے سب پر پھونڈ جی ہوئی ہے اور ظاہر ہے جب مرکز ہی بیجان اور آسودہ عمل ہو تو شاخوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ برسوں سے انجمن کی سالانہ کانفرنس بھی نہیں ہوئی ہے اردو تحریک کا بڑا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ اردو کے مسئلہ کو (صرف مسلمانوں کا نہیں) ایک قومی مسئلہ کی طرح زیادہ سے زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا جاتا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس کے علاوہ ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی ربط قائم ہوتا اور سطح

ان سب کی حمایت اور اعانت اردو کار کے لیے حاصل کی جاتی۔ پھر اردو کے تعلیم بانان کا بندوبست پولیس ملک میں ہوتا۔ بچوں اور بچیوں کو اردو سکھانے کی آسان کتابیں کثرت سے شائع ہوتیں۔ لکھنؤ کی کتابوں کی فراہمی۔ اساتذہ کا بندوبست اردو پرائمری مدارس کا قیام اور ان کا نظم و نسق فلم انڈسٹری سے ربط و ضبط۔ سیاسی جوڑ توڑ :- اردو اخبارات کی توسیع اشاعت اردو ٹاپ کے اعلیٰ انتظامات۔ انگریزی اور ہندی کے اخبارات و رسائل میں اردو زبان و ادب اور اردو کے مسائل و معاملات پر کثرت سے مضامین شائع کرنا۔ ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں سے اردو کے علاقائی در وابط قائم کرنا غرض کہ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جو اردو تحریک کے اجزا ہیں۔ انجمن ترقی اردو ان میں سے کوئی ایک کام بھی قابل ذکر طور پر نہیں کر رہی ہے اور عملاً صرف ایک ادارہ نشر و اشاعت ہو کر رہ گئی ہے۔ ہائے غضب۔ راقم الحروف کی ایک غزل کا شعر ہے :-

گزری ہی نہیں جیسے کوئی سر پہ قیامت

یوں لب بے بیٹھے ہیں نہ شکوہ نہ شکایت

ہمارے ہاں عام قاعدہ یہ ہے کہ اس طرح کے جماعتی کاموں کی ابتری اور زبوں حالی کی ذمہ داری تنہا ایک شخص کے سر ڈال دی جاتی اور اس کو ہی سؤل قرار دیا جاتا ہے یہ بات اصولاً غلط ہے۔ جب وہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے تو اس کے کاموں کی سؤلیت بھی تنظیم کے عہدار کان و اعضاء پر عائد ہوتی ہے سخت جرت اور فوس کی بات کہ آج تک اردو کے ان ارکان و اساطین کو یہ کہیں محسوس نہیں ہوا کہ ۔

(۱) مرکزی انجمن کا دفتر علی گڑھ میں مرکز نہ پہنا جاوے۔ جہاں کی آب و ہوا

جذبہ عمل اور دلولہ کار کو راس نہیں آتی۔

(۲) انجمن کا سرٹری اس شخص کو پہنا چاہیے جو بالکل آزاد ہو جی اور میاں

- اور جو پولیس کھنڈے انجن کے کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کرے۔
 (۳) انجن کا سکرٹری آئری نہ ہو بلکہ معقول اور حسبِ حیثیت شاہرہ پر ملازم ہو۔
 (۴) اس کے پاس اتنا فنڈ ہونا چاہیے کہ وہ پورے ملک کا دورہ کرتا رہے۔
 (۵) اس کو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کا بھی ادیب اور اناٹا پرداز

ہونا چاہیے۔

(۶) سکرٹری کے ساتھ کم از کم پانچ پانچ سو روپیہ ماسوا پر دو اور شخص ہونے چاہئیں جو علمی اور ادبی کاموں کے ساتھ تحریک کے کاموں میں بھی اس کے مدد و معاون ہوں جیسے مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ سنڈت و تازیہ کشتی اور سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ اگر اب تک انجن کا کام اس پہنچ پر سہا سہتا تو کوئی شبہ نہیں آج اردو کا کام بہت سہل ہو گیا سہتا اور وہ دقت آگیا تھا جب اندراجی کی قیادت میں حکومت اردو کو اس کا حق دینے کا فیصلہ کر دیتی اور ہمارے نزدیک نذر الدین احمد صاحب نے اردو والوں کی اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب اگر یہ کام نہیں سہا تو یہ ماتم فقط ایک انجن اور اس کے اعیان و ارکان کا ماتم نہیں ہے بلکہ یہ ماتم ہے اس بد نصیب قوم کا جو دنیا بھر میں شور مچاتی رہتی ہے اردو یونیورسٹی کے خواب میں بدست رہتی ہے لیکن جو کام کرنے کا ہے اس کی طرف دھیان نہیں دیتی اس نے گورنمنٹ کی گرانٹ پر انجن کے زندہ دہنے پر قناعت کر لی اور خود کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ انجن کا اصل کام کیا ہونا چاہیے اور یہ کام کس طرح انجام پذیر ہو سکتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اردو کا مسئلہ مسلمان جماعتوں کے ساتھ مخصوص سہ کر رہ گیا اور اس سے اردو کا ذکر کو نفقانہ پہنچا۔ اب حکومت اردو کے لیے جو کچھ کر رہا ہے وہ نیم سحری طور پر اس کو خالص مسلمانوں کا معاملہ سمجھ کر کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے سلجھانے کے بجائے معاملہ کی اصل پوزیشن کو کمزور بنا دیا ہے۔

۔۔۔۔۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

سید احمد اکبر آبادی

سرسید کے حالات و سوانح کا مطالعہ جس شخص نے بھی کیا ہے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید میں دو وصف خاص طور پر تھے۔ ایک یہ کہ وہ ہر معاملہ میں انتہا پسند تھے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تھے تو ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ چیز اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ کسی درمیانی درجہ پر قناعت کرنا ان کی فطرت اور طبیعت کے خلاف تھا اور دوسرے یہ کہ ان کی طبیعت میں صدا اور سہٹ بھی تھی۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے تو اب کوئی لاکھ ان کی مخالفت کرے ان کو مطلق پروا نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنے ڈگر پر قائم رہتے تھے۔ یہ دونوں وصف محمود بھی ہیں اور مذموم بھی۔ اگر ان کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو فی نفسہ اچھی ہو اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلیں تو یہ محمود ہیں ورنہ مذموم! عجیب بات ہے۔ سرسید کی زندگی میں ان وصفوں کے محمود اور مذموم دونوں ہی رخ نظر آتے ہیں۔ اور غالباً یہ انھیں کی خصوصیت نہیں دنیا کے ہر بڑے انسان کا جو ہر طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے۔

لہٰذا اس کا اعتراف مولانا حالی نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ جیک کلن لکے اندرونی استقامت میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خرد رائی اور صدا اور سہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شے نہیں کہ وہ گویا کہنا بالکل غلط نہ تھا (حیات جاوید حصہ دوم ص ۸۳)

کالج میں انگریز اساتذہ | چنانچہ جب سرسید نے یہ طے کر لیا کہ (۱) کالج میں انگریزی علوم جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کرنا ہے اور (۲) مسلمان نوجوانوں کو حکومت کے دفاتر میں کھیلنے کی غرض سے حکومت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنا ہے تو اب ایک طرف تو انھوں نے کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد ۸ جنوری ۱۸۶۱ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھوایا، جو اس زمانے میں وائسرائے تھے اور اس موقع پر سرسید نے جوائنٹ ریس پیش کیا اس میں فرمایا۔ ہمارے راستے میں جو دشواریاں حائل ہیں ہیں اور اس میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کے پیش نظر ہم کو یقین ہے کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے اور خود اپنے ہم وطنوں سے سبھی وہ امداد اور تائید حاصل کرتے ہیں گے جن کے باعث یہ کالج ایک دن یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا اور اس یونیورسٹی کے فرزند آزاد تحقیقات، وسیع القلب رواداری اور بے میل اخلاق کا وعظ ملک کے طول و عرض میں کہتے پھریں گے۔

اور دوسری جانب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ کالج میں ایک معقول تعداد یورپین اساتذہ کی بھی رہے گی جن کو بیش تر ارتخوہ کے علاوہ تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ جو یورپین طریق زندگی کے لیے ضروری ہیں، چنانچہ کالج کے اسٹاف میں (۱) ماسٹر کی جگہ کو بھی شامل کر کے) یورپین اساتذہ میں جو نام نمایاں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں۔ پرنسپل میک پروفسر مارلسن۔ پروفسر آرنلڈ۔ پروفسر والس۔ مسٹر ہورٹ۔ مسٹر وینٹن۔

سرسید کی دراندیشی کی داد دینی چاہیے کہ یورپین اسٹاف سے صرف ایک اعلیٰ تعلیم کا فائدہ نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعہ گورنمنٹ کا اعتماد بھی حاصل ہوتا تھا اور نہ اس وقت جو حالات تھے اور مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو جو شکوک و شبہات تھے ان کی وجہ سے بعید نہ تھا کہ انگریز اس کالج کو جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کے افراد بیک وقت اس کثرت سے مجتمع ہو گئے تھے۔ شک و شبہ کی نظر سے دیکھے اور انھیں خیال

ہوتا کہ کالج کہیں انگریزوں کے خلاف کسی تحریک کا مرکز تو نہیں ہے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔ یہ مدرسہ انگریزوں کی نگاہ میں ہمیشہ مشکوک و مشتبہ رہا اور شروع میں اس کے بعض مخالفوں نے انگریزوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ مدرسہ میں جہاد کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے تہ خالوں میں برابر ہتھیار چلانا سکھایا جاتا ہے حکومت کی جانب سے متعدد بار اس کی تحقیق و تفتیش بھی ہوئی۔

یورپین اساتذہ کی خدمات حسنہ | جیسا کہ آپ کو آئندہ جلد کر معلوم ہو گا۔ اگرچہ سرسید کی زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی مخالفت بڑے شد و ملکہ کے ساتھ ہوئی تو مخالفت کے وجہ میں ایک وجہ کالج کا یورپین اساتذہ اور سرسید کا ان پر غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ بھی تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں تک تعلیم و سہولت اور حسن انتظام کا تعلق سرسید کا یہ اقدام نہایت متحسن، قابل ستائش اور بارخیز نظری پر مبنی تھا۔ آج بھی جیسا کہ ہم سو برس آگے بڑھ آگے ہیں، ہمارے ملک میں انیسویں اور یونیورسٹیاں اور میسین خاص خاص شعبوں میں مہارت اور تخصیص کے ادارے اور انسٹیٹیوٹ قائم ہیں۔ ہمارے بچے اور بچیاں انگلش اسکولوں میں تعلیم پاتے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ امریکہ یا کناڈا وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں تعلیم کی استری اور طلبہ کی بے راہ روی کی جو شکایات عام ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے اساتذہ عموماً اپنے معنوں اور اپنے فرائض منصبی سے زیادہ یونیورسٹی کی سیاست اور اپنے ذاتی مفادات و اغراض سے دل چسپی رکھتے اور ان کے شب و روز ای او حیرت میں گزارتے ہیں۔ نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مغربی ملک کا حال بالکل اس کے برعکس ہے وہاں جو کوئی شخص بھی تعلیم کی راہ اور علمی کا پیشہ اختیار کرتا ہے کسی خارجی دباؤ یا روپیہ کا دلچ یا عہدہ و منصب کا غائب ہونے کے بغیر اپنے حقوق اور علم و تحقیق کے میدان میں تاخت کے شوق اور

دولت سے کرتا ہے کس بنا پر وہ فانی العلم ہوتا ہے اس میں خلاصہ میں عرض کردار کی پختگی اور دنیوی راحت و آسائش اور عہدہ و منصب سے بے نیازی کے احسان ہوتے ہیں اس کا شب و روز کا مشغلہ مطالعہ و تحقیق اور طلباء کی نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ تعلیم و تربیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اس بنا پر سرسید نے اگر اس وقت اعلیٰ تعلیم کے

لہ مصد ہوا ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر علی پنجاب یونیورسٹی لاسہ نے انگلینڈ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد لاہور واپس آکر معارف اعظم گڑھ میں ولایت سے متعلق اپنے تاثرات پر ایک مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے ایک

موقع پر یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ شام کو میں اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ (W.T. ARNOLD) کے بیان پہنچا ہوا تھا۔ بے تکلف بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک پروفیسر آرنلڈ نے کہا: "عنایت اللہ تبار! اس وقت تمہارے دل میں سب سے بڑی تمنا کیا ہے۔ اس کا جواب فوراً اور

سوجھ کی اجازت اور ہمت نہیں ہے۔" شاگرد نے کہا: "میرے سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میرے پاس اتنی دولت ہو کہ تمام دنیا کی خوب سیاحت کروں۔" پروفیسر آرنلڈ نے یہ جواب سننا تو ان کا چہرہ اتر گیا، دانتوں میں انگلی

دبائی اور بولے: "عنایت اللہ تم کو تمہارے جواب سے بڑا دکھ رہا ہے، تم کیسے طالب علم ہو جو دولت کی تمنا کرتے ہو ایک حقیقی طالب علم کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو تو علم میں ترقی ہی ہونی چاہیے۔ یہ پروفیسر آرنلڈ

دہا بزرگ ہیں جو سرسید کے زمانہ میں محمد بن کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ان کی متعدد نہایت دقیق تصنیفات کے علاوہ دی بریکنگ آف اسلام ص ۱۸۵ وغیرہ سرسید کے حکم سے محمد عنایت اللہ صاحب دہلی نے

دعوت اسلام کے نام سے کیا تھا، ایک نہایت بلند پایہ اور تاریخی ساز کتاب ہے انہوں نے علی گڑھ میں مولانا شبلی سے عربی اور مولانا شبلی نے ان سے زریخ پڑھی تھی، علی گڑھ سے منتقل ہو کر جب لاسہ گزشتہ

کالوں میں چلے گئے تو وہاں ڈاکٹر اقبال ان کے شاگرد رہے، انھیں پروفیسر آرنلڈ کا ایک حوالہ درج ہے کہ وہ واقعہ مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ معروروم و شام میں لکھا ہے، اسے بھی سن لیجیے شاید کوئی عبرت ہو۔

پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی دونوں ایک جہاز سے سفر کر رہے تھے، عدن کے قریب ایک مقام پر جہاز کو (جہنم کے جہاز) ایلن کے نظر آ جانے کے باعث (شدید خطرہ لاحق ہو گیا، مسافروں کے اوسان خطا

ہو گئے، اس حالت میں مولانا شبلی بھاگے پہلے پروفیسر آرنلڈ کے کین میں بیٹھے تو ایک دیکھتے ہی موصوف ہلے (باقی مشورہ)

یہ یورپین اساتذہ کی حضرات کو حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو کوئی شبہ نہیں ان کا فیصلہ غایت درجہ کی حقیقت پسندی عالی ہمتی اور بلند نظری پر مبنی تھا اور اس سے کالج کے مقاصد کی تکمیل باحسن وجہ ہوئی۔ اس زمانہ میں کالج کے حالات کا مبصر اور اس کے اچھے بُرے کا ناقد مولانا حالی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:-

”اگرچہ جو پیش قرار تھا میں یورپین عہدہ داروں کو دیجاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یورپین اسٹاف نے اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے ان کو کالج کا جبرو اعظم قرار دیا ہے وہ باوجود قومی مذہبی اور ملکی مخالفت کے محمدن کالج کو اپنا قوی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے طلباء کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں ان کی مجلسوں اور مباحثوں میں خود بھی شریک ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ طرح طرح سے ان کی غیرت دلاتے ہیں اور ان کی عظمت کے نتائج سے ان کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں،

اطمینان سے کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں مولانا کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا کیا آپ کو خبر نہیں ہے کہ ملا جاہر خطرہ میں ہے۔ پروفیسر آرٹلڈ نے کہا۔ جی ہاں مجھے اس خطرہ کا علم ہے۔ مولانا بولے تو پھر اس کے باوجود یہ اطمینان ابرو فیئر آرٹلڈ بولے سنو شبلی اس وقت ہم جس حالت میں ہیں اس کے انجام دو میں ایک یہ بات ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ خطرہ ٹل جائے گا اور جہاز اس سے صحیح سلامت باہر نکل آئے گا اور یا جہاز تباہ و برباد ہو جائے گا اور ہم سب مر جائیں گے۔ اگر پہلی صورت مقدر ہے تو پھر خواہ مخواہ پریشانی ہرنے سے کیا فائدہ ہوگا اگر بصورت دیگر تقدیر میں مر جانا ہی لکھا ہے تو عمر عزیز کے جو چند لمحات باقی ہیں انہیں کیوں کسی بیزکام میں صرف کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کتاب کے مطالعہ سے زیادہ بیزکام اور کون ہو سکتا ہے؟

ثالثہ عادتوں۔ فرائض کی پابندی۔ صفائی۔ ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرئیر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالب علموں کی امداد اور تقویت طرح طرح سے کرتے ہیں۔ بیماروں کی خبر لیتے ہیں۔ کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ تمام انتظامات اور طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ کرتے جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ تو کالج میں انتظام۔ ڈسپلن اور لڑکوں کی نگرانی اور حوصلہ افزائی سے متعلق تھا۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ لڑکوں کی مذہبی پابندی میں بھی ان یورپین اساتذہ کا کیا رول تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں۔

”وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں۔ مسجد کی غیر حاضری پر ان کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی ان کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور ان کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔“

(حیات جاوید حصہ دوم ص ۸۴)

مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری سرسید کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یورپین اساتذہ کی حسن کارگزاری کے ثنا خوان وہ بھی ہیں لکھتے ہیں:-

”سرسید کے انتقال کے بعد سٹریک نے سرسید میموریل فنڈ اور کالج کی ترقی کے لیے مدد جو کوشش کی اس سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ ہر چند انھیں کام سے ہٹا دیا گیا، مگر بیماری کی حالت میں جب کہ وہ قسطیلات کے زمانہ میں غلہ میں تھے۔ کام کرتے رہے حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۹۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد

سرحدی ڈور مارین نے نہ صرف تعلیمی کام بلکہ انتظامی کام حد درجہ کی تن دی سے انجام دیے۔ طلباء کی ملازمت کی ایجنسی قائم کی۔ اپنے غیر معمولی رسوخ سے جو انھیں حکام کے حلقہ میں حاصل تھا۔ طلباء کو سرکاری ملازمتیں دلواتے تھے۔ کالج کے تمام طلباء کے لیے وہ بمنزلہ بزرگ خاندان کے تھے۔ چونکہ صرف طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ ان کی کاروباری زندگی میں ہر دم یکساں مددگار رہتے تھے۔ دوران ملازمت میں اپنے شاگردوں کی ترقی و بہبود میں برابر سامعی رہتے تھے اور مصیبت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ مسٹر مارین (جو بعد میں سر ہوئے) کے زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ صرف چلت بھرت اور کھیل کود اور نمائش میں بلکہ تعلیم میں بھی علی گڑھ کے طلباء بہت نمایاں ہوئے۔ اور نتائج کے اعتبار سے الہ آباد یونیورسٹی میں اونچے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً تمام یونیورسٹی میں اول آتے تھے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کالج کے سابق طلباء کو اپنی مادر درس گاہ سے وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا پرنسپل بیک۔ مسٹر مارین اور مسٹر آرٹلڈ اور اسی زمانے کے انگریز اساتذوں کے سر تھا، یہ اساتذہ طلباء کی مختلف انجمنیں بناتے، انہیں منظم کرتے۔ ان سے پدرانہ برتاؤ کرتے۔ کالج چھوڑنے کے بعد ان سے مستقل تعلقات رکھتے۔ ان کے سالانہ جلسے اور ڈرامے منعقد کرتے اور ان کے ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کرتے تھے۔ کالج کے لیے جذبہ جمع کرانے کے تمام کام جو انگریز اساتذوں نے کیے وہ سب انھیں کے ایجاب تھے جو انہوں نے درجہ کمال پر پہنچا دیے۔ انہیں کی بدولت یہاں کے پڑھے ہوئے طلباء کی ایک مستقل برادری قائم ہو گئی۔ جنہوں نے علی گڑھ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور علی گڑھ کالج تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل باب پنجم ص ۲۶۱-۲۶۳)

جب کسی شخص قوم کا عظیم لیڈر اور قائد ہوتا ہے تو وہ صرف خود بڑا نہیں ہوتا

بلکہ اس کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش ایسے رفقاء کا ایک طبقہ
 مہیا کر لیتا ہے جو اس کے کاموں میں اس کے دست و بازو ہوتے اور اس کے مشن کی
 تکمیل میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے سبھی سرسید کی شخصیت کا جائزہ لیجیے
 تو معلوم ہوگا کہ قیادت کے دوسرے اوصاف و کمالات کے ساتھ قدرت نے اس
 وصف خاص میں بھی ان کے ساتھ بڑی فیاضی کا معاملہ کیا تھا۔ یہ ان کی بارخ
 نظری۔ روشن دماغی اور نگاہ انتخاب کا غیر معمولی کمال ہے کہ انہوں نے کالج کے
 یورپین اسٹاف کے لیے انتخاب کیا سبھی تو ایسے لوگوں کا کیا جو حسب و نسب کے اعتبار
 سے خریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کمبرج یا آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے
 اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے یورپین سوسائٹی کے بہترین افراد کہے جاسکتے تھے
 چنانچہ انہوں نے سرسید کے مشن کی نہ صرف یہ کہ حمایت کی بلکہ کامل غلوں و ہم آہنگی
 اور تن دہی کے ساتھ اس مشن کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ یہی وجہ
 ہے جیسا کہ مولانا حاکمی نے چند واقعات کی روشنی میں لکھا ہے۔ کالج کے سب لوگ
 اور خصوصاً طلباء اپنے ان شفیق اساتذہ پر جان چھڑکتے تھے اور جب کوئی دہان سے
 رخصت ہوتا تھا تو طلباء دل کی گہرائیوں میں اس کی جدائی کا غم محسوس کرتے تھے۔

اسی موضوع پر اس تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے
 زمانہ کے بعض سیاسی لغت نویسوں کے نزدیک ہر وہ کلام جس میں انگریزوں سے مدد لی گئی ہو
 اور اس سے استفادہ کیا گیا ہو انگریز پرستی ہے اور قومیت کی ضد۔ اس کے برخلاف
 ہر وہ چیز جو انگریز دشمنی میں کی گئی ہو وہ عین قوم پرستی اور نیشنلزم ہے۔ جہاں چہ
 محمدن کالج علی گڑھ کے یورپین اسٹاف کا یہی معاملہ ہے جس کی بنیاد پر آج کل کے
 بعض مدعیان قوم پروری ارباب قلم (ہندو اور مسلمان دونوں) نے سرسید کو انگریز پرستی
 اور قہار دھارے سے علیحدگی کے طعنے دیئے ہیں اور ان کو برا بھلا کہا ہے۔ جہاں چہ

حال میں ہی مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے سلسلہ میں روزنامہ ہسٹینٹین میں اس کے نامہ نگار خصوصی کا جو ایک دوکالمی مضمون شائع ہوا ہے اس میں مقالہ نگار نے دیوبند اور علی گڑھ کا موازنہ کرتے ہوئے سرسید کی نسبت اسی الزام کو دہرایا ہے ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو وہ پوری دنیا کو اپنی زمین اور دنیا کے تمام انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ حکمت اس کی متاع گمشدہ ہے وہ اگر چین میں بھی ہو (جس سے آج کل ہندوستان کے تعلقات خراب ہیں) تو ایک مسلمان کو اس کو وہاں سے حاصل کرنے میں بھی تاقل نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ سرسید کی انتہا پسندی کے باعث ان سے کچھ فروگزاشتیں اور بے اعتدالیاں ضرور ہوئیں۔ جنہیں ہم خود آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن سرسید پر یہ الزام سرتاسر غلط اور بہتان عظیم ہے کہ وہ انگریز پرست یا حکومت پرست تھے۔ انگریزوں کے خوشامدھی اور ان سے مرعوب تھے اور قوم پروری اور وطن دوستی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔

سرسید کی تحریک کا نیا موڑ | دنیا میں کسی بھی تحریک کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے اس کے حالات کیاں نہیں رہتے۔ گردشِ میل و نہار اور انقلابِ روزگار کی دلیویوں سے اسے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ہر بڑی تحریک کامیاب ہوتی اور سوسائٹی میں کوئی انقلاب پیدا کرتی ہے تو اس کے ابتدائی عہد میں تحریک کے تمام اعضاء اور کان میں یک جہتی اور اتحاد ہوتا ہے اگر کوئی وجہ مخالفت کا ہوتی بھی ہے تو باقی تحریک کی بھاری سبرک شخصیت کے زیر اثر شکوہ زیر لب ہو کر رہتا ہے۔ لیکن تحریک کی کامیابی پر جب ایک مدت گزر جاتی ہے اس کے اثرات و خمرات میں طور پر محسوس و مشاہد ہونے لگتے ہیں تو اختلاف و عدمِ توازن کی صدا اٹھ جاتی ہے جو کل تک زیر لب تھیں اب زبان پر بے حجاب آ جاتی ہیں اور ہر تحریک کے لیے یہ وقت سخت کڑا لیس (CRISIS) اور بھلا کا ہوتا ہے۔

تحریکوں میں یہ دور عام طور پر بانی تحریک کے انتقال کے بعد آتا ہے۔ لیکن سرسید کی بدقسمتی ان کی تحریک کا یہ صبر آزما اور حوصلہ شکن دوران کی زندگی میں ہی آگیا۔

اسباب و وجوہ | اس کے وجوہ و اسباب اگرچہ متعدد ہیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مہیا کہم نے عرض کیا۔ سرسید کی طبیعت میں ہر بڑے انسان کی طرح جس سے پیغمبری معصوم ہوتے ہیں بلا کی انتہا پسندی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے اعتدالی کا صدور ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے کالج میں یورپین اسٹاٹ کی موجودگی کو بطور ایک اصل کل اور پالیسی کے اختیار کیا تو ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کالج کا پرنسپل اور ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر دونوں انگریز ہی ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کالج کا مکمل نظم و نسق اور دروہیت ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جو حضرات ایشیا اور افریقہ میں برطانوی مستعمرات کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان مستعمرات میں حکومت کی پالیسی اور انگریز کا کیر کر پیئہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ جس قوم اور فرقہ میں رہتے ہیں ان میں گھل مل کر اور ان کو اپنا بنا کر رہتے ہیں۔ تعلیم، انتظام، صحت، صفائی اور ڈسپلن اس میں سے ہر میدان میں خلوص اور محنت سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس ملک اور قوم کی زبان اور ان کے علوم و فنون کو ترقی دیتے اور اس کے لیے جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام خدمات کے باوجود یہ لوگ اپنا سیاسی مقصد کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان تمام خدمات کے پس منظر میں جو جذبہ کار فرما ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے دل میں حکومت کے ساتھ وفاداری کا ولولہ اور جوش پیدا کیا جائے اور محکوم کے دل میں مکران طبقہ کی عظمت اس کی تہذیب و تمدن کی سر بلندی اور اس کے احسانات کے لیے شکر گزاری و محبت پذیری کے جذبات و احساسات پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ ایسے انداز اپنی اور اس کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں عوامی فادری اور شکر کے خصوصاً اور دوسرے معنایں کے عموماً انگریز محققین و ضابطہ کام کو ایک

عظیم گروہ نظر آتا ہے جنہوں نے بے شبہ ان علوم و فنون کی بڑی قابل قدر اور لائق تحسین خدمات انجام دی ہیں اور ان سے ہندوستان کو بڑا فائدہ پہنچا اور اب تک پہنچ رہا ہے لیکن بایں ہمہ یہ سب حضرات ڈپلومیٹ بھی تھے۔ اور انہوں نے اپنا سیاسی عقیدہ ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں کیا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن عربی فارسی کے نہایت بلند پایہ استاد اور محقق تھے۔ لیکن ساتھ ہی برطانوی حکومت کے محکمہ خارجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سر ڈینیسن راس جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء تک مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے انہوں نے عربی، فارسی، علوم و فنون کی جو عظیم خدمت کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موصوف اتول درجہ کے ڈپلومیٹ یا دوسرے لفظوں میں حکومت کے سیاسی ایجنٹ بھی تھے چنانچہ خاص ایران کے معاملہ میں انہوں نے حکومت ہند کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ایران میں برطانوی سیاست کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

افسوس ہے سرسید اپنی انتہا پسندی اور محبت میں کالج کے پرنسپل اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص کرتے وقت اس اہم نکتہ کو نظر انداز کر بیٹھے۔ جلد یا بدیر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یورپین اشاعت اور کالج کے عامل و زعماء میں تضاد اور نزاع پیدا ہوا اور کالج کا شیرازہ کھجیت و اطمینان پر گتہ درپیشان ہو۔

لیڈین اساتذہ کے ناگوار اثرات | چنانچہ اس صورت حال کے باعث جو حالات پیدا ہوئے انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:-

۱۔ مسلمان طلباء میں انگریز قوم کی عظمت ہی نہیں، جذباتی طور پر ان سے ایک شک و بدگمانی پیدا ہوئی۔

وہ انگریزی تہذیب و تمدن کے زیادہ کر دیدہ اور خریفہ ہو گئے۔ ان کے لیے اپنی مادری زبان میں گفتگو کرنا مشکل تھا۔ انگریزی میں بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ اپنی قومی اور ملی تہذیب سے ان کو عار آتی۔ لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے طور طریق اور معاشرت کے آداب و رسوم ان سب میں یورپ کی تقلید ان کے لیے باعثِ فخر اور سرمایہٴ ناز تھی۔ یورپین اساتذہ کے ساتھ ہر وقت کے خلا ملا کے علاوہ اس رحبان میں دخل سرسید کا بھی تھا۔ وہ خود ہندوستان میں مسلمانوں سے کمزری اور انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی ذلت و پسماندگی کا احساس دور کرنے کی غرض سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنے کی تاکید زور شور سے کرتے رہتے تھے اور خود بھی انھوں نے یہ تہذیب اختیار کر لی تھی۔ اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی قوم کی تہذیب میں اگر کوئی چیز اچھی اور مفید ہو تو اس کا اختیار کر لینا نہ ضرر یہ کہ معیوب نہیں ہے۔ بلکہ مستحسن ہے اس بنا پر اس میں شبہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں بعض ایسی خوبیاں ضرور ہیں جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے تھیں۔ لیکن سرسید کی انتہا پسندی یہاں بھی "اے روشنی طبع تو برہمن بلا شدی" کا مصداق ثابت ہوئی۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی نقالی میں ضروری اور غیر ضروری اچھے برے اور درست و نادرست کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ مغربی تہذیب کی مدح و ثنا اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی متقیں و مذمت کے باب میں

لے عبد گرشہ میں علامہ مولانا عبد اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ بھی ملا وطن کے بعد جب ہندوستان میں آئے تو عجیب بات ہے وہ بھی سرسید کی طرح مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ چنانچہ مجھے اکثر ملتے تھے۔ سعید ایں تجھے بہت خوش ہوں لیکن اس بات سے سخت ناخوش ہوں کہ تو مسلمانوں کے عہد جاگیر داری کا لباس پہنے پھرتا ہے اور کوٹ پہنے نہیں جانتا۔

سرسید کا لب و لہجہ متوازن اور معتدل نہیں رہتا اور لبا اوقات اشتغال انگیز بن جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ سرسید جو کہتے تھے وہ بے اصل و بے بنیاد باتیں نہیں تھیں اور ان میں سے کتنی چیزیں ہیں جن کو آج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں نے بلکہ پورے عالم اسلام نے بے تکلف اختیار کر لیا ہے۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب کسی مسلمان کا ترکی ٹوپی اور زکش کوٹ پہننا، علما کے نزدیک اس کے لمحہ اور بے دین ہونے کے لیے کافی تھا۔ پس جب فضلاس درجہ تیرہ و تارہ تو ظاہر ہے سرسید کا فخر مستانہ کس طرح برداشت ہو سکتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب و تمدن کے علم و نشان کے ساتھ جب ملک میں پھیلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی اس سلسلہ میں سرسید کی تقریریں اور تحریریں عام ہوئیں تو ملک میں کالج کے یورپین اسٹا اور ساتھ ہی سرسید کے خلاف عام بیزاری اور غیظ و غضب کے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ اونچے اور سخیہ طبقہ میں ان جذبات کے سب سے بڑے ترجمان مولانا شبلی اور اکبر الہ آبادی تھے۔

مولانا شبلی نے توان خیالات کا اظہار چند خطوط و دو تین نظموں اور چند مضامین میں کیا ہے اور وہ سب اپنے آپ کو لیے دیئے ہوئے۔ لیکن اکبر الہ آبادی مشہور و مقبول شاعر تھے۔ سرسید کی تنقید میں جو مصرعہ سبھی ان کی زبانِ قلم سے نکلتا۔ گھر گھر پھیل جاتا تھا۔ اکبر الہ آبادی سرسید کے بڑے مداح اور قدردان تھے لیکن سرسید کی حد سے زیادہ مغرب و آزادی سے سخت بیزار اور بد دل تھے چنانچہ سرسید پر ان کی تنقید کا رنگ یہ ہے فرماتے ہیں۔

قدیم و فصیح پر قائم رہوں اگر اکبر نصائح کہتے ہیں سید یہ رنگ پھیلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں خدا اپنی قوم بچاتی ہے خود خدا کا

جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ اُڑے زیادہ ٹکڑیے بننے پاؤں ہیں بھلا
 ادھر یہ مذہب کہ لٹا بھی چھو نہیں سکتے ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی مرا چمٹے لا
 ادھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک ادھر ہے دھجی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
 عرض دو گو نہ عذاب است جانِ محزون را

بلائے محبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ

ظاہر ہے جب یہ خیالات گھر گھر عام ہو رہے تھے تو کالج کے عمائد اور اس
 کے انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کب تک ان سے متاثر نہ ہوتے اور وہ بحیثیت ذمہ دار
 عہدہ کے اپنا یہ فرض محسوس نہ کرتے کہ سرسید کی انتہا پسندی نے کالج میں جو
 جو حالات پیدا کر دیے ہیں ان کا تدارک کیا جائے۔

تعلیم خوش حال طبقہ تک (رج) یہ سب تو خیر تھا ہی۔ سرسید کی پالیسی کا ایک
 محدود سو کر رہ گئی عظیم نقصان یہ ہوا کہ چونکہ کالج کے یورپین اساتذہ

یہاں بڑی بڑی تنخواہیں پر تھے اور کالج کے بجٹ پر ان کا غیر معمولی دباؤ
 پڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی کالج کے ساتھ اقامتی زندگی ضروری تھی جس کے فی نفسہ
 اہم اور مفید ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ سرسید ہر معاملہ میں
 کیمبرج اور آکسفورڈ کی نقالی کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی
 ہوئے اور اس کے لیے انہوں نے اس زمانہ کے لفٹننٹ گورنر اور دوسرے بڑے
 بڑے انگریزوں سے دباؤ تحمین حاصل بھی کیا۔ لیکن اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ
 یہ ہوا کہ ملی گروہ کالج کی تعلیم مسلمانوں کے خوش حال طبقہ کے نوجوانوں کے
 لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ جن کے والدین کالج کے گراں بار اخراجات کے متحمل ہو سکتے
 تھے۔ غریب طبقہ کے طالب علم کے لیے کالج سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ
 اس زمانے کے طلباء پر اگر آپ ایک نگاہ ڈالیں تو ان میں ایک عظیم اکثریت آپ کو

جاگیرداروں، فوجیوں، زمینداروں اور طبقہ وسطی کے ملازمت پیشہ یا تجارت پیشہ مسلمانوں کے لڑکوں کی طے کی، اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کا طبقہ عوام کالج سے کشیدہ رہا اور اس کے دل میں کالج کی وقعت اور عظمت پیدا نہ ہو سکی۔

سرسید کی ایک اور کمزوری | انتہا پسندی کے علاوہ ان میں ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ جس شخص پر اعتماد کرتے تھے، بھرپور کرتے تھے اس سے متعلق جو کام ہوتا وہ من و عن اس کے سپرد کر کے چنت سو کر بیٹھ جاتے اور پھر اس کا احتساب یا نگرانی نہ کرتے تھے۔ اس کمزوری میں ان کی طبیعت کے علاوہ بڑا دخل ان کی غیر معمولی مصروفیت و مشغولیت کا بھی تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں سخت المٹاک غبن کا جو واقعہ پیش آیا، وہ ان کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ شام بیاری لال ایک شخص جو رقم کا کالیتھ تھا ۱۸۸۳ء میں سرسید نے اس کا تقریباً کلرک کے عہدہ پر اپنے دفتر میں کیا۔ اگرچہ اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد سرسید کو کسی غلطی سے یہ بات معلوم بھی ہو گئی تھی کہ یہ شخص پنجاب گورنمنٹ میں ملازم تھا اور غبن کے الزام میں نہ صرف یہ کہ ملازمت سے الگ کیا گیا، بلکہ سزا بھی کھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سرسید نے احتیاط اور اس کی نگرانی نہیں کی اور اس پر اس درجہ اعتماد کیا کہ چک پر (جس کی کتاب سرسید کے قبضہ میں رہتی تھی) اپنی طرف سے جو رقم چاہا لکھ دیتا اور سرسید سے دستخط کرا لیتا تھا۔ نہایت اعتماد کے باعث سرسید یہ دیکھتے بھی نہیں تھے کہ اس چک پر رقم کیا لکھی گئی ہے اور وہ یہ کس کام کے لیے نکالا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ایک نہایت جبارت کا کام یہ کیا کہ کالج کا جو محفوظ سرمایہ بینک کے قبضہ میں تھا اس شخص نے محل فریب کر کے اس پر ہاتھ مارا اور ڈسٹینوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنا کر محفوظ سرمایہ کی ضمانت پر کالج کے نام سے دو مختار فنانسنگ سے سہولت پر پوزن لیا۔

اس طرح اس نے جو روپیہ غنیمت کیا اس کی مقدار ایک لاکھ چھ ہزار کے قریب تھی سرسید کے لیے یہ صدمہ جانکاہ ثابت ہوا اور وہ اس سے نہ بچ سکے۔

انڈوئی کشمکش | اسی طرح سرسید نے کالج کے پرنسپل اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص کیے تو وہ ان پر اعتماد بھی بہرپور کرتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو کالج کے سیاہ سپید کا مالک بنا دیا تھا اور ان کے انتظام میں اگر بات ناپسندیدہ بھی ہوتی تھی تو اس کا نوٹس نہیں لیتے تھے۔ مسٹر بیک بڑی آن بان کے پرنسپل تھے ان میں اور کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے بعض ممبروں میں جن میں مولوی سیح اللہ خاں پیش پیش تھے۔ ایک مستقل کشمکش رہنے لگی۔ لیکن سرسید ان معاملات میں پرنسپل بیک کی ہی حمایت کرتے تھے۔ چنانچہ جب کشمکش بڑھی تو سرسید نے پرنسپل بیک کے مشورہ پر اس پرانی انتظامیہ کمیٹی کو معطل کر دیا اور اس کے بجائے ایک نیا بورڈ آف مینجمنٹ بنایا جس کے ممبروں میں مولوی صاحب موصوف کا نام نہیں تھا۔ سرسید کے اس فعل نے کالج کے حلقہ میں ان کے مخالفین کا ایک مستقل گروہ پیدا کر دیا۔

باقی

رہبر حج

(مؤلف جناب الحاج قاری محمد بشیر الدین (پنڈت ایم - ۱۷۷) جیہ ساکڑ پر مختصر رسالہ لیکن مسائل حج و متعلقات حج کے وسیع و عریض دیکھو کوزے میں بند کرنے کا مصداق ہے، آخر میں مفید اور معلومات افزا مدید ۱۲ نقشے - قیمت ۱۰ سواروپہ

نذوق المصنفین دہلی کے قواعد و ضوابط مفت طلب فرمائیے۔

مکتبہ برہان اردو یا زار جامع مسجد دہلی

حافظ زکی الدین المنذریؒ

از مولوی محمد عبداللہ صاحب رفیق - مذوۃ المصنفین

حافظ زکی الدین منذریؒ کی مشہور و معروف کتاب التزیب والتریب کا تشریحی ترجمہ ضروری ہو گیا تھا۔ مذوۃ المصنفین نے اسے سہولت کے لئے اردو میں تراجم کیا تھا مگر اس کا مرقع بھی ہو گیا تھا مگر اس کا مرقع بھی ہو گیا تھا۔ اور کام کر گیا اب یہ خدمت مولوی محمد عبداللہ صاحب نے سر کی گئی ہے جو کچھ اور خدمت سے یہ خدمت کر رہے ہیں یہ نظر معصوم اس کتاب کا مقدمہ ہے جس میں حافظ منذریؒ اور ان کی کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ برائے۔

نام و نسب و پیدائش | الحافظ الکبیر الامام شیخ الاسلام زکی الدین ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ بن سلامۃ بن سعد بن سعید المنذری الشافعی ثم المصری الشافعی آپ کا خاندان شام سے آکر مصر میں مقیم ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ الشافعی ثم المصری لکھا جاتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ بعض مورخین نے آپ کی پیدائش مصر کی بیان کی ہے۔

آپ یکم شعبان سن پانچ سو اکیاسی ہجری (۵۷۷ھ مطابق ۱۱۸۱ء) میں اکثر مورخین کے بیان کے مطابق مصر میں پیدا ہوئے۔

تحصیل علم | آپ نے حصول علم کے لیے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، دمشق، حران، رام اور اسکندریہ وغیرہ اسفار کیے اور ہر جگہ کے اکابر اہل علم اور ماہرین اہل فن سے استفادہ کیا۔

اساتذہ کرام | آپ کے اساتذہ میں سب سے پہلے اتاد حدیث ابو عبداللہ الارناؤتہ تھے۔

خود حافظ منذری نے کہا ہے "هو اهل شيوخ سمعت منه الحديث" یعنی میرے سب سے
 پہلے استاد ہیں۔ جن سے میں نے حدیث سنی۔ امام ابوالقاسم عبدالرحمان بن محمد القرشی
 عقیل الجیب بن زہیر المتوفی ۶۱۴ھ محمد بن سعید المامونی، حافظ ابوالحسن علی المقدسی
 المطہر بن ابی بکر البیہقی، ربیعہ بن الحسن بن علی الیمینی المتوفی ۶۰۹ھ، ابو عبد اللہ
 البناء المتوفی ۶۱۲ھ، الحسن بن محمد بن الحسن زین الامناء المتوفی ۶۲۴ھ، الحضر بن
 کامل، ابراہیم النیب، ابو الجود غیاث بن فارس، الحافظ جعفر بن امسان، عمر بن طبرزد
 محمد بن الشریف، التاج الکندی، امام دارقطنی۔

علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے محمد بن عمر بن یوسف القرطبی الانصاری
 المتوفی ۶۳۱ھ اور تہذیب الدین محمد بن علی الحلبي الادیب اشاعر المتوفی ۶۴۲ھ کو بھی منذری
 کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ مورخان ابن العباد نے ابوالحسن علی ابن احمد بن عبد الواحد الفخر بن
 البخاری المتوفی ۶۶۹ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ منذری نے ان سے روایت کی ہے۔ علامہ
 سبکی نے متعدد علماء کے حالات میں منذری کا ان سے روایت کرنا نقل کیا ہے۔ ان میں سے
 چند یہ ہیں۔ محمد بن حبیب اللہ الشیرازی المتوفی ۶۳۵ھ۔ ابراہیم بن نصر بن طاقہ المصری
 الجوی المتوفی ۶۳۵ھ۔ عبد الرحمن بن محمد بن اسماعیل القرشی المصری ابن الوراق المتوفی
 ۶۶۲ھ۔ حافظ منذری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے حدیث سنی ہے اور مرصعہ دراز تک

۱۔ تذرات الذہب ج ۵۔ ملا ترجمہ محمد بن حمد۔ ج ۱ الف۔ بن حامد ابی عبد اللہ الارتما۔
 ان کی نسبت کسی نے اریا جی کسی نے ارتیا جی اور کسی نے کچھ نقل کی ہے۔ ہم نے خود ابو عبد اللہ
 الارتما جی کے حالات دیکھ کر اور مستند مقامات سے راجحت کر کے درست کیا ہے ۱۔ تذکرۃ الحفاظ
 تذرات الذہب وغیرہ ۲۔ بغیۃ الوعاة ۳۔ ترجمہ محمد بن عمر القرطبی ۴۔ بغیۃ الوعاة ۵۔
 ترجمہ محمد بن علی وطبات الشافعیہ ج ۵۔ ۶۔ تذرات الذہب ج ۵۔ ۷۔ طبقات ابن خلیفہ ج ۲۔
 ۸۔ ایضاً ص ۱۰۷

فقہ حاصل کیا ہے۔ المنظر بن ابی احمد الوارانی امین الدین التبریزی المتوفی ۶۲۱ھ۔
 ثم بن ابی الفرج بن سالم الکنافی المصری المتوفی ۶۷۵ھ۔ الفقیہ ہام بن واجی اللہ المصری
 المتوفی ۶۳۳ھ اور آپ کے اساتذہ میں موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن
 قدامة الحنبلی المقدسی المتوفی ۶۲۰ھ بھی ہیں۔

بعض محدثین سے روایت تو نہیں ہے لیکن محدثین کے طریقہ کے مطابق ان سے
 اجازت حاصل ہے مثلاً ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الحمیری الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ
 حافظ ذہبی نے ابو الربیع کے حالات لکھتے ہوئے منذری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ
 کتب الینابا لا حجازة سنة اربع عشرة یعنی ۶۱۲ھ میں انھوں نے ہمیں
 روایت حدیث کی تحریری اجازت بھیجی۔ برہان الدین ابراہیم بن المنظر الحمیری الموصلی
 المتوفی ۶۱۲ھ منذری نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ لنا منه اجازة یعنی ہمیں ان
 سے حدیث کی اجازت حاصل ہے۔

آپ نے قرآن مجید پڑھنے کے بعد ادب اور فقہ پڑھا اور فقہ میں یگانہ و بے مثال
 ہو گئے۔ لیکن فن حدیث آپ کی دلچسپی کا مرکز تھا اور یہی رات دن کا مشغلہ بھی اس لیے
 آپ کی ادبیت اور قہمت دب کر رہ گئی اور محدثانہ شان ہی کا غلبہ ہو گیا اور آپ
 بحیثیت محدث کے مشہور ہو گئے۔

تلامذہ و مستفیدین | آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکابر علماء شامل
 ہیں مثلاً حافظ دمیاطی، ابن الظاہری، ابوالحسین المیمنی، ابو عبداللہ بن القزاد اسماعیل

لہ لیسان الفقیہ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰ ۱۰۰۱ ۱۰۰۲ ۱۰۰۳ ۱۰۰۴ ۱۰۰۵ ۱۰۰۶ ۱۰۰۷ ۱۰۰۸ ۱۰۰۹ ۱۰۱۰ ۱۰۱۱ ۱۰۱۲ ۱۰۱۳ ۱۰۱۴ ۱۰۱۵ ۱۰۱۶ ۱۰۱۷ ۱۰۱۸ ۱۰۱۹ ۱۰۲۰ ۱۰۲۱ ۱۰۲۲ ۱۰۲۳ ۱۰۲۴ ۱۰۲۵ ۱۰۲۶ ۱۰۲۷ ۱۰۲۸ ۱۰۲۹ ۱۰۳۰ ۱۰۳۱ ۱۰۳۲ ۱۰۳۳ ۱۰۳۴ ۱۰۳۵ ۱۰۳۶ ۱۰۳۷ ۱۰۳۸ ۱۰۳۹ ۱۰۴۰ ۱۰۴۱ ۱۰۴۲ ۱۰۴۳ ۱۰۴۴ ۱۰۴۵ ۱۰۴۶ ۱۰۴۷ ۱۰۴۸ ۱۰۴۹ ۱۰۵۰ ۱۰۵۱ ۱۰۵۲ ۱۰۵۳ ۱۰۵۴ ۱۰۵۵ ۱۰۵۶ ۱۰۵۷ ۱۰۵۸ ۱۰۵۹ ۱۰۶۰ ۱۰۶۱ ۱۰۶۲ ۱۰۶۳ ۱۰۶۴ ۱۰۶۵ ۱۰۶۶ ۱۰۶۷ ۱۰۶۸ ۱۰۶۹ ۱۰۷۰ ۱۰۷۱ ۱۰۷۲ ۱۰۷۳ ۱۰۷۴ ۱۰۷۵ ۱۰۷۶ ۱۰۷۷ ۱۰۷۸ ۱۰۷۹ ۱۰۸۰ ۱۰۸۱ ۱۰۸۲ ۱۰۸۳ ۱۰۸۴ ۱۰۸۵ ۱۰۸۶ ۱۰۸۷ ۱۰۸۸ ۱۰۸۹ ۱۰۹۰ ۱۰۹۱ ۱۰۹۲ ۱۰۹۳ ۱۰۹۴ ۱۰۹۵ ۱۰۹۶ ۱۰۹۷ ۱۰۹۸ ۱۰۹۹ ۱۱۰۰ ۱۱۰۱ ۱۱۰۲ ۱۱۰۳ ۱۱۰۴ ۱۱۰۵ ۱۱۰۶ ۱۱۰۷ ۱۱۰۸ ۱۱۰۹ ۱۱۱۰ ۱۱۱۱ ۱۱۱۲ ۱۱۱۳ ۱۱۱۴ ۱۱۱۵ ۱۱۱۶ ۱۱۱۷ ۱۱۱۸ ۱۱۱۹ ۱۱۲۰ ۱۱۲۱ ۱۱۲۲ ۱۱۲۳ ۱۱۲۴ ۱۱۲۵ ۱۱۲۶ ۱۱۲۷ ۱۱۲۸ ۱۱۲۹ ۱۱۳۰ ۱۱۳۱ ۱۱۳۲ ۱۱۳۳ ۱۱۳۴ ۱۱۳۵ ۱۱۳۶ ۱۱۳۷ ۱۱۳۸ ۱۱۳۹ ۱۱۴۰ ۱۱۴۱ ۱۱۴۲ ۱۱۴۳ ۱۱۴۴ ۱۱۴۵ ۱۱۴۶ ۱۱۴۷ ۱۱۴۸ ۱۱۴۹ ۱۱۵۰ ۱۱۵۱ ۱۱۵۲ ۱۱۵۳ ۱۱۵۴ ۱۱۵۵ ۱۱۵۶ ۱۱۵۷ ۱۱۵۸ ۱۱۵۹ ۱۱۶۰ ۱۱۶۱ ۱۱۶۲ ۱۱۶۳ ۱۱۶۴ ۱۱۶۵ ۱۱۶۶ ۱۱۶۷ ۱۱۶۸ ۱۱۶۹ ۱۱۷۰ ۱۱۷۱ ۱۱۷۲ ۱۱۷۳ ۱۱۷۴ ۱۱۷۵ ۱۱۷۶ ۱۱۷۷ ۱۱۷۸ ۱۱۷۹ ۱۱۸۰ ۱۱۸۱ ۱۱۸۲ ۱۱۸۳ ۱۱۸۴ ۱۱۸۵ ۱۱۸۶ ۱۱۸۷ ۱۱۸۸ ۱۱۸۹ ۱۱۹۰ ۱۱۹۱ ۱۱۹۲ ۱۱۹۳ ۱۱۹۴ ۱۱۹۵ ۱۱۹۶ ۱۱۹۷ ۱۱۹۸ ۱۱۹۹ ۱۲۰۰ ۱۲۰۱ ۱۲۰۲ ۱۲۰۳ ۱۲۰۴ ۱۲۰۵ ۱۲۰۶ ۱۲۰۷ ۱۲۰۸ ۱۲۰۹ ۱۲۱۰ ۱۲۱۱ ۱۲۱۲ ۱۲۱۳ ۱۲۱۴ ۱۲۱۵ ۱۲۱۶ ۱۲۱۷ ۱۲۱۸ ۱۲۱۹ ۱۲۲۰ ۱۲۲۱ ۱۲۲۲ ۱۲۲۳ ۱۲۲۴ ۱۲۲۵ ۱۲۲۶ ۱۲۲۷ ۱۲۲۸ ۱۲۲۹ ۱۲۳۰ ۱۲۳۱ ۱۲۳۲ ۱۲۳۳ ۱۲۳۴ ۱۲۳۵ ۱۲۳۶ ۱۲۳۷ ۱۲۳۸ ۱۲۳۹ ۱۲۴۰ ۱۲۴۱ ۱۲۴۲ ۱۲۴۳ ۱۲۴۴ ۱۲۴۵ ۱۲۴۶ ۱۲۴۷ ۱۲۴۸ ۱۲۴۹ ۱۲۵۰ ۱۲۵۱ ۱۲۵۲ ۱۲۵۳ ۱۲۵۴ ۱۲۵۵ ۱۲۵۶ ۱۲۵۷ ۱۲۵۸ ۱۲۵۹ ۱۲۶۰ ۱۲۶۱ ۱۲۶۲ ۱۲۶۳ ۱۲۶۴ ۱۲۶۵ ۱۲۶۶ ۱۲۶۷ ۱۲۶۸ ۱۲۶۹ ۱۲۷۰ ۱۲۷۱ ۱۲۷۲ ۱۲۷۳ ۱۲۷۴ ۱۲۷۵ ۱۲۷۶ ۱۲۷۷ ۱۲۷۸ ۱۲۷۹ ۱۲۸۰ ۱۲۸۱ ۱۲۸۲ ۱۲۸۳ ۱۲۸۴ ۱۲۸۵ ۱۲۸۶ ۱۲۸۷ ۱۲۸۸ ۱۲۸۹ ۱۲۹۰ ۱۲۹۱ ۱۲۹۲ ۱۲۹۳ ۱۲۹۴ ۱۲۹۵ ۱۲۹۶ ۱۲۹۷ ۱۲۹۸ ۱۲۹۹ ۱۳۰۰ ۱۳۰۱ ۱۳۰۲ ۱۳۰۳ ۱۳۰۴ ۱۳۰۵ ۱۳۰۶ ۱۳۰۷ ۱۳۰۸ ۱۳۰۹ ۱۳۱۰ ۱۳۱۱ ۱۳۱۲ ۱۳۱۳ ۱۳۱۴ ۱۳۱۵ ۱۳۱۶ ۱۳۱۷ ۱۳۱۸ ۱۳۱۹ ۱۳۲۰ ۱۳۲۱ ۱۳۲۲ ۱۳۲۳ ۱۳۲۴ ۱۳۲۵ ۱۳۲۶ ۱۳۲۷ ۱۳۲۸ ۱۳۲۹ ۱۳۳۰ ۱۳۳۱ ۱۳۳۲ ۱۳۳۳ ۱۳۳۴ ۱۳۳۵ ۱۳۳۶ ۱۳۳۷ ۱۳۳۸ ۱۳۳۹ ۱۳۴۰ ۱۳۴۱ ۱۳۴۲ ۱۳۴۳ ۱۳۴۴ ۱۳۴۵ ۱۳۴۶ ۱۳۴۷ ۱۳۴۸ ۱۳۴۹ ۱۳۵۰ ۱۳۵۱ ۱۳۵۲ ۱۳۵۳ ۱۳۵۴ ۱۳۵۵ ۱۳۵۶ ۱۳۵۷ ۱۳۵۸ ۱۳۵۹ ۱۳۶۰ ۱۳۶۱ ۱۳۶۲ ۱۳۶۳ ۱۳۶۴ ۱۳۶۵ ۱۳۶۶ ۱۳۶۷ ۱۳۶۸ ۱۳۶۹ ۱۳۷۰ ۱۳۷۱ ۱۳۷۲ ۱۳۷۳ ۱۳۷۴ ۱۳۷۵ ۱۳۷۶ ۱۳۷۷ ۱۳۷۸ ۱۳۷۹ ۱۳۸۰ ۱۳۸۱ ۱۳۸۲ ۱۳۸۳ ۱۳۸۴ ۱۳۸۵ ۱۳۸۶ ۱۳۸۷ ۱۳۸۸ ۱۳۸۹ ۱۳۹۰ ۱۳۹۱ ۱۳۹۲ ۱۳۹۳ ۱۳۹۴ ۱۳۹۵ ۱۳۹۶ ۱۳۹۷ ۱۳۹۸ ۱۳۹۹ ۱۴۰۰ ۱۴۰۱ ۱۴۰۲ ۱۴۰۳ ۱۴۰۴ ۱۴۰۵ ۱۴۰۶ ۱۴۰۷ ۱۴۰۸ ۱۴۰۹ ۱۴۱۰ ۱۴۱۱ ۱۴۱۲ ۱۴۱۳ ۱۴۱۴ ۱۴۱۵ ۱۴۱۶ ۱۴۱۷ ۱۴۱۸ ۱۴۱۹ ۱۴۲۰ ۱۴۲۱ ۱۴۲۲ ۱۴۲۳ ۱۴۲۴ ۱۴۲۵ ۱۴۲۶ ۱۴۲۷ ۱۴۲۸ ۱۴۲۹ ۱۴۳۰ ۱۴۳۱ ۱۴۳۲ ۱۴۳۳ ۱۴۳۴ ۱۴۳۵ ۱۴۳۶ ۱۴۳۷ ۱۴۳۸ ۱۴۳۹ ۱۴۴۰ ۱۴۴۱ ۱۴۴۲ ۱۴۴۳ ۱۴۴۴ ۱۴۴۵ ۱۴۴۶ ۱۴۴۷ ۱۴۴۸ ۱۴۴۹ ۱۴۵۰ ۱۴۵۱ ۱۴۵۲ ۱۴۵۳ ۱۴۵۴ ۱۴۵۵ ۱۴۵۶ ۱۴۵۷ ۱۴۵۸ ۱۴۵۹ ۱۴۶۰ ۱۴۶۱ ۱۴۶۲ ۱۴۶۳ ۱۴۶۴ ۱۴۶۵ ۱۴۶۶ ۱۴۶۷ ۱۴۶۸ ۱۴۶۹ ۱۴۷۰ ۱۴۷۱ ۱۴۷۲ ۱۴۷۳ ۱۴۷۴ ۱۴۷۵ ۱۴۷۶ ۱۴۷۷ ۱۴۷۸ ۱۴۷۹ ۱۴۸۰ ۱۴۸۱ ۱۴۸۲ ۱۴۸۳ ۱۴۸۴ ۱۴۸۵ ۱۴۸۶ ۱۴۸۷ ۱۴۸۸ ۱۴۸۹ ۱۴۹۰ ۱۴۹۱ ۱۴۹۲ ۱۴۹۳ ۱۴۹۴ ۱۴۹۵ ۱۴۹۶ ۱۴۹۷ ۱۴۹۸ ۱۴۹۹ ۱۵۰۰ ۱۵۰۱ ۱۵۰۲ ۱۵۰۳ ۱۵۰۴ ۱۵۰۵ ۱۵۰۶ ۱۵۰۷ ۱۵۰۸ ۱۵۰۹ ۱۵۱۰ ۱۵۱۱ ۱۵۱۲ ۱۵۱۳ ۱۵۱۴ ۱۵۱۵ ۱۵۱۶ ۱۵۱۷ ۱۵۱۸ ۱۵۱۹ ۱۵۲۰ ۱۵۲۱ ۱۵۲۲ ۱۵۲۳ ۱۵۲۴ ۱۵۲۵ ۱۵۲۶ ۱۵۲۷ ۱۵۲۸ ۱۵۲۹ ۱۵۳۰ ۱۵۳۱ ۱۵۳۲ ۱۵۳۳ ۱۵۳۴ ۱۵۳۵ ۱۵۳۶ ۱۵۳۷ ۱۵۳۸ ۱۵۳۹ ۱۵۴۰ ۱۵۴۱ ۱۵۴۲ ۱۵۴۳ ۱۵۴۴ ۱۵۴۵ ۱۵۴۶ ۱۵۴۷ ۱۵۴۸ ۱۵۴۹ ۱۵۵۰ ۱۵۵۱ ۱۵۵۲ ۱۵۵۳ ۱۵۵۴ ۱۵۵۵ ۱۵۵۶ ۱۵۵۷ ۱۵۵۸ ۱۵۵۹ ۱۵۶۰ ۱۵۶۱ ۱۵۶۲ ۱۵۶۳ ۱۵۶۴ ۱۵۶۵ ۱۵۶۶ ۱۵۶۷ ۱۵۶۸ ۱۵۶۹ ۱۵۷۰ ۱۵۷۱ ۱۵۷۲ ۱۵۷۳ ۱۵۷۴ ۱۵۷۵ ۱۵۷۶ ۱۵۷۷ ۱۵۷۸ ۱۵۷۹ ۱۵۸۰ ۱۵۸۱ ۱۵۸۲ ۱۵۸۳ ۱۵۸۴ ۱۵۸۵ ۱۵۸۶ ۱۵۸۷ ۱۵۸۸ ۱۵۸۹ ۱۵۹۰ ۱۵۹۱ ۱۵۹۲ ۱۵۹۳ ۱۵۹۴ ۱۵۹۵ ۱۵۹۶ ۱۵۹۷ ۱۵۹۸ ۱۵۹۹ ۱۶۰۰ ۱۶۰۱ ۱۶۰۲ ۱۶۰۳ ۱۶۰۴ ۱۶۰۵ ۱۶۰۶ ۱۶۰۷ ۱۶۰۸ ۱۶۰۹ ۱۶۱۰ ۱۶۱۱ ۱۶۱۲ ۱۶۱۳ ۱۶۱۴ ۱۶۱۵ ۱۶۱۶ ۱۶۱۷ ۱۶۱۸ ۱۶۱۹ ۱۶۲۰ ۱۶۲۱ ۱۶۲۲ ۱۶۲۳ ۱۶۲۴ ۱۶۲۵ ۱۶۲۶ ۱۶۲۷ ۱۶۲۸ ۱۶۲۹ ۱۶۳۰ ۱۶۳۱ ۱۶۳۲ ۱۶۳۳ ۱۶۳۴ ۱۶۳۵ ۱۶۳۶ ۱۶۳۷ ۱۶۳۸ ۱۶۳۹ ۱۶۴۰ ۱۶۴۱ ۱۶۴۲ ۱۶۴۳ ۱۶۴۴ ۱۶۴۵ ۱۶۴۶ ۱۶۴۷ ۱۶۴۸ ۱۶۴۹ ۱۶۵۰ ۱۶۵۱ ۱۶۵۲ ۱۶۵۳ ۱۶۵۴ ۱۶۵۵ ۱۶۵۶ ۱۶۵۷ ۱۶۵۸ ۱۶۵۹ ۱۶۶۰ ۱۶۶۱ ۱۶۶۲ ۱۶۶۳ ۱۶۶۴ ۱۶۶۵ ۱۶۶۶ ۱۶۶۷ ۱۶۶۸ ۱۶۶۹ ۱۶۷۰ ۱۶۷۱ ۱۶۷۲ ۱۶۷۳ ۱۶۷۴ ۱۶۷۵ ۱۶۷۶ ۱۶۷۷ ۱۶۷۸ ۱۶۷۹ ۱۶۸۰ ۱۶۸۱ ۱۶۸۲ ۱۶۸۳ ۱۶۸۴ ۱۶۸۵ ۱۶۸۶ ۱۶۸۷ ۱۶۸۸ ۱۶۸۹ ۱۶۹۰ ۱۶۹۱ ۱۶۹۲ ۱۶۹۳ ۱۶۹۴ ۱۶۹۵ ۱۶۹۶ ۱۶۹۷ ۱۶۹۸ ۱۶۹۹ ۱۷۰۰ ۱۷۰۱ ۱۷۰۲ ۱۷۰۳ ۱۷۰۴ ۱۷۰۵ ۱۷۰۶ ۱۷۰۷ ۱۷۰۸ ۱۷۰۹ ۱۷۱۰ ۱۷۱۱ ۱۷۱۲ ۱۷۱۳ ۱۷۱۴ ۱۷۱۵ ۱۷۱۶ ۱۷۱۷ ۱۷۱۸ ۱۷۱۹ ۱۷۲۰ ۱۷۲۱ ۱۷۲۲ ۱۷۲۳ ۱۷۲۴ ۱۷۲۵ ۱۷۲۶ ۱۷۲۷ ۱۷۲۸ ۱۷۲۹ ۱۷۳۰ ۱۷۳۱ ۱۷۳۲ ۱۷۳۳ ۱۷۳۴ ۱۷۳۵ ۱۷۳۶ ۱۷۳۷ ۱۷۳۸ ۱۷۳۹ ۱۷۴۰ ۱۷۴۱ ۱۷۴۲ ۱۷۴۳ ۱۷۴۴ ۱۷۴۵ ۱۷۴۶ ۱۷۴۷ ۱۷۴۸ ۱۷۴۹ ۱۷۵۰ ۱۷۵۱ ۱۷۵۲ ۱۷۵۳ ۱۷۵۴ ۱۷۵۵ ۱۷۵۶ ۱۷۵۷ ۱۷۵۸ ۱۷۵۹ ۱۷۶۰ ۱۷۶۱ ۱۷۶۲ ۱۷۶۳ ۱۷۶۴ ۱۷۶۵ ۱۷۶۶ ۱۷۶۷ ۱۷۶۸ ۱۷۶۹ ۱۷۷۰ ۱۷۷۱ ۱۷۷۲ ۱۷۷۳ ۱۷۷۴ ۱۷۷۵ ۱۷۷۶ ۱۷۷۷ ۱۷۷۸ ۱۷۷۹ ۱۷۸۰ ۱۷۸۱ ۱۷۸۲ ۱۷۸۳ ۱۷۸۴ ۱۷۸۵ ۱۷۸۶ ۱۷۸۷ ۱۷۸۸ ۱۷۸۹ ۱۷۹۰ ۱۷۹۱ ۱۷۹۲ ۱۷۹۳ ۱۷۹۴ ۱۷۹۵ ۱۷۹۶ ۱۷۹۷ ۱۷۹۸ ۱۷۹۹ ۱۸۰۰ ۱۸۰۱ ۱۸۰۲ ۱۸۰۳ ۱۸۰۴ ۱۸۰۵ ۱۸۰۶ ۱۸۰۷ ۱۸۰۸ ۱۸۰۹ ۱۸۱۰ ۱۸۱۱ ۱۸۱۲ ۱۸۱۳ ۱۸۱۴ ۱۸۱۵ ۱۸۱۶ ۱۸۱۷ ۱۸۱۸ ۱۸۱۹ ۱۸۲۰ ۱۸۲۱ ۱۸۲۲ ۱۸۲۳ ۱۸۲۴ ۱۸۲۵ ۱۸۲۶ ۱۸۲۷ ۱۸۲۸ ۱۸۲۹ ۱۸۳۰ ۱۸۳۱ ۱۸۳۲ ۱۸۳۳ ۱۸۳۴ ۱۸۳۵ ۱۸۳۶ ۱۸۳۷ ۱۸۳۸ ۱۸۳۹ ۱۸۴۰ ۱۸۴۱ ۱۸۴۲ ۱۸۴۳ ۱۸۴۴ ۱۸۴۵ ۱۸۴۶ ۱۸۴۷ ۱۸۴۸ ۱۸۴۹ ۱۸۵۰ ۱۸۵۱ ۱۸۵۲ ۱۸۵۳ ۱۸۵۴ ۱۸۵۵ ۱۸۵۶ ۱۸۵۷ ۱۸۵۸ ۱۸۵۹ ۱۸۶۰ ۱۸۶۱ ۱۸۶۲ ۱۸۶۳ ۱۸۶۴ ۱۸۶۵ ۱۸۶۶ ۱۸۶۷ ۱۸۶۸ ۱۸۶۹ ۱۸۷۰ ۱۸۷۱ ۱۸۷۲ ۱۸۷۳ ۱۸۷۴ ۱۸۷۵ ۱۸۷۶ ۱۸۷۷ ۱۸۷۸ ۱۸۷۹ ۱۸۸۰ ۱۸۸۱ ۱۸۸۲ ۱۸۸۳ ۱۸۸۴ ۱۸۸۵ ۱۸۸۶ ۱۸۸۷ ۱۸۸۸ ۱۸۸۹ ۱۸۹۰ ۱۸۹۱ ۱۸۹۲ ۱۸۹۳ ۱۸۹۴ ۱۸۹۵ ۱۸۹۶ ۱۸۹۷ ۱۸۹۸ ۱۸۹۹ ۱۹۰۰ ۱۹۰۱ ۱۹۰۲ ۱۹۰۳ ۱۹۰۴ ۱۹۰۵ ۱۹۰۶ ۱۹۰۷ ۱۹۰۸ ۱۹

بن نصر البئر، قاضی العقضاۃ تقی الدین ابن دقیق العید، العاد بن محمد الخرائذی
اسحاق بن الوزیری، شیخ الاسلام حافظ عز الدین بن عبدالسلام السبی، محمد بن
ابراہیم المیدومی، احمد بن ابراہیم القرشی القاہری، اور حلال الدین احمد بن عبد الرحمن
الکندزی وغیرہم۔

حافظ منذری کا مقام | حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ان سے اونچا
اہل علم کی نظر میں | حافظ حدیث کوئی اور نہ تھا۔ ذہبی نے ان کے نام کے ساتھ
الحافظ الکبیر الامام الثبت شیخ الاسلام کے الفاظ لکھے ہیں۔ علامہ
حلال الدین السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے لکھا ہے کہ فن قرآن میں آپ کو کمال حاصل
تھا۔ حافظ عز الدین بن عبدالسلام جن کے متعلق حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ درجہ
اجتہاد پر فائز تھے اور سیوطی نے جنہیں شیخ الاسلام اور سلطان العلماء کے القاب
سے یاد کیا ہے وہ منذری کا شاگرد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ حافظ عز الدین بن عبدالسلام
فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ زکی الدین المنذری فن حدیث میں عظیم المثال تھے حدیث
کے صحیح و سقیم و معلول کو اچھی طرح جانتے تھے اس کے احکام و معانی اور اس کی
مشکلات کے حل کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے اور اس کے لغات اور ضبط الفاظ
میں کامل تھے۔ احادیث کے لفظی فروق پر گہری نظر تھی۔ نہایت متقی پرہیزگار اور
قانع انسان تھے۔ نیز فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے حدیث پڑھی ہے اور بہت کچھ
فائدہ اٹھایا ہے۔ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ منذری بڑے عبادت گزار اور زاہد تھے۔

۱۔ سیوطی نے بغیۃ الوعاة میں ان کے حالات میں لکھا ہے قال الذہبی وکان
خصیصاً بالحافظ المنذری ۲۔ طبقات شافعیہ للکبکی ج ۵ ص ۱۰۰ الفیاض ج ۵ ص ۱۰۰
۳۔ طبقات شافعیہ ج ۵ ص ۱۰۰ شذرات الذہبی ج ۵ ص ۱۰۰ من المحامز ج ۱ ص ۱۰۰

حافظ ابن عبدالسلام جب قاہرہ پہنچے تو حافظ منذری کی مجلس درس میں شاگردانہ شرکت کرتے تھے اور خود حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو تھا حافظ عزالدین بن عبدالسلام کا اعترافِ فضل۔ اب دوسری طرف حافظ منذری کی فزردانی اور توقیر و تعظیم دیکھیے کہ۔ حافظ منذری نے حافظ ابن عبدالسلام کے مصر تشریف لانے کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ ہم فتویٰ اس وقت تک دیتے تھے جب تک حافظ ابن عبدالسلام نہیں آئے تھے۔ اب ان کے تشریف لے آنے کے بعد منصبِ فتویٰ ان ہی کے لیے مخصوص و متعین ہے۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرة میں لکھا ہے کہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام جب مصر پہنچے تو بالآخر المندری فی الادب معہ یعنی منذری بہت زیادہ ادب و تعظیم کا معاملہ کیا۔ مشہور عالم و محدث حافظ ابن دینق العید جن کے متعلق علامہ تاج الدین سبکی نے لکھا ہے۔ بالاتفاق وہ ساتویں صدی ہجری کے محدث تھے۔ یہ فرماتے ہیں کہ میں حافظ زکی الدین المندری کو اپنے سے زیادہ متین سمجھتا ہوں۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرة میں شیخ الاسلام حافظ عزالدین بن عبدالسلام کے حالات بیان کرتے ہوئے شیخ ابوالحسن شاذلی کا قول نقل کیا ہے :-

قال الشيخ ابو الحسن الشاذلي	مجھے سے کہا گیا کہ روئے زمین پر علم فقہ کی کوئی
قلیٰ ماعلیٰ وجہ الارض مجلس	مجلس شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی مجلس سے
فی الفقہ ابھی من مجلس الشيخ	بہتر نہیں ہے اور روئے زمین پر علم حدیث میں

لحسن المحاضرة ج ۱ ص ۱۲۷ ترجمۃ الحافظ عزالدین بن عبدالسلام۔ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۹
 ترجمۃ المندری ص ۱۱۸ طبقات الشافعیہ ج ۶ ص ۲۶ من المحاضرة ج ۱ ص ۱۲۷
 حسن المحاضرة ج ۱ ص ۱۲۷

عز الدین بن عبد السلام و ما علی
 وجہ الارض مجلس فی الحدیث ابھی
 کوئی مجلس شیخ زکی الدین عبد العظیم (المندری)
 کی مجلس سے بارونق اور عمدہ نہیں اور
 من مجلس الشیخ زکی الدین عبد
 العظیم و ما علی وجہ الارض مجلس
 فی علم الحقائق ابھی من مجلس
 کوئی مجلس نہیں ہے۔

حافظ ذہبی کے استاد حافظ عبد المؤمن کہتے ہیں کہ حافظ مندری میرا استاد ہیں۔
 اقیقہ مبتدئاً و فارقتہ معیداً
 میں ان کے پاس مبتدی کی حیثیت میں آیا تھا اور
 فاضل بن کر ان کے پاس سے نکلا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

بحر بہذا الشان حتی فاق اہل
 زمانہ فیہ
 فن حدیث میں منہک اور دائم الاشتغال رہے۔
 یہاں تک کہ اپنے سب ہم عمروں سے سبقت لے گئے۔

علامہ عبدالحی الکتانی (المتوفی ۱۳۸۸ھ) نے الرحمة المرسلۃ فی شان
 حدیث البسلة میں حافظ زکی الدین المندری کی کتابوں کے متعلق علامہ جلال الدین
 سیرطی المتوفی ۹۱۱ھ کا قول نقل کیا ہے کہ :-

اذا علمت بما لحدیث اندہ فی تصانیف
 المندری صاحب الترغیب والترہیب
 فاروہ مطمئن
 جب ہمیں کسی حدیث کے متعلق یہ معلوم ہو جائے
 کہ یہ حافظ مندری مصنف الترغیب والترہیب
 کی کسی کتاب میں ہے تو اسے بے کھچے نقل کرو۔

علمی خدمات تدریس و تصنیف | آپ کے علوم کا سمندر ہر طرف سیراب کرتا رہا۔ اور

۱۔ اس مقولہ کا انداز بیان بالخصوص شروع و اخیر کے جملے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کئی
 ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ص ۲۱۱ ۳۔ ابداریۃ و النہایت ص ۱۳ ۴۔ ۱۳۵

انتیقات الحافظ علیہ الفاضل عبدالقدوس البغدادی علی الاثرۃ الفاضلۃ لا یم علیہ الخ
 (طبعة السورخ)

۱۳۸۸ھ کا شرف کہ شہر کی طرف کی بات ہے۔ واللہ اعلم

حافظ ابن القیم الجوزیہ شرح سنن ابی داؤد میں فرماتے ہیں :-

ان الحافظ زکی الدین ۱ المنذری حافظ زکی الدین المنذری نے اس سنن کا بڑا
قد احسن فی اختصارہ فہذا بتہ اچھا اختصار کیا ہے میں نے بھی اس پہنچ پر
نحو ماہذب ہدوبہ الاصل و زبدت اکو مرتب و مہذب کیا ہے اور جن محل و غیرہ پر
علیہ من الکلام علی علی سکت الخونے کوٹ کیا تھا ان پر بھی کلام کیا ہے ایسے
عنہا اذ لم یملکھا۔ کہ منذری اس کو مکمل نہیں کر سکے تھے۔

کشف الظنون میں منذری کی مختصر سنن ابی داؤد کا نام المجتبیٰ نقل کیا گیا ہے۔ حافظ
ابن کثیر نے اس کے متعلق یہ لکھا ہے :- دھوا حسن اختصاراً من الاول یعنی مختصر
صحیح مسلم سے یہ مختصر سنن ابی داؤد زیادہ عمدہ ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے
کہ سیوطی نے منذری کی اس المجتبیٰ کی شرح بنام زہر المرہبی علی المجتبیٰ لکھی ہے
واقم طور کہتا ہے کہ ہندوستان میں جو زہر المرہبی سنن فی کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے
اس کا بھی پورا نام زہر المرہبی علی المجتبیٰ ہے اور وہ بھی علامہ سیوطی ہی کی تصنیف
ہے۔ لہذا اگر صاحب کشف الظنون کو اشتباہ نہیں ہوا ہے تو یہ دونوں الگ کتابیں
سمجھنی چاہئیں واللہ اعلم۔ (۱) حواشی سنن ابی داؤد۔ (۵) المعجم۔ یہ کتاب دو
جلدوں میں ہے (۶) الترغیب والترہیب (۷) کتاب الخلافات وھذا ھب
السلف۔ اس کتاب کا ذکر خود منذری نے الترغیب والترہیب کے مقدمہ میں کیا ہے
حافظ ذہبی نے جو لکھا ہے کہ وصفت فی المذہب یعنی مذہب کے متعلق بھی ایک
کتاب لکھی ہے یہ غالباً اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے (۸) التکملة لوفیات النقلة
یہ حافظ ابو سلیمان محمد بن عبد اللہ کی کتاب وفيات النقلة کا تملکہ یا منجمہ ہے۔

لہ کشف الظنون ۲ ص ۳۵۵ علی البیہ وانیہ ذکرہ الخاطم ص ۳۳۲

صاحب کشف الظنون کہتے ہیں کہ میں اس کا مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیکھا ہے جو تین جلدوں میں تھا۔ سیوطی نے بغیۃ الوعاة کے مقدمہ میں جہاں اپنے تاخذ کی فہرست بیان کی ہے وہاں اس کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں: "تاریخ من دخل مصر للمسی بالکلمۃ لوفیات النقلة للمذری سیوطی نے بغیۃ الوعاة میں مختلف مقامات پر اس کا کئی ناموں سے حوالہ دیا ہے مثلاً ص ۱۳۷ پر محمد بن احمد بن عبداللہ اللخمی کے حالات میں لکھا ہے: "کذا ذکرہ المذری فی تاریخ من دخل مصر۔ اور ص ۲۰۷ پر محمد بن برکات السجیدی کے حالات میں ہے "المذری فی تاریخہ" اور صفحہ ۵ پر ابو عبد اللہ محمد بن علی السلمی الدمشقی کے حالات کے تحت اس کا نام "تاریخ مصر" ذکر کیا ہے۔ ہم نے یہاں پر یہ تنبیہ اس لیے ضروری سمجھی کہ مذری کی تصانیف میں اگر کہیں "تاریخ مصر" یا "تاریخ من دخل مصر" نظر آئے تو اس سے ان کی کوئی اور کتاب سمجھی جائے۔

(۹) ایک رسالہ (جزء) حدیث الطہور بشرط الایمان الخ کے طرق، احکام اور فوائد وغیرہ پر لکھا ہے جس کا ذکر خود حافظ منذری نے الترغیب والترہیب میں حدیث مذکورہ کے تحت کیا ہے۔

(۱۰) ایک رسالہ (جسے محدثین کی اصطلاح میں الجزء کہتے ہیں) حدیث ان من افضل ایا مکہ لیوم الجمعة الخ کے طرق پر لکھا ہے جس کا الترغیب میں اس حدیث کے تحت تذکرہ ہے۔

(۱۱) ایک رسالہ میں مصنف نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے جن میں مختلف اعمال پر غفرلہ ما تقدم من ذنبہ وما تأخر (اس کے کرنے والے کے اگلے

لہ کشف الظنون ص ۲۰۷ ببلد تقارن و نيات النقلة لہ بغیۃ الوعاة ص ۱۵۷ الترغیب والترہیب ص ۱۵۷ لہ الترغیب ص ۱۵۷۔

پچھلے تمام گناہ بخند یہ جائیں گے) کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس رسالہ کا ذکر کشف
الظنون میں جزء المنذری کے نام سے ہے اور علامہ عزیزی نے بھی السراج المنیر
شرح الجامع الصغير میں علمتی کے حوالہ سے حدیث من قراء اذا سلم
الامام يوم الجمعة قبل ان يثني رجله فاتحة الكتاب الخ کے تحت منذری
کے اس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔

(۱۲) ایک رسالہ میں حدیث من حفظ علی امتی اربعین حدیثا من امر دینہا الخ
کے طرق اور اس کی صحت و سقم کے متعلق اہل علم کی رائیں وغیرہ جمع کی ہیں۔ اس کا
تذکرہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے التلخیص المجید میں کیا ہے۔

(۱۳) تحمل اليوم والليلة اس کتاب میں رات دن کے معمولات، عبادات، اذکار
اور دعوات جمع کی ہیں۔ اس کتاب میں حافظ منذری نے کہا ہے کہ اس موضوع پر
اہل علم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بہترین کتاب امام ابو عبد الرحمن
النسائی (المتوفی ۳۳۰ھ) کی ہے اور اس سے بھی بہتر کتاب ان کے شاگرد حافظ
احمد بن محمد المعروف بابن السخی (المتوفی ۳۶۲ھ) کی ہے۔ نیز حافظ منذری لکھتے ہیں
وہر اجمع الکتب فی ہذا الفن لکنہا اس موضوع پر یہ کتاب سب سے زیادہ جامع ہے
مطلوۃ قال محمد فت ۲۱۵۸۵ نید لیکن طویل بیت ہے اور لوگوں کی ہمتیں بہت
ضعف ہمارا لطالبین۔ ہم گئیں اس لیے میں اس کی سب سے حذف کر دی۔

اس طرح گویا منذری کی یہ کتاب ان کی التزغیب والتزہیب کی طرح صرف
موتن حدیث پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا تذکرہ اور مصنف کے بیان سے کتاب کا

۱۔ السراج المنیر ج ۳ ص ۳۵۵ (مطبع مینہ مصر ۱۳۱۲ھ) ۲۔ مقدمہ لایع الدارای علی جامع
النجاری ۱۵۵ از استاد محترم مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ (طباعت ثنائیہ کھنوا ۱۳۱۳ھ)

یہ تعارف صاحب کشف الظنون نے نقل کیا ہے۔

(۱۴) ایک رسالہ میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جنہیں دعا کرتے وقت ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر ہے۔ اس رسالہ کا تذکرہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے شرح بخاری کتاب الدعوات کے باب رفع الایدی فی الدعاء کے تحت کیا ہے لکھتے ہیں: فان فیہ احادیث کثیرۃ افہام دھا اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں ہیں، حافظ منذری المنذری فی جزء ۱۵ نے ان کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔

(۱۵) الغوائد المشغریۃ مؤرخ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں عجی السنتہ حسین بن مسعود والفراء البغوی کے حالات میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا قلمی نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بغوی کا سن وفات ۲۵۸ھ لکھنے کے بعد ابن خلکان نے لکھا ہے کہ:-

ورایت فی کتاب الغوائد الشغریۃ اور میں نے الغوائد الشغریۃ جو حافظ
الشیخ جعفر الشیخ الحافظ زکی الدین زکی الدین عبد العظیم المنذری کی تالیف ہے
عبد العظیم المنذری اندہ لوفی سنتہ اس میں دیکھا ہے کہ بغوی کی وفات سن پانچ
ست عشرۃ وخمسائۃ ومن خطہ سولہ ہجری میں ہوئی ہے، اور یہ میں نے مصنف
نقلت ہذا۔ واللہ اعلم۔ کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے نقل کی ہے۔

(۱۶) کفایۃ التقویٰ وتحفۃ المؤمنین یہ رسالہ اعمال صالحہ کے اجر و ثواب کے موضوع پر ہے، اس کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے:-

کشف الظنون، حرف العین ج ۲ ص ۱۳۶ نے فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۲۳ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۴۱ راقم سطور کہتا ہے کہ صحیح سن وفات ۲۵۸ھ یہ ہے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۸ تذکرات الذہب ج ۴ ص ۲۲۸ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۶ وغیرہ میں ہے۔

دعوتِ یاقان ۲۱۰ یا احمد عبدالکرم میرے بھائی ابوالاحمد عبدالکرم نے مجھے سے خواہش
 سائنسی ۱۸۱۱ جیل کتا بانی ثواب ظاہر کی کہ میں اس کے لیے ایک سالہ اعمال کے
 ۱۸۱۱ اعمال و فضائل محمد و فضاائل کے موضوع پر لکھ دوں جس میں احادیث کی
 ۱۸۱۱ سائنس ٹیسٹل علیہ حفظہ۔ سبب صنف کر دی گئی ہوں تاکہ آسانی سے اے حفظ کیا جائے

یہ رسالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول نماز کے بیان میں۔ باب دوم
 روزہ کے بیان میں۔ باب سوم صدقہ (وزکوۃ) کے بیان میں اور باب چہارم ذکر و
 دعاء اور درود شریف کے بیان میں۔ یہ رسالہ ۳۴۶۶ میں المراسل المنیریۃ کے
 مجموعہ کے ساتھ ادارۃ المطابعۃ المنیریۃ مصر سے شائع ہو چکا ہے۔
 اب تک حافظ منذری کی یہ کل سولہ تصانیف معلوم ہو چکی ہیں۔ ولعل اللہ
 محدث لحد ذلک ۲۱۰ م۔

شعروادب عام قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص کی دل چسپی اور انہماک کسی ایک فن
 میں بڑھ جاتا ہے تو دیگر فنون خواہ وہ ان میں کتنی ہی مہارت رکھتا ہوں، دب کر
 رہ جاتے ہیں۔ حافظ منذری کے فقہ اور قرأت کے متعلق پہلے آچکا ہے اور یہی حال
 ان کے ادب اور دیگر علوم و فنون کا بھی ہوا۔ ان کے اشتغال بالحدیث نے ادب و فقہ
 تاریخ اور قرأت وغیرہ سب پر پردہ ڈال دیا۔ حافظ ذہبی اور دوسرے سوانح
 نگاروں نے ان کے متعلق ادب اور علوم عربیہ میں مہارت کا بھی ذکر کیا ہے
 علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں لکھا ہے :-

لے الرسائل المنیریۃ ج ۳ ص ۳۵۵ علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں
 کہاں مصر کے مفتی شافعی کا ذکر کیا ہے، ان میں حافظ زکی الدین منذری کا بھی ذکر
 کیا ہے (حسن المحاضرہ - ج ۱ ص ۱۴۷)

کان اماما حجة بادعا فی الفقه
والحر بیة والقراآت^۱
آپ فقہ عربیہ اور قرآن کے فنون میں بھی
امام کامل اور سند تھے۔

ابن شہبہ نے لکھا ہے :-

برع فی الحر بیة والفقه^۲
یعنی آپ فقہ اور عربیت میں بھی کمال حاصل تھا۔

علامہ سیوطی نے صوفیاء مصر کے بیان میں الامام الفقیہ الصوفی حسن بن عبد الرحیم
القنائی کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ حافظ منذری نے ان کے بہت سے اشعار
بھی روایت کیے ہیں اور ان کی دعاؤں کے برکات بھی حاصل کیے ہیں۔

علامہ تاج الدین سبکی نے حافظ منذری کے اشعار میں سے صرف یہ دو شعر
بطور نمونہ نقل کیے ہیں :-

اعل لنفسی وصالحا لا تحتفل
بظہور قیل فی الانام وقال

فاخلق لا یرجى اجتماع قلوبهم
لا بد من مثن علیہ وقالی

ترجمہ ماہر (۱) اپنی ذات کے لیے نیکیاں کرتے رہو اور لوگوں کی قیل و قال (کہنے سننے)
کی کچھ پروا نہ کرو۔

(۲) اس لیے کہ لوگوں سے اس بات کی کوئی توقع نہیں ہے کہ ان کے دل کسی ایک بتا
پر مجتمع ہو جائیں گے (اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو) ضروری ہے کہ کچھ تباہی و تفریق کریں اور کچھ
کلمہ چینیاں کریں۔ یعنی بقول غالب :-

غالب برانہ مانئے گر بُرا کوئی کہے
تقویٰ و پرہیزگاری | حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ کو خدا نے تعالیٰ نے ظاہری

۱۔ حسن الحامزة السیر علی ح۱ ص ۱۲۹ شذرات الذهب ج ۵ ص ۲۳۰

۲۔ حسن الحامزة ج ۱ ص ۲۲۰

علوم میں پوری عبادت کے ساتھ ساتھ باطن کی روشنی سے بھی بھر پور حصہ عطا فرمایا تھا۔ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے زہد و تقویٰ کا بہت اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کان ذالک و تزہد یعنی عبادت گزار اور زاہد آدمی تھے۔ تاج الدین سبکی نے ان الفاظ کیساتھ انکے حالات لکھنا شروع کیے ہیں:-
 الحافظ الکبیر الورع الزاہد یعنی بڑے حافظ، پرہیزگار اور زاہد....
 آگے لکھتے ہیں ترحی الرحمة بذکرہ ویستندل رضی الرحمن مدعاہ عن رحمہ اللہ تعالیٰ قد اوتی بالکمیل الاوفی من الورع والتقوی۔
 یعنی ان کے تذکرے سے رحمت الہی کے نزول کی امید کی جاتی ہے۔ اور ان کی دعا کے ذریعہ خدا کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔ آپ کو تقویٰ پر پرہیزگاری سے بھر پور حصہ ملا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں داماورعہ فاشہر من ان یحکی۔
 یعنی ان کی پرہیزگاری کسی تعارف کی محتاج نہیں! ہم گزشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں مجدد عصر حافظ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ مندری کی دیانت و تقویٰ کے معترف تھے۔ حافظ دہیا طلی نے زکی الدین مندری کی پرہیزگاری اور اصیاط کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار حافظ غزری حمام سے نکلے تو گرمی کی شدت سے چل نہ سکے اور بے بس ہو کر راستہ کے کنارے ایک دکان کے قریب لیٹ گئے۔ حافظ دہیا طلی کہتے ہیں کہ دکان بند تھی۔ میں نے عرض کیا کہ محترم المقام آپ کو (بجائے نیچے زمین پر لیٹنے کے) اس دکان کے چوڑے پر بیٹھا دیتا ہوں، تو حافظ مندری نے اس شدت کی کمزوری اور غشی کے عالم

لہ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۳۱ - ۲۳۲ طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۵ ص ۱۰

۲۳۱ - ۲۳۲ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۰ -

ہم گفتگو کرتے ہوئے اس کے ایک راوی خالد بن عمر والقرشی الاموی السعیدی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ متروک و مستہم ہے اور میں نے کوئی اس کی توثیق کرنے والا نہیں پایا اور جن بعض مشائخ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فیدہ بعد و یعنی یہ بات بعید ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا لزوم بصیرت انہیں کچھ اور سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

لکن علیٰ هذا الحدیث لا محذور من
۱ الخوارزمیۃ ولا یمنع کون راوی
ضعیفا ان یکون ۲ النبی صلی اللہ
علیہ وسلم لیس قالہ
لیکن اس حدیث پر انوار نبوت کی شاہین
محسوس ہو رہی ہیں اور راوی کے کمزور ہونے
سے یہ بات ضروری نہیں ہو جاتی کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی یا نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ راوی کے کمزور ہونے سے تو صرف اتنا معلوم ہو گیا کہ اس حدیث کے علم تک پہنچنے کا واسطہ کمزور ہے لیکن یہ بات کہ زبان نبوت سے واقعہ یہ الفاظ نکلے تھے یا نہیں؟ بالکل الگ چیز ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ایک دوسری سند سے اس کی متابعت و تائید کی ہے۔ لیکن ہمیں تو اس جگہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس حدیث کی تائید و توثیق کا اصل محرک درحقیقت وہی سخن شناس فوراً باطن ہے جس نے اس میں ان کو نبوت کی جھلک دکھائی ہے ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

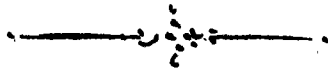
حافظ منذری کے اسی زائدانہ مزاج کا اثر ہے کہ انہوں نے الترغیب والترہیب کے اندر صرف ایک باب باب الترغیب فی اللہ ھد فی الدنیا والاکتفاء منها بالقلیل کے تحت ایک سو ستر و اسیس حج کی ہر جگہ

اس کے علاوہ پوری کتاب میں کسی باب کے اندر بھی اتنی روایات نہیں ہیں۔ ان روایات میں آپ نے مرفوع احادیث بھی لکھی ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے آثار و معمولات بھی نقل کیے ہیں اور اس کے بعد بھی سیری نہیں ہوئی۔ چنانچہ لکھا ہے :-

دلو بسطنا الکلام علی سیرۃ الخلف وزهدهم لکان من ذلک مجلدات کمنہ لیس من شرط کتابنا ۲۰ ملینا ہذا ۲۰ المیزۃ استظراد ۲ تبرکاً
اور اگر ہم اسلاف کی سیرت تفصیل سے بیان کریں تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں لیکن یہ بات ہماری کتاب کی شرائط کے موافق نہیں ہے۔ ہم نے تو یہ کچھ تھوڑا سا حصہ ضمنی طور پر بغرض تبرک لکھوا دیا ہے۔

مذکر ہم

وفات | علوم شریعت اور احادیث نبوت کا یہ آفتاب فقہ تاتار کے سال حبار ذیقعد سن چھ سو چھپن ہجری (۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۹ء) کو غروب ہو گیا اور مصر میں کوہ منقظم کے دامن میں تدفین ہوئی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔



۱۔ الترغیب ج ۴ ص ۲۲۶ و ۲۲۷ - ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۲۷ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۹۱، مقدمۃ الترغیب للمصنف، حسن المحامزہ ج ۱ ص ۱۲۹، شذرات الذهب ج ۵ ص ۲۴۵، البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۲۱۲ نوٹ :- ہم نے جہاں کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے وہاں انہیں کتابوں سے ماخوذ سمجھئے اور ان کے علاوہ ہم نے مصنف کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان کا کتاب الترغیب والترہیب سے بھی مدد لی ہے۔

عہدِ تانا شاہ کا ایک گمنام شاعر

۱۰۹۶ھ مطابق ۱۶۸۵ء

از جناب ڈاکٹر نورا السعید اختر بمبئی

عروس البلاد بمبئی اپنی گونا گوں صفات کی بنا پر رنگِ جواں بنی ہوئی ہے
 صن کی رعنائیاں صبح کی قیامت خیزیاں اور شام کی رنگینیاں یہاں کی از حد
 مصروفیت زندگی کو قدرے سکون پہنچاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس عروسِ نو کے
 گہوارے میں علوم و فنون کی پرورش بھی ہوتی رہی ہے۔ اور آج بھی علم و فن کے
 پروانے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں جامعہ
 بمبئی کی خدمات قابلِ تائس ہیں۔ محققین کے لیے جامعہ بمبئی کا کتب خانہ آبِ حیاں
 سے کم نہیں ہے۔ اس کی وسیع و عریض عمارت نہایت پرکشش ہے اس میں نادر و
 نایاب قلمی محفوظات کی بہتات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں قدیم اردو کے
 نوادرات اور محفوظات زیادہ نہیں ہیں البتہ چند محفوظے ایسے ہیں جو انتیازی حیثیت
 رکھتے ہیں۔ ان میں ملا وجہی کی تاج الحقائق، وجدی کی ”پنجی با جہا“ اور محمد ری
 کی ”لوک اور مینا“ قابلِ ذکر ہیں۔ ذیل کی سطور میں ایک بیاض نام محفوظے کا
 تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں عہدِ تانا شاہ کے ایک گمنام شاعر کا علی نام
 بھی موجود ہے۔

مجموعہ مثنویات :- اس مجموعہ میں چھ محفوظے ملے ہیں۔ عبدالقادر سرفراز صاحب
 کی مرتب کردہ فہرستِ محفوظات میں اس کا سلسلہ نمبر ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱ ہے

مجموعہ کاکینلاگ نمبر ۳۱ اور فہرست میں ان مخطوطات پر سرسری معلومات صفحہ ۱۱۷ پر درج ہے۔ اس مضمون میں پہلے تین مخطوطات ہی کا تعارف ہے۔ بقیہ مخطوطات کا تفصیلی تعارف آئندہ مضمون میں کیا جائے گا۔

(۱) مخطوط نمبر ۴۲ :- معراج نامہ :- قدیم اردو میں معراج نامے بہت ملتے ہیں۔ یہ مخطوط بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کا ذکر ہے۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے :-

الہی توں قادر ہے سنار کا	تو آدھار ہے سب زدھار کا
رحماں توں حاکم ہے صاحب سچا	توں ایک امر کے بیچ سب جگ رچا
کیا سات آسان یک مثل منے	سوا ذوق جس سات تجربہ دل منے
سوچو ڈا طبق توں کیا ذوق سوں	دیارنگ ہمدرد توں شوق سوں
احد میانی اول جو توں ایک تھا	نہ تھا کس کوں معلوم کیا بھید تھا

اس کے بعد اسماعیل محمدی کا تفصیلی بیان ہے اور خلفائے راشدین کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ معراج کے بیان میں شاعر کا زور بیان ملاحظہ ہو۔

سہیلے شہنشاہ یوگانے لگے	کتک جنس بابے بجانے لگے
سوچو تہی فلک پرچے جوں نسا	کمر باند حاضر سما آفتاب

تراؤں اگر ملیا نور میں	ندی حیوں ملے جا کو شہنشاہ میں
ندی کا کہنا ناؤں سمندر و ہوا	تیرا نور میرا ملک و ملک نور ہوا

لے سماعت لے چڑھے لے جا کر سمندر لے کہاں لے لاکر۔

کنک بات ظاہر کر د کر کہا کنک بات مخفی رکھ کر کہا

معراج کے بعد جبریل علیہ السلام حضور سے مخاطب ہیں :-

نبی نے سوسر سہویں دہرے سوڑ چلے کنک دور پر جبریل آئے
کہے تم دو گانہ کرو آج کا شکر تم بجلاؤ معراج کا

آئندہ اشعار میں شاعر کہتا ہے ۱۰

اوی ٹھار دیکھے اونٹن کا قطار بجز حق نہ ستا کیسے وان شمار

یو آتے کدھر سوں سو جاتے کدھر نہ تھا کس کو معلوم کیا ہے اوپر

حکم یوں سوا بیلا اونٹ کوں دیکھا کھول صندوق نبی پاس توں

کسی یہودی نے واقعہ معراج پر شبہ ظاہر کیا اس امر کی وضاحت یہ

اشعار ملاحظہ ہوں ۱۱

یونستے اوٹھیا بول یک نابکار کہا یک یہود سوں کہ اٹھ جائیں بھار

بچھانا گرم تھا سو کیا کون تھے سراسر جھوٹی بات لگتی منجے

یہودی کہا نقل مشہور ہے مولس سوا تھا سو منشور ہے

نبی کی زباں کو جھوٹی کے کیا سو یک ساٹھ میں ساٹھ پکڑے مینا

معراج نامے کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے ۱۲

بنیاں کا تجھ شاہ حق نے دیا ولایت نبوت ازل سے دیا

اوسے سو پنج برحق رچا مہر دیا منجے عاجز کوں سلطان اعظم کیا

رجب کی چھبیسویں یونامہ تمام بحق محمد علیہ السلام

لے کتنی لے میٹا لے پھر لے بستر لے کہوں لے کہا لے ساتھ لے لے

عبدالقادر سر فراز صاحب مرتبہ فہرست مخطوطات نے اس سراج نامے کے مصنف اس کے نام یا تخلص کی صراحت نہیں کی۔ دکن میں عاجز تخلص کرنے والے چند شاعر ہیں لیکن یہ عاجز اُن سے بالکل مختلف ہیں، راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان کا نام اعظم تھا اور وہ عاجز تخلص کرتے تھے۔ اختتامیہ اشعار ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

مخطوط کے کل صفحات گیارہ ہیں اور ہر صفحہ ۳ اسطری ہے، کل اشعار کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ کاتب کا نام غیاث خط نستعلیق ہے اور سنہ کتابت اس طرح درج ہے۔

”تمت الکتاب یازدہم در شوال المکرم ۱۱۸۶ھ روز پنج شنبہ

در بندر میلپور در پاس اول باتام رسید۔

عیوی سن کے اعتبار سے یہ مخطوطہ حیرات ۱۱۸۶ھ یعنی

۱۵ اربسمبر ۱۷۷۱ء عیوی میں بندرگاہ میلپور میں غیاث نامی کاتب نے نقل کیا۔

وجود نامہ ڈاکٹر سید فی الدین قادری زور نے اس نظم کا نام ”روح اور تن کا مخطوطہ (نمبر ۱)“ مکالمہ بتایا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سر فراز نے اس نظم کو

”وجود نامہ“ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال زیادہ درست ہے، البتہ یہ یقینی

طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نظم شیخ محمود خوش دہاں ہی کی ہے۔ شیخ محمود خوش دہاں

کی ایک نظم اور رسالہ بنام ”واجب الوجود“ بھی ملتا ہے۔ دراصل اس نظم میں

ایسی کوئی اندرونی شہادت نہیں ہے۔ جس کی بنا پر ہم اس نظم کو شیخ محمود خوش دہاں کی تسلیم کریں۔ لیکن ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے شیخ محمود نامی شاعر کی کئی چھوٹی چھوٹی نظموں کا تفاوت لکھنا جن میں پیش کیا ہے ان کا خیال ہے یہ نظمیں شیخ محمود خوش دہاں ہی کی ہر سکتی ہیں۔ کیوں کہ ان نظموں کے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ موصوفہ نے روح اور تن کے مکالمے کو بھی شیخ محمود خوش دہاں کی نظموں میں غیر یقینی طور پر شمار کیا ہے۔ ملاحظہ کے لئے مکمل نظم پیش کی جا رہی ہے۔

سوال

- ۱۔ اس حکم تے پاک پروردگار ۱ وجود سہر جیوں کوں ملا ایک ٹھار
- ۲۔ کہ بھیجا تھا دنیا میں تیری برات ۲ بولانے کا وعدہ کیا اس سنگات
- ۳۔ لکھیا تھا جو قسمت میں اوسکے جیتے ۳ دیکھیا کھول باقی رہا میں رتے
- ۴۔ اویں ساتا نکوں جو بھیجا طلب ۴ دو نو میانے بچھرا پڑیا تھا قلب
- ۵۔ یکسوں ملاتا ہے یک مانگ میں ۵ یکسوں ملاتا ہے بس خاک میں
- ۶۔ وجود سہر جیوں میں لگی گفتگو ۶ خوبی کان دہر کر سنو بار ہو
- ۷۔ وجود نے کہا یونکہ سن اے جیا ۷ یی دین (دن) مل کروں منج میں رہا
- ۸۔ کیا زندگانی توں منجسات مل ۸ منجے چھوڑ تنہا نجب ٹیک تل
- ۹۔ سہارے تھارے میں اتنا سلوک ۹ دونوں کو بچرتے تھے ملکی ملوک
- ۱۰۔ محبت مروت بیت جور کر ۱۰ نکو جبارے تنہا منجے چھوڑ کر
- ۱۱۔ ہمیں دونوں چلتے تھے ایکچہ طریق ۱۱ درد سہر دکھ میں اتے بور فیق
- ۱۲۔ تیرے نگ سوں سبے تھے سکی دکھی ۱۲ بیغرض تیری اور منجے کیا لگی

متاع تویتا کچھ ملا کر رکھتے ۱۳ دو نو میا نے یک کوں لجانا سکے
 چلیا جو منجہ سوں تو یوں رو کر ۱۴ اسے سات لیونگی لوٹ کر
 بیہ تجربن جو منجکوں سو عزت نتھی ۱۵ گہری (گھڑی) ایک (ایک) تجربا جت لڑتی
 جو کوئی آ کو دیکھے سو کہتے ہیں یوں ۱۶ بتا وقت اس کوں رکھے میں سو کیوں؟
 اتہا میں ہمیشہ تیری بات میں ۱۷ جتا حکم تھاسب تیرے بات میں
 ترے حکم سوں میں یو فارغ نتھا ۱۸ اتا توں تو جانا منجے کیا کتا
 (جواب)

دیا جواب جوئے کہ سن اے حیا ۱۹ تہی دن جو ملکر تو منجیں رہیا
 اصل میں توہوں میں خدا کا امر ۲۰ رہوں گا تو جب لگ جو تیری عمر
 کیا تھا الہی جو تیری دنیا ل ۲۱ کیا تھا جو منجکوں توں اسکوں سنھال
 زے ساتھ تھا میں سوا درات دن ۲۲ میرے ہر مشقت پڑ رہتی سنگن
 تیری قد و قامت کے رنگ ہر شکل ۲۳ کہ دنیا میں ظاہر اے یو نقل
 تجھ میں چرایا (چڑھایا) تھا اونچی صد ۲۴ نہیں کوئی سمجھیا توں میری قدر
 ترے سوں توں کچھ بنایا تھا ۲۵ دیکھیا سوں ترے سات میں یہی جفا
 میں محنت مشقت سوں کاڑا کیا ۲۶ تری قوت کاسب پو چار کیا
 اتاہیں ہے منج کوں میرا نگ یو ۲۷ نیرے نگ سوں میں چلیدنگ ہو
 ترے سات منجہ پر یو قصہ گھریا (گھڑیا) ۲۸ از جواب دینا سو مشکل پڑیا

کہے شیخ محمود سن اے اصل
 قیامت میں پوچھیا گا دونوں کوں میل

اس نظم کو کبھی غیاث تانی کاتب نے **حاشیہ** مطابق **۱۱۷۸** میں بئذرا گاہ

میل پور (مدرا س) میں نقل کیا ہے۔

علی نامہ از آدم منصور { قدیم اردو میں کئی علی نامے موجود ہیں۔ نصر قی کے علی نامے
گو گندوی مخطوطہ نمبر ۱۴ } کو خاص شہرت حاصل ہے۔ زیر نظر علی نامہ حالاں کہ
کسی فارسی قصے کا ما حاصل ہے لیکن جذباتوں کی بنا پر سہاری خاص توجہ کا حامل
ہے۔ قدیم اردو کی تاریخوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابوالحسن قطب شاہ

کے عہد میں (۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۷۲ء) فاکر، نوری، لطیف، شاہی، مرزا
غلام علی وغیرہ جیسے باکمال شاعر موجود تھے۔ افسوس ہے کہ تمام تذکرے اور
تاریخیں آدم منصور کے ذکر سے خالی ہیں۔ راقم الحروف کی تحقیق کے بموجب آدم

منصور کا نام اس فہرست میں شامل کرنا ضروری ہے یہ اور بات ہے کہ ہمیں آدم
منصور کے حالات زندگی کا پوری طرح علم نہیں ہے لیکن علی نامہ کے اختتامیہ
اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی سلطنت کا آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ
آدم منصور کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے آدم کو منصور کے لقب سے نوازا تھا۔ آدم
اپنے متعلق انکاری سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ وہ شاعر ہے اور نہ ہی شاعری
اس کا شعار ہے۔ البتہ یہ مثنوی اس کے اثنا عشری ہونے کی بین دلیل ہے۔

نہ شاعر ہوں میں نہ شاعر شاعری نہ منعم ہوں میں نہ زنا سامری

اپن طبع کے جھاڑ کے خیال کوں بہر حال الایا ہوں میں بار کوں

یہ علی نامہ ۳۵۰ ابیات پر مشتمل ہے اور اس کو دیکھ کر آدم منصور کی

قادرا لکھائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ واضح امر ہے کہ آدم نے ایک فارسی قصے کو کھنی

جامہ پہنایا ہے لیکن اس نے اپنی فنکاری سے قدیم اردو کی اس نظم کو کافی موثر

بنادیا ہے۔ آج سے تین سو سال قبل آدم منصور کی یہ کوشش لائق تحسین آفرین

اس مثنوی کی زباں صاف شستہ اور سلیس ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری رسائی اصل قصہ تک نہ ہو پائی۔ ورنہ دونوں کا مقابلہ پیش کیا جاسکتا تھا۔ تب بھی ادبی نقطہ نظر سے یہ مثنوی اہم مقام رکھتی ہے۔ اس علی نامہ کو جنگ نامہ علی یا جنتی بعد بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر عبدالقادر سرفراز

THE MASANAVI DEALS WITH ALIS COMBATS
WITH THE JINNE DWELLING AT THE BOTTOM
OF THE WELL CALLED بِرِ الْعِلْمِ IN ARABIA
(DESCRIPTION CATALOGUE OF ARABIC PERSIAN
AND URDU BY S.A. KADIR SARFARAZ B.U.P (117)

علی نامہ کی ابتدا روایتی انداز میں حمد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:-
۱۔ اول میں کروں لبم اللہ کا بیاں کیا ہے الہی یاں سب عیاں
۲۔ کہ رحمان روزے دہندہ ہے آپ جہانگ ہے ہندو مسلمان سب
۳۔ رحیم اور جو بخشنده آخر کا سب جہانگ ہے مومن مسلمان سب
۴۔ جو کھولوں زباں میں بنام خدا محمد علیؐ سہر امیر الہدا
۵۔ وہی دستگیر سہر وہی رہنما وہی بادشاہ ہے زمین و زمان
۶۔ گراے گر سنگتا ہے پائے نجات بغیر از علیؑ کا صفت کرنے بات
اس کے بعد نعتیہ اشعار ہیں اور پھر مثنوی کے اصل مآخذ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۷۔ اتفاقاً اصل میں نظم یو فارسی سو کھولے اس کے معنی کیا آرسی
۸۔ یہ یو اصل جھگڑا ہے بیر العلم جو روشن کیا جگ نہیں شر کا علم
۹۔ کتابوں اور جھگڑا انا کھول کر سنو خوب سمجھو نہیں کان دھر

حضرت علی کی شجاعت کی یہ داستان یوں شروع ہوتی ہے کہ ہے ایک مرتبہ حضور صلعم لشکر با صفا کے ہمراہ ایسے جنگل میں جا پہنچے جہاں پانی نہیں تھا رسول اکرم نے ساقی کو ٹر حضرت علی مرتضیٰ کو حکم دیا کہ دلدل پر سوار ہو کر پانی کی تلاش میں جاؤ۔ حضرت علی رضی عنہ نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ کچھ دور جانے پر انھیں ایک "تل" (میاں) نظر آیا، جہاں پر ایک کافرت پرستی میں مشغول تھا۔ حضرت علی رضی عنہ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو انھیں غصہ آ گیا۔ انھوں نے اس ڈیرہ دو سو سالہ بوڑھے کو دعوتِ حق دی۔ بوڑھے نے فوراً ایک شرط رکھی کہ اگر اس کی ہمسایہ بڑھیا دعوتِ حق قبول کرتی ہے تو وہ فوراً اسلام قبول کر لے گا۔ حضرت اس بڑھیا کو نبی کریم کے پاس لے گئے، حضور پر نور بڑھیا سے مخاطب ہوئے۔ بڑھیا نے بھی قبولِ اسلام کے لیے یہ شرط لگا دی کہ اس کی رہائش گاہ کے قریب ایک خوفناک جنگل ہے جس میں ایک بڑا سا کھنواں ہے۔ یہ جنگل شیروں اور اژدہوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو کوئی اس جنگل میں جاتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ لہذا جو بھی اس جنگل سے فحیاب ہو کر آئیگا وہ فوراً اسلام قبول کر لے گی۔ اب آدم کی زبانی داستانِ سینے پر

۱۰ لے سنگات لشکر کے تین مصطفیٰ ۱۱ چلے ایک جنگل میں با صفا
 نہ تھا میر کبریاں جنگل میں تمام ۱۱ قضا را نبی آ رہے اُس مقام
 دیکھا اس جنگل میں تو پانی نہیں ۱۲ رہے دھند دھند کر لپٹیاں میں
 محمد کہے یوں علی کوں ولی ۱۳ تو ساقی کو ٹر ہے روزِ حبلی
 چڑھو دلدل اُپر دھند دجاں تھاں ۱۴ جو پیدا کر دیر کوں تم یہاں

تک کہ (۹) نظر علی پر تھی ناگہاں ہر خوش حال علی پہر کو آئے وہاں

۱۵ دھونڈ دھونڈ ۱۵ چڑھو ۱۵ گھوم کر

جو آدیکھتے ہیں تو اس کھٹا پر تھے خالی گھراں ہونے کوئی بشر
تفکر سیتی پڑ کر سب دیکھے سوک پر مرد وہاں پائے
وے ادا تھا کافر بت پرست ۱۵ بے کو پرستا القاب پرست

.....

سنیا سو بڑھا ادا تھا بول کر ۱۶ سوا پنا قصہ سب کہا کھول کر
کیا کہوں قصہ اپن حال کا ۱۷ بدھا سہوں میں کیوں چلا سال کا
منجے ٹیک عورت ہے ہمایہ گی ۱۸ اسے سب خبر ہے متن دین کی
گراو آئیں گی دیں میں مصطفیٰ ۱۹ اوسی وقت پر میں مسلمان ہوا

.....

اس عورت کے نہیں مصطفیٰ ایو کہے ۲۰ یوے دیں سوا دجنت میں رہے
کہی سچ مسلمان ہونے سکی ۲۱ وے ٹیک حاجت سوں میں ہوں دوکھی
اس جنگل نے باں یک بٹھا رہے ۲۲ سودان شیر اور اژدہا مار رہے
اس جنگل نے کوئی جاتا نہیں ۲۳ گیا توادی بر کو آتا نہیں
اگر جا کر اس بان میں سوں جکوی ۲۴ لگائے تیر قومیں مسلمان ہوئی
عورت کا تفصیلی بیان سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روئے مبارک
اصحاب کی طرف پھیرا اور گویا ہوئے اس وقت تم سے کون جواں ہمتی کی داد
طلب کرنا پسند کرے گا؟ مالک اشترؒ نے شجاعت کے اس پیغام کو لبیک کہا۔
اور اجازت چاہی۔ وہ اس جنگل کی طرف بڑے جس میں ہر طرف خود و خوف
رہا تھا۔ دراصل یہ جنگل رعد جتی کی ملک تھا۔ وہ قوم جنات کا سردار تھا

لے گھوم کر لے بڑھا لے کنواں لے جنگل

اور لات وغری کی یہ پرستش کرتا تھا۔ اس وقت تک قوم جنات مشرق بہ اسلام نہیں پہنچی تھی۔ لہذا جنوں کے باعث انسانوں کو بے پناہ تکلیف تھی۔ عدجنی کے پاس بڑے نامی گرامی پہلوان شیرانگن باہی اور نامور ساحر موجود تھے۔ عدجنی خود بھی آزمودہ کار صفت شکن اور مشہور جادوگر تھا۔ صحابہ کرام اور دیگر افراد جب قوم جنات پر قابو نہ پاسکے تو حضور پر نور نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عدجنی کے مقابلے میں بھیجا۔ ایک طرف نولاکھ جنات کی فوج تھی اور دوسری طرف تنہا حضرت علی اور ان کی ذوالفقار۔ حضرت علی نے اسم اعظم کے ذریعے عدجنی کے سحر کو باطل کر دیا اور ذوالفقار کے ذریعے آدمی قوم جنات تہ تیغ کر دی۔ حتیٰ کہ عدجنی کا اکلوتا پہلوان بیٹا "راہیل" حلقہ گبون اسلام ہو گیا۔ بالآخر خود عدجنی میدانِ جگ میں اتر آیا لیکن علی مرتضیٰ کے سامنے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ وہ مارا گیا اور بقیہ قوم جنات نے اسلام قبول کر لیا۔

سویے بات سن کر نبی مصطفیٰ ۲۵ پہر رونا اصحاب کے ادھر صفا
کہے کون ایسا جوان بخت ہے ۲۶ شجاعت دیکھانا سویے وقت ہے

.....

ترنگ پر تے مالک جوارے تلار ۲۷ اٹھا غلغلہ بایں میں یک بار
جوا داز آبیوں اس غار سوں ۲۸ کیے نہاٹے جاؤ تم اسٹار سوں
کہے مالک اشتر سویار انکے تئیں ۲۹ کہ کوئی جو اس میں اتارے دئیں
جولائے گاجر کوئی اس بایں کا ۳۰ سجا پوت اچھے گا دئی مایں کا

جو ہے حکم رب کا علی کے اُپر ۳۱ کرو جا کو جتا کو سارے کمر

.....
علی کا قدم بائیں میں جیوں پڑیا ۳۲ سوا دس بائیں میں لاجالا پڑیا

.....
اتھا فرزند رعد کو سہجواں ۳۳ سو کھا صورت خوب ہو مہرباں
کہ تھا او پر ہی زادہ ہو رھلی نام ۳۴ اتھا اُس نے سیرت تمام
مبارعدویں اپنے فرزند کوں ۳۵ مری جان سہرمانی دل بند توں
اگر سچ تو فرزند میرا ہے ۳۶ مکر باند توں شہر تیرا ہے

.....
راہیل جب بغرض جنگ حیدر کرار کے سامنے پہنچی تو انھیں اس کی
خوفناک صورت پر ترس آیا اور انھوں نے سوال کیا۔

کیوں آیا تو اس تجھ نے بے زیاں ۳۷ نکلیں بات ہے نکلیں زوہاں
راہیل نے جواب دیا ہے

رعد باپ میرا پر ہی مائی تھا ہے ۳۸ سو پریاں کے راجا کی اوجا جاتی ہے
میرا نام سو حیل جگی ۱ ہے ۳۹ مرے ہاتھ شمشیر تنگی ۱ ہے
راہیل حیدر کرار کے حملے کی تاب نہیں لاسکا اور حضرت کی
دعوت اسلام صدقِ دل سے قبول کر لیتا ہے ۵

کیا یوں کہ لے شاہ بخشو منجے ۴۰ کہے کہ جو کلیمہ جو بخشوں تجھے
جگی ہو مسلمان جو ہر دو جہاں ۴۱ ہوئے مرغ اچھے شادماں

۱۔ راحل مسلمان ہو گیا۔ رعد جتنی کھانک اور کاری ضرب لگی وہ غصہ سے
آگ گبولہ ہو گیا اور واویلا کرنے لگا۔

دیکھا رعد جو اپنے بیٹے کو یوں ۱۲ لگیا بولنے مار سینے کو یوں
سوریش آپنا لوتچہ لینے لگیا ۱۳ جو لہو آنجو پونچہ لینے لگیا
کہا ہائے ہائے دیکھو کیوں ہوا ۱۴ کہ بیٹا مرا جا مسلمان ہوا
رعد جتنی کے نواکھو سہا ہیوں نے شیر خدا اور راحل کو گھیر لیا اور
تیروں وغیرہ کی بوجھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان پناہ
مانگنے لگے۔

لگے مارنے گرزیر و تنگ ۱۵ جو باناں رنگ ریزی (۹) ہوسنگ
جو یوں دیکھ ہو گھابرا آساں ۱۶ میں ستر ستر اکراکھی کرغاں
علی مرتضیٰ نے اسم اعظم اور ذوالفقار کی مدد سے رعد جتنی کی نواکھ
فوج کو مسل کر رکھ دیا۔

جو لشکر کوں جا کر گئے زن کھنڈ ۱۷ گئے نہاٹ سارے پلیدائے دل
بالآخر رعد جتنی بھی مقابلے پر اُتر آیا اور انجام کار رعد جتنی کی عبرتناک
موت ہوئی۔ حضرت علی نے راحل کو رعد کی حکومت سو پ دی اور کلمہ طیبہ
کے عیوض سارے جنات کو بھی بخش دیا۔ حضرت علیؑ اس غار اور جنگل سے
بجھر و فوجی لوٹ آئے۔ اس ضعیف شخص اور ضعیف نے سارا ماجرا بہ چشم خود
دیکھا اور مسلمان ہو گئے۔

دیکھ یوں بڑا ہو بڑی میں بھر ۱۸ اپن دوستاں سوکھے کھول کر

سودھر صدق شہ پرایاں لائے ۴۹ قوں کفر کی راہ اددین پائے
مشنوی کے آخری اشعار میں بھی اس کے فارسی ماخذ اور سنہ تصنیف پر
روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ابوالحسن تانا شاہ
کے آخری ایام سلطنت میں لکھی گئی۔ کیوں کہ اسی سنہ میں اورنگ زیب عالمگیر نے
گوکنڈہ پر فتح پائی اور قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعر نے اپنے نام
اور لقب کی صراحت بھی انھیں اشعار میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو ۵۰

یوسفہ اتھا فارسی ہوں اول ۵۰ جو معنی بکٹ ہو اور اوکل کبسل
خدا ہو محمد علی کا لے نام ۵۱ کیا فارسی کوں سودھ کنی تمام
سہرے خام تیوں ساک عالم کے تئیں ۵۲ ہر حال بیتے گیا اسکوں میں
نہ شاعر ہوں میں ہو نہ شاعری ۵۳ نہ سہم ہوں میں ہو نہ سامری
اپن طبع کے جھاڑ کے خیال کوں ۵۴ بھر حال لایا سوں میں بار کوں
کہ خوب ہے ہو رکیں خام ہے ۵۵ تن عارفاں کا ج انجام ہے
کہ ہجرت کے بعد از سنہ سال پر ۵۶ ہزار و دودھو شش سال پر
(سنہ ۱۰۹۶ مطابق جولائی اگست ۱۶۸۵ء)

کہ ماہ مبارک ہو در رمضان تھا ۵۷ امت کوں محمد کی ہواں تھا
جو اس ہینے یو مرتب کیا ۵۸ گراو اپنے ہینے سے آگہ کیا
اتھا اس وقت ابوالحسن بادشاہ ۵۹ خلق اسکوں بولے حسن قطب شاہ
کہ لہوں کے زمانے منے یو کیا ۶۰ تن عاشقاں سین دعا منگ لیا
لقب دے کتے منج کوں مضور کر ۶۱ ولے نام میرا ہے آدم ککر

سنہ کتابت ب۔ فی التاریخ تحریر ۲۲ شہر شوال ۱۱۸۸ھ (۲۶ دسمبر ۱۷۷۴ء) روزے در شنبہ

دواؤل پاس در بندر میلان پور (دراں) کاتب غیاث - ۵۵۵۵

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک جائزہ

از جناب محمد شعیب صاحب عمری منگلور

(۲)

(۱) مولانا آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت طبع نگاری ہے۔ اس صنف میں انھیں غیر معمولی ہلکے حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے کمالِ نگارش سے اس طرز میں ایک عجیب و غریب دریا بہا نشان پیدا کی اور اس کے دامن کو گہرائی سے بھر دیا۔ ان کی طنز نگاری ایک طرف حسین و دلکش الفاظ نادر اور بدیع تھے، دھماکا و درخشاں تشبیہات لطیف اور زنداں استعارات اور دل ربور و اشارات و کنایات کی جلوہ گاہ ہوتی ہے۔ خود دوسری طرف اس میں اس غضب کا اثر و نفوذ ہوتا ہے کہ وہ آہ و احوال میں مانع کی فوج کو چھو کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ نیز مولانا کے اس رنگین، باوقار و مہذب و شستہ و سنگھڑ نگارش کے ایک ایک لفظ میں تیر و شتر خمی ہوئے ہیں، وہ خبر کی نوک اور طور کی دھار سے زیادہ تیز ہوتے ہیں جن خوش قسمت افراد کو مولانا کے اس تیغِ طنز و لہجے کے قتل ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرزِ نگارش کی "لذت" سے انھیں کس قدر "خط" حاصل ہوا اور اپنے رستم و فوجِ دل کے کعبہ سے کس قدر "الم" نصیب ہوا۔

یوں تو طنز نگاری کی مثالیں اہلِ لال کے متعدد مضامین میں بکثرت ملتی ہیں لیکن سلسلہ طبعی فوڈنٹیشن کمیٹی کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں مولانا آزادؒ اور مولانا محمد علی مرحوم کے صحبیاں کی بے نقادی پیدا ہوئی تھی۔ مولانا نے ۲۶ فروری، ۱۳۴۲ء اور ۲۷ فروری، ۱۳۴۲ء کے اہلِ لال کی صحبتِ خاصہ کے عزیز و دوستان اس تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ اس نوع کی نہایت نادر و نایاب مثال ہے۔ نیز صحرا و سفر

کے دیوبند امام طنز بات مولانا عبدالعزیز صاحب دریا بادی ^{۱۹۵۷ء} میں ایک نئی اصطلاح یعنی مدخلہ بمعنی "لذت" اور کرب بمعنی "الم" وضع کر کے مولانا آزاد سے نو عمری کے جوش میں اُلجھ پڑے تھے مولانا آزاد نے اس بحث و جدل کے جواب میں الہلال مورخہ ارستمبر اور دیکم اکتوبر ۱۹۵۷ء میں جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ ادبیاتِ نثر میں نہایت عالی شان باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس قدر مختصر و جامع پر مولانا عبدالعزیز صاحب دریا بادی رقم طراز ہیں :-

"مولانا شبلی نے میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ ہوا) اندوہ کے لئے لکھا گیا تھا، الہلال کی طرف منتقل کر دیا، اس کی تاب میں نہ لاسکا، اور طبیعت جو اس نو عمری کے جوش میں بحث و جدل کے لئے بہانہ ڈھونڈتی تھی کچھ سی روز بعد بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحب الہلال سے اُلجھی پڑی، دو چار مضمون خوب گرم گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا جنھوں نے ویلان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکھوا دیا، ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہنچتی :-

(صدق جدیدہ چند یادیں، مورخہ ۱۳، اپریل ۱۹۵۷ء)

چونکہ طنز نگاری مولانا آزاد کی سیرت تک بلندی اور کردار کی پاکیزگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لہذا انھوں نے اس طنز نگارِ رش کو اپنے گہر بارِ ظلم کی جھلانیوں سے محروم کر دیا مولانا نے ۱۹۵۷ء میں جو جہد کیا تھا اس پر تاحینِ حیات قائم ہے، یعنی انھوں نے کوہِ صبر و وقار اور پیکرِ سکیم و ضابطہ کو فاضلین، معاذین اور حامدین سے سب و شتم، طنز و مزاح اور طعن و تشنیع سب کچھ شے کے بعد جو دہائی زبانِ صدق بیان سے کبھی کوئی ناگوار لفظ نہ نکالا۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء کے بعد ان کی کتاب زندگی کا دواق شاید ہی کران میں طنز ہے نہ تشویش، ہمزہ ہے نہ لہجہ حقارت کے کلمات بلکہ یہ سب کے الفاظ ایک مشہور عالمِ دین مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مرحوم نے ان کی تفسیر سورۃ فاتحہ کے چند مصرعوں پر مشاطہ انداز میں احکامات کیے تھے، اسی سلسلے میں مولانا محمد ابراہیم مرحوم نے مولانا سے وضاحت چاہی اور لکھا کہ آپ نے کتاب دیکھی ہے

بھجوا دوں؟ اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا:-

”جو تک آپ لکھتے ہیں کہ کسی وجہ سے انھوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے، اس لئے براہ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجئے، میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے، ۱۹۱۵ء سے میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا، نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا۔“

(نقش آزاد ص ۱۷ مکتوب نمبر ۲ مورخہ ۱ جنوری ۱۹۳۷ء)

پنجاب کے ایک سیاست دان نے اپنے ایک بیان میں چند ایسی باتیں کہیں جو بے اصل تھیں، مولانا آزاد نے مولانا غلام رسول ترمذی کو اس قلم سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ملاحظہ کیجئے اور غور فرمائیے کہ موجودہ دور میں طہارتِ نفس کی اس سے بہتر مثال کہیں مل سکتی ہے؟

”اگر میری طبیعت کا وہ انداز نہ ہوتا جو اس وقت تھا جب التلال نکلتا تھا تو میرے کذب ہے کہ نہیں معلوم کہیں عالم بیان میں میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت بھل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے کوئی شخص کہنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اُسے چپک میں بڑا کٹنا پسند نہیں کرتا، ہمیشہ ایسے قلم پر خود اپنا نفس اپنے سامنے آجاتا ہے، میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر میرا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو بڑا کیوں نہ کہوں؟ اس سے زیادہ بڑائی کس میں ہوگی؟ مہاراجہ شاہ کا ایک سیدھا سادا شعر ہے، جس میں شہرت کی کوئی بات نہیں، لیکن میرے دل پر نقش ہو گیا۔“

نہ تھی اپنی بڑائی پہ جب نہ نظر تو نظر میں بُرا تھا، ہر ایک بشر
پڑی اپنی بڑائی پہ جب نہ نظر تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ دلا

(نقش آزاد ص ۱۳۲ مکتوب نمبر ۶ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۳۷ء)

ملاشبہ مولانا آزاد کا یہ مثالی کردار ان کی حیاتِ نرتریں کا ایسا روشن اودھنا بن گیا ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی، آج بعض تعلیم یافتہ حضرات کا بطن کو اپنے زہد و ورع پر نانا ہے اور زہم خویش خود کو وارثِ مسندِ رسول سمجھتے ہیں، حال یہ ہے

”طنز کرتے ہیں، مرنے والوں پر“

(۱۸) مولانا آزادؒ کے طرزِ تحریر کی ایک اثر آفریں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک رنگ کے مضمون کو سب سے ڈھنگ سے باندھتے ہیں، اس قسم کی تحریریں زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تنظیم میں مسلمانوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں بحیثیت افکار و خیالات، جدت و ندرت نہیں ہوتی، صرف تکرار و اعادہ ہوتا ہے، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ اس نوع کی تمام تحریریں مختلف و بجا اور اسلوب و انداز کے لحاظ سے کچھ اس طرح جدت و ندرت کی حامل ہوتی ہیں کہ قارئین باوجود تکرار و اعادہ یعنی ایک ہی قسم کے مطالب و مفاہیم کے، جھجھوم اٹھتے ہیں، اور ہر مرتبہ نئی لذت و حلاوت سے نفع اندوز ہوتے ہیں۔

مولانا آزادؒ اس طرز کی تحریروں میں نہایت دلی نشین اور مؤثر پیرایہ بیان اختیار کر کے، مسلمانوں کو دلورہ مذہبی اور جوش ملی سے سرشار کرتے تھے، اور ان کے شعلہ دہائے حیات کو فروزاں کر کے ان کے جذبات میں جہان اور تلاطم اس انداز سے برپا کرتے تھے کہ ان کے متحرک خون کا ہر قطرہ حرارت سے معمور ہو جاتا ہے۔

زبان و بیان اور ادب و انشاء کے لحاظ سے مولانا کی ایسی تحریریں محفہ حسن و جمال ہوتی ہیں، ایک طرح ترکیب و الفاظ، ”روضہ تاج“ کا جمالی آتشیں بن کر نمایاں ہوتے ہیں، اور دوسری طرف تشبیہات و تمثیلات اور استعارات اپنی پوری رعنائیوں اور دلی فروغیوں کے ساتھ آمینہ کی جگہ سے زیادہ دلنشینہ ہو کر نظر افروز ہوتے ہیں۔

مولاناؒ نے اس طرزِ تحریر کو جس میں خیالات کی تکرار ہوتی ہے اور مطالب کا اعادہ ہوتا ہے، قرآنِ حکیم کے منظرِ بیان سے اخذ کیا ہے، قرآنِ حکیم میں ایک ہی بات مختلف اسلوب اور

طریق سے دلہا فریاد کرتا ہے اور اعمال و کردار جس دل کش طریقہ سے قرآن و سنت کا رنگ
 نکھرتا ہے اس کا اظہار ہوا اگرچہ زبان و قلم عاجز ہے تاہم اس قدر عرض کے بغیر چارہ نہیں
 کہ مولانا کی تحریروں نے ان افراد کے ذہن و فکر اور قلب و نظر میں جو جذبہ بے بیگانہ اور دین سے
 متفرق ہو چکے تھے ایسا ایمان افروز انقلاب برپا کیا اور ایسے حیرت انگیز طریقہ سے ان کے وجود کو
 حرکت سے اور ان کے تعطل کو عمل سے بدل دیا جیسے ان کے مرنے والے دل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی
 ہو اور وہ زبان حال سے نغمہ سنچ ہو :-

ز نسیم جان نغمیت دلی مرنے زندہ گردو
 ز کدام باغے لے گل کہ چنین خوش مست بخت

خود علماء و رہبران ملک و قوم نے بھی اپنے سیاسی معتقدات و آراء اور مذہبی و علمی افکار حال
 میں مولانا کی تحریروں کا اثر اس انداز سے قبول کیا جیسے مولانا نے ان کے ہاں خاندان قلب پر شک
 بعدی ہوا اور انہوں نے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہو چنانچہ انہوں نے بنات خود محسوس کیا
 کہ ان کی مذہبی علمی اور سیاسی زندگی میں انقلاب و تغیر کی لہر دوڑ گئی ہے اور ان کے ادراک و دل
 کا ایک ایک صفو ایمان و ایمان کی روشنی سے چمک اٹھا ہے۔

(۲) مولانا کی تحریروں اور ان کی تصانیف اس درجہ معنی آفریں اور دل آویز ہیں کہ آپ متعدد مرتبہ ان کا مطالعہ
 کیجئے، جیسے اسی کے کہ آپ کا ذہن گرائی محسوس کرے ہر مرتبہ ان کو قبول کرے گا اور ہر بار آپ کا
 ذوق نیا کیف اور سرور محسوس کرے گا، نیز عبارت بھی اپنی عاشری اور باطنی جمال آدابوں اور
 صن افروزوں کے ساتھ ایک نئے رنگ اور نئے پیکر میں نمایاں ہوگی۔

عربا دنیا و پ ہے ہر بار دنیا رنگ

جب دیکھو گئے پھر اندھی عالم ہے تمھارا

حضرت اس کی تحریروں کی سیلاب اور صاف و صفا نئی تحریر کی اشاعت و شمولیت کی روشنی میں
 واضح کیا ہے کہ یہ تحریریں ہر فرد کے لیے ہیں جو اس کے لیے دلچسپی رکھتا ہے

کو حذف کر دینا پڑا جو میں نے بطور مشہور ادا خذ کئے تھے، انشاء اللہ ایک زیر ترتیب کتاب جس کا ایک حصہ یہ مضمون بھی ہوگا، جب زیرِ طبع سے آراستہ ہوگی اس گوشت کو آپ مثالوں سے نہایت واضح پائیں گے۔

حاصلِ سخن | حاصلِ سخن یہ کہ مولانا آزاد کی ذات گرامی کمالاتِ علمی کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب و غریب دل کش مجموعہ تھی، لیکن ان کے شعبہ ہائے حیات کے جس قدراوصاف و کمالات منصفہ مشہور و مشہورہ آراہائے ہیں وہ ان سے بہت کم ہیں جو ان کی ذات میں عجوب و مستورہ گئے، خود مولانا کو اس کا شدید احساس تھا، چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جب کہ ان پر ضعف و اضمحلال طاری ہو گیا تھا انتہائی درد انگیز انداز میں اپنے ایک مخلص کو اس طرح تحریر فرمایا :-

”اپنی حالت دیکھتا ہوں تو روز بروز صحت جواب دے رہی ہے، ضعف و اضمحلال بڑھتا جاتا ہے، ہمیں معلوم مشیت الہی کیا ہے اور کون سا وقت آنے والا ہے، اگر پیام اجل سر پر آہو نچا (فَاتَ أَجَلَ اللَّهِ لَا تَحْتَ) تو آہ کس سے کہیے اور کون جانتا ہے کس مشیتِ خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپردِ خاک ہوں گی، فیضانِ الہی نے اپنے فضلِ مخصوص سے علوم و معارف کے کیسے دروازے اس عاجز پر کھولے تھے جو بند کے بندہ جانتیگی۔

تو نظیری ذلک آمدہ بودی چو سیح

باز پس رفتی و کس قدر تو شناختِ دلین

(المجتبٰ مولانا آزاد نمبر)

مولانا کے جس قدرا دنیائی علمی اور سیاسی کمالات ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور مختلف علوم و فنون کے ہر شعبہ میں انہوں نے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے بشمار مستقل قدس قائم کی ہیں ان کے مطلق ہے اب تک جس قدر لکھا گیا ہے شاید ہی کسی اور شخصیت کے متعلق اس قدر لکھا گیا ہو، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ تحریر و تحقیق کا حق اب تک شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا، اور فیضانِ ابوالکلام کے مستفیض ہونے والوں کا جوشِ طلبی بھی اس تکمیل پر کافی نہ ہو سکا، اور ان کی لبِ تشنگی میں سے زیادہ میرزا کا سلمان کاوش کی گئی ہے۔

غزل

جناب شمیم عثمانی

کہاں ہے آج بلا خیزی جنوں باقی روایتوں سے ہے اک ربطِ پُرسوں باقی
 ہم اپنے ماضی کا سایہ بھی اب نہیں شاید مگر زمانہ کو شکوہ کہ ہم ہیں کیوں باقی
 ابھی نگاہِ ستم کو عزیز ہیں ہم لوگ ابھی ہے پیر ہوا جاں میں بولے خوں باقی
 یہ فکر و فن کے نگہاں ستارِ غم کے امیں ہیں اک شکستہ عمارت کے کچھ ستوں باقی
 کہاں کی بادہ کشی لطفِ عامِ ساقی کیا بنامِ ظرف ہے اک جامِ واژگوں باقی
 حیات آج انہیں آئینہ دکھاتی ہے نہ جن کے چہرے سلامت نہ اندروں باقی
 عذابِ بحر بھی دکھیانا طرب کے بعد ہماری شونخ مزاجی ہے جوں کی توں باقی
 شراب ہے کہ لہو بھید کچھ نہیں کھلتا ہر ایک شے میں ہے آبِ لالہ گوں باقی
 اسی کا نام فنا ہے تو پھر بقا کیا ہے کہ آج تک ہے یہ دنیائے کاف و دؤں باقی

شمیم تیرے جنوں کی بھی حد نہیں کوئی

خرد کے دور میں اور دولت سکوں باقی

تبصرے

مغربی تہذیب آغاز و انجام۔ از جناب محمد ذکی صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔
(علیک) لکچرار شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ضخافت تین سو صفحات۔ کتابت و
طباعت متوسط درجہ کی۔ قیمت محلہ سات روپیہ۔ پتہ:- درج نہیں۔ غالباً
مصنف سے ملے گی۔

لائق مصنف نے کتاب کا آغاز ہی ان حبلوں سے کیا ہے:-
بنیادی اعتبار سے دنیا میں زندگی کے صرف دو نظام ہیں۔ اسلامی اور غیر اسلامی
اول الذکر کی بنیاد عقیدہ توحید و رسالت پر ہے اور دوسرے کی اس حقیقت کے
انکار پر، اور اسی کا نام مغربی تہذیب ہے یعنی جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام
کوئی تیاذہب نہیں۔ بلکہ اس مذہب کی تکمیل کا نام اسلام ہے جو حضرت آدم
سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں پایا جاتا
رہا ہے۔ اسی طرح فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ آج کل ہم جس کو مغربی تہذیب
کہتے ہیں وہ کھائی چیز نہیں۔ بلکہ اس تہذیب کی تکمیل ہے۔ جس کے دو بڑے مرکز
عراق اور مصر تھے اور جو یونان اور روم سے گزرتی ہوئی عہد جدید تک پہنچی
ہے اور جس کی تعمیر و تشکیل میں۔ ایشیا۔ افریقہ۔ اور یورپ کی سب قوموں نے
حصہ لیا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت مصنف نے تہذیب کے ادوار قدیمہ کے
فانر ترکیب کا تجزیہ کیا ہے اور اس طرح ثابت کیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب

غزل

جناب شمیم عثمانی

کہاں ہے آج بلا خیزی جہوں باقی روایتوں سے ہے اک ربطِ پُرفوں باقی
ہم اپنے ماضی کا سایہ بھی اب نہیں شاید مگر زمانہ کو شکوہ کہ ہم ہیں کیوں باقی
ابھی نگاہِ ستم کو عزیز ہیں ہم لوگ ابھی ہے پیر ہوا جاں میں بوئے خوں باقی
یہ فکر و فن کے نگہاں متاعِ غم کے ایں ہیں اک شکستہ عمارت کے کچھ ستوں باقی
کہاں کی بادہ کشی لطفِ عامِ ساقی کیا بنامِ ظرف ہے اک جامِ واژگوں باقی
حیات آج انہیں آئینہ دکھاتی ہے نہ جن کے چہرے سلامت نہ اندروں باقی
عذاب بھر بھی دیکھنا تا طرب کے بعد ہماری شوخ مزاجی ہے جوں کی توں باقی
شراب ہے کہ لہو بھید کچھ نہیں کھلتا ہر ایک شیشے میں ہے آبِ لالہ گوں باقی
اسی کا نامِ فاس ہے تو پھر بقا کیا ہے کہ آج تک ہے یہ دنیائے کاف و فوں باقی

شمیم تیرے جہوں کی بھی حد نہیں کوئی

خود کے دور میں اور دولت سکوں باقی

تبصرے

مغربی تہذیب آغاز و انجام۔ از جناب محمد ذکی صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔
(علیک) لکچرار شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ضخافت تین سو صفحات۔ کتابت و
طباعت متوسط درجہ کی۔ قیمت محلہ سات روپیہ۔ پتہ :- درج نہیں۔ غالباً
مصنف سے ملے گی۔

لائق مصنف نے کتاب کا آغاز ہی ان حلوں سے کیا ہے :-
بنیادی اعتبار سے دنیا میں زندگی کے صرف دو نظام ہیں، اسلامی اور غیر اسلامی
اول الذکر کی بنیاد عقیدہ توحید و رسالت پر ہے اور دوسرے کی اس حقیقت کے
انکار پر، اور اسی کا نام مغربی تہذیب ہے یعنی جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام
کوئی نیا مذہب نہیں، بلکہ اسی مذہب کی تکمیل کا نام اسلام ہے جو حضرت آدم
سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں پایا جاتا
رہا ہے، اسی طرح فاضل مصنف کا دعویٰ ہے کہ آج کل ہم جس کو مغربی تہذیب
کہتے ہیں وہ کبھی چیز نہیں، بلکہ اس تہذیب کی تکمیل ہے، جس کے دو بڑے مرکز
عراق اور مصر تھے اور جو یونان اور روم سے گزرتی ہوئی عہد جدید تک پہنچی
ہے اور جس کی تعمیر و تشکیل میں، ایشیا، افریقہ، اور یورپ کی سب قوموں نے
حصہ لیا ہے، اس نظریے کے تحت مصنف نے تہذیب کے ادوار قدیمہ کے
خاصہ ترکیبی کا تجزیہ کیا ہے اور اس طرح ثابت کیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب

نہ پہلی ہی تہذیبوں کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ لیکن پوری کتاب کو پڑھ جانے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر مصنف چاہتے کیا ہیں! اور ان کا بنیادی نقطہ نظر کیا ہے! ایک تسلیم یافتہ شخص کے دماغی عدم توازن کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکا کہ اسے مغربی تہذیب (قدیم اور جدید) میں سولے برسوں کے کوئی غلبہ ہی نظر نہیں آتی۔ موصوف کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ مولانا علی میاں جیسے داعی اسلام پر تنقید کر ڈالی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۷۵ پر لکھتے ہیں:-

مولانا کا علم وسیع ہے، ملت کا درد رکھتے ہیں۔ اسلام سے عقیدت ہے اور --- چاہتے ہیں کسی طرح مشرق و مغرب اسلام اور مغربیت ہم آہنگ ہو جائیں۔ ابھی تک اس کوشش میں کامیاب کوئی نہیں ہو سکا۔ اگر تھیل میسج ہے تو مولانا دلی پر دلی آم کی قلم لگانا چاہتے ہیں۔ جس میں دونوں کا مزہ آجائے۔ لیکن اس کو کیا سمجھے کہ کر بلا مفید ہے اور آم لذیذ لیکن دونوں کی قلم ابھی تک نہیں لگ سکی۔ فوجان مصنف اپنے خیالات میں مفرد نہیں ہیں، بلکہ ہندوؤں، عیسائیوں اور مشرق و مغرب میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ لوگ اس قسم کے خیالات کے حامل ہیں۔ بہر حال یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے اور مطالعہ اس کا بھی کرنا چاہیے۔

اللہ کے گھر میں۔ از جناب احمد سعید صاحب یلیح آبادی۔ ضخامت تین سو صفحات کتاب و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ:- دفتر آزاد نمبر ۲۲-۷۱۔ ساگر دت لین، کلکتہ۔ ۱۲۔

ہائن مصنف نے ۱۹۷۰ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ سفر کیا تھا یہ کتاب اسی سفر کی روئداد ہے۔ یوں تو سفر نامہ اور وہ بھی سرزمینِ حرم کا عام طور پر دل چپ ہوتا ہی ہے۔ لیکن چونکہ موصوف اردو زبان کے ادیب ایک

مشہور روزنامہ کے ایڈیٹر اور بلڈ پائپر جرنلسٹ ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ سفر دیدہ و دل دوڑوں کو دار کھڑ کیا۔ ہر چیز کو غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا اس کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کی۔ پھر مقامات عشق و محبت میں جب تک دل رہتا نہ سواصل منزل تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کی کیا قلت ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی عکاسی کے لیے جس شگفتہ قلم اور دقیقہ رس قلم کی ضرورت ہے وہ بھی موجود تھا ہی، پھر کمی کس چیز کی تھی۔ چنانچہ یہ سفر ہمہ اس مقدس سفر کی تاریخی، جغرافیائی اور دینی معلومات کی ان ٹیکو پیڈیا ہے جس میں واقعات و حقائق کے ساتھ جذبات کی آمیزش نے حسن بیان کو نکھار دیا ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کا مطالعہ بے شبہ ہم خرماد ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کا مسئلہ۔ از پروفیسر طاہر محمود۔ صفحات ۱۰۸
صفحات تقطیع متوسطہ، کتاب و طباعت اعلیٰ۔ قیمت چار روپیہ۔ پتہ: ڈاکٹر
حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
لائق مصنف اعلیٰ لاء انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں اسلامی قانون کے پروفیسر
ہیں اور اب تک اس موضوع پر انگریزی اور اردو میں مفید اور قابل قدر کتابیں
اور مضامین لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں
موصوف نے بتایا ہے کہ جس کو عام طور پر مسلم پرسنل لاء کہا جاتا ہے وہ کیا
ہے؟ اس کا ماخذ کیا ہیں؟ پھر ہندوستان میں اس کی قانونی حیثیت کیا ہے
یہ قانون کب بنا اور کن کن چیزوں پر مشتمل ہے اور ان کی کیا نوعیت
ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کے جو مسلم پرسنل لاء میں وہ کیا ہیں
کیا ان سول کوڈ کے معاملہ کی کیا حقیقت ہے۔ اس پر مخالف اور موافق

آراء جو ظاہر کی گئی ہیں وہ کیا ہیں۔ مسلم پرسنل لایں اصلاح کی تجویز کیا ہے؟ اعدا اس بارے میں مختلف حضرات کے خیالات کیا ہیں؟ بیردنی ممالک میں اور خاص طور پر مسلم ممالک میں اب تک مسلم پرسنل لایں وقتاً فوقتاً جو اصلاحات ہوئی ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ ان تمام مباحث کے بعد لائق مصنف نے ان مسائل کے بارے میں اپنی ذاتی رائے بیان کی ہے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے آج وقت کا بہت اہم مسئلہ ہے اب تک اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔ جو حضرات اس مسئلہ کا مطالعہ عملی طور پر کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

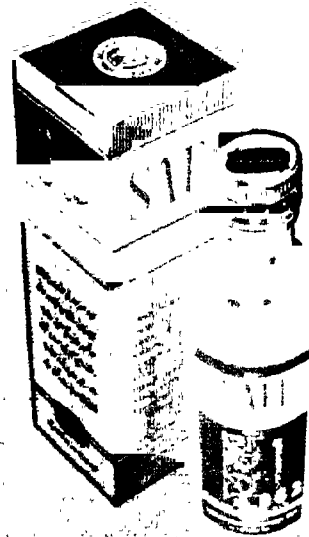
مسلم پرسنل لا۔ از مولانا منت اللہ صاحب رحمانی۔ تقطیع خورد صفحات ستر صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ خالقانہ رحمانیہ۔ مونگر۔ بہار کے پتے سے ملے گی۔

مولانا بہار کے امیر شریعت اور ممتاز عالم ہیں۔ اس بنا پر آپ نے اس رسالہ میں خالص شرعی اور فقہی نقطہ نظر سے وقت کے اس اہم سوال پر اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اس کے پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے اس کے ماخذ کیا ہیں؟ جب کبھی کوئی نیا معاملہ پیش آیا تو صحابہ کرام نے اس کو کس طرح حل کیا ہے۔ آج بھی جو مسائل حل طلب ہیں ان کا حل ضرور سہنا چاہیے اس سلسلہ میں اجتہاد کی تعریف، اس کے حدود اور اس کے لیے قیود و شرائط وغیرہ پر بھی غور کیا گیا ہے اور خلاصانہ کلام کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس رسالہ سے کسی مسئلہ کا حل نہیں سہتا۔ لیکن اصول و کلیات کے نقطہ نظر سے اس رسالہ کا مطالعہ بھی مفید اور بصیرت افزا ہو گا۔

موسم بدلتے ہی چہرے بھی بدل جاتے ہیں! کیا ٹھاسوں، پٹھنیوں اور جلدی تکلیفوں کی وجہ سے؟ جب یہ تکلیفیں پیدا ہوں تو اُن کو صّافی کے استعمال سے فوراً ختم کیجیے

ٹھاسے، پٹھنیاں، دوسری جلدی تکلیفیں اور خسرو بھی موسم کی تبدیلی پر اکثر
ہو جاتی ہیں، کیوں کہ جگر اور فعل ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور خون میں
خرابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس موسم میں خاص طور پر صّافی سے اپنے خون کو صّاف
کیجیے۔ صّافی خون کو صّاف کرتی ہے۔ خراب اذوں کو جسم سے نکالتی ہے۔
آنتوں اور گردوں کو صّاف کرتی ہے اور آپ کے خون کی صّافی کا سبب
بہنی ہے۔ صّاف خون کا مطلب ہے صحت مند جلد۔

۲۶ جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی صّافی تیز اثر رکھتی ہے۔ جراثیم کھاتی ہے
اور ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے استعمال سے اجابت کھل کر آتی ہے اور
خون صّاف ہوتا ہے۔ صّافی سے خون کی تمام خرابیاں نکل کر جاتی ہیں۔



صّافی

خون صّاف کرنے کی قدرتی دوا

ہمدرد

ذرا خود غرض بنئے!

فدا خود غرض بنئے اور اپنی فوری یا

آئندہ ضروریات کے لئے بچا لیجئے۔ اپنی بنگ۔ بخت میں اضافہ کیجئے۔

اس قسم کی خود مطلبی آپ کے بہت کام آئیگی۔ آپ کے کنبہ کو آپ کا ممنون بنائیگی۔

اور اس سے ملک کی خدمت بھی ہوگی۔ آپ کی بخت قوم کے تعمیری کاموں میں

مدد دے گی اور ملک خوش حال ہوگا۔

آپنے لئے بچائیے۔ ملک کی خدمت کیجئے



قومی بخت
لگاتار

ذرا
خود غرض
بنئے

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ شریفان کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ ”لغات قرآن“ کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی آہستگی سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۳	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	”	پانچ روپے	” چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	”	پانچ روپے	” چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	”	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	”	آٹھ روپے	نور روپے
جلد ششم	۳۳۳	”	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

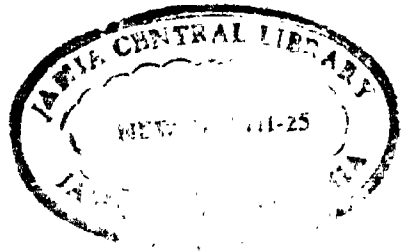
18 AUG 1972



حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشرز، ریسرچ پرنٹنگ پریس، ٹی ایس پی جی، کراچی، پاکستان کے شائع کیا

مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دِلِّی کا علمی و دینی مآبہنا

189 SEP 1932



برہان

مؤلف
سعید احمد کسرا بادی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

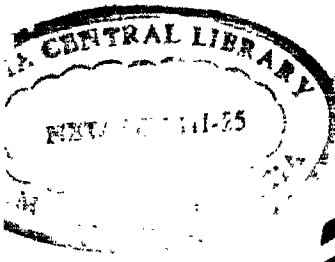
قصص القرآن کا شمار ادوارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں تالیف نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۸۳۷ ہیں۔
حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی متفقہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف و الزمزم و اصحاب القریۃ و اصحاب النبیۃ و اصحاب الریس و بیت المقدس اور یہود و اصحاب الافود و اصحاب الفیل و اصحاب النجۃ و القرین اور سرسکندری و سبا و ریس غرم و غیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و متفقہ تفسیر
حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و علیہ السلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم ساٹھ روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت مکمل سٹاکتیس روپے۔ اجرت فی جلد فل پارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی



بُھان

جلد ۶۹ { ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ } مطابق ستمبر ۱۹۷۱ء { شمارہ ۳ }

- ۱۔ نظرات
سید احمد اکبر آبادی ۱۲۶
- ۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۳)
۱۵۰
- ۳۔ رسول شاہد و مشہور
قاری بشیر الدین صاحب پنڈت
ایم۔ اے نیشنل ایوارڈی شاہجہانپور ۱۷۲
- ۴۔ تفسیری چحانات اور نئی تفسیر کی ضرورت
حبیب ڈاکٹر محسن الدین الاعظمی ۱۸۸
- ۵۔ شائق اور ان کا دیوان فارسی
حبیب ڈاکٹر شریف حسین صاحب
قاسمی۔ دہلی یونیورسٹی۔ ۱۹۸
- ۶۔ تبصرے
س۔ ع ۲۱۲

.....

نظرات

سائنس و زمان کیلئے تو فوہل پرائزر (جو غالباً سب بڑا بین الاقوامی انعام ہے) کے نام سے ایک عالمی انعام عین تھا۔ لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب مذہب کیلئے بھی اسی قسم کے ایک گرانقدر عالمی انعام کا اعلان ہوا ہے۔ اس انعام کا پورا نام ہے ٹیمپٹن فاؤنڈیشن انعام مذہب کی ترقی کے لیے۔ یہ انعام چونتیس ہزار پاؤنڈ (اسٹریلنگ) کل ہے۔ ۸ مئی ۱۹۶۲ء کو لے بفاسٹ (شمالی آئرلینڈ) میں قائم کیا گیا ہے۔ اسے قائم کرتے وقت انعام کے بانی نے جو الفاظ کہے ہیں وہ یہ ہیں: یہ انعام ایک ایسا شخص قائم کر رہا ہے جو اگرچہ ایک معمولی انسان ہے لیکن اس کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ مذہب انسان کے وجود اور اس کے بقا کے لیے ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔ مجھ کو امید قوی ہے کہ سائنس اور کلچر کی ترقی میں اس نوع کے اخلاعات نے جہد و لاد کیا ہے وہی رول یہ انعام مذہب کی ترقی میں ادا کرے گا اس انعام کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان خیالات، کوششوں اور ان اعمال و افعال کا اعتراف کرے اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائے جنہوں نے انسان کی روحانی صلاحیتوں اور خدا کے ساتھ عشق و محبت کے جذبہ کو ابھارنے میں زیادہ سے زیادہ اہم بول دیا ہو، مختلف مذہب ملت کے حجوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی ہے جو اس انعام کے مستحق شخص کی ہر سال تعیین کرے گا حجوں کے میل میں سات حضرات شامل ہیں ان میں ہندوستان سے پروفیسر سوئی کار چرچ میٹنل پروفیسر کو اور پاکستان کی طرف سے چودھری محمد ظفر اللہ خاں صدر بین الاقوامی عدالت ہگ کو شامل کیا گیا ہے باقی پانچ حضرات میں امریکا، یورپ، جاپان کی بلند پایہ مشہور مذہبی شخصیتیں شامل ہیں اس سلسلہ میں پہلا انعام کے لیے انتخاب اور اس کا اعلان ۱۹۶۲ء کے شروع میں ہو گا۔

قارئین برہان کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ ٹیمپٹن فاؤنڈیشن کے وائس پریذیڈنٹ

سر ڈبلیو جی فورڈ نے اس سلسلہ میں مخفی طور پر ایک خط اڈمیٹر برہان کو بھی لکھا ہے جس میں متعلقہ انعام کے بارہ میں ایک مشورہ طلب کیا ہے جس کا خاطر خواہ جواب انشاء اللہ جلد بھیج دیا جائے گا۔ بہر حال ہم اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں یہ اعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے جیسا کہ ہم نے متعدد جگہوں پر بار بار کہا اور لکھا ہے کہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ یورپ میں مذہب ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ مذہب زندہ ہے اور وہ سائنس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ سائنس جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اسی قدر یہ حقیقت روز بروز منکشف ہوتی جا رہی ہے کہ اگر سائنس کا رشتہ مذہب سے بالکل منقطع ہو گیا تو اس کا انجام عالم انسانیت کی مکمل تباہی اور بربادی کے سوا کچھ اور نہ ہو گا۔ اس بنا پر امریکہ، کناڈا اور یورپ میں جہاں سائنس پر تحقیقات اور اس کی اشاعت کے بڑے بڑے ادارے ہیں اور ان پر اربوں کھربوں روپیہ خرچ ہوا ہے اس کے ساتھ ہی مذہب کی تعلیم اس پر تحقیق اور اس کی اشاعت کے متعلق ادراک اور مرکز ہیں جو اس مقصد کے لیے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر ماہ مذہبی لٹریچر میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹیٹلن فاؤنڈیشن کا یہ انعام بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ فاؤنڈیشن اس اہم اقدام کے لیے سب مذاہب عالم کی طرف سے مبارکباد کا مستحق ہے۔

افسوس ہے پچھلے ماہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا مرحوم ہندوستان کے ان مغربی تعلیم یافتہ اکابر اساتذہ عربی و فارسی میں سے تھے جن کی نسل اب چراغِ سحری ہے۔ مرحوم علی گڑھ کے اس زمانے کے بڑھے ہوئے تھے جب کہ ابھی وہ صرف کالج تھا۔ انہوں نے یہاں پر فیسر یوسف ہورودنس (JOSEF HOROVITZ) جو صدر شعبہ عربی تھے ان کی شاگردی میں عربی میں ایم۔ اے کیا اور جب ان کو حکومت ہند کی جانب سے

اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا تو موصوف کے ہی شہرے سے ۱۹۱۲ء میں
جرمنی چلے گئے۔ اس زمانے میں جہاں تک عربی اور فارسی میں ریسرچ کا تعلق
ہے فرانس کے ساتھ جرمنی کے نام کا بھی دنیا میں غلغلہ بلند تھا۔ جرمنی میں جو
مستشرقین علم و تحقیق کی جوئے شیر کے کوہن مشہور تھے ان میں پروفیسر یو
ڈورنولڈ لیمکی اور پروفیسر انولتمان (ENNO LITTMAN) (۱۸۷۵-
۱۹۵۸) سرخیل گروہ تھے۔ ان دونوں کا اور خصوصاً موخر الذکر کا خاص
فن سامی لسانیات تھا۔ خوش قسمتی سے مرحوم کو جرمنی میں ان اساتذہ
سے استفادہ کا پورا موقع ملا۔ پروفیسر انولتمان ان کے استاد خصوصی تھے
جن کی خدمت میں وہ مسلسل سات برس یعنی ۱۹۱۹ء تک رہے۔ استاد نہایت
شفیق اور علم و تحقیق کے بحرِ ناپیدا کنار کا کامیاب شاگرد اور شاگرد نہایت
ذہین اور ہم طلب و جستجو۔ پھر کئی کس چیز کی کتنی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے
فنی لسانیات میں وہ کمال پیدا کیا کہ یورپ تک میں مشہور ہو گئے۔ جرمنی سے
آنے کے بعد وہ علی گڑھ، حیدر آباد اور ڈھاکہ رہے۔ لیکن آخر کار الہ آباد
یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ایسے جج کہ ہیں
سے ۱۹۴۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور یہیں مستقل طور پر رہ پڑے۔ اپنے علم و
فضل اور لسانیات میں خصوصی وسعت و وقتِ نظر کے باعث جامعات
اور اربابِ علم کے حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے
جرمنی زبان میں ان کے مقالہٴ فضیلت کے علاوہ غالباً کوئی مستقل تصنیف
ان کی یادگار نہیں ہے۔ تاہم جو مضامین (عربی کے علاوہ اردو و فارسی ادب
پر بھی) ان کے قلم سے نکلے ہیں علم و تحقیق کا شاہکار ہیں۔ چار یا پنج برس
پہلے مرحوم سے آخری ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی تھی اس میں انھوں نے بتایا

ہمنا کہ انہوں نے اپنے تمام مطبوعہ مضامین فراہم کر لیے ہیں اور آج کل وہ ان پر نظر ثانی اور ان کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں، مرحوم علم و فضل کے ساتھ ہی اخلاق و عادات کے اعتبار سے نہایت شریف الطبع، با وضوح اور خوش اخلاق و مہنار بزرگ تھے۔ ان کی گفتگو معلومات سے پُر مہوتی تھی، اصول و ضوابط کے سخت پابند تھے۔ ان میں کسی قسم کی مہانت یا ردا داری کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ جس سے جو وضع ہو گئی اسے آخر تک نباہتے تھے، راقم الحروف کے ایم۔ اے (عربی) کے امتحان میں فلا لوجی کے پرچہ کے وی معین تھے اور اس میں انہوں نے فرسٹ ڈویژن کے نمبر دیے تھے، جو وہ کسی خوش نصیب کو ہی شاذ و نادر دیتے ہوں گے، اس کے چند برسوں کے بعد حبان سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یاد دلایا کہ میں نے ان سے اتنے نمبر حاصل کیے ہیں تو انہوں نے فوراً پہچان لیا اور اس دن کے بعد سے ہمیشہ جب کبھی اور جہاں کہیں ملے بڑی محبت اور شفقت بزرگانہ سے ملے۔ اب ایسے با وضوح بزرگ کہاں ملیں گے،! چند برس سے چند در چند عوارض و استقام کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور قوت حافظہ حب کے لیے وہ اپنے ہم عمروں میں ہمیشہ متاثر رہے بالکل جواب دے چکی تھی، انتقال کے وقت عمر ۹۰ سے کچھ زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو محفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

بچپن کے زمانہ کی یاد پر پھر دسم کرنے کے باعث گزشتہ ماہ اگست کے برہان میں صفحہ ۱ پر آخری سطر سے پہلی سطر میں برکیٹ کے اندر غلطی سے یہ عبارت لکھی گئی تھی (جرمنی کے جہاز ایمڈن کے نظر آ جانے کے باعث محذور و محرم حباب مولانا عبد الماجد صاحب دلیا بادی نے حب محول اپنی شفقت بزرگانہ سے ایک والا نامہ میں یاد دلایا کہ ایمڈن کا واقعہ تو مولانا شبلی اور پروغلیس آرٹلڈ کے اس سفر سے کئی برس بعد جب جرمنی کے زمانہ کا ہے اسی لیے اس فقرہ کو واپس لیا جاتا ہے ناظرین ازراہ کرم تصحیح فرمائیں۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

(۳)

سید احمد اکبر آبادی

سرسید کی زندگی کا سب سے بڑا کراسس | مولوی سمیع اللہ خاں جو ایک با اقتدار اور با اثر بزرگ ہونے کے علاوہ کالج وغیرہ کے معاملات میں اب تک سرسید کے مددگار اور ان کے دست راست رہے تھے اب ان کا اس درجہ مخالف ہو جانا سرسید کے لیے ایک شدید حادثہ سے کم نہیں تھا کہ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل کا واقعہ پیش آیا اور اس نے سرسید کے لیے مصائب کی تکمیل کر دی۔ سوا یہ کہ سرسید کی صحت خراب ہونے لگی تھی اور یوں بھی خفاقتیں بڑھ رہی تھیں۔ سرسید نے خیال کیا کہ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کالج کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اس بنا پر بہتر ہے کہ ایک بل کے ذریعہ کالج کا مستقبل محفوظ کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں غالب کرتا رہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے "حب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر اور ان کے ساتھیوں نے اس بل کی بعض دفعات سے اور علی القیوں اس دفعہ سے سخت اختلاف کیا۔ جس کے بعد سرسید نے اپنے فرزند ارجمند جن صاحب کو جو اس وقت سکریٹری بننے کی ترقی کی تھی۔ بہر حال بل جوں کا توں ٹرسٹی بل کے نام سے سرسید کے حامی

ممبروں کی کثرت سے پاس تو ہو گیا۔ لیکن سرسید کے لیے ایک مستقل عذاب و بلا ہے جان بن گیا، مخالفت کی اصل وجہ وہی یورپین اسٹاف کا معاملہ تھا۔ سرسید کو اس کا یقین تھا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم و نسق کا جو معیار قائم ہو گیا ہے وہ یورپین اسٹاف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور بھر ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں حکومت سے جو توقعات ہیں اس اسٹاف کے بغیر ان کا پورا ہونا بھی مشکل ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کا گروپ ان اساتذہ کا مخالف تھا۔ اور ان کے وجود کو اپنی تہذیب، معاشرت اور آزادی کے لیے خطرناک سمجھتا تھا عام طور پر خیال تھا کہ سرسید کے بعد کالج کے سرکریٹری مولوی صاحب موصوف ہوں گے۔ سرسید نے خیال کیا کہ اگر واقعی ایسا ہوا تو کالج سے یورپین اساتذہ کا پتہ کٹ جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حکومت کالج اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے بدظن نہیں تو مشتبہ ضرور ہو جائے گی اور ان دونوں چیزوں کا انجام یہ ہو گا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم و نسق کا معیار ہی پست نہ ہو گا بلکہ علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلبہ کے لیے سرکاری ملازمت کے حصول میں چند در چند دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ آئندہ کے لیے اس خطرہ کے سد باب کا طریقہ اس وقت بھی ہو سکتا تھا کہ جسٹس محمود کو جو اسٹنٹ سرکریٹری بنایا جائے خود محمود اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس بارگراں کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ تھے۔ لیکن ان کو کسی نہ کسی طرح رضا مند کر لیا گیا اور ٹرسٹی بل کی ایک دفعہ کی رو سے جسٹس محمود جو انٹنٹ سرکریٹری ہو گئے۔

ٹرسٹی بل کی مخالفت | یورپین اساتذہ اور تعلیم کی گرانی وغیرہ تو سرسید کی بڑی وجہ | مخالفت کے وجہ تھے، لیکن ٹرسٹی بل کی مخالفت کی بڑی وجہ جو انٹنٹ سرکریٹری کے عہدہ کے لیے اپنے ہی فرزند کی

نامزدگی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ سطحی طور پر دیکھیے تو سرسید کے لیے یہ بات سخت قابلِ اعتراض اور ان کے مرتبہ اور مقام سے حد درجہ فروتر تھی بھی! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:- اتقوا مواضع التہم یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو۔ یوں تو یہ ارشاد ہر انسان کے لیے واجب العمل ہے لیکن علی الخصوص وہ لوگ جو کسی تحریک کے بانی ہوں اور اس حیثیت سے ہزاروں انسانوں کو ان پر اعتماد سونپانے کے لیے تو اس پر عمل کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا: اگر میری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں حطیم کو گردانتا۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا کہ منافقین جو اسلام کے لیے مار آستین ہیں آپ ان کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے تو آپ نے فرمایا میں تو ان کو جانتا ہوں مگر مسلمان تو انھیں نہیں پہچانتے۔ اس حالت میں میں نے ان کو قتل کیا تو لوگ کہیں گے لو دیکھو! محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشاد نبوی قوم کے ہر قائد اور تحریک کے ہر بانی اور اسی طرح حکومت کے ہر سربراہ کے پیش نظر رہنا چاہیے ورنہ کتنی بڑی بڑی تحریکیں ہیں جو بانی تحریک کی طرف سے کسی معاملہ میں ذرا بے اعتمادی پیدا ہوئی نہیں کہ وہ ختم ہو گئیں۔

<p>سرسید کے موقف کا نفسیاتی تجزیہ</p>	<p>اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرسید نے اس ارشاد نبوی کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کی اور اس کی پاداش بھی اس قدر سخت بجگتنی پڑی کہ ان کا کام ہی تمام ہو گیا ان کی مخالفت کی جو جنگاریں اب تک مروت اور لحاظ کے خاکستر میں دب دی سی تھیں اب وہ بھڑک کر شعلہ فشان آتش تھیں۔ نواب وقار الملک مولانا حالی اور دوسرے</p>
---------------------------------------	--

معزز حضرات نے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک بیان تیار کیا تھا جس میں سرسید کی پالیسی کی مذمت کا بلچ اور قوم کے حق میں اس کے تفصیلات اور اپنی اس سے برائت کا اعلان کیا گیا تھا لیکن ابھی یہ بیان اخبارات میں بھیجا نہ گیا تھا کہ اچانک سرسید کے انتقال کی خبر ملی اور وہ بیان روک لیا گیا۔ لیکن بات حقیقی ہو ہیئت اتنی کہنی چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سرسید کی نسبت وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ہرگز نہ کہنا چاہیے تھا۔ حقیقت

۱۹۳۷ء میں علی گڑھ میں ایم۔ اے میں داخلہ کی غرض سے میں پہلی مرتبہ علی گڑھ آیا تو ولایت منزل میں جہاں اب فیکلٹی آف کیمیا لوجی ہے۔ قیام کیا تھا۔ یہاں ڈپٹی صیب اللہ خاں صاحب کے ساتھ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رہتے تھے۔ مولوی صاحب میرے والد صاحب قبلہ کے بہت گہرے دوست تھے اور اس تعلق سے مجھ سے کبھی بہت زیادہ محبت اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ اسی تقرب سے میں نے یہاں قیام کیا تھا۔ مجھے یاد ہے تین چار دن جب تک میں یہاں رہا۔ روزانہ رات کو سوتے وقت ڈپٹی صیب اللہ خاں اور مولوی طفیل احمد صاحب دونوں بزرگ جو سرسید کے صحبت یافتہ اور علی گڑھ کے نام پر فدا تھے۔ سرسید کے حالات مزہ لے لے کر بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سرسید کی نجی اور خانگی زندگی کے چند ایسے نہایت درد انگیز اور سن آموز واقعات بھی سناے جو آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملیں گی اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید درحقیقت کردار اور اخلاق کے اعتبار سے کتنے بلند انسان تھے اور یہ قوسب جانتے ہی ہیں کہ سرسید کا انتقال کس بے کسی کے عالم میں ہوا اور انتقال کے بعد جب سرسید کے امانتہ کا جائزہ لیا گیا تو اس میں کفن اور دفن کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ٹرسٹی بل پر جب ان کی مخالفت بڑھی تو لوگوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ سرسید کو کون مخلص خادم قوم و ملت کہتا ہے

یہ ہے کہ سرسید کے لیے صرف دو صورتیں تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سکرٹری ہوں اور کالج سے یورپین اساتذہ کا خاتمہ ہو جائے۔ اس صورت میں سرسید کا نام نہ ہوتے لیکن ان کے ذہن میں کالج میں اعلیٰ تعلیم، ڈسپن اور حکومت سے قرب کے جو فوائد تھے وہ سب ختم ہو جاتے اور کالج اس معیار پر قائم نہیں رہتا۔

(۲) اس کی متبادل صورت یہ تھی کہ سرسید جسٹس محمود کو جوائنٹ سکرٹری بنواتے اس صورت میں سرسید کی بدنامی اور رسوائی یقینی تھی، لیکن کالج سرسید کے مقاصد کے مطابق کام کرتا رہتا۔ گویا کالج یا اپنی نیک نامی اور مقبولیت

بقیہ صفحہ ۱۵۲:- انہوں نے یہ سارا ڈھونگ سرسید محمود کو انگلینڈ میں تعلیم دلانے اور پھر انہیں چیف جسٹس بنانے کی غرض سے رچایا تھا۔ "تقویر تو اے چرخ گردانِ تقو"

اس حاشیہ کی پہلی سطر سے کسی کو یہ دھوکا نہ پہنچے کہ میں نے ایم۔ اے۔ علیگڑھ سے کیا ہے یہاں اس وقت مولانا عبدالعزیز مین کے ساتھ علمی و ادبی عقیدت و ارادت کے باعث ان سے استفادہ کی غرض سے میں آیا تو اسی غرض سے تھا اور وہاں میرا داخلہ منظور بھی ہو گیا تھا لیکن جب میں نے وہاں بکثرت لوگوں سے یہ سنا کہ مین صاحب روپیہ سب کے ساتھ علم کے معاملہ میں بھی بھل ہیں تو میں بددل ہو گیا اور ادھر دہلی آیا تو شمس العلماء مولانا عبدالرحمن صاحب نے جو جمعہ پر بے حد شفیق تھے فرمایا: "میں دو برس کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ اگر تم دہلی سے ایم۔ اے کرو تو میں تم کو اپنی جگہ بٹھا کر جھاؤں گا۔ یہ بات میرے لیے بڑی خوش کن تھی، میں نے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مولانا نے جو فرمایا تھا وہی ہوا، میرا ایم۔ اے کا نتیجہ آیا تھا کہ مولانا ریٹائرڈ ہو گئے اور میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں لکچرر مقرر ہو گیا۔

دہر دلعزیری، ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا! سرسید نے دوسری راہ کو اختیار کیا! یہ درحقیقت ان کی غیر معمولی اخلاقی جرات اور عزم و ہمت کی دلیل ہے اور اس لیے لائق ستائش!

سرسید کی وفات | لیکن یہ جراتمندانہ اقدام کرتے وقت سرسید اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ اسلام عقل سلیم اور قانونِ فطرت کا تقاضا ہی ہے کہ کوئی کام خواہ کتنے ہی اچھے جذبہ سے کیا جائے بہر حال اس کا طریق کار بھی اچھا ہونا چاہیے، ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوش و گرامی گزرا ہے اس کا نشانہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ سرسید یہ کرنے کو تو کر گئے۔ ٹرسٹی بل اکثریت سے منظور ہو گیا۔ لیکن سرسید کے اس طریق کار کا جو طبعی رد عمل ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا۔ سرسید کا سفینہ حیات مخالفات و طوفان میں گھر گیا۔ یہ ساری عمر ہر قسم کے طوفانوں کا بڑی حرأت و ہمت سے مقابلہ کرتے رہے تھے۔ لیکن سیم حوادثِ روزگار نے دل شکستگی اور آزر دگی خاطر کی اس منزل میں لاکھڑا کر دیا تھا جہاں ایک رستم دوراں کو بھی کہنا پڑتا ہے۔

بہت روز طوفان کی موجوں سے کھیلے

بس اب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

اور غالباً اسی قسم کا کوئی عالم تھا جس میں مرزا غالب ایسے کھلندے ہوئے ہنوٹ اور خوش باش شخص نے کہا ہے

رہے اب ایسی جگہ جل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
بے درد دیوار سا کھر بنانا چاہیے کوئی مہیا نہ ہو اور پاسبان کوئی نہ ہو
پڑیے گر نیار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اور اگر مر جائیے تو لوحِ خواں کوئی نہ ہو
تھوڑی بہت جو کسر باقی تھی وہ غبن کے مذکورہ بالا واقعہ نے پوری کر دی۔

علاوہ ازیں خانگی زندگی میں بھی بیٹے کی سخت علالت، سوء مزاج اور کھجور کی حد درجہ بددماغی کے باعث سرسید کو جو صدمات پہنچے انھوں نے سمندرِ ناز پہ تازیانہ کا کام کیا با اینہم صبر و ضبط کا یہ عالم کہ بقول مولانا حالی کے ”کبھی کسی نے اس کو ہدقہ شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہو گا۔“ اس قسم کے غیر معمولی صبر و ضبط کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان پر حیرت و گمشدگی کی کیفیت کا غلبہ ہو جاتا اور اس کی فطرتِ گفتار سلب ہو جاتی ہے، چنانچہ سرسید کو بھی یہی معاملہ پیش آیا مولانا حالی لکھتے ہیں :-

”مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے ان کو چپ لگ گئی تھی۔ بولتے بہت کم تھے اور ہاں اور نہیں کے جوابات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا ”آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟“ سرسید نے کہا: ”اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہو گا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔“

آخر ۲ مارچ ۱۸۹۷ء کو شب میں دس بجے کے قریب ایک محقر مگر سخت علالت کے بعد ملت اسلامیہ ہند کا یہ عظیم مجاہد اور قائد اپنے رب سے جا ملا اور اس نے جس ہمیشہ کے لیے چپ رہنے کی عادت ڈالنی شروع کر دی تھی آخر اس کا وقت موعود بھی آ گیا۔

کفن سر کاؤسر سے بے زبانی دیکھتے جاؤ

اللھم اغفر لہ وارحمہ

سرسید کی سیاسی پالیسی | چونکہ سرسید کی سیاسی پالیسی کا بہت گہرا تعلق ان کی تعلیمی پالیسی کے ساتھ ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اس پر بھی

گفتگو کی جائے۔

آج کل کے مدعیان قوم پرستی و وطن دوستی نے سرسید کی سیاسی پالیسی پر بڑی نکتہ چینی کی اور بہت لحاظ کیا تو بجائے لبرل کہنے کے ان کو قدامت پرست (CONSERVATIVE) کہا ہے۔ سرسید پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکتے تھے۔ اسی سلسلہ میں چند اور باتیں کہی جاتی ہیں مثلاً

(۱) جب وہ ۱۸۸۸ء میں سول سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے تو انھوں نے انگلینڈ کے سول سروس کمیشن کے بغیر اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کی مخالفت کی۔

(۲) انہوں نے جمال الدین افغانی کی اس تحریک کی مخالفت کی جس کے ذریعہ وہ عالم اسلام کے جدید مردہ میں حریت و استقلال کی روح بھونک رہے تھے اور جس کو عام طور پر پان اسلامزم تحریک کہتے ہیں۔

(۳) انھوں نے والسٹرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کی مخالفت کی حالانکہ سب سے پہلے اس کا مطالبہ انھوں نے ہی کیا تھا۔

(۴) سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے بالمقابل دی یونائیٹڈ پیڑیاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا مقصد انگریزی میں رسالے اور پمفلٹ شائع کرنا اور برطانوی پارلیمنٹ کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار و نظریات سے باخبر رکھنا تھا جو کانگریس کے مخالف تھے۔

(۵) انہوں نے ہندوستان کے وفادار مسلمان کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی۔

لیکن یہ اعتراضات صحتی ہیں سب سے بڑا اور اصل اعتراض یہ ہے کہ سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کی اس میں شرکت گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے اب ہم اس پر کلام کریں گے۔

سرسید کا نظریہ قومیت | اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ سرسید کے نزدیک قومیت کا کیا تصور تھا؟ جس شخص نے سرسید کے لکچروں، تقریروں اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید جب کبھی لفظ قوم بولتے تھے تو اس سے مراد بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستان کے سب باشندے ہوتے تھے۔ ایک تقریر میں جواہر لال نے ایک سپاسنامہ کے جواب میں ۱۸۸۸ء میں لکھی۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا :-

”لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے
یہی وہ معنی ہیں جس میں، میں لفظ نیشن (NATION) کی تعبیر کرتا
ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر حضانہ لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کہ
ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیونکہ جو بات ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے
کہ ہم سب خواہ ہندو مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں
ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک
ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی
مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو کہ
ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ جس زمانہ
میں، میں قانونی کونسل کا ممبر تھا مجھ کو اسی قوم کی یہودی کا دل
سے خیال تھا۔“

۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں ایک لکچر میں فرمایا۔

”درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں (ہندو اور مسلمان) باعتبار
اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے باہمی اتفاق
اور سہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی
ترقی و بہبود ممکن ہے۔ میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں
کہ ہندوستان ایک دلہن ہے اور اس کی خوبصورت اور رسیلی
دوا نکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر یہ دونوں آپس میں نفاق
رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔“

اسی بات کو اس سے زیادہ واضح اور مدلل طریقہ پر انھوں نے ۱۸۸۴ء
میں گورداس پور میں ایک تقریر کرتے ہوئے پھر دہرایا اور کہا۔

”پرانی تاریخوں اور پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہو گا اور اب
ابھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا
ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران
کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور مختلف
مذہب کے لوگ ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ غرض کہ
قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے تو پھر
ہندو اور مسلمانوں، کیا تم ہندوستان کے سراسر ایک اور ملک کے
رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ تو یاد رکھو
کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان
اور عیسائی جو بھی اس ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے
سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں

قلمی فائدے میں جو ان سب کا ملک ہے ایک ہونا چاہیے۔

آزادی وطن کا جذبہ | آپ نے دیکھا! قومیت سے متعلق سرسید کا نظریہ بعینہ وہی ہے جو ایک بڑے سے بڑے قوم پرور (نیشنلسٹ) کا ہو سکتا ہے اور جو ہونا چاہیے۔ یعنی ملکی اور وطنی معاملات و مسائل میں وہ مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کے فرقہ اور امتیاز کے قائل نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اپنے وطن کے لیے آزادی کا جذبہ بھی ان میں کسی سے کم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ والٹر رائے کی لیجس لٹیو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے جبری قانون ٹیکہ چیک جس کا مسودہ خود انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کو پیش کرتے ہوئے سرسید نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا۔

”میں منجملہ ان لوگوں کے ہوں جو کسی جبری قانون کو اشد ضروری حالت میں ہی قابلِ جواز خیال کرتے ہیں، ورنہ رعایا کی آزادی ایک حق منجملہ ان عزیز ترین حقوق کے ہے جو اپنے کمزوروں ہم وطنوں کی طرح میں بھی جن کی خواہش کرتا ہوں۔ ایک طبقہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے زور سے کہا:۔

”اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں، بہت بڑا لبرل ہوں، لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے جو شخص اس طرح کے الیکشن کے برخلاف تھا وہ میں تھا اگر میں چینی

۱۔ سید سب اقتباسات پر وفیر خلیق احمد نظامی کی فاضلانہ کتاب سید احمد خاں سے ماخوذ ہیں۔ آئندہ بھی سرسید کی سیاسی پالیسی کے عنوان کے تحت جو اقتباسات بغیر حوالہ کے آئیں وہ سب اسی کتاب سے ماخوذ سمجھنا چاہئیں۔ موصوف نے خود کئی بات بغیر حوالہ کے نقل نہیں کی ہے۔

شہنی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈرپن کی رائے میری ہی
ایسیج کے زور سے بدلی کہ (وکیل بورڈ اور میونسپل بورڈ میں)
ایک ٹلٹ کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ٹلٹ
انتخاب الیکشن سے۔

۱۸۶۹ء میں جب گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے
لیے برطانوی پارلیمنٹ میں بل پیش کیا گیا تو سرسید اس زمانہ میں انگلستان میں
مقیم تھے، وہاں سے انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا: حقیقت
میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے لیے ہے۔ اگر
انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا تو کل رعیت اس کی منوخی کی درخواست
کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اس زمانہ کے حالات
کو مدنظر رکھا جائے تو سرسید کے یہ خیالات ترقی پسندانہ ہی نہیں۔ بلکہ
انقلابی ہیں۔

کانگریس کی مخالفت | اب آئیے اس پر غور کریں کہ اس درجہ ترقی پسند
کے اسباب و وجوہ | اور انقلابی ہونے کے باوصف وہ کانگریس کے
اتنے مخالف کیوں تھے؟ اس سلسلہ میں مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری
نے مسلمانوں کے روشن مستقبل میں مفصل بحث کی ہے اور اس کا حاصل
یہ ہے کہ کالج کے قائم ہونے کے دس برس بعد تک تو سرسید کے خیالات
و افکار بہت اعلیٰ اور حریت پسندانہ رہے لیکن اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ
مسٹر بیک پرنپل کے زیر اثر آتے رہے یہاں تک کہ وہ سرسید کے سیاسی
فکر و ذہن پر ایسا چھا گئے کہ سرسید کا قلب ماہیت ہو گیا موصوف کے اس

مفروضہ کے جواب میں تو ہم صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی بڑے کانگریسی، حریت پرست اور محب وطن ہوں۔ بہر حال اس وصف خاص میں وہ پنڈت جواہر لال پر سبقت نہیں لے جاسکے۔ پنڈت جی سرسید کی سیاسی پالیسی کے بارہ میں لکھتے ہیں :-

پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان [بورڈز اہندوؤں کی کوشش سے وطن پرستی کی ایک نئی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ سرسید کے نزدیک اس تحریک میں شرکت سے مسلمانوں کی توجہ اور دھیان اصل تعلیم سے ہٹ جاتے اس لیے انھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی ہندو جو مغربی تعلیم میں مسلمانوں سے نصف صدی آگے تھے۔ حکومت وقت پر نکتہ چینی کرنے کا مشغلہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن سرسید اپنے تعلیمی کاموں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون چاہتے تھے اور اسی لیے حلد بازی میں وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کاموں کو نقصان پہنچے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو تمام کوششیں جدید تعلیم سے آراستہ ہونے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، اس تعلیم کے بغیر میرا خیال ہے۔ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں کم حیثیت ہو جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے تعلیم میں بھی آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورڈز و طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ مسلمانوں کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ وہ بورڈز و تحریک وطنیت میں شریک ہو جاتے۔ سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو ہمیں واضح طور پر معتدل نظر آتی ہیں۔ درحقیقت ایک قسم کا

انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں (سید احمد خاں از پر و فیر نظامی ص ۱۵۶)
 سچ یہ ہے کہ سرسید کے سیاسی فکر اور کانگریس سے ان کی علیحدگی کے اصل
 سبب کا تجزیہ پنڈت جی نے مندرجہ بالا بیان میں جس بالغ نظری، روشن دماغی
 اور حقیقت پسندی سے کیا ہے وہ اس بحث میں حرف آخر کا حکم رہا ہے۔
مولانا حالی کا بیان | اس سلسلہ میں مولانا حالی نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بھی
 پنڈت جی کے بیان سے ملتا جلتا ہے، لکھتے ہیں :-

”اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا
 نہایت فہموس ہے۔ لیکن کانگریس کی شرکت میں جو مصرتائج مسلمانوں
 کے حق میں پیدا ہوئے وہ ان کے لیے اس سے بہت زیادہ فہوسنا
 ہوتے۔ اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے
 کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایچی ٹیشن میں شریک
 ہونے سے باز رہے جو دیوانوں کے لیے ہو کی آواز اور ہشیاروں
 کے لیے خالی بادل کی گرج تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگریس
 کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال
 کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ کہنا پڑتا ہے کہ ’حلوہ خوردن را
 روئے بایہ‘۔“

اس کے بعد مولانا نے وہ تمام ذہنی تعلیمی، اخلاقی، معاشی، اور سماجی
 عیوب اور نقائص گنائے ہیں جن میں اس وقت مسلمان مبتلا تھے اور اسی
 اعتبار سے ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :-

”ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ ”اونٹ رساوت
 تیری کوئی کل سیدھی، جب ہمارے قوم (مسلمانوں) کا یہ حال“

تو کس برتے پر ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا منہ لیکر ہم گورنمنٹ سے ان حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں۔ مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے ان اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ اس لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپیک کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ۔

(حیات جاوید حصہ دوم ص ۱۱۵-۱۱۶)

محمد نیشنل کانفرنس | کانگریس تو کانگریس، محمد نیشنل کانفرنس جس کو میں شرکت سے انکار

۱۸۸۷ء میں سید امیر علی نے قائم کیا۔

تھا اور جس کی اس وقت وہی حیثیت تھی جو بعد میں مسلم لیگ کی ہوئی۔ جب سید امیر علی نے سرسید سے اس میں شرکت کی درخواست کی تو سرسید نے انکار کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کا مشترک پلیٹ فارم ہو یا کوئی انجمن صرف مسلمانوں کی ہو۔ بہر حال سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونا مضر ہو گا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی مثال | باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے زیر فیض و تربیت پنجاب کی غدر پارٹی اور بنگال کی انقلابی پارٹی کی طرح ان مجاہدین حریت میں سے تھے جنہوں نے ملک کو آزاد کرانے کی تحریک اس وقت

شروع کی تھی جب کہ کانگریس کے چہرہ پر سبزہ خط کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا اس جرم کی پاداش میں وہ جلا وطن کر دیئے گئے۔ یہ زمانہ انھوں نے افغانستان روس، ہنگری، زیمبرلاند، ترکی، بعض عرب ممالک اور حجاز مقدس میں بسر کیا اور عسرت و افلاس اور پریشانی کا وہ عالم گزرا ہے جو کانگریس کے نامی گرامی لیڈروں کو کم ہی پیش آیا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود جب مولانا مسلمہ میں تیس برس کی جلا وطنی کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو اب ان کے سیاسی ملک میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ بجائے مکمل آزادی کے مستعمراتی آزادی (DOMINION STATUS) کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان کو بدنام کرنا شروع کیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ! لیکن مولانا کی رائے میں کوئی تزلزل نہیں ہوا۔ وہ فرماتے تھے، میں آزادی کے سب سے پہلے علمبرداروں میں سے ہوں۔ لیکن جلا وطنی کے زمانے میں میں نے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ آزادی اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں بھی لاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے لوگ اب تک ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل نہیں بن سکے ہیں۔ اس لیے اب میری رائے ہے کہ مکمل آزادی کے بجائے ہم کو آزادی زیر سایہ برطانیہ کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ وہ زمانہ تحریک آزادی کے شباب کا تھا اس لیے مولانا کی رائے کی حیثیت ایک محذوب کی بڑے زیادہ ہو سکتی تھی؛ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے گزشتہ پچیس برسوں کی تاریخ کو سامنے رکھیے تو کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے درحقیقت ایک دیوانہ کی کجواس ہی تھی۔ مرزا غالب نے اس نکتہ کو کس بلاغت سے بیان کیا ہے :-

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں

پابستگی رسم ورہ عام بہت ہے

یہی وہ پابستگی رسم ورہ عام ہے جو قوم پروری اور حکومت پرستی ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے جھوٹے پیمانے باقی اور فیصلے کرتی ہے یہی وہ جھوٹے معیار اور پیمانے ہیں جنہوں نے محمد علی جناح اور حسرت موہانی کو فرقہ پرست بنایا اور انہوں نے ہی مولانا عبداللہ سندھی کی طرح سرسید کو اپنوں اور بے گانوں کی زبان سے کیا کچھ نہیں کہلوا یا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

سرسید کی ہندوؤں کی طرف سے | علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز
مالوسی اور اس کا رد عمل | نہ کرنا چاہیے کہ سرسید جو کچھ کر رہے تھے

اس یقین سے کر رہے تھے کہ ان کے کاموں کا فائدہ کسی خاص ایک گروہ یا ایک فرقہ تک محدود نہیں۔ بلکہ گورنمنٹ ہندو اور مسلمان سب کے لیے عام ہے۔ چنانچہ آغازِ کار میں اور اس کے بعد بھی برسوں تک ہندوؤں نے سرسید کے ان کاموں کی بڑی فخر کی اور مسلمانوں کے ساتھ خود انہوں نے بھی چند لے دیکر عملاً اور سرسید کو سپاس دے پیش کر کے اس قدر دانی اور دل سے منت پذیر کیا کہ قولاً ثبوت ہم پہنچا یا۔ لیکن حکومت کی پالیسی ہمیشہ جھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی رہی تھی۔ آریبل اے۔ بیج۔ مرزا

۱۔ چنانچہ انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں جو ایک نہایت اہم مکمل دیا تھا۔ اس میں کہا تھا: میری توجہ ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مائل رہی ہے اور اسی کو میں ہندوستان کے لیے قوم کے لیے اور گورنمنٹ کے لیے بہت مفید سمجھتا ہوں۔

لکھتے ہیں :-

”اول اول اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا، اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا سبب ہوا۔ (ہندوستان کا قومی ارتقاء (انگریزی) ص ۲۴۷)

اس بنا پر جب سرسید کی تحریک نے برگ و بار پیدا کرنے شروع کیے اور پورے ملک میں ان کی عظمت اور قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کیا جانے لگا تو ہندوؤں کی طرف سے سرسید کے کار (Cause) کی مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ اس مخالفت کی داستان بہت طویل اور المناک ہے۔ یہ مخالفت اردو اور ہندی کشمکش کی شکل میں شروع ہوئی جس نے ہندو قومیت کے جذبہ کو فروغ دے کر ملک کے دو اہم فرقوں میں مستقل سیاسی اور قومی نزاع پیدا کر دیا۔ ۱۸۶۷ء میں بہار گورنمنٹ نے اردو کو دفاتر سے خارج کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اثر پریشی میں ناگری حروف کو جاری کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہاں تحریک کا مرکز بنارس تھا چنانچہ اسی برس یہاں کے ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں سے اردو کو موقوف کرانے اور اس کی جگہ ہندی زبان اور دیوناگری حروف کو رائج کرنے کی تحریک شروع کر دی لیکن اس وقت مسلمانوں اور بعض ہندوؤں کی مخالفت کے باعث یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی ۱۸۸۶ء میں تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تو اب ہندوؤں نے پھر کمیشن کے سامنے ہندی کے مسئلہ کو پیش کیا ۱۸۶۷ء میں علی گڑھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک درخواست بھی تھی جس کا مسودہ خود سرسید نے تیار کیا تھا۔ اس درخواست میں گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک سررشتہ قائم کیا جائے اور کامیاب طلباء کو سندھ دی جاگیں لیکن اس کی مخالفت میں ہندوؤں

کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی کا
 انتظام کیا جائے۔ غرض کہ ہندوؤں کی طرف سے بار بار اردو کی مخالفت اور
 ہندی کے مطالبہ کی آوازیں اٹھتی تھیں اور سرسید اس کے جواب میں برابر مضامین
 لکھتے اور گورنمنٹ کو اس خطرہ کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ لیکن سرسید کی کچھ پیش نہ
 چلی اور یہ نزاع برابر شدید سے شدید تر ہی ہوتا چلا گیا، بہر حال جیسا کہ سرسید
 کے خطوط، ان کے مضامین اور تقریروں سے پتہ چلتا ہے ان حالات نے سرسید کو
 ہندوؤں کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا اور ان کا قومی یک جہتی کا خواب
 ایک خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ جب ہندوؤں کا رویہ
 اٹھی یہ ہے تو پھر آئندہ ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ مسلمان تعلیمی اور معاشی
 اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت پسماندہ ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے
 زیادہ نہیں۔ ہندوان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں
 چنانچہ زبان کے معاملہ میں ہندو مسلمان کا کیا سوال ہو سکتا ہے وہ تو ہوا
 اور پانی کی طرح مذہب کی بنیاد پر ناقابل انقسام ہوتی ہے۔ لیکن ہندوؤں
 نے اس معاملہ میں کبھی جھوٹ جھپٹ کی بجٹ اٹھا دی، ہندی کی تحریک کے زمانہ
 میں فرانس کے مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے ایک لکچر میں سچ کہا تھا۔ ہندو
 اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں
 کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ سرسید نے سوچا کہ اگر ان حالات میں اصلاحات
 کا (جن کو حقوق کہا جا رہا ہے) نفاذ ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوان
 سے فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی کریں گے اور مسلمان منہ تکتے رہ جائیں گے۔ سرسید کا
 ذہن کسی مسئلہ پر فرقہ پرستی کا محدود دائرہ میں بند ہو کر سوچنے کا عادی نہیں تھا
 اس بنا پر انہوں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوا تو اس میں صرف مسلمانوں کا نقصان

نہیں ہو گا۔ بلکہ ہندوؤں میں بھی جو کم تعلیم یافتہ اور کم خوش قسمت طبقات ہیں وہ بھی اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کی دوڑ میں کھینچ دی رہ جائیں گے اس سے ملک میں اباد کی اور طبقاتیت پیدا ہوگی اور یہ ہندوستانی سوسائٹی تباہ ہو جائیگی۔ چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے کہا۔

”اس (جمہوری حقوق کے) مطالبہ سے مختلف قوموں میں کش مکش اور تناؤ پیدا ہو گا چونکہ یہاں بنگالی تعلیمی میدان میں آگے ہیں اس لیے تمام سیاسی امتیازات کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہوں گے اور تمام ہندو، بہادر راجپوت، جوشیلے مرہٹے اور دوسری جنگ جو قومیں گورنمنٹ سے ناراض ہو جائیں گی، تشدد راہ پا جائے گا۔ اور ملک کا امن غارت ہو جائے گا۔“

اس بنا پر ان حالات میں ملک اور قوم کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ سیاست اور حقوق طلبی ان سب سے صرف نظر کر کے مسلمان خصوصاً (کیونکہ وہ ہندوؤں سے پیچھے تھے) اور سب باشندگان ہند عموماً اپنی تمام تر توجہ علوم جدیدہ کی تحصیل اور تعلیم پر مرکوز کھیں اور گورنمنٹ سے لین دین کے جھگڑے میں نہ پڑیں۔ چنانچہ سرسید نے صاف صاف کہا۔

”جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۸۲) ایک مرتبہ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۸ء ص ۹۹۱ پر لکھا۔“

”ہماری نصیحت ہمیشہ اپنے دوستوں کو یہی رہی ہے کہ رعایتوں کی درخواستوں کے پیچھے نہ پڑو اور قوم کو ناشدنی امر کا متوقع نہ کرو۔ بلکہ علیٰ طور پر قوم کی ترقی تعلیم پر کوشش کرو۔ (محوالہ روشن مستقبل ص ۳۰۸)

کھنڈ کی تقریر میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-
 ”جو چیز ہم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن
 ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے
 اوروں سے پست رہیں گے اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر
 پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں
 نے تم کو کی ہیں۔ تجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی تجھے دیوانہ کہے
 یا اور کچھ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باقی قوم کی بھلائی کی ہیں
 وہ ان سے کم ہوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے
 جو قادرِ مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے اپنے ہاتھوں
 کو دھو دوں۔“ (حیات جاوید حصہ دوم ص ۱۱۶)

نکتہ چینی کہتے ہیں کہ سرسید زندگی کے آخری برسوں میں بہت بدل گئے تھے۔ گزارش
 یہ ہے کہ جی ہاں! بہت بدل گئے تھے۔ لیکن دنیا میں بڑا سے بڑا لیڈر ایسا کون ہے
 جو حالات کی نبض پر اپنی انگلی نہیں رکھتا اور وقت کی سہاؤی کے رخ کو پہچان
 کر ان میں تغیر و تبدل کے مطابق اپنے فکر و عمل کے سانچوں کو نہیں بدل لیتا، یہ
 تبدیلی روشن ضمیری اور بیدار مغزی کی دلیل ہے۔ نہ کہ تلونِ طبع اور کمزوری
 کی۔ حالات کا صحیح رخ پہچاننا اور اس کے مطابق خود اپنے موقف میں تبدیلی
 پیدا کرنا جس طرح افرادِ واضح خاص کو توانائی بخشتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی
 اور ان کی بقا کا ضامن ہے۔ دور کیوں جالیے۔ خود کانگریس کی گزشتہ اور
 حال کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ تبدیلیوں اور قول و عمل کے تضاد کا ایک عجیب و
 غریب مرتعہ نظر آئے گا۔ جو کانگریس سمیت لوگوں کو یقین دلاتی رہی کہ تقسیم اس
 کے نزدیک ملک کو تباہ کر دے گی اور وہ کبھی اس پر رضامند نہ ہوگا! اچانک

تقسیم پر رضامند ہو گئی اور عوام منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس بنا پر ہم صاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ جزئی طور پر اور طریق کار کے اعتبار سے سرسید میں تبدیلی ضرور پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں ان کی افتاد طبع کے مطابق ان سے بعض معاملات میں بے اعتدالیاں یقیناً صادر ہوئیں لیکن ان سب کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ وہی جبار خانہ بند و قومیت جس کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے اشارہ کیا ہے اور وہی اکثریت کا گھمنڈ جس نے اقلیت کے جذبہ اخلاص کی کبھی قدر نہ کی۔ اور جس نے سرسید ایسے عالی ظرف انسان کو مجبور کر دیا۔ کہ مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے حکومت سے قرب کا سہارا لے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ استوار کرے۔ آج بھی اگر گوشِ حقیقت نبوٹ ہو تو سرسید کی قبر سے آواز آرہی ہے:-

در میان قدر دریا تختہ بندم کردہ
بازی گوئی کہ دامن ترکمن، شیار باش

- ۱۔ صاحبِ علم و ذوق اس سنہری موقع سے بہترین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔
 - ۲۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کے زیادہ سے زیادہ ممبر اور رسالہ برہان کے خریدار بنیے اپنے حلقہ احباب میں اس کی پوری سچی بھی فرمائیے۔
 - ۳۔ مکتبہ برہان کی اعلیٰ و معیاری مطبوعات خرید کر فائدہ حاصل کیجیے۔
 - ۴۔ مندرجہ ذیل پتہ پر فرست کتب، قواعد و ضوابط ادارہ، نئے پینتیس پیسے کے ٹرانک ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔
 - ۵۔ نوٹس:- آرڈر بھیجتے وقت اپنا مکمل پتہ خوشخط اور قریب لکھیں اسٹیشن فرم کیجیے۔ آرڈر کے ہمراہ کچھ رقم بطور پیشگی ضرور ارسال فرمائیے۔
- ادارہ ندوۃ المصنفین اردو بآ نزار دہلی

رسول شہید و مشہود

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت . ایم ۔ اے)

کتب سماویہ اور صحف انبیاء علیہم السلام کے اندر سرکارِ دو عالم ماحدِ بارِ مدینہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات اس کثرت اور تفصیل کیساتھ درج ہیں کہ انکے ذریعہ سے ذاتِ پاک کے تعین و تشخص میں از روئے عقل و انصاف کسی قسم کا ادنیٰ شک و شبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن علمائے اُمتِ ادھر کا حق تو جہ نہیں دے سکے۔ امام محمد بن مازنی جنہوں نے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی تھی اور ان کے بعد ان کے متبعین نے اسکو ایک مستقل فن بنا دیا انہوں نے عقلی دلائل سے تمام عقائدِ اسلامیہ کا ثبوت دیا اور یونانیوں کے مسلمات کو جن کا عقائدِ اسلامیہ پر برا اثر پڑتا تھا۔ وہم باطل اور دھوکے کی ٹٹنی ثابت کیا۔ اسی ضمن میں سب سے اہم اور محرکہ الارام مسئلہ ہمارے رسولِ مقبولِ روحی فداہ کی رسالت کا ثبوت یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا ثبوت دلائلِ عقلیہ سے اتنا مفید نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ ان کے مسلمات سے کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ مسلمات دو قسم کے ہیں ایک تو وہ مسائل ہیں جن کا مآخذ فلسفہ یونان تھا ان کا استیعاب تو علمِ کلام سے کیا گیا اور اس میں سلمان کا مہاب رہے لیکن دوسرا پہلو جو ان سب سے مؤثر تھا اور جسکی بنیاد ان کی کتب و صحائف سماویہ پر تھی اسی میں مسلمانوں نے صرف اتنی کوشش کی کہ ان کے صحائف کو محض ثابت کیا اور الزامی جواب کو کافی سمجھا حالانکہ یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں اگر کوئی استدلال ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ موجودہ توہم و داجیل میں عام اس سے کہ وہ صرف ہوں یا نہ ہوں آنحضرتؐ کی بعثت کی پیشینگوئیاں موجود ہیں

جن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اُن کو ثابت کیا جائے۔ بہر حال وہ کتابیں جو غیر مذاہب کی کفالت میں ہزار ہا سال سے چلی آتی ہیں ان کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کر کے حقائق کو سامنے لایا جائے۔

آج کل ہم مسافک دور سے گزر رہے ہیں جو بوجہ چند اس ناچیز کے نزدیک اسلام کیلئے لیٹھ رکھا علی الدین کلمہ کا زمانہ ہے۔ اسلام کی صداقت کے لیے بے شمار دلائل اس زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں اور غالباً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق دعویٰ پر مختلف مذاہب کے صاحب التحظیم انبیاء اکرام کی شہادۃ کا اظہار بھی اسی زمانے سے مخصوص ہے۔ وہ نہ کوئی دجہر سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے پیشتر مذاہب عالم اپنی اپنی مقدس کتابوں کو کس قدر اہتمام اور کوشش سے عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے جسکی داستان نہایت طویل ہے لیکن اب وہ منظر شہود پر لائی جا رہی ہیں۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں "تقابل مطالعہ ادیان" کے شعبے کھلتے جا رہے ہیں اور مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کر کے ان زبانوں کے مذہبی صحائف پر تحقیقی نظر ڈالی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر وید منتر جو کل تک اچھوتوں کیلئے ممنوع تھے آج تقابلی مطالعہ ادیان کی بدولت ویدوں کے نایاب پوشیدہ نسخے یورپ سے چھپ کر مشرق میں شائع ہو رہے ہیں۔ اور زبان سنسکرت اقصائے مغرب میں جلوہ فگن ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں اور ان کے صحائف کا ہے۔

مجھے تو اس میں بھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی پیش خبری نظر آتی ہے اسلئے کہ انتھک کوشش کرنے والے وہ حضرات ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کے نام لیوا ہیں۔ جناب مسیح علیہ السلام صبح کا وہ ستارہ تھے جو اتر عالم پر آفتابِ صالت کے آمد کی انجیل (بشارت) لائے تھے اور قرب قیامت میں لانیوالے ہیں۔ اسلئے آپ کے نام لیواؤں کی علمی خدمات خواہ وہ دین ہوں یا دنیوی آنحضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ذیل راہ ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ علمی کم مائیگی تمدن کا زوال

اھ علیہ دین کی بجائے تکفیر و تفسیق کی تخریبی کوششیں ایسے اسباب و قرائن ہیں جو اسلام کے مٹانے کیلئے کافی ہیں لیکن یاد رکھیے اللہ کے پیارے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درد و مصرت مسلمان ہی نہیں پڑتے بلکہ خود اللہ تعالیٰ ادا اسکے ملائکہ بھی مدد و معیضت کرتے ہیں۔ اگر کسی آلہ جہاں نامے اس درد و مصرت کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو مسلمانوں کا درد و مصرت (الامتناء واللہ) اب آفتاب رسالت پر ظلمت و تاریکی کے کسوف پھینک رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ادا اسکے ملائکہ کا درد و مصرت ان ظلماتی بادلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا سرخ انور بے نقاب کر رہا ہے۔ مذاہب قدیم پر جو مظہر پروردگار سے شائع ہو رہا ہے اس میں صداقت اسلام پر بے شمار دلائل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر عیسائی راہب اور علماء و فہمہ و فہمہ قلیط (اجرت) کی آمد کا انتظار کر رہے تھے تو آج اپنی علی موشگافیوں سے اسی محسن مسیحیلا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ثابت کر رہے ہیں۔ جناب مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کے شجرہ نسب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ کم احسان نہیں تھا اور یہ اسی احسان غظیم کا حقیر سا بدلہ ہے کہ یہ لوگ ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اور حق شناسانہ برداشت کر کے اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں کیا عجب ہے کہ ان کی ان جائزہ لگائی مشنوں کی جزا میں انھیں اسلام جیسی نعمت نصیب ہو جائے۔

مکابر و دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدس کو غیر مذاہب کے پیروؤں کے سامنے انھیں کی زبان میں اور انھیں کی مقدس کتابوں سے پیش کر دینا کام مسلمانوں کا تھا لیکن ہمارے علماء و اصلاحی کام کو تبلیغی کام سمجھتے رہے اور اس کام کو انجام نہ دے سکے تو اس میں بھی کچھ حکمت خداوندی پوشیدہ تھی مگر مسلمان ان مذاہب قدیم کی کتابوں کو قرآن گمانی سے نکال کر منقہ شہود پر لاتے تو ان کتابوں میں تحریر کا شبہ مسلمانوں پر کیا جاسکتا تھا لیکن ان کتابوں کے ظاہر کرنے والے ایک غیر قوم کے علماء تھے کہ جن میں مسلمانوں سے ایک گونہ مخالفت تھا اسلئے وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں محفوظ ہیں ہر قسم کی تحریر کے

ننگ و شبہ سے پاک رہیں اور شاید یہی حکمت تھی کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں سائبر اور وید وغیرہ کتب پوشیدہ رہیں اور یہ علمی خزانہ مسلمانوں کو ان کی ہر قسم کی بے باکی اور فقر کے زمانے میں دیا گیا تاکہ اس امر کی دلیل ہو کہ اسلام اپنی صداقت سوانے کے لیے دتی ہوئی شوکت کا محتاج نہیں بلکہ اس کے دامن میں وہ علمی جواہر رہیں گے بھی موجود ہیں جو ہزار ہا سال تک غیر مذاہب کے خزانوں میں بطور ایک نایاب عطیہ خداوندی کے مدفون رہے۔

اقوام عالم کے لیے ایک قابل غور نکتہ: اقوام عالم کے مشہور مذاہب میں یہودی و عیسائی، مجوسی و بودھ و زرتشتیہ دھرم سرفہرست ہیں۔ دنیا کی ان تمام اقوام میں انبیاء و مصلحین کا سلسلہ ایک زنجیر کی طرح مسلسل زمانہ کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔ ان تمام عظیم المرتبت انبیاء کرام ایشیوں اور وسطیٰ کی زندگی عوام کی زندگی سے اس قدر بلند تھی کہ بعض ان میں سے خدا، خدا کے اوتار اور خدا کے بیٹے سمجھ کر پوجے گئے اور جن کی شخصیات نے کروڑوں مردوں کو زندگی بخشی۔ ان کا نام زبان پر لانے کے لیے منہ کو مشک و گلاب سے پاک کرنے کی شرط ہے۔ انہوں نے اپنے پاک کلمات میں کہ جن کے متعلق کسی دنیوی غرض والا پلچ و فریب کا شائبہ تک نہیں ایک بنی موعود کے ظہور کی پیشینگوئی کی اور اس عہد و میثاق کو پورا کیا جو سورہ عمران میں مذکور ہے جس کو فوری کرنا شمارہ نمبر میں اجمالاً پیش کیا جا چکا ہے تو پھر ایسے بنی موعود پر ایمان لانا درحقیقت اپنے انبیاء کی اطاعت اپنے ایشیوں اور وسطیٰ کی فرمانبرداری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ انبیاء جو ہزار ہا سال پیشتر عرب سے دور و دداز ممالک میں مبعوث ہوئے ان سب نے ایک ہی عظیم و خیر خدائے برتر کی وحی سے ضربا کر ایک عظیم انسان تجی کے ظہور کی پیشینگوئی کی جو محض خبر کے رنگ کی نہیں بلکہ اس

کے ساتھ دلائل اور اللہ تعالیٰ کی زبردست قوت و قدرت کے نشانات ہیں جنکا پیدا کر لینا ایک کمزور انسان کی طاقت سے قطعی محال اور غیر ممکن ہے کیا یہ امر واقعہ اس قابل نہیں کہ دنیا کے عقلاء و دانشمندان اس امر پر غور کریں کہ ایک اجماعی محض اور دینوی علوم سے ناواقف وہ باتیں پیش کرتا ہے جو اس سے پیشتر کسی عالم نے نہیں بتائی۔ اُن باتوں کی اگر تشریح کی جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا۔ اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے صرف دو ایک باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

موعود نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو انبیاء عالم میں بہت سی خصوصیتیں حاصل ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضورؐ نے تمام انبیائے عالم کی تصدیق کی ان پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری قرار دیا۔ جیسا خود اپنی نبوت و رسالت پر اسلام کا یہ عقیدہ اس قدر مہم بالشان ہے کہ اس پر نہ صرف اتحاد اقوام اور مذاہب کی بنیاد قائم ہے۔ بلکہ اس عقیدے سے اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کر لی جائے تو مذاہب کی عمارت اسی وقت زمین پر آ رہتی ہے کیونکہ اسلام کے نزدیک مذہب ایک عالمگیر حقیقت ہے جو دنیا کی تمام اقوام کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا ماننے والا بنی الاقوامی انسان ہے۔ راکھنور کی بعثت سے پہلے کسی نبی نے یہ تعلیم نہیں دی اور نہ کل انبیاء عالم پر ایمان لانے کے عقیدہ کو کسی اور مذہب نے جزو ایمان بھڑایا۔ اس لیے اُس موعود نبی پر ایمان لانے والے مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ وہ یہودیوں سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اور عیسائیوں سے زیادہ حضرت عیسیٰ روح اللہ کے پیروں ہیں اور ان تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا جزو ایمان سمجھتے ہیں کہ جن کا ذکر فرقان حمید میں ہے اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ان کو بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں صفحات ۱۱-۱۲۸-۵۶۵-۵۷۵-۵۷۶-۵۹۹-۶۵۹)۔

تفسیر کنز الایمان از شیخ اہل السنۃ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب (نیز صفحات خطبات احمدیہ ۵۶۹ اور ۵۷۹ از سرسید احمد خاں مرحوم۔

نسل انسانی کی ہر امت میں انبیاء کی بعثت کو تسلیم کرنا تو ایک طرف اکثر و بیشتر مذاہب نے تو اس امر کو بھی کشادہ دلی سے تسلیم نہیں کیا کہ ان کا خدا دنیا کی دوسری اقوام کا بھی خدا اور معبود ہے، برہمن دھرم تو صرف آریوں کو الیہ اور کی اولاد سمجھتا رہا (زکرت ادھیاء ۶ کھنڈ ۲۶) ان کے خیال میں ویدوں کی گوئامتا صرف برہمن، چھتری اور ویش کو مدد دہا، نہ اور ان کی پرورش کرنے والی ہے (اتھرو وید کا نمبر ۱۹ سوکت ۱۷ ستر)۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا خداوند یہودہ صرف بنی اسرائیل کا خدا تھا، جان۔ ایس۔ ہیلنڈ "مختصر تاریخ تہذیب" میں لکھتے ہیں :-

THE GOD, WHOM THE JEWS WORSHIPED
HAD AT FIRST BEEN CONCEIVED OF AS THE
TRIBAL DEITY OF A NOMADIC PEOPLE FOR
MANY CENTURIES THE JEWS CONTINUED TO
CONCEIVE THIS GOD OF RIGHTEOUSNESS
AS THEIR GOD ONLY..... BUT THIS IDEA
THEIR OWN NATIONAL GOD WAS ALSO
THE GOD OF ALL OTHER MEN WAS NEVER
WELCOMED AND ADEPTED BY THE MASS
OF THE JEWISH POPULATION.

(A BRIEF HISTORY OF CIVILIZATION P. 72)

بہر حال دنیا کے مذہب میں جو یائے حق کے لیے یہ ایک قابلِ غور نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مصدّقِ انبیائے عالم تھے۔ یہ اتحاد اور این عالم کی بنیاد ہے اور انبیاء عالم سرکارِ دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدّق تھے۔ یہ دنیا کے مذہب کا حصن حصین اور حریم امن ہے۔ اس حرمِ پاک سے جو شخص باہر رہے گا وہ دہریت و لامذہبیت کا شکار ہوگا اس لیے نہایت ادب کے ساتھ اپنے بھائیوں سے گزارش ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی۔ یہودی ہوں یا مجوسی یا کوئی اور کہ وہ نہایت خراہی اور سنجیدگی کے ساتھ سطور ذیل پر غور فرمائیں۔

قانونِ شہادت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ :-

DECREMENTS ARE SUPERIOR TO ORAL
TESTIMONY AND ARE NOT TO BE OVER
RULED BY WITNESSES OR BY OATH.

یعنی تحریری سند زبانی شہادت پر فضیلت رکھتی ہے اور اسے گواہوں کی شہادت اور قسم سے مسزود نہیں کیا جاسکتا تو پھر غور کیجیے کہ یہ وہی تحریری اسناد اور الٰہی نوشتے ہیں جو مقدس انبیاءِ ارشیوں اور وحشور کی یادگار ہیں جن میں اللہ کے ان پاک اور برگزیدہ بندوں نے آنحضور کی ذاتی و صفاتی خوبیوں کو بتا کر پیشینگوئی کی ہے کہ (اسی نبی موعود محمد رسول اللہ) کا وہ چراغ ہے جبے داغ ہے اور جس کی روشنی کو دوام ہے وہی روشنی گمراہی سے بچانے والی ہے۔ اس لیے آئیے سب سے پہلے تو ریت و اناجیل کی شہادتوں پر غور کریں۔

توریت و اناجیل کی شہادتیں (۱) حضرت آدم کا کوئی الگ صحیفہ بائبل

میں موجود نہیں۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ حضرت آدمؑ کے متعلق فرمایا وہ بھی ان کے اصل الفاظ میں کہیں موجود نہیں جو حیثیت تاریخ کی نگاہ میں باقی قصصِ قرأت کی ہے وہی حیثیت قصہ آدمؑ کی ہے البتہ یہودیوں میں ایک کتاب "آدم و حوا" کے صحیفہ کے طور پر مشہور ہے جو یقیناً جعلی ہے اور غالباً حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سو دو سو سال پہلے کی تصنیف ہے۔ تاہم اس قصہ کو مسیحی دوستوں نے جناب مسیحؑ کے متعلق بطور پیشینگوئی سمجھ کر غلط استنباط کیے۔ پیشینگوئی کے الفاظ یہ ہیں :-

عنان کو ملعون ٹھہراتے ہوئے خداوند نے کہا "میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی اڑی پر کاٹے گا" (پیدائش باب ۳ آیت ۱۵) ابرص کا کتاب مقدس مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور ۱۹۵۶ء

مسیحی دوستوں کا کہنا ہے کہ جناب مسیحؑ نے کفارہ ہو کر سانپ (شیطان) کا سر کچل دیا اس طرح جناب آدمؑ کے سلسلہ کی پیشینگوئی پوری ہو گئی حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس دکھائی دیتا ہے کیوں کہ اناجیل کی تقریحات کی بنا پر مسیحؑ نے ہرگز شیطان کا سر نہیں کچلا وہ ان کے حواریوں میں گھسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً پطرسؑ میں ہو کر شیطان نے جناب مسیحؑ کو بے حد تکالیف پہنچائی۔ پطرسؑ کو جناب مسیحؑ کی سرکار سے شیطان کا خطاب لایا۔ انجیل متی ۱۶: ۲۳ میں ہے "پراس نے (مسیحؑ نے) پھر کے پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لیے ٹھوکر کا باعث ہے شیطان نے یہودا اسکوریوطی میں ہو کر خدا کے اکلوتے بیٹے کو صلیب دلا دی۔ اس کے

متعلق جناب مسیحؑ فرماتے ہیں :-

"کیا میں نے تم بارسوں کو نہیں چنا جو اور ایک تم میں سے شیطان ہے۔" (یوحنا ۶: ۷۰) اب رہا کفارہ کا عقیدہ اس کے متعلق کیا کہا جائے۔ اس نے گناہ کی جڑ کو بجائے کاٹنے کے اسے اور مزید تقویت دی۔ اس عقیدہ کی بنا پر بقول شخصے ہر گناہ داخل ثواب ہے آج۔ البتہ اس پیشینگوئی کی حقیقی مصداق جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ جنہوں نے اپنے صحابہ کو گناہ سے اس قدر نفرت دلائی کہ وہ گناہ یا شیطان کے حقیقی دشمن بن گئے۔ اور اس سے بیزار ہو گئے۔ شراب، جوا، زنا، چوری، جھوٹ، غرضیکہ ہر بدی و بدکاری ان سے دور ہو گئی۔ انہیں کے متعلق فرمایا گیا۔

"قال هذا صراط على مستقيمين عبادي ليس لك عليهم من سلطان۔ یعنی یہ سیدھا راستہ میری طرف پہنچتا ہے۔ میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی غلبہ نہیں۔" (۲۲: ۴۱: ۱۵)

جناب آدمؑ کی مذکورہ بالا پیشینگوئی کے متعلق خود جناب مسیحؑ شہادت دیتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے فرماتے ہیں :- میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رکھ کر تمہیں کہیں لیکن وہ فارقلیط (روح القدس) جسے باپؑ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تمہیں کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا باب ۱۴ آیات ۲۵ و ۲۶) اس پیشینگوئی پر تفصیلی بحث انجیلی ثارات کے ضمن میں کی جائیگی سر دست اتنا بتا دینا کافی ہے کہ فارقلیط جن کے تشریف لانے کی خوشخبری جناب مسیحؑ سنا رہے ہیں اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ فارقلیط مرکب لفظ ہے فارق + لیط۔ فارق بمعنی بھاڑنے والا یا سرکھینے والا۔ لیط بمعنی شیطان رحیم۔

اس طرح پورے لفظ کے معنی ہیں شیطان کا سر کھٹنے والا اللہ تعالیٰ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو خوشخبری حضرت آدمؑ کے ذریعہ سنارہا ہے وہ مسیحی لوگ جناب مسیحؑ پر منطبق کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے اس کی حکمت بالغہ نے مسیحؑ کی زبان سے کہلوادیا کہ اس بشارت کے مصداق وہ نہیں ہیں بلکہ فارعلی کی ذات گرائی وہ ہے جو میرے جانے کے بعد تشریف لائیں گے، اللہم صل وسلم وبارک علیہ۔

(۲) جناب حنوک (ادرلیں) کی پیشنگوئی | حضرت حنوک یا ادرلیں علیہ السلام جناب آدم علیہ السلام کی ساتویں پشت میں ایک جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں۔ ان کی عظمت و شان کا اندازہ توریت کی اس آیت سے ظاہر ہے کہ "حنوک تین سو پچاس خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔۔۔۔۔ اور غائب ہو گیا۔ اس لیے کہ خدا نے اُسے لے لیا؟ (توریت پیدائش باب ۵ آیات ۲۲، ۲۴) کتب جوہلی میں جو بائبل کے یونانی نسخہ میں شامل ہے ان کے متعلق لکھا ہے "اس نے سب سے پہلے علم و حکمت رسم الخط اور علم نجوم ایجاد کیا۔ خدا کے فرشتے تین سو سال تک اس کے ساتھ ساتھ رہے اور انھوں نے اسے زمین و آسمان کی ہر ایک چیز کا علم دیا۔ (جوہلی باب) قرآن عزیز میں انھیں صادق و صابر نبی بتایا جاتا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ علم رمل میں ماہر تھے۔ معراج شریف میں ان سے جو تھے آسمان پر ملاقات ہوئی۔ حکماء و فلاسفہ نے حضرت ادرلیںؑ کی تعلیم و نصائح کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ الحکماء از علامہ جمال الدین قسطنطینی نیز قصص القرآن جلد اول ص ۹۳ تا ص ۱۰۱۔

انھیں اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب دی جو صحیفہ حزق کہلاتی ہے۔ یہ پہلا عبرانی زبان میں تھی اور اب اکتوپیا زبان میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے ان کی دوری کتاب اسرار حزق ہے جو سالونیکا زبان میں موجود ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بلیکا کے مطابق تیسری چوتھی صدی عیسوی تک لوگ اس سے بخوبی واقف تھے بابل کے مروجہ نسخہ میں ان کی کسی کتاب کا ذکر نہیں لیکن آج کل بابل کے کھنڈرات نے جو الواح اگل دی ہیں ان میں حضرت حزق کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ وہ علم و حکمت اور بے نظیر اطاعت احکام الہی کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ فرقان حمید میں ان کے لیے د اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیقًا نَبِیًّا کہہ کر ان کی بے نظیر نبوت کی تصدیق کی ہے اور وَرَفَعْنَا مَکَانَ عَلَیَّا تَا کر ان کے لیے علم و حکمت عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ انھوں نے جو پیشینگوئی آنحضرتؐ کے متعلق کی ہے وہ یہوداہ کے خط سے ظاہر ہے۔ یہ خط عہد نامہ جدید میں شامل ہے (ملاحظہ ہو ص ۲۴۲ آیت ۱۴) اور مسیحی مسلمات سے ہے۔ خط کی عبارت یہ ہے :-

”حزق نے جو آدم کی ساتویں پشت میں تھا ان کی بابت بتایا کہ دیکھ خداؤ اپنے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آتا ہے تاکہ سبھوں کی عدالت کرے اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کی کاموں پر جو انھوں نے بے دینی سے کیے اور ساری سخت باتوں پر جو بے دین گنہگاروں نے اس کی مخالفت میں کی ہیں ملزم گردانے۔ یہ پیشینگوئی پوری کی پوری جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے اس لیے کہ :-

(۱) دس ہزار قدوسیوں کا آقا بجز جناب محمد رسول اللہ کے اور کوئی نہیں۔ فتح مکہ کے وقت یہ جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ وید بھی اسکی تصدیق

کہتے ہیں اور دساتیر بھی (۲) فتح مکہ کے وقت عدالت بھی ہوئی اہل یدنیوں کو ملزم بھی گردانا گیا (۳) مسیحی حضرات اسی خداوند اعظم کی آمد کے منتظر تھے۔ (۴) اس پیشینگوئی کے پیشتر یہ جناب مسیح نہیں ہیں کیونکہ یہود کا خط مسیح علیہ السلام کے بعد لکھا گیا ہے۔ جس میں انہیں اس پیشینگوئی کا مستحق نہیں گردانا گیا۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام کی پیشینگوئی | حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت یہودی دعیائی، محجوسی و ہنود نیز مسلمانوں بلکہ تمام اقوام عالم کے نزدیک مسلم ہے ان کی پیشینگوئی و بشارت سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم سب کے لیے قابلِ غور ہے۔ جناب نوح کو دیدوں و شاستروں میں ”نوح“ اور ژند اوستا میں ”یم“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں میں انھیں آدم نانی کہا گیا ہے۔ اسی طرح ”نوح“ کو دیدوں میں ساری نسلِ انسانی کا باپ بتایا گیا ہے۔ وید کے کم و بیش پچاس حوالہ جات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح قرآن عزیز میں ۲۸ سورتوں کے اندر ۳۴ جگہ حضرت نوح کا اجمالی و تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورہ اعراف، ہود، مومن، شعراء، قمر و نوح میں اہم تفصیلات درج ہیں۔ تورات موسوی اور ان الواح میں جو بابل کے کھنڈرات سے دستیاب ہوئی ہیں ایک حیرت انگیز منظر پائی گئی ہے۔ طوفانِ نوح کا قصہ گلِ گمشدہ کی شویٰ جو بابل کے کھنڈرات سے ملی ہے اس کی گیارہویں لوح کے پہلے چار کالموں میں کندہ ہے۔

توراة موسوی کی کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۴ میں جناب نوح علیہ السلام کی بشارت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

میں اپنی کمان بدلی میں رکھتا ہوں اور یہ ایک عہد کا نشان ہوگی میرے اور زمین کے درمیان اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین کے اوپر بادل لاؤں گا تو کمان

بدلی میں نظر آئے گی اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے اور ہر جاندار کے درمیان ہے یاد کروں گا اور طوفان کا پانی پھر نہ ہوگا کہ سب جانداروں کو تباہ کرے اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کروں گا تاکہ اس ہمیشہ کے عہد کو جو خدا کے اور زمین کے سب جانداروں کے درمیان ہے یاد کروں۔

اس پیشینگوئی کے الفاظ پر غور کیجیے تو دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔
 (۱) ایک یہ کہ جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانے میں بدلیوں کی کثرت تھی اسی طرح ایک زمانہ پھر آیا ہی ہوگا جس میں کہ بدلیوں کا زور ہوگا (۲) دوسری بات یہ کہ بدی کے طوفان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا طوفان نہیں آئے گا کہ کل دنیا کو شرارت اور بدی کی سزا میں غرق کر دے یعنی وہ اپنی کمان بدلی میں رکھتا ہے اس کی کمان اب بدلی سے باہر نہ ہوگی۔ یاد رکھیے بائبل، ژند اوستا، وید اور منہوی گل ٹمیش میں کمان اٹھانے کا محاورہ جنگ کی تیاری اور کمان رکھ دینے کا محاورہ جنگ ختم کر دینے کے لیے مستقل ہے اور خدا کا بدلی میں ہونے کا محاورہ رحمت کے پردے میں ہونے کے لیے بولا جاتا ہے (ملاحظہ ہو احبار ۱۶: ۲)

یہ پیشینگوئی نہایت واضح طور پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور ان کے زمانے کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی تائید جناب مسیحؑ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جو متی ۲۴: ۳۷ میں درج ہیں۔ جناب مسیحؑ نے فرمایا "جبکہ نوح کے دنوں میں ہوا دیا ہی ابن آدم (یعنی احمدؑ) کا آنا بھی ہوگا کیونکہ جس طرح طوفان سے پہلے لوگ کھاتے پیتے بیاہے جاتے تھے اس دن تک کہ طوفان آیا اور ان سب کو بہائے گیا اسی طرح ابن آدم کا آنا ہوگا۔ دو آدمی کھیت میں ہوں گے ایک پکڑا دوسرا چھوڑا جائے گا۔ دو عورتیں چکی پتی ہونگی

ایک پکڑی دوسری چھوڑی جائے گی۔ (مقی ۲۴ آیت ۳۷)

حضرت مسیح کے الفاظ پر غور کیجئے کہ بدی اور غفلت کا طوفان عالمگیر ہو گا مگر سب پکڑے نہ جائیں گے صرف حق کا دشمن ماخوذ ہو گا اور توبہ کر کے نیکی کی طرف رجوع کرنے والوں کو چھوڑ دیا جائے گا نیز ایسا وقت مسیح علیہ السلام کے جانے کے بعد آئے گا۔ اس طرح جناب عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف آنحضرتؐ وہ نبی ہیں جن پر پیشینگوئی صادق آتی ہے۔ اللہ کے حکم سے آنحضرتؐ نے جناب نوحؑ کی طرح بیشتر ہی سے اپنی قوم کو بتلادیا تھا کہ میرا اور تمہارا معاملہ نوحؑ اور ان کی قوم کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے جس طرح قوم نوحؑ تفرق ہوئی اور مومنین کو بچا لیا گیا۔ اسی طرح یہاں بھی ہو گا حسب بشارتِ توریت کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۱ جنگ کے بادل فضا میں چھا گئے مسلمانوں اور کفار میں رعد و برق کے خوب مظاہر ہوئے مگر خدا کی کمان بدلی سے باہر نہیں ہوئی بلکہ رحمت کی بدلیوں میں ہمیشہ نظر آئی پیشینگوئی کے مطابق اگر بدکار پکڑے گئے تو کثرت سے مومنوں اور تائبین کی جان بخشی بھی کی گئی۔ چونکہ آنحضرتؐ رحمت للعالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں اس لیے بھی اب منکرین اور بدکاروں کے ساتھ معاملہ نوحؑ کی قوم کی طرح نہیں ہو گا ان کی بد اعمالیوں پر سزا ضرور دی جائے گی لیکن انھیں نیست و نابود نہیں کیا جائے گا بلکہ تائب ہونے کا موقع دیا جائے گا اگر توبہ کر کے ایمان لے آئے تو اللہ کی طرف سے نجات کا وعدہ ہے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت | حضرت نوحؑ کے بعد عزت و

عظمت کے لحاظ سے جناب ابراہیم علیہ السلام دنیا کی تمام قوموں کے مشترک باپ ہیں قرآنِ عزیز کی ۲۵ کی ومدنی سورتوں میں ۶۳ آیات کے اندر ذکر مذکور ہے۔ ہندو صحابیوں کے نزدیک برہما جی ابو البشر ہیں۔ دیوتاؤں میں وہ سب سے پہلے پیدا ہوئے اور برہم و دیار (صحیفہ الہی) جو سب علوم کی بنیاد ہے اپنے بڑے لڑکے اقروداکو سکھائی۔

(ملاحظہ ہو منڈک اپنندا: ۱) اس لیے اھترو وید انھیں کی طرف منسوب ہے ان کا چھوٹا لڑکا انگریس تھا (ملاحظہ ہو گوپتہ برہمن) چنانچہ ازروے تاریخ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ بڑے حضرت اسماعیلؑ اور چھوٹے حضرت اسحقؑ۔ انھوں نے یہ تمنا کی کہ اے پروردگار عالم میں تیرا فرماں بردار ہونے پر بھی تنہا اور بے اولاد ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ میں اپنی مثل اپنی صفات کا دوسرا دیو (روشن پیغمبر) پیدا کروں اس نے سخت محنت مشاقہ سے ریاضت کی (گوپتہ برہمن ۱: ۱۱، بائبل پیدائش ۱۵: ۱ تا ۴) گوپتہ برہمن میں اس کے بعد افسانہ کے رنگ میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں میٹھے اور کھاری دو الگ الگ پانیوں سے اھترو اور انگریس پیدا ہوئے۔ میٹھے پانی سے اھترو اور کھاری پانی سے انگریس کی پیدائش ہوئی۔ میٹھے پانی سے مراد اھترو کی ماں پاربتی (ہاجرہ) جو حلیم مزاج اور صابر تھیں۔ کھارے پانی سے مراد انگریس کی ماں سرسوتی (سارہ) جو نہایت تنگ مزاج اور غصیلی تھیں۔

اس افسانہ میں بھی ایک حقیقت ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں بیٹوں کی نسل یعنی بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل میٹھے اور کھاری سمندر کی مثال ہیں۔ بائبل میں کئی جگہ کھاری اور میٹھے سمندر کی تمثیل آتی ہے۔ کھاری سمندر بنی اسرائیل ہیں جبکہ قربانیوں بچہ کی پیدائش وغیرہ کی رسوم میں نہایت سختی سے نمک کے استعمال کا ذکر ہے (اجازۃ: ۱۳، حوقل ۱۶: ۴) جناب مسیحؑ فرماتے ہیں: "اے بنو اسرائیل تم زمین کے نمک ہو۔" (متی ۵: ۱۳) کتاب شمارہ ۱۹: ۱۱ میں لکھا ہے "یہ نمک کا عبد خدا کے حضور ہمیشہ کے لیے ہے۔" بائبل کے ان بیانات سے آپ کو کھاری و نمکین سمندر کا پتہ چل گیا۔ اب آئیے شیریں اور میٹھے سمندر پر نظر ڈالیں جو حضرت ہاجرہ اور ان کی اولاد سے متعلق ہے۔ ارشاد باری ہے: "وہو الذی موح النجین ہذا عذب فرات و ہذا ملح اجاج و جعل بینہما برزخا و حبرا" (سورہ ابراہیم: ۱۵)

کھجور (۵۲:۲۵) اور اللہ وہی ہے جس نے دو سمندر چلا رکھے ہیں یہ میٹھا ہے اور بہت میٹھا اور وہ کھاری ہے سینہ جلانے والا۔ ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے اور روکنے والی روک ہے۔ گویا بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل دو میٹھے اور کھاری سمندر ہیں۔ اَلْمُؤْمِنُ حُلُوٌّ مُّوْمِنٍ شَرِیْں ہوتا ہے (حدیث) ان میٹھے اور کھاری سمندروں کے ملنے میں صدیوں سے ایک روک ہے۔ مگر اب موج البحرین ملتقیان بینہما برزخ لا یشیان (۲۱: ۵۵) یہ بہتے ہوئے دونوں سمندر ملا دیے جائیں گے ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جس سے ایک دوسرے پر بغاوت نہیں کر سکتے۔ غور کیجیے یہ شرقی و غربی آریں اور سامی یا اسرائیلی و اسماعیلی دو سہارے اور میٹھے سمندر ہیں جو اقوام عالم کے باپ برہما جی یا حضرت ابراہیمؑ سے پیدا ہوئے ہیں ابراہیمؑ کی اولاد میں سے اس پیشنگوئی کا مبشر نبی اس برزخ (ادٹ) کو کاٹ کر دونوں سمندروں کو ملا دے گلجنا ابراہیمؑ کی نسل کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا اور کل امت واحدہ کا سبق پڑھائے گا۔ جبکہ بنی اسرائیل نے صرف اپنے انبیاء کی تصدیق کی۔ آریوں نے صرف اپنے رشیوں کو تسلیم کیا۔ لیکن پیشنگوئی کا وہ موعود برہما اور دعاء ابراہیمؑ آتا ہے جو ابراہیمؑ کے گھرانے کی تمام بکھری ہوئی قوموں کو یکجا جمع کرے گا۔ مسیح اس لیے آئے کہ صرف بنو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کریں۔ لیکن وہ موعود نبی (محمدؐ) اس لیے مبعوث ہوئے کہ تمام دنیا کی گم شدہ قوموں کو یکجا اکٹھا کریں۔ اتنا سمجھ لینے کے بعد اب ذرا اس پیشنگوئی پر نظر ڈالیں جو پیدائش باب ۱۲ آیت ۲ میں محفوظ ہے۔

(باقی آئندہ)

تفسیری رجحانات اور نئی تفسیر کی ضرورت

ڈاکٹر معین الدین اعظمی

روئے زمین پر قرآن کے علاوہ کوئی ایسی دینی کتاب نہیں ہے جس نے دنیا چہ کے بعد اپنا آغاز اس چیز سے کیا ہو کہ اس کی صداقت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ الحمد للہ کتاب کا دیب فیہ اور اگر کوئی آدمی اور خاص کر تعلیم یافتہ خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو اگر اس جملہ سے قرآن کی ابتدا پر سنجیدگی سے غور کرے تو وہیں اس کو اس کتاب کی عظمت کا اندازہ ہونے لگے گا اور معلوم ہو گا کہ اس کتاب کا ایک ایک جملہ اور لفظ کسی خاص حکمت کے پیش نظر رکھا گیا ہے جو خاص وقت اور مطالعہ چاہتا ہے۔

واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے شروع ہی سے اس کتاب مقدس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اور پہلو سے اس کی تعلیمات کو جاننے اور اس کو مشعلِ راہ بنانے کے لیے شاندار کوشش کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کا جو مفہوم بالکل آغاز میں تھا وہ باقی نہ رہ سکا یعنی شروع میں تفسیر کا فن مستقل فن نہ تھا لیکن یہ علم حدیث کا ایک جزو تھا اور جب کسی آیت کی تفسیر اور اس کا مطلب سمجھنا ہوتا تھا تو رسول اللہ اور اس کے اصحاب سے اس سلسلہ میں جو مروی ہوتا تھا اس کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تفسیر کو تفسیر بالرائے یعنی من مانی یا خیالی تصور کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس مفہوم و تصور کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کا ذخیرہ بہت ہی معمولی تھا اور اس دائمی چشمہ سے پورے طور پر فیض یا

نہیں سہا جاسکتا تھا۔ لہذا علماء کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ عقل اور اجتہاد کو کبھی قرآن کی تفسیر میں دخل سہنا چاہیے۔ مگر عقل کا یہ استعمال قرآن میں ایک جائز حدود اور دائرہ میں سہنا چاہیے۔ یعنی قرآن کی تفسیر جو بھی ہو اگر وہ عربی اصول اور قواعد کے لحاظ سے درست ہے تو وہ تفسیر بالرائے نہ ہوگی۔

تفسیر میں یہ طریقہ ماثور یعنی ایک آیت کی تفسیر کلام رسول اور اقوال صحابہ سے کرنا سب سے پہلے رائج ہوا، اس اصول و نہج پر جو مشہور تفسیریں لکھی گئیں وہ یہ ہیں :- تفسیر ابن عباس، تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر، سیوطی کی تفسیر الدر المنثور، تفسیر ماثور کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تفسیریں بھی وجود میں آنے لگیں۔ جن میں ماثور کم اور دوسری عقلی اجتہادی اور خصوصی باتیں زیادہ ہوتے گئیں۔ اعتقادی تفسیر جیسے زنجیزی کی مشہور کتاب 'کشاف' صوفی رحمانی کے مطابق تفسیر جیسے ابن العربی کی تفسیر، اسی طرح شیعہ تفسیر اور عیسائی و کلامی تفسیر جیسے امام رازی کی تفسیر مفتاح الغیب۔ ان مشہور و عام رجحانات کے علاوہ اور بھی مختلف نقطہ ہائے نظر سے تفاسیر وجود میں آنے لگیں۔ جیسے نحوی، ادبی، فقہی، تاریخی اور سامنی لحاظ سے۔

غرض قرآن جو انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوا تھا ہر گوشہ سے معرین نے اس سے روشنی حاصل کرنی چاہی اور اس چیز میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اصلی مقصد اس لحاظ سے ثانوی ہو گیا کہ دوسری بحثیں بہت زیادہ شروع ہو گئیں اور باوجود اس کے کہ اصول تفسیر کے کچھ شرائط مقرر کر دیے گئے تھے ان کی پابندی نہ ہو سکی۔

میرا مقصد یہاں تاریخ تفسیر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اہم تفاسیر

اور اہم تفسیری عجائبات کا ایک جائزہ لینا ہے۔ ورنہ میں اس کو تفصیل سے بیان کرتا۔

یہاں پر ایک عجیب بات ہے اور وہ یہ کہ تفسیر میں ہر ایک مفسر نے اپنے پہلے مشہور مفسر سے اس قدر چیزیں نقل کی ہیں کہ ایک تفسیر کے طالب علم کو حیرت ہوتی ہے اور خاص کر تفسیر کی وہ کتابیں جو تفسیر باؤد کے نام سے موسوم ہیں، لہذا جب کوئی تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر الدر المنثور میں باہم موازنہ کرے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی اور ان تفاسیر میں مروج روایات کا اس قدر وافر حصہ ہے کہ بسا اوقات وہ قرآن کے ربط اور نظم معنوی کو منقطع اور درہم برہم کر دیتا ہے۔ نیز ان تفسیروں میں اس قدر سطحیت نظر آتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ظاہری معنی کے علاوہ اس کے اندر کیا فلسفہ اور کیا حکمت ہے اس تک رسائی نہ ہو سکی۔

دوسرے مکتب خیال کی تفسیر جس کو اعتقادی یا اپنے خیالات و افکار کے مطابق قرآن کی تفسیر کہاجائے ان میں تفسیر کشاف ہے۔ اس تفسیر نے سب سے پہلے قرآن کے اندر جوادبی لطافت اور معنوی نظم ہے اس کو اس طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ قاری مطمئن و متاثر ہو جائے اُس میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے عقلی تحلیل پر خاص زور دیا جو تفسیر باؤد میں نہیں پائی جاتی۔

مگر عجیب لطف ہے کہ مفسرین اس کو معتزلی قرار دیتے ہیں اور اس کو مستحقہ تفاسیر میں شامل نہیں کرتے لیکن اس سے مفسرین نے اس قدر فائدہ اٹھایا ہے اور متاثر ہوئے ہیں کہ میرے خیال میں اگر تفسیر طبری سے زیادہ

نہیں۔ تو تفسیر ابن کثیر اور الدر المنثور سے کہیں زیادہ اٹھایا اس تفسیر کے اندر گو
اعتزال تھا۔ مگر جو اچھائیاں تھیں اگر دوسرے مفسرین ان اچھائیوں کا اد جا کر کرتے
تو قرآن کی تفسیر صحیح سمت میں دور تک پہنچ سکتی تھی۔

تیسری تفسیر جس پر مفسرین نے عام طور پر تنقید کی ہے اور بعض لوگوں نے
یہاں تک کہہ دیا کہ تفسیر کے علاوہ اس میں ہر چیز ہے وہ تفسیر مفتاح الغیب
ہے جو تفسیر رازی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیان ایک متعطفانہ بیان تھا
کیوں کہ مفسرین اس تفسیر سے تفسیر کشاف سے بھی زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔
اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ عقلی طور پر امام رازی ہر قسم کے مسائل اور
علوم کا استخراج کرتے ہیں اور ہر مسئلہ میں نقلی و عقلی دونوں تاویلیں تفصیل
سے بیان کرتے ہیں۔ میں نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ مفسرین انھیں اقوال
میں سے اپنے پسند کے لحاظ سے کوئی تاویل اختیار کر لیتے ہیں اس تفسیر کی
دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظم معنوی کو اجاگر کرنے کی قابلِ تائیس
کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں بہت ہی واضح قسم کا ربط معنوی موجود ہے۔
ان کے علاوہ جتنی بھی تفسیریں ہیں اگر وہ تفسیر ماثر میں سے ہیں تو طبری
ابن کثیر اور الدر المنثور سے متاثر ہیں اور اگر عقلی ہیں تو کشاف اور رازی
سے سخت متاثر ہیں اور حدت ابتکار اور اصلیت اور نئے منہج و اسلوب کا
ان میں فقدان ہے اس طریقہ علوم قرآن پر جو کتابیں ہیں ان کا بھی یہی
حال ہے۔ یعنی لوگوں کو تفسیر پر کام کرنے کا شوق بہت ہوا مگر اس میں
محققانہ بات کہنے کی ہمت کم ہوئی مثال کے طور پر آپ امام زرکشی کی کتاب
البرہان فی علوم القرآن اور امام سیوطی کی کتاب الا تقان فی علوم القرآن
کا موازنہ کیجے تو پتہ چلے گا کہ امام سیوطی صاحب نے صفحے کے صفحے زرکشی

کی کتاب البرہان فی علوم القرآن سے بغیر حوالہ کے نقل کئے ہیں۔
 ان تمام تفاسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں دو باتیں مشترک ہیں اور وہ یہ ہے
 کہ ان میں ہر مسئلہ پر مختلف رایوں کو جمع کر دیا گیا ہے اور قطعی اور محققانہ رائے
 کم ملتی ہے۔

اب ہم ان تفسیروں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد دو تین صدی کے اندر ہندوستان
 و مصر میں تفسیر پر جو کام ہوا ہے اس کا سطحی جائزہ لیتے ہیں۔
 ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے بعد سے تفسیر پر بہت قابل قدر کام ہوا ہے
 حضرت شاہ صاحب نے اپنے وسعت مطالعہ اور اجتہادی رائے کے ذریعہ
 بہت سے مسائل پر محققانہ بحث کی۔ اپنے علوم قرآن کے مسائل جیسے اسباب
 نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات اور دوسرے مسائل پر سیر حاصل بحث
 کی قرآن کا ترجمہ کیا جو تفسیر کے مانند ہے۔ اس کے بعد تفسیر کا کام بہت تیزی
 سے آگے بڑھا اور تفسیر میں مولانا فراہی، مولانا نقی اور مولانا آزاد کی
 بہتر تفسیریں ملیں۔ ان تفسیروں میں نظم معنوی کا کافی خیال کیا گیا ہے۔ ساتھ
 ہی اس بات کا بھی الزام کیا گیا کہ مختلف تاویلات میں سے جو تاویل صحیح ہو
 اس کو نقل کیا جائے اور بقیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

ہندوستان کے مفسرین میں سے فراہی صاحب کے یہاں ابتکار و اور جدت
 سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے قرآن کی ایک قطعی تاویل پر زور دیا۔ فراہی
 صاحب نے گوپوری تفسیر نہ کی کیوں کہ عام اور سطحی تفسیر کو وہ پسند نہ
 کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ محققانہ بات کرنے پر زور دیتے تھے۔ انہوں نے قرآن
 میں نظم معنوی کے وجود اور اس کو تلاش کرنے کے مختلف نقلی اور عقلی اصول
 بتائے۔ اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نظم قرآن پر گویا رائے ابوبکر الشافعی

کے زمانہ سے موجود تھی اور زرخیزی و رازی کے علاوہ دوسرے مفسرین نے بھی اس کی طرف توجہ کی۔ مگر امام فراہی نے نظم قرآن کو جاننے کے لیے سب سے پہلے اصول و قواعد بنائے اور اس کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا اور اس طرح تمام متقدمین و متاخرین و معاصرین پر سبقت لے گئے۔ اس طرح اگر فراہی کے اصول تفسیر کے مطابق تفسیر کی جائے تو سب سے پہلے آیت کی صحیح تاویل سامنے آئے گی پھر قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں باہم گہرا تعلق سامنے آئے گا۔

عرب دنیا میں مصر میں تفسیر پر دو تین صدی میں بہت اچھا کام ہوا ہے جو مختلف اعتبارات سے ہندوستان سے کہیں زیادہ بہتر اور عمدہ ہے ان میں شیخ عبدہ نے جو تفسیر کی اور جو اصول اور منہاج بنائے وہ پرانی تفسیر کے مقابلہ میں بہت عمدہ ہیں۔ اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ قرآن انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوا، لہذا سب سے پہلے مفسر کو قرآن میں یہ چیز حاصل کرنی چاہئے۔ ساتھ ہی اس تفسیر میں قرآن کی ادبی فنی اور نظم معنوی کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن بہت التزام کے ساتھ نہیں۔ یعنی ثانوی حیثیت کے ساتھ شیخ رشید رضا کی تفسیر چونکہ شیخ عبدہ کی تفسیر کا اکمال ہے، اس لیے اس پر کلام و بحث کرنے کا خاص فائدہ نہیں۔

۲ مصر کی دوسری تفسیروں میں سید قطب کی مشہور تفسیر فی ظلال القرآن ہے۔ یہ مکمل تفسیر ہے اور اسلوب و بیان کے لحاظ سے تمام تفسیروں میں عمدہ ہے۔ ان تفسیروں میں قرآن کی فنی خوبیوں کو اس قدر پیارے انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔ البتہ معنوی نظم و ربط اس قدر محقول و مضبوط نہیں ہوتا۔ یہ تفسیر بہت عمدہ ہے، مگر مولف نے نظم معنوی کے ادراک کے لیے کوئی اصول بیان نہیں کیا۔ جس سے دوسروں کو کچھ

آسانی ہو، اس تفسیر میں ایک کمزوری مجھ کو یہ نظر آئی کہ تفسیر و تاویل میں محققانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے اور بہت جگہوں پر کمزور، نقلی تاویلات و اقوال پر اعتماد کیا گیا ہے اور اجتہادی و محققانہ چیز کم ہے۔

۳۔ مصر میں تیسری تفسیر جو چند سورتوں کی تفسیر ہے مگر باقاعدہ ایک اصول اور منہج رکھتی ہے، اس منہج کے ذریعہ پورے قرآن کی تفسیر کی جاسکتی ہے وہ ہے ذاکر بنت الانطاہی کی التفسیر البیانی للقرآن، یہ بالکل ایک نئے منہج اور اصول پر لکھی گئی ہے جو تفسیر کے مقدمہ اور امین المحضی صاحب کی کتاب منہج تجدید فی النحو والبلاغت والتفسیر والادب میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس منہج کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کی موضوع کے لحاظ سے تفسیر کرنے پر زور دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کو موضوع کے لحاظ سے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاة، قصص احکام اور تبلیغ کو مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ لہذا جب کسی چیز کی تفسیر مطلوب ہو تو پورے قرآن میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے اور تاریخ نزول کے اعتبار سے اس کا پورا علم حاصل کرنا چاہیے اور پھر اس کی تفسیر کرنی چاہیے۔

اس تفسیر کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ہر آیت پر از سر نو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور کسی بھی معسر کے قول کو بغیر تنقید و تحقیق کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس تفسیر میں تمام نقلی و عقلی اور دوسری تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو لے کر دوسری تاویلات کے بطلان اور کمزوری کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اسرائیلیات کا جو تسلط ہو گیا تھا اس کو باطل کیا جاتا ہے اس طرح یہ بہترین تفسیر ہے۔

سوریا میں ڈاکٹر محمد المبارک نے بھی اپنی کتاب المنہل الخالد میں قرآن کی

تفسیر کا ایک طریقہ پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ محمد قطب اور بنت الناطلی کے طریقے سے ملتا جلتا اور مشابہ ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن کے نظم معنوی اور ادبی خوبصورتی کی طرف خاص اہتمام کیا ہے۔ مگر انھوں نے نظم معنوی تلاش کرنے کے لیے کوئی اصول نہ بتائے بلکہ اس کو لوگوں کے ذوق و ذہانت اور وجدان پر چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے صرف چند سورتوں کا نمونہ پیش کیا۔ کاش وہ پورے قرآن کی تفسیر اس انداز سے کر دیتے تو اسرائیلیات اور قیاسی باتوں کا جو ایک بہت بڑا ذخیرہ قرآن کی تفسیر میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ دور ہو جاتا اور قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کا راستہ ایک خاص منزل تک پہنچ جاتا۔

ہندوستان کے علامہ فزای اور مصر کی ذاکرینت الناطلی کی تفسیر میں مجھ کو بہت پسند آئیں، کیونکہ ان دونوں تفسیروں میں کئی چیزیں بین طور پر مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ قرآن کی قطعی تفسیر یعنی اس بات کی تحدید کہ قرآن کی کیا مراد ہے۔

۲۔ بلاغت قرآن کا ظہور۔

۳۔ اسرائیلیات جو قرآنی کی تفسیر میں بڑی حد تک سرایت کر گئی ہیں ان کا اخراج۔

۴۔ اخلاق احکام کے حلت و حرمت کا فلسفہ اور ان کے دور رس فوائد و نتائج کا انکشاف۔

۵۔ اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات، قسم قرآنی، اور مقطعات کے مسائل کا حل اور ان پیچیدہ مسائل کی اقرب ترین تاویل۔
نئی تفسیر کی ضرورت اور طریقہ تفسیر۔

یہاں پر ایک اہم سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تفسیر اور علوم تفسیر پر اس قدر ذخیرہ موجود ہے تو پھر نئی تفسیر کی کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا اصول ہونا چاہیے۔

اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔

(۱) تفسیریں موادِ تنظیم و تنسیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے آخری منزل کو پہنچ گئی ہیں جس کے بعد اس میں تحمین و تکمیل کی گنجائش نہ ہو۔
(۲) قدامِ مفسرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے یہ کتابیں لکھی تھیں، مگر اب جبکہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور کم وقت میں زیادہ چیز جاننے کی ضرورت ہے لہذا ان تفسیروں میں جو بہت سی دور از کار چیزیں آگئی ہیں، جن کی جہاں ضرورت نہیں تھی مگر اس زمانہ کے لحاظ سے مفید تھیں، ان سے نئی تفسیر کو خالی ہونا چاہیے۔

(۳) ان تفسیروں کی زبان بھی بہت خشک اور بالماثل ہے۔ نیز ان میں اس قدر تکرار اور ایک دوسرے مواد کی ترتیبِ ثویب اس قدر خلط ملط اور نقص ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ بہت زیادہ ہیں بہت کم ہیں۔

(۴) موجودہ عمدہ تفسیریں جن کا ابھی ذکر ہوا وہ نامکمل ہیں اور صرف چند سورتوں کی تفسیر ہیں۔

(۵) سابقہ تفسیر قدیم و جدید انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں اس وقت عام اسلام و عرب کی مشترکہ کوشش سے تدریجی طور پر مجموعی لحاظ سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور تفسیرِ قرآن اور علومِ قرآن کے سلسلہ میں مختلف مباحث پر مختلف کمیٹیاں قائم ہوں جن میں عالم اسلام و عرب کے دو ممتاز علماء شریک ہوں جن کا قرآنیات سے گہرا تعلق ہو اور ہر کمیٹی کے نتیجہ کو دوسری کمیٹی تنقیدی نقطہ نظر

سے دیکھیے اور مباحثہ کرے۔

اس مشترک سچی کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ قرآن میں جس قدر بے پایاں علم ہیں اور جس ذات کی طرف سے اتر رہے ایک انسان اس کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نئی تفسیر کا کیا طریقہ اور کیا منہج ہونا چاہئے۔ اس کے لیے اسکیم اور کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں تدریجی طریقہ کا اپنانا مفید ہوگا۔

سب سے پہلے جو تفسیر لکھی جائے، اس میں اس فکر کی کلی تطبیق ہو جس کو معاصرین انجام طور پر تسلیم کیا ہے مگر عمدہ کام بہت کم ہوا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کو شروع سے آخر تک فکری لحاظ سے منظم و مربوط کتاب مانا جائے۔ جس کے علمبردار اس زمانہ میں ہندوستان کے علامہ فراہی ہیں۔ اس فکر کے مویدین کی یہ دلیل بہت محقول معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آیتوں کو مختلف سورتوں میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک ہی باب و سورت میں تمام آیتوں کو جمع کر دیا جاتا مگر افسوس ہے کہ اس منہج پر کوئی بھی مکمل تفسیر نہیں ہے اور جو ہیں ان میں باقاعدہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے اور جو فکری و معنوی ربط و تعلق بنائے گئے ہیں وہ بابت اوقات کمزور اور عقلی لحاظ سے ناقابل قبول ہیں۔

اس سلسلہ میں نظم الدرر فی تناسب الآی و السور اور تفسیر کشاف، رازی، عبیدہ رشید رضا، سید قطب اور ہندوستان میں مولانا فراہی مولانا کھانا بڑی مولانا آزاد کے یہاں بہت کچھ مواد مل جاتا ہے۔

مولانا فراہی ان تمام معنوں میں تنہا مفسر ہیں جنہوں نے قرآن میں نظم معنوی کو معلوم کرنے کے لیے مستقل کتاب دلائل النظام لکھی اور اس میں قرآنی نظم کو

معلوم کرنے کے لیے بہت سے نقلی و عقلی طریقے بتائے۔
مولانا فراہی نے قرآن فہمی میں چالیس سال گزارے مگر وہ پوری تفسیر نہ
لکھ سکے۔ کیونکہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا اس پر ان کو قدم قدم پر دشواری
سامنے آئی۔

اس طریقہ پر تفسیر کرنے سے فراہی صاحب کے قول کے مطابق مختلف
و متضاد تاویلات میں سے صحیح تاویل کھل کر سامنے آجاتی ہے اس قسم کی
جو تفسیر کی جائے تو ہر سورت کی ابتدا میں اس کے موضوع، موضوع کے جزئی
و یفکی عناصر کو خلاصہ کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ ہر سورت مکمل خیال و
موضوع کا ایک پیکر معلوم ہو۔

۲۔ دوسری تفسیر موضوعی لحاظ سے ہر جس طرح کی مصر کی ذکر و ثبت
الفاظ نے کی ہے۔

۳۔ جب یہ دونوں تفسیریں مکمل ہو جائیں، اس کے بعد ان کے اندر جو
مشترک چیزیں ہیں ان کی روشنی میں ایک تیسری تفسیر لکھی جائے اور جہاں
کہیں اختلاف ہو اس کو از سر نو غور کیا جائے۔ اس طرح ایک بہترین تفسیر
وجود میں آسکتی ہے جو تمام تفاسیر سے اصح اور مفید ہوگی۔

اس قسم کی تفسیر کی تیاری کے ساتھ علوم قرآن کے مختلف اہم پہلوؤں
پر نہایت محققانہ مستقل بحثیں ہونی چاہئیں اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ نظم قرآن کو کیسے جانا جائے، قرآن اس کو کس طرح پر بیان کرتا ہے
اور کس طرح قرآن اپنے اساسی اغراض و مقاصد کو جیسے توحید رسالت اور
آخرت مستقل موضوع بناتا ہے اور پھر دوسرے جزئی امور کی طرف
ملفت ہوتا ہے۔

۲۔ بلاغت قرآنی کو معلوم کرنے سے پہلے خود قرآن کے اسالیب کو معلوم کیا جائے جو قرآن نے خود استعمال کیے ہیں۔

۳۔ اقام القرآن پر مفصل کتاب ہو جس میں تمام قسمیہ آیات کے وجہ استدلال اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کو ظاہر کیا جائے، ساتھ ہی ان میں جو بلاغی خوبیاں ہیں ان کو بھی اجاگر کیا جائے۔

۴۔ ناسخ و منسوخ پر مستقل رسالہ ہو جس میں اس قسم کی تمام آیات کو یکجا کیا جائے اور آیا واقعی ان میں نسخ ہے یا نہیں اس کو بیان کیا جائے۔ اور امام سیوطی اور شاہ ولی اللہ نے ناسخ و منسوخ میں تاویل کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے، ساتھ ہی ان آیات کے بعد تخصیص و تعمیم کی جو آیات ہیں ان کے اتارے جانے کی حکمت کو بیان کیا جائے۔

۵۔ اسباب نزول پر مستقل بحث ہو اور ان تمام آیات کو جن کی تاویل میں مشکل پیش آتی ہے یکجا جمع کر کے ان کی تاویل بیان کی جائے اور ان واقعات کو ظاہری سبب بنا کر جو آیات نازل ہوں ان کے اندر جو فلسفہ ہے اسکو اجاگر کیا جائے۔

۶۔ قصص القرآن پر محققانہ بحث ہو اور قصص کے تاریخی پہلو کے علاوہ ان میں جو حکم و مواظب اور فلسفہ ہیں ان کو بیان کیا جائے۔

۷۔ امثال و تشبیہات پر مستقل کتاب ہو جس میں ان کے فنی اور معنوی حکمت و فلسفہ کو بیان کیا جائے۔

۸۔ محاذہ یہود و نصاریٰ، مشرکین و منافقین کے اندر جو فلسفہ موجود ہے اس کو مفصل بیان کیا جائے اور صرف اس کی ظاہری صورت پر اکتفا نہ کیا جائے۔

یہ چندہ عام موضوعات ہیں جن کی قرآن فہمی میں ہمہ وقت ضرورت پیش آتی ہے اور اس قسم کی اب تک جتنی کتابیں ہیں وہ بے حد سطحی ہیں۔ لہذا ضرورت ہے کہ ان پر از سر نو بہت تحقیق کے ساتھ کام ہو اور کچھ نئی چیزیں دریافت کی جائیں جو اب تک دریافت نہ ہو سکیں۔

اس طرح قرآن و علوم قرآن پر اس وقت ایک عالمی اور اسلامی سطح پر محنت و کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس طریقہ کا کوئی قدم اٹھایا گیا تو یقیناً اہم اور مفید کام اب بھی ہو سکتا ہے جو پہلے کاموں سے زیادہ بہتر و زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ امت کے اندر ایک جوش اور ہمت ہو اور اس فکر سے گریز ہو کہ جو کچھ قدیم مفسروں نے لکھا ہے اب مزید اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ مگر ان میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے اور جو کج روی ہوتی ہے اس کو دور کیا جاسکتا ہے۔

بعض اہم مراجع

- | | |
|--------------------------------------|---------------------------|
| ۱- التمثیل الخالد | ۱- تفسیر طبری |
| ۱۱- البرہان فی علوم القرآن | ۲- تفسیر الکشاف |
| ۱۲- الاتقان فی علوم القرآن | ۳- تفسیر ابن کثیر |
| ۱۳- مذاہب فی التفسیر الاسلامی | ۴- الدر المنثور |
| ۱۴- مباحث فی علوم القرآن | ۵- التفسیر البیانی للقرآن |
| ۱۵- منہاج تہذیب فی التفسیر والعلوم | ۶- تفسیر نظام القرآن |
| ۱۶- منہج الامام عبدہ فی تفسیر القرآن | ۷- تاویل القرآن بالقرآن |
| ۱۷- منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن | ۸- فی ظلال القرآن |
| ۱۸- مقدمہ ابن خلدون | ۹- دلائل النظام |
| ۱۹- فخر الاسلام | ۱۰- الفوز الکبیر |
| ۲۰- ضیاء الاسلام | |

شایق اور انکا دیوان فارسی

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

انیسویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہند میں فارسی کا چرچہ کم ہوا اور آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ اردو نے لینی شروع کی، اس وقت جنوب ہند میں کرناٹک کے نوابوں نے بڑی فراخ دلی سے فارسی کی سرپرستی کی۔ کرناٹک کے آخری نواب والا جاہ امیر الہند عمدة الامراء مختار الملک سراج الدولہ غلام محمد عوث خاں شہامت جنگ متخلص بہ اعظم (متوفی: ۱۲۵۵/۱۸۵۵ء) نے اس دور میں ایک مجلس شاعرہ کی تشکیل کی جس میں مصرع طرح کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور مختلف شراح جنہیں اس مجلس میں شرکت کی اجازت تھی، اپنی اپنی فارسی غزلیں پیش کرتے۔ شہزاد کے کلام پر تبصرہ اور تنقید ہوتی۔ میر مجلس محمد حسین قادری مخاطب بہ شیریں سخن خان بہادر متخلص بہ راقم اور حکیمین شاعرہ

۱۔ دہلی یونیورسٹی لائبریری، شمار مخطوطہ: ۲۸۳۶۴۵

۲۔ راقم اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے انہیں نواب اعظم کی سہرسی کا فخر حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے تذکرے گلزار اعظم کی تالیف میں نواب موصوف نے راقم کو شامل رکھا اور راقم نے بھی اس کی ترتیب میں نواب کا نام لکھ دیا۔ جب مجلس شاعرہ قائم ہوئی تو راقم کو اس کا میر بنا کر افضل الشہزاد شیریں سخن خان بہادر کا خطاب دیا۔
سخنوران بلند فکر، طبع مدراس، ص: ۱۶۱۔

واقف و قدرت اللہ اس بحث و مباحثہ میں اپنی رائے دیتے، اگر مسئلہ حل نہ ہو
پاتا تو نواب موصوف اس میں مداخلت کرتے اور ان کی رائے مسلم مانی جاتی تھی۔
علامہ محی الدین المصطفیٰ علی خاں متخلص بہ شائق نے کرناٹک
میں اسی دور میں زندگی گزاری ہے، شائق ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء میں اُدگیر (مہاراشٹر)
میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علماء اور صوفیوں کا خاندان تھا، شاہ صبیحۃ اللہ

۱۔ مولوی میران محی الدین قادری متخلص بہ واقف ۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ء میں اُدگیر میں پیدا ہوئے
علمی فصیلت اور شاعرانہ چہارت کی وجہ سے نواب اعظم نے انھیں حکم اول مجلس شاعرہ
مقرر کیا، مدراس میں شہر استاد کہلاتے تھے۔ نواب اعظم نے مدراس میں ایک مدرسہ قائم کیا
جس کا نام مدرسہ اعظم رکھا۔ واقف اس مدرسہ میں مدرس مقرر کئے گئے۔

۲۔ محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی مؤلف تذکرہ نتائج الافکار کا شمار پختہ گوشہ
میں کیا جاتا ہے۔ قدرت ۱۷۸۵ء/۱۱۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۲ء/۱۲۲۷ء میں مدراس
آئے۔ نواب اعظم جاہ بہادر نواب کرناٹک (۱۸۱۸ء/۱۲۳۲ء - ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ء)
کے دربار سے خان کا خطاب اور نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت آباد (۱۸۰۱ء - ۱۸۱۶ء)
کے مقبرے کی تولیت مرحمت ہوئی، سخنورانِ بلند فکر
ص ۱۲۶، نتائج الافکار، طبع بمبئی: ص ۳۔

۳۔ اشارات نبیش: (مخطوطہ) ایٹیاٹک سوسائٹی، شمارہ ۶۲، ادرنی ۱۹۳۳ء
۴۔ گلزار اعظم: ص ۲۳۳

۵۔ اشارات نبیش: ورق ۳۲، نتائج الافکار: ص ۲۶، اسکے علاوہ دیوان میں
موجود ان اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شائق کا وطن اُدگیر تھا۔
تا کی شائق کا پوہر رحمت میکی: رفعتی گریادت، پرقلو، اُدگیریش (دیوان: ص ۴۲)
خلق از مکیہ بہ مدراس زواقف دیدیم: جو گردید ز دل الفت اُدگیرا (دیوان: ص ۱۱)

نائب رسول کے مرید مولانا حبیب اللہ اور سید محمد گیسو دراز، شائق کے خاندانی بزرگوں میں سے ہیں۔

شائق کے آبا و اجداد گلبرگہ سے ہجرت کر کے اُدگیر میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ عمر کے ابتدائی دور میں شائق اپنے والد شاہ احمد ابوتراب کے ہمراہ مدراس چلے آئے اور مدراس ہی میں مختلف اساتذہ کی نگرانی میں انکی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ مولوی عبدالقادر اور مولوی شرف الملک بہار نے انہیں عربی کی تعلیم دی۔ مولانا محمد باقر آگاہ اور مولوی سید خیر الدین فائق نے انہیں فارسی سے روشناس کرایا۔ مؤخر الذکر ہی نے فارسی شاعری میں بھی شائق کی رہنمائی کی۔ شائق اردو کے شاعر بھی تھے اور اس میدان میں مرزا محمد ظہیر الدین علی بخت اظفری اور میر شاہ حقیقت حسین نے ان کی تربیت کی۔

۱۔ گلزار اعظم: ص ۲۳۳ - ۲۔ ایضاً: ص ۲۳۳، نتائج الافکار: ص ۴۰۔
۳۔ ان کے والد محمد تقی المعروف بہ محمد صاحب تھے۔ ان کے اسلاف کا وطن سیجا پور تھا اور یہ ۱۷۵۸/۱۷۵۹ء میں بمقام دیور پیدا ہوئے، پندرہ سال کی عمر میں فارسی نظم و نثر لکھنے پر قادر ہو گئے۔ آگاہ حضرت سید شاہ ابوالحسن قدس سرہ سے بیعت تھے اور آپ ہی سے اشعار کی اصلاح لیتے تھے۔ آگاہ نے اپنے دور میں بڑا نام پیدا کیا اور ۱۸۰۵/۱۲۲۰ء میں انتقال کیا، مخدوران بلند فکر: ص ۱۳۲-۱۳۴۔ ۴۔ گلزار اعظم: ص ۲۳۳، اشارات بنیش: ورق ۳۲ ب ۵۔ ان کے والد کا نام محمد ولی تھا جو اورنگ زیب کی پوتی عفت آرا کے پوتے تھے۔ اظفری ۸- ۱۷۹۷/۱۲۱۲ء میں مدراس پہنچے اور یہاں مستقل قیام اختیار کیا۔ اظفری اردو کے اچھے شاعر اور ترکی زبان کے ماہر تھے لیکن فارسی شاعری کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۰۸/۱۲۳۴ء میں ہوا۔ گلزار اعظم: ص ۴۱۔ ۵۔ گلزار اعظم: ص ۲۳۳۔

شائق کے مربی نواب اعظم نے اپنے تذکرہ گلزار اعظم میں شائق کی شاعرانہ مہارت کی بہت تعریف کی ہے، اعظم نے لکھا ہے کہ انھیں فی البدیہہ شعر کہنے میں بلکہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بیان کیا ہے کہ شائق نے نواب موصوف کی فرمائش پر تیرہ دن کے دوران نعت اور منقبت میں سینتیس غزلیں کہی تھیں۔
شائق ۸-۱۸۱۷/۱۲۳۳ میں اپنی شادی کے سلسلے میں اپنے وطن ادگیر گئے اور وہاں سے واپسی پر نواب محمد غوث اعظمی کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور شہرت و نام پایا، یہی وہ زمانہ ہے جب نواب نے انھیں شائق علیاں کا خطاب عطا کیا اور اپنے ایک مدرسہ میں استاد مقرر کر دیا۔

اپنی خاندانی روایات کے مطابق شائق کو بھی تصوف سے خاص لگاؤ تھا، اسی مناسبت سے یہ اپنے چچا سید شاہ منصور قادری کے مرید ہو گئے تھے۔ شائق کی وفات ۲-۱۸۳۳/۱۲۴۹ میں ہوئی جس پر ان کے چھوٹے بھائی اور مجلسِ شاعرہ کے حکم مولوی واقف نے سذریہ ذیل قطعہ تاریخ لکھا:-

بیدل عصر حضرت شائق	قدس اللہ سرہ السامی
کام دل جنت چوں بقرب اللہ	کہ جہانست جہای ناکامی
ہاتھ سال رحلتش فرمود	رفتنہ ہیبت ہم درم حیا می

۱۲۴۹

یہ واقف ہی تھے جن کے اچھے برتاؤ اور مہربانیوں کی وجہ سے شائق کے دل سے غریب الوطنی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

خلق از لبیک یہ مدراس ز واقف دیدم محو گردید ز دل الفت ادگیر مرا

۱۔ گلزار اعظم: ص ۵-۲۳۲، ایضاً ص ۲۳۵، اشارات بنیش: ورق ۳۲، ب ۳۲ ایضاً
ص ۵-۲۳۲، نتائج الافکار: ص ۷۷، ایضاً ص ۲۳۵، اشارات بنیش
ورق ۳۲، ب ۳۲ دیوان شائق: ص ۱۱-۶۰

نواب اعظم نے گلزار اعظم میں شایق کے مندرجہ ذیل فارسی اور اردو آثار کا ذکر کیا ہے :- فارسی

۱۔ مرج البحرین : نعت و منقبت میں غزلوں کا مجموعہ ۔

۲۔ روضہ قدسیہ : شایق کے آبا و اجداد کے حالات ۔

۳۔ مخقر فارسی دیوان ۔

اردو :-

۱۔ رشک نسب ۔

۲۔ مخقر دیوان ۔

دیوان شایق :- شایق کے اس فارسی دیوان کا ذکر کسی فہرست نگار نے نہیں کیا ہے ۔ اس فارسی دیوان کے مخطوطہ کے شروع صفحہ پر ذیل کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام چغتای فصاحت ہے ۔

” دیوان شایق مسمی بہ چغتای فصاحت ، من تصنیف شاعر نازک

خیال ، سرآمد اہل کمال ، وحید عصر ، علامہ دہر ، جناب غلام محی الدین

صاحب الخطاب بہ شایق علی خاں تخلص شایق ، مرحوم مغفور

حب اجازت ، خاکسار سید خواجہ معین الدین چشتی معروف بجواہر

بڑا ، تخلص سلام ، مدراسی نبیسیہ حضرت شایق ”

اس سلسلہ میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ اس دیوان کا ذکر شایق

کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے کیوں نہیں کیا ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ

اعظم نے جس ” مخقر فارسی دیوان ” کا نام لیا ہے ، زیر بحث دیوان وہی ہو ۔

پہر حال اس دیوان پر کوئی تاریخ موجود نہیں اس کا سائٹ ۶ x ۸ ہے اور

یہ نیا قے صفحات پر مشتمل ہے ۔ حاشیوں پر کہیں کہیں مشکل الفاظ کی تشریح

کی گئی ہے۔ معمولی مگر صاف نستعلیق میں لکھے گئے اس دیوان میں کل (۹۳) تیراؤے غزلیں، ایک مستزاد، دو قطعے، چھبیس رباعیاں، کچھ متفرق اشعار اور منقبت میں دو مطلع جمع کیے گئے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل جو حمد باری تعالیٰ میں ہے، اس مطلع سے شروع ہوتی ہے :

الہی رنگ روی گلرخانہ دہ داستاںم را
برنگ کاکل مشکیں مسلسل کن بیانم را

شایق کا یہ دیوان مختصر ہے لیکن ان کی شاعرانہ مہارت، صوفیانہ طرز فکر اور فنی پختگی کا آئینہ دار ہے۔ دیوان کی بیشتر غزلیں شاعر کی بلند فکری کا نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی کہ شایق غزل کی نزاکت کو سمجھتے تھے اور اس صفت میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اگر کچھ اشعار سے شایق کے صوفیانہ مزاج کا علم ہوتا ہے اور محبوب حقیقی کی تعریف میں شعر ملتے ہیں تو ایسے اشعار بھی کثرت سے نظر آتے ہیں جس میں محبوب مجازی کی تحقیر و توصیف کی گئی ہے۔ اور جو اپنے شیریں انداز بیان، آسان طرز اور عام فہم ہونے کے وجہ سے پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ اپنی اس خوبی کو شایق نے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

گئی گریبان و گد خنداں، گئی سرمست و گد حیراں
گئی صوفی و گد رندم، اغثنی یا رسول اللہ

مزید برآں شایق خود کو عاشقوں کا امام بتاتے ہیں کیوں کہ انہیں محبوب حقیقی کے عاشق ہونے کا شرف حاصل ہے۔

تا فدا می الفت معشوق رحمانی شدم در دو عالم گشتہ ام شایق امام عاشقان

۱۰ دیوان شایق، ص ۳۷

۱۱ دیوان شایق، ص

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ شائق نقوف سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اسی وجہ سے دیوان میں ایسے متعدد شعر نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور صاحب نقوف ان کے نزدیک نہ صرف محترم تھے بلکہ شائق ان سے تعلق کو اپنے لیے وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔ ایک پوری غزل سید محمد غوث گوالیار (متوفی: ۱۵۶۲-۳/۹۷۰) کی شان میں ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-

خوش نادرش سہاوی بہشت بریں گہی کیم جو سیر کرد کسی گلستانِ غوث
از ظلمتِ گناہ، چہ باک است شایقا داغیت بر جبین من از آستانِ غوث
شاہِ جیلان کی تعریف میں بھی بہت سے شعر دیوان میں موجود ہیں مثلاً:
تعالی اللہ چہ شانِ شاہِ جیلانت در عالم کہ گردوں پیش درگاہش سر خود بر زمین دارد
در بزمِ گاہ وحدت مسند نشینِ عزت کس فی چو شاہِ جیلان، من خوب میشناسم
وحدت الشہود کی تائید میں شائق نے ذیل کے اشعار میں اظہارِ خیال کیا ہے:-

ہاں یک ذات شد در کثرت کون و مکان مشہود
تو شاہد باش ای زاہد ز عرفانی کہ من دارم
ہر چند بی نشانی ای جانِ خلق لاکن
ظاہر توئی و پنہاں، من خوب می شناسم
ترا چگونہ و گردانم از بتان یارب وجود خویش عیاں کردہ بشارتِ جنت

صوفی منش ہونے کی وجہ سے شائق نے ایک حد تک دنیوی جھبیلوں سے بچ کر زندگی گزاری ہے۔ اور اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر یہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں شہرت و نام پانا آسان ہے۔ مگر دنیا کو ترک کر دینا اور گوشہ نشینی

۱۔ دیوان شائق: ص ۲۳۔ ۲۔ ایضاً: ص ۳۳۔ ۳۔ ایضاً: ص ۵۶

۴۔ ایضاً: ص ۶۴۔ ۵۔ ایضاً: ص ۵۵۔ ۶۔ ایضاً: ص ۲۰

کارندگی گزارنا دشوار ہے۔

سہل باشد شہرہ آفاق کردن خویش را !
 انجھو شایق در جہان غزلت گریح مشکل است

شایق ساری پریشانیوں کی وجہ نفس پرستی کو سمجھتے ہیں اور مل وذر کے پیچھے دوڑنا ان کے نزدیک تکلیفوں اور نامرادیوں کو دعوت دینا ہے۔

کثرت ذر نقد آفت در بخل دارد نہاں اجتماع زر کند آخر پریشاں غنچہ را
 از خویش بر آذین نشان شو آماج بلاست این نشانہا

دنیا میں دکھ سکھ کا ساتھ چولی دامن کا ہے وقت سدا ایک سا نہیں رہتا، اگر کوئی آج پریشانی سے دوچار ہے تو وہ وقت دور نہیں جب اس کی ہمت اور محنت سے راحت و اطمینان سے ہمکنار کر دے گی۔ شایق نے اس کلیہ کو تعبیرت آسان اور دلنشین انداز میں نظم کیا ہے۔

میشی بجاں غیرالم نیست میر این گلشن رعنا گل بیچار ندارد
 اخلاقی قدروں کی اہمیت پر فارسی کے تقریباً ہر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے شایق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن ہمارے شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ آسان و دلنشین اور مدلل طریقے سے اپنے پڑھنے والوں میں ان خیالات کی تبلیغ کرتا ہے سخاوت کے سلسلے میں شایق نے کہا ہے۔

سخاوت پیشہ خود کن تو اگر تا شوی شایق کہ چوں گل کیہ بکشا بدستش ز روش و پیرا

لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا شایق کی نظر میں بے جا ہے۔

دست خواہش پیش ز درازاں دوران اکن ہرچہ خواہی چوں صدف از عالم اعلیٰ طلب
 خم مشو پیش بزرگاں ہرسم وزر کہ طفل شاخ را سازد برای میوہ پای خام خم

لہذا شایق ص ۱۸، ایضاً ص ۶، ایضاً ص ۳، ایضاً ص ۳۵، ایضاً ص ۱۲-۱۳
 لہذا ایضاً ص ۱۲، ایضاً ص ۵۳

اگر اکر، جاگیر اور شاہجہاں کے دور سے مقابلہ کیا جائے تو شائق کا زمانہ فارسی علم و ادب کے لحاظ سے تنزل کا دور ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی نے بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اپنے پیشرو بادشاہوں کی طرح عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کر سکیں اور ان کی قابلیت اور فضیلت کے شایان شان ان کی قدر و منزلت کریں اور مال و دولت سے نوازیں شائق نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے دور کی تعلیمی بد حالی کی طرف اشارہ کیا ہے :-

خارجہل است لک زن ہر سو من ازیں روزگار می ترسم
دریں گلشن کہ خار تانِ ناپہیت نشتر زن رنگ غنچہ باید بست لب را از سخن گوئی
ہر انسان اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی تحریروں میں ایسے اشارے ضرور کرتا ہے جس سے اس کے زمانے کے سماجی یا سیاسی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور یہ لوگ اب ہر جگہ اور ہر معاملہ میں پوری طرح دخل ہو چکے تھے، شائق نے اس تبدیلی کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے :-

چراشتاقی چنانش نگر د جان من شائق چو اکثر با فرنگی ہست اکنوں کار و بار اینجا
شائق نے اپنے استاد فائق کی تعریف کی ہے، ان کی شخصیت کو اپنے زمانے میں غنیمت سمجھا ہے اور ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

عالی سخن چو حضرت فائق مذیدہ شد فیض ہمیشہ باد بدوراں غنیمت است
چوں تنادم بہ شعر خود شائق حضرت فائق چو استاد است

شائق کی بیشتر غزلیں رواں سہل اور شستہ ہیں، انداز بیان میں زور ہے، عام فہم لے دیوان شائق ص ۶۵، ایضاً ص ۸۶، ایضاً ص ۹، ایضاً ص ۱۰، ایضاً ص ۱۱

تسمیہ واستعاروں نے شائق کی غزلوں کو پرکشش بنا دیا ہے۔ اعظم نے گلزارِ اعظم میں شائق کے طرزِ سخن کے بارے میں لکھا ہے کہ "شائق ظہوری، طغرا اور بیدل کے پیروکار ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ ہونا چاہیے کہ شائق صائب سے بھی متاثر ہوئے ہیں جیسا کہ ذیل کے شعر سے پتہ چلتا ہے۔

شائق از صائب شہودِ صفِ قدِ دلدار من ہر چہ میخاہد دولت از عالم بالا طلب
بہر حال محقر آئیہ کہا جاسکتا ہے کہ شائق کا امتیاز یہ ہے کہ موجودہ محقر دیوان میں مشکل سے کوئی ایسا شعر نظر سے گزرے گا جو معنویت یا زبان کے لحاظ سے مشکل یا پیچیدہ ہو ورنہ شائق کا طرزِ بیان سادہ اور سہل ہے، اسکے علاوہ شائق نے اپنے دعووں کے ثبوت میں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بہت دلچسپ اور دل لگتی ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کبا با ز دل شراب زانک سر خم بہت در محفل مذاق دیگری بخشد اگر آید نگار انجبا
صبرے زن از تو کرم، اینہم غلط، اینہم غلط مہرے ز تو از من ستم، اینہم غلط، اینہم غلط
گرچہ شائق بہ بود عزلت نشینی مرد را گر نباشد آں پری از گوشہ تنہا چہ خطہ
عشق عاشق در دل معشوق آخرا کند گل گریباں چاک داد از ولای عنایہ
بہر دیدار آب و تاب و حش بحر را عینک از حباب شدہ
سیر مژگان و دہان در وی دلبر کردیت گل بہ بین و غنچہ بین و نیزہ ہای خار بین
شائق اپنے کلام کے ان محاسن کی وجہ سے اپنے دور کے بہترین فارسی شعرا میں شامل کیے جاسکتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے مندرجہ ذیل اشعار محض شاعرانہ تقلی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ گلزارِ اعظم: ص ۲۳۲ ۲۔ دیوان شائق: ص ۱۵ ۳۔ ایضاً: ص ۸
۴۔ ایضاً: ص ۵۴ ۵۔ ایضاً: ص ۶۶ ۶۔ ایضاً: ص ۵۸ ۷۔ ایضاً: ص ۶۶

شایق جو بیت ابروی دلداری شرم
 نام خدا کہ نزد خلائق بلند شد
 شود کمال من از شرم عیاں شایق
 برنگ معنی خوش در کلام مستورم
 معارف گل کند از طبع جولانی کہ من دارم
 بہارتاں معنیہا ست دیوانی کہ من دارم
 دیوان میں موجود بیشتر با عیاں مذہبِ مسم کی ہیں۔ مدح رسول، علی، حسن
 حسین، اور خالقِ جنّت کی منقبت میں رباعیاں ہیں۔ ایک مستزاد ہے
 جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔
 متانہ پئی قتل چو آن یار برآمد صد شور و فغاں شد
 مردانہ دلم پیش ستکار برآمد بی نام و نشان شد
 ایک قطعہ بے نقطہ کے الفاظ پر مشتمل ہے جس کا ایک شعر ہے۔
 محرم سرد درگہ سرد
 مہر علم و امام اہل کمال
 زیر بحث دیوان ان اشعار پر ختم ہوتا ہے۔
 بدور تنگ چشتی ہائے گردوں
 بتنگ آمد دلم از تنگ دستی
 بسویم کن نگاہی از عنایت
 حذار ای شہ دیوان ہستی

۱۔ دیوان شایق: ص ۳۶ - ۲۔ الفیہ: ص ۶۰

۳۔ الفیہ: ص ۶۳

تبصرے

مجلات و رسائل

مجلد علوم الدین مرتبہ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی تقطیع متوسط ضخامت دو سو صفحات کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں۔ بہتہ فیکلٹی آف سٹیا لوجی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

دوسری یونیورسٹیوں کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مختلف فیکلٹیوں کی طرف سے سالانہ یا ششماہی مجلات شائع ہوتے ہیں لیکن اب تک دینیات کی فیکلٹی کا کوئی مجلہ نہیں تھا خوشی کی بات ہے کہ اب اس نے بھی مجلہ شائع کرنا شروع کر دیا ہے اور زیر تبصرہ پرچہ اس کا پہلا نمبر ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہم وجہ فیکلٹی کی شایان شان ہے اس نمبر میں لائق مرتبہ کا مضمون مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور ڈاکٹر محبتی حسن کا مونپری کا مقالہ "شرعیہ مرتضیٰ علم الہدیٰ اور ناسخ و منسوخ" از ڈاکٹر قاری محمد صوان اللہ محققانہ مقالات ہیں جو محنت اور مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ تدوین حدیث کی محقق تاریخ "از قاضی منظر الدین احمد صاحب بگرامی (ڈین فیکلٹی) عقل، قلب اور وحی" مولانا محمد تقی امینی مذاہب عالم اور ان کی رجائی تعلیم، ڈاکٹر سید ارتضائین قیام دار السلام دیوبند، از ڈاکٹر اقبال حسن خاں، یہ سب مقالات بھی دل چسپ اور لائق مطالعہ ہیں، شروع میں (جس کی انتہا آخر میں پہنچی ہے) اور یہ طرز ایک علمی رسالہ کی وضع کے خلاف ہے (ابتداء کے زیر عنوان چند صفحات میں جناب مرتبہ کے قلم سے ان تبدیلیوں اور فیکلٹی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ایک برس میں پیش آتی رہیں ملاحظہ فرمائیے)

محمد سہاوی بانی درس نظامی کے دو اصل خطوط کے عکس اور ان کی تشریح نے مجلہ کی علمی شان کو دوبالا کر دیا ہے، بہر حال فیکٹی اس کامیاب اور شاندار مجلہ کی اشاعت پر لائق مبارک باد ہے۔

دعوت مسلم یونیورسٹی نمبر - اخباری سائز - کتابت و طباعت بہتر - صفحات ۶۸
صفحات قیمت درج نہیں - پتہ: روزنامہ دعوت دہلی - ۶۔

دعوت مسلمانوں کا بہت مقبول اور نہایت سنجیدہ و متین روزنامہ ہے اس کا سہارا ایڈیشن بلند پایہ فکر انگیز اور حسب ضرورت مملو تمام مقالات و مضامین سے پر ہوتا ہے اور اسی لیے کثرت سے پڑھا جاتا ہے، زیر تبصرہ نمبر جس کا نام سے واضح ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۲ء کے خلاف جوائنٹیشن پورے ملک میں چل رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ بین الاقوامی نہ بن جائے۔ یہ نمبر اس ایجنڈیشن کی تقریب میں شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دو مقالات میں یونیورسٹی کی ابتدائی تاریخ یعنی سرسید کے محمدؐ ن کالج کی تاسیس اور اس کے مقاصد کا جائزہ لینے کے علاوہ ۱۹۶۵ء (جبکہ یونیورسٹی میں ایک نیا ایکٹ نافذ ہوا تھا) سے یکسر ۱۹۶۲ء کے ایکٹ کے بننے تک یونیورسٹی کے لیے مسلمانوں اور حکومت کی طرف سے جو کچھ بھی ہوا ہے اس سب کی نہایت مفصل اور واضح روڈ مارٹب کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ۱۹۶۲ء کا ایکٹ اور پھر ۱۹۶۵ء کا ایکٹ ان دونوں کو بتماہان نقل کرنے کے بعد ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور یونیورسٹی کس کلچر کی نمائندہ رہی ہے۔ موجودہ ایکٹ کے خلاف ایجنڈیشن کے کیا وجوہ ہیں؟ ان سب امور پر مختلف مقالات میں خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض کہ یہ نمبر اپنے مقصد میں بے حد کامیاب ہے اور اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو یونیورسٹی کے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے ضرورت ہے کہ یہ نمبر دو تین اور مقالات کو شامل کر کے مجلہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے اور انگریزی اور ہندی میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا جائے۔

نڈائے ملت جائزہ نمبر تقطیع، اخباری سائز صفحات ۹۸ صفحات کتابت طباعت
بیتز قیمت دو روپے۔ پتہ: نڈائے ملت ویلی، لکھنؤ۔

نڈائے ملت ملکی و وطنی معاملات و مسائل میں مسلمانوں کے احساسات، جذبات اور
ان کی مشکلات کا سہفہ وار مباحثہ ہے اور اس حیثیت سے مسلمانوں میں وقعت اور
قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، آزادی کی پچیس سالہ جوبلی کی تقرب سے اس نے یہ
خاص نمبر اس غرض سے شائع کیا ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں جو کچھ ہوا ہے مسلمانوں
کے نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ قومیں بجلی کا پاؤں
لگا کر ترقی کے میدان میں دوڑ رہی ہیں ایک آزاد و خود مختار اور حوصلہ مند قوم
کے لیے پچیس برس کی مدت کم نہیں ہوتی اور پھر ہندوستان تو ایک بہت بڑا اور وسیع تر
ملک ہے۔ اس کے ذرائع پیداوار لا محدود ہیں اور اس کی آبادی دنیا کی چارہم
اگر ہندوستان کو صحیح ریڈر شپ ملی ہوتی تو وہ اس مدت میں کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
چین، جاپان اور مغربی جرمنی ہمارے سامنے کی بات ہیں۔ جائزہ میں نفع اور
نقصان دونوں دکھائے جاتے ہیں تب جائزہ مکمل ہوتا ہے۔ اس بنا پر
مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ جائزہ مکمل اس وقت ہوتا ہے جب کہ الگ
الگ عنوان مقرر کیے جاتے۔ مثلاً صنعت و حرفت، فلاح و زراعت
قومی آمدنی، تعلیم، امن اور قانون، سیاست، سماجی فلاح و بہبود اور زبان
اور ان میں سے ہر عنوان کے ماتحت اعداد و شمار کی روشنی میں یہ دکھایا جاتا
کہ اس میں ملک نے شروع سے اب تک کیا ترقی کی ہے اور اس ترقی میں
مسلمانوں کا اثبات اور نفی کے اعتبار سے کیا اور کتنا حصہ ہے۔ اگر جائزہ اس
طرح لیا جاتا تو بے شبہ وہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس سے مسلمانوں کو بھی
فائدہ ہوتا اور حکومت اور اکثریت کو بھی۔ آج جبکہ ہر چیز کا کارڈ موجود ہے

اس پرکت میں اود سرکاری وغیر سرکاری رپورٹیں موجود ہیں اس نوع کا جائزہ لینا چناں
 مشکل نہیں ہے البتہ اس کے لیے ضرورت ہے صرف زر کثیر کی محنت اور استقلال سے تحقیق
 و تفتیش کرنے کی اور یہ ایک شخص کا نہیں بلکہ پورے ادارہ کا کام ہے۔ لیکن جو قوم بے جس
 بے خبر اور اپنے انجام سے غافل ہو اور اس بنا پر اس کے اخبارات و رسائل عسرت و افلاس
 کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں اوس کے کسی جریدہ سے اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان
 دشواریوں کے باوجود نائے ملت کا یہ خاص نمبر با غنیمت ہے۔ اس میں مقالات کے
 دو حصے ہیں ایک حصے میں مسلمانوں کے ان کارناموں کو بیان کیا گیا ہے جو انہوں نے
 ایٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں انگریزوں کے عمل دخل کے خلاف اور پھر ۱۸۵۷ء میں اور
 اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی تک انجام دیے ہیں۔ اس حصہ میں مولانا
 ابوالحسن علی کا مقالہ خاصہ کی چیز ہے۔ دوسرے حصہ میں جو نسبتاً طویل اور مفصل
 ہے اور جو سترہ مقالات پر مشتمل ہے۔ دستور اور آئین جمہوریت پر گفتگو کرنے کے
 بعد ان آلام و شکایات کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے
 ہیں اور جو خود آئین کے خلاف ہیں ان مضامین کو پڑھ کر مایوسی اور دل گرفتگی کی جو
 کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے لیے تعمیر نشین کے زیر عنوان چند مقالات ہیں جن میں
 حکومت اور مسلمان دونوں کو تعمیری مشورہ دیے گئے ہیں۔ ان سنجیدہ
 نمایاں کے علاوہ زیب داستان کی غرض سے کچھ طنزیہ مضامین اور نظمیں بھی ہیں
 غرض کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ خاص نمبر بڑی محنت، توجہ اور لگن سے مرتب کیا گیا
 ہے اور مضامین کے تنوع، افادیت اور جامعیت کے باعث اس کا مستحق ہے کہ ہر صاحب
 ذوق مسلمان بلکہ حکومت اور اکثریت کے حق پسند افراد بھی اس کا مطالعہ کریں
 جو مضامین دیر میں وصول ہونے کے باعث اس اشاعت میں شریک نہیں ہو
 سکے ہیں، بہتر ہے کہ ان کو اس جائزہ نمبر کا حصہ دوم بنا کر شائع کیا جائے اور
 پھر ان سب مضامین کو اشتہارات سے الگ کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیا جا

اس طرح اس خاص نمبر کی افادیت محفوظ اور مستقل ہو سکے گی۔

بھارت کی طاقت زیادہ آبادی میں نہیں
بلکہ صحت مند اور زیادہ تعلیم یافتہ شہریوں میں مضمر ہے
چوئے گنہگار مطلب ہے
صحت مند بچے
ہر ایک کے لئے زیادہ خوشحالی
اچھی تعلیم کے بہتر مواقع



مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

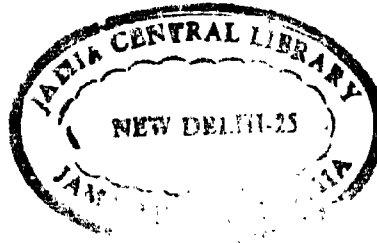
قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ شریفان کی مکمل اور ولید پر شریع کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ ”لغات قرآن“ کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	”	پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	”	پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	”	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	”	آٹھ روپے	نو روپے
جلد ششم	۳۲۴	”	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

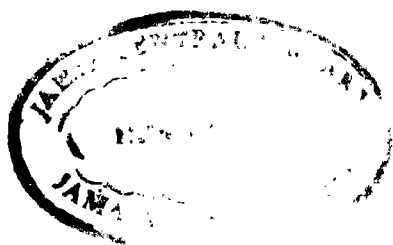
مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



عظیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس ڈپٹی میں طبع کر کے دفتر برہان سے شائع کیا

مدوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ



برہان

مرتبہ
سعید احمد بستر آبادی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار دارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۱۷۸۳ ہیں۔
حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی متفقہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف والقریم اصحاب القریۃ اصحاب التبت اصحاب الکوس بیت المقدس اور یہود اصحاب الافودہ اصحاب الفیل اصحاب یثرب ذوالقرنین اور سید سکندری، سبا اور بیل عزم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و متفقہ تفسیر۔
حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والسلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت مکمل سٹاکتیس روپے۔ اجرت فی جلد فی پارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی



برہان

جلد ۶۹، رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۲ء، شمارہ ۴۴

- ۱۔ نظرات سعید احمد اکبر آبادی ۲۱۸
- ۲۔ علی گڑھ مسلم یورسٹی مقالات:
- ۳۔ رسول شاہ دمشہود
- ۴۔ اسلامی شریعت میں چند زوجگی کی جناب مولانا محمد برہان الدین سنطلی ۲۵۵
- ۵۔ مرزا غالب اور مدرسہ کارکنی جناب پروفیسر ابو حفصہ الحکیم معصومی ۲۷۲
- ۶۔ نیش ایوارڈی - شاہجہاں پور
- ۷۔ اباحت - تنقید و جواب: "مفت و منفعت" اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۸۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ

نظرات

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے : اگر میرے اختیار میں ہو تو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کی سند حاصل کرنے کے لئے یہ شرط بھی لگا دوں کہ فارغ التحصیل کم از کم چھ مہینہ کے لئے یورپ میں گھوم آیا ہو ؛ اس سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ ایک عالم دین کو ارشاد و ہدایت کا جو فرض انجام دینا چاہیے ، موجودہ زمانہ میں کوئی عالم یہ فرض کا حق اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں گھوم پھر کر انسانی معاشرہ میں جو عظیم انقلاب ہوا اور اس کی وجہ سے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان سب کا جائزہ بصارت اور بصیرت کے ساتھ نہ لے ، دراصل یہی وہ ضرورت ہے جس کی وجہ سے درختار میں قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :-

من لم یکن عالما باحوال زمانہ سالم جو شخص اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے ۔

ترقی یافتہ ممالک میں جا کر مزید برآں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اکثریت میں بھیا اقلیت میں ، کس طرح اپنی تعمیر کرتی ہے ، وہاں کس طرح ہر شخص بوتا کم اور کام زیادہ کرتا ہے ، محنت اس طرح گزرتا ہے کہ کام کے اوقات کا ایک منٹ ضائع نہیں کرتا ۔ اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں سستی ، کالی بے ایبائی اور بددیانتی کو دخل نہیں دیتا ۔ پھر کام چھوٹا ہو یا بڑا اسے کسی کام میں عار نہیں ہوتا ۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان ممالک میں انسانی صلاح و مہجور ، اپنی قومی روایات ، علم و ادب ، صنعت و حرفت اور مذہب و تعلیم ان سب کی ترقی کے لئے کیسی اعلیٰ سے اعلیٰ تنظیمات اور ادارے ہیں جو بڑے غلوں اور شفقت کے

ساتھ اپنے کاموں میں مشغول ہیں اور ان کی وجہ سے قومیں ترقی کی راہ پر لگے ہی بڑھتی جا رہی ہیں۔

ابھی چند مہینے ہوئے ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی جو معاشیات میں ڈاکٹر اور اس کے نامور استاد ہونے کے باوصف نہایت راسخ العقیدہ اور پُر دولہ و جوش مسلمان بھی ہیں، وہاں مسلمان طلباء کی انجمن کی دعوت پر اسلام پر مختلف مراکز میں پکچر دینے کی غرض سے امریکہ گئے ہیں اور یہ ان کا عمر میں پہلا غیر ملکی سفر ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب تک انھوں نے جو پکچر دیئے ہیں وہ بڑے کامیاب رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں شکاگو سمران کا ایک خط آیا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان میں گزشتہ پچیس برس میں ہم نے (مسلمانوں نے) احتجاج کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا لیکن یہاں کے مسلمان مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مذمت میں ہم نے کوئی تعمیری (constructive) اور مثبت کام بھی کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ کیا ہے؟ یہ سن کر سخت شرمندگی ہوتی ہے، آپ اذرا و کرم اس پر توجہ کیجئے۔ راقم الحروف نے اس کے جواب میں لکھا ہے: آپ نے یہ وہی بات لکھی ہے جس کو میں شریع سے کہتا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں، لیکن افسوس! یہاں کے مسلمانوں میں اجتماعی اور قومی سطح پر مثبت اور تعمیری کام کر نیکا کوئی جذبہ ہی نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیڈر شپ بالکل نکلی اور ناکارہ ہے، اس کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ۔ ہواؤں پر رات کی اور صلیبوں جھوسوں پر مصیبتی ہے۔ اب آپ امریکہ سے واپس آجلیئے تو ہم دونوں مل کر مسلمانوں کے لئے ایک ہمہ جہتی تعمیری منصوبہ (محکومتوں کے پنجالہ منصوبوں کے طرز پر) بنائیں گے۔

ہمارے جولیڈار آئے دن مسلمانوں کی بے روزگاری، تعلیمی پسماندگی، اردو کی حق تلفی، اور مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی کا رونا روتے رہتے اور پبلک میں شور مچاتے رہتے ہیں ان کو بتانا چاہیے کہ انھوں نے اب تک ان مسائل کے حل کے لئے کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ مسلمانوں

کی بجائے درگاہی کا علاج کرنے کے لئے مسلمانوں کے کتنے نئے کارخانے، فیکٹریاں اور صنعتی ادارے قائم کرائے، تعلیم پسندگی کو دہور کرنے کے غرض سے کتے اسکول اور کالج بنائے، ذہین اور غریب طلباء کے لئے کتے وظائف کا بندوبست کیا، ان کے لئے کتے پالی ٹیکنک، کتے انجینئرنگ اور ڈھکیں کالج کھولے، ہتھنی کو آپریٹو سوسائٹیاں قائم کیں، اردو اخبارات و مجلات کی حوصلہ افزائی اور جگہ جگہ پرائمری اسٹنڈرڈ کے دینی مکاتب اور اردو کی نشر و اشاعت کے اداروں کی ترقی کے سلسلے میں کیا کیا کوششیں بروئے کار آئیں! حکومت کی نا انصافی اور دھاندلی مسلم لیکن جمہوریت میں حکومت کی کتنی بھی پالیسی یا اس کے کسی بھی کام کو موثر طریقہ پر اس وقت تک چلیج نہیں کیا جاسکتا جب تک رائے عامہ کو چیلنج کی ہمنوائی پر آمادہ نہ کر لیا گیا ہو! اب سوال یہ ہے کہ ہمارے زمائے ملت نے اس راہ میں کیا کچھ کیا اور کر کے دکھایا ہے ہندوستان ایسے عظیم ملک میں جہاں ہر فرقہ و ملت کے لوگ کثرت سے آباد ہیں، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کی بنیاد پر کسی ایک فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل ہندو مل نکل سکتا ہے تو اس کی عقل کا ماتم کرنا چاہیے۔

مسلم پرسنل لاکے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند نے جو اہم اقدام کیے اور جس کا تذکرہ اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتا رہا ہے، یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جہاں تک حکومت پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت اور اس کے خاطر خواہ عواقب و نتائج کا تعلق ہے اس اقدام کا نتیجہ کیا ہوگا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دارالعلوم کا یہ اقدام بالکل بروقت، بر محل اور اس کی روایات کے شایان شان ہے۔ اسی سلسلہ میں دارالعلوم کی مقرر کردہ کمیٹی کی طرف سے ایک طویل مگر جامع سوانامہ مستند علمائے کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا۔ اس سوانامہ کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، پچھلے دنوں ان پر غور و خوض اور بحث و گفتگو کرنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں تیاری کمیٹی کا ایک جلسہ دو تین نشستوں میں منعقد ہوا اور اس میں یہ موصولہ جوابات پڑھے کمر

سنائے گئے۔ راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شریک تھا اور اسے یہ کہنے میں بڑی مستر ہے کہ جوابات عموماً بڑے مدلل، مفصل، واضح اور صاف تھے، جو فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں کو گنگال کر مرتب کئے گئے تھے۔ ان جوابات میں قیمتی مواد کے علاوہ منطقی اور فقیہانہ استدلال بھی تھا اور وقت کے تقاضوں سے باخبر ہونیکا ہوشمندانہ ثبوت بھی جوابات اکثر و بیشتر بلکہ غالباً سب ہی نوجوان علما کے لکھے اور مرتب کئے ہوئے تھے۔ یہ اور بھی مستر انگریزات ہے، بہر حال اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی سبکی کا کوئی اور نتیجہ نہ بھی نکلا، تو بھی یہ کچھ کم اہم بات نہیں ہے کہ اس تقریب سے اس مسلم پرسنل لاک کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر فقہی تصریحات و بیانات کا ایسا عمدہ ذخیرہ مہیا کر دیا ہے جو اگر شائع ہو گیا تو یہ بجائے خود دارالعلوم کا ایک عظیم کارنامہ اور علما کی طرف سے انتہام حجت کا باعث ہو گا۔

ہیں کوئی شبہ نہیں کہ اگر خلافت راشدہ کی کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو درحقیقت کوئی بھی سماجی اور معاشی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل آسانی کے ساتھ ممکن نہ ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں جب کہ غیر مسلم حکومتوں کا کیا ذکر؟ خود مسلم حکومتوں میں کوئی ایک حکومت بھی صحیح معنی میں اسلامی حکومت نہیں ہے، علما کو سب سے زیادہ توجہ اس بات پر کرنی چاہیے کہ معاشرہ میں فساد اور حالات میں تبدیلی کے باعث احکام میں جو تفسیر و تبدل ضروری ہوتا ہے اس کی تفسیر کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ کیا یہ اختیار حکومت کو دیا جاسکتا ہے اور اس سے کہہ کر کوئی قانون ایسا بنوایا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنی سماجی زندگی میں عام طور پر عروج و غیاء اسلامی اور خلاف شرع رسوم و عوائد سے محفوظ رہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو اختیار دینے کا یہ جواز مطلق ہے یا مقید، یعنی بعض امور کی نسبت یہ اختیار دیا جاسکتا ہے اور بعض کے متعلق نہیں، اگر مقید ہے تو ان امور و معاملات کی تنقیح ہونی چاہیے اور وجہ بتانی چاہیے کہ کیوں بعض امور کا اختیار دیا جاسکتا ہے اور کیوں بعض اور امور کا نہیں دیا جاسکتا، ورنہ ان کا ایک فساد کا سبب ہونے میں سب یکساں ہیں، اور اگر حکومت کو کوئی اختیار دیا ہی نہیں جاسکتا تو پھر مسلمانوں کو معاملات میں خلاف شرع طور طریقوں سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۴۲)
اَسْتَیْلَا مِثْلَ اِهْتِدَادِکَ اِیْحَاکَ یَهْدِیْ شَرِیْعَہ

سر سید اور اسلامی تعلیم و تہذیب :- سر سید نے بار بار، پُر زور الفاظ میں کہا اور لکھا بھی کہ ان کے کالج سے ایسے نوجوان پیدا ہوں گے جن کے دلہنے ہاتھ میں (ایک اور جگہ) یا ان کے سر پر قرآن مجید ہوگا..... تو اب دیکھنا چاہیے کہ سر سید نے اس اہم مقصد کے لئے کیا کیا اور اس کے لئے کیا انتظامات کئے؟ اس ایک سوال کے دو جز ہیں : (الف) دینیات کی تعلیم اور (ب) اسلامی تہذیب و کردار۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔ تاکہ اصل موضوع گھٹکڑ زیادہ واضح ہو سکے۔

دینیات کی تعلیم :- سر سید نے دلہنے ہاتھ میں یا سر پر قرآن مجید کی جو بات کہی تھی پوری سچائی، عزم راسخ اور جذبہ کامل سے کہی تھی۔ اس میں اشک شوق یا محض تصنع کا جیسا کہ سر سید کے ناقد کہتے ہیں، ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کو دل سے اس بات کا یقین تھا کہ مسلمانوں کو بہر حال مل اور کردار کے اعتبار سے پکا اور سچا مسلمان بننا ہے کیونکہ دنیا میں اس قوم کا کوئی وجود نہیں ہو تا جس کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہوتی اور مسلمانوں کی تہذیب کا تار و پود جو کچھ ہے وہ ان کے مذہب کے ہی بنا اور تیار ہلے۔ اس بنا پر اگر مسلمان مذہب کے الگ ہو گئے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کا قومی اور ملی وجود ہی ختم ہو گیا ہاں بے شبہ سر سید مسلمانوں کی ماڈرن اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک جدید ترقی یافتہ اور عروج پذیر قوم بنانا چاہتے تھے، لیکن ان کو یقین تھا کہ اسلام اس راہ میں حائل

نہیں ہے اور اس کی اہل اور سچی تعلیمات نہ صرف اجادت دیتی ہیں۔ بلکہ حکم دیتی ہیں کہ ہر زمانہ میں دنیا کی جو اعلیٰ تہذیب ہو اس کی اپنی اور مفید باتوں کو اختیار کر کے اسلام کے اصول اور اس کی بنیادی تہذیبی و تمدنی تعلیمات کو ان کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ بنایا جائے کہ ان دونوں کے امتزاج سے تہذیب کا جو خاکہ تیار ہو وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی منفرد تہذیب ہو۔ مہرے عربی نکلنے کے بعد جب مسلمانوں نے دنیا میں پھیلنا شروع کیا اور اس راہ میں ان کو اس عہد کی نئی نئی قوموں اور ان کی تہذیبوں سے واسطہ پڑا تو ان کا عمل ہمیشہ خذ ما صفا ودع ما کدسا پر رہا ہے، اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے فاتح ہونے کے باوجود مفتوح اقوام کی تہذیبیں کا قلع نہیں کیا، بلکہ ان کی تہذیب کے صالح عناصر و اجزا کو اختیار کر کے ان کی اسلامی اصول معاشرت و اخلاق کے ساتھ ایسی پیوند کاری کی کہ بالآخر تبدیل کیا مگر روح سرتاسر اسلامی رہی اسلام کی تعلیمات کے ماتحت زندگی متعلق مسلمانوں کا بھی وہ نقطہ نظر ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اور تہذیبانی کے عروج و ارتقا کے ہر مرحلہ میں مسلمانوں کے قومی وجود کے استحکام اور اس کے نشوونما کا ضامن رہا ہے۔ سرید کے علم و یقین میں مسلمانوں کو پہلے واسطہ اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب اور ان کے تمدن سے پڑنا تھا۔ لیکن آج خدا کی مرضی! ان کا واسطہ اس قوم کی تہذیب سے ہے جو مسلمانوں کی محکوم نہیں۔ بلکہ حاکم ہے، اور جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے مشرق و مغرب میں اپنے علوم و فنون اور اپنی تہذیب کی طاقت و قوت کے سہارے پھیلتی اور غالب ہوتی جا رہی ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کی جو روش ماضی میں دوسری تہذیبوں کے ساتھ رہی ہے وہی اب مغربی تہذیب کے ساتھ بھی ہونی چاہیے اور نہ تہذیب جدید کے اس بحران و غلاطم کے زمانہ میں مسلمانوں کا رویہ اگر منفی رہا اور عہد جدید کے تقاضوں پر انہوں نے دھیان نہ دیا تو یہ عہد گزشتہ کی ایک حسرت.....

انگریز بادشاہ کو کرہ جائیں گے۔ یہی وہ فکر و خیال تھا جس کے باعث سرسید جہاں مسلمانوں کے لئے اعلیٰ ماڈرن تعلیم اور مغربی تہذیب کے صالح اور مفید عناصر کو اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے مذہبی تعلیم اور اسلامی تہذیب اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنے کو بھی مان کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیتے تھے۔ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی اس پیوند کاری پر سرسید کے مخالفوں نے انہیں اور علی گڑھ کالج کو کیا کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے آج تک کسی ایسے مسلمان کا نام معلوم نہیں ہوا جو علی گڑھ میں تعلیم پانے کے باعث عیسائی بن گیا ہو۔ حالانکہ عیسائی مشنریز نے اپنا ایک بڑا ادارہ وہاں بھی قائم کر رکھا تھا۔

بہر حال اس اہم اور عظیم مقصد کے پیش نظر سرسید نے جو بضائع تسلیم بنایا اس میں دینیات کی تعلیم کو ہر ایک مسلمان طالب علم کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیا۔ اس معاملہ میں سرسید کی نیک نیتی اور ان کے خلوص کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ چونکہ اپنے مذہبی خیالات و افکار (جن میں سے بعض ہمارے نزدیک صحیح ہیں اور بعض غلط) کے باعث وہ مسلمانوں میں عام طور پر بدنام تھے اس بنا پر دینیات کی تعلیم اور اس کے نصاب وغیرہ پر غور کرنے کی غرض سے انہوں نے شیعہ و سنی دینیات سنیے الگ الگ جو دو کمیٹیاں بنائی تھیں اپنے آپ کو ان دونوں سے الگ رکھا اور کسی ایک کمیٹی کے معمولی ممبر بھی نہیں بنے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی مذہبی کتابوں اور رسالوں میں سے کسی ایک کتاب یا رسالے کو کرایا جزاً نہ شریک نصاب بنانے کی خواہش کی اور نہ طلباء کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی۔ دینیات کے معاملہ میں سرسید کے اس خلوص اور ان کے جذبہ صادق کے باوجود نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دینیات کی تعلیم سرسید کے زمانہ میں اور ان کے بعد کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے عہد میں بھی کبھی کالج یا یونیورسٹی کے شایان شان اور خاطر خواہ نہیں ہو سکی۔ اور اس سے وہ توقعات بالکل پوری نہ ہوئیں جو سرسید کے یہاں غائے قلب و دماغ میں موجزن تھیں۔ اس کا سبب

کیا تھا؟ مولانا حالی فرماتے ہیں :

”مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کے خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شیخ جیسی گراؤ، محمدن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی، لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے منتظموں پر عائد نہیں ہوتا! اول تو وہ مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جدا جدا مقرر ہوئی اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی، دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر شکل اور طریق الدین ہوتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے میں طلباء کو دوسری طرف متوجہ ہونیکا بہت ہی کم موقع ملتا ہے“ (حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۸۲)۔

لیکن ہمارے نزدیک اس کے بنیادی سبب دو ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ سرسید نے، جیسا کہ اصولاً ہونا چاہیے تھا، دینیات کی تعلیم اور اس کے بند و بست کا سارا کام علماء کے سپرد کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا محمد قاسم السانائو قومی سے بڑھ کر مستند اور بلند پایہ عالم اور کون ہو سکتا تھا اور مولانا اور سرسید میں جو مخالفت تھی وہ بھی سب کو معلوم ہے، لیکن اس کے باوجود سرسید نے دینیات کی تعلیم اور اس کی نگرانی کا سارا کام مولانا کے سپرد کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے مولانا سے درخواست کی اور مولانا کی شرط کے مطابق سرسید اس کمیٹی سے الگ بھی رہے، لیکن اس کے باوجود سرسید مولانا کا تعاون حاصل نہ کر سکے حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے منشا کے مطابق یہ کام علماء کے کرنا تھا، لیکن اس موقع پر انہوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی فرض شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ عالم اسلام کی بدقسمتی! ملجا جو ہوا میں گرہ باندھ سکے اور دور کی کوڑی لانے میں شق و بہارت رکھتے ہیں وقت پر ہوا کا رخ پہچاننے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا سبب یہ تھا کہ جو عالم کالج یا یونیورسٹی میں دینیات کا درس دیتے رہے تھے وہ پختہ استعداد ضرور رکھتے تھے لیکن یہ روشن خیال علماء نہیں تھے۔ ان کے نزدیک دینیات اور خود اسلام کا تصور محدود تھا۔ انہوں نے اسلام کا مطالعہ شاہ ولی اللہ دہلوی یا جمال الدین افغانی کے نقطہ نظر سے نہیں کیا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام کا حاصل بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ”خاتمہ بالخیر“ ہو اور آخرت میں جنت نصیب ہو جائے۔ اسلام کس طرح ایک عالمگیر اور اجتماعی مذہب ہے؟ وہ کس طرح ہر قوم کو پذیر معاشرۃ انسانی کی جملہ ضرورتوں کی عملی وجہ انکمال و التمام تکمیل کا ضامن ہے؟ مغربی تہذیب اور مغربی علوم و فنون نے کس طرح ایک جدید علم کلام کی ضرورت پیدا کی ہے اور وہ ضرورت کیونکر پوری کی جاسکتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات سے ان حضرات کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس بنا پر یہاں دینیات کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا وہ وضو اور نجاست اور نماز روزہ وغیرہ کے مسائل تک محدود رہا اور اس لئے یونیورسٹی کے ایک وسیع مضمون کی حیثیت سے اس کو کوئی وقعت حاصل نہ ہو سکی۔

یہ حال تو تھا دینیات کے نصاب تعلیم کا اب ذرا اس کے اہتمام اور اس کی نگرانی کا اجزا بھی سن لیجئے۔ علی گڑھ کے ایک قدیم پوسٹ گریجویٹ حمید الدین خاں صاحب اپنے عہد کے شعبہ دینیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”مولانا عبد اللہ انصاری بڑے نیک خصلت بزرگ تھے اور طلباء سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے بعض لوگ دینیات کی کلاسوں میں کم ہی حاضر ہوتے تھے اور عموماً کوئی نہ کوئی دوست غیر حاضرین کی طرف سے حاضر جناب کسی گوشہ سے پکار دیتا تھا۔ دینیات کے امتحان میں بعض کمزور طلباء کا پی میں خوش خط علی قلم سے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ اور ”ما خذ از کچھ رہاے“ مالیم جناب مولانا ابو محمد عبد اللہ انصاری وغیرہ جیسے الفاظ کا ذکر نہایت عاجزانہ انداز

میں یہ بھی تحریر کر دیتے تھے یا اللہ! تیرے اس عاجز بندے نے دینیات کے سوالوں کے جوابات میں جو غلطیاں کی ہوں ان کو اپنی رحمت سے بخشدے ہو ملا مرحوم ایسی تحریریں پڑھ کر معاف بھی کر دیتے تھے اور فرماتے: سبحان اللہ کیا دیندار لوگ ہیں۔ (مجلتہ علوم الدین جلد انبہ (ص ۱۴)۔

پس جب دینیات سے متعلق خود وہاں کے ذمہ دار علماء اور اساتذہ کی سہل انگاری اور بے اعتنائی کا یہ عالم ہوتا رہا کہ انتظام اور دوسرے حضرات سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس شعبہ کا بھی خاطر خواہ انتظام اور بندوبست کرتے چنانچہ آج بھی جب کہ سائنس انجینئرنگ اور کامرس کا ذکر نہیں! آرٹس اور سوشل سائنس کے بعض بعض شعبوں میں دو دو اور تین تین پروفیسر ہیں اور یونیورسٹی کا بجٹ ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے دینیات کی فیکلٹی ہستی اور شبیہ دینیات میں ایک ریڈر اور چھ پند لکچروں کے سہارے چل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب :- بہر حال سرسید نے داہنے ہاتھ میں قرآن کی جوابات کہی تھی، علماء کی کوتاہی اور بے بصیرتی کے باعث اس میں تو کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن اس کا دوسرا جز تھا اسلامی تہذیب! یہ خود سرسید کے اپنے بس کی بات تھی، چنانچہ انہوں نے اس کو بڑی قوت اور عزم کے ساتھ قائم کیا اور جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن کی، اور پھر امریکہ اور کناڈا اور یورپ میں بعض یونیورسٹیاں کیتھولک چرچ اور بعض یونیورسٹیاں پروٹسٹنٹ چرچ کی منقلد ہیں بنارس ہندو یونیورسٹی ہندو کلچر کی اور شانتی تھکین ڈاکٹر ٹیگور کے تہذیبی تصور کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کالج (جو بعد میں یونیورسٹی بنا) اسلامی کلچر اور اسلامی ثقافت و تہذیب کا ایک مرکز بن گیا۔

کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونیکا مطلب :- لیکن اس موقع پر یہ حقیقت ذہن

نیشن کر لینی چاہیے کہ کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہو نیکاً یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس ادارہ کے تمام افراد عبادات اور جہ رسوم و معاملات میں یکساں ہوتے ہیں، عبادات کا معاملہ بندہ اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اس لئے وہ انفرادی اعمال و افعال ہیں اور تہذیب کا تعلق اجتماعیت کے ساتھ ہے، اس بنا پر کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں سب افراد اپنی تہذیب کے اقدار عالیہ سے وابستہ ہیں اور وہ اس کا احترام و ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے اخلاق، عادات، ان کا اپنوں اور غیروں کے ساتھ برتاؤ اور ان کی معاشرتی زندگی، ان کے فکر کا اسلوب ان کی رفتار اور گفتار یہ سب ان کی تہذیبی اقدار کا ترجمان ہوتے ہیں، عبادات کے معاملہ میں وہ باہم دگر کیسے ہی مختلف ہوں، لیکن اجتماعی زندگی میں مذہبی شعائر و رسوم جو ایک قوم کے ملی خصائص اور اس کے لئے وجہ امتیاز ہوتے ہیں ان کی رعایت اور نگہداشت بہر حال ضروری اور واجب ہوتی ہے، اسی کو علامہ اقبال نے سورج کی کرن کہا ہے۔ فرماتے ہیں:

چمک سورج میں کیا باقی رہیگی

اگر میزار ہے اپنی کرن سے !!

یہ تہذیب ایک قوم کی انفرادیت اور انسانی معاشرہ میں اس کے امتیاز کی دلیل ہوتی ہے۔ ان وجوہ کے باعث سرسید نے کالج میں تعلیم پانے کے ساتھ وہاں کی اقامتی زندگی کو بھی لازمی قرار دیا کیونکہ اس کے بغیر تربیت کا سروسان نہیں ہو سکتا تھا سرسید کو اس تربیت کا اس درجہ سے اہتمام تھا کہ انہوں نے بچوں کے لئے بھی کالج میں جگہ پیدا کی کیونکہ بچپن میں جو تربیت ہوتی ہے اس کا رنگ بڑا پختہ ہوتا ہے۔ ان بچوں کے نظام تربیت کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں :-

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک بچے مختلف فرائض میں جکڑے

ہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا یا گیند باکین، مارنگ

اسکول، ٹاسٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا، اور سونا یا سوکر اٹھنا، غرض ہر ایک کام کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں، جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا، ظاہر ہے جب ان کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ وہ اس عبادت کو چھوڑ دیں گے، اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لئے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عبادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعتِ ثانیہ ہو جاتی ہے۔

(حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۷۷)

ہوسٹل کے علاوہ مختلف قسم کی سوسائٹیاں، انجمنیں اور ادارے بھی قائم کئے گئے جو طلباء کی تربیت کا کام کرتے تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نوجوان آٹھ دس برس وہاں گزار لیتے تھے وہ خاص خاص اخلاق و عادات اور صفات کے حامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ نماز روزہ کے پابند ہوں یا نہ ہوں لیکن ان میں غیرت و حیثیت اسلامی ہوتی تھی، جبری اور بے باک ہوتے تھے، ہنس کھ اور شگفتہ مزاج ہوتے تھے، ایک دوسرے کے ہمدرد و انگار، ضرورت کے وقت مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار، تنگ نظری اور قصبے بالاتر، فراخوصلہ اور عالی ہمت ہوتے تھے۔ صاف ستھری زندگی عام بول چال میں گویا سٹائٹ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے۔ طبیعت میں بلند پروازی ہوتی اور شرافت و حسن اخلاق کا پیکر ہوتے تھے، میسج بچپن کی بات ہے اور خود میرے خاندان کے متعدد عزیز اور بزرگ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مذکورہ بالا اوصاف اس زمانہ میں علی گڑھ کے خصوصیات میں سے سمجھے جاتے تھے۔ یہ کیرکٹر اور کردار تو تھا ان نوجوانوں کا جو علی گڑھ

۱۔ اگرچہ علی گڑھ کبھی چند ایک ایسے طلباء سے محروم نہیں رہا جو بخود نماز تلاوت قرآن کے ہی پابند نہیں، تہجد کے بھی پابند ہوتے تھے۔

کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہو کر آتے تھے اور خود کالج کا اسلامی کیرکٹر یہ تھا کہ یہاں ایک مالی شان مسجد ہے، اس کے علاوہ ہوسٹلوں میں بھی نماز کا اہتمام تھا۔ طلباء کو جماعت سے نماز ادا کر نیکی نہ صرف ترغیب دی جاتی بلکہ مسجد میں باقاعدہ حاضری بھی لی جاتی تھی مسجد میں خاص خاص دنوں میں وعظ یا درس قرآن کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ کالج میں تعطیل جمعہ کو ہوتی تھی پورے کمپس میں کوئی شراب نہیں پی سکتا تھا۔ عورتیں بے پردہ نہیں آسکتی تھیں۔ کالج میں جب کوئی فنکشن ہوتا تو اس کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے وقت جلسہ ملتوی یا ختم ہو جاتا تھا۔ رمضان کے دنوں میں کوئی شخص کھلے بندوں کھا پیتا نظر نہیں آسکتا تھا۔ اسلامی تیوہار اور تقریبات بڑے اہتمام اور شان و شوکت منائے جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت اسلام علیکم کہتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی خواہ کسی عقیدہ یا خیال کا ہو لیکن کوئی شخص یونیورسٹی کے احاطہ میں خدا پیغمبر یا مذہب کے مسئلہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس ایک چیز کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ملازمت کے وقت ہر شخص کو ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے ہوتے تھے کہ وہ اسلام کے خلاف کہی کوئی بات نہیں کہے گا اور نہ کوئی ایسا عمل کریگا جس سے اسلام کی توہین و تنقیص ہوتی ہو، علی گڑھ میں تعلیم کے ساتھ کھیل کود (Sports) پر بھی بڑا زور ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود مجال نہیں تھی کہ لڑکے اور لڑکیاں ڈرامہ میں ایک ساتھ ایکٹنگ کریں، ناچ رنگ وغیرہ یہ سب ممنوع تھے۔ اقبال نے جو کہا ہے :-

۱۔ اس کا اہتمام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے زمانہ میں بھی اس درجہ تھا کہ ایک مشہور کمیونسٹ جن کا چھ برس ہوئے انتقال ہو گیا ہے کا ایک مرتبہ شعبہ تاریخ میں پکچر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور انہوں نے کسی پکچر میں خدا اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہدی تو ادھر لڑکوں میں ہنگامہ ہوا اور ادھر ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کو فوراً نوکری سے برخاست کر دیا۔

انھیں کو بتاؤں میں تقدیر ام کیا ہے شمشیر و سناں اول طاؤس در باب آخر سرسید اس فلسفہ سے اچھی طرح آشنا تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نوجوانوں کو ہمیشہ شمشیر و سناں بکف ہونے اور طاؤس در باب سے محبت رہنے کی تاکید کی، سرسید کو ترکوں کا لباس بہت پسند تھا انھوں نے خود اسے اختیار کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ لڑکوں کے لئے اسے ہی یونیفارم بنادیں۔ لیکن بقول مولانا حالی کے بعض مواقع کے باعث اسے نافذ نہیں کر سکے، تاہم سرسید کے دیکھا دکھی یہ لباس کالج میں اس درجہ مقبول ہوا کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اسے علی گڑھ سے باہر بھی استعمال کرتے تھے۔ ترکش کوٹ گیا تو اس کی جگہ شبروانی نے لی۔ کھڑے پانسوں کا پا جامہ اور شیروانی کی ایک مخصوص تراش علی گڑھ کٹ کہلاتی تھی اور پورے ملک میں اس نام سے معروف تھی۔ علی گڑھ میں یہ دونوں اور ان کے ساتھ ترکی ٹوپی، ان تینوں کا اس درجہ اہتمام تھا کہ کوئی استاذ یا طالب علم اپنے مکان یا کمرہ سے باہر ان کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ اساتذہ اور طلبا میں باہم باپ اور اولاد کا سا تعلق ہوتا تھا۔ اساتذہ کلاس روم سے باہر بھی طلبا کا برابر خیال رکھتے اور ان کی ہر قسم کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، اسی طرح طلبا ان کے ساتھ ادب و احترام اور محبت کا معاملہ کرتے تھے۔

غرض کہ یہ ہے وہ کلچر اور وہ تہذیب جس کو اس کے پورے لوازم کے ساتھ سرسید نے کالج میں برپا کیا اور یہی کلچر اس درس گاہ کی خصوصیت اور نشان امتیاز بن گیا۔ ۱۹۷۷ء کا ترمیمی ایکٹ منظور ہو جانے کے بعد وزیر تعلیم نے متعدد تقریریں دیں یہ طور طنز کہا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی مذہبی ادارہ نہیں اور اس کا کام مولوی طانے پیدا کرنا نہیں ہے، گذارش یہ ہے کہ بجا فرمایا آپ نے! بیٹنگ علی گڑھ ایک مذہبی مدرسہ نہیں اور اس نے مولوی طانوں کے بجائے (مولانا) محمد علی، محمد شعیب قریشی، عبدالرحمن مجبوری اور محفوظ علی جیسے انگریزی زبان کے ادیب اور انشا پرداز اور علوم جدیدہ کے ماہر و فاضل ایسے

ہزاروں افراد پیدا کئے ہیں جنہوں نے اس ملک کی قسمت بدل دی اور ہر شعبہ زندگی میں حاصل کی۔ لیکن یہ سب حضرات ایک مخصوص کچر اور تہذیب کے حامل تھے اور یہی تہذیب علی گڑھ کالج اور پھر یونیورسٹی کا طفرائے امتیاز تھی۔ اگر کیمبرج اور آکسفورڈ کو عیسائی تہذیب پر بنارس ہندو یونیورسٹی کو ہندو تہذیب پر اور شاہی کیتھن کو گوری تہذیب پر فخر ہے تو بے شبہ سرہند کے کالج کو اسلامی تہذیب پر فخر تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ اس موقع پر گاندھی جی کا ایک واقعہ یاد آیا۔ میں اسے برہان میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں اور موقع کی مناسبت سے اب پھر یہاں لکھتا ہوں :

۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے، ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد نے مفتی محمد کفایت اللہ مولانا احمد سعید، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حفص الرحمن سیوہاروی، ڈاکٹر ذاکر حسین (اللہ اکبر!) اب یہ سب ہی مرحوم ہو گئے۔ رحمہم اللہ! مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور خاکسار اقم الحرمین (داروان رفتہ کے ماتم کنندگان حسرت سرا) ان سب کو بیچ پر مدعو کیا۔ اس دعوت کا اصل مقصد تو تھا ان مسجدوں کے متعلق مشورہ کرنا جن کے علاقوں میں ایک مسلمان بھی نہیں رہا اور اب وہ وہاں اجاڑ اور ویران پڑی ہوئی ہیں لیکن جب

۱۔ میں علی سیاست کا مریدان کبھی بھی نہیں رہا۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد برہان کا برابر مطالعہ کرتے اور میری بعض تصانیف جو ان کی نظر سے گذر چکی تھیں ان پر تحسین فرماتے تھے خاص طور پر میری کتاب 'اسلام میں غلامی کی حقیقت' کے بارہ میں فرمایا کہ اس موضوع پر میرے شفیق بکنے 'الرق فی الاسلام' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے اور میں نے اس کو بھی پڑھا ہے، لیکن ہتھاری کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ جامع اور بہتر ہے، بہر حال ان وجوہ سے مولانا مجھ پر خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے اور اس لئے جب کبھی مسلمانوں سے متعلق کوئی علی یا تبلیغی مشورہ کرنا ہوتا تھا مجھے اس میں ضرور (الٹے معز پر)

بات چلی تو اور چند امور بھی زیر گفتگو آ گئے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خطاب کر کے پوچھا: مولانا! کیا اب علی گڑھ اور بنارس کے ہندو مسلم یونیورسٹی نام رہ

شریک کر لیتے تھے۔ یہی ان کی وہ شغقت بزرگانہ تھی جس کے باعث جب مغربی بنگال کی گورنمنٹ نے ان سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے آدمی طلب کیا تو انہوں نے فوراً وہاں میرا نام لکھ بھیجا، ۱۹۴۷ء میں اس عہدہ کا چارج لینے کے ایک دن میں مغربی بنگال گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کے اڈیشنل سکرٹری سٹراے کے چنڈا سے ملا۔ یہ نہایت شگفتہ مزاج اور خوش باش بنگالی آفیسر اور مولانا آزاد کے لئے تکلف دوست اور ان کے حاضر باشوں میں تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک چند اصحاب بولے: اور ہاں اکبر آبادی صاحب! معلوم ہوتا ہے آپ بڑے قابل آدمی ہیں! میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا! انہوں نے جواب دیا: بسنے! میں مولانا ابوالکلام کو تیس برس سے جانتا ہوں وہ کسی کی تعریف کرنے میں سید بخیل ہیں لیکن آپ کی تعریف میں انہوں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہا جو میں نے ان کی زبان سے کسی کی نسبت نہیں سنا، ہوا یہ کہ ادھر کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے مولانا نے آپ کا نام بھیجا اور ادھر پروفیسر ہمایوں کبیر نے کلکتہ کے ہی ایک نیم بنگالی جو ڈبل ایم۔ اے تھے اور تعلیم کا پرانا تجربہ رکھتے تھے اس پوسٹ کے لئے ان کے نام کی سفارش کی۔ میں جب دہلی جا کر مولانا سے ملا اور ہمایوں کبیر کی تجویز کا ذکر کیا تو مولانا یہ سننے ہی غصہ کے مارے سرخ ہو گئے۔ اور فرمایا: ہرگز نہیں! اکبر آبادی کے سوا دوسرا کوئی شخص ہرگز پرنسپل نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنے کے بعد مولانا نے آپ کی نسبت وہ تعریفی الفاظ کہے جن کو میں ان کی زبان سے سن کر سخت متعجب ہوا تھا۔ یہ الفاظ کیا تھے؟ ان کو نہ چندہ صاحب نے بیان کیا اور نہ میں نے ان کی کرید کرنا مناسب جانا! بہان میں اگر کوئی اچھا مضمون میرے قلم سے نکلتا تو عند الملاقات اس پر خوشنودی کا اظہار فرماتے تھے اور اگر کوئی جملہ یا فقرہ! کوئی پیرا اگر افسوسہ نہیں آتا تھا (دیکھ صفحہ ۲۱۷)

لیگیں گے؛ مولانا یہ منکر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کر کے کچھ غور فرمانے لگے۔ اتنے میں میں نے کہا: اگر گستاخی نہ ہو تو گاندھی جی کا ایک واقعہ عرض کروں جو میں نے شفیق الرحمن صاحب (مرحوم) سے براہِ راست سنا ہے، مولانا نے فرمایا کیسے کیسے! بے تکلف سنایا کیا واقعہ ہے؟ میں نے عرض کیا: شفیق الرحمن صاحب نے کہا: ایک مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس کا چلنا دشوار ہو گیا تو اس معاملہ پر غور و فوض کرنے کے لئے ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کی کوٹھی نمبر ۱۰ دریا گنج میں ایک اہم اجتماع ہوا جس میں گاندھی جی، حکیم اہل خاں، ڈاکٹر انصاری، سیٹھ جنالال بجاج اور شفیق الرحمن صاحب، قدوائی وغیرہ حضرات شریک تھے، اصل موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک سیٹھ جنالال بجاج حکیم اہل خاں صاحب کو مخاطب کر کے بولے: یکم صاحب! اگر آپ جامعہ کے نام سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ لاکھوں روپیہ تو جامعہ کے لئے میں ہندوؤں سے دواؤں گا، گاندھی جی اس وقت گادنگیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ یہ سنا تو اوبد اُکے پالتی مار کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ”ہیں بجاج! یہ کیا کہاتم نے! یہ جامعہ کا نام اسلامیہ تو میں نے رکھوایا ہے اور اسی مقصد اور ارادہ سے کہ یہ اسلامی کالج کی درس گاہ ہوگی یہ کالج دنیا کا ایک عظیم کالج ہے اور مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی اس کالج کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ پھر فرمایا: آخر کوئی ایک درس گاہ تو ایسی ہونی چاہیے جہاں اگر میں اپنے بیٹے دیو داس گاندھی کو اسلامی کالج کی تعلیم دلانا چاہوں تو صبح سکول۔ اس کے بعد گاندھی جی نے چنانچہ غائب دیو داس گاندھی نے کچھ عرصہ کہ جامعہ میں تعلیم بھی پائی ہے۔

تو اس پر بھی متنبہ فرمادیتے اور کہتے: مولوی صاحب! اگر آپ اس جملہ میں الفاظ کی ترتیب اس طرح کر دیتے تو کلام زیادہ دلچسپ ہو جاتا۔ سدا رہے نام اللہ کا! اب بھی میں تیرے قصوں سے وہی راز و نیاز کرتا ہوں۔

نے حکیم صاحب مخاطب ہو کر کہا: حکیم صاحب! آپ بجا ج کی بات کا کوئی خیال نہ کریں
میں اذ آپ ملک کے دورہ پر نکلیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے
ہی لاکھوں روپیہ ہندوؤں سے لادوں گا۔ یہ واقعہ اس اجتماع کے سبب شرم کا نئے بہت
دھچکی اور توجہ سے نا۔ جب میں نہ چکا تو مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے پوچھا: کیا یہ واقعہ صحیح
ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کی اور فرمایا: جی ہاں! شفیق صاحب نے یہ واقعہ ہم لوگوں
کو بھی سنایا تھا۔

سر سید انگلیں لڑ گئے تو وہاں علوم و فنون جدیدہ، نظام تعلیم و تربیت اور ایڈمنسٹریشن
ان سب کے اس درجہ متاثر ہو کر آئے کہ یہاں بات بات میں کیمبرج اور آکسفورڈ کو سامنے رکھتے
تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ یہ دونوں یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن اور ان کی
روایات کی پاباں ہیں اور سر سید اپنے کالج کو اسلامی تہذیب اور اس کے کلچر کا ترجمان بنانے
کا عزم اور جذبہ رکھتے تھے اور اسی وجہ سے کالج کا نام محمدن کالج رکھا گیا تھا۔ ورنہ اس
زمانہ کے گلے مدرسہ اور سنسکرت کالج، مملکت کی طرح یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ یہ کالج صرف
ایک فرقہ کے طلباء کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے فرقہ کے طلباء کے لئے اس کا دروازہ بند
ہے۔ پس اگر کالج ایک جسم تھا تو اس کی روح اسلامی کلچر ہے، اگر وہ ایک پھول تھا تو اس
کی بو اسلامی تہذیب تھی، اگر کاغذ شرباب و آتش کیے تو اسلامی ثقافت کو اس کا نشہ بھینے
غیرت مند ادارے اور باجمیت قومیں کس طرح اپنے کلچر اور تہذیب کی حفاظت کرتی ہیں؟
اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بڑی بڑی جنگیں اسی تہذیب کی خاطر ہوتی ہیں۔
اور آج بھی قوموں میں باہم کشیدگی اور رقابت کا بڑا سبب تہذیب ہی ہے۔ بہر حال
سر سید اگرچہ دینیات کی تعلیم اور ان کے دروبست کا معقول اور نامزد و انتظام نہیں
کر سکے، کیونکہ ملائے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور جو علماء اس شعبہ کے ساتھ وابستہ تھے
وہ درسی اور فنی استعداد کے اعتبار سے کیسے ہی لائق و فائق ہوں، فکر و نظر، مطالعہ اور

اٹل اندیشی کے لحاظ سے لائے کتب سے زیادہ نہیں تھے لیکن اسلامی تہذیب کو قائم کرنا سرید
کے جس کی بات تھی اس میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔
سات اصول ۱۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سب کو سامنے رکھیے تو سرید نے کالج
کو جن روایات کے ساتھ چھوڑا اور اس سلسلہ میں ان کی جو پالیسی رہی اسے دفعات ذیل میں
بیان کیا جاسکتا ہے۔

- (۱) کالج صرف ایک درس گاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تحریک تھا۔
- (۲) کالج کا مقصد مسلمانوں کو حصینِ ذلت و خواری سے نکال کر عزت و رفعت کے
مقام پر لانا تھا۔
- (۳) کالج میں علوم و فنونِ جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا جائے۔
- (۴) کالج صرف ایک تعلیم کا نہیں بلکہ تہذیب و تربیت کا بھی مرکز تھا۔
- (۵) کالج میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں اور مذاہب غیر کے نوجوان بھی تعلیم
پاسکیں گے۔

(۶) کالج کا کوئی تعلق ملک کی سیاست سے نہیں ہوگا۔

(۷) کالج حکومتِ وقت سے اشتراکِ دتھاؤن حاصل کرنیکی کوشش کو تار ہے گا۔
نواب محسن الملک کا دور: سرید کے انتقال کے بعد سید محمود آنریری سکریٹری ہوئے،
لیکن کثرتِ بلاء و نوبت کے سبب ان کی صحت کو گھٹن لگ چکا تھا۔ وہ زیادہ دنوں نہ چل سکے
اور دس ماہ کے بعد ہی یعنی ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری مقرر
ہوئے۔ نواب صاحبِ علمانوں کے نہایت دردمند، خاموش کارکن اور بے حد شخص اور
مستعد بزرگ تھے۔ انہوں نے سکریٹری ہوتے ہی کالج کو وہ بال و پر دیئے کہ کالج شاہراہ
ترقی پر تیز رفتاری سے گامزن ہو گیا۔ مولوی طہیل احمد صاحب منگوری لکھتے ہیں:۔
سرید کے انتقال کے بعد نہ صرف علی گڑھ کالج کی حیثیت قائم رہی، بلکہ نواب

محکم الملک بہادر کی پالیسی سے پہلے نقصانات کی تلافی کا دور شروع ہوا..... آپ کی کوشش سے تھوڑے عرصہ میں نہ صرف کالج کے ذمہ کا پہلا قرضہ ادا کر دیا گیا، بلکہ لاکھوں روپے کالج میں جمع ہو گیا اور جو ہمارے سالہا سال سے ناقص پڑی چلی آرہی تھیں وہ مکمل ہو گئیں۔ ایک بڑا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ اپنے جلسوں اور قومی تقریبات میں علما اور مشائخ کو شریک کر کے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصہ سے چلی آرہی تھی اسے دور کیا اور اس طرح تمام مسلمانوں کو بہت کچھ ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی، اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کے عرصہ میں تعداد طلباء دو گنی کے قریب ہو گئی، مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۲۱)۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: سستیدنے کالج کے نمونے پر ملک بھر میں جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج بنانے کی غرض سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ کی تاسیس کی تھی۔ لیکن وہ کالج کے معاملات میں ہی اس درجہ مصروف رہے کہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے اور کانفرنس کا کام آگے نہ بڑھا۔ نواب محکم الملک نے بدقسمتی اور روشن دماغی کی راہ سے اس ادارہ کی اہمیت اور مسلمانوں کے لئے اس کی شدید ضرورت کو محسوس کیا تو انھوں نے اس پر بھی خاطر خواہ توجہ مبذول فرمائی اور اس کو ترقی دے دی چنانچہ اپنے سکریٹری بننے کے پہلے ہی سال ۱۸۹۹ء کے ماہ دسمبر میں کلکتہ میں کانفرنس کا چوتھا اجلاس منعقد ہوا اس میں ایک تجویز منظور کرائی جس کا حاصل یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اسلامیہ کالجوں کو طلباء مسلم ہونے کے لئے ہر ضلع یا مجموعہ اضلاع میں تہمدی مدارس قائم کئے جائیں، اس تجویز کا اثر یہ ہوا کہ کانفرنس کی سہی اور کوشش سے مختلف مقامات میں مسلمانوں کے اسکول قائم ہونے لگے، علاوہ ازیں نواب صاحب مرحوم کی جدوجہد اور کوشش کے باعث ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے اور ان اجلاسوں میں مقامی مسلمانوں نے اپنے اپنے

سکولوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق تجویزیں منظور کیں اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے مطابقت
کئے مثلاً مسلمان انسپکٹر آف ایجوکیشن کو حقر، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں عربی، فارسی اور
اردو کی تعلیم کا بندوبست، طلباء کے لئے سرکاری وظائف، غریب طلباء کی فیس کی معافی، انصاف
تعلیم میں ایسی ترمیم کہ وہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو جائے، سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم
کی اجازت ہو، مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں: یہ وہ مراعات تھیں جو ۲۰-۳۵
سال قبل گورنمنٹ نے مسلمانوں کے لئے منظور کی تھیں اور جن کی طرف اجتماعی طور پر مسلمانوں
کو اس وقت توجہ ہوئی جب کہ وقت بہت کچھ نکل چکا تھا۔ بہر حال نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر
تھا۔ جو بالآخر کانفرنس کے ذریعہ ہونا شروع ہوا۔ (ص ۲۳۳)

انگریز اساتذہ کی خدمت کا تسلسل:۔ سر سید کو انگریز اساتذہ کی تعلیمی خدمات حاصل
کرنے پر جو اصرار تھا نواب محسن الملک کو اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس تھا اس لئے
وہ اپنے دور سرکریٹری شپ میں بھی اس پر عامل رہے۔ چنانچہ سر سید کے انتقال کے ایک برس بعد
ہی جب پرنسپل بیگ کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ پر و فیس مارلین پرنسپل مقرر ہوئے اور انھوں
نے کالج کی ہمہ جہتی اور طلباء کی عام فلاح و بہبود کے لئے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ان
سے نہ صرف یہ کہ کالج کو مزید استحکام ہوا بلکہ ملک میں بھی اس کے وقار اور شہرت کو چار چاند
لگ گئے، پرنسپل مارلین طلباء سے ان کے علی گڑھ سے فراغت کے بعد بھی تعلق اور رابطہ رکھتے
ملازمت کے حصول میں ان کی مدد کرتے اور اپنے مشوروں سے ان کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔
نماز کی پابندی:۔ خود نماز روزہ کے بہت پابند تھے اور اکثر نماز باجماعت یونیورسٹی کی
مسجد میں ادا کرتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب اپنے دفتر سے اٹھ کر مسجد میں نماز کیلئے جاتے
تھے تو راہ میں جو مسلمان طالب علم بھی مل جاتا اسے بھی ساتھ لیتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک زمانہ میں
نماز کے وقت طلباء کی باقاعدہ حاضری ہوتی تھی اور جو طلباء کسی معقول عذر کے بغیر غائب ہوتے
تھے ان پر جرمانہ ہوتا تھا۔ غرض کہ سر سید نے کالج میں جو اسلامی تہذیب قائم کرنا چاہی تھی
نواب محسن الملک کے دامن میں اس پر اور جلا ہوئی اور اس کا رنگ نکھر گیا۔

رسولؐ شاہد و شہود

(۲)

(از جناب قاری بشیر الدین جصا پنڈت . ایم . اے)

اللہ تعالیٰ نے دعا براہِ اسیم کو شرفِ قبولیت بخشا۔ کعبہ تعمیر کرتے وقت دعا مانگی تھی :
 رَبَّنَا وَجَعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَهَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا۔ تا۔ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَنِيُّ الْحَكِيمُ سورۃ بقرہ
 آیات ۱۲۸، ۱۲۹) یعنی اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنالیجے اور ہماری اولاد
 میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجے جو آپ کی مطیع ہو اور ہم کو حج کرنے کے احکام بھی بتا دیجے
 اور ہمارے حال پر توجہ رکھیے فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمائیو اے ، مہربانی کرنیوالے اور
 اے ہمارے پالنہار اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجے جو لوگوں کو
 آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو آسمانی کتاب و حکمت کی تسلیم دے اور ان کو پاک کر دیں
 بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب اور حکمت والے ۔

اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی ارشاد ہوا یہ تھے بڑی قوم بناؤں گا۔ تیرا نام بڑا کروں گا۔
 اور ان کو برکت دوں گا جو تجھے برکت دیتے ہیں اور نفی کر دوں گا تیرے (تجھے) خفیف کر نیوالوں
 کو اور برکت پائیں گے تجھ سے سب زمین کے سب گھرانے ؟

اس پیشین گوئی کے کچھ اور اجزاء بھی ہیں جو بائبل کی کتاب کی پیدائش کے ابواب ۲ تا ۴ میں
 میں موسیٰ کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں مثلاً (۱) ختنہ کا عہد جس قوم میں ہو گا وہی خدا کے
 عہد کی وارث ہوگی (پیدائش ۱۷، آیت ۱۴، ۱۵) (۲) اسلیل کے حق میں دعا کی قبولیت یعنی اس
 سے ایک نعتِ عظیمہ (مسلمہ) پیدا ہوگی (پیدائش ۱۷، آیت ۲۰)۔ (۳) فرشتہ کا والدہ اسمیل

یعنی حضرت آجرہ سے وعدہ کہ تیرے بیٹے سے ایک عظیم اُشان قوم پیدا ہوگی دپسیدائش

۲۱ : ۶۷۰

بہر حال ان تمام نشانیوں کو پیش نظر رکھ کر غور فرمائیے کہ یہ کس طرح جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری اترتی ہے۔ مذکورہ بالا پیشینگوئی میں یہ بتایا گیا ہے کہ تجھے جو برکت دیتے ہیں میں ان کو برکت دوں گا؛ دنیا میں صرف امت مسلمہ ہی ایک وہ قوم ہے جو اپنی پختہ نمازوں میں اور روزانہ درود و وظائف میں حضرت ابراہیم اور ان کی ان اصحاب کے لئے دعا برکت بھیجتی ہے۔ اور ہم گھنٹوں میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ میں درود شریف نہ پڑھی جاتی ہو۔ سورہ احزاب رکوع کی اس آیت شریفہ یعنی **إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا** کے صریح حکم کی بنا پر صلوٰۃ و سلام بھیجا ہر فرد امت پر فرض ہے اور نبیؐ پر سخت و معید ہیں۔ بتدرک عالم میں حضرت کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا جناب محمد رسول اللہؐ نے محروم و برباد ہو وہ شخص جو رمضان المبارک کا مہینہ پائے پھر بھی اس میں اس کی مغفرت کا فیصلہ نہ ہو۔ تباہ و برباد ہو وہ بد نصیب اور بے توفیق کہ جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور درود نہ بھیجے۔ برباد ہو وہ بد بخت جو اپنے بڑے باپ یا ماں یا دونوں کی خدمت کو کہے جنت کا مستحق نہ ہو سکے۔ درود شریف کی عظمت و اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نیک مقاصد کیلئے دعاؤں کی جگہ صرف درود شریف ہی پڑھا کرے تو اس کے سارے مسائل غیبیے حل ہوں گے۔ جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے (ترمذی) یہ اللہ کا خصوصی کرم ہے کہ وہ اپنے حبیب پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت درود بھیجے کا صلہ اس طرح عطا فرمائے کہ اس کے تمام مسائل غیبیے حل کر دے۔ جو اللہ کا بندہ جناب رسول اللہؐ پر ایک صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس پر دس صلوٰۃ بھیجی جاتی ہیں۔ اس کے نامہ اعمال میں دس نیکیاں درج کی جاتی ہیں۔ دس گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔

اور اس کا مرتبہ دس درجہ بلند کر دیا جاتا ہے ۔

تو پھر جس بندہ کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی ذاتی دعاؤں کی جگہ بھی صرف آنحضورؐ کیلئے صلوٰۃ کی استدعا کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ و سلام، رحمتوں اور عنایتوں کی کیسی موسلا دھار بارش ہوگی جس کا لازمی اثر و انجام یہ ہوگا کہ اللہ کی رحمت بلا مانگے اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا یقین و علم عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ اس پیشینگوئی کی تائید حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کی کہ اس کے (آنحضرتؐ کے) حق میں سدا دعا ہوگی اور ہر روز اس کی مبارک باد بھی جائے گی۔ (ملاحظہ ہو زبور ۷۲: ۱۵) وید بھی اس کے مؤید ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے یہاں کوئی روزانہ دعا ایسی نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا برکت کے مضمون پر مشتمل ہو۔ اس کے برکت دینے والی قوم سے مراد صرف امت مسلمہ ہے، جو صحیح معنی میں دینِ حنیف کی پیروی ہے۔

پیشینگوئی کا دوسرا جزو کہ ”دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے“ صرف امت میں سے مخصوص ہے کیونکہ یہودی مذہب میں تبلیغِ مسیح سے منع ہے اگر ان کی طویل تاریخ میں سے دو واقعات کو خارج کر دیا جائے ایک یہ کہ بعثتِ محمدیؐ سے کئی صدی قبل یمن میں ایک قابلِ ذکر تعداد نے یہودی مذہب قبول کر لیا اور دوسرا یہ واقعہ کہ روس کے حدود میں تاتاری الاصل ریاستِ قزار کے باشندوں نے یہودی مذہب کو قبول کیا تو پھر یہودیوں کے پاس ان کی زندگی کے کسی دور میں کوئی عالمی پیغام نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی خون و نسل، روحانی پاکیزگی و صلاحیت نیز قربِ خداوندی کو صرف اپنی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ عالمی پیغام کی روح اور اسپرٹ کے قطعی منافی ہے۔ روئے زمین کی دوسری اقوام اور پوری انسانیت کو اپنے دعوت و پیغام میں شریک کرنا اور انہیں عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ میں برابر کا حصہ دار سمجھنا ان کے مذہبی عقائد و مزاج کے خلاف ہے۔ دنیا کی تمام اقوام ان کی نظر میں جمادات و حیوانات سے زیادہ قیمت نہیں رکھتیں۔ اللہ نے

ان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ غوث باللہ اس کی لاڈلی اولاد یعنی یہود کی خدمت کرتے رہیں۔ یہ نظریہ اور عقیدہ ہندوستان کے ان برہمنوں اور آریہوں کے ان فاختوں کے عقیدہ سے بہت متماثل ہے جو گویدک کال کے بعد ہوئے اور جس پر آج ہندو مذہب کے طبقاتی نظام اور مخدوم مساوات کی بنیاد ہے اور باوجود اصلاحی کوششوں کے اب بھی سماج میں رائج ہے، اور اس پر بدستور عمل ہو رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی کل دنیا کی رہنمائی کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ (مئی ۱۵: ۲۴)۔

غرض کہ کل انبیاء عالم میں آنحضرتؐ ہی ایک ایسے نبی ہیں جو دنیا کے تمام گھرانوں کے لئے برکت لائے۔ قرآن پاک نے اس بشارت ابراہیمی کی ان الفاظ میں تائید کی: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (سورہ اعراف آیت ۵۸) یعنی کہو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ میرے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرو، کلمے گورے بھی، عربی بھی اور عجمی بھی، تم میں کسی کو کسی پر رنگ و نسل اور قوم و وطن کی وجہ سے فوقیت نہیں البتہ تم میں اشرف و اعلیٰ وہ ہے جو نیک ہے، متقی و پرہیزگار ہے اور اللہ والا ہے۔ اِنْ اَتَوْكُمْ مُّعَذَّةً مِنَ اللَّهِ اَتَقْلَمُ اَمْ تَخْشَوْنَ كَيْدَ الَّذِي يُضِلُّ الْبَصِيرَ (سورہ اعراف آیت ۸۵)۔ اے لوگو! اگر تم کو اللہ سے عذاب پہنچے گا تو کیا تم اسے قلم کرنے سے ڈرتے ہو یا اس کی دغا بازی سے ڈرتے ہو؟

(۵) جناب یعقوبؒ کی پیشین گوئی :-

عصر حاضر کے علماء محققین اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن عزیز کے علاوہ تمام الہامی کتب میں تحریف ہے لیکن یہ کتنے حیرت کی بات ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان میں جو بشارتیں اور پیشین گوئیاں محفوظ رکھی ہیں اسی لئے جو اسرائیل جناب سید کے بعد بھی اس آیت الہیہ کی منتظر تھے جن کی نشاندہی جناب ابراہیم کے بعد بھی برامہ کی جاتی رہی۔ جناب یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے پوتے اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹے ہیں انھوں نے اپنے بسترِ رحال پر اپنے سب بیٹوں کو جو تعداد میں تھے طلب کیا

اور ہر ایک کو اس کی عادت اور فضیلت کے مطابق دعا دی، سب سے بڑے بیٹے یہودہ کو مخاطب کر کے دعا دی، فرمایا یہودہ سے ریاست کا عصا جدا ہوگا اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عصا موقوف ہوگا جب تک کہ شیلوہ نہ آجائے اور تو میں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی۔ (پیدائش باب ۴۹ آیت ۱۰) یوسف علیہ السلام کے لئے برکت چاہی اور کہا کہ خدا جس کے سامنے میرے دادا ابراہیم اور باپ اسحق چلے ان کو برکت دیوے، (کتاب پیدائش باب ۴۸، آیت ۱۵)۔ ان بشارات سے ظاہر ہے کہ یعقوبؑ کی اولاد میں حکومت کا عصا اگر یہودہ اور اس کی اولاد کو دیا گیا تو برکات نبوت کا وارث یوسفؑ اور اولاد یوسفؑ کو قرار دیا گیا لیکن اس وقت تک کے لئے جب تک کہ شیلوہ نہ آجائے۔ اس لئے اس لفظ کی تشریح ضروری ہے تو رات کے مختلف نسخوں میں لفظ کہیں شیلوہ ہے اور کسی جگہ شلوہ، بعض میں نسیم شلوہ اور شیلوہ ہے۔ قرأت کے اس اختلاف کے باوجود عام طور سے اس کے معنی صلح کرنا یا "یا سلامتی کا شہزادہ" سمجھے گئے ہیں۔ یہود اس قبیلہ کی آمد کے بڑی بے حسنی کے ساتھ منتظر تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اولاد یوسف یا قبیلہ یوسف میں مبعوث ہوگا لیکن یوسف علیہ السلام کے دونوں بیٹوں افراہیم و منی کی اولاد جب رحبام بن ییمان کے دور حکومت میں مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملی تو وہ مایوس ہو گئے لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کی بنا پر کہ خداوند تمہارا خدا تمہارے لئے تمہارے ہی پیچھے تمہارے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا؟ (استثنا باب ۱۸ آیات ۱۵، ۱۸) اس کا یقین رکھتے تھے کہ وہ (شیلوہ) انہیں کے بھائیوں (بنی اسرائیل) میں سے ہوگا۔ اس بشارت میں "تمہارے بھائیوں" کی اصلیت نہ سمجھنے کی بنا پر یہود اب تک مفالط میں مبتلا ہیں۔ اگلی سطور میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ فی الحال لفظ (شیلوہ) پر غور کیجئے اور یعقوبؑ کی بشارت کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی مصدقہ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

کل تک بہت سی حقیقتیں جو مسطور تھیں آج کھل کر سامنے آرہی ہیں جن کو دیکھ کر انسان

صداقتِ اسلام پر ایمان لانے کے لئے مجبور ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس کی حسد اور ہٹ اے باز رکھے اور وہ زورِ راست پر نہ آ سکے۔ کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ غیب کی وہ خبریں جو آج آثارِ قدیمہ بابل اور فلسطین سے ظاہر ہو رہی ہیں جنہوں نے عیسائی و یہودی مذہب کے پیروؤں میں ٹپل مچا دی ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ظاہر کر رہی ہیں۔ مذکورہ بالا سطور میں بشارتِ یعقوبی کا لفظ شیلوہ اب تک متنازعہ فیہ تھا۔ اس لفظ کی مختلف قرائتیں بابل کے مختلف نسخوں میں موجود ہیں اور دوسری طرف روایات میں یوسفؑ کے آنے کی خبر یہودیوں میں اتنی عام ہے کہ عیسائی اس کو جناب مسیحؑ پر چسپاں کرنے کے لئے ان کے شجرہ نسب پر زور دینے سے بھی نہیں چوکتے اور جناب مسیحؑ کو زبردستی ابنِ یوسفؑ بنا دیتے ہیں۔ آج تحقیقاتِ فلسطین کے واقعات نے اصیبت کو آشکارا کر دیا کہ یہ لفظ شیلوہ کی بجائے شیلون ہے اور شیلون عربی زبان میں یوسفؑ کا نام ہے (ملاحظہ ہو بائبلک ریسرچ فلسطین ص ۸۶ تا ۸۹)۔ کتاب پیدائش کے عربی ترجمہ میں بھی اس کا لفظ شیلون ہے (تکوین باب ۴۹) اب یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ جناب یعقوب علیہ السلام نے بشارت میں یوسفؑ کے عربی نام سے خوشخبری سنائی کہ شیلون آئے گا جس کا تعلق عرب سے ہوگا۔ یوسفؑ اگر عبری بنی ہیں تو وہ یوسف (شیلون) عربی بنی ہوگا جو مثیل یوسفؑ ہے نہ کہ عیسائی خیال کے مطابق ابنِ یوسفؑ۔ آنحضرتؐ مثیل یوسفؑ ہیں اس لئے انہیں شیلون کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنا بیکار ہے اس لئے کہ دونوں کی سوانح حیات میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بشری ص ۳۵ تا ص ۴۴ نیز میثاقِ انیسین ص ۱۳۶ تا ۱۴۷۔

اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مذکورہ بالا بشارت کی تشریح جناب خرقی ایل نے اس طرح کی خداوندِ خدا یوں فرماتا ہے کہ اے مجروحِ شدید شاہِ اسرائیل تو گلاہ دور کر اور تاج، تاج اتار یہ ایسا نہ رہے گا۔ پست کو بلند کر اور جو بلند

ہے اسے پست کر۔ میں ہی اے اٹ، اٹ، اٹ دوں گا۔ پریوں بھی نہ رہے گا اور وہ
آئیے گا جس کا حق ہے میں اُسے دوں گا، حُزقی ایل باب ۲۱ آیات ۲۶، ۲۷۔
حُزقی ایل کی عبادت کے آخری عبرانی الفاظ "اشر لہ شیطاٹ" کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی
وجہ سے ترجمہ میں دو مبہم باتیں ہیں :

(۱) کون آئیے گا ؟ (۲) کیا دوں گا ؟

اشر کے صحیح معنی میں "وہ جو کہ ہے" ہمیشیاط کے دو معنی ہیں "صاحبِ یاشریت والا"۔ اس طرح
آخری جملہ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "میں اس کو برسرِ اقتدار کروں گا جو صاحبِ حکومت و شریعت ہے"۔
یعنی بنو اسرائیل سے حکومت چھین لی جائے گی اور ان کی شریعت منسوخ ہو جائے گی۔ چنانچہ تاریخ
شاہد ہے کہ اس بشارت میں شیلوہ (شیلون) سے مراد نہ حضرت موسیٰ ہیں اور نہ جناب عیسیٰ
اس لئے کہ دونوں کے عہد میں ایک ہی شریعت پر عمل ہوتا رہا البتہ قرآن عزیز نے شریعت
موسویٰ کو منسوخ کر کے بنی نوع انسان کے لئے ایک نئی شریعت پیش کی۔ علاوہ بریں صاحب
عصا ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ جناب سبجے نے بالا اعلان کبار دمیری بادشاہت اس
دنیا کی نہیں بلکہ آسمانی ہے۔ (یوحنا ۱: ۳۶) اس کے برخلاف جناب محمد رسول اللہ کو شریعت
کے ساتھ ساتھ مادی و روحانی دونوں بادشاہتیں بھی ملیں اس لئے جناب یعقوب علیہ السلام
کی پیشینگوئی بہ تمام و کمال آنحضرت پر صادق آتی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

(۶) جناب موسیٰ علیہ السلام کی بشارتیں :-

(۱) جناب یعقوب علیہ السلام کی طرح جناب موسیٰ علیہ السلام نے بھی کھلے الفاظ میں بشارت
دی ہے۔ فرمایا "خداوند تمہارا خدا تمہارے لئے تمہارے ہی پیچھے سے یعنی تمہارے ہی بھائیوں
میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا" آگے اور وضاحت فرمائی "خداوند
نے مجھ سے کہا میں تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو
کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام

لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حجاب ان سے لوں گا (استثناب باب ۱۸ آیات ۱۸-۱۱)۔
 (۱۹) اس بشارت کے مطابق مثیل موسیٰ صرف آنحضرتؐ میں جو بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسرائیل
 میں مبعوث ہوئے۔ بنو اسرائیل میں استثنابات ۳۴ آیات ۱۰ تا ۱۲ کے مطابق مثیل موسیٰؑ
 کوئی نئی پیدائش نہیں ہو سکتا۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو اور اس وقت سے یعنی موسیٰؑ کے
 بعد سے، اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کے مانند جس سے خدا نے روبرو باتیں کیں نہیں
 اٹھا۔ اس ترجمہ میں لفظ اب تک عبرانی نسخہ کا غلط ترجمہ ہے۔ عبرانی عبارت دِلْوَقْتَامَ
 تَابِیْ عَوْدِیْسَ اَیْلَ مَکُوْمَ شَہ "اس میں لفظ عود کے معنی" اب تک کے بجائے ہمیشہ
 ہونا چاہیے۔ اسی طرح دِلْوَقْتَامَ "کے معنی بجائے ماضی کے فعل مستقبل میں ہونا چاہیے اس
 لئے کہ از روئے گرامر و" کی خاصیت یہ ہے کہ وہ فعل ماضی کے ساتھ آکر اس کو فعل مستقبل
 بنا دیتا ہے اس لئے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ نہ قائم ہو گا کبھی (ہمیشہ ابداً) بنی اسرائیل میں کوئی نبی
 موسیٰ کی طرح (موسیٰ کی مانند یا جیسا)۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توریت مقدس کی گم شدگی کے بعد جناب عزرا
 علیہ السلام نے لوگوں کی روایات کو لے کر اُسے دوبارہ تالیف کیا گویا بنو اسرائیل جناب مسیحؑ
 کے ایک ہزار سال بعد بھی اپنے بھائیوں میں سے ایک ایسے نبی کی آمد کے منتظر تھے جو (۱) بنو اسرائیل
 میں سے ہو گا۔ (۲) مثیل موسیٰ ہو گا۔ ان دونوں باتوں کی تردید جناب عزراؑ نے کی پھر بھی
 انہیں یقین نہیں آیا اور وہ اس نبیؑ کی آمد کے منتظر رہے اور جناب عزراؑ دعوہ کے ۷۰۰ سال
 بعد یعنی جناب موسیٰؑ کے ۷۰۰ سال بعد جناب یسوعؑ نے جناب مسیحؑ کے ہم عصر ایک دوسرے نبی
 جناب یوحناؑ یعنی یحییٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا تو وہ نبیؑ ہے جس کی بشارت جناب
 موسیٰؑ نے کی ہے اس کا جواب انہوں نے نفی میں دیا (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱ آیت ۲۱)۔

جناب مسیحؑ کے بعد بھی حواریان مسیح میں اس نبیؑ کا انتظار موجود تھا جیسا کہ پطرس حواری
 کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پطرس نے جناب مسیحؑ کے ۳۳ سال بعد مسیحائیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

”پس تو نہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور کوتاہی نہ ہو۔“
 بخش ایام آویں اور وہ اس یسوع مسیح کو پھر بھیجے جو تمہارے واسطے مقرر ہوا ہے۔ ضرور ہو
 کہ وہ آسمان میں اس وقت تک رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر
 خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں۔ چنانچہ موسیٰؑ نے
 کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ جیسا ایک نبی پیدا کرے گا
 جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یوں ہوگا کہ جیسا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ نیست و
 نابود کر دیا جائے گا بلکہ موسیٰؑ سے لیکر پچھپوں تک جتنے نبیوں نے کلام کیا ان سب نے اللہ دونوں
 کی تہدید ہے (ملاحظہ ہو اعمال باب ۳ آیات ۱۹ تا ۲۴)۔

بنی اسرائیل جناب موسیٰؑ کی بشارت کے ان الفاظ سے کہ خدا تمہارے بھائیوں میں
 سے مجھ جیسا ایک نبی پیدا کرے گا ”آخر وقت تک“ مغالطہ میں گرفتار رہے (اور اب بھی
 ہیں) وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ آخری نبی بنوا اسرائیل ہی میں سے ہوگا۔ ان کا ذہن ادھر نہیں
 منتقل ہو سکا کہ آخر بنو اسرائیل بھی تو ان کے بھائی ہیں۔ تورات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسحقؑ
 کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ کے بھائی جناب عیسوؑ نے حضرت اسمعیلؑ (اپنے چچا) کی بیٹی مہلت
 سے شادی کی (پیدائش باب ۲۸: ۹ اور باب ۲۶: ۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ان کو
 اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ عربی کا ”اخ“ عبری میں ”اح“ یعنی بھائی چھ لحاظ سے استعمال ہوتا
 ہے۔ :-

(۱) حقیقی بھائی کے لئے ماں باپ دونوں کی طرف سے یا صرف ایک جانب سے۔

(۲) قریبی رشتہ دار کے لئے (پیدائش باب ۴۲: ۱۳)۔

(۳) طبی و وطنی بھائی کے لئے (ایضاً باب ۱۹: ۷)۔

(۴) نسل اور پیشہ کے لحاظ سے (نامہ کلیتون ۱: ۲)۔

(۵) حاملت کے لحاظ سے ہمیشہ وہیم مشرب کے لئے اور

(۶) منہ بولے بھائی بہن کے لئے۔

لہذا یہ سمجھنا کہ عبرانی "اح" صرف حقیقی بھائیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک فاش غلطی ہے۔ ایک دوسری جگہ توریت کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی کون ہیں جناب باجرہ کو خدا کا فرشتہ خطاب کرتا ہے میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنتی نہ جائے تو حاملہ ہے اور ایک جنے گی۔ اس کا نام اسماعیل رکھا وہ بادیشین عرب ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے۔ اور وہ اپنے سب بھائیوں (بنو اسرائیل و بنو قطورہ) کے سامنے بود و باش کرے گا۔ (ملاحظہ ہو پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲)۔

دب، کاش کہ ہمارے یہودی بھائی توریت و انجیل نیز جناب پطرس کے وعظ کی روشنی میں حقیقت پر غور کرتے تو لازماً اسی نتیجہ پر پہنچتے کہ وہ آخری مٹی بجز جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اگر استثنائی اس بشارت کو ملحوظ رکھتے جس میں وہ اخیر ویتے وقت جناب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "خداوند سینا سے آیا اور وہ چلے گا سیر سے اور بہت شدت سے منجلی ہوگا کہ وہ فاران سے اور دس ہزار قدیوں کے ساتھ آئے گا اس کے داہنے ہاتھ میں اتنی شریعت ہوگی (استثنا باب ۲۲ آیت ۲۱) تو وہ ہرگز منالہ میں نہ رہتے کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ سینا پر جناب موسیٰ کو پیغمبری عطا ہوئی تھی سیر پر جو بیت المقدس کے ایک پہاڑ کا عبرانی نام ہے۔ جناب عیسیٰ کا ظہور ہو نیوالا تھا اور فاران اذروئے بائبل باب پیدائش ۲۱ آیت ۲۱ حجاز کا مشہور میدان وادی غیر ذی زرع ہے جہاں مخصوص مروجہ گہوئے اور دس ہزار قدیوں کی جماعت کے ساتھ کہ کو فتح کیا۔ وہ ایسی شریعت لے کر آئے جو عدل و انصاف کی ضامن ہے اور جس نے تمام گزشتہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا اتنی کھلی اور واضح نشانوں کے بعد اگر یہودی بھائی آنحضرت پر ایمان نہیں لاتے تو اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ جس کو ہدایت دے اسی کو ہدایت ملتی ہے۔ آنحضرت قودیت

مقدس میں کم و بیش ۲۰ نشانیاں اس قسم کی موجود ہیں جن سے آنحضرتؐ کی انفصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انجیل میں بھی بے شمار نشانیاں ہیں جو نہ صرف توریت کی نشانیوں کی تصدیق کرتی ہیں بلکہ اور زیادہ کھلے الفاظ میں اللہ کے صیب جناب محمد رسول اللہ کے متعلق بتاتی ہیں کہ وہ اور صرف وہی آخری نبی ایسے ہیں جن کی شریعت آخری شریعت ہے اور وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے کسی خاص گروہ اور قبیلہ تک محدود نہیں اور وہی دنیا میں شانتی و امن کی ضامن ہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی پیشین گوئی میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ”وہ نبی“ موسیٰ کی مانند اور موسیٰ کی طرح ہوگا۔ آنحضرتؐ کی مماثلت جناب موسیٰ علیہ السلام سے اظہر من الشمس ہے۔ ذرا سی تاریخی نظر رکھنے والا انسان اسے اچھی طرح پہچانتا ہے کہ :

(۱) دونوں انبیاء کرام کو دشمنوں سے مجبور ہو کر ہجرت کرنا پڑی۔

(۲) آنحضرتؐ کی مدینہ منورہ میں مدت قیام ۱۰ سال ہے۔ جناب موسیٰ بھی دس سال شرب

(مدینہ میں رہے) ملاحظہ ہو ميثاق النبیین جلد اول ص ۱۶۶ تا ۱۶۷۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب مفصل دی گئی مگر آنحضرتؐ کو اکمل شریعت دئے جانے

کے علاوہ اس کو بقائے دوام بھی بخشا گیا۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو استبداد فرعون سے نجات دلائی مگر آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فراعنہ محبوب کو دست بدست جنگ میں شکست دیکر ان کی اولاد کو

مسلمان بنایا۔

(۵) یہودیوں اور مسلمانوں میں سال کا پہلا مہینہ تاریخ ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ مصر کو

چھوڑتے وقت خداوند نے موسیٰ و ہارون سے کہا یہ مہینہ تمہارے لئے مہینوں کا شروع

ہوگا اور یہ تمہارے سال کا پہلا سال ہوگا (ملاحظہ ہو خروج ۱۲: ۱)۔

(۶) دونوں کو اللہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۷۱۔ دونوں کو کفار سے جہاد کر نیک حکم دیا گیا۔

۸۸۔ حضرت موسیٰ کا مقصد جنگ سرزمین کنتان کو حاصل کرنا تھا جو آپ کے خلیفہ یوشبن نون کے زمانے میں سر کی گئی۔ ملک کنتان کو آنحضرتؐ کے خلیفہ نے فتح کیا۔

۹۰۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے حکم (جج) تھے آنحضرتؐ مسلمانوں اور یہود دونوں کے جج تھے۔ اور دونوں کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔

۱۰۰۔ حضرت موسیٰ کو فرعونؒ کے قریب پہنچ جانے پر پانی کی لہر نے حکم دیا یا جبکہ غارِ ثور میں دشمن کے پہنچ جانے پر آنحضرتؐ کے لئے تارِ عنکبوت نے فلولادی قلعہ کا کام دیا۔

۱۱۰۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے دشمن کو قریب دیکھ کر انا اللہ دھمکون کہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے کہا "کلان معی دینی شہدین" ایسا نہ ہوگا میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے کامیاب کرے گا۔ (۶۳، ۶۱، ۲۶)۔ آنحضرتؐ نے بھی غارِ ثور میں دشمن کو قریب دیکھ کر فرمایا "لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ هُمْ" (ابو بکرؓ) عیسیٰ مسیح ہوا اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے (۹ : ۴۰)۔

اس طرح اور بھی نکات ہیں جو آنحضرتؐ کو جناب موسیٰؑ جیسا ثابت کرتے ہیں بغیر نظر انداز کرتے ہوئے بشارت کے آخری حصہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے اس کے دہانے ہاتھ میں تشیئ شریعت ہوگی، عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں "تیشیئ" (دہانے ہاتھ) کا محاورہ برکت، بندگی، حکومت اور طاقت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے سچی دوست "دہانے ہاتھ میں تشیئ شریعت" کا مطلب شریعت باعث اطاعت و بندگی یا باعث عدل و انصاف ہوگی کے بجائے یہ نکالتے ہیں کہ جہاد اور مذہبی جنگ ہوگی۔ اور وہ ظاہر ہے کہ کشت و خون کا باعث ہوگی۔ اس مفہوم کا رد انبیاء کے صحف نے کبھی تو یہ بتا چکا کہ "اس (نبی موعود) کی کمان بدلی سے باہر نہ ہوگی" یعنی اس کی جنگ رخت کی بدلی میں یا رجم مجسم ہوگی (ملاحظہ ہو بشارتِ نوح)۔ اور کبھی یوں جواب دیا کہ "وہ جب ۱۰ ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا تو اپنا ہتھیار رکھ

دیگا، یعنی اس کی فتح خونریزی سے نہ ہوگی، امن و تسکین سے ہوگی (وہ ملاحظہ ہوں) اور کبھی جہاد کے اعتراض کی تردید یہ کہہ کر کی کہ اس کا آنا انصاف و عدل کا کچھ ہوگا کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ دیشینگونی حضرت موسیٰؑ تا یسح کے صفحات شاہد ہیں کہ ایسا ہی ہوا فتح کے وقت لا تشریباً علیکم الیوم فرما کر عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ تمام غزوات و سریات میں عمومی طور سے اتنا بھی جانی نقصان نہیں ہوا کہ قضا آن نبویارک وغیرہ بڑے شہروں میں ایک دن کے اندر حادثات کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد :-

ہمارے یہودی بھائی حضرت موسیٰؑ کے بعد کسی کو پیغمبر نہیں تسلیم کرتے البتہ اس نبیؑ کے اب تک منظر میں جو جناب موسیٰؑ کی پیشینگوئی کے بموجب آچکا اور دنیا کو شیعہ ہدایت کے نور سے نہ صرف منور کر چکا بلکہ منور کرتا رہے گا علماء کا بنیاد بنی اسرائیلؑ کی شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک ۴۰۰ سال کے اندر بہت سے انبیاء کرامؑ بنی اسرائیلؑ میں مبعوث ہوئے ان میں سے کچھ کا ذکر قرآن عزیز میں کیا گیا ہے اور کچھ کا پتہ احادیث شریفہ سے چلتا ہے۔ حضرت یوشعؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت ایساؑ، حضرت ایسحؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عزیرؑ (عزرا) حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، (یوحنا)، وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے اپنے وقت پر تشریف لائے لیکن یہودیوں نے سب کو جھٹلایا جس کا عذاب انہیں سہنا پڑا۔ اس لئے انہیں حضورؐ کیلئے مزید شہادتیں پیش کرنے سے پہلے یہود کی تباہی و بربادی پر اجالی تبصرہ ناگزیر ہے۔

یہود اور بیت المقدس کی تباہی :-

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیلؑ کے تفصیلی واقعات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس قوم کے اندر ایک عجیب طرح کا تلون پایا جاتا ہے، سرکشی، احسان غرائف،

فنادانگری، بغض و کد کھنچتی صدا اور ہٹ ان کے قومی مزاج کا بایہ خیر ہے۔ حضرت موسیٰ نہایت ضبط و صبر کے ساتھ ان کی ہر بیہودگی کو برداشت کرتے اور رشد و ہدایت کے کام میں مہنک نظر آتے ہیں، پھر بھی قوم نصیحت نہیں پکڑتی، عبور قلم کے بعد بت پرستی کی فرمائش من و سلویٰ پر تاسپاسی، گنہ پرستی میں انہماک، قبولِ تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلہ سے انکار، ذبح بقرہ کے سلسلہ میں حیل و حجت، غرض ہر فرض کی ادائیگی میں صدا اور ہٹ اور ہر معاملہ میں حضرت موسیٰ کے ساتھ جاہلانہ رد و کد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو بنی اسرائیل کی زندگی کا جز نظر آتا ہے۔ انھوں نے بالآخر انعام و اکرام خداوندی اور عفو و رحمت کی فراوانی کے باوجود خدا کے قہر و غضب کو سرمایہ نازش بنا کر ہمیشہ کے لئے دنیا و آخرت کی عزت سے محرومی کا داغ لگایا۔ حضرت یرمیاہؑ، حضرت حزقیلؑ اور حضرت زکریاؑ کے مخالف میں یہود کی کشری کی وجہ سے ان کی تباہی و بربادی کے متعلق پیشینگوئیاں ہیں۔ قرآن عزیز نے سورہ بنی اسرائیل میں ان کی تصدیق کی ہے۔

یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر سے متعلق ہے، ۶۰۴ قبل مسیح بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ توراۃ و سبیل کو جلا کر خاک کر دیا۔ یہود کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔ حضرت دانیالؑ اور حضرت عزیزؑ ان کے ہمراہ تھے البتہ حضرت یرمیاہؑ کو چھوڑ دیا گیا اور وہ یہیں جھونپڑی ڈال کر قیام پذیر رہے۔ حضرت یسعیاہؑ نبی نے ۱۶ برس پہلے یہود کے بادشاہ حزقیاہؑ کو اس تباہی و بربادی سے آگاہ کر دیا تھا جبکہ بابل میں مردوک نامی بادشاہ سریر آرائے حکومت تھا۔ باب ۴۹، آیت ۲ تا ۷، اسی طرح یرمیاہؑ نبی نے بھی ۶۰ برس پہلے سے بیت المقدس پر قہر خداوندی کی پیشینگوئی کی تھی۔ ان دونوں پیشینگوئیوں کے ظہور سے قبل حضرت دانیالؑ نے ایک خواب دیکھا کہ جس میں شاہ فارس کو دو سینگ والے منڈھے کی شکل میں دیکھا تھا اس کی تعبیر جبرئیل علیہ السلام نے یہ بتائی کہ وہ بادشاہ (خو) میڈیا اور فارس دونوں کا بادشاہ ہوگا۔

اسی مکاشفہ میں یہ بھی دکھیا کہ ایک سینگ والے بکرے نے مینڈھے کو منسوب کر دیا ہے اس کی تبصیر یہ تھی کہ ایک زبردست بادشاہ (سکندر رومی) ایران کی بادشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قبضہ کر لے گا۔ یرمیاہ نبیؑ کی یہ بھی پیشینگوئی تھی کہ یہود دستِ برسن تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گے (یرمیاہ باب ۲۵ آیات ۱۱-۱۳) ان کا نجات دہندہ خورس ہو گا وہ خدا کا چرواہا اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہو گا (یرمیاہ باب ۴۰ آیات ۲۶-۲۸)۔

۶۲۵ قبل مسیح ایران میں قبائلی طرزِ حکومت تھا۔ ایران دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی مغربی حصہ یا آذربائیجان اور جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا۔ یہ دونوں ریاستیں نینوی کے زیر اثر تھیں ۶۱۲ ق م میں نینوی برباد ہو گیا اس کی جگہ بابل کی حکومت کو فروغ ہوا جس نے بیت المقدس کو اجاڑ دیا۔ ۵۵۹ ق م میں پارس اور پارس کی متحدہ ریاست کا مالک خورس ہوا۔ خورس ایرانی نام ہے۔ فارسی میں آرش (گورش)، یونانی میں سائرس اور عربی میں کیمسر کے نام سے مشہور ہے۔ اس بادشاہ سے یہودی دیوانی خوب واقف ہیں کیونکہ ان قوموں پر اس کی حکومت کا موافق یا مخالف اثر بہت نمایاں ہے اس نے بخت نصر کے جانشین نابونی دس اور اس کو مدار المہام بل شازار کو شکست دیکر بابل پر قبضہ کر لیا۔ اس نے بنی اسرائیل کو قیدِ غلامی سے نجات دی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دی۔ اس کام میں حکومتِ وقت نے پوری مدد دی۔ خورس کے بعد اس کے بیٹے کیتباد (کبوجہ) نے آباد کاری کا کام جاری رکھا۔ آٹھ سال کے بعد خورس کا چچا زاد بھائی دارا اول جانشین ہوا اس کے عہد میں یہ کام پورا ہوا۔ بنی اسرائیل میں اس کام کی نگرانی حجتی زکریا، دانیال اور عزیر علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کی۔ فرض کہ بیت المقدس پھر آباد ہو گیا اور توریت کو حضرت عزیرؑ نے روایات اور اپنی یادداشت سے مدد لے کر دوبارہ قلمبند کر دیا۔ اس طرح پہلا دور ختم ہو گیا۔

یہود دوبارہ بیت المقدس میں آباد ہونے کے بعد مئیش دعوشت میں پڑ گئے، اللہ کو بھول گئے اور ان میں وہی پرانی کسرشیں پھر عود کر آئی۔ ان کو اللہ کے نبیوں نے ہر چند منع

کیا لیکن وہ باز نہیں آئے، ان کی تکذیب کرتے رہے، یہی نہیں بلکہ اپنی خواہشات ہی کو بذریعہ تاویل وین سمجھتے رہے۔ خدا معلوم کتنے انبیاء و صلحاء کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے۔ آخر میں حضرت عیسیٰ (دیو خا) اور زکریا کو قتل کر دیا اور حضرت مسیح کو بھی قتل کرنے کا مہم ارادہ کر لیا۔ اس پر غیبتِ حق کو حرکت ہوئی اور انھیں پھر ذیل ہونا پڑا۔ وہ اس طرح کہ ان میں آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یہ واقعہ رفعِ صیسی کے ستر سال بعد شروع ہوا۔ دو مدعیانِ حق یوحنا اور سمعون کے درمیان سرکہ جنگ و جدال برپا ہوا۔ یہ دو فریقِ قریبی اور صدوقی تھے۔ یہودیوں کے بادشاہ نے یوحنا کا ساتھ دیا۔ فریقِ مخالف کو بلا امتیاز مرد و عورت بوڑھے بچے ایک طرف سے تہ تیغ کیا اس پر بادشاہ روم اسبائوس سے مدد مانگی گئی۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیسٹس) کو فوجِ جرار کے ساتھ ارضِ مقدس بھیجا۔ اس نے امن و امان قائم کرنے کے لئے پیلطس صلح ایک قاصد نيقانوس کو دیوکر بیت المقدس بھیجا، جس کو قتل کر دیا گیا ٹیسٹس نے طیش میں آکر یہودیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ ہزارا یہودی مارے گئے اور جو بچے وہ اپنی جان لے کر ادھر ادھر بھاگ گئے، غرض یہ وہ شکست تھی کہ یہودی پھر پینپ نہیں سکے۔ (باقی آئندہ)

رہبر حج

مؤلفہ جناب الحاج قاری محمد بشیر الدین (پنڈت) ایم۔ اے۔ جی سائز پر مختصر رسالہ لیکن مسائل حج و منقولات حج کے وسیع و عریض دریا کو کوزے میں بند کر نیکا مصداق ہے۔ آخر میں مفید اور معلومات افزا جدید ۱۲ نکتے۔ قیمت :-

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

اسلامی شریعت میں چند زوجگی کی اباحت

تنقید و جواب - مضرت و منفعت

مولانا محمد برہان الدین سنہلی (اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)
چند زوجیت کے قانون پر تنقید کے محکومات
عرصہ دراز سے شریعت اسلامی کے جن قوانین پر طرح طرح کے اشکالات بلکہ اعتراضات
کئے جا رہے ہیں غیروں ہی کی طرف سے نہیں کچھ اپنوں کی جانب سے بھی۔ ان میں غالباً یہ
مسئلہ سرفہرست ہے، اس سلسلہ میں اکثر توجہ باقی باتوں اور فرضی افانوں کا سہارا لے کر تنقید
کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ شریعت اسلامی کے - پر مصلحت اور فطرت انسانی کے عین مطابق
اس قانون سے ناجائز قائدہ اٹھائیوا لوں اور بعض اسلام کے نام بیواؤں کی شخصی غلطی بھی -
نفس قانون پر اعتراض کرتے ہیں اور اختیار کو طعنہ زنی کا موقعہ فراہم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بہتر سے
بہتر قانون کے عمل درآمد کے بعد جزوی قسم کے نامناسب اثرات کا ظاہر ہونا۔ ایسی واضح اور
پیش آمدہ حقیقت ہے کہ اس سے انکار کی مجال مشکل ہے۔ اس لئے اس طرح کی چھوٹی موٹی
صور توں کے پیش آجانے سے کسی عقلمند کے نزدیک اس قانون کی افادیت ختم نہیں ہو جاتی
ہے لیکن جب "مقصد تنقید برائے تنقید" ہی ہو، یا پورے قانون کا بنظر قائر مطالعہ نہ کیا ہو تو
ایسی معمولی چیزیں بھی پہاڑ نظر آنے لگتی ہیں اور ہر خوبی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں
ذہن صرف اعتراضات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ بد قسمتی سے یہی وجہیں تعدد ازدواج پر
اعتراضات کرنے کی محرک ہیں۔

پس بلا طرز فکر کہ جن کا مقصد محض تنقید ہے اور کچھ نہیں کے سامنے کسی بھی طریقہ سے

صورت حال پیش کرنا غیر مفید اور لاعا صل ہے۔ ہاں وہ لوگ کہ جن کی تنقید کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسئلہ کو پورے طور پر تمام گوشوں سے سمجھا نہیں ہے۔ آئندہ سطر پر ان کو شاید کسی صحیح راہ تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ واللہ الموفق للسداد۔

عقد ثانی کے لئے شرعی پابندیاں :

اول تو عام طور پر۔ تنقیدی حلقوں میں۔ یہ سمجھا جاتا ہے۔ یا ایسا تاثر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سمجھنے کا باعث کسی اخذاترس مسلمان یا کچھ مسلمانوں کا طرز عمل ہی ہو۔ کہ چند بیویاں رکھنے کی اجازت بغیر کسی خاص پابندی کے ہے۔ حالانکہ اسلامی قانون کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جس آیت سے چند بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے اسی میں جواز کے ساتھ یہ بھی موجود ہے **فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ تَتَّقُوا اللَّهَ فَأَجِدُوا أَحَدَهُ أَوْ صَوْلَةً أَيْنَمَا تُكُونُوا فَمَوْلَاكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ** (اگر تم کو غالب احتمال ہو کہ (اگر کئی بیبیاں کر کے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بی بی کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔

(بیان القرآن ص ۹۳)

چنانچہ علماء امت نے نکاح ثانی (مابعد) کے بارہ میں بالخصوص اور ہر نکاح کے سلسلہ میں بالعموم حقوق زوجیت (ایک ہی ہے تو اسی ایک کے اور چند میں تو ان سب کے) ادا کرنے کی اہمیت کو ضروری قرار دیا ہے، ورنہ نکاح کا گناہ اور عند اللہ قابل مواخذہ فعل ہو گا۔ آخرت پر عقیدہ رکھنے والے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز باز رکھنے والی نہیں ہو سکتی اور اگر آخرت پر عقیدہ نہیں ہے تو دنیاوی سخت سے سخت سزا کا قانون بھی روکنے کا باعث عموماً نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

دیکھیے مشہور مالکی عالم حمی الدین ابن عربی نقل فرماتے ہیں :-

قال علماء نامعناہ (فان خفتم ان لا تعدوا في القسم بين الزوجات والتوقيف في الحقوق النكاح وهو فرض واخذ المخلوق بالعتل الى الظاهر

سورة النساء آیتہ ۳ -

لَتَيْسَ عَلَى الْعَاقِلِ إِذَا قَدَّرَ الرَّجُلُ مِنْ مَالِهِ وَمِنْ بَنِيَّتِهِ عَلَى نِكَاحٍ أَرْبَعٌ
فَلْيَفْعَلْ وَإِذَا لَمْ يَحْتَمِلْ مَالَهُ وَلَا بَنِيَّتَهُ فِي الْبَاءَةِ فَلْيَقْتَصِرْ عَلَى مَا يَقْدِرُ
عَلَيْهِ

یہاں پر تعدد ازدواج کو بہت محدود صورتوں میں درست سمجھنے والوں یا بالفاظِ
صحیح تعدد کے مخالفین کے اس مطالبہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جہاں عدل بین الزوجات میں کوتاہی
کا خطرہ ہو، وہاں دوسرا نکاح کرنے پر پہلے ہی سے پابندی لگا دی جائے بلکہ بعض تو یہاں
تک کہہ گزرے کہ اس نکاح کو سرے سے منقذ ہی نہ مانا جائے۔ اس جگہ یہ سوال کرنا بالکل حق
بجانب ہوگا کہ ایسا کون سا پیمانہ یا آلہ ہے کہ جو اس ”خطرہ“ (اگر اس شکی بڑے سے ہوئے احساس
کو خطرہ کہنا درست ہو) کا تو قبل از وقت صحیح اندازہ کر کے اطلاع دیدیا کرے کہ شخص دوسری
بیوی کے آنے کے بعد کبیر ظالم بن جائیگا، لیکن وہی پیمانہ یا آلہ عقد اول کے وقت کسی شخص کے آئندہ
اپنی منکوحہ پر ظلم کرنے کا پیشگی پتہ نہ چلا سکے، ظاہر ہے کہ نکاح سے قبل دونوں جگہ ہی یہ احتمال
ہے کہ شخص ہونیوالی منکوحہ کے ساتھ اچھا سلوک اور (مسائل بالمعسر و ف) کے تقاضے
پورے کرے گا کہ نہیں؟

اس منطق کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ پہلی شادی کے وقت بھی اگر کسی شخص کے بارہ میں
یہ خطرہ ہے کہ وہ حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرے گا یا نہ کر سکے گا تو اس کے لئے قانوناً یہ نکاح
منوع ہو، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پہلے نکاح کے وقت یہ سوال کسی حلقہ کی طرف سے نہیں
اٹھایا گیا۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عقد ثانی کے وقت ہی اس کا ہوا کھڑا کیا جائے۔ بس سیدھی
بات وہی ہے جو شریعت کے مفسرین نے بیان کی ہے کہ جس شخص کو اپنے بارے میں یہ خطرہ
ہو کہ وہ نکاح کے بعد (خواہ اول ہویا ثانی) منکوحہ کے حقوق ادا نہ کر سکے گا اور اس سے ظلم
سرزد ہوگا تو اس کے لئے نکاح کرنا منوع اور گناہ کی بات ہے۔ اس امر کی متعدد فقہانے

تصریح کی ہے شہرہ مخفی عالم محقق ابن ہمام فرماتے ہیں :-

فان ما دہند (خوف الجور) محرہ والذی یخاف الجور یا ثم لہ
اسی طرح فقہ حنفی کی شہرہ آفاق کتاب در مختار اور اس کی شرح رد المحتار میں ایسے
نکاح کے بارے میں ہے :-

(دمکودھا) ای غویہا (لخوف الجور فان یتیقنہ حرمة ذلك) ای یتیقن
الجور حرمة لان النکاح انما شرع لمصلحة تختص بالنفس وتحصيل الثواب و
بالجور یا ثم دیونکب المحرمات فتندم المصالح لوجہیان ہذا المقاسد لہ
چونکہ اپنے حالات اور رجحان طبع کو ہر شخص خود جس قدر جانتا یا جان سکتا، کوئی دوسرا نہیں
جان سکتا۔ اس لئے شریعت نے ہر شخص کو عند اللہ مسئول ہو نیکاشور دے کر اس پر ذمہ داری
ڈال دی ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت خود فیصلہ کرے۔ اور اس طرح اپنی طرف سے
نکاح پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام علماء کے نزدیک نکاح ثانی
کے لئے عدل بن الزوجات کا اطمینان ایسی شرط نہیں ہے کہ اس کے پیشگی حاصل کئے بغیر نکاح
ہی صحیح نہ ہو بلکہ سب کے نزدیک نکاح ثانی منعقد ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ابن عربی نے نقل کیا ہے :-
دلیل خطاب ہذہ الایۃ ساقط بالاجماع فان کل من علم انما یقسط الیتمہ
جائزہ ان یتزوج سواہا کما یجوز لہ اذا خاف ان لا یقسط
عدل نہ کر نیکی صورت میں علیحدگی کا اختیار :-

ہاں اگر نکاح کے بعد زوج پر (خواہ وہ کوئی بھی ہو) ظلم کیا یا حقوق ضروریہ ادا

۱۔ فتح القدیر، ۴/۲ مطبوعہ نول کشور

۲۔ در مختار مع رد المحتار

۳۔ احکام القرآن لابن العربی ۱/۱۲۹ -

نہیں کہے، یا بیویوں کے درمیان واجب مساوات نہیں برقی تو اس وقت مظلوم بیوی کو یہ حق ہوگا کہ وہ شوہر سے گلو خلاصی کرے، اور قانون شریعت۔ اگرچہ جغنی فقہ کی رو سے تو نہیں لیکن ایسے موقعوں پر اخاف کو بھی مالکیہ کا مذہب اختیار کر لینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہی ضروری اطمینان حاصل کر لینے کے بعد اور بعض مخصوص مشروطوں کے پائے جانے کی صورت میں مرد سے علیحدگی کا عدالتی فیصلہ لینے کا، عورت کو حق دیا ہے۔ ان تمام تفصیلات اور قانونی مراحل کا بیان یہاں اس وقت مقصود ہے نہ ضروری اس کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "المیلت الناجزۃ" دیکھی جائے یہاں پر صرف ایک مختصر عبارت مالکی عالم کی نقل کی جاتی ہے :-

اذا كانت الاساءة من قبل الزوج فرق بينهما

ان تفصیلات کے سامنے آجانے کے بعد یہ مطالبہ بھی بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کہ نکاح ثانی کرنے سے ہی زوجہ اول کو فسخ کا اختیار دے دیا جائے محض اس دہم کی بنیاد پر کہ ایسا شخص لازماً عدل نہ ہو کر یگا، حالانکہ ذرا سا غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہو جائے کہ یہ کتنی ٹھنکی خیز بات ہے اس لئے شریعت محض نکاح ثانی نہ کرنے سے کسی کو مجرم قرار نہیں دیتی۔ اور قبل جرم سزا دینا کیسے درست ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

تعدد کی اباحت کے بارے میں بعض ناقدین کے اقوال :-

اس گروہ کے ممتاز افراد جنہیں اپنے بارے میں اسلامی قوانین سے واقفیت کا گمان ہے۔ ان کی طرف سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ شریع محمدی کا رخ یک ذوقی لگے بڑھ کر چند زوجگی کی اباحت کا نہیں بلکہ مروج اباحت مطلقہ کو محدود کر دینا چاہئے مگر محض دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے بلکہ شاید یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ ٹھیک اس دعوے

پر شریعت اسلامی کے آخذ سے کوئی صحیح دلیل قائم کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس دعویٰ کی تائید نہ قرآن کی آیت بعدد س کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے نہ احادیث رسول سے اور نہ ساطین امت کے اقوال سے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے برخلاف آیت قرآنی - **كَانَ كُفْرُكُمْ مِمَّا كَانَتْ لَكُمُ الْاَيْمَةُ مِنَ الْاَنْثَاءِ مَتَّحِي وَثَلَاثَ وَرُبْعَ ل** میں جس انداز سے تعدد کا حکم مذکور ہوا ہے اس سے وسعت اور تعدد کی اباحت کے رجحان ہی کا پتہ چلتا ہے، نہ کہ تنگی اور محدودیت کا جیسا کہ دیگر قرآن فہم حضرات کے علاوہ — عصر قریب کے مشہور باطنی نظر مفسر علامہ آنوسی نے بھی محسوس کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

مايشعر به، السياق من التوسعة وجه اشارة بذلك
انه اطلق قوله سبحانه (ماطاب لكم من النساء) ثرجاء (مثنى) وثلاث و
رباع) كانه بيان لما وقع اطلاقه على نوع من التقيد لو كان
المراد التضييق لكان التقيد من الاول اوقع فيه وامس به ل

یہاں پر اس واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ — موجودہ مغرب زدگی کے دور سے قبل — جمہور اہل حق علماء و فقہاء کے علاوہ دیگر بعض "عالموں" اور "فقہوں" سے اذواج کی تعدد کو چار میں منحصر ہونے کے خلاف آیت سے استدلال کیا۔ چنانچہ کسی نے

۱۔ سورة النساء۔ آیت ۳ -

۲۔ روح المعانی حاشیہ ۹۵/۴، مطبوعہ دیوبند -

ع۔ اس بارہ میں ابوداؤد و دارقطنی وغیرہا میں من تخريج کردہ غیلان تقفنی کی روایت اور ان کے واقعہ سے استدلال بھی غیر مفید ہے کیونکہ اس واقعہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ چار سے زیادہ بیویوں کا رکھنا منوع ہے، سو جمہوریہ پہلے ہی سے یہ کہتے آرہے ہیں۔

۹ کسی نے ۱۱۸ اور کسی نے بلا قید ہر تعداد کی اباحت کو آیت سے مستنبط کر لیا ہے۔ کیونکہ آیت سے فی الجملہ وسعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بات عربی زبان کی مہارت رکھنے والوں پر مخفی نہیں ہے اس بنا پر جمہور علماء نے اپنے مسلک کے اثبات کے لئے اجماع پر زیادہ بھروسہ کیا ہے اور یہی سب سے زیادہ قوی دلیل ہے اس بارے میں سمجھی گئی ہے۔ علامہ آلوسی نے اس بحث کو خاصی تفصیل سے کئی صفحوں میں بیان کیا ہے (ازمہ ۱۹/۲ تا ۱۹/۳) اور اپنا یقین جمہور علماء کا مسلک ثابت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا ہے :-

اقول الامرين المتمدن عليهما في المحصر الاجماع فانما قد وقع والتفقني عصر
المجمعين قبل ظهور الاختلاف ۱

علاوہ ازیں یہ کہ یہ سبیل تنزل اگر بلا دلیل (بلکہ خلاف دلیل) یہ بات مان بھی لی جائے کہ نزول آیت کا سبب یا شریعت کا نشا مروج اباحت مطلقہ کو محدود کرنا ہو تب بھی یک زوجگی پر مجبور کرنے اور تعدد پر قانونی پابندی لگانے کا کسی طرح جواز نہیں نکلتا کیونکہ یہ امر عند علماء مسلم ہے کہ مشروعیت حکم کے وقت کسی خصوصی سبب کے وجود کے معنی لازماً یہ نہیں ہوتے کہ وہ حکم اسی خاص سبب تک محدود ہے۔

(العبودۃ لعموم المعانی لا لخصوص الموارد ۲) یہی بات شیخ ابوبکر البوصاری نے بھی ایک موقع پر ارشاد فرمائی ہے :- لو نزلت علی سبب خاص لم یوجب ذلك تخصیص عموم اللفظ بل المحکم للعموم دون السبب عندنا فنزولها علی سبب ونزولها متبداً من غیر سبب سواء ۳ غرض کہ دونوں گروہ افراط اور تفریط میں مبتلا ہیں اعتدال کی راہ وہی ہے جو جمہور علماء نے اختیار کی کہ چار سے زیادہ کا

۱ روح المعانی مع حاشیہ ۹۵/۴ مطبوعہ دیوبند

۲ نور الانوار للملا احمد حبیون۔ ۳ احکام القرآن للبصا ۴/۲۔

جواز نہیں اور ایک سے زیادہ چارنگ کنوع نہیں۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور عجیب تر اور قرآن ہی سے بُد کا آئینہ دار ان لوگوں کا یہ قول ہے کہ آیت میں صرف یتیم بچوں کے ساتھ نکاح میں تعدد کی اباحت و اجازت ہے اور وہ ان کی سرپرستی کا ایک حل ہے، نہ کہ دوسری عورتوں سے تعدد کے جواز کا حکم۔

حالانکہ خود صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم کہ جن پر قرآن مجید نازل ہوا ہے اور جن کا اصل منصب قرآن مجید کی آیات کی تشریح و تفسیر ہے، (التین الناس ما نزل الیہم لہ) ان سے براہ راست استفادہ ہونیوالے بتاتے ہیں (جو صیم سندوں کے ساتھ معتبر ترین کتابوں میں منقول و موجود ہے) اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ دراصل یتیم بچوں کے ساتھ نکاح کر کے ہی ان بچیوں پر ظلم کیا جاتا تھا، اس طرح پر کہ مال کی حرص و آذ کا شکار افراد یتیم المدار بچیوں سے نکاح حصن ان کے مال و جائیداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے کر لیا کرتے تھے اور حقوق مزوجیت ادا کرنا ان کے پیش نظر ہوتا تھا اور نہ انھیں ایسی بے یار و مددگار بیویوں کی طرف سے حقوق طلبی کے دعویٰ کا کسی جانب سے ڈر ہوتا تھا۔ اس لئے ایسی خود غرضانہ شادیوں کہ جن میں یتیم بچیاں کنکال بنا کر چھوڑ دی جاتیں — سے روکا گیا ہے اور کہا گیا کہ ان بچیوں کے علاوہ سارے عالم میں بہت عورتیں موجود ہیں ان سے حسب پسند نکاح کرو ایک چھوڑ چارے کر سکتے ہو۔ یہاں حدیث شریک سے زیادہ صحیح اور مقبول کتاب بخاری سے صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے :-

عن ابن شہاب قال اخبر عروۃ بن الزبیر انہ سأل عائشۃ عن قول
اللہ تعالیٰ وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فقال یا ابن اختی هذه الیتیمۃ

تكون في جرد وليها تشركه في ماله ويمنعها ماله وجمالها فتريد وليها ان يتزوجها
 بغير ان يقسط في صداقها فيعطيهامثل ما يعطيها غير لا فنهو امن ان يسكنوهن
 ان يقسطوا لهن ويبلغوا لهن على ستمهن في الصداق فامروا ان يسكنوا ما
 طالب لهم من النساء سواهن لـ

اور یہ بات تقریباً تمام معتبر مفسرین نے نقل کی ہے ۷

صرف ان احادیث سے ہی نہیں قرآن مجید کے سیاق سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے اس
 کے علاوہ اور کچھ نکلتا تلف سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلی آیت میں یتیموں کا مال ان
 ہی کو سپرد کر دینے کا حکم مذکور ہے۔ (وَآتُوا الْيَتَامَىٰ اَمْوَالَهُمْ) پھر اپنے مال اور ان کے مال
 کو (ازرا و فریب) گڈمڈ کر کے استعمال کرنے سے منع کیا گیا اور اس کو بہت بڑا گناہ بتایا
 گیا ہے (وَلَا تَتَّبِعُوا اَمْوَالَهُمْ اِلَىٰ اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا) اس کے بعد پھر وہ آیت
 ہے جس میں تعدد ازواج کا حکم مذکور ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ
 کا مفہوم اگر وہی ہوتا جو مذکورہ لوگوں نے بیان کیا ہے تو آیت میں فَاَنْتُمْ مَوْءَاظَاتٌ لِّكُلِّ
 مِّنْ اٰلِهٰتِكُمْ کے بجائے قنہن، یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ہوتا جیسا کہ اس کے بعد والی آیتوں میں
 یتیموں کے اموال کے سلسلہ میں ایسا یعنی (اسم ظاہر کے بجائے اسم ضمیر) موجود ہے شَلَا وَابْتَلُوا
 اَلَيْفُمْ مَعَكُمْ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کے بعد ہے — فَانْ اَنْتُمْ مِّنْهُمْ رِّسَالًا، کیونکہ یہاں
 پر دونوں جگہ ایک ہی قسم یعنی یتیم ہی مراد ہیں اس لئے ایک جگہ اسم ظاہر آیا اور دوسری
 جگہ اسم ضمیر عربیت کا تقاضا ہی ہے۔ اسی طرح آیتِ اباحتِ تعدد میں بھی اگر وہی یتیم

۱۔ بخاری، ۶۵۸/۲۔ مطبوعہ ریحیہ دیوبند۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۴۹۹/۵، درمنثور ۱۱۹/۱۱۸، تفسیر مظہری ص ۲۶۵،
 تفسیر کبیر ص ۱۳۹، احکام القرآن للجصاص ص ۵۴۱، احکام القرآن لابن العربی ص ۱۲۹۔

پہلیاں مراد ہوتیں جن کے بارہ میں کای خفتم اَنْ لَا تَقْسِرُوا فِي الْيَتٰمٰی کہا گیا ہے تو وہ اسلوب
 نہ ہو جو اس وقت ہے، بلکہ ایسا ہوتا جیسا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا اس بنیاد پر متعدد
 مفسرین نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بات بصراحت کہی ہے کہ ان یتیم بچوں کے علاوہ
 دوسری عورتوں سے نکاح کر دینے اور حدیث مذکور میں بھی من النساء کے بعد سوا حق
 موجود ہے۔

تخذوا زواج کی حکمتیں :-

دیے تو خدائی احکام کے تمام مصالح اور انکی سب حکمتوں کا ادراک انسان کی دسترس
 سے باہر ہے اسی وجہ سے وہ اس کا مکلف نہیں کیا گیا بایں ہمہ انسان کی معمولی عقل اور تھوڑی
 سی سمجھ میں جو کچھ آجاتا آسکتا ہے (اگرچہ ضروری نہیں کہ اس پر حکم کا مدار ہو اور نہ ایسا
 خیال ہی کرنا چاہیے کہ بس یہی حکمت و سبب ہے) اسے پیش کر دینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔
 (کہ پہلے کبھی بہت سے محتاط لوگوں تک نے بھی ایسا کیا ہے بالخصوص) اس غرض سے کہ اس حکم
 میں سراسر بُرائی دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے کچھ خوبیاں بھی آجائیں۔

معتد زواج کی ذیل میں وہ حکمتیں اور حکمتیں پیش کی جا رہی ہیں جو معمولی غور و فکر سے
 ہی سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں سے بعض عامی اور وقتی نوعیت کی ہیں اور بعض مستقل اور ابدی
 حیثیت کی حامل۔

(۱) مردوں سے عورتوں کا تناسب بڑھ جانے کی صورت بکلامناسب حل یہی ہے، ورنہ

حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ قرآن مجید کے اندر ہی اس بات کی رعایت کر دی
 ہے۔ فرماتے ہیں :- اور اگر درود کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور
 عورتیں تم کو خوش آئیں دو، دو تین تین چار چار۔ اسی طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے
 اپنے تشریحی نوٹ میں اسی بات کو خوب واضح کر دیا ہے۔ یاد رکھیے فوائد مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے

اخلاق خرابیاں پھیلنا یقینی ہے (قیامت کے قریب، عورتوں کی اکثریت ہو جانے کی) (احادیث میں پیشینگوئی بھی کی گئی ہے اور اب حالات دیکھئے نیز مختلف ممالک کے اندر مرد و زن کی تعداد کے تناسب سے یہ پیشینگوئی جلد ہی صادق ہوتی نظر آ رہی ہے۔

(۲) بیوہ اور ملکہ عورتوں کی باآسانی شادی ہو جانے کی امید، کیونکہ عقدِ ثانی کے وقت عموماً وہ شرطیں نہیں لگائی جاتیں جو عقدِ اول کے وقت مرد لگایا کرتے ہیں اور اس وقت ان کی پسند کامیاب بھی نسبتاً پست ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اچانک طلاق ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات جو مہیب شبکیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ کہ عورت دیکھتے دیکھتے بے یار و مددگار بن جاتی ہے۔ اس دشواری کا بھی ایک حد تک حل، اباحتِ تعدد میں ملتا نظر آتا ہے۔

(۳) بد صورت، نادار اور اسی طرح وہ عورتیں جن کا عقد موجودہ زمانہ میں مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی شادی ایسے مردوں سے ہو جانا نسبتاً آسان ہے جن کے یہاں پہلے سے بیوی موجود ہے۔ اور کسی ضرورت سے وہ عقدِ ثانی کے خواہشمند ہیں۔ اس طور پر اس ایک اہم مشکل کا حل بھی اہل میں ہے۔

(۴) جنگ یا ایسے ہی کسی دوسرے ہنگامی زمانہ میں بیوہ یا بے سہارا ہو جانے والی شریف عورتوں کو بے راہِ ردی سے بچانے اور ان کی کفالت کا سامان۔

(۵) خوشحال، تندرست اور خوش خوراک مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل عموماً ایک بیوی سے ہو جانا ممکن نہیں۔ اس لئے ایسے لوگ بے راہِ ردی کا شکار ہو جاتے یا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لئے نکاحِ ثانی گویا ان کی ضرورت کا سامان اور صحیح راستہ۔

(۶) مستقل بیمار یا فقیر عورتوں کے شوہران کی جائز بلکہ ضروری اور فطری خواہش پورا کرنے کی صحیح راہ اور شدید ضرورت جس کا لحاظ نہ کرنا ان پر ظلم۔ یہ امداد کے علاوہ اور بہت سی مصلحتیں ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے بایں ہمہ اس بات کے امکان کا انکار نہیں اس اباحت کے کچھ مضربِ پہلو بھی

عمل کے وقت سامنے آئیں، مگر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ دنیا کے ہر قانون بلکہ ہر چیز کی طرح شریعت میں بھی عموماً خیر غالب کا (اختیار کیلئے) اور شر غالب کا (اجتناب کے لئے) اعتبار کیا گیا ہے جیسا کہ امام شافعیؒ نے فرمایا:

فالمصلحة اذا كانت هي الغالبة عند مناظرتها مع المفسدة في حكم
الاعتیاد فی المقصودة شرعاً ولتحصيلها وقع الطلب على العباد ولكن ذلك
المفسدة اذا كانت هي الغالبة بالنظر الى المصلحة في حكم الاعتیاد فرفعها هو
المقصود شرعاً ولاجله وقع النهي له -

لیکن اس کا مطلب نہیں کہ قانون کے مضر پہلو سامنے آجانے کے بعد کبھی اسے نظر انداز کر دیا جائے اور اس کا تدارک نہ کیا جائے بلکہ اس کا تدارک کیا جائے گا چنانچہ شریعت میں اس کی پوری رعایت موجود ہے مثلاً (جیسا کہ شروع میں ذکر ہوا) شوہر کے عدل نہ کرنے کی بجائے شکایت پر عورت کو فسخ نکاح کا اختیار دیا گیا، علاوہ ازیں پیش بندی کے طور پر بھی نکاح ثانی سے قبل ہی بعض ایسی تدبیریں کی جاسکتی ہیں کہ ظلم کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ اگرچہ چند بیویاں رکھنے والے شہرہ کے ظلم کی داستانوں اور اس کا پروپیگنڈہ کریں وہاں نے گویا آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے لیکن تحقیق اور تفقہ احوال کے بعد اس دھول کا پول کھل جاتا ہے۔ اول تو مسلمانوں بالخصوص مسلمان ہند میں - چند زوجیت کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ پچھلے دنوں اخبارات میں ایک سروے رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں میں دوسرا شادی کا رواج فی ہزارہ ۱۲-۱۵ کے اوسط سے ہے (ہندوؤں سے بھی کم ہے) ظاہر ہے کہ اس میں صد فی صد واقعات ظلم کرنے اور عدل نہ کرنے کے نہیں ہو سکتے۔ ان ایجے کہ چند بیویاں رکھنے والے شوہر نصف کی تعداد میں ظلم کرتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہزار

شادی شدہ مردوں میں صرف سات واقعات ظلم کے ہوئے یعنی ایک فی صد سے بھی بہت کم۔
غور فرمائیے کہ ایک ایسے مسئلہ پر سرکھپانا اور اس کے اس طرح پیچھے پڑنا کہ دنیا کے
دوسرے ضروری مسائل پس پشت چلے جائیں کیا عقلمندی اور دانشوری کی بات ہوگی؟ کیا
ایسے ہی موقعہ کے لئے ”کوہِ کندن و کاہ“ ”براؤر دن“ نہیں کہا گیا ہے؟

تاہم جرم کا اوسط کتنا ہی کم کیوں نہ ہو بہر حال سد باب کے لئے سنی ضروری کرنا چاہیے۔
یہاں اس بارہ میں مختصر چند شکلیں بطور تجویز ذکر کی جاتی ہیں، شرفا میں عموماً دوسری شادی
کرنا بھی جرات عموماً وہی کرتے بلکہ کر سکتے ہیں۔ جو دوسری صلاحیتوں کے ساتھ خوشحال اور ذمی حیثیت
بھی ہوتے ہیں۔ اس امر واقعہ کو سامنے رکھ کر دوسری بیوی کے آنے کی صورت میں :-

۱۔ عقدِ نکاح کے وقت زوجہ یا اس کے اویا کے مطالبہ پر مردے (اگر جائداد والا ہے)
تو اس کی جائداد کا مستحق حصہ یا (اگر وہ ملازم ہے) تو تنخواہ کی مستحق مقدار بذریعہ رجسٹری
بیوی کے نام کرائی جائے اور پھر شوہر کے حقوق زوجیت ادا کرنے کی صورت میں اس سے سہارا
لیا جائے۔

۲۔ یا نکاح ہی کے وقت عدل نہ کرنے کی صورت میں علیحدگی کا اختیار لے لیا جائے۔
۳۔ یا عقدِ اول کے وقت شرط کر لی جائے کہ شوہر دوسرا نکاح اس کی موجودگی میں نہیں
کرے گا بصورت خلاف ورزی عورت کو نفقہ کا اختیار (امام احمد رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق) دے
دیا جائے۔ حافظ ابن قیم حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں :-

واختلفت فی شرط..... ان لا یبکتری علیہا ولا یتزوج علیہا فاوجب احمد
وخیروا لوفاء بہ ومتی لم یف فلھا الفسخ عند احدہ -
مگر کسی دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنا (بمشورہ علماء) ضرورتِ شدیدہ کے

وقت ہی فیصلہ کیا جائے۔ معمولی صورتوں میں نہیں۔

پہلے گزر چکا ہے کہ عدل نہ کرنے اور حقوق زوجیت پورے ادا نہ کرنے کی صورت میں
فسخ کا موقع حاصل ہو جائے گا۔
مرد و زن کی مساوات کا نعرہ :-

بعض گوشوں سے تعدد اذواج کے خلاف دلائل کی فہرست میں اضافہ کے طور پر اقوام
متحدہ کے چارٹر۔ کہ جس میں مرد و زن کی مساوات تسلیم کی گئی ہے۔ کی وہائی بھی سنائی دیتی ہے
لیکن ذرا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہی معنی مساوات کے ہیں کہ بلا استثناء ہر موقع پر۔ ان
کے صنفی اور خلقی فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی۔ مرد و زن کے درمیان یکساں معاملہ کیا
جائے! اگر جواب اثبات میں ملے تو دوسرا سوال یہ ہو کہ بتاؤ! تم نے ایسی مساوات کہا برتی؟
اور اعداد و شمار کی روشنی میں جواب طلب کیا جائے کہ تمہارے یہاں یہی (یورپ میں) ابتداء
عہدہ پر فائز ہونیوالوں میں مردوں اور عورتوں کا کیا تناسب ہے؟ کتنی عورتیں اب تک
وزیرِ اعظم بنائی گئیں؟ کتنی فوج کی اعلیٰ عہدیدار؟ کتنی کمانڈر انچیف؟ کتنی پالیٹ؟ اور
جلنے دیجے صرف یہی بتا دیجئے کہ فوج کے اندر کتنے بڑے عہدوں پر نہیں۔ معمولی ہی عہدوں
پر کتنی عورتیں فائز کی گئی ہیں؟ یقین رکھنا چاہیے! جواب دیا تو یہی ہو گا کہ — ایک
بھی نہیں!!! —

اسی بنا پر لاخوف تبید کہا جاسکتا ہے کہ مرد و عورت کے خلقی تفاوت صنفی فرق اور بہت سے
امور میں بحسن اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان ہمہ جہتی مساوات کا نعرہ
لگانا بے دانشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس موقع پر حضرت الاتاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت جھنجھٹی
اور پر مغز بات یاد آتی ہے۔ جو موصوف نے ایک دن سبق کے درمیان اسلام میں مساوات
کا مطلب بتاتے ہوئے بیان فرمائی کہ ۱۔

اسلام میں مساوات کے معنی :-

مساوات کے معنی انفس قانون میں مساوات کے نہیں، بلکہ نفاذ قانون میں مساوات برتنا ہیں۔ علامہ موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے فطری فرق اور ناگزیر جنسی اختلاف کے پیش نظر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ہر قانون دونوں کے لئے یکساں ہو۔ بلکہ واقعی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض قوانین میں اختلاف ناگزیر ہے۔ لیکن نفاذ کے وقت کسی کو محض جنسی فرق کی بنیاد پر اولیت و تقدم حاصل نہ ہوگا اور نہ ان میں سے کسی کو صرف اس بنا پر نظر انداز کیا جائے گا۔ اس بصیرت افروز قول کی روشنی میں بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر۔ (اگر وہ عقلاً رائے بنایا ہے)۔ میں جس جنسی فرق کی بنیاد پر مرد و زن میں اختلاف نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور دونوں کے درمیان مساوات تسلیم کی گئی ہے اس کا مطلب بھی غلط فہمی کے فرق کے ساتھ۔ ایسا یا یہی ہونا چاہیے۔ وہ نہیں ہو سکتا یا نہ ہونا چاہیے۔ جو ترقی پسند عام طور پر کہتے ہیں اور ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ نہ وہ عقل صحیح کا تقاضا ہے نہ واقعات ہی کے مطابق۔ مثلاً دنیا کے قابل ذکر ممالک میں یہ قانون موجود و معمول ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہے کہ شوہر کا نفقہ بیوی کے ذمہ ہے (بعض استثناء اور مجبوری کی حالتوں کو چھوڑ کر) ظاہر ہے کہ یہ فرق اصلاً جنسی اختلاف ہی کی بنا پر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں ہے۔

تو کیا یہ ممالک اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہرائے گئے یا ٹھہرائے جاتے ہیں ؟

مرد و زن کے درمیان مساوات میں اسلام کا نقطہ نظر :-

ان امور کی روشنی میں ہم اس امر کے اظہار میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے واضح طور پر عورت و مرد کے درمیان بعض امور میں فرق ملحوظ رکھا ہے اور اس کا اظہار قرآن مجید کی آیات میں بھی کیا گیا ہے اور احادیث نبوی میں بھی اور اہلین

بنیادوں پر تمام علماء امت کے اقوال میں بھی اس کا براہِ اعتراف موجود ہے جس کی تفصیل موجبِ طوالت ہوگی۔ یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے:-
قرآن و حدیث کا بیان :-

قرآن مجید کی آیات سے دونوں کے فرق مراتب کا ثبوت :-

۱۔ للرجال علیہن درجۃ ۱۔ ۲۔ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ لِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَذَٰلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ۱۔

احادیثِ رسول صنفین میں خلقی و طبعی تفاوت کا ذکر:

۱۔ ما رأیت من ناقصات عقل و دین اذہب للرجل الحازم ۳۔

۲۔ استوصوا بالنساء خیرا فان المرأة خلقت من ضلع وان اعوج البشی فی الضلع اعلاہ فان ذہبت تقیمہ کسرتہ وان ترککۃ لم یزل اعوج ۴۔

علماء امت کے اقوال :-

علماء امت کے اقوال کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف دو ممتاز عالموں کے فرمودات نقل کئے جاتے ہیں:-

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں: ”آیت الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کی تفسیر کرتے ہوئے:- القوام ایلغ وهو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب وعلل ذلك بامرین وهی وکسبی بما فضل الله.... علی النساء فی اصل المخلقة بکمال العقل وحن التدبیر وبسطة فی العلم والجسم ومزید القوة فی الاعمال وعلو الاستعداد ولذلك خصوصاً بالغبوة.... وزیادة السهم فی الارث وما لکیة

۱۔ سورۃ بقرہ آیت ۶۶۔ ۲۔ سورۃ نساء آیت ۳۴۔

۳۔ بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ۱/۱۳۱ ۴۔ بخاری جلد اول ص ۴۶۹

النکاح وتعدد المنکوحات والاستبداد بالطلاق وهذا امر دہمی
وبما انفقوا من اموالهم فی نکاح من المهور والنفقات الواجبة وهذا امر مکبہ.
۲۔ حافظ ابن قیم جوزی "رقطراز میں :-

وہر سبمانہ امر یا شہاد امرأتین لتوکید الحفظ لان عقل المرأتین وحفظها
يقوم مقام رجل وحفظه ولذا اجعلت علی النصف من الرجل فی الميراث
والديتة والعققة والمتق، فتعق امرأتین يقوم مقام عتق رجل لکما صح
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم :-

ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کرنے کے بعد تعدد ازواج کا مسئلہ (انتشار الشہمانہ)
آسان ہو جائے گا اور اس کی "بھیانک" صورت کے بجائے متوازن حیثیت سامنے آئیگی۔

فہرست مؤخذ

- ۱۔ قرآن مجید
- ۲۔ بخاری : للإمام ابی عبد اللہ محمد بن یسین
- ۳۔ مسلم : للإمام مسلم بن الحجاج القشیری
- ۴۔ ابوداؤد : للإمام ابی داؤد سلیمان الاشعث
- ۵۔ دارقطنی : للإمام ابی یحییٰ بن یزید بن عرار دارقطنی
- ۶۔ مشکوٰۃ : للعلاء ابی محمد یحییٰ بن مسعود البیہقی وللشیخ ولی الدین البنداری
- ۷۔ زاد المعاد : للحافظ ابن قیم الجوزی
- ۸۔ احکام القرآن : لابی بکر الجصاص الرازی
- ۹۔ احکام القرآن : لمحمی الدین ابن العربی
- ۱۰۔ تفسیر منہجی ۱/۲۷۲ء - ۱/۲۷۳ء احکام المؤمنین / ۱۱۱
- ۱۱۔ تفسیر القرآن : للحافظ عداد الدین ابن کثیر
- ۱۲۔ درغفور : للشیخ جلال الدین السیوطی
- ۱۳۔ روح المعانی : للعلاء الآلوسی
- ۱۴۔ تفسیر منہجی : للقاضی ثناء اللہ چانی پتی
- ۱۵۔ بیان القرآن : محقر اقدس مولانا اشرف علی تھانوی
- ۱۶۔ فوائد قرآن مجید : حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی
- ۱۷۔ اعلام المؤمنین : للحافظ ابن قیم الجوزی
- ۱۸۔ فتح القدیر : نکال الدین ابن ابراہیم
- ۱۹۔ در المختار : لعلاء الدین السبکی
- ۲۰۔ رد المختار : لابن عابد بن الشامی
- ۲۱۔ الموافقات : للإمام الشافعی
- ۲۲۔ نور الانوار : للشیخ علاء الدین احمد جوی
- ۲۳۔ حیدر ناجزہ : محقر اقدس مولانا اشرف علی تھانوی

مرزا غالب اور مدرسہ کارپنی

پروفیسر ابو محفوظ الکریم منصومی مدرسہ عالیہ کلکتہ

مرزا غالب کی سوانح زندگی میں مشاعرہ کلکتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فردری ۱۸۲۵ء میں مرزا دارِ کلکتہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بہر حال کم بیش دو سال مرزا کلکتہ میں مقیم رہے اور نومبر ۱۸۲۷ء کے آخر تک دلی واپس پہنچے۔

قیام کلکتہ کے دوران یہ ظاہر کئی ایک مشاعروں میں مرزا کی شرکت سے جان پڑ گئی ہوگی لیکن ان میں سے صرف ایک مشاعرہ کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اور ان اعتراضات کی تفصیل جنتِ حسنہ سنائی ہے۔ جو سربزم ان کے بعض اشعار پر کئے گئے تھے۔ مشاعرہ کی یہ مجلس جس ادارہ میں منعقد ہوئی تھی اس کے متعلق اصحابِ قلم کا ایک طبقہ خاموش نظر آتا ہے اور ایک طبقہ جو غالب شناسی کے متنازرا کین پر مشتمل ہے۔ بہ صراحت لکھتا ہے کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ جو ۱۷۸۰-۱۷۸۱ء میں قائم ہوا اور ۱۸۲۷ء تک اپنی موجودہ عمارت واقع وینزلی اسکوائر (موجودہ حاجی محمد حسن اسکوائر) میں منتقل ہو چکا تھا، مدرسہ کی اسی عمارت میں مشاعرہ منعقد ہوا اور وہ ہنگامہ برپا ہوا جس نے غالب کی گہرے شہرتِ حیات میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔

اس ہنگامہ خیز مشاعرہ کی مفصل روئداد کسی قدیم ماخذ میں یکجا نہیں ملتی۔ خود مرزا غالب نے اس کا ذکر متفرق طور پر کیا ہے۔ مرزا کے نیم معاصر وزیر علی قبری عظیم آبادی نے فارسی شہر اور نثر نگاروں پر الگ الگ دو تذکرے مرتب کئے تھے، معراجِ انخیال اور ریاض الافکار۔ قبری نے دونوں تذکروں میں مرزا غالب کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے اور مشاعرہ

میں ہنگامہ برپا کر نیا لوں کی مذمت کی ہے۔ لیکن جگہ کے تعین کا مسئلہ ان تذکروں سے بھی حل نہیں ہوتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ خود مرزا کے بیان کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔ اور ان کے بیان میں جو اشارات ملتے ہیں ان پر اور کئی ٹاپیک دوسرے خارجی دلائل و قرآن پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد مشاعرہ کی جگہ کا تعین کرنا چاہیے۔ یہ مضمون خاص اسی مقصد سے سپرد قلم کیا گیا ہے :

(الف) مرزا غالب کا ایک فارسی مکتوب اس مشاعرہ کے سلسلہ میں بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مکتوب اعلیٰ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ ہیں۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

”از نوادر حالات این کہ سخن و رمان و نکته رسان این بقعہ پس از ورود
خاکسار بزم سخن آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمی انگریزی، روز یکشنبہ نخستین
سخن گویان در مدرسہ سرکار کپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی
و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسید
است، در آن انجمن می رسد و اشعار مرا شنودہ، بہ بانگ بندہ ستاید
و بکلام نادرہ گویان این قلمرو، تبسم ہائے زیر لبی می فرماید۔ چون طابع
بالذات مفتون خود نمائی است، ہنگنان حدی بر بند و کلانان انجمن و
فرزانگان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست بر آوردہ، آں را شہرت
می دہند۔ و بے آنکہ زبان بہ پاسخ آشنا شود۔ از دانشوران کہ مخدومی ملاذی
نواب علی اکبر خاں و کرمی و مطاعی مولوی محمد من از قانند، جوابہای یابند
(کیات نثر فارسی ص ۱۷۷، حال : یادگار غالب ص ۳۶۷-۳۶۸)

غالب کے مکتبہ پہنچنے کے بعد بہ قول مولانا مہر غالب کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ منعقد کیا گیا ”غالب : ص ۱۷۷“ اراقم الحروف کو اس اعزاز کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔ زیادہ سے

دیلمہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعرہ کا یہ سلسلہ غالب کے کلکتہ پہنچنے کے بعد شروع کیا گیا تھا، گوچہ
یہاں کلام اس بارہ میں بھی قطعی نہیں ہے۔ بہر حال منقولہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :-

۱۔ شاعرہ ہر آگہ بیری جیسے پہلے اتوار کو منعقد کیا جاتا تھا۔

۲۔ نشست مدرسہ کارکنی میں ہوتی تھی۔

۳۔ شاعرہ میں اردو اور فارسی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔

۴۔ جس مجلس میں غالب شریک ہوئے اس میں اچانک سفیر برات بھی پہنچ گئے تھے۔

۵۔ سفیر برات نے غالب کے کلام کی تعریف کی اور ان کو جی کھول کر داد دی۔

۶۔ مقامی شعراء کے کلام پر سفیر زیر لب کراتے رہے۔

۷۔ مقامی شعراء کو جو خفت اٹھانی پڑی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب ہر فنِ اعتراض
بنائے گئے۔

۸۔ اعتراض غالب کے دو شعر پر کئے گئے۔

۹۔ غالب کی حایت میں نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد حسن نے جوابات دیئے (مولانا

مہر نے ثانی الذکر کا نام محمد حسن لکھا ہے دیکھیے : غالب ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵)۔

دب، چودہری عبدالغفور مترجم کے نام خط میں صاحب عالم مار پروی کو لکھتے ہیں :-

یہ شبنوی جس میں یہ مصرع ہے عَاشِ لَیْلَہ کہ بدی گویم، کلکتہ میں میں نے لکھا ہے۔

پانچہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراضات مجھ پر کئے گئے تھے ان میں سے ایک

اعتراض یہ ہے کہ (ہمہ عالم) غلط ہے۔ یعنی (ہمہ) کا لفظ (عالم) کے ساتھ ربط

نہیں پاسکتا تین کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حانڈا کہتا ہے۔ ہمہ عالم گواہ

عصمتِ اوست۔ سوہی کہتا ہے طر عاشقہ ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دست۔

۱۰۔ مرزا غالب اور مولوی محمد حسن کے مزید تعلقات کے لئے دیکھیے : حکایت شہر ص ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵۔

غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ ثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی
کرم حسین بگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری مولوی منت علی عظیم آبادی اور
ان کے ایشال و نظائر کے پاس بھیجی گئی اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کمال ادھیڑ
ڈالتے؟ (حدود ہندی ص ۱۵۱، مطبوعہ مفید عام ایضاً علی گڑھ)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مشاعرہ میں پانچہزار کا جمع تھا۔ معترضین نے (ہمہ عالم) کی
ترکیب پر اعتراض کیا تھا۔ کلکتہ کے سربراہ اور وہاں میں کرم حسین بگرامی، عبدالقادر رامپوری
اور نعمت علی عظیم آبادی اس پایہ کے لوگ تھے کہ ثنوی بادی مخالف کے نسخے مرزا غالب نے ان
کی خدمت میں بھیجے تھے۔ معترضین کی صف میں ان کے شامل ہونے کی صراحت نہیں ملتی ہے۔
لیکن اس قدر ضرورت ثابت ہوتا ہے کہ موقع ملنے پر ان میں سے ایک بھی چونکے والا نہیں تھا جیسا
کہ خود مرزا نے واضح کر دیا ہے۔

بظاہر اسی عبارت کی بنیاد پر شیخ اکرام نے غالب کے معترضین میں ان تینوں کو شمار کیا
ہے۔ اگرچہ مولانا مہر نے غالب نامہ کے حوالہ سے ان کے نام نقل کرنا خیر میں لکھا ہے کہ مجھے
اس بیان کا مأخذ معلوم نہیں ہو سکا۔ (غالب ص ۱۱۱ حاشیہ ۱)

مولوی کرم حسین بگرامی وہی بزرگ معلوم ہوتے ہیں جن کی فرمائش پر غالب نے برجستہ
تظہر چکنی دلی پر کہا تھا۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ برہان قاطع، تصحیح کے آخری مرحلہ سے
انہی کے ہاتھوں گزرتی تھی۔ فارسی دیباچہ میں خود لکھتے ہیں: وایں حقیر... بحسب اشارہ
فیض بشارہ جناب مستغنی الانقلاب، تصحیح الفاظ تن عبارات و لغات و در ضمن تصحیح پر و ف
اخیر از آغاز تا انجام التمام دہشتم، دبرہان قاطع، دیباچہ ص ۱۸۱ اس کے بعد ماس رو بک
(Thomas Roebuck) کی باری آتی تھی۔ برہان قاطع کے انگریزی دیباچہ میں رو بک
نے ان کی تعریف و تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ کرم حسین
بگرامی خود ولیم کلج کے شعبہ عربی و فارسی میں سکندر منشی کے عہدہ پر کلج کے مشہور

زمانہ ہی سے فائز تھے اور ناس روک سے پہلے (N.B. Edmonstone) اور (Shan Baillie) کی ماتحتی میں موقوفہ خدمت کامیابی سے انجام دے چکے تھے۔ غالب کے ورور کلکتہ تک وہ یقیناً فورٹ ولیم کالج کے شعبہ عربی و فارسی میں میرنشی کے عہدہ پر سرفراز ہو چکے تھے۔ لغت و زبان دانی میں خواہ مخواہ دستگاہ رکھتے تھے۔ برہان دکنی سے ان کو جیسی کچھ عقیدت ہوگی وہ ظاہر ہے۔ ایسی شکل میں غالب کا ان کی طرف سے خائف ہونا کچھ عجیبہ تھا۔ کرم حسین ۱۸۳۱ء تک یقینی طور پر بقید حیات رہے۔ صراح کے ضمیمہ لطیفہ (مطبوعہ ۱۲۵۷ء، ۱۸۳۱ء) کے خاتمہ میں حکیم عبدالحمید مرتب ضمیمہ نے جن اصحاب علم و فضل کے نام (اسلامی مددگار) کے زیر عنوان گنائے ہیں۔ ان میں مولوی کرم حسین میرنشی کالج کا نام شامل ہے (۱۸۳۱ء)۔

دوسرے صاحب مولوی عبدالقادر رامپوری کے بارہ میں کوئی خاص بات مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ شوق نے تذکرہ کالان رامپور میں مفتی عبدالقادر فگین کا ذکر کیا ہے جو مراد آباد رہتے تھے ۱۸۰۹ء میں کمپنی کی لازمت میں داخل ہوئے۔ اور اجمیر راجستھان جیلپور، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کمپنی نے خطاب خان بہادری اور خلعت دیا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں لازمت ترک کر کے دہلی گئے اور شاہ ظفر کے پاس چھ مہینے رہے۔ یہ قول شوق اسی زمانہ میں ایک موقع پر غالب کے کلام سے ظرافت کی تھی (کالان رامپور: ۲۳۷) قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے قیام کلکتہ کے دوران یہ بھی کلکتہ میں مقیم رہے ہوں گے۔

نعت علی عظیم آبادی کے بارہ میں ہماری معلومات درجہ صفر میں ہیں۔

(ج) غالب کا تیسرا بیان مولوی مولوی عبدالرزاق شاہ کر کے نام ایک رقعہ میں یوں ملتا ہے: اللہ اللہ جو کلکتہ میں شور نشور اٹھاتا تھا میرا یہ شعر:

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم

بچو مومے کہ بتاں راز کمر بخیزد

حیرت و حیرت اعراض ہوا ہے۔ نشان اعتراض یہ ہے کہ عالم، مفرد ہے اس کا ربط

دہم کے ساتھ سبب اجتہاد قلیل ممنوع ہے۔ قصار اس زمانہ میں شاہزادہ کامران مدانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا، کفایت خاں اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ پہنچا اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جس میں دہم عالم، دہم روز، دہم جا، مرقوم تھا۔ اور وہ اشعار قاطع برہان میں مندرج ہیں۔ (عود ہندی: ۱۷۱، ایضاً ۱۷۱ اگرہ)۔

اس عبارت میں جس کفایت خاں کا نام آیا ہے، غالباً اس سے سفیر ہرات ہی مراد ہے۔ جس کے نام کی صراحت کلیاتِ نثر فارسی میں نہیں کی گئی ہے۔ لیکن عود ہندی کی عبارت غماز ہے کہ کفایت خاں خود مجلسِ مشاعرہ میں حاضر نہیں ہوئے جبکہ کلیاتِ نثر فارسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیر ہرات ناگاہ مجلسِ مشاعرہ میں وارد ہو گئے تھے۔

عبارتِ منقولہ بالا میں گرچہ اسی ایک اعتراض کا اعادہ کیا گیا ہے جس کا ذکر عبدالغفور سرور کے خط میں آچکا ہے: "ہم اس شعر کو (خستہ جہر اجتہائے اعتراض) کہہ کر غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس شعر پر کچھ اور اعتراضات بھی کئے گئے تھے۔ جن کی تفصیل میں ثمنوی بادی مخالف میں ملتی ہے۔"

(د) ثمنوی بادی مخالف "جو اس ہنگامہ کے بعد نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد حسن کے اشارہ پر لکھی گئی، اس کے مندرجہ ذیل ابیات مجلسِ مشاعرہ کے تمام اعتراضات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

زلفِ گزقار را کہ در ہم کرد	بزمِ اشعار را کہ بر ہم کرد
(دہم عالم) غلط کہ گفتِ نخت	پارہٴ زیں غلط کہ گفتِ نخت
(بیش) را بیشتر کہ گفتِ بمن	بد ز من پیشتر کہ گفتِ بہ من
موئے را بر کہ گفتِ غلط	شعر را سر بسر کہ گفتِ غلط

اس مصرعہ سے بزمِ اشعار را کہ بر ہم کرد، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہنگامہ بزمِ مشاعرہ ہی میں برپا ہوا تھا اور کم از کم (دہم عالم) کی ترکیب پر (بشرطیکہ غالب کا

بیان کیا گیا تھا۔ لہذا مہر صاحب کا یہ بیان محتاج نظر ثانی ہے کہ اسی مشعرہ میں یا کسی دوسری مجلس میں اعتراض کیا گیا کہ (مہر عالم) کی ترکیب درست نہیں (غالب : ملاحظہ)۔

کلیاتِ شرفاری کی عبارت سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدفِ اعتراض غالب کے دو شعر تھے۔ دوسرا شعر بہ ظاہر اس غزل کا تھا جس کی ردیف تھی (دزدہ) کسرہ کے ساتھ۔ مخالفین کا ایک اعتراض اسی کسرہ پر تھا جس کو مندرجہ ذیل ابیات ظاہر کرتے ہیں :-

وایے با آنکہ شعر من صاف است دزدہ (رامی زندہ انصاف است

دزدہ (را کسرہ از ظرافت نیست یایے وحدت بود اخافت نیست

واضع طرز این زمین نہ مسمم در خور ستر ز نشاں ہیں نہ مسمم

دیگراں نیز گفتہ اند چنبن گوہر راز سفتہ اند چنبن

وہ شعر جس میں (دزدہ) کسرہ کے ساتھ آتا ہے حسب ذیل ہے :

شور اشکے بہ فتار بن مژگاں دارم

طعنہ بے سرو سامانی طوفاں دزدہ

(کلیاتِ فارسی ص ۴۸۳ نول کشور ۱۹۲۵ء)

غالب نامہ کے حوالہ سے اس شعر کو نقل کرنے کے بعد مولانا مہر فرماتے ہیں : ”مجھے غالب کے کلام میں یہ شعر نہیں مل سکا۔ اس زمین میں غالب کی ایک غزل موجود ہے لیکن اس میں منقولہ شعر موجود نہیں“ (غالب : ملاحظہ ۲)۔

نثرِ کلیات سے غالب مہر صاحب نے سرسری طور پر رجوع فرمایا ہوگا۔ ورنہ اس زمین میں غالب کی دو غزلیں ملتی ہیں۔ ردیف ہائے ہوز کی پہلی غزل میں یہ شعر موجود ہے دوسری غزل ہائے ہوز کے اواخر میں ثبت ہے جو یقیناً مولانا مہر کی نظر سے گزری ہوگی، منقولہ بالا شعر اس غزل کا نہیں ہے لیکن طوفاں دزدہ کی ترکیب اس میں بھی ملتی ہے۔

خواتین شکوہ بیداد تو انشا کروں قلم از خوش رقم شد خس طوفاں زدہ

(کلیات فارسی، غالب: ۲۷۷)

مذکورہ بالا اقتباسات سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں اُن میں سے چند چیزیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں، مدرسہ سرکاری، پانچہزار کا جمع، اور ہر انگریزی مہینے، پہلے اتوار کو نیم مشاعرہ کا انعقاد ہوتا۔

غالب کے بعد میکس علم میں وزیر علی عبرتی کا بیان اس مشاعرہ کے سلسلہ میں قدیم تر مافذ ہے جو ہماری دست رس میں ہے۔ عبرتی نے فارسی شعرا کا تذکرہ معراج الخیال ۱۸۶۳ء تک مرتب کیا اس سے پہلے ۱۲۶۸ھ = ۱۸۵۳ء میں انھوں نے شریکاروں کا تذکرہ ریاض الانوار میں مرتب کیا تھا گویا دونوں تذکرے مرزا غالب کے دوران حیات میں لکھے گئے۔ موخر از کتبہ میں عبرتی نے اپنا مافذ میرزا ذوالفقار علی کی بیاض کو قرار دیا ہے، اور پہلا مشاعرہ مرزا غالب کے ایک معترض کا نام امان علی خاں بتایا ہے۔ تذکرہ معراج الخیال میں ان کا مافذ ایک بیاض کے علاوہ خواجہ حیدر خاں (کذا) شائق شاگرد غالب کا بیان ہے۔ مواد کے اعتبار سے دونوں

(۱) شائق کا نام رحمن علی پیش نے تواریح دھاکہ میں خواجہ حیدر جہاں لکھا ہے۔ خواجہ غلیل کے لڑکے تھے اور نواب سر عبدالغنی کے قرابت مندوں میں تھے۔ بہ قول پیش، مرزا اسد اللہ خاں غالب سے بذریعہ خط و کتابت کے اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ شائق کا ایک مختصر دیوان خواجہ محمد افضل کے کتب خانہ میں پیش کو ملا تھا۔ دو شعر نمونے کے یہاں بھی درج ہیں:-

جس کی ٹھوکر سے جی اٹھے مرے اس کی رفتار نے ہیں مارا

خون دل پیتے ہیں غم کھاتے ہیں دل لگانے کا مزہ پاتے ہیں

دیکھیے تواریح دھاکہ (۳۳۶-۳۳۷، مطبوعہ آستان قدس) و فاراشدی: بنگال میں اردو ادب، مرقی کے الفاظ سے مترشح ہے کہ شائق کی ملاقات غالب سے کبھی ضرور ہوئی۔ یہ ظاہر اس کا موقع دیکھتے ہوئے ہے

تذکرے ایک جیسے ہیں اور یہ کہ معراج الحیال میں مرزا امان علی خاں کا نام بر موق نہیں آیا۔ برقی بہر حال معرچین سے ناخوش نظر آتے ہیں لیکن وہ مرزا غالب کو قتل پر ترجیح دینا روا نہیں رکھتے۔ متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:-

سخن فہانِ کلکتہ پئے ہمہ دانی آں سیف لسانی نبرہ، حریفانہ آویز تھے
بادِ گردنہ۔ چوں آں مفتنم روزگار خیلے سخن رس و ماہر ایں فن بود، کسے را
از آں جاعتہ بر خود دستے نداد۔ بلکہ ہمہ را مہر کسوت بر لب بیان نہاد
چنانچہ مختصر ثنوی کہ در مناظرۃ اہلِ کلکتہ بنظم در آورده، شاہد ایں مقال
است۔ مگر بعضے سخن شناساں کہ بر مرزا قتل آں عالی افکار را ترجیح
می دہند، خالی از تکلف نمی نمایند۔

(معراج الحیال ورق ۱۵ رب۔ زیر شماره ۶۵۵ کرزن)

برقی کے دونوں تذکروں کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) غالب کا مولد دارالسلطنت دہلی ہے (یہ بیان صحیح نہیں۔ غالب متفقہ طور پر لکھنؤ آباد میں پیدا ہوئے)۔

(۲) معرچین بد مذاق اور عاصد تھے در اتم کے خیال میں تفاوت سن و سال اور مرزا کے بلند آہنگ و عودوں کو بھی ہنگامہ برپا کرنے میں بنیادی اسباب کی حیثیت رکھتے تھے۔

غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران آیا ہوگا۔ شائق سے برقی کی ملاقات جہانگیر نگر (دھاکا) میں ہوئی تھی
برقی نے پہلے غالب، شائق کا حوالہ اس طرح دیا ہے:- از زبان خواجہ حیدر خاں (؟) متخلص شائق
کہ از شاگردانِ آں عالی گفتار باشد شنودیم کہ خیلے وارستہ معراج و آواز دہ طبعیتِ ذیت۔ فرمودے
بہر بڑے کہ تشریف دادے پردہ گوش اہلِ بزم ادرنگین مغالی خوش رکش ضل بہاراں ساختے معراج
الحیال ورق ۱۵ رب، شائق کو شہنشاہ محمد وجیہ الدین حسنی سے بھی تلمذ تھا جو اصلاً عظیم آبادی تھے۔ دھاکا میں
وفاات پائی (معراج الحیال۔ ورق ۲۶ رب)۔

(۳) اعتراض کرنیوالوں میں مرزا امان علی خاں پیش پیش تھے ریاض الافکار - برگ ۹۳ (فارسی بولہ)۔
رقم ۹۳ فارسی بولہ)۔

(۴) امان علی خاں کو غالب سے کوئی نسبت نہیں تھی (ریاض الافکار)۔

(۵) قلیل پو غالب کو ترجیح دینا خالی از تکلف نہیں (معراج الحیال)۔

میرے علم میں عبرتی کی ریاض الافکار سے سب سے پہلے جناب حمید احمد خاں نے استفادہ کیا۔ ان کا مضمون (غالب کا کلکتہ) ماہ نومبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ راقم کو اسی مضمون سے عبرتی اور ان کی ریاض الافکار کا علم ہوا اور اسی زمانہ میں نسخہ بولہ کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔

خان صاحب، امان علی خاں کے متعلق رقم طراز ہیں کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند آہنگ ایک صاحب بنام نواب مرزا امان علی خاں تھے۔ یہ بھی غالب تخلص کرتے تھے۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں آرہے تھے (ماہ نو: ص ۲، شمارہ فروری ۱۹۵۷ء) معلوم نہیں ریاض الافکار کی عاجلانہ مراجعت نے خان صاحب کو اس غلط فہمی کا انکار بنایا، یا کسی دوسرے ماخذ کی بنا پر انھوں نے امان علی خاں کو غالب کا ہم تخلص لکھ دیا ہے۔ بہر حال اس کی نشاندہی نہ ان کے مقالہ میں ملتی ہے نہ کسی اور ذریعہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ عظیم آباد کے مرزا امان علی خاں ذہن تخلص کرتے تھے۔ مرزا ابراہیم خان اصفہانی کے لڑکے تھے۔ یعنی غالب اگر سلجوقی ترک ہو کر تیغ اصفہانی کے گھاس ہو سکتے تھے تو یہ بھی اصلاً اصفہانی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کی طرح ان کا مولد اکبر آباد ہی تھا۔ البتہ نشو و نما عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ غزل ریختہ میں قادر الکلام ہونے کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے عبرتی نے ان کو خاص دوستیوں میں لکھا ہے، اور بڑے اچھے الفاظ میں ان کا ذکر دونوں تذکروں میں کیا ہے۔ ریاض الافکار کی تالیف کے زمانہ میں یقیناً عظیم آباد ہی میں مقیم تھے۔ (بفضل بخوشدلی تمام بہزار قناعت عظیم آبادی گذارد۔ ریاض الافکار) عبرتی نے

ان کی آزمودہ وضعی و خانہ بدوشی کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے لہذا میں ممکن ہے
 کلکتہ میں بھی کچھ زمانہ بسر کیا ہو۔ تاہم حیرت ہوتی ہے کہ برقی نے مرزا ذبیحہ کے تذکرہ میں
 غالب سے ان کی آویزش کی جانب اشارہ کرنا تو ایک طرف کبھی کلکتہ پہنچنے کا ذکر تک
 نہیں کیا۔ علاوہ بریں غالب کے ذکر میں ایسا فقرہ لکھا گوارہ کیا (خصوصاً مرزا امان علی
 خان کہ اصلاً باہن مستعد روزگار جادو بیان نسبتے ندارد۔ ریاض الافکار)۔ بہر حال
 یہ احتمال اپنی جگہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عظیم آباد کے یہی امان علی خاں اعتراض کرنیوالوں میں
 سب سے زیادہ بلند آہنگ رہے ہوں گے۔ لیکن ان کا تخلص ذبیحہ تھا نہ کہ غالب۔ ان کے نام
 کے ساتھ نواب کا لقب بھی مجھ کو کہیں نظر نہیں آیا۔ نوروز علی خاں کیتا کے والد امان علی
 خاں کی شخصیت بھی ذبیحہ عظیم آبادی سے شاید الگ نہیں تھی (دیکھئے : ریاض الافکار،
 ذکرِ نجف، معراج النہال ۸۲/۵)۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے غالب کے قیام کلکتہ کی سرگشت میں اس ہنگامہ کی
 جو تفصیل پیش کی ہے وہ مدرسہ عالیہ کے ذکر سے خالی ہے۔ (یادگار غالب : ص ۱۵-۲۰ پہلی گڈ)۔
 محمد حسین آزاد کو بھی اس سے سروکار نہیں کہ مشاعرہ کس ادارہ میں منعقد ہوا تھا۔

آزاد اور حالی کے بعد معلوم نہیں کس طرح غالب کے تذکرہ نگاروں نے اس مشاعرہ کی
 جگہ مدرسہ عالیہ کو قرار دینا شروع کیا بیشیخ اکرام نے حیات غالب میں یہ ظاہر کلیات نشر
 فارسی کی مذکورہ بالا عبارت کی بنیاد پر لکھا ہے۔ کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ
 جاری کیا تھا اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہوئی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے
 اتوار کو مشاعرہ ہوتا اور دو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔
 (حیات غالب : ص ۱۷) (برموقع حاشیہ پر مدرسہ کے قیام کی مختصر تاریخ بتا کر شیخ صاحب
 نے متعین کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک مدرسہ سرکار کمپنی سے مدرسہ عالیہ مراد ہے جس کو گورنر
 جنرل دارل سنسکھ نے قائم کیا (حیات غالب : ص ۱۷ حاشیہ ۱)۔

مہر صاحب نے مدرسہ سرکار کینپی، کو مدرسہ کلکتہ لکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد مدرسہ عالیہ واقع ولیمزلی اسکوائر سے ہوگی اور اس میں شک نہیں کہ آج تک مدرسہ عالیہ کیبے کاغذات میں مدرسہ کلکتہ لکھنے کا دستور ہے۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا خود مرزا غالب اس مدرسہ کو (مدرسہ کلکتہ) کے نام سے جانتے تھے۔

حمید احمد خاں نے اپنے مضمون (غائب کا کلکتہ) میں مدرسہ کلکتہ سے ہمارے اس مدرسہ کو مراد لیا ہے اور اسی ذیل میں لکھا ہے :-

”۱۹۳۸ء میں جب میں کلکتہ میں تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مجلس میں مجھ سے کہا کہ مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں ۱۸۶۰ء یا ۱۸۷۰ء کے قریب منتقل ہوا۔ غالب کو ثنوی باوجود مخالف والا سنگامہ مدرسہ کی پہلی عمارت میں پیش آیا جو سیالہ میں بیٹھک خانہ روڈ پر تھی“ (ماہ نو: مش: ۲ فروری ۱۹۵۰ء)۔

خان صاحب نے اس کے بعد پرنسپل مولانا محمد موسیٰ (مرحوم) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو مشاعرے ۱۸۳۸-۲۹ء میں ہوئے ان کا ذکر مدرسہ کے پرانے کاغذات میں نہیں ملتا ہے اس باقاعدہ اطلاع کے باوجود خان صاحب کو مولانا آزاد کے بیان میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آئی اور انھوں نے مولانا کے بیان کو صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ مشاعرہ پہلی عمارت میں نہیں ہوا، تسلیم کر لیا ہے۔

ذکر غالب میں جناب مالک رام یوں رقمطراز ہیں :-

”ان دنوں کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کینپی کے مدرسہ عالیہ کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزم سخن منعقد ہوتی تھی“ (ذکر غالب: ص ۶۵ جامعہ ۱۹۵۵ء)

یہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ کی موجودہ ولیمزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانہ میں تھا۔ ولیمزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۵ جولائی ۱۸۶۳ء کو رکھا گیا، پوری عمارت تین سال کی

دست میں تیار ہوئی۔ اور غالب کے کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست ۱۸۴۷ء میں جامعیت اس نئی جگہ میں منتقل ہوئی تھیں۔ مشاعرہ میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعراء کرام اندر کے مغربی برآمدے میں تشریف فرماتے تھے۔ حاضریں کی بڑی تعداد باہر کھلے صحن میں فرش پر بٹھیں تھیں۔ (ذکر غالب: ص ۶۳ حاشیہ ۱)۔

مالک رام صاحب نے اصل میں گویا غالب کے مدرسہ سرکار کینٹی کا ترجمہ کر دیا ہے۔ پھر حاشیہ میں اس کی توضیح کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے کہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ دلیزلی اسٹریٹ میں منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے اسی پرس نہیں کیا بلکہ شعراء کی نشست تک کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے جیسے خود چشم دید گواہ ہوں۔ مگر حقیقت ہے کہ مالک رام صاحب نے کسی ماخذ کی نشاندہی نہیں کی۔ مجھے کافی تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مولانا آزاد مرحوم کا بیان جناب حمید احمد خاں کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مولانا مرحوم ہی کا بیان مالک رام صاحب کے معلومات کا مرتبہ ہو۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ جو بعض اوقات محمدن کالج اور سرکاری کافذات میں عام طور پر منعقد ہوتا ہے اس کی روایات میں کسی مشاعرہ کا ذکر نہ کیا گیا اور کم از کم عالی کی یادگار غالب تک یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس مشاعرہ کے سلسلہ میں کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کا تصور ہی نہیں کیا گیا تھا۔

ہمارے استاذ مولانا عبدالستار صاحب جن سے بڑھ کر مدرسہ عالیہ کے پرانے کاغذات اور قدیم وثائق کا مطالعہ کسی اور نے شاید ہی کیا ہو گا۔ وہ بھی اپنی کتاب تاریخ مدرسہ عالیہ میں کسی مشاعرہ کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف آغا احمد علی کے تذکرہ میں ان کے یہ الفاظ ملتے ہیں: ۱۸۶۳ء میں مسٹر کوڈیل کی سفارش سے کرنل ناسوٹیز پرپنل مدرسہ عالیہ نے مدرسے فارسی مدرس کی جگہ پر آپ کو (آغا احمد علی) مقرر کر دیا۔ یہ زمانہ ہے کہ مرزا غالب کلکتہ آئے ہوئے تھے اور مسلم انسٹیٹیوٹ میں ایک مجلس تھی۔ اس مجلس میں آغا صاحب

بھی موجود تھے۔ ان دونوں میں کسی علمی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا جب مرزا غالب نے اپنی کتاب قاطع برہان شائع کی جس میں برہان قاطع اور اس کے مصنف پر سخت اعتراضات کئے گئے تھے، تو آغا صاحب، مرزا غالب کے مقابلہ اور برہان قاطع کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مرزا غالب کے خلاف ۱۸۶۵ء میں مؤید برہان لکھا اور (تاریخ مدرسہ عالیہ ۱۸۳۱-۱۸۵۱ء - حصہ دوم - ڈھاکہ ۱۹۵۹ء)۔

مذکورہ بالا بیان کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے:-

۱۔ غالب کے سلسلہ میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۹۰۲ء میں عمل میں آیا۔ اس سے پہلے آئندہ میں دو انجمنیں قائم ہو چکی تھیں، انجمن مذاکرہ علمیہ یا (Mohammedan Literary Society) جو اپریل ۱۸۶۳ء میں نواب عبداللطیف مرحوم کی سی سے قائم ہوئی اور (Society for the Mutual Improvement of Young men) ان دونوں کی جگہ بعد میں مسلم انسٹی ٹیوٹ سے پُر ہوئی۔

۲۔ غالب سے آغا احمد خاں کی باثنا فہ ملاقات، محتاج ثبوت ہے۔ اس قدر یقینی ہے کہ جس زمانہ میں غالب کلکتہ میں مقیم تھے آغا احمد علی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، آغا کی پیدائش جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۴۴ء ہوئی یعنی کلکتہ سے غالب کی واپسی کے دس گیارہ سال بعد۔

کچھ اسی قسم کا وہم بعض لوگوں کو سید محمود آزاد کے سلسلہ میں بھی ہوا ہے۔ ڈاکٹر شادانی تحریر کرتے ہیں: جس زمانہ میں مرزا غالب اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ آئے ہوئے تھے، آزاد بھی ان سے ملے کلکتہ گئے تھے " (دفاعا شدی: بنگال میں اردو ۴۹)۔ محمود آزاد کا سن ولادت ۱۸۴۳ء ہے اور مرزا کا سفر کلکتہ لگ بھگ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

۳۔ آغا احمد علی اور غالب کی قلمی معرکہ آرائی ایک تاریخی حقیقت ہے، لیکن یہ معرکہ جس وقت شروع ہوا اس وقت تک غالب کے سفر کلکتہ پر ۳۴ سال بیت چکے تھے۔ غالب

فے ۱۸۶۶ء میں قاطع برہان کا مسودہ مکمل کیا اور ۱۸۶۷ء میں اس کی طباعت و اشاعت کے ذریعہ شہر و آزاؤں کو دعوتِ مبارزت دی۔

فنی حبیب اللہ خاں کے نام ایک رقعہ میں لکھتے ہیں: ”کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا مؤید برہان ہے اس رسالہ میں رفع کئے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کئے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کئے ہیں۔ اور اہل مدرسہ اور شغلے کلکتہ نے تقریظیں اور تائیدیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں (اردوئے معلیٰ ص ۳۱۳) باد ۱۲۹۷ھ (رقعہ کی تاریخ ۱۲ شعبان ۱۲۸۳ھ ہے یعنی دسمبر ۱۸۶۶ء)۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں مرزا نے مدرسہ کلکتہ لکھا ہے۔ مدرسہ سرکار کپسٹی نہیں لکھا۔

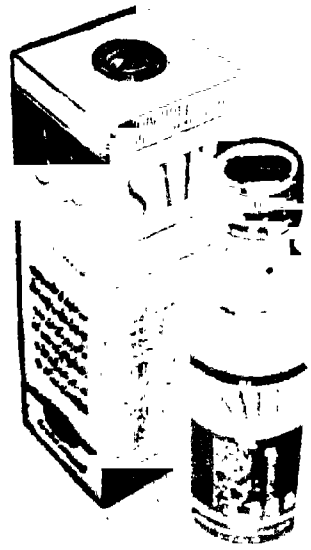
مولانا تہن شاعرہ میں ہنگامہ برپا کر نیوالوں میں احمد علی گویا مدرسہ مدرسہ عالیہ اور وجاہت علی کو شمار کیا ہے۔ ان کا ماخذ مولانا آزاد کا ایک بیان ہے (غالب: ص ۱۲۱، ۱۲۲ حاشیہ ۲) اس فہرست میں احمد علی مدرسہ مدرسہ عالیہ (یعنی آغا احمد علی) کا ذکر جیسا کہ ذکر کیا گیا درست نہیں۔

مدرسہ سرکار کپسٹی، مدرسہ عالیہ یا مدرسہ عالی کا اطلاق صرف موجودہ مدرسہ عالیہ یا محمدن کالج پر نہیں ہوتا تھا۔ یہ قصہ جس وقت پیش آیا اس وقت بیٹھک خانہ روڈ یا دیو پری اسکوائر کے مدرسہ عالیہ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج پر بھی اردو فارسی کے اہل قلم اپنی الفاظ کا اطلاق کرتے تھے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات اور باقی ماندہ مخطوطات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ (باقی آئندہ)

موسم بدلتے ہی چہرے بھی بدل جاتے ہیں! کیا ٹھاسوں، پٹنسیوں اور جلدی شکلیفوں کی وجہ سے؟ جب یہ شکلیفیں پیدا ہوں تو ان کو صافی کے استعمال سے فوراً ختم کیجیے

ٹھاسے، پٹنسیاں، دوسری جلدی شکلیفیں اور خسو بھی موسم کی تبدیلی سے
ہر جاتی ہیں، کیوں کہ جگر اور فعل ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور خون میں
غریبیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس موسم میں خاص طور پر صافی سے اپنے خلیوں کو صاف
کیجیے۔ صافی، خون کو صاف کرتی ہے۔ خراب مادوں کو جسم سے نکالتی ہے۔
آنسوؤں اور گردوں کو صاف کرتی ہے اور آپ کے خون کی صفائی کا سب
بہترین ہے۔ صاف خونی کا مطلب ہے صحت مند ہے۔

۶۶ جلی بوتلیوں سے تیار کی گئی صافی تیز اثر رکھتی ہے۔ جسے کدلی سے
اور ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے استعمال سے اجابت کسل نکالتی ہے اور
خون صاف ہوتا ہے۔ صافی سے خونی کی تمام غریبیاں ختم ہو جاتی ہیں۔



ہمورد

صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

بھارت کے دفاع و ترقی میں شرکت کیجئے

ساتھ ہی
7 1/4 %
سود کمائیے

۱ سالہ گنریمانہ کا قسط
3 سالہ گنریمانہ 7%
1 سالہ گنریمانہ 6%
ان کے علاوہ اور بھی اچھے قابل ٹیکس
گنریمانہ دھندلے ہوئے گنریمانہ 2000 روپے
ملاؤ گنریمانہ سود ٹیکس سے بڑی ہے

تفصیل کے لئے اپنے ملک کے سرکاری بینکوں کے منسلک
انکوائری سے پہلے ہی رابطہ کیجئے۔

بھارت
گنریمانہ

1962

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ شریفہ کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ ”لغات قرآن“ کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی آہستگی سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	”	پانچ روپے	”
جلد سوم	۳۳۷	”	پانچ روپے	”
جلد چہارم	۳۸۶	”	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	”	آٹھ روپے	نور روپے
جلد ششم	۳۳۳	”	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان، اردو بازار جامع مسجد، دہلی

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس میں طبع کر کے دفتر بہان سے شائع کیا

۱۲۵۱
مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دِلِّی کَا عِلْمِی دِی نِی مَکَاهِنَا

بُرْکَانُ

مُتَرَبِّع
سَعْدِیَا حَمْدَا کِتَابْ سَرَا بَادِی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۷۸۳۱ ہیں۔
حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی معتقہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہنہ و الزعمہ اصحاب النبوۃ اصحاب التبت اصحاب الریس بیت المقدس اور یہود اصحاب الاخذ و اصحاب الفیل اصحاب الجوہر و القرنین اور سکندری سبا و رسیل عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و معتقہ تفسیر حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت مکمل سٹاکتیس روپے۔ اجرت فی جلد فل پانچ روپے۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی

بُرہانِ دہلی

جلد: ۶۹	ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق نومبر ۱۹۷۲ء	شمارہ: ۵
---------	---	----------

- ۱۔ نظرات
مقالات
۲۹۰ سعید احمد اکبر آبادی
- ۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۹۴ سعید احمد اکبر آبادی
- ۳۔ رسول شاہد و مشہود
۳۰۸ جناب قاری بشیر الدین صاحب (رہنمائی)
- ۴۔ امام دارمی اور ان کی سنن
ایم۔ اے، نیشنل ایوارڈی شاہ جہاں پور
۳۲۴ جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب رفیق ندوۃ الدین
- ۵۔ مرزا غالب اور مدرسہ سرکار کمپنی
۳۳۶ جناب پروفیسر ابو حفصہ الکریم معصومی مدظلہ العالی
- ۶۔ غالب اور معراج الخیال
۳۴۴ ڈاکٹر شریف حسین صاحب قاسمی ایم اے
- ۷۔ ادبیات "انسان" غزل
شعبہ فارسی۔ دہلی یونیورسٹی۔
۳۴۸ جناب ڈاکٹر اسماعیل سعیدی۔ ایم۔ اے
- ۸۔ تبصرے
بی۔ ایڈ۔ پی۔ ایم ڈی۔ دہلی۔
۳۵۴ مس۔ ع

نظرات

گزشتہ ماہ کے نظرات پڑھ کر کلکتہ سے ایک دوست نے ایک عجیب و غریب خط لکھا ہے، ان کے دماغ میں جو سوال پیدا ہوا ہے، ممکن ہے کسی اور صاحب کو بھی اسی قسم کا کوئی وسوسہ ہو اس لیے موصوف کا اصل خط اور ایس کا جواب برہان میں شائع کیا جاتا ہے خط کا مضمون بعینہ یہ ہے -

”برہان اکتوبر کا پرچہ دیکھا ماشاء اللہ آپ کے زور قلم کا کیا کہنا، نظرات پڑھ کر ایک سوال دل میں آیا وہ بلا کم و کاست آپ کی خدمت میں ارسال ہے، امید ہے کہ قاری عبد المنان صاحب امام مسجد کولہوڑا اسٹریٹ کلکتہ کی معرفت مطمئن کریں گے، سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ جنہوں نے آپ کی طرح یورپ کا سفر نہیں کیا تھا ان کو فتویٰ دینے کا حق حاصل تھا یا نہیں اور دور کیوں جائیے آپ کے زمانہ میں مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا عزیز الرحمن صاحب دیوبندی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی جو اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت علماء تھے، چونکہ ان میں سے کوئی بھی یورپ نہیں گیا تھا اور قاضی ابویوسف کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا، کیا ان کو فتوے دینے کا حق پہنچتا تھا؟ ہر بانی فرما کر جواب عنایت فرمائیے، شکر گزار ہوں گے“

جواباً گزارش یہ ہے کہ نظرات کے شذرہ متعلقہ کی بنیاد دو چیزیں تھیں، ایک امام ابویوسف کا مقولہ اور دوسرا مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، آپ نے ان دونوں کو ایک کر دیا ہے۔

حالانکہ دونوں کی حیثیت الگ الگ ہے، امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ فتوے کا تعلق جن مسائل سے ہوتا ہے وہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ مسائل جن کی حیثیت اصولی اور کلیاتی ہوتی ہے۔ مثلاً عبادات کے ارکان و شرائط، ان کے فرائض اور واجبات، ان کے منہیات و مباحات اور اسی طرح نکاح و طلاق وغیرہ کے اصولی مسائل۔ اور دوسرے وہ مسائل جن میں افراد و اشخاص متعلقہ کے اور اگر مسائل زیادہ عمومی حیثیت رکھتے ہوں تو صرف افراد اشخاص نہیں بلکہ اقوام و مل کے احوال و ظروف کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے اور چونکہ ایک مفتی کو سابقہ دونوں قسم کے معاملات سے ہوتا ہے اس بنا پر امام ابویوسف نے فرمایا کہ ایک صاحب اختیار کو اس منصب کا حق ادا کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے اوصاف و کمالات سے متصف ہونا چاہئے ان میں ایک شرط معرفت احوال زمانہ کی بھی ہے۔“

اور چونکہ احوال زمانہ متغیر و متبدل ہوتے ہیں احوال کا اثر اقوام و مل اور افراد و اشخاص کے حالات پر ہوتا ہے اس بنا پر ہر عہد کے مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے عہد کے حالات کا علم ہو، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عہد اور ایک زمانہ کے مجتہدین کے احکام مجتہد فیہا دوسرے اور اس سے مختلف زمانہ کے لوگوں کے لیے حجت تو ہو سکتے ہیں واجب العمل نہیں ہو سکتے امام ابویوسفؒ نے اپنے متول میں اسی امر کی طرف توجہ دلائی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ایک بہت اہم اور ضروری حقیقت کا انکشاف کیا ہے !

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور چونکہ علامہ اقبال کے لفظوں میں ”جہانگیری کے لیے جہاں بینی شرط اول ہے“ اس بنا پر قرآن میں مختلف قوموں کے قصص بیان کئے گئے ہیں، کائنات ارض و سما میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، عہد نبوی میں روئے شہنشاہیت اور ایرانی سلطنت دنیا کی دو عظیم طاقتیں تھیں، سیرت نبویؐ اور صحابہ کرامؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ان دونوں حکومتوں اور ان کے ملک اور قوم کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے، آپ کے ہاں باقاعدہ جاسوس تھے۔ پرچہ نویس تھے اور اطلاعات و خبر رسانی کا باضابطہ انتظام تھا۔ اس موضوع پر مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

(۱) التاریخ الادبیہ از کتانی (عربی)، (۲) اسلامی حکومت کا نظم و نسق، ڈاکٹر حمید اللہ (انگریزی)، (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست، از مسٹر فضل اقبال (انگریزی) (۴) حدیث دفاع از مہاجر محمد اکبر (اردو) علاوہ ازیں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران و روم ہی نہیں جن سے عربوں کا سابقہ براہ راست تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسری قوموں (جن کو آپ نے عاجم فرمایا ہے) کے حالات سے بھی باخبر تھے۔ چنانچہ ان لوگوں میں جو اچھی باتیں تھیں ان کو آپ نے سراہا ہے اور جو بری باتیں تھیں ان کی مذمت فرمائی ہے۔ ظاہر ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا تو صحابہ کرام کی جہاں بینی کا عالم کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ دشوار نہیں ہے، مسلمانوں کے فنِ تاریخ پر عربی اور انگریزی اور فرانسیسی میں دیسوں اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہئے، سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اب رہا مولانا عبید اللہ سندھی کا ارشاد! تو چونکہ ہمارے زمانہ میں فکری، سیاسی، علمی اور معاشی و معاشرتی انقلابات جو کچھ بھی ہو رہے ہیں اور دنیا کی ہر قوم پر جن کے اثرات پڑ رہے ہیں ان کا سرچشمہ یورپ ہی ہے اس لیے مولانا کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ہم اس سرچشمہ سے واقف نہیں ہوں گے دنیا کے حالات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں گے، البتہ علم و دھڑکا ہوتا ہے، ایک بلاوا اور براہ راست اور دوسرا بلاواسطہ جو اخبارات و رسائل اور لٹریچر کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے، مولانا کا منشا یہ ہے کہ اسلام کا تقاضا ہے کہ ایک عالم دین کو ان حالات سے واقف ہونا ضروری ہے، اگر خدا توفیق دے تو براہ راست ورنہ بلاواسطہ ہی سہی، آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نامہ نویس نے چند علمائے نام لکھ کر سوال کا صغیہ دوسری طرف کر دیا ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں گفتگو ہمیشہ

اصول اور حقائق سے کرتا ہوں۔ افراد و اشخاص سے مجھ کو بحث نہیں ہوتی۔ بہر حال اسلام کو اگر آپ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا علمی مطالعہ کیجئے، محض تبلیغی لٹریچر کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔

افسوس ہے گزشتہ مہینہ ہمارے دو مخلص قومی کارکن، ملا جان محمد کلکتہ اور مولانا محمد عاقل الدہ آباد انتقال کر گئے۔ ملا صاحب کا اصل وطن پشاور تھا، لیکن عرصہ دراز سے کلکتہ میں آجے تھے اور اب پچھ مچ وہی ان کا وطن تھا، نہایت پرجوش، جری اور بیباک انسان تھے۔ گزشتہ نصف صدی میں کوئی قومی اور ملی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر اور دلولہ و عزم کے ساتھ حصہ نہ لیا ہو، ان کی علمی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا اور اختتام مجلس مشاورت پر کلکتہ میں شاید ہی کوئی مسلم ادارہ (میں ہاں تک کہ محمد ان اسپورٹنگ کلب بھی) ایسا ہو جس میں ملا صاحب نے نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔ اسی وجہ سے وہ کلکتہ کے لوگوں میں بید مقبول تھے، بڑے بے غرض بدلہ لوٹ اور نہایت سادہ اور مخلص مسلمان تھے، سنہ ۷۰ میں کلکتہ کے فسادیں لوگوں نے ان کو بچوں کی طرح پیچھے اور روتے دیکھا ہے، عمر ۸۵ سال کے قریب تھی۔

مولانا محمد عاقل الدہ آبادی دارالعلوم دیوبند کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اور استعداد بھی اچھی اور پختہ تھی، کچھ دنوں کی مدرسہ میں درس کا کام بھی کیا تھا، لیکن طبیعت کا اصل رجحان قومی اور ملی کاموں کی طرف تھا اس لیے جمیعتہ علماء سے وابستہ ہو گئے ان میں تنظیم کی بڑی اچھی صلاحیت تھی اور خاموش کام کرنے کے عادی تھے۔ جمیعتہ کی موجودہ ہیئت و تنظیم سے اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہو کر مجلس مشاورت کے سرگرم کارکن بن گئے اور ادھر بھی سر دبازی دیکھی تو مسلم مجلس میں چلے گئے اور اسی حالت میں چند ماہ بیمارہ کدوائی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں خادمان ملت کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے!

علی گڑھ سے مسلم یونیورسٹی

اسلامیائے ہند کا تہذیبی ورثہ

(۵)

از: — سعید احمد اکبر آبادی

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کو عرف عام میں مذہبیت کہتے ہیں اس میں نواب محسن الملک کا مقام سرسید سے بلند تر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں اسلامی تہذیب کے مذہبی نقش و نگار میں زیادہ نکھار پیدا ہوا، وہ اپنی تقریروں میں عمل پر ہمیشہ زور دیتے تھے اور مسلمان طلباء کو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے اور پختہ مسلمان بننے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک لکچر میں کس سوز و گداز سے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

”اگر تمہارے ذہن میں اسلام کی سچائی کا یقین نہ رہے اور تم اپنے مذہب پر قائم نہ رہو اور جیسے کہ نام اور صورت کے مسلمان ہو تو تمہارے علم سے جہل اچھا، تمہاری تہذیب سے بے تہذیبی بہتر، بلکہ چکڑو چکڑو تمہاری زندگی سے قوم کے لیے تمہاری موت اچھی، کیا خوشی ہو سکتی ہے ہم کو اس سے کہ تم عالم بن گئے، حکیم اور فلسفی ہو گئے، دنیا کے سارے علوم سیکھ لیے، یورپ کی نئی تحقیقاتوں اور یونان کے پرانے علوم میں استاد ہو گئے، مگر مطمئن نہ رہے، اور مسلمان چھوڑ بیٹھے، جب تمہارے دل میں اسلام ہی نہ رہا تو قوم تم پر کیا غرور کرے گی، تمہارا نام علماء اور حکماء کی نہرت میں دیکھ کر کیا خوش ہوں گے، تمہارے گلے میں خطباتی تمغوں کے ہار پڑے ہونے سے کیا فائدہ؟

کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو گورد میں بٹھاتا ہے جب کہ اس کی جان نکل گئی ہو، گودہ کیسا ہی خوبصورت اور پیکارا کیوں نہ ہو، بس اسلامی کردار اس درس گاہ کی اور اسلام تمہاری جان ہے، اس کے بغیر کوئی کیسا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو جائے وہ ایک مٹی میں دبانے کے قابل، اور ایک نعش ہے زمین میں چھپانے کے لائق ۱۷

موصوف جیسا دیدہ در اور بالغ منظر بزرگ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک لیڈر کو قوم کا صرف ماتم گسار اور اس کی عظمت گزشتہ کا مرثیہ خواں یا نکتہ چیں و نقاد نہیں ہونا چاہئے، جو ہر وقت قوم کے معائب و مثالب اور اس کی کمزوریوں اور برائیوں کو بیان کر کے اس کو مطعون کرتا رہے کہ اس سے قوم احساس کتری کا شکار ہو کر مٹ جاتی ہے اور اس پر بھرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی بلکہ لیڈر کا فرض یہ بھی ہے کہ قوم میں اگر کوئی جوہر قابل موجود ہے تو اس کو ابعادے اس کی تعریف کرے تاکہ اس میں حوصلہ و ولولہ عمل پیدا ہو۔ بہر حال ایک لیڈر میں شان و نذیری کے ساتھ شان بشیری کا ہونا بھی ضروری ہے، نواب محسن الملک میں یہ دونوں باتیں بدرجہ اتم تھیں، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے حیدرآباد میں جو لکچر دیا تھا وہ کتا بی صورت میں اسی زمانہ میں چھاپ دیا گیا تھا۔ اس کی ایک کاپی اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اسی کو ملاحظہ فرمائیے، سبحان اللہ کیا عجیب و غریب لکچر ہے، فاضل مقرر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے حقائق اور جذبات دونوں کو باہم مدگرایا ہم آہنگ بنایا ہے کہ پورا مضمون قوس قزح کی دھنک معلوم ہوتا ہے ایک مقام پر مسلمانوں کے موجودہ آلام و مصائب کو بیان کرنے کے بعد خود ایک سوال اٹھاتے ہیں: ”تو پھر اسلام جواب نام کو باقی ہے کیا وہ بھی نہ رہے گا؟ اور پھر خود اس کا جواب کس قوت اور جوش و خروش سے دیتے ہیں۔ افسوس ہے ان سطور کے دیکھتے وقت تھوڑی بہت جستجو کے باوجود محسن الملک کے خطوط، مضامین اور لکچروں کا مجموعہ دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے محسن الملک کے سلسل میں اگر کوئی اور حوالہ نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اردو ڈائجسٹ ہمارے مسلم یونیورسٹی نمبر سے ماخوذ ہے۔

سے دیتے ہیں! فرماتے ہیں:-

”كَوَاللّٰهِ، كَوَاللّٰهِ، كَوَاللّٰهِ، وَالَّذِي نَفْسِيْ بِيَدِهِ، هُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ

مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ“ وهو الولي الحميد، ہم اگرچہ بیمار ہیں مگر ابھی مرے نہیں، گو ابھی ضعیف ہو گئے مگر ابھی دم نہیں توڑا۔ داغوں کی قوت، دلوں کا جوش و طبعیتوں کا دلولہ بلاشبہ بہت کم ہو گیا ہے، مگر ابھی باقی ہے، وہ دل کو ہلا دینے والی آواز ”الذکر“ کی جو ہمارے بزرگوں کے منہ سے نکلتی تھی، اگرچہ سست پڑ گئی ہے، مگر کانوں میں اب تک گونجتی ہے، وہ خوبصورت تصویر اسلام کی جو ہمارے باپ دادا نے کھینچی تھی اور جس نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور فریفتہ کر لیا تھا۔ اگرچہ نقاب میں چھپ گئی ہے، مگر ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی، وہ ابراہیمی خون جو ہماری رگوں میں دوڑتا ہے بھرتا تھا، اگرچہ دھیمبا پڑ گیا ہے مگر ابھی جاری ہے، وہ ہاشمی جوش جو ہمارے سینوں میں بھرا ہوا تھا، اگرچہ سست ہو گیا ہے مگر ابھی باقی ہے، وہ نور اسلام جس سے ہمارے دل روشن تھے، اگرچہ دھندلا ہو گیا ہے مگر ابھی سمجھا نہیں، اب بھی اسلام کی حرارت اس قدر باقی ہے کہ اسلام کا نام سن کر وجد میں آجاتے ہیں، مذہب کا جوش اب تک اتنا ہے کہ دین کی آواز سنتے ہی چونک پڑتے ہیں، اور یہی دلیل اس بات کی ہے کہ اسلام ابھی باقی ہے اور مسلمان ہنوز زندہ ہیں، اور جب تک زندگی ہے، ہر طرح کی امید ہے (ص ۱۲، ۱۳)

فرقہ پرستی سے دور رہنے کی تاکید | جس طرح کوتاہ منظر آج یونیورسٹی کو فرقہ پرستی کا الزام دیتے ہیں، اسی طرح محسن الملک کے زمانے میں بھی گاہے بگاہے اس قسم کی آوازیں کالج کے خلاف بلند ہوتی رہتی تھیں اور جیسا کہ

لے ترجمہ:- سجدنا نہیں، سجدنا نہیں، سجدنا نہیں، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم! وہ تو وہ ہے جو لوگوں کے مالوس ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے اور یہی ہے کارساز مطلق اور لائق حمد

آگے چل کر ہم مفصل گفتگو کریں گے، علی گڑھ کالج ہندو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں غار کی طرح کھٹنے لگا تھا اور وہ موقع بموقع اس کا اظہار کرتے رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود کالج کا معاملہ کیا تھا؟ اس کا اندازہ اس ایک خطاب سے ہو گا جو نواب محسن الملک نے ایک مرتبہ طلباء سے کیا تھا، اس میں آپ نے فرمایا۔

”اے میرے عزیز بچو! کبھی ایسے خیال کو (فرقہ پرستی) تم دل میں نہ لانا، کبھی ایسی بات کو جس سے جھگڑا پیدا ہو نہ سنو، ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو، ان کے بزرگوں کو عزت اور ادب سے یاد کرو۔ ان کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ۔۔۔۔۔ ان کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ کرو جس سے وہ خود شرمندہ ہوں، وہ تمہارا تحمل اور تمہاری دوستی دیکھ کر تمہاری قدر کریں، وہ تمہارے بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنے لگیں اور بجاتے ہدی کے نیکی کا ترلو دیکھ کر وہ خود اپنے طرز عمل کو بدلنے پر مجبور ہوں، یہ انصاف کی بات نہیں کہ تم اپنے آپ کو معصوم اور پاک سمجھو اور اختلاف کے سارے گناہ کا الزام ہندوؤں کو دو، تم اسی کالج کے نیک نام طالب علم اور سرسید کے سچے مقلد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت سمجھے جاؤ گے جب کہ تم اپنے ہم وطنوں اور اپنے بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کرو اور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو، ان ناقص تعلیم یافتوں کو نہ دیکھو جو اختلاف پیدا کرنے کے خواہاں ہیں، بلکہ ان علما و ماخض ہندوؤں کی باتیں سنو جو اتحاد اور اتفاق بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

غور کیجئے! کیا نواب محسن الملک کی یہ تقریر بعینہ قرآن مجید کی حسب ذیل ان آیات کی ترجمان نہیں ہے جن میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ تمہارے مخالف ہیں ان کے ساتھ بخیر و بیکار ایسے طریقہ پر کرد جو سب سے بہتر ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارا کٹر دشمن بھی تمہارا اپکا دوست بن جاتے، اس کے بعد اس پر بھی متنبہ فرمایا گیا کہ یہ راستہ اختیار کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، چنانچہ ارشاد ہوا۔ اور ہاں! اس راہ کو وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو میر کے خور ہوتے ہیں اور جو لوگ بڑی قسمت والے ہوتے ہیں، اسی کے قریب المفہوم وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

”ہاں دیکھو کسی قوم کا بغض تم کو عدل و انصاف کے جادہ سے منحرف نہ کر دے، تم بہر حال عدل ہی کرو۔ پر سیرگاری کا قریب ترین راستہ یہی ہے۔“
ایک اور موقع پر نواب محسن الملک نے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-
”دوسروں پر الزام رکھ دینے سے کام نہیں چلتا ہے، یاد رکھو تم ہرگز سرسید کے پیروں نہ سمجھ جاؤ گے اور نہ تم تعلیم یافتہ کہلاتے جانے کے مستحق ہو گے اگر تم نے (فرق پرستی نہ کی) اس زہریلے مادہ کو اپنے جسم میں سرایت ہونے دیا اور تم نے سبھی ہندو مسلم میں فرق سمجھا، اگر تم ایسا کر دو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا، بلکہ تمہاری ساری قوم کو ہوگا اور نہ صرف تم بدنام ہو گے، بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہوگا، اور ہم پر اس کا الزام آئے گا۔ مجھے نہایت روحانی تکلیف ہوتی ہے جب میں بعض اخباروں میں پڑھتا ہوں کہ علیگڑھ پارٹی متعصب ہے اور اس کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندوؤں کے مخالف ہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے، اگر اس کا خیال یا عمل اس پر ہو تو میں بوجھتا ہوں کہ یہ سبق تم کو کس نے سکھایا؟ کیا مرحوم سرسید نے؟ اور کیا ہم نے؟ حاشا وکلانہ سرسید اور نہ ہم اس کے لازم ہیں، بلکہ برخلاف اس کے ہم نہایت حقارت و نفرت سے ایسی باتوں کو دیکھتے ہیں۔“

جس کو ہم تہذیب کہتے ہیں وہ دراصل نام ہے زندگی اور کائنات کے متعلق ایک مخصوص نقطہ نظر اور اس کے مطابق اپنے کردار کو بنالینے کا، اس بنا پر اسلامی تہذیب کے معنی ہوتے کہ زندگی اور کائنات کی نسبت وہ عقیدہ اور نقطہ نظر رکھنا جو اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہو اور جو اس کے مطابق اپنا کردار بنانا، محسن الملک نے یہ جو فرمایا قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید اور ان کے جانشین علیگڑھ کالج (اور اب دہلی یونیورسٹی) کو جو اسلامی تہذیب کا نمائندہ بنا اچا ہتے تھے وہ فرقہ پرستی سے اور ملکی و وطنی معاملات میں ہندو مسلم

کے فرق و امتیاز سے کس درجہ نفور اور بلند تھی، سرسید پر فرقہ پرستی کا الزام سب سے پہلے ان کی کانگریس کی مخالفت اور بعض شخصی طور پر ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے لگا، لیکن ان معاملہ میں بھی انہوں نے اپنا دامن فرقہ پرستی کی گندگی سے اکودہ نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور مورخ اور کیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف لکھتے ہیں :-

آپ سرسید کو رجعت پرست کہہ سکتے ہیں، مگر فرقہ پرست کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے۔“
(علی گڑھ تحریک ص ۱۸)

اس معاملہ میں جو کچھ سرسید کا تھا وہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ان کے جانشین کا تھا۔ اگر ان تمام تقریروں کے باوجود وہ فرقہ پرست تھے تو ہم بڑے خوش ہوں گے اگر ہمارے یہ دوست پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے، ساورکر یا کسی اور بڑے جہاں سہائی یا جن سنگھی لیڈر کی بھی کوئی ایسی تقریر پیش کر سکیں جس میں صرف ہندو طلباء سے خطاب کرتے وقت مسلمانوں کی نسبت اسی قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا گیا ہو۔

لیکن ابھی سرسید کے انتقال کو دو برس ہی ہوئے تھے

پھر وہی ہندی اردو جھگڑا

اور نواب محسن الملک ہر چیز سے صرف نظر کر کے کابل

کو ترقی دینے اور اس کی گزشتہ گونا گویوں کی تلافی کرنے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف تھے کہ انہیں دونوں میں سرانٹونی ملکہ انڈیا کی گورنمنٹ نے اتر پردیش میں یہ حکم نافذ کیا کہ حکومت کے تمام نمٹن اور اعلانات آئندہ اردو اور ناگری حروف میں جاری ہوں گے اور کوئی شخص کسی عہدہ پر اس وقت تک مقرر نہ ہوگا جب تک وہ ان دونوں میں سرعت کے ساتھ بے تکلف لکھنے کی ہمارت نہ رکھتا ہو۔ گورنمنٹ کے اس حکم نے مسلمانوں میں سخت بددلی پیدا کر دی اور اس کے اظہار کے لیے انہوں نے جگہ جگہ جلسے منعقد کئے۔ اخبارات نے پے پے مضامین شائع کئے، علی گڑھ اس وقت مسلمانوں کی قیادت کا مرکز تھا۔ اس کے لیے دامن بچانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بقول مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری

کے ایک موبدانہ مگر پرزور اسپیش ناگرتی کے اجراء کے خلاف کی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تائید سے ایک رزولوشن اس مضمون کا پیش کیا کہ گورنر سے اس حکم کو واپس لینے کی درخواست کی جائے اس کے بعد ۱۸ اور ۱۹ اگست کو ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا، اب نواب محسن الملک اردو تحریک (جو بعد میں انجمن ترقی اردو بنی) کے صدر بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے اس حیثیت سے انہوں نے اس جلسہ میں بھی ناگرتی کی مخالفت میں بڑی معرکہ آراء تقریر کی۔ حکومت ان کی پچھلی تقریر سے ہی کچھ کم بالا نہ تھی کہ اب اس دوسری تقریر نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ چنانچہ لفٹنٹ گورنر خود علیگڑھ آیا۔ کالج کے ٹرینیوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ "نواب محسن الملک دونوں کام نہیں کر سکتے یا وہ علیگڑھ کالج کے سکریٹری رہیں یا انجمن اردو کے صدر، نواب محسن الملک کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً کالج کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا، حکومت کو اس پر اور ناراضگی ہوئی اور دوسری جانب ٹرینیوں نے بھی بہت امر کر دیا لیکن نواب محسن الملک نے استعفا واپس نہیں لیا۔ البتہ وقار حیات کے مصنف مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی لکھتے ہیں:۔ ابھی یہ مسئلہ (یعنی استعفا واپس لینے نہ لینے کا) زیر بحث تھا کہ منگڈ اللہ کا دور حکومت ختم ہو گیا اور سر جس لائوشن کے جانشین ہوئے۔ ان کو کالج سے اور مسلمانوں کی ترقی سے یک گو نہ لپٹی تھی، ان کے عہد میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا۔ آخر سر جس خود علیگڑھ آئے اور وہاں جب انہوں نے ٹرینیوں اور نواب محسن الملک کو اس بات کا یقین دلایا کہ گورنمنٹ کسی کی آزادی سلب نہیں کرے گی تو نواب صاحب نے استعفا واپس لے لیا اور پھر کالج کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، یہ واقعہ نواب صاحب کی خود طری، عزت نفس اور حق گوئی کی دلیل روشن ہے، اسلامی تہذیب اور اسلامی کردار کے معاملہ میں سبھی ان کے تشدد کا یہ عالم تھا کہ کالج میں بائبل کی تعلیم کا جو سلسلہ وہاں کے مقامی مشنریز نے شروع کیا تھا، نواب محسن الملک نے اس کو حکماً بند کرا دیا، مشنری خواتین نے اس کی مزاحمت کی مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

نواب محسن الملک کی زندگی کا عظیم کراسس | تعلیم اور ڈپلن کے اعتبار سے کالج

کے یورپین اسٹاف نے جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف نہ کرنا ناپاسی ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انتظامی اعتبار سے یہ اسٹاف سانپ کے منہ کا چھوڑ بن گیا۔ اس سے دامن بھڑانا آسان تھا اور نہ اس کے ساتھ نباہ کرنا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، سرسید کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ جس نے ان کا کام ہی تمام کر دیا اسی یورپین اسٹاف کے باعث پیش آیا تھا اور اب اس واقعہ کے کم و بیش دس برس کے بعد پھر اسی قسم کا ایک عظیم حادثہ نواب محسن الملک کو پیش آیا۔ وقار حیات کے میان کے مطابق اس واقعہ کی روئداد یہ ہے کہ ستمبر ۱۹ء میں جب بعض وجوہ سے پرنسپل مارلین نے علیگڑھ کو چھوڑنے کا ارادہ کیا اور کالج کے ٹرسٹیوں نے اس کو منظور بھی کر لیا تو اب پرنسپل مارلین نے اپنی قائم مقامی کیلئے خود ایک سینئر پروفیسر مسٹر کارنا کا نام پیش کیا۔ نواب محسن الملک اس انتخاب سے خوش نہ تھے، لیکن بعض مجبوریوں کے باعث انہوں نے اس سفارش کو منظور کر لیا تھا، لیکن کارنا ایک نہایت بد دماغ اور تند خور انگریز تھا۔ مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی تعطیل جو کالج میں ہوتی تھی اس کو اس نے بند کر دیا تھا، غرض کہ مسٹر کارنا سے متعلق اسی قسم کی باتیں پبلک میں مشہور تھیں۔ اس بنا پر جب مارلین کے بعد اسی شخص کی نامزدگی کا پھر چارپبلک میں ہوا تو آگ لگ گئی، اخبارات نے مضامین لکھے، مختلف انجمنوں نے احتجاجی جلسے کئے، اس مخالفت میں نواب وقار الملک نے قائدانہ رول ادا کیا۔ انہوں نے ایک مفصل خط ٹرسٹیوں کے نام لکھا اور اس میں بتایا کہ سرسید کا کالج قائم کرنے سے اصل مقصد کیا تھا اور اب تک ایک سینئر پروفیسر کی حیثیت سے مسٹر کارنا کا جو طرز عمل کالج کے طلباء، ملازمین اور کالج کی رعایات کے ساتھ رہا ہے اس سے سرسید کے مقصد کو کس درجہ عظیم نقصان پہنچا ہے، نواب صاحب نے اس گشتی مراسلہ میں کارنا کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ اس شخص کی بددماغی کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ بورڈنگ ہاؤس کے ملازموں سے کہا کہ تمہاری عشا اور صبح کے وقت کی افان سے محکوم بہت تکلیف ہوتی ہے، اگر تم اس کو بند نہ کرو گے تو میں تمہاری نماز کا چوتراہ اکھاڑ کر پھینکوا دوں گا، اسی شخص نے ایک مرتبہ غصہ میں کہا، ”مسلمانوں کے لیے تو انگریزی کی بجائے

نعلبنندی کی تعلیم زیادہ مفید ہوگی، سربراہ آدرہ اور ممتاز حضرات میں مولانا حالی نواب وقار الملک کی رائے کے سیکے بڑے مؤید تھے، ہسٹر کارنالی نسبت جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو اب تعجب اس پر ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک جیسا مذہبی، خوددار اور غیر متمذربزرگ کارناجیے اسلام دشمن اور مغرور و بددماغ انگریز کو کالج کا پرنسپل بنانے پر کیسے رضا مند ہو گیا؟ اس سلسلہ میں امور ذیل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(۱) اگرچہ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک دونوں قوم کے نہایت مخلص خادم اور عقیدہ و عمل کے اعتبار سے بچے اور بچے مسلمان تھے، لیکن افتاد طبیعت کے اعتبار سے دونوں میں یوں بعید تھلہ چنانچہ نواب محسن الملک کی سکرٹری شپ کے زمانہ میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے کوشش کی کہ نواب وقار الملک بھی نواب محسن الملک کے ساتھ مل کر کام کریں تو اعلیٰ الذکر نے صاف انکار کر دیا اور اس کی وجہ بھی بتائی کہ میں نواب محسن الملک کے ساتھ کام نہیں کر سکتا، صاحبزادہ موصوف کو اپنی تجویز پر اصرار اس لیے تھا کہ — جیسا کہ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی نے ”وقار حیات“ کے مقدمہ میں نقل کیا ہے (ص ۱) — ان کی رائے تھی ”محسن الملک تیل ہی تیل ہیں“ وقار الملک لوہا ہی لوہا، جب تک دونوں نہ ملیں کالج کی مشین نہیں چل سکتی“ لہ

لہ اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اختلاف کہاں نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اوطان دونوں کا اختلاف بعض مسائل میں سرسید کے ساتھ اور پھر ان دونوں کا اختلاف آپس میں کچھ بھی تھا غلوں اور نیک نیقی پر مبنی تھا اس بنا پر یہ اختلاف کبھی خلاف نہیں بنا اور ایک دوسرے کے ساتھ ذاتی ادب و احترام کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا، چنانچہ سرسید اور نواب وقار الملک کے اختلاف کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ لکھتے ہیں کہ ”نواب وقار الملک کے انتہائی عروج حیدرآباد کے زمانہ میں ایک بچہ اکابر نے یہ سہا دیکھا کہ وقار الملک کی ترکی ٹیپ ان کے ہاتھ میں ہے، گٹھا ہا سرسید کے (باقی اگلے صفحہ پر)۔

(۲) کالج کے یورپین اسٹاف میں سب لوگ ایک ہی مزاج اور طبیعت کے نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس اسٹاف کے بعض ناپسندیدہ لوگوں کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھایا جائے تو یہ دیکھنا ضروری تھا کہ حکومت پر اس کا اثر کیا ہوگا؟ حکومت قومی یا جمہوری تو تھی نہیں، آمرانہ تھی، اگر کالج حکومت کا معتبہ ہو جائے تو لوگوں کو

(بقیہ صفحہ ۳۴) سامنے جھکا ہے۔ زبان سے کہہ رہے ہیں "یہ سر حاضر ہے جوتیاں مار لیجئے، مگر عرض یہی کروں گا کہ رائے آپ کی غلط تھی۔ (ص ۱۰) اسی طرح یہ بھی سن لیجئے کہ نواب وقار الملک کے سخت اختلاف کے باوجود جب ایک اخبار کے نامہ نگار نے نواب محسن الملک سے انٹرویو لیتے ہوئے ان سے اس اختلاف کی وجہ پوچھی اور ساتھ ہی اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ نواب وقار الملک سکریٹری شپ کے خواہاں ہوں گے تو نواب محسن الملک نے نہایت صفائی اور بڑی قوت سے فرمایا۔ "بہت تعنائے جبریت مجھے اس کا رنج ہوا ہے، مگر میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا تو کیسا ہی سخت لکھا ہے مگر ذاتی مخالفت یا رنج کی وجہ سے نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے نزدیک قوم اور کالج ہی کے فائدہ کی غرض سے لکھا ہوگا۔ اس لیے میں ان کی گالیوں کو بھی ان کی نیک نیت پر خیال کر کے اپنے لیے تنبیہ اور ہدایت سمجھتا ہوں" (وقاریات ص ۴۴)، رہا یہ خیال کہ وقار الملک خود سکریٹری بننے کے خواہشمند ہیں تو اس کی پر زور تردید کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے فرمایا: "وہ کبھی سکریٹری ہونے کے خواہاں نہیں ہیں، اگر کوئی ایسا وقت آج بھی جائے کہ لوگ ان کے سکریٹری بننے کے لیے ہمارے دروازے پر آئیں تو شاید بہت ہی مجبوری اور کالج کی ہمدردی کے خیال سے وہ منظور کر لیں، ورنہ میں کو سکریٹری شپ کے منظور کرنے میں مذبذب ہوگا۔ اور یہ معضلہ میرا خیال ہی نہیں ہے۔ بلکہ پچھلے واقعات سے اس کا تین ثبوت ملتا ہے۔ مجھے رنج ہوتا ہے جب لوگ ایسی بدگمانی ان کی نسبت مشہور کرتے ہیں۔ (ص ۴۶) یہ پڑھتے وقت یہ امن میں متلاطم رہے کہ اس ناز میں علی گڑھ کالج کا سکریٹری پہلی قوم کا سربراہ ہوتا اور ملت اسلامیہ کا نہایت قابل احترام بزرگ سمجھا جاتا تھا، ہر حال آپ نے دیکھا! علی گڑھ جس اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اور میں بزرگوں نے اپنے خونِ جگر سے اس چمن کی آبیاری کی ہے وہ اخلاقی اعتبار سے کس رتبہ و مقام بلند کے بزرگ تھے۔"

سرکاری ملازمت کا ملنا اور مسلمانوں کے لیے ترقی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی قسم کے مواقع کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نگرانی ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص دو مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے تو ان دونوں میں جو آسان مصیبت ہو اسے اختیار کر لے، جھوٹا کایہ ارشاد اس درجہ اہم ہے کہ ہمارے فقہاء نے استنباط و استخراج احکام کے اصول میں اس کو بھی شامل کر لیا ہے اور اس کی اساس پر متعدد احکام وضع کیے ہیں جو کتب فقہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۳۱) پرنسپل مارین جنہوں نے پروفیسر کارنا کے نام کی سفارش کی تھی انگریزوں کے صدر درجہ معتمد علیہ اور لفٹننٹ گورنر آفس لوی کے فاس دوست تھے اس بنا پر ان کی تجویز کو کيسر نظر انداز کر دینا اچھے نتائج کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔

(۴) پروفیسر آرنلڈ جو علی گڑھ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے تھے، نہایت شریف اور قابل قدر انگریز تھے، نواب محسن الملک نے اب ان کو پرنسپل کے عہدے پر بلا ناچا مگر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

(۵) کارنا یقیناً مغرور اور بد ریاغ انگریز ہو گا۔ لیکن جو باتیں نواب وقار الملک نے اپنے خط میں اس کی طرف منسوب کی ہیں وہ بالذات سے خالی نظر نہیں آتیں، خدا سزا ستر یہ بات نہیں کہ نواب صاحب نے دروغ بیانی کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جماعت میں نیک نام ہو یا بد نام تو کچھ باتیں جو اس کی طرف منسوب ہوتی ہیں، حقیقت ہوتی ہیں اور کچھ یوں ہی غلط اسلط اس کے متعلق مشہور ہو جاتی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ کبھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اور ان کی نسبت کارنا کے وہ الفاظ اور مسلمانوں کی توہین و تذلیل میں اس کا وہ جسد ! طبیعت ہرگز یاد نہیں کرتی کہ کوئی شخص علی گڑھ کے اس ماحول میں اس طرح کی بد تمیزی کسے اور بچا پسند سلامت لے جائے، یہ انہونی سی بات ہے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ

ہو گا کہ نواب وقار الملک کی سخت مخالفت کے باوجود اگر نواب محسن الملک مسٹر مارین کی سفارش کو منظور کرنے پر رضامند ہو گئے تھے تو محض بادل خواستہ اور کالج کے مفاد اور اس کی غرض و غایت کے پیش نظر، ورنہ دل سے پروفیسر کارنا کو وہ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ نواب وقار الملک بھی اس مصلحت اندیشی سے بے خبر نہیں تھے، چنانچہ وہ ایک خط میں جواہروں نے اس سلسلہ میں مولانا کمالی کو لکھا ہے۔ تحریر کرتے ہیں :-

”جناب نے جو کچھ کہ ازراہ دراندیشی فرمایا ہے وہ ضرور قابلِ غور ہے اور اس کے علاوہ عالی جناب نواب محسن الملک بہادر جو ایک بات فرماتے ہیں وہ بھی تو مجھ کے قابل ہے، اور وہ یہ کہ اگر یورپین اسٹاف ہم سے بد دل ہو جائے اور انگلستان اور ہندوستان میں اس کا فائل مچائے کہ علی گڑھ کالج میں کوئی قاعدہ و اصول باقی نہیں ہے اور ستر حاکموں کی حکومت وہاں برداشت کرنی پڑتی ہے تو سچر آئندہ کسی پروفیسر کا میسر آنا بھی مشکل ہے، (وقار حیات ص ۴۲۹-۴۳۰)

لیکن اسی احساس اور نواب محسن الملک کے دلیں جو خطرات تھے ان کی واقفیت کو تسلیم کرنے کے باوجود فرماتے ہیں :-

”اگر یہ خطرات سب صبح ہیں تو بکرے کی مال کب تک خیر منائے گی، ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے“ (ص ۴۴۲)

بہر حال نواب وقار الملک کی جدوجہد اور ان کے پرزور اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر مارین اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے، اور پروفیسر کارنا کے سہجائے مسٹر آرچر ہولڈ پر نپل مقرر ہو گئے۔ اس طرح رسیدہ بود بلاتے ولے سنجیر گزشت :-

اس وقت تو خیال یہ معاملہ رفت و گذشت ہو گیا، لیکن اب کالج

کالج میں سٹراٹک | کالج میں اسٹاف پہلا سا رہا ہی نہیں تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شرشہ چھوٹتا رہتا تھا۔ مولانا اندیشی اندیش رہا تھا۔ آخر ایک دن یہ لاما چھٹ پڑا۔ طلباء

نے جب اپنی شکایات پیش کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ پرنسپل کی خدمت میں سمیجا تو پرنسپل نے اس کو ہاسٹل سے خارج کر دیا۔ اس سے طلباء میں آگ لگ گئی اور انہوں نے اسٹراٹمک کر دی، اسٹراٹمک کے وجہ و اسباب کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ جس کے ایک ممبر نواب وقار الملک بھی تھے۔ انہوں نے کمیشن کی رپورٹ کے علاوہ اپنی ایک رپورٹ الگ بھی مرتب کی، اس رپورٹ کا حاصل یہ تھا کہ سکریٹری نے یورپین اسٹاف سے متعلق جو نرم رویہ اختیار کر رکھا ہے، یہ سارا فساد اسی کا ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”بہت عرصہ سے ہم سنتے چلے آئے ہیں کہ فلاں معاملہ پر اس لیے زور دینا مناسب نہیں کہ کہیں یورپین اسٹاف بدول ہو کر کالج نہ چھوڑ دے اور اب طلباء کی اس حال کی شورش سے ہمارے لیے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوتی ہے کہ کہیں طلباء اسٹراٹمک نہ کر دیں، اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیے..... اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو، ہم کو تیار رہنا چاہیے۔“

نواب محسن الملک پر اسٹراٹمک اور اس سلسلہ میں جو باتیں ان کے انتظام اور ان کی پالیسی سے متعلق کہی گئی تھیں ان سے متاثر ہو کر ۱۱ مارچ ۱۹۷۶ء کو سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا۔

وقایع یہ خبر مشہور ہوئی تو ملک میں شور مچ گیا، ہر طرف سے خطوط آنے لگے کہ آپ کالج سے ترک تعلق رکھتے ہیں تو آخر اسے کس پر چھوڑتے ہیں۔ اور طلباء کو بھی اس کا سخت طاعن ہوا اور انہوں نے استعفا واپس لینے کی درخواست کی۔ نواب صاحب اس پر رضامند تو ہو گئے اور استعفا واپس بھی لے لیا، لیکن اس سلسلہ میں ان کو جو سخت ناگوار باتیں سننی پڑی اور ان کے باعث یہ ہم صدمات دیکھنے پڑے تھے انہوں نے جان پینا لای

وہ سخت بیمار ہو گئے۔ صحت کی بحالی کے ارادہ سے شملہ گئے تھے وہیں ستمبر ۱۹۷۷ء کو رگزلے کاظم جادوانی ہو گئے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

اس کے بعد کچھ دنوں نواب سر زلی اللہ نواب قار الملک کا عہدہ سکرٹری شپ

خاں قائم مقام سکرٹری رہے، لیکن یہ عارضی اور وقتی انتظام تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فوراً کوئی مستقل انتظام کیا جائے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کا جو وید منسٹرین کا پسندیدہ اور وسیع تجربہ رکھتا ہو اور جس میں اس امر کی صلاحیت ہو کہ مختلف اسباب و وجوہ کے باعث کالج کی کشتی اس وقت جن ناگوار حالات کے گرداب بلا میں پھنس چکی تھی اس سے وہ اس کو باہر نکال سکے، ظاہر ہے، اس وقت ان صفات کا جامعہ رنگین نواب قار الملک کے قامت موزوں کے علاوہ اور کس کے راست آسکتا تھا۔ چنانچہ ۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو کالج کے ٹریڈوں کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا اور اس میں ممدوح تنقہ طور پر حسب ضابطہ دستورین برس کے لیے سکرٹری منتخب ہو گئے۔

مولانا سید محمد وج قادری کی زیادت نکلتے

کامطالعہ کیجیے۔
”زندگی“ رام پور جو ۲۶ سال سے برابر پابندی سے شائع ہوا ہے

- جس کے بین الاقوامی، ملکی، ملی اور دینی حالات پر اشارات
 - دماغوں کو روشن اور دلوں کو جذبہ عطا کرنے والے دعوتی اور علمی مضامین
 - حالات حاضرہ پر تبصرے • سوالوں کے جوابات • کتابوں پر تنقید و تبصرے۔
- آپ کو اور آپ کے متعلقین کو معلومات بھی پہنچائیں گے اور آپ کے دلوں میں بین کی خدمت کا جذبہ بھی بیدار کریں گے۔
- آج ہی سالانہ چنڈا = ۱۰ روپے بیکر سال بھر گھر بیٹھے حاصل کیجیے یا قریبی اجنبی سے طلب فرمائیے
- منیجر ماکہ فامہ ”زندگی“ رام پور یو پی

رسول شاہد و مشہود

(۳)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب ہنڈت - ایم۔ اے)

یہودیوں کی حجاز میں آمد :- بیت المقدس کی دوبارہ تباہی و بربادی کے بہت سے یہودی قبائل یثرب (حجاز) کی طرف چلے آئے۔ انھوں نے حجاز کی سرزمین کو کیوں پسند کیا کہ جہاں خوردنوش کی قلت، زمین بے آب و گیاہ تھی اور آب و ہوا بھی بمقابلہ عراق و شام اور مصر ناخوشگوار تھی تو اس میں بھی ایک راز ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تورات پر نظر ڈالے جس میں صراحت کی گئی ہے کہ ”وہ نبی“ جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو پھر تازہ کرے گا وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں (یعنی بنی اسمعیل) میں سے ہوگا۔ یثرب میں آئے گا اور یاس کا دارالہجرت بنے گا۔ مدینہ کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے شمال میں جبل احد، مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں وادی مدینہ ہے تو ریت کے الفاظ میں :-

”خداوند کے لئے اے لوگو گیت گاؤ..... بیابان اصفہار کے گاؤں اپنی آواز بلند کریں۔ صلے کے لئے وائے گیت گائیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں..... خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا۔ غیرت دکھائے گا۔ نعرہ مارے گا۔ وہ دشمنوں پر غالب آئے گا،“

(ما حفظ ہو یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۱۰-۱۱)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد نبی اکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس نے مشرکوں سے جہاد کیا ہو اور فتح پائی ہو۔

پھر یہ نبی قیدار کون؟ کہاں رہتے ہیں؟ جبلِ سلع کس جگہ واقع ہے؟ ظاہر ہے کہ ان سب کا تعلق سرزمینِ حجاز سے ہے اس لیے آئیہوالا پیغمبر بھی حجاز ہی میں مبعوث ہو گا۔ اس نبی منتظر کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ”میں اُن کے لئے (بنی اسرائیل کے لیے) ان ہی کے مجاہدوں میں سے ایک نبی پر پا کر دوں گا“ (استشباب ۱۸) یہ نہیں کہا کہ ”ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے بر پا کر دوں گا“ افسوس ہے کہ یہودی علماء نے عوام کو اس وسوسہ میں گرفتار کر دیا کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہِ سلع کے قریب بتایا گیا ہے۔ مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں ہو گا۔ ”بھائیوں کے لفظ سے دھوکے میں پڑ گئے حالانکہ بنی اسمعیل کا شمار بھائیوں میں ہے۔ بہر حال یسعیاہؑ کی پیشینگوئی نے سمجھدار یہود کو توجہ دلائی کہ وہ فلسطین سے ہجرت کر کے جبلِ سلع کے قریب آسکیں کہ جہاں ”موجود نبی“ کا ظہور ہو گا چنانچہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کو انھوں نے اپنا مسکن بنا لیا۔ یہود کو قدرت نے یہ تیسرا موقع دیا تھا کہ وہ آنحضرتؐ پر ایمان لاکر دینی و دنیوی سعادتیں حاصل کریں۔ حضور نبی کریمؐ کی بعثت کی خوشخبریاں یہودی علماء و اہلِ ایمان مدینہ کو سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ تشریف لائے تو متحرف ہو گئے کیوں؟ اس کی داستان طویل ہے البتہ جنہوں نے پہچانا چاہا وہ پہچان گئے۔ فرقانِ حمید میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے: ”الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَكْفُرُونَ بِمَا كُفِّرُوا عَنْهُ أَوَّلًا هُمْ ۖ وَإِنْ فَزَعْنَاهُمْ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنُعَذِّبَنَّهُمْ بِالْحَقِّ ۖ وَهُمْ يُعَذِّبُونَ“ یعنی جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ اور بیشک انہیں ایک گروہِ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔ (پارہ ۲ رکون ۱)

کتاب سابقہ میں نبی آخر الزماں حضور سپہِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ ایسے واضح و صاف بیان کئے گئے ہیں جن سے علماء اہل کتاب کو حضورؐ کے خاتم الانبیاءؑ ہونے میں کچھ شک و شبہ باقی نہیں رہ سکتا اور وہ حضورؐ کے اس منصبِ عالی کو اتم یقین کے ساتھ جانتے ہیں۔ احبارِ یہود مدینہ میں سے جب ایک مستند و جید عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ

مشرق باسلام ہوئے تو سیدنا عمرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ آیۃ یحیٰ قوتہ میں جو فقرت بیان کی گئی ہے اس کی کیا شان ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اسے عمرؓ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بے اشتباہ پہچان لیا اور میرا حضور کو پہچاننا اپنے بیٹوں کے پہچاننے سے بدرجہا زیادہ اہم و اکل ہے حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیسے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور اللہ کی طرف سے اس کے فرستادہ رسول میں اُن کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے ہماری کتابِ توریت میں بیان فرمائے ہیں بیٹے کی طرف سے ایسا یقین کس طرح ہو جبکہ عورتوں کا حال صرف انھیں تک محدود ہے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سر جھوم لیا۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ کنز الایمان ص ۲۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں متعدد جگہ تعارض کے طور پر فرمایا ہے کہ علماءِ توریت و انجیل پر ”میثاق البینین“ کے بموجب یہ واجب تھا کہ وہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرنے والے دلائل کو عوام الناس پر اچھی طرح شرح و مفصل طور پر واضح کریں اور انھیں سمجھائیں اور ہرگز نہ چھپائیں (ملاحظہ ہو پارہ ۴ رکوع ۸، پارہ ۵ رکوع ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰

کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے اللہ نے نوحؑ کو دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا، (پارہ ۲۵ رکوع ۳) مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے (جو شرع انبیاء میں سب سے پہلے نبی ہیں) آپ تک اے سید انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جتنے انبیاء ہوئے سب کے لئے ہم نے دین کی ایک ہی راہ مقرر کی جس میں وہ سب متفق ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا ”وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً“ (پارہ ۱۸ رکوع ۴) اور بے شک یہ تمہارا دین (دین اسلام) ایک ہی دین (سب دینوں کا نام نہ ہے) دسی کو مانو اور اسی کے احکام کی پیروی کرو۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار ”توریت“ اور ”نبیم“ پر ہے۔ توریت کا اطلاق باہم سفر نکون (پیدائش)، سفر خروج، سفر احبار، سفر عدد، اور سفر استناب پر ہوتا ہے۔ نبیم میں سفر پوتش، سفر القضاۃ، سفر سموئیل، x x x x

سفر ایام، اور سفر ملوک وغیرہ مشتمل ہے۔ نبیم میں انبیاء بنی اسرائیل کے مواعظ اور تاریخی واقعات کا ذخیرہ ہے یہ بھی توریت کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ان دونوں کی تفسیر رامی زبان میں ترکوم کے نام سے مشہور ہے۔ مدرائش اور تالمود ان کے یہاں حدیث و فقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ توریت و نبیم کی کچھ شہادتوں کو نقل کیا جا چکا ہے اگر ان کی سب شہادتوں کو ضبط تحریر میں لایا جائے تو نہایت ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ نبیم کی چند شہادتیں توریت کی پیشینگوئیوں کی تائید میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب زبور کی چند شہادتیں ملاحظہ ہوں۔۔۔

زبور پہر ایک نظر از روئے توریت و قرآن عزیز: حضرت داؤد کو خدا نے زبور عطا فرمائی دَلَقْنَاكَ كُتُبًا بَعْضُ النَّبِيِّينَ عَلَى الْبَعْضِ وَآتَيْنَاكَ زُورًا اور ہم نے اللہ نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا فرمائی (۵۵: ۱۷) دوسری جگہ ارشاد فرمایا ”يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ“

(۳۶:۳۸) یعنی اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے یہی لوگوں کے دریاں راستی سے فیصلہ کرے۔ انبیاء و رسل میں حضرت آدم کے بعد صرف داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کے لقب سے اللہ نے پکارا ہے۔ یہ بہت بڑا شرف ہے کہ ان میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی جمع کر دی گئی ہے اس طرح قرآن عزیز کی مختلف سورتوں میں ۶۷ جگہ ذکر ہے اور نام لے کر ۱۶ جگہ ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔ حضرت داؤد اسرائیلی اسباط میں یہوداہ بن یعقوبؑ کی نسل سے ہیں اور گیارہویں پشت میں مبعوث ہوئے آپ کی طہارت قلب اور نفاس طبع کے لیے فرقانِ حمید گواہ ہے اس کے برخلاف توراة میں تضاد بیانی سے کام لیا گیا ہے عیوفہ سمویلؑ میں ہے ”تب ناثن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا بجا جو کچھ تیرے دل میں ہے کہو کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے“ (باب ۷ آیتہ ۳ تا ۸) گویا داؤد صرف بادشاہ ہیں۔ دوسری جگہ انھیں نبی بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو باب ۲۲ آیات ۱۸ تا ۲۵۔ سمویل کے بیان کردہ بادشاہ اور نبی کی ہریت و کردار کا جو گھناؤنا رخ ہے وہ اس قابل نہیں کہ اسے تحریر کیا جائے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سمویل ۲ باب ۱۱ آیات ۲ تا ۲)۔ المختصر قرآن عزیز حضرت داؤد کو رسول بھی تسلیم کرتا ہے اللہ صاحبِ مہولت و شوکت بادشاہ بھی لیکن تورات انھیں صرف ایک پیشہ ور بادشاہ تسلیم کرتی ہے۔ قرآن عزیز نے ان کے صفات بیان کئے ہیں لیکن تورت میں ان کے اوپر الزامات و اتہامات ہیں۔

زبور کا بھی یہی حال ہے۔ افسوس ہے کہ بنی اسرائیل نے اس کی صورت کو بھی مسح کر دیا، اس کا اندازہ اس بات سے لگا جا سکتا ہے کہ آج موجودہ زبور ۱۵۰ عزبور پر مشتمل ہے۔ جو باریک ثابت کے ۷۷ صفحات (۲۹ تا ۶۱) پر مشتمل ہے۔ یہ سب عزبور حضرت داؤد کے نہیں ہیں بعض اگر داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پرغنیوں کے استاد کوہج کا بعض پر آصف کا اور بعض پر شیت بعض عزبور ایسے بھی ہیں جن کی کسی کا نام نہیں ہے اور صدیوں بعد تعریف کئے گئے مثلاً یہ عزبور کے خدا تو یہی تیری میراث میں گھس آئی ہیں۔ انھوں نے تیری مقدس ہیکل کو ٹھاک کیا

ہے۔ انھوں نے یروشلم کو کھنڈر بنا دیا ہے، اس مزبور میں بیت المقدس کی تباہی کا ذکر ہے جو بخت نصر کے ہاتھوں ۶۰۴ ق۔ م میں وقوع پذیر ہوئی جو حضرت داؤد علیہ السلام کے صدیوں برس بعد ہوئی بخاری کتاب الانبیاء میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤدؑ پوری زبور کو مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے تھے جب گھوڑے پر زین کسے تو اس وقت اسے شروع کرتے اور جب زین کس کر فارغ ہوتے تو پوری ختم کر چکے ہوتے تھے۔

بہر حال تحریف کے باوجود اللہ تبارک تعالیٰ نے زبور میں اُن بشارتوں اور اُن نشانوں کو محفوظ رکھا جو ”نبی موعود“ سید عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہیں۔ مثلاً:

از خرد ارے صرت دو پر غود فرما یئ:۔۔ پہلی پیشگوئی:۔

”وہ قیوم کے مسکینوں کا انھان کرے گا اور محتاجوں کے فرزندوں کو بچائے گا اور ظالم کو کٹڑے ٹکڑے کرے گا جب تک کہ سورج اور چاند باقی رہیں گے (امجد و ذراہ تک) ساری پشتوں کے لوگ تجھ سے ڈر کریں گے، وہ بارش کی مانند جو کاٹی ہوئی گھاس پر پڑے نازل ہوگا اور موسلا دھار سینہ کی طرح (نازل ہوگا) جو زمین کو میراب کرتا ہے، اس کے عصر میں صادق پھلیں گے اور سلامتی فرماواں ہوگی..... ساری گروہی اس کی تعظیم کریں گی کیونکہ وہ دہائی دینے والے محتاج کو اور مسکین کو اور ان کو جن کا کوئی مددگار نہ ہو چھڑکے گا۔ وہ جیتا رہے گا اور سب کا سونا اسے دیا جائیگا، اس کے حق میں سدا دعا ہوگی ہر روز اس کی مبارک باد کہی جاوے گی..... اس کا نام ابد تک باقی رہے گا جب تک کہ آفتاب رہے گا۔ اس کے نام کا رواج رہیگا، لوگ اس کے باعث اپنے تئیں مبارک کہیں گے، ساری قومیں اسے مبارک بلو دیں گی۔ خداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجبائب کام کرتا ہے“

(ملاحظہ ہو زبور ۷۲: آیات ۴ تا ۱۰ تا ۱۹)

اس پیشینگوئی میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اس ایک اور صوف ایکہ اکرینہ ملنے والے ”موعود“ جناب محمد رسول اللہ کی پوری سرگزشت بیان کر دی ہے۔ بشارت دیتے

ہیں کہ وہ موعود نبی، آخری نبی ہے کیوں کہ چاند اور سورج کے باقی رہنے تک (یعنی تا قیام قیامت) کوئی دوسرا نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اسی کی شریعت پر عمل ہوگا۔ وہ یتیموں اور یتیموں کا ملجا و مادی ہے۔ ظالموں کی بیخ کنی کرے گا مگر نیکوں کے لئے رحمت کی بارش ہوگا اس لئے سلامتی کی فراوانی ہوگی یعنی اسلام سب میں پھیل جائے گا۔ وہ جیتا رہے گا۔ یعنی اس کی نبوت و شریعت کو دوام حاصل ہوگا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سباز (میں) کا سونا آنحضرت کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ اس کے حق میں سدا دعا بھی ہوئی ہے اور دعا دینے والے (صلوٰۃ و سلام بھیجئے والے مومن) و باری علیٰ آلہ محمد میں اپنے آپ کو بھی مبارک دیتے ہیں اس کی تشریح بشارتِ ابراہیم کے سلسلہ میں کی جا چکی ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ایمان لانے کے لئے یہی ایک بشارت کافی ہے۔

(ب) جناب داؤد علیہ السلام کی دوسری پیشین گوئی :- فرمایا "میں تیری حمد و شاکر رہوں گا۔ (کیونکہ) تو نے میری مشن ملی اور میری نجات (کا باعث) ہوا۔ وہ پتھر جسے معاروں نے رد کیا وہی چوٹی کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند (آقلے نام لڑا) سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے۔ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے (یعنی آئے گا)۔ (بحوالہ ربور ۱۱۸-۲۲ تا ۲۶) واضح ہو جناب داؤد علیہ السلام پر ایسٹل اور یہود نے جس طرح کے عیب لگائے ہیں وہ اس قدر مکرر ہیں کہ ان کی موجودگی میں آپ کی عزت و وقعت ختم ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ نے تشریف لا کر ان گناہوں اور الزامات سے آپ کو نجات دی اور ان کی تقدیس و تطہیر سے لوگوں کو واقف کار بنایا لہذا آنحضرتؐ اس کے مستحق ہیں کہ جناب داؤد علیہ السلام ان کی حمد و ثنا کے گیت گائیں۔ بشارت میں بطور استعارہ معاروں سے رد کئے ہوئے پتھر کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ اور حضورؐ کی قوم ہی وہ پتھر ہے جسے بنی اسرائیل کے معاروں (علماء و فقہاء) نے رد کیا اور کہہ کر بنی اسرائیل میں کوئی خوبی نہیں مگر اسی رد شدہ قوم میں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت ہر گز معنوں نے ہمیشہ چوٹی کا پتھر ہونے کے قہر نبوت کی کھیل کی۔ اگر چوٹی

کا پتھر نہ ہوتا تو نبوت کی ساری عمارت بیکار تھی۔ چوٹی کا پتھر گنبد کا آخری پتھر ہوتا ہے۔ جس کو یائیل میں ”روش پناہ“ کہا گیا ہے یا وہ عمارت جو دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے بنائی جاتی ہے، اس کے برج کا آخری پتھر ”روش پناہ“ کہلاتا ہے۔ پناہ بمعنی حفاظت کا برج۔ (یائیل تواریخ ۲۔ باب ۲۶ آیت ۱۵) اس طرح قبر نبوت کا آخری پتھر یعنی نبی خاتم الرسل اور محافظ نبوت سوائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں۔ آپ کی ذات بابرکات پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ بنی اسرائیل میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو یا خدا نے اس کے متعلق کہا ہو کہ وہ خاتم النبیین ہے (مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو خاتم النبیین ص ۱۹۲ تا ص ۲۰۰ نیز بشری ص ۵۵ تا ص ۸۸)۔

(۸) حضرت سلیمان علیہ السلام کا محبوب :- حضرت داؤدؑ کی طرح اللہ رب العزت نے حضرت سلیمانؑ کو بھی نبوت و حکومت دونوں سے نوازا۔ قرآن عزیز میں ان کا ذکر ۱۶ جگہ آیا ہے اور بنی اسرائیل کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی ہے اور ان کی پیغمبر و نشان اور دعوت و تبلیغ کی ستائش کی ہے۔ سورۃ صٰح میں ارشاد فرمایا ”اور سخر کر دے سلیمان کے لئے شیطان (سرکش جن) ہر قسم کے کام کرنے والے، عمارت بنانے والے، دریا میں غوطہ لگانے والے۔ یہ ہماری غطا و بخشش ہے، چاہے اسے روکے رکھو یا بخش دے تم سلیمان سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں“ اللہ اکبر! اس عظمت و رفعت کا کیا کہنا کہ جب کہ وہ مومن سے باز پرس ہوگی لیکن حضرت سلیمانؑ کو مستثنیٰ کر دیا ان سے کوئی حساب نہیں ہوگا وہ جیسے چاہیں خرچ کریں یا طبعیت چاہے تو بزدک لیں یہ خصوصی انعام و اکرام ہے اللہ کا حضرت سلیمانؑ کے لئے۔ بنی اسرائیل نے سلیمانؑ کی نبوت و رسالت سے صرف انکار ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ منہدم دوسرے الزامات کے ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ وہ جادو کے حامل تھے اور اسی کے زور پر ”کنگ سلیمانؑ“ تھے اور جن و انس اور در و وحش و طيور کو سخر کئے ہوئے تھے۔ قرآن عزیز نے بتایا (ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ کو ح ۱۱۲)

کر سلیمان علیہ السلام کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے۔ جادو سلیمانؑ نے نہیں۔ بلکہ شیاطین (جن وانس) نے سکھایا اور اس کو مدون کیا۔ نبی اسرائیلؑ نے توریت و زبور کو پس پشت ڈال کر اس فن کو سیکھا اور سکھایا اور جب ان کی جماعت کے اہل حق نے ان کو متنبہ کیا کہ یہ سخت گمراہی کا کام ہے۔ اس سے باز آ جاؤ تو وہ شیطانوں کے بہکانے میں آکر یہ کہتے تھے کہ یہ تو سلیمانؑ کا سکھایا ہوا علم ہے اسی کے زور سے تو انھوں نے حکمرانی کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ نے بھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حمد و ثنا کا گیت گایا۔ نہد عتیق (یائیل) میں ”غزل الغزلات“ کے عنوان سے ان کی کچھ عشقیہ غزلیں درج ہیں جو انھوں نے اپنے محبوب کی شان میں کہی ہیں۔ ان کا محبوب کون ہے؟ عیسائی حضرات انھیں جناب مسیحؑ پر منطبق کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ جبکہ نعتیہ کلام میں خود جناب سلیمانؑ نے اپنے محبوب کا نام ”محمدؐ“ بتایا ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لفظ ”محمد“ میں نہ صرف تحریف کی گئی بلکہ اس کا ترجمہ بجائے ”تعریف کیا گیا“ کے ”سراپا عشق“ انگیزہ کر دیا گیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میثاق النبین جلد اول ص ۲۰۵ تا ص ۲۱۳) جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں حضرت سلیمانؑ علیہ السلام کی نعتیہ غزل ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں :- (۱) میرا محبوب سرخ و سفید ہے (۲) وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔ (۳) اس کا سرفالص سونا ہے (۴) اس کی زلفیں بیچ در بیچ کوٹے سے کالی ہیں (۵) اس کی آنکھیں ان کیبوتروں کی مانند ہیں جو دودھ میں نہا کر لب دریا تمکنت سے پیٹھے ہوں (۶) اس کے رخسار پھولوں کے چمن اور بلبسان کی کی ابھری ہوئی کیا بیاں ہیں۔ (۷) اس کے ہونٹ سوسن ہیں جن سے رقیق مرچ پکنا ہے۔ (۸) اس کے ہاتھ زبرجد سے مرصع سونے کے حلقے ہیں۔ (۹) اس کا بیٹھا ہاتھ

دانت کا کام ہے۔ جس پر سلیم کے پھول بنے ہوں (۱۰) اس کی ناگنیں کھن کے پالیوں پر سنگ مرمر کے ستون ہیں اور دیکھنے میں لبناں اور خوبی میں رشک سرو ہیں۔
 (۱۱) اس کا منہ از بس شیریں ہے یعنی اس کا کلام شہد سے زیادہ شیریں ہے۔
 ہاں یہی ہے میرا محبوب محمدؐ سراپا عشق انگیز، اے یر و سلیم کی بیٹیو (غزل الغزلات)،
 باب ۵۔ آیات ۱۰ تا ۱۵)

نوٹ: اس نعت میں بزبان عمری آخری جملہ کے اندر

کہہ کر بتایا ہے کہ نہ صرف اس کا کلام شہد اور شیریں ہے بلکہ وہ خود تعریف مجسم یا محمدؐ ہے۔ اس میں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نام بتانا تھا تو بجاے محمدؐ کے محمدؐ کہا ہوتا۔ محمدؐ کیوں کہا اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ بزبان میں تھے اور میم غلامت جمع کی ہے جب کسی بلند مرتبت و عظیم شخصیت کا نام لینا مقصود ہوتا ہے تو اس کے اسم کو بھی صیغہ جمع میں استعمال کرتے ہیں جیسے خدا کا نام ”الوہ“ ہے اس کی جمع ”الوہم“ بنائی اسی طرح ”بعث“ جو ایک کا نام تھا اس کو عظیم الشان سمجھتے تھے اس کی جمع ”بعثہم“ بنائی گئی لہذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اپنے ذی قدر و عظیم الشان محبوب کو صیغہ جمع میں استعمال کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محمدؐ سے زیادہ کون شخص محمدؐ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی نعت شریف کے تمام نشانات جناب محمدؐ رسول اللہؐ پر صادق آتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ جناب محمدؐ رسول اللہؐ کے وقت میں کچھ یہودی حضرت سلیمانؑ کی اس بشارت سے باخبر ہو کر مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اپنے اسلام لانے کی وجہ یہی پیشگی کوئی قرار دی اس پر ان لوگوں کے سامنے دوسرے یہودی علماء کو بلا کر پیشگی کوئی کے الفاظ پڑھنے کو کہا گیا تو وہ انگلی سے کہی تو محمدؐ کو چھپا لیتے تھے اور کبھی کوئی دوسرا لفظ بنا کر پڑھ دیتے تھے۔

(۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :- قرآن عزیز نے نبی اکرمؐ کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، اور حضرت عیسیٰؑ کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ تیرہ سورتوں میں ۸۴ جگہ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہے، ۲۶ جگہ نام عیسیٰؑ، ۱۱ جگہ مسیحؑ اور ۲۳ جگہ کنیت ابن مریم کے ساتھ۔ تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی بعثت سے پہلے یہود مشرکاتہ رسوم و عقائد کو اپنے مذہب کا ہزینا چکے تھے۔ یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر نقشہ شعیانہ علیہ السلام کی زبانی خود گوریت نے اس طرح دکھایا ہے : ”خداوند فرماتا ہے کہ یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے۔ یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیوں کہ میرے حکموں کو میرے پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کو تعلیم دیتے ہیں“ (بحوالہ تفسیر القرآن جلد چہارم ص ۴۹)

یہود کی مذہبی جماعت میں مدد توئی سزا و جزا اور حشر و نشر کے قائل نہ تھے فریسی واصل الی اللہ ہونے کے لیے ترک دنیا کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن ترک دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر گنہ گری میں ملوث تھے۔ تیسری جماعت ہیکل کے خدمت گزاروں اور بچاریوں کی تھی جنہوں نے مذہبی رسوم کی انائیگی کو تجارتی کاروبار بنالیا تھا۔ بھینٹ اور نذر لینے کی خاطر توریت کے احکام تک بدل ڈالے، یہ کابھوں کی جماعت تھی۔ چوتھی جماعت ان سب پر حاوی تھی، عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ وہ مذہب وہ ہے جو یہ کہیں، ان کو اختیار ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کریں۔ جنت و دوزخ میں بھیجنا ان کا کام ہے۔ یہ ”اجبار“ یا ”فقہ“ تھے۔ بہر حال اسی تاریکی کو دور کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ اس مقدس ہستی نے قوم کو لالکا لا۔ اجبار کی غلطیوں، راہیوں کے خلوت کردوں، بادشاہ و امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ ہر کوچہ و بازار

میں جا جا کر پیغامِ حق، سنایا اور سناتے وقت اپنی اصل حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا کہ۔
 ”لے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ تصدیق کرنے
 والا ہوں تو رویت کی اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئیگا اس کا
 نام احمد ہے“ (ملاحظہ ہو سورہ صفت) انجیلی شہادت آگے درج ہے:

حواریین عیسیٰ از روئے قرآن و انجیل :- حضرت عیسیٰ تمام مخالفتوں اور معاندین
 کی ہرزہ سراہیوں کے باوجود اپنے کام میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بنی اسرائیل کے سرکش
 اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں بھی کچھ ایسی سمیڑ روحیں نکل آئی تھیں جنہوں نے دین
 حق کی سر بلندی و کامیابی کے لئے جان و مال کی بازی لگا دی تھی۔ یہ حواری بیشتر غریب
 اور مزدور طبقہ میں سے تھے۔ انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ”سنت
 اللہ“ یہی جاری رہی ہے کہ زیر دست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور طبقہ کے
 زبردست اور صاحبِ اقتدار لوگ اپنے تکبر و غرور کی وجہ سے اغلاء کلمتہ اللہ کی
 راہ میں سنگِ گراں بن جاتے ہیں۔

قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ کی منقبت بیان کی ہے کہ مشکل کے وقت حضرت عیسیٰ نے
 پوچھا کہ اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے؟ تو حواریوں نے جواب دیا ”مُحَمَّدٌ أَنْصَارُ اللَّهِ“
 یعنی ہم یہی اللہ کے دین کے مددگار (ملاحظہ ہو ”دہ آل عمران اور سورہ صفت)۔ سورہ مائدہ میں
 بھی ان کے خلوصِ حق طلبی اور حق کوشی کا تذکرہ ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت کا حال ہے
 کہ جب حضرت عیسیٰ ان میں موجود تھے لیکن آپ کے رفیع الی السماء کے بعد بھی ان کی
 استقامت اور فداکارانہ خدمت کا سورہ الصف میں ذکر ہے آیت شریفہ فَاَيُّدُ نَالِدَيْنِ
 عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَمْبُتُوْا طَاهِرِيْنَ ؕ اٰی تَفْسِيْرُ كَرْتِے ہوئے حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے
 فرمایا ہے: یہ حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے حواریوں نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین
 نشر ہوا۔ ہمارے آنحضرتؐ کے پیچھے بھی انہوں نے اس سے زیادہ کیا ہے“ اس کے

بینکس بائبل میں بعض مقامات پر اگر مدح سرائی ہے تو دوسرے مقامات پر انھیں منافق و زبیل بتایا ہے مثلاً (۱) انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ کے معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جبکہ یہودی حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں اس طرح دیا ہوا ہے۔ یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرا یا اور کہا تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا..... پوچھا ہے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا جسے میں نواز دیکر دیدوں گا وہی ہے۔ پھر اس نے لیاؤد بودیا اور کے کر اسکریوٹی کے بیٹے یہودا کو دیدیا اور اس نواز کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔ (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۳ آیت ۲۱-۲۷) انجیل متی میں شمعون پطرس حواری کے متعلق مسطور ہے:- ”شمعون پطرس نے اس سے پوچھا اے خداوند تو کہاں جاتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ میں جہاں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا۔ اس نے کہا اے خداوند میں تیرے پیچھے اب کیوں نہیں آ سکتا میں تو تیرے لئے اپنی جان دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا تو اور میرے پیچھے جان دے گا! میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔“ (ملاحظہ ہو متی باب ۲۷ آیت ۴۶-۵۰) اسی انجیل میں دوسری جگہ تمام حواریوں کو بزدل بتایا گیا ہے کہ وہ امتحان کے وقت حضرت یسوع کو بے پارو و ہتکار چھوڑ کر فرار ہو گئے (ملاحظہ ہو متی کی انجیل باب ۲۶ آیت ۵۶)

موجود اناجیل کی حقیقت :- بات دراصل یہ ہے کہ آجکل عیسائیت وہ عیسائیت نہیں جس کی تلقین حضرت عیسیٰ نے تو ریت موسوی کو بنیاد مان کر انجیل کے ذریعہ کی ہے۔ انجیل دراصل تورات کا تکملہ ہے۔ موجودہ چاروں اناجیل حضرت مسیح کے بعد کی تصانیف ہیں انہیں بے کوئی کبھی انجیل حضرت مسیح کی انجیل نہیں ہے (۱) متی کی انجیل ۲۹ء میں بزرگانِ عبرانی بیت المقدس میں لکھی گئی۔ اصل غائب ہو گئی۔ اس کا یونانی ترجمہ بہت کچھ رد و بدل کے بعد باقی ہے اس کے نہ مترجم کا نام معلوم ہے اور نہ یہ معلوم کہ کس زمانہ میں ترجمہ ہوا (۲) انجیل مرقس کو لپس کے ایک مسافر مرقس نے رومی عیسائیوں

کے اہل پرستارہ میں ترتیب دیا وہ مسیح کی الوہیت کا منکر تھا (۳) لوقا کی انجیل۔ لوقا نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا، اس نے مسیحیت کو پولوس (سینٹ پال) سے سیکھا یا سنا جس نے برینک تعصبِ تقیہ کا لباس اوڑھ کر دینِ عیسوی کی صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں (الوہیت۔ مسیح، کفارہ۔ تثلیث) کا مجموعہ بنا دیا۔ اس انجیل کو عیسائی عالم الہامی نہیں مانتے (۴) یوحنا کی انجیل۔ اس انجیل کے بارے میں بہت اختلاف ہے کچھ علماء نصاریٰ اس کو یوحنا کی تعریف بتاتے ہیں لیکن سر تعریف میں اختلاف رائے ہے بعض ۶۹۵، ۶۹۵، ۶۹۸ اور پروفیسر کننگھم ہیرالڈ جلد ۷ میں دوسری صدی عیسوی تجویز کرتے ہیں اور مصنف، اسکندر یہ کے ایک طالب علم کو بتاتے ہیں۔ اس انجیل میں بھی ابوہیت مسیح کو شامل کر دیا ہے تاکہ عقیدہ کی اصلاح کے لیے جو اوزار کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دیا جائے۔

عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے احوال تک عیسائیوں میں اکیس انجیلیں الہامی خیال کی جاتی تھیں اور یوں تو ان کی تعداد سو سے زائد تھی۔ ۳۲۵ء میں نائسیا کی کونسل نے فرقہ بندی کر کے صرف چار مذکورہ بالا انجیلیوں کو باقی رکھا۔ ان متردک انجیلیوں میں انجیل اگنٹس اور بریناس (برنابا) کا پتہ لگ چکا ہے بلکہ برنابا تو شائع بھی ہو چکی ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں پوپ سکس کے کتب خانے سے اس کے ایک مقرب لائٹ پادری فرامینو نے اس کو بڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ یہ انجیل دوسری انجیل کے مقابلہ میں قرآن عزیز سے زیادہ قریب ہے (بشری مٹا دیا اس انجیل کے منسوخ ہونے کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس انجیل منشور رکھنا مٹا دیا ہے جو پوپ گلیسوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھی گیا تھا میں ان انجیل کا نام درج ہے، جن کا پڑھنا حرام کیا گیا تھا ان میں برنابا بھی شامل تھی۔ بہر حال اس کا نسخہ سینا "جینی کے ایک مشہور ڈاکٹر نے کوہ طور کی ایک مشہور عیسوی خانقاہ سے ۱۵ سال کی کوشش کے بعد حاصل

کر کے روس کے شاہی کتب خانہ میں داخل کر دیا تھا۔ روس نے اس نسخہ کو ایک لاکھ پونڈ کی قیمت پر حکومت انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور اب یہ نسخہ وہاں کی میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ میں آنحضرتؐ کو عربی زبان میں لفظ احمد سے یاد کیا گیا ہے جس کو یونانی میں ترجمہ کرتے وقت ”پیر کلوٹوس“ کے مترادف سمجھا گیا جو بعد میں بگڑ کر ہاراکلیٹوس، اور ”پاراکلوٹوس“ ہو گیا۔ ”پیرٹوس“ کے معنی بھی احمد و محمد کے ہیں۔ ”فارقلیط“ اس کا معرب ہے جس کا ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء میں اردو اناجیل میں ترجمہ ”روح القدس“ کر دیا گیا اس کے بعد پھر ترمیم ہوئی اب صرف ”روح حق“ ہے۔

میلی جنگوں سے قبل تمام دنیا کے عیسائی ”فارقلیط“ سے مراد ایک ایسا شخص لیتے تھے جو جناب مسیح کے بعد پیغمبر مکر دنیا میں آئے گا۔ اسی وجہ سے جناب مسیح کے بعد ایک غصہ دراز تک جھپٹے فارقلیط پیدا ہوتے رہے چنانچہ سن ۱۷۵۷ء میں مونٹانی نامی ایک شخص نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیا تھا ملاحظہ ہو تواریخ کلیسا مطبوعہ لندن ۱۷۵۷ء صفحہ ۲۰۵

اسی طرح مینیس بھی فارقلیط ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب سے سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں یورپین اقوام نے رک اٹھائی ہے تب سے یورپ کے پادری مقدس انجیل میں تحریفات کے مرتکب ہوئے جو آج تک جاری ہے اسی وجہ سے عیسائی مذہب میں بہت سے فرقے ہو گئے۔ مانی ٹیرن اور یونی ٹیرن وغیرہ فرقے ان انجیلوں کو نہیں مانتے جن کو اور فرقے مانتے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کی انجیلوں کو نہیں مانتے۔

مسٹر وارڈ اپنی کتاب ”غلطنامہ“ میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مل نے بائبل کے مختلف نسخے ملائے تو تیس ہزار اختلاف پائے۔ ڈاکٹر گربسیاخ نے ۳۵۵ نسخوں کا مقابلہ کیا تو

ڈیڑھ لاکھ اختلاف ہے۔ بہر صورت اگر "فارقلیط" کے لفظ یا معنی میں تحریف ہوئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ بحمد اللہ بعض پادری ایسے اب بھی موجود ہیں جو دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ آئندہ آیہ نوالے کی بابت جناب مسیحؑ نے جو پیشنگوئی کی ہے وہ فارقلیط بمعنی احمد و محمد ہے (ما خطہ ہو تفسیر انجیل انبیا در یحییٰ مرے میچل مطبوعہ لندن ۱۸۶۹ء صفحہ ۲۰۶) اسی طرح گاڈ فری ہیگن اور بشپ مارش نے لمبی چوڑی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ جناب مسیحؑ نے جو پیشنگوئی کی ہے اس میں لفظ فارقلیط بولا ہے تفصیل کے لیے ما خطہ ہو خطبات احمدیہ ص ۶۳۹ تا ص ۶۵۳)

ماہنامہ سیکولر ڈیموکریسی (اردو) (نومبر ۱۹۷۷ء کا شمارہ) "قومی شاعری نمبر"

ہوگا۔ اس موضوع پر پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، علی جوازی پوری اور عرش مسیانی کے مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل شعراء کرام بھی شرکت فرما رہے ہیں۔

سردار جعفری۔ فراق گورکھ پوری۔ ساغر نظامی۔ زکریا غفر۔ ساحر لدھیانوی۔ جان نثار اختر۔
 اختر الامان۔ مجروح سلطان پوری۔ ندا فاضلی۔ مجنور سعیدی۔ گوپال مٹل۔ زبیر رضوی۔ سلام پھلی
 شہری۔ رفعت سروش۔ کمار پاشی۔ کرشن موہن۔ جگن ناتھ آزاد۔ خلیل الرحمن غظمی۔ حسین نعیم۔
 معین احسن جادوی۔ عمیق حنفی۔ ممتاز مرزا۔ غلام ربانی تاباں۔ مجنور جالندھری۔ سکندر علی وجہ۔
 براج کول۔ اسلم پروین۔ بھل کرشن اشک۔ وقار خلیل۔ راج نرائن راز۔ شہر بار۔
 قاضی سلیم۔ شمیم کرہانی۔ فرقت کا کوردی۔ یوسف ندیم۔ حسرت بے پوری۔ کیفی غظمی۔

سالانہ چند کلاس ہے۔ فی کاپی ایک روپیہ۔
 ایجنٹ حضرات اس پتے پر اپنے اڈر سال فرمائیں
 ۱۹۔ اے۔ تحصیل کمریہ، گیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس۔ نئی دہلی۔
 ۳۵

امام داری اور ان کی سنن

از مولوی محمد عبداللہ صاحب رفیق ندوۃ المصنفین

زیر ترتیب کتاب "الترغیب والترہیب" جس کا شرعی ترجمہ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو رہا ہے اس کے مقدمہ میں مذکورہ محدثین کے ذیل میں امام داری اور ان کی سنن کا مختصر سا تذکرہ آیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں امام داری اور ان کی سنن پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(جربان)

نام و نسب | کنیت ابو محمد نام عبداللہ سلسلہ نسب عبداللہ بن عبدالرحمن بن الفضل بن بہرام بن عبدالعزیز الغیمی الداری السمرقندیؒ۔
 داری یکسر راہ دارم بن مالک بن حنظلہ بن زید مناة بن تیمم کی طرف نسبت ہے جو قبیلہ بنو تیمم کی ایک بڑی شاخ ہے۔
 اور سمرقند میں چونکہ رہائش تھی اس لئے اس کی طرف بھی نسبت ہے۔

۱۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۲ ص ۲۸۱ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۲

۲۔ مرآۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح ج ۲ ص ۲۲ و تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۹

پیدائش مشہور امام حدیث عبداللہ بن مبارک کاسن وفات ان کا سال پیدائش ہے یعنی سن ایک سو اکیاسی ہجری (۱۸۱ھ)

تعلیم، اساتذہ اور تلامذہ [دارمی نے نصر بن کھلیل، یزید بن ہارون، جعفر بن عون ابوالنضر یاقوت بن القاسم، مروان بن محمد الطاطری، اسہل بن حاتم، حبان بن ہلال، محمد بن یوسف القریابی، اسود بن عامر، وہب بن جریر اور ابو غاصم وغیرہم سے علم حاصل کیا۔
تحصیل علم کے لئے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، خراسان، شام، عراق اور مصر کا سفر کیا۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست میں امام مسلم صاحب صحیح، امام ابو داؤد، امام ترمذی، الحسن بن الصباح البزار، بنیدار، الذہبی، البوزرغ، ابو حاتم، یحییٰ بن محمد، جعفر بن محمد، القریابی اور حافظ غسانی بن عمر بن العباس السمرقندی جیسے فن حدیث کے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں جن میں سے پہلی تک کے شاگردوں کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ غمر بن دارمی سے بڑے تھے نہ

امام مسلم نے دارمی سے تہنترہ حدیثیں لی ہیں تھ۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ سنن کے علاوہ دوسری کتابوں میں امام نسائی نے بھی دارمی سے روایت کی ہے تھ۔ ابن عدی نے "الکامل" میں ایک حدیث امام نسائی سے نقل کی ہے جسے وہ امام دارمی سے روایت کرتے تھے۔ اور امام اہل الدنیا فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ نے بھی اپنی صحیح بخاری کے علاوہ آپ سے روایت کی ہے تھ۔ امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ بھی دارمی کے زمرہ تلامذہ میں شامل ہیں۔

محدثین کی نظر میں دارمی کا مقام خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ دارمی کا شمار حفاظ و

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۹۵، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵
۲۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۷ تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ ۳۔ الضعفاء ص ۲۹۵

حدیث میں ہے آپ طلب علم کیلئے کثرت سے سفر کیا کرتے تھے، ثقہ متقی اور زاہد تھے۔ بادشاہ وقت نے آپ کو سمرقند کا قاضی بنانا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا سلطان نے اصرار کر کے زبردستی پھینس قاضی بنادیا لیکن صرف ایک مقدمہ کا فیصلہ کر کے مستعفی ہو گئے۔ نیز فرماتے ہیں کہ عقلمندی اور فضل میں انتہائی کمال رکھتے تھے۔ دیانتداری، بردباری، جدوجہد اور عبادت میں ضرب المثل تھے۔

امام احمد بن حنبل کے سامنے دارمی کا ذکر آیا تو امام صاحب نے فرمایا کہ میرے سامنے کفر پیش ہوا تھا میں نے رد کر دیا اور دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی تھی انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔

اسحق بن داؤد سمرقندی کہتے ہیں کہ میرے ایک ملنے والے نے بیان کیا کہ میں امام احمد بن حنبل کے پاس گیا اور ان کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کرنے لگا تو امام احمد نے فرمایا کہ میں ان کو کچھ نہیں جانتا۔ ہمارے دوستوں کو ہم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے، تمہیں عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی کے متعلق بھی کچھ خبر ہے؟ تم اس سردار کو دیکھو، تم اس سردار کو دیکھو، تم اس سردار کو دیکھو (میں بار فرمایا)

رجاء بن جابر مرجمی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا شاذ کونی کو دیکھا، یحییٰ بن راہویہ

کو دیکھا اور ابن المدینی کو دیکھا لیکن قوت حافظہ میں کسی کو بھی عبداللہ دارمی کا ہمسر نہیں پایا۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد نے فرمایا کہ عبداللہ بن عبدالرحمن (دارمی) اپنے ہم عصروں

کے امام تھے۔ محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں کہ دارمی حفظ و تقویٰ میں ہم پر غالب آ گئے

حافظ ذہبی نے ان کے نام کے ساتھ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے الفاظ لکھے ہیں۔ علامہ سیوطی نے

تدریب الراوی میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے اپنے

والد سے سوال کیا کہ آبا جان! حفاظ کون کون ہیں؟

۱۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵، ۱۶، تاریخ بغداد ج ۱ ص ۱۵، تذکرۃ الحفاظ

ج ۲ ص ۱۶، ۱۷، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، و شذرات الذهب ج ۲ ص ۱۴

حضرت امام نے فرمایا عزیز من! خراسان کے چند نوجوان تھے جو اب منتشر ہو چکے ہیں۔
 صاحبزادے نے پھر سوال کیا کہ اباجان! وہ ہیں کون کون؟ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا۔
 کہ: محمد بن اسماعیل بخاریؒ (۳) عبداللہ بن عبدالمکریم الرازیؒ (۳) عبداللہ بن عبد الرحمن
 سمرقندی الدارمیؒ (۴) الحسن بن اشجاع البغیؒ لے

بندارؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں (اس وقت) چار حافظ حدیث ہیں۔ (۱) ابو زر عہ
 "ری" میں (۲) مسلم بن الحجاج "نیشاپور" میں۔ (۳) عبداللہ بن عبد الرحمن دارمی سمرقندی۔
 (۴) اور محمد بن اسماعیل "بخارا" میں تھے شیخ محی الدین النوذی نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ
 دارمی اپنے زمانہ میں مسلمانوں کے حفاظ حدیث میں سے ایک تھے۔ علم و فضل میں بہت کم
 کوئی ان کی برابری کر سکتا تھا تھے۔ محمد بن عبداللہ بن المبارک الحمری نے اہل خراسان کو مخاطب
 کر کے فرمایا کہ اے اہل خراسان، جب تک تمہارے درمیان عبداللہ بن عبد الرحمن (دارمی)
 موجود ہیں کسی دوسرے کی طرف رخ نہ کرنا تھے۔ ابوسعید الاشج فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن عبد الرحمن
 ہمارے امام ہیں تھے۔ ابن الشری کہتے ہیں کہ خراسان نے پانچ ائمہ حدیث پیدا کئے ہیں ان میں
 دارمی کا بھی ذکر کیا۔ ابو حاتم بن حبان کہتے ہیں کہ "کان من الحفاظ المقتن و اهل الوری والدین"
 اور فرماتے ہیں کہ دارمی حدیث کے یاد کرنے والے، جمع کرنے والے اے سمجھنے اور اس پر تصنیف
 کرنے والے محدث تھے۔ اپنے وطن میں حدیث کو پھیلایا اور اس کی حفاظت و حمایت کی اور
 مخالفین کی مخالفت کا خاتمہ کیا۔

علمی خدمات تصنیف و تالیف | امام دارمی نے اپنے وقت کے فرقہ باطلہ جہمیہ کے رد میں
 متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی تعالیف میں سب سے

۱۔ مقدمہ سنن دارمی ۲۔ از مولانا عبدالرشید کشمیری (مطبع نظامی کراچی ۱۹۹۳ء) ۳۔ مقدمہ سنن دارمی ۴۔
 ۵۔ ایضاً ۶۔ تاریخ بغداد ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔

و زیادہ مشہور کتاب ”سنن“ ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کو بجائے ”سنن“ کے ”مسند“ کہا ہے۔ لیکن ملاحظہ قاری نے شرح مشکوٰۃ میں اس کو دوہم قرار دیا ہے۔ اور صاحب کشف الظنون نے شرح الفیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن الصلاح نے اس کو مسند میں شمار کر کے غلطی کی ہے۔ ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ ”علوم الحدیث“ میں بھی اس کو مسند داری کے نام سے ہی ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی حافظ عراقی نے شرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان کا دوہم ہے۔ حافظ عراقی نے ایک عجیب و غریب شبہ ظاہر کیا ہے کہ

انہم ذکر کوافی ترجمت الدار محی مورخین نے امام دارمی کے حالات میں لکھا ہے
ان له الجامع والمسنود والتفسیر کہ ان کی تعانیفیں ایک جامع ایک مسند اور
وغیرہ ذلك فلعلم الموجد هو الجامع ایک تفسیر وغیرہ ہے تو ہو سکتا ہے کہ موجود جو ہے وہ
والمسنود قد فقد صح جامع ہوا و مسند مفقود و نایاب ہو گئی ہو۔

عراقی کا یہ شبہ اگرچہ بالکل نرالا ہے اور تعجب ہے کہ بعد والوں نے اس سے کسی قسم کا تعرض بھی نہیں کیا حتیٰ کہ مجھے کہیں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کے کلام میں بھی اس سے اتفاق یا اختلاف نہیں ملا۔ تدریب الراوی میں سیوطی نے اس کو نقل کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے اور علامہ عبدالحی لکھنوی نے ابھی الاجوبۃ الفاضلۃ میں اسے نقل کیا ہے لیکن یہ شبہ ہے اہم اس لئے کہ جیب ان کی تعانیف میں دو کتابیں ایک سنن اور ایک جامع ہیں اور ایک کتاب جس کی ترتیب بطرز
لہ ”سنن“ حدیث کی وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں حدیثیں فقہی ترتیب سے لکھی جائیں اور ”مسند“ وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں ہر صحابی کی کل روایات ایک جگہ جمع کر دی جائیں اور ابواب کی کوئی رعایت نہ ہو علامہ وفاة شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۳، کشف الظنون ج ۲ ص ۲۲۳، مقدمہ سنن دارمی ص ۱۰ (نوٹ) صاحب کشف الظنون نے غالباً شہرت کی رعایت کرتے ہوئے اس کو مسند کے تحت بیان کیا ہے۔
یہ ”التقیید والایضاح شرح علوم الحدیث المعروف بمقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۰۳ لزمین الدین العزازی
ص ۱۰۳ الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۰۳

جوامع ہے دستیاب ہے تو کیا بعید ہے کہ یہی وہ جامع ہو اور مسند کوئی اور ہو۔ غزالی کے اس شبہ نے یہ ایک مستقل تحقیق طلب سوال پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ ان کے اس قول میں اور مذکورہ بالا بیان میں تعارض ہے کہ ابن الصلاح نے سنن دارمی کو مسند کہہ کر غلطی کی ہے کیونکہ جب یہ احتمال موجود ہے کہ مسند کوئی اور ہو اور جامع یہ ہو تو پھر اس اعتراض کا کیا موقع ہے کہ ابن الصلاح نے جامع کو مسند کہہ دیا ہو سکتا ہے کہ ابن الصلاح نے جسے مسند کے نام سے ذکر کیا ہے وہ مسند ہی ہو۔ لیکن حافظ غزالی نے بھی اس کو علی انھم ذکر داغ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے یعنی میرے اس اعتراض کے ساتھ ساتھ یہ شبہ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خود حافظ غزالی کو اگر اس شبہ کا حل مل جاتا تو انھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ بہر حال یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ امید ہے کوئی صاحب اس پر توجہ فرمائیں گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا تذکرہ کتاب السنن السنی بسند الدارمی در کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم ہے کے الفاظ میں کیا ہے۔

سنن دارمی کا مرتبہ | اس کتاب کی سند صحاح کی اکثر کتابوں سے غالی ہے اس لئے اس کا مقال بھی بہت بلند ہے اور محدثین نے بہت اونچے الفاظ میں اس کا

تذکرہ کیا ہے۔ علامہ حافظ علاؤ الدین مغلطائی المتوفی ۷۲۲ھ نے اس کو الصبیح کہا ہے اور ان سے قبل ہماری اس کتاب الترغیب والترہیب کے مصنف علامہ زکی الدین المنذری المتوفی ۷۵۶ھ اس کو الصبیح لکھ چکے ہیں بلکہ حافظ مغلطائی نے تو کہا ہے کہ اہل علم کی ایک جماعت اس کو الصبیح کہتی ہے۔ اور بعض علما نے دعویٰ کیا ہے کہ سنن دارمی صبیح بخاری سے پہلے لکھی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر اس سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”مجھے یہ تسلیم نہیں ہے اور جسے اس کا دعویٰ ہو وہ ثبوت پیش کرے۔“

اس کا جواب ترکی یہ ترکی علامہ سید محمد بن اسماعیل الامیر نے اپنی شرح توفیح الافکار علی تفصیح الانظار میں دیا ہے کہ ”جسے صحیح بخاری کی تصنیف کے مقدم ہونے کا دعویٰ ہو وہ بھی اس کا ثبوت پیش کر لے“ حافظ مغلطائی المتوفی ۱۲۶۲ھ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ کی جگہ اگر سنن داری کو رکھا جائے تو بہت مناسب ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

انہ لیس دون السنن فی المرتبۃ سنن داری مرتبہ میں دیگر کتب سنن سے کم نہیں
بل لو قم الی الخمستا لکان اولی ہے بلکہ اس سے پہلے کتابوں (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) کے ساتھ ابن ماجہ کی جگہ میں
من ابن ماجہ فانت امثل منہ لگایا جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کیونکہ یہ ابن ماجہ
بکثیر ہے سے بدرجہا فائق ہے۔

ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں حافظ ابن حجر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے:

ینی ان لیجعل مستند اللہمی مناسب یہ ہے کہ پانچ کتابوں کے ساتھ ملا کر
ساد ساللخمسہ بدلا فانت جمعٹی کتاب مستند داری قرار دی جائے کیوں کہ
قلیل الرجال القنعاء، نادر اس میں ضعیف راوی کم ہیں اور منکر و شاذ
الاحادیث المنکرۃ والشاذۃ روایات بھی نادر ہیں۔ اور اگرچہ اس میں چندین
وان کان فیہ احادیث وموقوف حدیثیں بھی ہیں لیکن اسکے باوجود یہ سنن
مرسلۃ وموقوفۃ فہو مع ابن ماجہ سے اذلی ہے۔
ذلائک اولی منہ ہے

۱۰ مقدمہ سنن داری ص ۷۰ ایضاً ۳۰ تدریب الراوی ص ۱۱۱ السیوطی، کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۳
۱۱ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲۰، فی ترجمہ ابن ماجہ

محترم مولانا عبد الرشید صاحب لغمانی فرماتے ہیں کہ ”واما ما صافته الدارمی بدل
ابن ماجہ، فالقول بسا حداث وقع بعد اضافة سنن ابن ماجہ الى الکتاب الخمسة“
یعنی دارمی کو چھٹی کتاب قرار دینے کا قول حادث اور نیا ہے جو ابن ماجہ کو چھٹی کتاب
قرار دینے جانے کے بعد سامنے آیا ہے لیکن یہ بات خود ثابت نہیں ہے کہ ابن ماجہ کسی بھی
دور میں بلا اختلاف چھٹی کتاب مانی گئی ہو۔ علامہ زرین بن معاویہ العبدی المتوفی ۵۳۵ھ
نے پانچ صحاح کے ساتھ چھٹی کتاب موطا امام مالک قرار دی ہے۔ علامہ ابن الاثیر المتوفی
۶۲۶ھ نے جامع الاصول میں یہی مسلک اختیار کیا ہے اور یہی ابن الدبیغ الشیبانی متوفی
۹۴۲ھ نے جامع الاصول کی تخیص تبسیر الاصول میں کیا ہے۔ حافظ مغلائی، حافظ العلانی،
حافظ ابن حجر عسقلانی اور ملا علی قاری وغیرہم کی رائیں آپ کے سامنے ہیں ایسی صورت میں یہ کیسے
درست ہے کہ ہم سنن ابن ماجہ کے چھٹی کتاب ہونے کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھ لیں۔

اور جن لوگوں نے ابن ماجہ کی تعریف کی ہے ان کے الفاظ دیکھئے تو تعریف کے ساتھ
تقریباً ہر ایک نے تنقید ضرور کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے ”کہا جیادوی السیو“
یعنی سب حدیثیں اچھی ہیں سوائے چند احادیث کے (ج ۱۱ ص ۵۲) حافظ ابی نے کہا ہے
”کتاب سنن لوللکثر من احادیث واهیت لیست بالکثیرۃ“ یعنی یہ کتاب بہت عمدہ تھی اگر اسے
چند بے اصل حدیثوں نے مکدر نہ کر دیا ہوتا اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

محترم مولانا محمد علی کاندھلوی دارمی کے متعلق حافظ ابن حجر کی مذکورہ بالا رائے نقل کرنے
کے بعد اسے کمزور کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔

”لیکن اس تفریع کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے

چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل البیہقی لکھتے ہیں کہ ”صحاح خمسہ کے ساتھ موطا بھی

مع بفتح الدال وسكون الیاء الشاة التثانیة وفتح الباء الموحدة وفي آخرها عین مہملہ ساکتہ

ہے جیسا کہ جامع الأصول میں ابن الاثیر نے کہا اور کچھ لوگوں نے اس کی جگہ ابن ماجہ کو رکھ لیا ہے۔ اسی کے پیش نظر حافظ ابوالحاج المزی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور علامہ خرزرجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس اقتباس کو ذکر کر کے یہ کہنا کہ ابن حجر کا غل ان کی مذکورہ بالا رائے کے خلاف ہے کسی طرح درست نہیں۔ یہاں ابن حجر اپنی طرف سے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ حافظ مزی کی کتاب تہذیب الکمال کا اختصار کر رہے ہیں اور چونکہ اصل کے مصنف کا رجحان ابن ماجہ کو سادہ ترین قرار دینے کی طرف ہے اس لئے اس کے اختصار میں اسی رائے کا باقی رکھنا ضروری ہے لہذا اس کو ابن حجر کی رائے قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس رائے پر دوسرا اعتراض محترم مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی نے کیا ہے۔ چنانچہ ”ما تنس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ“ میں اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے حافظ کا کلام نقل کرنے کے بعد ”تتفق ابن حجر فی حد الباب“ کا عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت نقل کیا ہے کہ حافظ مغلطی نے جو سنن دارمی کو ”الصحيح“ کہا ہے حافظ ابن حجر کو اختلاف ہے۔ ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ :- (۱) دارمی ”الصحيح“ ہے یا نہیں (۲) اور ابن ماجہ کے مقابلہ میں دارمی مقدم ہے یا نہیں؟ یہ دونوں بالکل الگ باتیں ہیں۔ حافظ مغلطی کی رائے ہے کہ دارمی ”الصحيح“ کا درجہ رکھتی ہے حافظ ابن حجر کو اس سے اتفاق نہیں دوسری رائے حافظ مغلطی اور صلاح الدین العلانی وغیرہا کی یہ ہے کہ سنن ابن ماجہ کے بمقابلہ سنن دارمی صحاح ستہ میں جگہ پانے کی زیادہ حقدار ہے اس رائے سے حافظ ابن حجر کو پورا پورا اتفاق بلکہ وہ دارمی کو ابن ماجہ سے بدرجہا

۱۔ امام اعظم اور علم الحدیث مسند مولانا محمد علی کاندھلوی بحوالہ توفیق الافکار

ج ۱ صفحہ

بہتر قرار دیتے ہیں۔ لہذا ان دونوں باتوں کو ذکر کر کے حافظ ابن حجر کے کلام میں تناقض قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

علامہ شیخ محمد عابد سندھی نے امام صلاح الدین العلائی سے نقل کیا ہے کہ :-

لو قدم مستند الدارمی بدلہ اگر سند داری کو سنن ابن ماجہ کی جگہ رکھ دیا
ابن ماجہ فکان سادسا لکان اولیٰ جئے اور لے چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مقدمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ ”بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ سنن داری اس بات کی زیادہ متحقق ہے کہ اس کو صحاح ستہ میں چھٹی کتاب کی جگہ دی جائے اس لئے کہ اس میں ضعیف رجال بہت کم ہیں اور منکر و شاذ روایات بھی اس میں شاذ و نادر ہیں اور سندیں بھی اس کی عالی ہیں اور اس میں بخاری سے بھی زیادہ ثلاثیات ہیں ابو حاتم نے داری کی ثلاثیات کی تعداد پندرہ بیان کی ہے۔“

پہلی حدیث ثلاثی یہ ہے - داری کہتے ہیں - حد ثنا جعفر بن عون انبانا یحییٰ بن سعید عن انس قال جاء اعرجی الی ابی صلی اللہ علیہ وسلم فلما قام بال فی ناحیة المسجد الخ اس حدیث میں امام داری اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں جعفر بن عون، یحییٰ بن سعید اور حضرت انس صحابی رضی اللہ عنہ۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث میں ایک جگہ سنن داری کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث کی مستند کتاب اور اس کا درجہ صحاح کی اکثر کتابوں سے بلند ہے۔

۱۰ قالہ الشیخ السدھی فی ثبوتہ - (مقدمہ سنن داری ص ۵) ۱۱ ثلاثی ”وہ روایت کہلاتی ہے جس کی سند میں محدث کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔“ ۱۲ مقدمہ مشکوٰۃ ص ۵، ۱۳ مقدمہ سنن داری ص ۵ ۱۴ سنن داری ص ۱ باب البول فی المسجد ۱۵ تدوین حدیث ص ۵

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ سنن دارمی جامعیت، حسن ترتیب اور علو استاد ہر لحاظ سے اس رائے کی مستحق ہے جو یہ اہل علم پیش کر رہے ہیں ضرورت ہے کہ اہل قلم حضرات مختلف پہلوؤں سے اس کا تعارف کرائیں اس کی اہمیت کو واضح کریں اور مشائخ حدیث اندر ارباب مدارس اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اسے درس میں شامل کریں۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مرحوم نے سنن دارمی کا قدیم نسخہ حاصل کر کے اس کی تصحیح اور دیگر نسخوں سے اس کا مقابلہ کر کر ۱۲۹۳ھ میں مطبع لغامی کانپور سے شائع کرایا۔ اس کے کل صفحات ۴۴۲ ہیں خط بہت عمدہ اور جلی ہے۔ شروع میں مولانا محمد عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری کے قلم سے مقدمہ بھی ہے۔ ہندوستان کے اکثر بڑے کتب خانوں میں موجود ہے۔ میری نظر سے سنن دارمی کا یہی ایک نسخہ گذرا ہے۔ سنن دارمی ایک ہزار پانچ سو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں تین ہزار پانچ سو ستاون حدیثیں آگئی ہیں۔ سنن دارمی ۳۴۲ احادیث دو جلدوں میں دستاویز شائع ہوئی ہے۔

سنن دارمی کے تراجم (۱) سنن دارمی کا مکمل ترجمہ تحت اللفظ بلا تین اسلامیاہ پرنٹنگ پلاننگ اسکین لٹریچر دہلی نے کرزن اسٹیم پریس میں طبع کر کر شائع کیا تھا یہ ترجمہ متوسط

(۲۰ × ۲۶) سائز کے پانچ سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا حمیرت دہلوی کی نگرانی میں شائع ہوا ہے مترجم کے نام کی جگہ لکھا ہے کہ "فاضل علماء سے عربی کا اردو میں ترجمہ کرایا" ہو سکتا ہے کہ یہ ترجمہ مولانا عبد الشکور صاحب لکھنؤی کا کیا ہوا ہو واللہ اعلم یہ ترجمہ مجھے پاس موجود ہے اس پر سن طباعت درست نہیں ہے لیکن ڈاکٹر عبد الحق صاحب بابائے اردو مرحوم نے نہ معلوم کہاں سے اس کا سن طباعت ۱۳۲۷ھ بیان کیا ہے۔

(۲) دوسرا ترجمہ با عمارہ سلیس اور شگفتہ اردو زبان میں ہے لیکن اخیر سے یہ اور مذکورہ ترجمہ دونوں بہت طے جلتے ہیں اس ترجمہ کا ایک نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مگر ناقص ہے۔

(۳) ڈاکٹر عبد الحق صاحب مرحوم نے ایک ترجمہ کا ذکر کیا ہے کہ مطبع سعیدی کراچی سے ۱۹۵۱ء

لے بتان الحمد للہ ۴۱۱ ۴۱۲ قاموس الکتب ۱۵۱ ۱۵۲ مراسلت محترم مولانا ظفر الدین صاحب مغامی
محترم مولانا سید محبوب صاحب رضوی۔

میں شائع ہوا ہے اور اس پر مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقدمہ ہے صفحات ۶۹۶-۶۹۷ ہیں۔ لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے نمبر میں جس ترجمہ کا ذکر کیا ہے یہ وہی ہے یا کوئی اور ہے۔

حافظ ابن حجر مقلانی نے "اتحاف المصنف باطلال العشرۃ" میں جن دس کتابوں کے احوال جمع کئے ہیں ان میں دارحمی بھی ہے۔ ذیل التذکرۃ لابن فہد ص ۳۳۳ اس اتحاف المہرۃ کا کلمی نسخہ مکتبہ مرادیہ آستانہ میں محفوظ ہے (حاشیہ کوثری بر ذیل مذکور)

وفات امام دارحمی غزہ کے دن جمعرات کو بعد نماز عصرین دو سو پچیس ہجری (۸۵۷ھ) میں فوت ہوئے اور عید الفصحی جمعہ کے روز دفن کئے گئے۔

اسحق بن احمد بن خلف البخاری کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو جب امام دارحمی کی وفات کی اطلاع کا خط ملا تو آپ نے انتہائی مدد سے سرحد کا لیا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ حسرت آمیز شعر نکلا حالانکہ کج زبان اشعار کے جو احادیث میں آگئے ہیں یا جس کی ضرورت کسی لفظ کی تحقیق کے سلسلے میں پڑ گئی ہے آپ کبھی شعر نہیں پڑھتے تھے۔

ان تبق تفع مبالا حبة کھم

وفناؤ نفس لا بالک افجح ۵

ترجمہ: اگر تو زندہ رہے گا تو تمام دوستوں کی موت کا مددہ تجھ ہی کو اٹھانا پڑے گا۔
لیکن خود تیری موت کا ساتھ ان سے زیادہ المناک ہے۔

رحمۃ اللہ علینا وعلیہم اجمعین

۱۔ قاموس الکتب ص ۱۳۲ ۲۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۳۲ ، ۳۔ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۹۶

مقدمہ سنن دارحمی ص ۱

مرزا غالب کے مدرسے کا کمیٹی

(۲)

پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی۔ مدرسہ عالیہ، کلکتہ

کلیات میر تقی میرؒ میں طبع ہوا۔ سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔ مدرسہ عالیہ کے لئے نوازش تفصیلات سے صاحبان عالی شان کالج کانسلس۔۔۔۔۔ تفصیح مرزا کاظم علی جوان اور مرزا جان طیش و مولوی محمد اسلم و قاری چرن متر۔۔۔۔۔ ۱۸۸۱ء میں مطابق ۱۲۲۶ھ ہجری، ہندوستانی چھاپہ خانے میں چھاپا کیا ہوا۔

رقعات جاتی کا پہلا ایڈیشن مولوی الہ داد نے ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں شائع کیا تھا، اس کے خاتمہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

برزخرف نگاہان پوشیدہ خاند کہ چون برائے صاحبان عالی شان
جامعہ متعلین مدرسہ عالیہ، کہ در مدد کسب مہارت بزبان فارسی اند، از اقاسم نثر
اکثر... مثل بہار دانش و اخلاق محسنی، و انشائی ابوالفضل و اخلاق جلالی،
در رحمت طبع در آمد خوش آتم کہ برائے طبع نثرے برگزینم“ (طبع دوم ۱۲۲۶ھ
۱۸۲۶ء در مطبع ایٹیا بلک لتھیوگرافک کمپنی)

ظاہر ہے کہ صاحبان عالی شان جس مدرسہ عالیہ کے متعلم تھے، وہ فورٹ ولیم کالج ہی ہو سکتا ہے۔ یا کلیات میر کی طباعت جس مدرسہ عالیہ کے لئے ہوئی تھی اس سے بھی کالج مراد لیا جاسکتا ہے، نہ کہ ٹیٹن کالج۔

برہان قاطع مطبوعہ ۱۸۱۵ء، قصہ حاتم طائی (۱۸۱۵ء) مطبوعہ۔

دیگر کے سرورق اور دیا چہ میں مدرسۃ الفیثیہ، مدرسۃ الفیثیہ، اور مدرسۃ عالیہ کالج کے الفاظ ملتے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے لئے لکھے گئے ہیں۔

منتخب الفوائد محمد خلیل علی خان اشک کی قابل قدر تالیف ہے، جو دراصل کتاب آداب الحرب و الشجاعت کا ترجمہ ہے جس کا دوسرا نام اوصاف الملوک و طرق حروبہم ہے۔ اس کے دریا چہ میں مترجم کا یہ بیان ملتا ہے: "اسقر العباد محمد خلیل علی خان نے کہ تخلص جس کا اشک ہے بن بارہ سے چھپس کے درمیان مطابق اسٹارہ سودس غیسوی کے، وقت میں محمد اکبر بادشاہ غازی کے اور مصر میں.... لارڈ منٹگوگورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کپنی انگریز.... اور حکومت میں خداوند نعمت کپتان ٹیلر صاحب دام حشمتہ کی، انتظام میں.... ڈاکٹر ولیم ہٹروڈ دولت کے، کتاب اوصاف الملوک و طرق حروبہم کو، کہ سلطان اتش کے حکم سے جس کو محمد منصور سعید ابو الفرح خلیل نے پیشقت تمام بڑی جدوجہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کر کے تالیف کیا تھا، زبان میں موافق محاورے کے، واسطے مدرسۃ الفیثیہ کے ترجمہ کیا.... نام اس کا منتخب الفوائد رکھا۔ کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی ہے" (مخطوط نمبر ۱۲، اردو ایٹیاٹک سوسائٹی کلکتہ) منقولہ بالا عبارت میں مدرسۃ الفیثیہ، یقیناً فورٹ ولیم کالج کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

سن ۱۸۰۷ میں خرد افروز کالج تیار ہوا، مقدمہ میں مترجم کا بیان حسب ذیل ہے: "بعد حمد و لغت کے شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ ہلال الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر مدلقی، کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد اعلیٰ پہلے عرب سے دکن کو آئے، بعد دو مینشتوں کے شیخ حسن مغفور جنت البلاد بنگلے کو تشریف لائے.... اس حقیقہ نے بیس برس کے سن تک مدرسہ کپنی میں رہ کر علوم عربی و فارسی سے فراغت کی، جو فکر معیشت کی انسان کو لازم ہے، تحصیل علم کے بعد تلاش میں در آیا، اور کپنی بہادر کے اس مدرسہ عالی میں نوکر ہوا کہ جس کی بنا امیر پتہ میرا شرف الاشراف مارکوس دہلوی گورنر جنرل بہادر دام اقبال کے عہد میں ہوئی۔ (مخطوط نمبر ۱۱۸، اردو، ایٹیاٹک سوسائٹی کلکتہ) اس عبارت میں مدرسہ کپنی سے، جہاں شیخ حفیظ الدین نے تحصیل علم کی، یقیناً

مدرسہ عالیہ یا محمدن کالج مراد ہے جو اس وقت تک بیٹھک خانہ روڈ پر واقع تھا۔ اور کمپنی کے مدرسہ عالی سے جس کی بنا گورنر جنرل ویلز کی کے عہد میں ہوئی فورٹ ولیم کالج مراد ہے۔
 فتاویٰ قاضی خان کی چار جلدیں ۱۸۳۵ء میں ایٹاٹک لیتھوگرافک پریس میں طبع ہوئی تھیں، تصبیح کرنے والوں میں ایک نام مولوی حافظ احمد کبیر، امین مدرسہ کمپنی بہادر کا ملتا ہے۔ انگریزی سرورق پر ان کے نام کے ساتھ SUPERINTENDENT OF THE GOVERNMENT MADRAS A نائب سکرٹری کی طرف اشارہ ہے جس پر حافظ صاحب ۱۸۴۲ء ہوئے تھے۔

سید منصور علی بن سید امام بخش حسینی موسوی سبزداری نے فقہ سیف الملوک کا ترجمہ بحر عشق کے نام سے کیا تھا اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "..... کلمتہ میں وارد ہو کر تصنیف منشی گری صاحبان عالیشان نوآموزوں کی تعلیم و درس کے واسطے، مدرسہ میں کمپنی انگریز بہادر دام اقبال، کے تفریق ہندوی میں سرفراز ہوا ہے۔۔۔۔۔ سن بارہ سو اٹھارہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو تین غیسوی (۱۸۸۶ء) کے زبان ریختہ نثر میں ترجمہ کیا (میریق: ۲، مخطوط نمبر ۱۱) یہاں مدرسہ کمپنی انگریز بہادر سے فورٹ ولیم کالج مراد لیا گیا ہے۔
 اقتباسات منقولہ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مدرسہ عالیہ، مدرسہ عالی، مدرسہ کمپنی

۱۔ حالات کیلئے دیکھئے: تذکرہ کاٹلان رامپور ص ۲۹، تاریخ مدرسہ عالیہ ج ۱ ص ۶
 حافظ صاحب کی نگارنی میں ایک ہفتہ وار (آئینہ گیتی نامی) کے نام سے شائع ہوتا تھا شاہ الفتین فریاد اسی ہفتہ وار کے سلسلہ میں راجہ بھوپ سنگھ کو لکھتے ہیں: الحال اخبار یکہ کمی با آئینہ گیتی ناست، مظہر محاسن آن موقوف بر مطالعہ عالی است، مدرسہ عالیہ باہتمام فاضل محریہ عالم بے نظیر حافظ احمد کبیر صاحب مطبوع می شود۔ قطعاً از این بجالی خدمت ہم سمت ابلاغ می یابد اگر پسند جناب سامی باشد، بفقیر سوارود کہ در بندگی حافظ صاحب اعلام کمر۔ تا در ہر ہفتہ بخد مت عالی رسیدہ باشد (ریاض الافکار۔ تذکرہ فریاد)

کا اطلاق فورٹ ولیم کالج پر بھی ہوتا تھا اور کبھی محمدن کالج سے تمیز کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج کو مدرسہ جدید کہتے تھے (دیباچہ انتخاب لطانیہ — مخطوط نمبر ۱۹، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، لیکن کسی قید احترازی کا التزام بہر حال غیر ضروری تھا۔

مرزا غالب کی تحریر میں مدرسہ سرکار کپنی سے مدرسہ عالیہ یا محمدن کالج کی طرح فورٹ ولیم کالج بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ اور جب دونوں باتوں کا احتمال ہے، کوئی وجہ نہیں کہ مشاعرہ کی جگہ خاص طور پر محمدن کالج یا مدرسہ لیکو قرار دیا جائے۔ اس ترجیح کے لئے کسی خارجی دلیل یا کم از کم قریبہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں اہل تحقیق میں سے جن لوگوں نے مراحت کے ساتھ مدرسہ سرکار کپنی سے ولزلی اسکوائر کے مدرسہ عالیہ کو مراد لیا ہے ان کی تحریر میں دلائل و قرائن سے یکسر خالی ہیں۔

تھوڈی درے کے لئے اگر دوسرے احتمال کو تسلیم کریں اور غالب کے مدرسہ سرکار کپنی سے فورٹ ولیم کالج کو مراد لیں تو ہمارے خیال میں یہ ایسا احتمال ہے جسے مستبعد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ تمام تر قرائن سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی روایات میں مشاعرہ بجا طبع پر شامل رہا ہے اس کالج کے تحت ترجمہ و تالیف کا جو مصیغ قائم ہوا اس سے اردو زبان کے نثر نگار اور شاعر دونوں قسم کے ادبا و مستلک تھے اور منتخب اصحاب قلم اور شاعروں کی خاصہ جماعت فراہم ہو گئی تھی جس نے اپنی ادبی رجحان اور شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے کلکتہ میں مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ یہ شاعر پیراں بڑے اہتمام کے ساتھ ۲۵ جولائی کو منعقد ہوتا تھا۔ اس میں کلکتہ کے تمام چھوٹے بڑے شاعر ہم طرحی غزلیں سنتے تھے۔ اردو کے محسن اور دلدادہ انگریز بھی اس میں دل چسپی لیتے تھے اور ان کی نگرانی میں یہ مشاعرہ ایک با مبالغہ شاعرانہ مقابلہ اور علمی دھچل ہو گیا تھا۔

۱۸۶۲ء میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں کالج نے مرزا جان پٹش کے کلیات کا نسخہ خریدا اور اس کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دینے کے علاوہ کلیات کو شائع کیا۔

(ملاحظہ ہو: اربابِ نثر اردو ص ۲۵۹-۲۵۷)

منشی بینی نرائن جہان کی تالیف دیوانِ جہان میں جس کا کلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے ۲۵ جولائی ۱۸۵۱ء کے مشاعرہ کی غزلیں گل دستہ کی شکل میں درج ملتی ہیں۔ غزل ہزاروں میں کاظم علی جوان، میر حیدر بخش حیدری، سید جعفر علی روان، افتخار الدین علی خان شہرت مرزا ہاشم علی عیان (پسر جوان)، ابوالقاسم خان قاسم، میرزا قاسم علی ممتاز (پسر جوان) مرزا الطیف علی ولد نظر تے ہیں۔

۱۵ دیوانِ جہان کا ایک کاپی نسخہ ایذا ملک سوسائٹی میں نظر آگیا اس میں مشاعرہ کی تاریخ سنہ کے بغیر درج ہے (دورق ۱۷۳-ب، مخطوط نمبر ۵۶)

۱۶ ابوالقاسم خان قاسم کے لئے دیکھے مولانا مہر کی کتاب غالب (ص ۲۱۳-۱۱۲، ۱۱۱) نیز دیوانِ غالب تبریزی (ص ۱۳۳) مولانا مہر لکھتے ہیں: قاسم کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی وہ فارسی کے شاعر تھے۔ مولانا مہر نے قاسم اور طپاں کی مدح میں غالب کا ایک قطعوں (نقطہ لکھنؤ) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ دیوانِ جہان میں بینی پر شاد لکھتے ہیں: قاسم تخلص نام ابوالقاسم خان، خاندان شاہی سے کچھ قربت رکھتے ہیں اور اس خاک را کو بھی ان کی خدمت میں نیاز ہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف لکھتے ہیں (دورق ۵۴، ۵۵-ا) اس کے بعد قاسم کی تین غزلیں نقل کی ہیں:

(۱) سچے دی انداز مے طرز سخن کا نالہ ہوسنا جس نے کبھی مرغِ چین کا (کل، آیات)

(۲) شور و فغاں ہے متعللوں کی کچھ دھڑھڑ شاید دلِ جاں یارِ مرگ دلِ مرحوم ہے (کل ۹ شعرا)

(۳) اشکوں سے ہر خمرہ ہے مری نرسوں کی شاخ پھولوں میں کیا گنتی ہے یہ میری چمن کی شاخ (کل، بیت)

۲۵ جولائی کے مشاعرہ میں قاسم نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع ہے:

ہجر میں اک گل کے گل ہاتھوں پہ کھایا چاہیے ہاتھ کو گل دستہ رنگین بنایا چاہیے
منقطع میں فرماتے ہیں:

لگ رہی ہے لوبھی قاسم کئی دن سے ہیں حضرت دہلی کو کلکتہ سے جایا چاہیے

(دیوانِ جہان، دورق ۱۷۶-ارب ۱۷۷-ا، رظ)

سالانہ مشاعرہ کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کالج سے منسلک حلقہ شعراء کے اہتمام میں ہر مہینے مشاعرے ہوتے ہوں گے، جن میں اردو فارسی کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ ظاہر یہی سلسلہ غالب کے قیام کلکتہ کے زمانہ تک باقی رہا جس کا تذکرہ انھوں نے صدائیں باندھ کے خط میں کیا ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ یا محمدن کالج میں کبھی مشاعرہ کا منعقد ہونا ثابت ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ پابندی کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کے پہلے التوار کو بزم سخن کا ارستہ کیا جاتا جو خاص اہتمام چاہتا ہے، وہ کسی مدرسہ کے علماء اور اصحاب فن کے مذہبی، حول، دینی مذاق، اور مدرسی مزاج سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا اس کے برعکس فورڈ ٹیمپل کالج کے حلقہ ادب سے وابستہ اصحاب شعر و سخن کے زیر اہتمام، ان کے ذوق، میلان طبع مخصوص ادبی رجحان اور شاعرانہ ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر مہینے ایک مقررہ دن میں بزم سخن منعقد کرنے کی بات ہمہ وجوہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مرزا غالب کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے، کہ یہ مشاعرہ ہر مہینے، پہلے التوار کو ہوتا تھا۔ مدرسہ عالیہ (محمدن کالج) میں جمعہ کے سوا ہر روز تعلیم ہوتی تھی التوار کا دن بھی درس و تدریس کے ایام میں شامل تھا۔ ۱۸۶۹ء کی ترمیم کے بموجب مدرسہ التوار کو پورے دن بند رکھا جانے لگا۔ اس طرح مدرسہ کے اسٹاف کو ولزلی اسکوائر کی نہایت بڑی میں منتقل ہونے کے بعد بھی اتنی فرصت کہاں ملتی ہوگی کہ ہر مہینے پہلے التوار کو بزم سخن آراستہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ علاوہ بزمیں مدرسہ کا اسٹاف غالب کے قیام کلکتہ کے بعد تک اس قدر محدود تھا کہ اس کے لئے مشاعروں کا اہتمام کرنا خاصہ دشوار کام تھا۔ ظاہراً اس وقت تک پشمولیت مدرسہ اول کل پانچ اسٹاذ اور خطیب و مؤذن اسٹاف میں ہوتے تھے۔ (تاریخ مدرسہ عالیہ: ۶۳-۶۵ حصہ اول) پھر مشاعرہ کی مجلس معمول نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ سامعین کی فائز کمزرت ہوتی تھی اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ آپ خود

مرزا کی زبانی سن چکے ہیں کہ جس مشاعرہ میں ان پر اعتراضات کئے گئے، اس میں پانچ ہزار کا مجموعہ تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ مدرسہ کا اندر روئی محسن پانچ ہزار کے لگ بھگ مجموعہ کے لئے 'جائے تنگ' است و مردماں بسیار کا مصداق ہے۔ اس محسن میں اتنے بڑے مجموعہ کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مرزا غالب نے کلکتہ کا سفر جس مقصد سے کیا تھا اس میں کامیابی کا راستہ کچھ اسی طرح ہموار ہو سکتا تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب علم و ادب سے تعلق و تعارف پیدا کیا جائے۔ لہذا یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ غالب فورٹ ولیم کالج سے یکسر بے تعلق رہ گئے ہوں۔ غلی الخفصہوں جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج مرزا غالب کی مراجعت کے بعد بھی ایک عرصہ تک کمپنی کے ارباب بسط و کشادگی محالفتوں کے باوجود اپنی میٹرز روایات کے ساتھ قائم رہا۔ مشنری باد مخالف کے نفع سے جن لوگوں کے پاس گویا بطور معدت نامہ بھیجے گئے تھے ان کے نام خود مرزا غالب نے بتائیے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا تعلق مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ثابت نہیں اس کے برعکس مولوی کریم حسین بگلرانی فورٹ ولیم کالج کے قدیم کارپرداز نظر آتے ہیں جو اواخر میں ۱۸۳۱ء تک یقیناً کالج کے میٹرنری رہے اور یکم جون ۱۸۳۱ء سے سوریہ پیش پرتعلقہ خدمت سے سبکدوش کئے گئے۔

۱۷ فورٹ ولیم کالج کے غلام میں تخفیف کا فیصلہ خط مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۳۱ء کی رو سے کیا گیا اور اس کا نفاذ یکم جون ۱۸۳۱ء سے عمل میں آگیا شعبہ فارسی میں کریم حسین بگلرانی کے علاوہ عبدالرحیم، نذر اللہ، بدر علی معوض تخفیف میں آئے۔ شعبہ ہندی کے تارنی چرن، میٹرنری علی مرتضیٰ خان اور شعبہ بنگلہ کے رام کار، اور گدادھر، اسی تاریخ سے سبکدوش کئے گئے۔ اور ہر ایک کی پیش مقرر ہو گئی اور آئندہ کے لئے طے کر دیا گیا کہ کالج کا عملہ سکرٹری اور دو اکرادہ میٹرنری ہو گا جس میں بہت محدود اور ناگزیر تعداد منشیوں اور پتلہ لکھ کی شامل ہوگی۔

مولوی عبدالقادر امپوری اگر وہی مفتی عبدالقادر عظیمی ہیں جن کا ذکر شوق نے کیا ہے۔ تو وہ بھی قطعاً کمپنی کے کارپردازانِ قدیم سے تھے۔ صرف مولوی نعمت علی عظیم آبادی کا حال کچھ نہیں کھلتا، پھر بھی کلکتہ مدرسہ سے ان کا رشتہ جوڑنا خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے زیرِ اہتمام ہوا تھا تو مشنری کے نسخوں کا مدرسہ سے وابستہ حضرات میں سے کسی ایک کے پاس نہ بھیج کر فورٹ ولیم کالج اور کمپنی کے راست خدمت گزاروں کے پاس بھیجنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں!

مذکورہ بالا دلائل و وجوہ کی روشنی میں ہمیں اس عام خیال سے اتفاق کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کہ مرزا غالب نے جن مشاعرہ میں شرکت کی تھی، وہ مدرسہ عالیہ ولزلی اسکوائر میں منعقد ہوا تھا۔ جبکہ پیش کردہ دلائل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس مدرسہ سرکار کمپنی میں ہر انگریزی پسند کے پہلے اتوار کو مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا اس سے فورٹ ولیم کالج ہی مراد لیا جاسکتا ہے۔

(ملاحظہ فرمائیے: BENGAL PAST AND PRESENT: ۱۳۸-۱۳۹ء، فارسی) خالیہ کے قیام کلکتہ کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج کا سکریٹری DAVID RUDDLE۔ زبان کے شیرانیوں میں تھا۔ ۱۳۲۷ء میں اس عہدہ پر مقرر ہوا اور ۱۳۳۲ء میں استعفیٰ ہو کر یورپ چلا گیا۔ دوبارہ ایران ہو کر ہندوستان پہنچا تھا کہ ۱۶ دسمبر ۱۳۳۷ء کو شیراز پہنچ کر فوت ہو گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے لئے جو عمارت مخصوص تھی اس کا محل وقوع ڈھلوزی اسکوائر کے جنوبی سمت، کونسل ہاؤس اسٹریٹ کا ایک گوشہ تھا اسی عمارت کے بالمقابل ایک دوسری عمارت بھی کالج کی ضروریات کے لئے صرف میں لی گئی تھی اور دونوں عمارتوں کو ایک گیلری کے ذریعہ ملا دیا گیا تھا۔

ملاحظہ ہو: H-E-A-COTTON, CALCUTTA OLD AND NEW, 23, CALCUTTA-1907۔ ۲۴ فروری ۱۸۵۷ء کو فورٹ ولیم کالج حکماً بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ لیوڈ آف اکرا منسز قائم ہوا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کا نام آئندہ ایک قرضہ تک بعض ذمہ دار عہدہ داروں کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ولیم ناسریس نے فتوح الشام از دی کا، انگریزی دریا چہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے۔ FORT WILLIAM COLLEGE, 1st JULY, 1854 دیا چہ میں مولوی کبیر الدین احمد کی اطلاع کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

IN THIS I WAS MUCH ASSISTED BY MAULVI KABIR UDDIN AHMED OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM (PREFACE, VI)
مولوی کبیر الدین احمد اور ناسریس کے اشتراک میں اس طلبہ اور محقق پیشو ڈپارٹمنٹ (کلکتہ یونیورسٹی) کے لئے ایک فارسی کتاب: نام قدیم کتب
ہوا تھا۔ اس کے انگریزی دیباچہ کے آخر میں لکھا ہے:
COLLEGE OF FORT WILLIAM, 1st SEPTEMBER, 1863

غالب اور معراج الخیال

ڈاکٹر شریف حسین صاحب قاسمی، ایم۔ اے شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی

سید میر دوزخ علی عبرتی عظیم آبادی، انیسویں صدی عیسوی کے ایک برجستہ فارسی مصنفین میں سے ہیں۔ فارسی میں ان کی تقریباً سترہ تالیفات آج بھی محفوظ ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ ہمیں اس وقت عبرتی کی دیگر تعانیف سے سروکار نہیں، البتہ ان کے تذکرہ ”معراج الخیال“ میں غالب کے ترجمہ کو پیش کرنا مقصود ہے۔

عبرتی نے دو تذکرے فارسی میں تصنیف کیے ہیں۔ ایک تذکرہ معراج الخیال^(۱) ہے جو فارسی شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا تذکرہ ”ریاض الافکار“ ہے جس میں سب سے زیادہ فارسی نثر نگاروں کے ترجمے شامل ہیں ”ریاض الافکار“ کا مختصر تعارف نثار احمد قادری اپنے ایک مضمون بعنوان ”غالب اور ریاض الافکار“^(۲) میں جوای موقر سالر کے ایک پچھلے شمارہ میں چھپا تھا، کراچیکے ہیں۔

(۱) ایشیاٹک سوسائٹی، شمارہ خطوط ۴۰، یہ ماہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں نکلا گیا ہے اور اس کا سائز ۸×۱۰ ہے۔

(۲) فاروقی صاحب کا یہ مضمون، ان کی تصنیف ”تلاش غالب“ ص ۱۹۵-۱۹۸ میں شامل ہے۔

معراجِ الحیال ۲۵ شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل بیشتر شعرا اٹھارویں صدی عیسوی کے اور خداداد انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں مکمل ہوا۔ عبرتی نے اس موقع کی مناسبت سے ایک تاریخی قطعہ کہا ہے جو ”معراجِ الحیال“ میں موجود ہے اور اس قطعہ کے مندرجہ ذیل شعر میں ”نظمِ روانی“ سے یہ سنہ برآمد ہوتا ہے:

چو فکر سال ترتیش نمودم چکید از خار ام نظمِ روانی^(۱)

۱۲ ۵ ۷

اس کے برخلاف عبرتی نے ”ریاض الافکار“ ۲-۱۸۵۱/۱۲۶۸ میں لکھنا شروع کیا اور اسی سال اسے مکمل کر لیا۔ یعنی ”ریاض الافکار“ ”معراجِ الحیال“ سے گیارہ سال بعد معرضِ وجود میں آیا۔ مزید برآں عبرتی نے غالب کے متعلق جو کچھ ”معراجِ الحیال“ میں لکھا ہے وہ مفصل تر ہے اور ”ریاض الافکار“ میں شامل غالب کا ترجمہ اسی کا اقتباس ہے۔

عبرتی صحفاً غالب سے نہ مل سکے لیکن عبرتی نے اپنے دونوں تذکروں میں غالب کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے ”معراجِ الحیال“،، سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے شاگرد خواجہ حیدر جان متخلص بشائق^(۲) سے عبرتی ملے تھے اور شائق نے عبرتی سے اپنے

۱۔ معراجِ الحیال: ورق ۸۵ الف

۲۔ ان کا نام خواجہ فیض الدین عرف حیدر جان اور تخلص شائق تھا۔ یہ جاگیرگر دھاک کے رہنے والے تھے اور ۳-۱۸۵۲/۱۲۶۹ میں فوت ہوئے: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تلذذۃ غالب: (مالک رام)، مرکز تصنیف و تالیف، نکلور،

اساتذہ کی بہت تعریف و صیغ کی تھی۔ لیکن یہ امر تعجب ہے کہ عبرتی اپنے دونوں تذکروں میں غالب کی جائے پیدائش ”دار السلطنہ دہلی“ بتاتے ہیں جو درست نہیں بہر حال اس طرح کا تساہل فارسی اور اردو کے بیشتر تذکروں میں نظر آتا ہے۔

معراج الخیال میں غالب کا ترجمہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں ایک ہم عصر شاعر اور مصنف نے غالب کے ساتھ کلکتہ میں پیش آنے والے ادبی معرکہ کا صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں اپنی رائے دی ہے اور معترضین پر غالب کی بالادستی کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ لوگ جو غالب کو مرزا قلیٰ پر ترجیح دیتے ہیں وہ تکلف سے کام لیتے ہیں یعنی انصاف نہیں کرتے۔

عبرتی نے کلکتہ میں رونما ہونے والے معرکہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے چونکہ عبرتی اس واقعہ کے صرف تین سال بعد ۱۸۳۱/۱۲۴۸ میں کلکتہ گئے تھے^(۱) اور ظاہر ہے کہ عبرتی نے اس واقعہ کے ردِ عمل کو خود مشاہدہ کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ شائقِ کلکتہ اور دہلی آئے تھے اور کلکتہ میں ہی غالب سے ان کی ملاقات ہوئی^(۲)۔ چونکہ غالب کی کلکتہ سے واپسی کے صرف تین سال بعد عبرتی کلکتہ پہنچے تھے اور ممکن ہے کہ شائق اس عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے ہوں اس لئے غالباً حیدر جان شائق سے عبرتی کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔

عبرتی نے غالب کی فارسی اور اردو نظم و نثر کی بہت تعریف کی ہے بہر حال ”معراج الخیال“ میں غالب کے ترجمہ کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ غالب کے فن کے متعلق ان کے ایک ہم عصر کے خیالات کا علم ہو سکے: ”غالب: اسم شریف آن لغز کلام، معنی تلاش، اسد اللہ خاں است: مولد حمیدہ اش خاں جو ہر خیز دار السلطنہ دہلی، بقصر می از شاہ جہاں آباد وارد شہر کلکتہ گشت^(۳) سخن نہاں کلکتہ

(۱) عبرتی نے اپنی مختصر سوانح حیات اپنی ایک تعینف حملہ سکندری (یا کی بعد لا بُرہی، شمار ۲۴۹۲)

میں لکھی ہے۔ (۲) تلامذہ غالب، ص ۱۶۸۔

(۳) غالب اپنی پیش سے متعلق مقدمہ کی پیروی کے لیے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ گئے تھے، ذکر غالب (طبع سوم) ص ۵۷۔

پہلے دانی آن سیف سان نبرده، حریفانہ آوینیشی باو کردند، چون آن مفتنم روزگار خلی سخن رس و ماہرین فن بود، کسی را از انجماط برخوردستی نداد، بلکہ ہمہ را مہر سکوت برب نیسان نہاد۔ چنانچہ مختصر سنونے کے درمناظرہ اہل مکتبہ بنظم در آورده شاہدین مقال است۔ مگر بعض سخن شناسان کہ بر مرزا قلیل آٹالی افکار رائج میدہند، خالی از تکلف نمی نمایند بن محرر اوراق را ہم چیز نظم و نثر آن معنی یا بـ بر بیاضی نظر درآمده۔ البتہ در پارسی زبان شعری از فادفعات بارش مسجکہ کہ یاران ہم ضرر اداں از فکر شعری سرود میگردن نثری از قلم بلاغت نگارش می بریزد کہ تنگ نگاہان این فن سپند از مردم دیو بر آن می سوزند و ہچنان در ہندی زبان ہم از خوشگویان ادب اندمی بایش پنداشت۔ از زبان خواجہ حیدر جان مخلص بشارتی کہ از شاگردان عالی گفتار باشد، شنودیم کہ خلی وارستہ مزاج و آزادانہ طبیعت زسیت فرمودی، بہر بزمی کہ تشریف دادی، پردہ گوش اہل بزم از رنگین مقالی خویش روکش فصل بہار ان ساختی۔ تادم تحریر این تذکرہ بشاہ جہان آباد بعیش و کامرانی میگذازد۔ جز این چند سطر از حال خجستہ مالش، بگو شتم نخورده کہ زیب رقم میداد، ازان غالب موصوفہ خدائی است “عبرتی نے ”معراج الحیال، میں غالب کی جو غزل نقل کی ہے اس میں صرف پانچ شعر ہیں۔ اس کے برخلاف ضیاء الدین احمد خان نیر کے مرتبہ غالب کے فارسی دیوان اور نوکشور کی مطبعہ غالب کی فارسی کلیات نظم میں اس غزل کے بارہ شعر ملتے ہیں جو شعر عبرتی نے نقل کیے ہیں وہ بغیر کسی اختلاف کے ان دونوں تذکرہ دیوان اور کلیات میں موجود ہیں ”معراج الحیال“ میں موجود غزل ذیل میں نقل کی جا رہی ہے:

جنون مسم بفضل نو بہارم میتوان کشتن	مراجی بر کف و گل در کنارم میتوان کشتن
تفا غلہای یارم زندہ دارد و دہ در بزمش	بجرم گریہ بی اختیارم میتوان کشتن
جفا بر چون فنی کم کن مگر کشتن ہوس باشد	بدوقی مزدہ بوس و کنارم میتوان کشتن
بجرم اینکہ درستی بی پایان بردہ ام عمری	بکوی میفروشان در خمارم میتوان کشتن
مگر تم یار باشد بی نیاز از کشتن غالب	بمردی بی نیاز بہای یارم میتوان کشتن

(۱) یہ بیاض عبرتی کے دوست میر ذوالفقار علی نے ترتیب دی تھی: ریاض الافکار، ۱۹۷۷ء الف۔

بحوالہ کش غالب، ص ۱۴۸ (۲) معراج الحیال: ۵۱ ب ۵۲۔

ادبیات

انسان

ڈاکٹر اسماعیل - ایم - اے - بی ایچ - پی - ایم ڈی دہلی

آج بھی شام اور سحر ہے وہی
 آج بھی ہے حسین چمن کی فضا
 آج بھی آبشار ہیں دلکش
 آج بھی لالہ زار اور صحرا
 آج بھی ہے کشش بہاروں میں
 آج بھی ضو فشاں ہیں نجم و قمر
 آج بھی آگ کا مزاج ہے گرم
 آج بھی آہ سادہ دل شبنم
 آج بھی آسمان سے بادل
 آج بھی فطرت نسیم سحر
 قاعدے سب وہی ہیں قدرت کے
 کیوں مگر یہ بدل گیا انسان
 سینہ گیتی کا اس سے ہے لرزاں
 مانگتے ہیں بہائم اس سے پناہ
 ظلم سفاکی اور چالاک
 قتل و غارت گری و خونریزی

گردشِ وقت کا اثر ہے وہی
 خطر بار و خنک ہے بادِ صبا
 وادی و کوہِ سار ہیں دلکش
 دل پہ کرتے ہیں اک اثر گہرا
 نزہت و دلکشیِ نظاروں میں
 لہر کی پڑتی ہے کرن سب پر
 طبعِ گل آج بھی ہے نازک و نرم
 رکھتی ہے اپنی آنکھ کو پر خم
 خشک صحرا کو کرتے ہیں جلِ تھل
 گل فشاں سہی ہے اور سرورِ آود
 رسم و آئیں، اصولِ فطرت کے
 کیوں ہے تخریبِ کاری اس میں نہاں
 ہے دلِ کائنات کیوں ترساں
 اس کا شیوہ الگ، الگ ہے راہ
 اس کی طینت میں جھوٹ، بے باکی
 رہنری جوہر اور بے رحمی

بغض و نفرت، خصومت و غیبت
 مکر و تزویر و کذب، خود غرضی
 ظاہری خلق و ظاہری اُلفت
 ظاہری ہمد می و دلجوئی
 ظاہری خوشنمائی و خوبی
 خود تمنائی و خود سری و غرور
 خود فریبی، تصنع، جہل و ظلم
 صلہ جوئی بہانے لاف و گراف
 شکلِ انساں میں ہے یہ اک ابلیس
 جہل و شر اور فساد سے معمور
 اس کا ایماں ہے دولت و شہرت
 خود پرستی و تمکنت، نخوت
 آرزوئے ستول و سطوت
 اس کے سارے تمدن و آداب
 اس کی تفریح رقص و بے شرمی
 شغل ہیں اس کے بے شمار و عجیب
 بربریت ہے اس کا ادنیٰ شغل
 کھیلتا ہے یہ خون کی ہولی
 جانتا ہے مآلِ ظلم و ستم
 رشوت و سود خواری اس کا شعار
 نفس کا بندہ عشرتوں کا غلام

غیب جوئی، عداوت و تہمت
 جعل، فن و فریب بد غہدی
 ظاہری نیکی ظاہری عفت
 ظاہری مہر و نرمی، ہمدردی
 ظاہری ہر ادا کے محبوبی
 دوسروں کی تباہی پر مسرور
 شرمسار اس سے ہیں فنون و علوم
 خوبیاں اس کی اس کے ہیں اوصاف
 یہ کسی کار فیت ہے نہ انیس
 ہر ادا میں کراہتیں مستور
 اس کا یزداں ہے منصب و عزت
 حرص زر، حرصِ حشمت و شوکت
 برتری اور دبدبہ عظمت
 فی الحقیقت تباہی کے اسباب
 ارغوانی شراب کی گرمی
 عادتیں اس کی ہیں عجیب و غریب
 گم مشینوں میں اس کی فہم و عقل
 آنکھ ظلم و ستم سے کب کھولی
 پھر بھی کرتا نہیں یہ رحم و کرم
 عیش و عشرت سے رنگ پر ہے نگار
 دشمنی دل میں لب پہ شیریں کلام

دوستی میں نہاں ہے غداری
جو دو بخشش ہے اس کی مکاری
مصلحت کا اسیر و ابن الوقت
کیا یہی ہے وہ محترم الناس
جو ملائک کا تھا کبھی مسجود
عالم رنگ و بود کی وجہ بنا
جس سے ہے کائنات کی تکوین
ہیں تصرف میں جس کے مہر و ماہ
ہیں گھٹائیں فضا میں جس کے لیے
پھول کا حسن رونق گلشن
کوہ و صحرا و گلستاں بستی
سب ثوابت تمام ستارے
بحر و براہر اور باد و بہار
گردش وقت و صبح و شام حسین
ہے تصرف میں جس کی ہر اکٹھے
جس کو بخشی ہے حق نے اک قدرت
جس کی تخلیق پر خدا کو ناز
کی عطا جس کو عقل و فہم و ادراک
وسعتِ دل، بلندیِ احساس
علم و فن نطق و دانش و حکمت
ذہن کی ہر بلندی و رفعت

طنز و طعنت بہ شکل غم خواری
اک مدد اور لاکھ غیاری
عقل کا بودا اور دل کا سخت
جواز ل سے ہے نائبِ یزداں
حسبِ تعمیلِ قادر و معبود
جادو داں ہے کبھی نہ ہو گافنا
جو ہے دنیا کا سب سے اعلیٰ مکیں
سارے گردوں ہیں ایک گردِ راہ
نرم و نازک ہوائیں جس کے لیے
وادی و آبشار و دشت و دمن
دونوں عالم کی رفعت و پستی
چرخ کے و فربہ نظارے
سب ہیں جس کے لیے جو ہے مختار
جس کی منت پذیر جس کی رہیں
کر لیے جس نے بحر و بر سب طے
جس کا تابع ہے عالمِ فطرت
منکشف جس پر کر دیئے سب راز
تا کہ ہو آشنائے ذاتِ پاک
پختگی یقین اُمید اور آس
عزم و جرات شجاعت و ہمت
جستجو شوقِ کام کی رغبت

راحت و عیش، حسن کا افسوں
 ڈالتا ہے جو آسماں پہ کمند
 پاکبازی رُوح کا سرور
 مالکِ کائنات و سرور کے
 کیا یہی ہے وہ ناسپاس انسان
 حق تعالیٰ نے انتقام کیے
 آشتی، امن و عافیت کے لیے
 رشد، نیکی، سلامتی کے لیے
 چارہ درد و رنج و غم کے لیے
 عالمی سہائی چارگی کے لیے
 دفع شر و فساد کی خاطر
 اس کی بہبودی جہاں کے لیے
 جہل کے انفعال کی خاطر
 کفر کے انحطاط کی خاطر
 رہنما اور ہادی اکبر
 راستہ خیر کا بتائیں اُسے
 گرمیِ دین و جوشِ ایمانی
 راستی، سادگی و نرم دلی
 ہمدی و شرافت و نرمی
 بے ریائی و زہد اور عفت
 صبر و محنت و تحمل و ہمت

آرزو و امید و سوزِ دروں
 عشق کا جذبہ لطیف و بلند
 آنکھ کا نور و برتری و شعور
 ہیں یہ احسانِ خدائے برتر کے
 جس پہ ہیں اس کے اس قدر احسان
 جس کی تعلیم و تربیت کے لیے
 درسِ دین و معاشرت کے لیے
 نورِ ایمان و آگہی کے لیے
 رحم و انعام اور کرم کے لیے
 عالمی امن و دوستی کے لیے
 باہمی اتحاد کی خاطر
 اپنے بندے کے امتحاں کے لیے
 شرک کے ابتدال کی خاطر
 دائمی انبساط کی خاطر
 کیے پیدا خدا نے پیغمبر
 تاکہ پیغامِ حق سنائیں اسے
 تاکہ پیدا ہو اس میں ہر خوبی
 ہوشمندی خودی، خرد مندی
 غمگساری و غمبزد و ہمدردی
 مہر و اخلاص و گرمیِ الفت
 زہد و فقر و توکل و غیرت

اعلیٰ کردار اور نیک دلی
یاد شاہی میں شانِ درویشی
جوش و عظمت بلندِ اعمال
حُبِّ اللہ اور وفاداری
صدق و ایثار و عزّت و حرمت
کبر سے احتراز اور دوری
درسِ پیغمبران کی یہ انساں
رہنما، ہادیوں کی محنت سے
بزمِ انسانیت کا روح رواں
اس کے جبروت سے ہر اک لڑاں
محو حیرت تھے آسماں پہ ملک
خسرواں اس سے مانگتے تھے اماں
تذکرے اس کے تھے کبھی گھر گھر
پر جلال و منور و رخشاں
بے نیازی تھی اور خوش خلقی
یاد شہ تھا قلندری میں یہ
جاہ و منصب کی دلبری سے نفور
اس سے جنت ہر ایک دشت و دمن
بیکسوں کا تھا وارث و والی
حکمران، اک خلیفہ و خادم
بے ریا یہ تھا صادق و ہمد

ضبط و حلم و حیا و نفس کشی
سعی و جہدِ عمل ابو العزّی
پاکبازی و پاکِ افعال
خوفِ اللہ اور خدا ترسی
حُبِ انسان و دل دہی شہقت
عیش سے اجتناب و بے زاری
درسِ پیغمبران سے یہ انساں
سارے پیغمبروں کی ہمت سے
بن گیا تھا یہ نازشیں دوراں
اس کی تقدیس پر تھے سب حیراں
اس کی ہیبت سے کانپتے تھے فلک
رعب سے اس کے بادشہ تیراں
امن و انسانیت کا تھا پیکر
نیکوں سے تھی زندگی تاباں
انکساری تھی اس میں بے غرضی
تھا قلندر تو نگری میں یہ
دولت و زر کی سروری سے نفور
اس سے شاداب تھا جہاں کا چین
تھا کرم اس کا بیکراں عالی
اپنے عیبوں پہ منفعل نا دم
تھا غم و گمراہ خود اس کا غم

خود پسندی سے رہتا یہ بیزار
علم و عرفاں کا سرسراک نور
عیب جوئی سے مجتنب تھا یہ
شخصیت میں تھی اس کی اک تاثیر
عدل و انصاف گستری تھا شعار
اس کا کردار ایک کوہِ خطیم
وقت کا تھا یہ حاکم و آقا
منکسر، محنتی و مخلص تھا
تھا شجاع و بہادر و جانباز
فرض آگاہ و حق شناس درحیم
اس سے آباد تھے یہ میخانے
تھا وجود اس کا برکتوں کا سبب
صابر و قانع و حلیم و غیور
رزم اور بزم میں سدا مشغول
سعی و کوشش کا تھا یہ اک طوفان
تھا وسیع النظر دلی بیدار

تھا مثل اس کا بذل و ادیشار
روشنی جس کی تھی قریب و دور
وقت کا اپنے محتسب تھا یہ
اعتماد و یقین کی تصویر
ہر ادا میں نہاں تھا ضبط و وقار
لطف اس کا تھا ایک لطفِ غیم
وقت کا حیف یہ غلام ہوا
بذل و جود و کرم سے مفلس تھا
جاننا تھا یہ زندگی کا راز
شفیق و پاکباز اور کریم
بادۂ حق سے پڑتے تھے پیمانے
خیر و انصاف، رحمتوں کا سبب
آزمائش میں مطمئن مسرور
گاہ شمشیر و گاہ تھا اک شہول
حوصلہ، غزم و جستجو کا جہاں
پاک ذہن و نگاہ سجدہ گزار

کیوں مگر یہ بدل گیا انسان
حیف، تھا یہ تو نائبِ یزداں

تبصرے

احساس : چھوٹا اخباری سائز کتابت و طباعت بہتر۔ چندہ سالانہ چھ روپے پتہ : دودھ پور۔ علی گڑھ۔ مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملک کے مشہور اور صاحب تعالیف کثیرہ عالم اور اہل قلم ہیں۔

یہ ہفتہ وار اخبار مولانا کی ادارت میں ابھی چند ماہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کا قدم برابر ترقی اور اصلاح کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یوں تو ہر اشاعت میں متعدد اصلاحی اور مذہبی مضامین ہوتے ہی ہیں بڑی بات یہ ہے کہ یہ اخبار اپنے فاضل مدیر کے تعمیری اور اصلاحی افکار کا ترجمان ہوتا ہے۔ امید ہے کہ یونیورسٹی کے طلباء کے علاوہ عام مسلمان بھی اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ لیکن شروع کے صفحہ پر ایک مختصر عبارت کو عربی حکم سے لکھنا اور پھر مضمون متعلقہ کے بھی بعض جملوں اور عبارتوں کو منتخب کر کے درمیان مقالہ میں الٹی سیدھی سطروں میں نمایاں طور شائع کرنا ایک مذہبی اصلاحی ہفتہ وار کے لئے نامناسب ہے۔ اس سے پروپیگنڈہ بازی بھی ہو آتی ہے اور اسی وجہ سے بعض اخباروں نے اس کو اپنا دھڑ بٹا لیا ہے۔

امریکہ کے کالے مسلمان : از ڈاکٹر مشیر الحق تقیہ خورد، ضخامت ۳۲ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت ۲ روپیہ۔ پتہ : مکتبہ جامعہ لیڈز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵۔

امریکہ کے کالے مسلمانوں پر وقتاً فوقتاً اردو اخبارات میں مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن اب تک اردو میں اس موضوع پر کوئی مستند اور جامع کتاب نہیں تھی۔ یہ کتاب اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہے۔ لائق مصنف نے کٹاواں چھ سات برس مقیم رہ کر

ان لوگوں کا قریب سے مطالعہ کیلئے ہے اور ساتھ ہی اس موضوع پر انگریزی میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس بنا پر یہ کالے سلمان کون ہیں؟ ان کی کتنی قسمیں ہیں؟ ان میں کیا کیا تحریکیں پیدا ہوئیں؟ ان تحریکوں کے بانی کون تھے؟ ان کا مقصد و مقولہ اور ان کی تنظیمات کیا ہیں؟ ان کے عقائد، عوائد رسم و آداب کے معاشرتی ادب کیا ہیں؟ یہ کتاب ان سب امور پر روشنی ڈالتی ہے۔ زبان صاف ستھری اور مورخانہ ہے۔

فضائل علم و مناقب علماء : مرتبہ مولانا محمد الدین عامر الفاری ضخامت ۱۰۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔

پتہ - ادارہ، باب العلوم منزل منزل بستی حضرت نظام الدین اولیا۔ نئی دہلی ۱۳ اسلام میں علم کی جو اہمیت ہے اور جس طرح بار بار حصول علم کی تاکید اور اسی نسبت سے علماء کے فضائل و مناقب کا بیان ہے وہ غالباً اس شرد و مد کے ساتھ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ غری میں اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی ہیں اور ان کے علاوہ قرآن و حدیث میں بھی یہ ارشادات بکھرے ہوئے ہیں۔ لائق مرتب نے ان سب ماخذ سے عموماً اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مظلہ العالی کی تحریروں سے خصوصاً استفادہ کر کے یہ کتاب بڑے سلیقہ سے مرتب کی ہے۔

پہلا باب قرآنی آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کے ابواب میں عنوانات باب کی مناسبت سے ایک یا دو حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ پھر ان کا ترجمہ اور اس کے بعد اس کی تشریح، اس ضمن میں حضرت شیخ الحدیث کے جستہ جستہ واقعات بھی بیان ہوتے گئے ہیں۔ زبان شگفتہ اور انداز بیان موثر و دلنشین ہے۔ اگر باب ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لیکن علم اور علمائے متعلق ابھی اور چند اہم موضوعات ہیں مثلاً علماء سواد علماء خیر! ان کے باہمی امتیازات، علماء کے اوصاف، اور ان کے لئے شرائط و اداب، وغیرہ! امید ہے کہ کتاب کے دوسرے حصے میں ان مسائل پر گفتگو ہوگی! البتہ ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جس علم کے

فنائن و مناقب بیان کئے گئے ہیں اس سے مراد صرف علم دین ہے، جب قرآن مجید کائنات ارض و سما کو اللہ کی آیات کہتا اور ان پر غور و خوض کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس علم کے فنائن بیان کئے گئے ہیں اس سے مراد صرف علم دین ہی ہو بہتر تھا کہ لائق مولف ایک باب میں علم کی حقیقت پر بحث کر لیتے، حضرت آدم کو جس علم کی بنیاد پر ظیفہ رب اور سجود ملائکہ ہونے کا شرف عطا فرمایا گیا وہ لا سماء کلمہا کا علم ہے نہ کہ کوئی خاص ایک علم۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں ان تمام امور کی وضاحت ہونی چاہیے۔

تخلیق انسانی کا مقصد : از مولانا حبیب ریحان ندوی تقطیع خورد و خوراک ۲۶ صفحہ

کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپے پچاس پیسے ۔

پتہ : دارالتحقیق والترجمہ ۱۳۔ مسجد شگور خان روڈ۔ بھوپال ۔

یہ کتاب جو چھ ابواب پر منقسم ہے اس میں اہم احادیث کی شریعت، اس کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد شریعت محمدیہ، اس کے اصول و حیات اور اس ضمن میں خلافت اسلامی نظام زندگی میں اس کی اہمیت و ضرورت پر بسط و تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ خلافت کی بحث میں صحابہ کرام کے اختلافات اور ان کے مشاجرات کا تذکرہ ناگزیر تھا، لائق مصنف نے اس کا سراغ ذکر کے اجمالاً خلافت راشدہ کی سرگذشت بیان کی ہے۔ اور پھر وہ اچانک موجودہ زمانہ میں شرعی قوانین کی تنفیذ کی ضرورت و اہمیت کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ موصوف ایک مدت سے لیبیا میں بحیثیت ایک استاد کے مقیم ہیں۔ لیبیا کی حکومت کے سربراہ کرنل قزاقی ایک نہایت مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ ان کا جذبہ ہے کہ صرف ان کے ملک میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلامی اور شرعی قوانین نافذ ہوں۔ اس سلسلہ میں اس کی مساعی کا تذکرہ وقتاً فوقتاً اخبارات میں آتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی کچھ دنوں لیبیا میں ایک عظیم اسلامی کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ جس میں عرب ملکوں کے مشاہیر علماء نے شریک ہو کر اسلامی قانون کے مختلف مسائل و مباحث پر مقالات پیش کیں۔ تقریری کیں اور باہم

تبادلہ خیالات افکار کیا۔ نوجوان مصنف نے کتاب کا آخری حصہ اس کانفرنس کی روداد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بہر حال کتاب بہت سی مفید معلومات پر مشتمل ہے اور لائق مطالعہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی مسرت انگیز ہے کہ موصوف نے لیبیا میں مقیم ہوتے ہوئے اپنے وطن بھوئیاں میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ کتاب اس ادارہ کی پہلی پیش کش ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کرے۔ اور اردو زبان میں اسلامی لٹریچر میں اضافہ کا باعث ہو۔

اردو ڈائجسٹ ہما علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر: مرتبہ مولانا عبدالوحید صدیقی۔

تقطیع خورد۔ ضخامت ۲۹۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت: چار روپے۔

پتہ: اردو ڈائجسٹ ہما۔ جے ۱۷۔ جنگپورہ کسٹیشن نئی دہلی ۱۱۰۱۷۱۔

اردو ڈائجسٹ ہما اردو زبان کا نہایت مقبول و مشہور ماہنامہ ہے جس نے کم سنی کے باوجود نودواں طبقہ میں بڑی ہر دلعزیزی حاصل کر لی ہے۔ اس کا یہ خاص نمبر اس کی روایات کے مطابق ہے اس کے نام نگار نے یونیورسٹی کے بعض ممتاز لوگوں سے انٹرویو لے کر چھوڑ دیا۔ قلمبند کی ہے۔ اس میں اگرچہ بعض چیزیں تصحیح طلب ہیں۔ تاہم دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی قدیم و جدید ہیئت اور اس کی تنظیم و ترتیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ٹھوس اور مفید معلومات اعداد و شمار کی روشنی میں تاریخ دار بیان نہ کیے گئے ہوں۔ مضامین اور معلوماتی شذرات اور چارٹ کے علاوہ اول تو یوں بھی اس کا کوئی معقول تعدادیر کے بغیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ بھی ان سے خالی نہیں ہے لیکن علی گڑھ یونیورسٹی جب کہ ابھی صرف کلچر تھی اس زمانہ کے اکابر علی گڑھ کی ایسی نایاب تصویریں بھی ہیں جو غالباً اب شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہیں موجودہ ایکٹ کے سلسلہ میں مخالف اور موافق آرا کا بھی ایک مستقل باب ہے۔ غرض کہ اس میں شبہ نہیں یہ نمبر بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے اس نمبر کی حیثیت تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی۔ جن حضرات کو علی گڑھ یونیورسٹی سے دلچسپی ہے ان کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

راجو کب تک اکیلا رہے



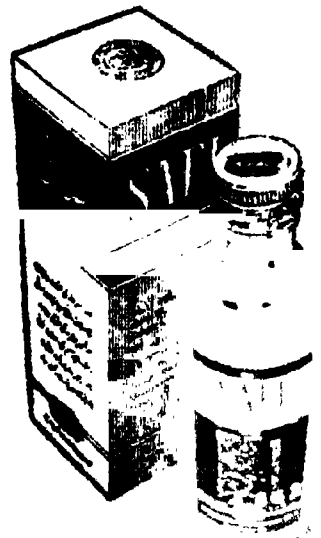
راجو دو سال کا تھا،
لیکن چمپا کی ساس کنبہ میں
ایک اور بچہ چاہتی تھی۔ اس کے
سوچنے کا ڈھنگ ہی ایسا تھا۔
لیکن چمپا جانتی ہے کہ
راجو کی ختیج نشوونما کے لئے یہ
ضروری ہے کہ اسے کم سے کم
ایک اور سال تک پورا لاد پیار ملے
اور صحیح دیکھ بھال ہو۔

بچوں کی پیدائش میں
صحیح وقفہ ہونے سے
وہ صحت مند رہتے ہیں۔

موسم بدلتے ہی چہرے بھی بدل جاتے ہیں! کیا ٹھاسوں، پھنسیوں اور جلدی تکلیفوں کی وجہ سے؟ جب یہ تکلیفیں پیدا ہوں تو اُن کو صافی کے استعمال سے فوراً ختم کیجیے

ٹھاسے، پھنسیاں، دوسری جلدی تکلیفیں اور خسرو کی موسم کی تبدیلی پر ہلکڑ
ہو جاتی ہیں، کیوں کہ جگر اور فعل ہضم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور خون میں
خرابیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اس موسم میں خاص طور پر صافی سے اپنے خون کو صاف
کیجیے۔ صافی، خون کو صاف کرتی ہے، خراب، دھول کو جسم سے نکالتی ہے۔
آنتوں اور گردوں کو صاف کرتی ہے اور آپ کے خون کی صفائی کا سب
بہترین ہے۔ صاف خون کا مطلب ہے صحت مند جلد۔

۲۲ جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی صافی تیز اثر رکھتی ہے۔ چاندی کی دھلی
اور ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے استعمال سے اجابت کھل کر آتی ہے اور
خون صاف ہوتا ہے۔ صافی سے خون کی تمام خرابیاں ختم ہو جاتی ہیں۔



صافی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

ہمدرد

بھارت کے دفاع و ترقی میں شرکت کیجئے

ساتھ ہی
7 1/4 %
سود کمائیے

۱ سالہ ٹاک گھریلادی کھاتوں پر
3 سالہ کھاتے 7%
1 سالہ کھاتے 6%
ان کھاتوں پر ہر سال دیگر ایسے قابل ٹیکس
کھاتوں پر ہسٹریوں پر کیا 2000 روپے
سالانہ تک سود ٹیکس سے بری ہے۔

توری
ہجستہ
آؤارہ

تھامیل کے لئے اپنے ٹاک لہرا اپنے ملک کے قومی چیزوں کے ضلع
آگسٹا ٹیکس سے ہر چہ تاہم کیجئے۔

000 77/113

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اُس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائقِ مطالعہ ہیں۔ ”لغات قرآن“ کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی لہجہ سے نکالے جاسکتے ہیں۔ ”مکمل لغات قرآن“ اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	”	پانچ روپے	” چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	”	پانچ روپے	” چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	”	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	”	آٹھ روپے	نور روپے
جلد ششم	۳۲۴	”	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

سالانہ قیمت دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ



حکیم مولوی عظیم الرحمن، ریزرویشنر، ایڈمنسٹریشن، نیشنل بک ٹرسٹ، لاہور، پاکستان

✓
۶۵/۱۲
۶۶
مَدَوَّةُ الْمُصَنِّفِينَ دِلِّی کَا عِلْمِی دِیْنِی کَا هِنَا

بُرکات

مُتَرَبِّع
سَعْدِیَا حَمْدِ کِتَابِ آبَادِی

اُردو زبان میں ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات، مراس و درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں منسلک ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۷۸۳۷ ہیں۔ حصہ اول :- حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام تک تمام نبیوں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم :- حضرت یوشع علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی حقائق و تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم :- انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف و الزمیم و اصحاب القہر و اصحاب النبت و اصحاب الریس بیت المقدس اور یہود و اصحاب الاخدود و اصحاب الغیل و اصحاب الجحیم ذوالقرنین اور سید سکندری، سبا و ریل عرم و غیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و متفقہ تفسیر۔ حصہ چہارم :- حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلمہ و السلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اول دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم ساٹھ روپے جلد چہارم نو روپے قیمت مکمل سٹاک تیس روپے۔ اُجرت فی جلد فی بارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ برہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی

سُرمہان

جلد: ۶۹	ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۲ء	شمارہ: ۶
---------	------------------------------------	----------

۱۔ نظرات سعید احمد اکبر آبادی ۳۶۲

مقالات

۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی " " " ۳۶۵

۳۔ رسول شاہ مہمشہود جناب قاری بشیر الدین صاحب (پنڈت) ۳۸۱
(ایم۔ اے)
نیشنل یونیورسٹی (شاہجہاں پور)

۴۔ الترغیب والترہیب مولوی محمد عبداللہ صاحب دہلوی رفیق ۳۹۷

ندوۃ المصنفین دہلی

حافظ زکی الدین المستندی

۵۔ علامہ اقبال احمد تالہ زمان مولوی بشیر احمد خاں صاحب غوری ۴۰۸

جیل خاں طبرک کالج علیگڑھ

۶۔ تمہید س۔ سع ۴۲۸

نظرات

مسلم پرسنل کے موضوع پر جو علماء کرام نہایت محنت و جانفشانی سے داد تحقیق دے رہے ہیں ان میں سے بعض اس میدان میں اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہیں وہ حضرات جو مسلم پرسنل لایں تغیر و تبدل کے حامی ہیں ان کو ان مضامین میں اپنی تائید کا سامان نہ مل جائے۔ مثلاً ایک مولانا نے تحقیق کی ہے (۱) اود بالکل صحیح کی ہے کہ (۱) طلاق اسلام میں ابغض البہاجات ہے (۲) طلاق اگر بے ضرورت ہو اور بے وجہ ہو تو جمہور علماء کے نزدیک مکروہ اور امام صاحب کے نزدیک حرام ہے (۳) میاں اود بیوی میں اگر نزاع ہو تو شوہر فوراً اس کو طلاق نہ دے بلکہ قرآن کے حکم کے مطابق دونوں کی طرف سے ایک شخص حکم ہو اور وہ اصلاح ذات البین کی کوشش کریں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو اب شوہر کو طلاق دینے کی اجازت ہے (۴) لیکن ان حالات میں کبھی طلاق دینے کے لئے چند فیود و حدود در ہیں۔ مثلاً یہ کہ شوہر طہر کی حالت میں ایک طلاق دے، اور تمام طلاقیں ایک ہی مرتبہ نہ دے۔

اب مسلم پرسنل میں تغیر و تبدل کا حامی ایک شخص کہتا ہے کہ پاکستان میں جو عائلی قانون بننا ہے تو اس کا حاصل بھی تو یہی ہے کہ معاشرہ میں عام فساد کے پیدا ہو جانے کے باعث طلاق کی اباحت کے حکم کو جس طرح غلط اور مشرعیّت کے منشا کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اس قانون کے ذریعہ اس کا انسداد کرنا مطلوب ہے۔ اور اگر پاکستان میں یہ

بات صحیح ہے تو کسی دوسرے ملک میں درست کیوں نہیں ہو سکتی۔" طلاق کے سلسلہ میں تحقیق و تنقیح کی یہ مثال ہم نے صرف نمونہ کے طور پر نقل کی ہے ورنہ تعداد از واج وغیرہ دوسرے مسائل کا عالم بھی یہی ہے۔ اب فرمائیے اگر کوئی مجدد پسند یہ کہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ راقم الحروف نے دارالعلوم دیوبند میں مسلم پرنسپل لایہ اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا بھی تھا۔ مسلم پرنسپل لاکا معاملہ جو زیر بحث ہے، یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ ان احکام کی تفصیلات کیا ہیں؟ اس میں فقہاء کے آراء کیا ہیں؟ اور ان کے لئے شرائط و قیود کیا ہیں؟ اور تاریخ اسلام میں ان پر عمل کس کس شکل و صورت میں ہوتا رہا ہے؟ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ سماج میں اختلال پیدا ہو جانے کے باعث جب شریعت کے بعض سماجی احکام کا استعمال ان کی اصل اسپرٹ اور روح اور شارع علیہ السلام کے منشا و مقصد کے خلاف عام طور پر کیا جا رہا ہو اور ان کو ہوس برسوں نے اپنے لئے بچاؤ کا ذریعہ بنا لیا ہو تو اب ان حالات کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے حکومت سے کوئی قانون بنوانا درست ہے؟ اگر ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟ اور اگر نہیں ہے تو ان حالات کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟

ہم کو یہ سطور لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ بالا اجتماع کے لئے جن حضرات نے مقالات لکھے تھے ان میں سے بعض نے اپنے مقالات کی اشاعت قبل از وقت کر دی ہے۔ یہ مقالات عوام کے لئے ہرگز نہیں لکھے گئے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ان مقالات کی روشنی میں دیوبند کے اجتماع میں شریک علماء اہل موضوع بحث پر بحث و تمحیص اور غور و فکر کر سکیں اور سچو سچی میں جو عظیم اجتماع

ہم نے والا ہے اس میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیں۔

افسوس ہے کچھ دنوں پر و فیروز سید احتشام حسین کا اسٹھ برس کی عمر میں اچانک حرکت قلب کے بند ہو جانے کے باعث الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ مصوف اردو زبان کے نامور اساتذہ بلند پایہ ادیب، مصنف اور نقاد تھے۔ اگرچہ انھوں نے لسانیات، تاریخ اور سماجیات پر بھی لکھا ہے لیکن ان کی قلمی تنگ و دو کا اصل میدان تنقید تھا۔ اگرچہ وہ ترقی پسند نظریۂ ادب کے حامی اور اس کے علمبردار تھے، لیکن طبیعت میں سنجیدگی تھی اور فکر میں اعتدال و توازن، اس حیثیت سے انہوں نے اردو ادب میں نئی تحریکوں کی رہنمائی کی اور ان کو غلط راستہ پر ہٹ جانے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی تحریر شگفتہ اور رواں ہوتی تھی اور اس میں زبان کے پتھر کے بجائے علمی وقار ہوتا تھا۔ اردو زبان ادب میں محقق اور تنقید نگار نوجوانوں کی موجودہ نسل کے پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اخلاقی وعادات کے اعتبار سے بڑے شریف، ہمدرد متواضع اور سادہ طبیعت انسان تھے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت بخشش کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

ضروری گزارش

حضرات جبران ادارہ اور جبران کے خریداروں سے گزارش ہے کہ ابھر سے آپ حضرات کو یاد دہانی کے جو خطوط ارسال کیے جا رہے ہیں ان پر فوری توجہ فرمائیں۔ نیز خطوط ارسال کرتے وقت یا مٹی کرڈر کوپن پر پتہ پتہ اور خریداری نمبر کا لکھنا و بھولیں جو پتہ کی حیثیت پر درج ہو تا ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔
نماز مند دینگر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلامیان ہند کا تہذیبی ورثہ

(۶)

از: — سعید احمد اکبر آبادی

آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس چیز کا نام ہے معنوی اور بنیادی اعتبار سے تین چیزیں اس کے عناصر ترکیبی ہیں (۱) تعلیم (۲) تہذیب (۳) سیاسیات - "سیاسیات پریم ایکٹ" گفٹگو اس وقت کریں گے جب موجودہ ایکٹ ۱۹۷۲ء زیر گفتگو آئے گا۔ اس وقت تذکرہ اس درجہ گاہ کے تہذیبی کردار اور اس کی روایات کا چل رہا ہے اور چونکہ نواب وقار الملک اس سلسلہ طمانی کے آخری مگر نہایت اہم کڑی نہیں جنہوں نے کالج کے تہذیبی اور اسلامی کردار کو نکھارا اس کو وسیع کیا اور مستحکم بنایا اور یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ بقول مولانا حبیب الرحمن صاحب صاحب شیروانی کے خود نواب صاحب کی شخصیت اور ان کے اسلامی خصائل ملک و ملت کے واسطے کامل رہنا ہیں ۴ اس بنا پر درجہ دوم کے ہندو سکریٹری شپ کا تذکرہ ہم ذرا کسی تفصیل سے کریں گے اور اسی پر کالج کے تہذیبی اور اسلامی کردار کا باب ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نظام تعلیم پر ایک جامع تبصرہ ہو گا۔

نواب وقار الملک کی شخصیت اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نواب وقار الملک (مولوی حاجی مشتاق حسین صاحب) کی شخصیت بہت غریب مولوی اور عہد آفرین تھی، وہ سرسید

اور نواب محسن الملک کی طرح تعلیم قدیم کی پیداوار تھے۔ لیکن قدرت نے ان کو دلوں اور دماغ کے اُن اعلیٰ اوصاف کمال سے نوازا تھا کہ ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوئے اور ایک بہت معمولی نوکری سے اپنی معاشی زندگی کا آغاز کرنے کے باوجود وہ بڑی تیز رفتاری سے ترقی کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ اس زمانہ میں عہدہ و منصب اور ترقی و جاہت کے اعتبار سے ایک مسلمان کے لئے جو سب سے بڑا اعزاز ہو سکتا تھا وہ ان کو حاصل تھا۔ چنانچہ جبہ آباد میں دولتِ آصفیہ کے ریونیو سیکرٹری رہے۔ اس سے سبکدوش ہوئے تو علی گڑھ کالج اور انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری منتخب ہوئے اور جہاں کہیں رہے اور جو خدمت بھی انھوں نے اپنے ذمہ لی اس کو اس خوبی اور مخلصی سے انجام دیا کہ اس کا حق ادا ہو گیا۔ کالج سے ان کا تعلق کالج اور تعلیم جدید کے معاملہ میں وہ شروع سے سرسید کے رفیق اور شریک تھے اور چونکہ مذہب کے معاملہ میں وہ سخت کٹر اور متشدد تھے اس بنا پر عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید پر جب اعتراضات یا ان کے مذہبی خیالات و افکار کے بارے میں شکوک و شبہات بننا ہر گز جاتے تھے تو ایسے مواقع پر سرسید نواب صاحب کی شخصیت کو ہی اپنے لئے بطور سپر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں لکھا: ”منشی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دینداری بے ریا عبادت، سچی خدا پرستی، غایت تشدد سے نماز اور روزہ اور احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے، اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی تخلیق نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے، مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے۔“

(بحوالہ تذکرہ محسن ص ۸۰)

سرسید سے غیر معمولی عقیدت و ارادت | ان کو سرسید سے غیر معمولی محبت اور عقیدت و ارادت تھی سرسید کی عظیم شخصیت، اور ان کی مخلصانہ جدوجہد کادل سے اعتراف اور اس کی قدر کرتے تھے، لیکن جب ان کو سرسید کی کسی رائے یا عمل سے اختلاف ہوتا تھا تو اس کا اظہار بھی

لاگ لپیٹ کے بغیر طری صفائی اور جرأت سے کرتے تھے لیکن سچے اور پکے مسلمان ہونے کے باعث وہ تھام و سندان باختن، کے ہنر سے واقف تھے، اختلاف کو ہمیشہ انھوں نے اختلاف کی حد تک رکھا، اس سے متجاوز ہو کر کبھی اسے خلاف نہیں بننے دیا۔ سرسید کو بعض اوقات ان کے اختلاف سے سخت اذیت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اسی قسم کے ایک موقع پر جھنجلا کر نواب صاحب کو لکھتے ہیں:-

”میں کامل یقین رکھتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔ قیامت میں خدا کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسول اللہ! میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہیں رکھا تھا، بن لوگوں نے اس کو بر یاد کرنا چاہا منجملہ ان کے ایک یہ نواب استعمار جنگ (دقار الملک) ہیں، آپ کہیں گے: میں نے نہایت نیک نیتی سے کہا تھا، خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہوگی۔ باللہ نہ ہوگی۔

تاللہ نہ ہوگی شرم باللہ نہ ہوگی، یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت“ لہ
لیکن ان پر اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنی رائے پر قائم رہے، ایک اور موقع پر سرسید نے اسی قسم کا خط لکھا تو اس کے جواب میں کس جسارت اور بے باکی سے لکھتے ہیں:-

لہ سرسید کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذات کے سید ہونے کے باعث ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جیسی تعلق تھا اس پر ان کو نہ صرف فخر تھا بلکہ ان کے اس کا استغفار رہتا تھا۔ چنانچہ اس مکتوب میں بھی یہ بات ہے۔ خطوط کے علاوہ بعض تقریروں میں بھی انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے اس کا مقصد تعلی یا باز خوانی ہرگز نہیں بلکہ جس طرح بچہ کو تکلیف ہوتی ہے تو باپ اور ماں کو یاد کرتا ہے، اسی طرح سرسید کو جب کبھی کسی مخالفت کا یا پریشانی کا سامنا ہوتا ہے تو بے ساختہ حضور پروردگار یاد آتے ہیں۔ یہ امر حضور کے ساتھ غایت محبت کی اور عشق دلیل ہے۔

”آپ فرماتے ہیں کہ لوگ قوم قوم پکارتے ہیں، قوم کا نام انہوں نے کس سے سیکھا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آپ ہی سے یہ نام بھی سیکھا ہے اور آپ سے ہی یہ آزادی بھی سیکھی ہے، جو اتفاق وقت سے آپ ہی کے خلاف قائم لائی جا رہی ہے، اور چونکہ وہ راستبازی سے کام میں لائی جا رہی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ یا کم از کم اس کی شکایت تو نہ کرنی چاہیے“ اس کے بعد لکھتے ہیں:

”آپ کی فرمائش یہ ہے کہ تم حالات سے لاعلم بھی رہو اور بولے بھی دو۔ اور جو تم کہتے ہیں اس کو مان لو۔ تو صرف نبی کا درجہ مذہبی معاملات میں ہے۔ اور آپ جو شرک فی النبوة کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھ کو سمجھائیے کہ یہ شرک فی النبوة نہیں ہے تو اور کیا ہے؟“ پھر لکھتے ہیں:-

”خیر آپ جانیں اور آپ کا کام جانے، ہر ایک کو اپنی قبر میں علیحدہ علیحدہ جانا ہے، اگر آج میں آپ کی ناراضی کے خوف سے وہ رائے دید و نہن کو میں سمجھتا ہوں وہ قوم کا گناہ ہے تو ظلِ خدا کے سامنے آپ میرے گناہ نہ بخشوائیں گے“ (وقار حیات ص ۷۵۲)

اس نوع کے متعدد اور مختلف مکتوبات کے اقتباسات صرف اس غرض سے نقل کئے گئے ہیں کہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے رفقاء یوں سب ہی ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھے، لیکن اس میں بھی نواب وقار الملک کس آن بان اور شان کے بزرگ تھے۔ اپنی رائے میں اس درجہ مشدد۔ اس کے اظہار میں اس قدر جبری ادب و بیباکی، لیکن با اینہم اپنے قائد اور رئیس جماعت کا یہ ادب و احترام کہ (جیسا کہ) پہلے لکھا جا چکا ہے، ایک اعلیٰ دنیوی جاہ و منصب فائز ہونے کے باوجود مجمع عام میں سرسید

کے سامنے اپنا گھٹا ہوا سر جھکائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ”سرکار! یہ سر حاضر ہے“، جوتے مار لیجئے، لیکن بندہ کہے گا تو یہی کہ راستے آپ کی غلط تھی؟ یہ معمولی واقعہ نہیں؟ یہ کیرکٹر۔ یہ محبت، تعظیم و محکم اور ساتھ ہی فرض شناسی میں حسن توازن و اعتدال! کوئی شبہ نہیں کہ یہ غیر معمولی اخلاقی عظمت اور کیرکٹر کی دلیل ہے۔ لہ

لہ راقم الحروف نے علی گڑھ تحریک اور سرسید کا تھیوٹرا بہت مطالعہ پہلے بھی کیا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر بیرونی ممالک میں پکچر دیتے ہیں اور بعض سیمیناروں میں مقالات پڑھے ہیں۔ لیکن اس مضمون کے سلسلہ میں اب جو مزید مطالعہ کیا اور سرسید کے رفقاء اور ان کے ساتھیوں کے حالات اور کارنامے پڑھے تو شہد درویشان ہو کر رہ گیا کہ اللہ اکبر! کس سیرت (CALIBRE) کے لوگ تھے۔ اگر نظر کو اور وسیع کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کا ایک عظیم دور نشاۃ ثانیہ کا ہے اس دور میں علماء، مشائخ، جدید تعلیم یافتہ گروہ ہیں۔ بیرسٹر۔ وکیں۔ اساتذہ۔ ماہرین تعلیم، ادیبان سیاست، شعراء، ادباء، اصحاب محافت و جہلزم، ارباب صنعت و تجارت، رؤسا و امراء، یہاں تک کہ کھلاڑی اور پہلوان ان میں کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں بڑے اند بلند بایہ لوگ نہ پیدا ہوئے ہوں۔ یہ سب اپنے پیشوں اور کاموں کے اعتبار سے مختلف تھے۔ لیکن ان میں ایک خاص قسم کی وضعداری، عروت و شرافت اور اسلامی اخلاقی و کردار کی جھلک پائی جاتی تھی اور اس لئے سماج میں یہ حضرات الگ الگ ممتاز تھے۔ غالباً یہ سب کچھ تھیوٹرا اس زوال کا جو ۱۹۴۷ء میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا، مولانا سید مرتضیٰ اس صاحب گیلانی رحمہ اللہ بات چیت میں کبھی بھی بڑی انتہا پسندانہ باتیں کہہ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: میاں سعید امیرؒ نزدیک اکبر الہ آباد میں اور اقبال قدرت کی طرف سے مسلمانوں کے لئے اس انحطاط کا بدلہ دیں جو انہیں شہرہ میں پہنچا، اور درحقیقت یہ دونوں ہمارے انحطاط کا عظیم نعم البدل ہیں کہ اگر قدرت مجھ سے پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اپنی حکومت و سلطنت یا اکیلا تو میں صاف عرض کروں گا کہ اکبر الہ آباد! بہر حال ضرورت ہے کہ کوئی ادارہ مسلمانوں کے اس خیر نشاۃ ثانیہ کی مصلحت اور سبوتاخ مارج مغرب کرے، وہ اس عہد کی ایک نہایت سبق آموز اور ولولہ انگیز داستان ہوگی۔

حسن انتظام کی تین شرطیں | امام اڈمنسٹریشن اور خصوصاً ایک کالج کی تعلیمی کے اعلیٰ انتظام اور اڈمنسٹریشن کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں:

(۱) منظم کالج کے طریقے غیب اور بے داغ ہو۔ اس کے ظاہر و باطن اور اس کے قول و فعل میں تضاد اور تباہی نہ ہو۔ جس چیز کا مطالبہ وہ دوسروں سے کرے وہ خود اس پر پوری طرح عامل ہو۔

(۲) طلباء کا مکمل طور پر ہمدردی و مہم جوئی ہو، ان کو اپنی اولاد سمجھے اور اس لئے ان کے قسم کے دکھ درد میں ان کا شریک اور ان کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں سرگرم ہو۔

(۳) اصول و قواعد اور ڈسپلن کا سخت پابند ہو۔ جو معاملہ کبھی پیش آئے اس پر ٹھنڈے دل اور طلباء کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے غور و فحوص کرے اور جب کسی نتیجہ پر پہنچ جائے تو اس پر سختی سے قائم رہے اور کسی دباؤ یا لالچ سے اپنی رائے یا فیصلہ میں تبدیلی نہ کرے۔

اب اس نقطہ نظر سے فور کیجئے تو ان میں سے وہ کونسی شرط ہے جو بحال و تمام نواب صاحب میں موجود نہ ہوں جہاں تک ان کے ذہنی اور دماغی کمالات و اوصاف کا تعلق ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ شروع میں دس روپے ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ ترقی کرتے کرتے نظام گورنمنٹ کے چوہینو سکریٹری ہوئے اور تین ہزار روپیہ مشاہرہ پایا۔ پھر اس حیثیت سے موصوف نے مالیاتی بندوبست اور اس کے دستور و آئین میں اصلاحات کر کے ریاست کو جو فائدہ پہنچایا اور اس کو ترقی دی۔ خود نظام اور اس زمانہ کے بڑے بڑے انگریز خندہ داروں نے اس کا کھل دل سے اعتراف کیا ہے۔ اب شرائط سے گمان نہ کو ملاحظہ فرمائیے :-

صاف ستھری اور پاک زندگی | نواب صاحب کی ضخیم سوانح حیات کا مطالعہ کیجئے، صفحہ ۱۷۱ کے صفحہ ۱۷۱ کی امانت و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی مثالوں سے پرہیز۔ یہاں مولانا

حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی کی جامع شہادت کا نقل کر دینا کافی ہو گا یا فرطے ہیں :-

”قبل اس کے کہ وقار الملک مرحوم سے نیاز حاصل ہوا ان کی دیانت و صداقت دل پر نقش ہو چکی تھی، سب سے اول نواب محسن الملک کے ہاں ملاقات ہوئی اور اسی موقع پر نیاز مغرب ساتھ ساتھ ادا کی، اس کے بعد نواب صاحب کو بہت کچھ دیکھا۔ سکرپٹری شپ کے زمانہ میں تعلیمی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ پاس رہنے کا اتفاق ہوا، حیدر آباد آکر ان کے متعلق اتنا سنا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں بتا سکتا، جتنا سنا، اسی قدر ان کی دیانت و صداقت کا نقش گہرا ہوتا گیا، یہ اوصاف خاص نتیجہ تھے مذہبی عقیدہ کی سچائی اور فرائض مذہبی کی پابندی کا۔“

(مقدمہ وقار حیات ص ۳)

آجے چل کر لکھتے ہیں :-

”اُن کی (نواب وقار الملک) زندگی کی کل جس طاقت سے چل رہی تھی اور ملتی رہی وہ ان کی مذہبی زندگی تھی، بچپن میں نماز کے گھر میں پابند تھے، بڑے ہوئے تو نماز کے پیچھے انگریزی ملازمت چھوڑ دی، حیدر آباد میں زوج کے دور میں شاہی اسپتال ان کی نماز کے واسطے روکی گئی، علیٰ ہذا القیاس اس زندگی میں ان کی اولین سعادت یہ تھی کہ ان کے قلب نے قوت کے ساتھ صداقت ایمانی کو جذب کیا، اور یہ انجذاب تہ تک پہنچا، اسی کا نام ہے قوت ایمانی، قوت ایمانی کو لازم ہے، پابندی ارکان اسلام، قوت ایمان اور پابندی ارکان کا نتیجہ تھی وہ پُر غلظت زندگی جس کا کارنامہ

آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ (ص ۱۱)

طلباء کے ساتھ محبت طلباء کے ساتھ ان کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ وقار حیات

کے مصنف کا بیان ہے:-

”نواب صاحب کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت تھی کہ وہ طلباء کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور ان کی فلاح و بہبودی اور اخلاقی اصلاح کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے تھے، طلباء کے ساتھ ان کی مہربانی محض ظاہری طرز عمل تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ دل سے طلباء کی عزت کرتے تھے اور نہایت فراخ دلی سے غیر منطیع طلباء کی مالی اعانت بھی کرتے تھے۔ یہ اعانت عموماً خفیہ ہوتی تھی اور کبھی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ہم کو بذات خود ایسے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب سے واقفیت ہے جنہوں نے نواب صاحب کے وظیفہ سے تعلیم حاصل کی اور معزز عہدوں پر پہنچے“

اس کے بعد لکھتے ہیں:

”نواب صاحب کا زمانہ سگریٹ پی شپ اس لحاظ سے بھی یادگار رہیگا کہ انہوں نے وظائف کی مد میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا، اور انجمن القرض سے اصرار کر کے دلایا۔ وظائف کا اہتمام بجائے پرنسپل کے انہوں نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا، جو صیغہ راز میں تھا، وہ حتی الامکان یہ کوشش کرتے تھے کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ کون کون طالب علم وظیفہ خوار ہیں“

اس سلسلہ میں ان کا جو ذاتی خیال تھا۔ اسے ایک مرتبہ انہوں نے اس طرح ظاہر کیا:-

”کوئی قوم صرف اپنے دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم دینے کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتی یہی ہو نہ ان لو جو ان جن کے ماں باپ ان کی تعلیم کے معارف برداشت نہیں کر سکتے قوم کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سمجھے جانے کے قابل ہیں، یہی ہونہار اور شریف نوجوان جو اس وقت افلاس کی مصیبت میں گرفتار ہیں اگر اپنے پیرائے پر غور ہو جائے کہ قابل ہو جائیں تو انہی سے قوم ترقی کر سکتی ہے“ (ص ۸۳۲)

طلبا کی عزت | محبت اور شفقت کے ساتھ طلبا کی عزت کرتے تھے، تاکہ ان میں عزت نفس اور خود داری پیدا ہو۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا بیان ہے: ”گو ہم بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن ہم کو اور خود اپنے بیٹے کو نواب صاحب مرحوم ہمیشہ ”آپ“ اور ”جناب“ کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے۔“ نواب محسن الملک کی ایک تقریریں پر ناراض ہو کر ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا:۔ پہلے آپ خود اپنے بچوں کی عزت کیجئے، اس کے بعد دوسروں سے امید کیجئے کہ وہ بھی ان کی عزت کریں گے۔۔“ وہ چاہتے تھے کہ طلباء میں عزت نفس اور خود داری پیدا ہو اور ظاہری طور پر کبھی وہ ایسے شکستہ حال نہ نظر آئیں کہ اپنا وقار قائم نہ رکھ سکیں، ایک دفعہ کسی شخص نے طنزاً ان کے سامنے کہا کہ بعض ایسے طلباء بھی وظیفہ مانگنے آتے ہیں جو سوٹ لیوٹ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کو مدد نہ پہنچائے، نواب صاحب کو یہ گفتگو ناگوار گذری، فرمایا:۔

”کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے طالب علم ہمارے سامنے ننگے یا چھترے

لگائے ہوئے آئیں۔“

طلبا سے بے تکلف ملاقات | ”نواب صاحب کا دروازہ طلباء کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، کسی وقت روک ٹوک نہ تھی، وہ خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں، اور کیسے ہی ذی رتبہ شخص سے ملاقات کر رہے ہوں، اگر کوئی طالب علم آجاتا تھا تو وہ فوراً اس سے ملاقات کرتے تھے اور بڑے اطمینان اور خوش دلی سے اس کے آنے کی غرض منکر، اس کا انتظام کر دیتے تھے، وہ طلباء عموماً تخلیہ میں ملاقات کرتے تھے تاکہ طلباء آزادی دے تکلفی سے اپنی ضرورتیں بیان کر سکیں،..... جب وہ صبح سے دوپہر تک کام کر کے زنانہ مکان میں کھانا کھانے یا کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے جانا چاہتے تھے تو براۓ مدہ میں آکر چاروں طرف خوب غور سے دیکھ لیا کرتے تھے کہ کوئی طالب علم کو نہیں ملتا ہے، اگر کسی کو آتا دیکھتے تو فوراً رک جاتے تھے اور سچرا اس طرح اطمینان

وسکون سے اس آنیوالے سے گفتگو کرتے تھے کہ گویا ابھی کام کے لئے برا آمد ہوئے ہیں۔ (ص ۸۳۳)

طلباء کی نمائندگی اور اخلاقی اصلاح | نواب صاحب سکریٹری ہونے سے پہلے ایک مرتبہ جدید کالج سے اکثرین بریل تک طلباء کے بورڈنگ ہاؤس کے نگران اور منظم بھی رہے تھے، اس زمانہ میں اور اس کے بعد سکریٹری شپ عہد میں ان کی توجہ بڑی سختی اور اہتمام کے ساتھ طلباء کی تعلیمی اور اخلاقی اصلاح پر مرکوز رہی، نماز کا یہ اہتمام تھا کہ وقار حیات کے مصنف لکھتے ہیں: مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) کے زمانہ نگرانی میں نماز کے معاملہ میں طلباء پر بڑی سختی ہوتی تھی، ترک نماز ایک ایسا جرم تھا جس کو وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے، عاجز اور آفتاب احمد خاں جی اسی زمانہ میں اسکول کے طالب علم تھے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

”جس انہماک اور محنت اور ہمدردی کے ساتھ نواب صاحب مرحوم

بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اس زمانہ میں کرتے تھے، وہ کبھی فراموش نہیں

ہو سکتا، ڈاسٹنگ ہال اور باورچی خانہ کی نگرانی وہ کرتے تھے۔ طلباء کی

خیر اندگی کی دیکھ بھال وہ کرتے تھے، ان کے امتحانات کے نتائج میں

دلچسپی وہ لیتے تھے۔ کھیلوں میں وہ شریک ہوتے تھے اور نماز کی پابندی

کے لئے جو تنبیہ ان کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ کبھی بھی نہیں ہوئی۔“

غلاہ ازین انہوں نے لڑکوں کو تاش کھیلنے، شطرنج کھیلنے اور ڈھول طبل بجانے

اور سوانگ رچلنے وغیرہ کی ممانعت کر دی تھی کہ ان سے کھیل کود یعنی تفریح اور

دور رس کا فائدہ کبھی نہیں ہوتا اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے صرف احکام

ذریعہ بند کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی بھی رکھتے تھے

حدیث ہے جیسا وقار حیات (ص ۸۳۶) میں ہے، چاندنی راتوں میں وہ ہمیشہ از فرق

ساقہ سفید پوش ہوتے اور اندھیری راتوں میں اس کے برعکس سیاہ پوش! مقصد یہ تھا کہ

وہ شب کی خاموشیوں میں بورڈنگ ہاؤس کا چکر لگائیں تو کوئی طالب علم ان کو دھڑ سے دیکھ کر پہچان نہ سنے اور لڑکوں کو شرارت کرتے ہوئے عین موقع پر پہنچ کر کچھ نہ کہیں اس سلسلہ میں وقار حیات کے مصنف نے متعدد دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ سن لیجئے، کہتے ہیں،

”ایک دفعہ ایک کمرے میں بیٹھے چند لڑکے خفیہ طور پر تاش کھیل رہے تھے۔ کھیلنے کھیلنے کسی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ”کہیں سرگھٹا ملا (نواب صاحب) نہ آجائے“ ”دفعاً دروازہ کھلا اور مولوی مشتاق حسین صاحب پوری معانت اور سنجیدگی سے یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ السلام علیکم! بندہ حاضر ہے!“

ڈسپلن | اس محبت و شفقت اور ان کی اخلاقی اور مذہبی نگرانی میں مستعد رہنے کے ساتھ وہ نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون کی پابندی کے معاملہ میں کبھی سخت گیر اور متشدد تھے اور لڑکوں کی اسٹرائک یا ہنگامہ آرائی کی پروا نہیں کرتے تھے، نواب محسن الملک کے زمانہ میں جو طلباء جو اسٹرائک کی تھی اور اس کی تحقیقات کے لیے جو ایک کمیشن مقرر ہوا تھا نواب وقار الملک بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ آپ نے کمیشن کی ایک عام رپورٹ کے علاوہ الگ ایک نوٹ بھی لکھا تھا، اس میں آپ نے تحریر فرمایا:-

”اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیے، اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے، جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو ہم کو تیار رہنا چاہیے، عام ازمین کہ طلباء کی طرف سے ایسی کوئی دھمکی ہو، یا اسٹاف کی طرف سے۔ میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کے بجائے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا مناسب سمجھتا ہوں“

یہ نواب محسن الملک کے سکریٹری شپ کے زمانہ کی بات تھی، اس کے بعد جب نواب کا الملک سکریٹری ہوئے تو ان کے زمانہ میں بھی متعدد مرتبہ ٹرسٹیوں کے بعض فیصلوں پر طلباء نے اظہار ناراضگی اور احتجاج کیا۔ لیکن نواب صاحب ٹرسٹیوں کے فیصلہ پر قائم رہے اور طلبائے انھوں نے صاف کہا کہ ٹرسٹیوں کا فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہے۔ طلبہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی خوشی یا ناخوشی کے خیال سے اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، ان معاملات میں طلباء کا دخل دینا اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

ڈسپلن کے معاملہ میں اس درجہ سخت گیر اور مستبد ہونے کے باعث بعض اوقات طلباء میں بددلی اور میزاری پیدا ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ نواب صاحب طلباء کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ دل و جان سے کرتے تھے۔ ان کا کیرکڑ بے داغ تھا اور ان کی امانت و دیانت پر سب کو اعتماد کی تھا اس بنا پر وقتی اور ہنگامی بددلی اور میزاری کے باوجود سب طلباء ان سے بڑی محبت اور دل سے ادب و احترام کرتے تھے، چنانچہ جب انھوں نے اپنی ذاتی مجبورریوں کے باعث سکریٹری شپ سے استعفا دیا تو طلباء بے حد مضطرب اور غم گین ہوئے اور انہوں نے پونین کلب کے رامپور حامد ہال میں جمع ہو کر ان کی خدمت میں اور پیش کیا اور نہایت پُر اثر و پروردہ الفاظ میں احتجاج کیا کہ وہ ان سے جدا نہ ہوں۔ ”وقار حیات“ کے مصنف لکھتے ہیں: ”نواب صاحب اس فکر و رائے سے بے حد متاثر ہوئے۔ طلباء کو محبت آمیز جواب دیا۔ اپنی مجبورریاں بیان کیں اور پیش قیمت نصیب کیں اور طلباء کے دل کو مسخر کر کے رخصت ہو گئے،

نواب صاحب کے عہد کی اصلاحات | نواب صاحب کا سکریٹری شپ کا زمانہ اگرچہ کچھ زیادہ طویل نہیں۔ یعنی کل چار برس اور چند ماہ ہے۔ لیکن اس اعتبار سے بہت اہم اور شاندار ہے کہ بعض اندرونی اور بیرونی اسباب کے باعث کالج کو جو گھن لگ گیا تھا اور جس نے اندر ہی اندر خاموش طریقہ پر کالج کے اصل مقصد کی بنیاد کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے کالج کو نجات ملی۔ اور اس طرح اسے نئی زندگی اور نئی توانائی نصیب ہوئی۔ اس سلسلہ میں

سب سے اہم مسئلہ یورپین اسٹاف کا تھا۔ اس اسٹاف سے کالج کو تعلیمی اعتبار سے خصوصاً اور بعض دوسرے اعتبارات سے عموماً جو فوائد پہنچنے لواب صاحب اس کے معترف اور مداح تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ پرنسپل اور اس کے ساتھ دوسرے یورپین اساتذہ نے مطلق العنانی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور جس کے باعث کالج کا سکرٹری بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ لواب صاحب اس کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ لواب محسن الملک سے ان کے اختلاف کی بڑی وجہ پرنسپل اور اسٹاف کے ساتھ نرمی اور اغماض کا برتاؤ ہی تھا۔ چنانچہ لواب صاحب کے تقریر کے کچھ دنوں بعد ہی لواب صاحب اور پرنسپل میں سکرٹری اور پرنسپل کے اختیارات کے معاملہ میں سخت اختلاف شروع ہو گیا اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ پرنسپل اور اس کے ساتھ یورپین اسٹاف سیب نے استعفا دے دیا۔ لیفٹننٹ گورنر ان لوگوں کا پشت پناہ تھا۔ لیکن لواب صاحب کو ہندوستان کے سب مسلمانوں کی تائید حاصل تھی۔ جب لواب صاحب اور پرنسپل کے اختلافات اور لیفٹننٹ گورنر کی مداخلت کی حمایت کی خبر ملک میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ شہر شہر بڑے بڑے عظیم جلسے ہوئے۔ اخبارات میں نہایت زوردار مضامین لکھے گئے۔ سرائے خاں، سید امیر علی، لواب صاحب ڈھاکہ اور اور میجر سید حسین بگلہاری ایسے نامور اور معزز مسلمانوں نے حکومت اور لواب و قمار الملک کے نام ٹیگٹرم بھیجے۔ لندن میں جو مسلمان آباد تھے انہوں نے بھی عین جلسے کئے۔ ان سب کا حاصل لواب صاحب کے موقف کی زبردست حمایت و تائید اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ مکمل اشتراک و تعاون کی یقین دہانی تھی۔ اس وقت پورے ملک میں مسلمانوں میں جو کچھ ٹیشن برپا تھا اس کی کیا نوعیت اور اس کا کیا مقصد تھا؟ اس کا اندازہ اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور اور بااثر اخبار "کشف الخباہ" بمبئی کے ایک مضمون کے حسبِ ذیل اختیار کیا جاسکتا ہے۔

"علی گڑھ کالج میں اسٹاف اور پرنسپل کے درمیان جو ناگوار اختلاف پیدا

ہوا ہے وہ اگر جلدی سے فیصلہ نہ ہو گیا تو اس کا نتیجہ نہایت ہی برا ہو گا۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ سکرٹری نواب مشتاق حسین صاحب، نواب محسن الملک کی طرح سے خوشامدی اور چاہوس نہیں ہیں، وہ اسٹاف کی اطاعت پسند نہیں کرتے اور اس بارے میں ہم انہیں ہرگز ہرگز مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے، بات یہ ہے کہ یونین اسٹاف کا داماغ نواب محسن الملک کی خوشامدوں سے آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ اب مسلمانوں میں خودداری کا مادہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس بات کو ہرگز ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ ہمارے نوکر ہم پر حکمرانی کریں۔ کالج مسلمانوں کا کالج ہے اور وہ جس طرح چاہیں اس کا کاروبار چلائیں۔“

”انٹرکس کے مشہور اخبار وکیل“ نے ۱۲ جولائی کی اشاعت میں ”قومی جہاز خطرہ میں“

کے عنوان سے ایک دلولہ انگیز مضمون سپرد قلم کیا۔ اور اس میں لکھا:

۳۔ جولائی ۱۹۷۲ء کو جب کہ ٹرسٹیوں کی ایفینٹ گورنر کے ایما پر ایک اسپیشل میٹنگ ہونے والی تھی، مسلمانوں کی قسمت کے فیصلہ کا دن قرار پایا ہے، جو بالکل سر پر آگیا ہے۔ اگر مسلمانوں میں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ اگر ان میں عزت و حمیت ہے، اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے رہے سبے نشانات گورنمنٹ انگلیشیہ کے زیر سایہ محفوظ رہیں تو ان کو چاہئے کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ دیں اور حَسْبُنَا اللہ وَفَعَلْنَا الْوَكُیْلُ ”کہہ کر کھڑے ہو جائیں“

اس کے بعد اخبار مذکور نے مشورہ دیا ہے کہ تمام مسلمانان ہند جا بجا جلسے کر کے اپنے مسلم لیڈر نواب آغا ملک پر کامل اعتماد ظاہر کریں اور ان کی شاندار قومی خدمات کا اعتراف کریں، اسی طرح سر آغا خان اور سید امیر علی وغیرہ نے جو تار دیئے تھے اس میں انھوں نے صاف لکھا، ہم پُر زور تائید کرتے ہیں، اس کارروائی کی جو وقار الملک کالج کی آزادی قائم رکھنے کے لئے کر رہے ہیں۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد ہے۔“

غرض کہ اس طرح کے سینکڑوں خطوط اور تارنواب وقار ملک کوہندوستان کے گوشہ گوشہ سے موصول ہوئے، اور سر آغا خاں اور سید امیر علی نے براہ راست لیفٹنٹ گورنر کو بھی مفصل خط لکھا جس میں آنریری سکریٹری (نواب وقار الملک) کے اوصاف و کمالات بیان کرنے کے بعد یہ بھی صاف صاف لکھ دیا تھا کہ کالج تمام تر آنریری سکریٹری اور ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔

مسلمانان ہند نے اس موقع پر علی گڑھ کالج کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت کا جس جوش و خروش اور دلولہ و غزم کے ساتھ مظاہرہ کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اگرچہ شروع میں لیفٹنٹ گورنر کا ردِ پیرنپل اور اسٹاف کے حق میں نہایت سخت اور غیر معالمانہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کے اس عام احتجاج اور مطالبات کے سامنے تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ ”آخر پیرنپل اور اس کے ساتھ اسٹاف کے بعض لوگوں کا استعفا منظور کر لیا گیا۔ اگرچہ پیرنپل نے اپنا استعفا واپس لینے کی خواہش تحریراً کی بھی تھی!

وقار حیات کے فاضل مصنف نے اس پورے ہنگامے کی دردناک نہایت مبسوط و مفصل دستاویزات و کاغذات کی روشنی میں قلبندگی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اس نہایت شدید اور انقلاب انگیز بحران میں نواب صاحب نے جموں اڑکیا ہے، وہ ان کی لیاقت و قابلیت۔ غیر معمولی فہم و تدبیر معاملہ فہمی اور ذہانت اور حیرت انگیز ہمت و ہمت کا عجیب و غریب شاہکار ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر صدر کا نام کالج کے بانی کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہنے کا مستحق ہے تو نواب وقار الملک کا نام نامی اور اسم گرامی اس کالج کو اس کے اساسی مقاصد کے مطابق نہایت مستحکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے مسلمانان ہند کی تعلیم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن اور تابناک رہے گا حقدار ہے۔

حسن پوری سرگودشت اور روڈا کو بچھ کر یہ عزت بھی ہوتی ہے کہ اللہ اکبر! ایک طرف انہوں نے تھا جب کہ ملک میں انگریزوں کی آمرانہ حکومت قائم تھی مسلمان غلام تھے اور وہ ان کے لیے شکست فاش نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دم خم یہ تھا کہ جب انہوں نے اپنے محبوب علی گڑھ کا لالچ پراخج آتے دیکھی تو تھلا اٹھے اور کالج کے سکریٹری اور اس کے ٹر سٹیوں کی مدد کے لئے ایک ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو شکست ہوئی اور کالج کا سفینہ اس گداز بلا سے صحیح سلامت نکل آیا۔ لیکن اس کے برعکس آج ملک آزاد ہے مسلمان بھی آزاد ہیں اور ملک میں ایک جمہوری اور سیکولر حکومت قائم ہے۔ لیکن اس کے باوجود کم ہمتی، ڈر اور خوف اور مصلحت پسندی کا یہ عالم ہے کہ حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کے حق میں اچھا برا جو فیصلہ اور جو حکم بھی آئے بہر حال وہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے لئے بسرو چشم تسلیم کر لیے کا مستحق ہے، اور کسی میں اس کے خلاف بیزاری کے اظہار کی جرأت نہیں ہے۔

مدوۃ المصنفین دہلی

اعلیٰ علیہ الشان (دہلی ۱۹۳۷ء) سے قلموشی کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت انجام دے رہا ہے جس کے دوسرے سانس نہایت مدد دہلی اس کے ضروری مصافق اس کے معاذین کے خلفائے مشترک و تعاون اور کتابوں کی عام فروخت سے پورے کئے جاتے ہیں۔ سنجیدہ علمی لٹریچر کی فروخت کا دائرہ محدود اور مختصر رہی ہو تاں بھی صاحب قلم و ذوق محض اس کے گزارش ہے کہ حسب ذیل طریقہ پناہ کے مفاد سے تعاون فرمائیں۔

۱۔ "مدوۃ المصنفین" مجلہ اور دیگر زیادہ سے زیادہ نمبر پناہ کی کوشش فرمائیں۔
۲۔ رسائل، جرائد، اخبارات، کتابخانوں کی زیادتی کے باعث اپنا خرچہ اس کی کوشش کریں۔
۳۔ قلمی و ادبی کاموں کی اشاعت کے لئے اس کی کوشش کریں۔
۴۔ اس کی کوشش کریں۔
۵۔ اس کی کوشش کریں۔
۶۔ اس کی کوشش کریں۔
۷۔ اس کی کوشش کریں۔
۸۔ اس کی کوشش کریں۔
۹۔ اس کی کوشش کریں۔
۱۰۔ اس کی کوشش کریں۔

چندین نمبر "مدوۃ المصنفین" جامع مسجد اردو بازار دہلی

رسول شاہد و مشہود

(۴)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پندت . ایم . اے)

اسی طرح پادری فائدر اپنی تفسیر انجیل مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء صفحہ ۳۰۱ پر تحریر فرماتے ہیں کہ انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۳ میں جو پیشگوئی ہے کہ ”میرے بعد سچائی کا روح آئے گا۔ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تم کو غیب کی خبریں دے گا۔“ اس سے یقیناً محمدؐ اور ان کا قرآن مراد ہے کیوں کہ ہم عیسائی جو اس سے در روح القدس مراد لیتے ہیں غلط ہے۔ اس لئے کہ روح القدس کو تو ہم خدا مانتے ہیں یا اس کا ایک جز۔ تو پھر خدا سے کیوں کر سنے گا۔ اسی طرح پادری ٹامس لیم اپنی تفسیر انجیل صفحہ ۲۵ مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء میں تحریر کرتے ہیں کہ انجیل کی ساری پیشین گوئیاں محمدؐ پر صادق آتی ہیں۔ اور عیسائی جو اس سے مراد ”روح القدس“ لیتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اس کے بعد پادری صاحب نے غلطی کے اسباب بتائے ہیں۔

میرہ حال یہ حقیقت ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئی نبیل
عیسائی میں اس تصور کو عربی الفاظ احمد سے یاد کیا ہے اور اپنے متبعین کو ہدایت
کی ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں۔ قرآن عزیز نے اس کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے۔
إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ قَدْ خَلَّيْتُ مِنْ التَّوْرَةِ وَبُشِّرُوا بِرَسُولِي يَأْتِي مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ
أَقْدَمُ مِنْكُمْ وَهُوَ رَحِيمٌ (وہ وقت بھی قابل تذکرہ ہے) جب کہ عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ اے
بنی اسرائیل میں سے اس کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ محمدؐ سے پہلے جو توراہ آچکی ہے اس کی

تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام مبارک احمدؑ ہوگا۔
میں ان کی بشارت دینے والا ہوں (ملاحظہ ہو سورہ صف آیت ۶)

پیشین گوئی کی مکمل عبارت | جناب مسیحؑ کی شہین گوئی (غیر دفع) اور عید الفطر سے دو دن پہلے

کی ہے کہ جب انھیں یقین ہو گیا کہ ان کا وقت آگیا ہے اور ان کو گرفت کرنے کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔ جناب مسیحؑ کی تبلیغی جدوجہد اور غوام میں بیداری کے آثار پیدا ہونے دیکھ کر یہود کے سرداروں، فقیہوں، فلسفیوں اور کاہنوں کو حسد پیدا ہوا اور انھیں اپنے لئے سخت خطرہ نظر آنے لگا۔ چنانچہ سازش کی گئی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے حضرت مسیحؑ کو دار پر چڑھا دیا جائے۔ اس زمانہ میں یہود کا بادشاہ جو اپنے باپ دادا کی مملکت میں سے صرف ہم کا مالک تھا تاہنشاہ و قوم کے زیر اثر اور باجگزار تھا۔ اس کا گورنر پلاطیس دراصل یہود کے بادشاہ کا افسر اعلیٰ تھا اور وہی دراصل یہود کی کچی کچی مملکت کا بادشاہ تھا۔ یہ بت پرست تھا۔ سازشی یہود اس کے دربار میں پہنچے اور اسے ہر طرح سے بھڑکایا کہ یہ مسیحؑ غوام کو شعیب کے دکھا کر گریویدہ بنا رہا ہے اور اور ان کو بد دین بنانے میں مہمک ہے، چاہتا ہے کہ قیصر روم کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے اس کی اس کی سرکوبی ضروری ہے۔ ابھی یہ فتنہ ابتدائی منزل میں ہے دبا یا جا سکتا ہے ورنہ پھر بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔ پلاطیس نے اجازت دیدی گرفتار کر کے قتل کر دینے کی سازش کا حال تکمیل یوحنا میں درج ہے۔ (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۱ آیات ۷ تا ۵۱)

یہ واقعہ بہت نازک تھا۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو جمع کر کے بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان سے کہا "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا۔ کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔۔۔۔۔۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رکھ کر تم سے کہیں لیکن مددگار یعنی روح القدس (یعنی احمد یا فارقلیط) جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد

دلائلے گا..... اور اب میں نے تم سے اس کے (فارقلیط کے) ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے
(یعنی مشین گوئی گزری ہے) تاکہ جب ہو جائے (احمد مبعوث ہوں) تو تم یقین کرو۔ اس کے
بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیوں کہ دنیا کا سردار (احمد) آتا ہے اور مجھ میں
اس کا کچھ نہیں (یعنی دنیا جس نبی موعود کی اب تک منتظر چلی آتی ہے وہ میں نہیں ہوں بلکہ
وہ احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)“ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶-۲۵، ۲۶-۳۰)

حواریوں کو تسلی دیتے ہوئے اس پٹھین گوئی کی مزید وضاحت فرمائی ”میں تم سے
سچی کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ بد نگار
(فارقلیط یا احمد) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو تم سے تمہارے پاس بھیج
دوں گا..... جب وہ یعنی روحِ حق (احمد یا فارقلیط) آئے گا تو تم کو تمام سچائی
کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور
تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا“ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۷-۱۳)

المختصر تورات و انجیل نیز دیگر مخالف انبیاء و کرام کی یہ ہیں وہ تحریری شہادتیں
آنحضرت کے متعلق جو روزِ وطن کی طبع عیاں ہیں۔ ان کو علماءِ یہود و نصاریٰ اچھی طرح
جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ نے ایک مرتبہ جب یہودِ مدینہ کے پاس اپنے معتدین
کو یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ کیا نبی آخر الزماں سید کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی نسبت ان کی کتابوں میں کوئی خبر ہے؟ اس کا جواب علماءِ یہود نے یہ دیا کہ یہی ان کا
زمانہ ہے اور ان کی نعت و صفت تورات میں موجود ہے۔ علماءِ یہود میں سے حضرت
عبداللہ بن سلامؓ، بن یاسینؓ، ثعلبہؓ، اسدؓ، اور اسفید جنہوں نے تعصب کو بالائے طاق
رکھ کر تورات میں آنحضرت کے اوصاف پڑھے تھے ایمان لے لے۔ اسی طرح بحیرہ
راہب نے آپ کو حضرت ابوطالب کے ساتھ تجارتی سفر میں جب کہ سنِ شریف
حرف ۴۰ سال کا تھا دیکھ کر پہچان لیا تھا اور ابوطالب کو ہدایت کی تھی کہ اس بچہ کو

یہود و نصاریٰ سے محفوظ رکھنا وہ اس کے دشمن ہیں بچیں یس کی عمر میں آپ بی بی خدیجہ کا مال تجارت لے کر گئے تو وہاں نسطور راہب نے ہیشینگونیوں کے مطابق آپ میں علامتیں دیکھ کر پہچان لیا کہ فارقلیط جس کی خبر عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے یہی ہیں۔ اس سے بھی ۵ سال پیشتر بغرض تجارت آپ نے ملک شام کا سفر کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جو آپ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک منزل پر ٹھہرے وہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے۔ قریب ہی ایک راہب رہتا تھا حضرت صدیقؓ اس کے پاس چلے گئے۔ راہب نے آپ سے پوچھا یہ کون صاحب میں جو اس بیری کے سایہ میں جلوہ فرما ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے بتایا کہ یہ محمد بن عبداللہ ہیں۔ راہب نے کہا خدا کی قسم یہ نبی ہیں (حالانکہ اعلان نبوت میں ابھی ۲۰ سال باقی تھے)۔ اس بیری کے سایہ میں حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے آج تک ان کے سرا اور کوئی نہیں بیٹھا۔ یہی نبی آخر الزماں ہیں۔ راہب کی یہ بات حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دل میں اتر کر گئی اور نبوت کا یقین آپ کے دل میں جم گیا۔ ہر وقت سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہنے لگے جب ۲۰ سال گزرنے کے بعد آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا تو فردوں میں سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے۔ کنز الاکبان ص ۲۶۹ و ص ۵۹۹

گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر اگر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے تو اس ناچیز کے معروضہ پر ہمنوائی کے لئے مجبور ہوں گے کہ انبیاء عالم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اقدس ایک ایسا کعبہ مقصود ہے جس کی نسبت دنیا کے ہر ایک عظیم الشان نبی نے بیانات دیے ہیں اور اپنی اپنی امتوں کو اس رحمتہ اللعالمین کے زیر سایہ جمع ہونے کی تلقین کی ہے۔ لہذا ہب عالم میں سینکڑوں اختلافات ہو کر رہیں لیکن امر پر وہ سب کے سب متفق ہیں وہ جناب جنوک (ادریسؑ) کا دس ہزار قیدیوں کے ساتھ

آنے والا خداوند ہے۔ وہ ایک عالمگیر طغیان بدی کے وقت حسب بشارت جناب نوحؑ نجات کاشتیاں ہے۔ وہی حضرت نوحؑ کا منیل، جناب داؤدؑ کا محبوب، حضرت سلیمانؑ کا محمدؑ اور جناب عیسیٰؑ کا فارقلیط ہے۔ اس طرح سب مذاہب کا آخری محبوب اور کعبۂ مقصود ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے ذات گرامی سید الاولین والآخرین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ۵

گو میری اور قریب کی راہیں تھیں مختلف

لیکن ہم ایک منزلِ جاننا پہ جا ملے

انبیاءِ کرام میں سے کچھ شاہدینِ عظام کی پیشین گوئیاں سرکارِ دو عالمؐ کے متعلق پیش کی جا چکی ہیں۔ توریت و انجیل میں سامی اہل پیغمبروں کا ذکر ہے۔ اب جو بشارتیں آپؐ ملاحظہ فرمائیں گے وہ آریائی نسل کے دشور نیز ریشمیوں و مینوں کی ہیں۔ بشارتوں میں ہنڈا دافع اور کھلی ہوئی نشانیاں موجود ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں لیکن سامی النسل پیغمبروں کی طرح بشارت دینے والے ان آریائی نسل کے بزرگوں کا نام پاکر شاید آپ کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ بنی نوع انسان کی ہدایت درہنائی کے لئے نبی و رسول تو ہر قوم میں اور درنیل کے ہر ملک میں آتے پھر آخر کیا درجہ ہے کہ قرآن عزیز نے ذکر صرف انہیں انبیاءِ کرام کا کیا جو آنکھنور کی جائے بخت کے قریب اور پڑوس مقامات میں ہوئے۔ دور و داز ملک میں بھی تو قومیں آباد تھیں، کیا اللہ کو ان کی اصلاح کے لئے کسی نبی یا رسول کو بھیجنے کی ضرورت نہ تھی جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ بت پرستی اور شرک میں ملوث ایرانی، جاپانی، چینی، ہندی وغیرہ بہت سی قومیں رہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اس بنیادی حقیقت کو ملحوظ رکھئے کہ قرآن عزیز و دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں دو حیثیتوں سے منفرد ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ وہ ذاتی و عالمی صحیفہ ہدایت ہے دنیا کے ہر ملک و قلم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے دوسری اس کی شانِ انفرادی یہ ہے کہ اس کی مخاطبِ اول براہِ راست

ملک عرب کی ایک قوم تھی جس کی ایک مخصوص ذہنیت، ثقافت و معاشرت اور فکری و وجدانی حالت تھی، اسی قوم کے ذریعہ صحیفہ ہدایت کو عام کرنا تھا۔ اس لئے مخاطب میں اس کی فہم و استعداد کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ حکیمانہ کلام وہ ہے جس کے علوم و معارف منظم ہوں بلکہ مخاطب کے معیار اور انداز کے مطابق ہوں۔ قرآن حکیم سے بڑھ کر اس حکیمانہ اصول پر اور کون عمل کر سکتا تھا۔ چنانچہ قوم عرب کے مسلمات عقل و نقل کے بخلاف اگر حکایات و امثال میں ذکرِ بھیم و ارجن یا رستم و اسفندیار یا روم و یونان کے مشابہت کا کیا جاتا تو یہ سراسر خلافِ حکمت و مصلحت ہوتا۔ یا اگر گردشِ ارض و آفتاب کے ضمن میں تذکرہ نیوٹن و آئنسٹائن کے زمانہ کے نظریات و تحقیقات کا چھیڑ دیا جاتا یا تاریخ و جغرافیہ یا عام علوم و فنون کے سلسلہ میں کوئی بات ایسی پیش کی جاتی جو ان کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوتی تو خواہ مخواہ منکرینِ توحید و رسالت اور آخرت کے لئے ایک اور وسیع میدانِ انکار و تمکذیب کے لئے ہاتھ آجاتا اور ان کی اصلاح کبھی نہ ہو سکتی اس لئے قرآن عزیز نے انتہائی حکیمانہ طریقہ اختیار کیا اس نے ساری فزونی و ثنائی بحثوں کی تصریح تو ایک بار بھی مذاقِ عرب کے خلاف نہیں کی اور اہلِ عرب کے علمی، عقلی، فکری و مروجات کو ان کے حال پر چھوڑ رکھا لیکن اس لئے ایسے برابر رکھ دیئے اور کلام میں اتنی لچک پیدا کر دی کہ انے دلی نسلیں اپنے دور کے ماحولِ فکری کے مطابق کتابِ الہی کی تعبیر و تشریح میں آزاد رہیں۔

بہر حال قرآن عزیز کی براہِ راست مخاطب تھی قومِ عرب۔ اس کے باہر کا ذکر اگر کہیں بہ تصریح نام چھڑ جاتا تو آخر خیم کہاں پر مہتا؟ کس ملک کا ذکر کیا جاتا اور کس کو چھوڑا جاتا مگر ہندوستان کو لیا جاتا تو ایران کو کس قاعدہ سے ترک کیا جاتا؟ اگر چین کا نام آتا تو خزاں پان نے کیا قصور کیا تھا؟ غرضیکہ اس طرح فہرست کو کوفہ ارض کے ایک ایک ملک اور ایک ایک صوبہ و ریاست تک دراز سے دراز کرنا پڑتا اس لئے ذکر صرف انھیں کا کیا گیا جس سے عرب مانوس تھے ان کی اصلاح کے لئے: "وَمِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" یعنی کوئی قوم

ایسی نہیں کہ جس میں خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو،

یہ کہہ کر انھیں بتایا کہ تمہاری قوم منقرض نہیں ہے۔ دنیا کی ہر قوم میں اللہ کے برگزیدہ بند
 رشد و ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں (خواہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوں یا اس سے بھی کم یا زیادہ)
 اور مِنْهُمْ مَنْ تَصَمَّنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْطَعْ عَلَيْكَ ۚ اِن میں سے بعض نبیوں
 کا نام لے کر ان کا ذکر نہیں سنا دیا ہے اور بعض کا نام لے کر ذکر نہیں سنا لیکن معلوم و غیر معلوم
 ایمان تم کو بھی پہلانا ہے لَا تَنْفِرْ فِیْ بَیْنِ اَحَدٍ مِّنْهُمْ سَلٰمٌ ۚ یعنی نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان
 فرق نہ کرو۔ سب کی تعظیم و تکریم کرنا تم پر فرض ہے۔ یہ بتا کر انھیں دعوتِ غیر و فکر دی گئی کہ توریت
 و زبور و انجیل کتب مقدسہ کے علاوہ کہ جن سے تم واقف ہو دو دوسری اقوام عالم کے مخالف پر
 بھی غور کرو اگرچہ تم ان سے نامانوس ہو کچھ تو اس لئے کہ ان کی تاریخی حیثیت مبہم ہے اور
 کچھ اس لئے کہ براہِ راست وہ تم سے متعلق نہیں لیکن ان میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے
 حبیب پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُن پیشین گوئیوں کو محفوظ رکھا
 ہے کہ جن میں آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ آئیے ان آریائی کتب
 مقدسہ کی پیشین گوئیوں پر غور کریں:-

پارسی مذہب کی کتابیں زرتشتی مذہب جسے نوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں ایران
 کا قدیم مذہب ہے اسی کو آتش پرست یا جوسی دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب زرتشتی
 کو پہلوی زبان میں ہیں اور کچھ لٹریچر سنی خط میں بھی محفوظ ہے۔ پہلوی رسم الخط فارسی سے ملتا
 جلتا ہے لیکن زرتشتی دو سنی دونوں خط اس سے مختلف ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب
 میں دو وقتراہم ہیں ایک دساتیراوند و سترترند و ستا (کاؤستا) ان کے بھی خورد و کلاں کے فنون
 سے دو دستے ہیں۔ ان کتابوں کی صحیح تعداد اور زمانہ نزول کے متعلق اس قدر اختلافات ہیں۔
 کہ قطعیّت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ زرتشتی مذہب کے ہائی پریسٹ مانک نصر دانی نے
 ایچ ڈی زدا سٹرن تھیولوجی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:- ”زرتشت نے جس زبان میں اپنے

گیتوں کو ترتیب دیا وہ جلد ہی دنیا سے نابود ہو گئی۔ اس کے بعد اوستا کا رواج بھلا جو پار
پارٹینس کے آخری دنوں تک جاری رہی۔ اس کے بعد پہلوی زبان اوستا پر غالب گئی۔
پہلوی زبان کا دور آٹھ صدیوں تک قائم رہا۔ پس جیسے پارسی خود ایک تباہ شدہ قوم
کے کھنڈرات ہیں اسی طرح ان کی مقدس کتابیں ایک برباد شدہ مذہب کے خرابے
ہیں۔ (بحوالہ میثاق انجیلین ص ۲۹)

ایران کی مذہبی و سیاسی کیفیت قبل مسیح ۱۰۰۰ ق م اور بیت المقدس کی روشنی میں اتنا
پتہ چلتا ہے کہ جس زمانہ میں بخت نصر نے بیت المقدس کو خاکستر کر کے بنی اسرائیل
کو اپنا غلام بنایا اسی زمانہ میں پارس کے اندر بھی سیاسی و مذہبی حالات کروٹ بدل
رہے تھے۔ کچھ مصنفیات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۶۱۲ ق م نینوی کی آشوری حکومت
پر زوال آیا اور بابل کا عروج ہوا۔ ۵۵۹ ق م میلڈیا اور جنوبی پارس کی متحدہ حکومت
بنی اور اس کے بادشاہ خورس نے بابل سے آزادی حاصل کی یہ سب کچھ بابل کے سفلہ
و ظالم بادشاہ بخت نصر کے مرنے کے بعد ہوا۔ اس کے تخت کا مالک نابونی وس تسلیم کیا
گیا اس نے حکومت کا تمام بار وزیر اعظم بیلشازار پر ڈال دیا جو بڑا عیاش اور ظالم تھا حضرت
دانیال اس کے شیر تھے انھوں نے بہت کچھ سمجھایا سمجھایا آخر میں کنارہ کش ہو گئے۔
تورات کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ بیلشازار نے اپنی ملکہ کے اگسائے پر حکم دیا کہ
بیت المقدس سے نائے ہوئے مقدس ظروف میں شراب پلائی جائے۔ چنانچہ دوران
جشن جب شراب کا دور چل رہا تھا ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور دیوار پر لکھ دیا۔ ”منے منے
تقیل او فرسین“ بحوالہ دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۵ تا ۲۵) نوشتہ کا مطلب یہ
ہے کہ ”خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تو ترازو میں تو لا گیا اور کم
نکلا۔ تیری حکومت پارہ پارہ ہوئی اور فارسیوں کو دیدی گئی۔ چنانچہ خورس خلیفہ یا
رائیہ کو چک) اور کرمان وغیرہ کی مہمات سے فارغ ہونے کے بعد بابل کا رخ کیا

اور وہاں کے گورنر گوب ریاس کی مدد سے شہر کو فتح کر لیا۔ بیلشازار مارا گیا۔
 صحیفہ عزرا باب ۱۶ آیات ۱ تا ۵ سے پتہ چلتا ہے کہ خورس ایران کے مروجہ مذہب کے
 خلاف توحید الہی کا داعی تھا۔ اس کے جانشین دارا اول نے اپنے زمانہ حکومت میں ایک
 اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ چٹانوں پر کتبے نقش کرا دیئے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد
 زریں کو روشنی میں لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے۔
 یہ بہت مفصل کتبہ ہے اس میں دارا نے اپنی مملکت کے صوبوں کے نام تک گنا دیئے ہیں۔
 اسی کتبہ میں دارا کے مذہبی عقیدہ کا ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے :

”خدا نے برتر اور موزدہ ہے۔ اسی نے زمین و آسمان بنائے۔ اسی نے انسان کی
 سعادت بنائی..... میں اور موزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور
 ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے جو اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے دے..... اے
 انسان! اور موزدہ کا تیرے لئے حکم ہے کہ بڑائی کا دھیان نہ کر۔ صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ
 گناہ سے بچ“

اصطخر کے کتبہ سے زائد اہمیت ”کتبے ستون“ کو حاصل ہے جس میں ایک مجموعی شاہی
 ”گومائہ کو موگوش“ کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہو نیکی اور موزدہ کے فضل کی جانب منسوب
 کیا ہے۔ ہیرودوٹس نے بھی مجوسیوں کی بغاوت کا ذکر کیا ہے۔ خورس اور دارا کمون ہونے
 اور قدیم مذہب موگوش (موجوس) سے بیزاری کا ثبوت و تبلیغی اعلان ہے جو اس نے
 دانیال کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا جب کہ دشمنوں نے انھیں شیرِ ببر کے
 ڈال دیا تھا اور وہ معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ اعلان کے الفاظ پر غور کیجئے ”میں یہ حکم دیتا
 ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبہ کے لوگ دانی ایل (دانیال) کے خدا کے آگے سوجھ
 و لرزائیں ہوں کیونکہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے۔ اس کی سلطنت لازوال
 ہے..... اسی نے دانی ایل کو شیر کے پچھل سے چھڑایا“ (دانیال کی کتاب باب

آیات ۲۵-۲۸

ایران کا قدیم مذہب اور حضرت زرتشت (زردشت) وسط ایشیاء کے آریہ قبائل کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر مشترک رہا ہے۔ یہ سب مظاہر پرست تھے۔ سورج، چاند، آگ، ہوا، پانی وغیرہ ان کے دیوتا تھے۔ ایران اور ہندوستان کے عوام الناس کے تخیل میں بس اتنا فرق ہے کہ ہندی دیوتا خیر و شر دونوں کے مالک ہیں لیکن ایران میں خیر کا الگ اور شر کا الگ۔ اس مذہب کے معتقد مجوسی کہلاتے تھے۔ تقریباً ۵۵۰ ق۔ م اور ۵۸۳ ق۔ م کے درمیان تفقازہ اور آذربائیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کہلاتی ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا۔ یہ حضرت ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انھوں نے مجوسیوں کو دین الہی کی تعلیم دی۔ مورخین کا خیال ہے کہ وہ حضرت یرمیاہؑ اور حضرت دانیالؑ کے شاگرد تھے۔ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب ”کاوستا“ اگرچہ اب محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں اب بھی ایسے مضامین ہیں جو ”دین حق“ کے مؤید ہیں اور الہامی کتب کی طرح اس میں بھی آنحضرتؐ کے متعلق پیشینگوئیاں موجود ہیں۔ ژند اوستا کا پہلا حصہ زندگی اور دوسرا لیشٹ کہلاتا ہے۔

بہر حال توریت کے بیانات کو ہمیشہ نظر رکھ کر جو بیت المقدس کی ازسرنو تعمیر سے متعلق ہیں نیز سنگی کتبات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خیرس، کیقباد و دارا اول کا مذہب مجوسی مذہب کے خلاف ”دین حق“ کا مذہب تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایران زردشت کی تعلیم کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا۔ سکندر مقدونی کے حملہ کے بعد یونان کے خارجی اثرات اور قدیم مجوسی مذہب کے داخلی اثرات نے زرتشتی (زردشتی) مذہب کو بگاڑ دیا۔ سکندر مقدونی کے حملہ سے اسلخ میں زرتشت کا مقدس مجذبات کاؤستا آگ کے نذر ہو گیا پھر تقریباً سو سال کے بعد ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکان نے ”ادستا“ کو ازسرنو مرتب کرایا۔ مسلمانوں نے خیر القرون میں جب ایران کو فتح کیا تو وہاں کا مذہب مجوسی، زرتشتی اور یونانی مذاہب کا مجموعہ مرکب تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قصص القرآن جلد سوم صنف

مولانا حفص الرحمن سیوہاروی (مجموع)

پھر بھی اس میں کچھ ایسی ٹھوس حقیقتیں جو دین الہی کے سرچشمہ سے نکلی ہوئی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر محاطہ کرام نے جب ایران کو فتح کیا تو ایرانیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہ "ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے کہ جس نے آگ جلائی اور جب آگ نے اپنے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے اس کے نور کو سلب کر لیا اور اس کو سخت تاریکی میں نابینا چھوڑ دیا،" (سورۃ بقرہ: ۱۷) جب اسلام کو پیش کیا تو انہوں نے اسے قبول کر لیا معاندین یہ سمجھے کہ ان میں اسلام بزرگ شمشیر پھیلا جیسے ڈارمیسٹر نے زنداوستا کے ترجمہ کی تمہید میں کیا خوب لکھا ہے۔

WHEN ISLAM ASSIMILATED THE ZOROASTRIANS TO

THE PEOPLE OF THE BOOK IT EVINCED A RARE
HISTORICAL SENSE AND SOLVED THE HISTORICAL PROBLEM
OF THE ORIGIN OF THE AVESTA.

"یعنی جب اسلام نے زرتشتیوں کو اہل کتاب میں شامل کر لیا تو اس نے ایک منطقی تاریخی نکتہ کو آشکارا کر دیا اور اوستا کی حیثیت کے معر کو حل کر دیا،" بحوالہ اشیاq البینین^{۳۵}۔ معاندین اسلام نے جان بوجھ کر اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ قابل غور نکتہ بعض کو تہ اندیش طبائع جب دو مختلف مذہبی کتابوں کی تعلیم میں کچھ مطابقت

دیکھتے ہیں تو وہ غلطی سے یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ بعد کی کتاب نے اپنے ماضی صحیفہ سے اس تعلیم کو نقل کر لیا ہے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ وہ خدا جس نے ایک نبی کو شیعہ ہدایت دی (جس کو خود اس نبی نے اور اس کی قوم نے اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کی) وہ اس صداقت کے نور کو دوسرے نبی پر بھی ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ رب المشارق والمغربین^{۳۶} کی روحانی روشنی اور تعلیم بھی کسی ملک اور قوم تک محدود نہیں بلکہ اختلاف اوقات زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ روشنی بھی برابر چلتی رہی ہے۔ مسلم قوم کے علاوہ ہر قوم

سورۃ واقعہ اور سورۃ نباہ
کے بیان کے مطابق ہے

دن بہشت کے متعلق بتایا "بہشتیاں راتیں آنکھیں میڑوں برتر
باشند نہ ز ریز و کہنہ شود نہ درگیر و نہ آلائش درو

قرار آید..... در اوں خورم آباد جاوید پائید دو (تیسرے ص ۱۱۱)

(۱۱) دوزخ کے بارے میں ہے مگر گمراہوں کو دوزخ باشد۔ بدخوئے ہلے
اور دھیکہ آتش سوزندہ و برف فشرندہ و مار کتر دم
از زندگان دوزخ آوراں شدہ آرائش دہند۔
(دس تیسرے ص ۲۵)

اس کی تصدیق کی۔

(۱۲) وحی الہی کی تین قسمیں بتائیں اول خواب دوم غنودگی
اور سوم بیداری کی حالت (نامہ شت و خورشید شت۔
ہوتا ہے۔

(آیت ۵ تا ۷)

(۱۳) پیغمبر کی دنیا کو کیوں ضرورت ہے اور اس کی شناخت
کیلئے ضرورت اس لئے ہے کہ نظام عالم کی درستی اللہ
کے بتائے ہوئے قانون کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور وہ
قانون پیغمبر کے ذریعہ ہی نافذ ہو سکتا ہے۔ اس کی شناخت
یہ ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے دوسرے نہیں جانتے وہ انسانی
فطرت سے واقف ہوتا ہے۔ کسی جواب سے عاجز نہیں۔ وہ
جو کر سکتا ہے دوسرے نہیں کر سکتے۔

(نامہ یشت و خورشید آیات ۴۵ تا ۵۴)

(۱۴) تخلیق کائنات چھ ادوار میں بالترتیب ہوئی آسمان۔
پانی۔ زمین۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور آخر میں انسان

کو پیدا کیا۔

(۵) تمام کس انسانی کے ماں باپ آدم (مشتیہ) تخلیق آدم و حوا کا ذکر

ادھ حوا (مشیانا) ہیں

قرآن میں ہے۔

آنحضرت نے زرتشتی مذہب کی کیا اصلاح کی یا حضرت زرتشت کی بنی موعود کی پیشگوئیوں کے سلسلہ میں آپ پڑھیں گے کہ وہ موعود بنی زرتشتی مذہب کی اصلاح کرے گا اور شرک کو مٹائے گا۔ کچھ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام کو فتح ایران کے وقت جس مجوسی قوم سے واسطہ پڑا تھا وہ حضرت زرتشت کی تعلیم سے بہت دور ہٹ چکی تھی۔ اس قوم کے اس زمانہ میں مذہبی تصورات کو سمجھنے سے اصلاح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) زرتشتی قوم میں بت پرستی کے بجائے مظاہر پرستی کا عقیدہ راسخ تھا۔ خدا دو تھے ایک خالق نور (آہور مزدا) اور دوسرا خالق ظلمات (اہرمن)۔ ہر اچھی چیز کا خالق یزدان (آہور مزدا) اور ہر بری چیز کا خالق اہرمن تھا۔ اسلام نے بتایا کہ دو خداؤں کا تصور غلط ہے۔ ہر شے کا خالق اللہ اور صرف اللہ ہے اور وہ وَحْدٌ لَا شَرِیکَ لَهُ ہے جو چیز نہیں بڑی اور خوفناک معلوم ہوتی ہے اس کی تخلیق میں بھی سینکڑوں حکمتیں اور فوائد ہیں۔ تکوینی امور کو وہی بہتر سمجھتا ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔ موت اگرچہ خوفناک معلوم ہوتی ہے مگر آئندہ ترقیات کا یہی دروازہ ہے اسی لئے اس آخری مصلح نے فرمایا ”خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاتِ“ یعنی موت و حیات دونوں کو اسی نے پیدا کیا۔ دونوں کے خدا اگر الگ الگ ہوتے تو ان میں جنگ چھڑ جاتی اور نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔

(۲) مجوسیوں کے اس خیال کی بھی اصلاح کی کہ خدا کے دشمنوں و انبیاء کے متعلق یہ گمان کہ وہ فرائض نبوت کے بجائے میں کوتاہی برتتے ہیں یا احکام خداوندی کی تعمیل سے انکار کرتے ہیں غلط ہے۔ یہ عقیدہ نہایت غیر معقول ہے۔ کیا خدا کو اس کا علم نہ تھا کہ

فلاں و خشور یا نبی رسالت کا اہل نہیں اور پھر و خشور خود بذات خود دوسروں کے لئے نمود ہوتے ہیں اگر وہ خود ہی غلط ہوں تو دوسروں کی رہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں۔ مجوسی زرتشت کو سب سے پہلا شارح نبی سمجھتے تھے اس لئے کہ نوح کے بعد کم نے نبوت کی تبلیغ سے انکار کر دیا تھا۔ (وندادید و فرگرد بحوالہ میثاق النبیین ص ۲)

(۳) موجودہ سائنس کے دور میں یہ توہمات کس درجہ قابل اصلاح ہیں جن کی اصلاح کے لئے اب سے چودہ سو سال پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ لاش سے زمین، ہوا اور انسان ناپاک ہو جاتے ہیں۔ لاش میں جہنم کے دار و قعہ گھس آتے ہیں یا عور میں اپنے مخصوص دلوں میں اس قدر ناپاک ہو جاتی ہیں کہ ان کو دور سے کر چھی کے ذریعہ پھینک کر کھانا دینا چاہئے۔

(۴) اسی طرح کتے کی جان کو انسان سے زیادہ عزیز سمجھنا۔ قتل انسان کی سزا مرگ و دے اور کتے کو بڑا کھانا دینے کی سزا دوسو دے۔ عورت بچہ کی پیدائش کے بعد اگر پانی پی لے تو سزا دوسو دے۔ اگر انسان ناپاک ہونے کی حالت میں درخت یا پانی کو چھو لے تو اس کی سزا چار سو دے ہے اور مردہ کو جلانے یا دفن کرنے کی سزا ناقابل کفارہ اور ناقابل معافی۔ (ملاحظہ ہو اد فرگرد ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹ اور ۲۰، ۲۱، ۲۲ بحوالہ میثاق النبیین ص ۲۹)۔

(۵) زرتشتی دین میں مردک نے عورتوں کے متعلق نہایت اخلاق سوز باتیں داخل کر دی تھیں جس کی اصلاح اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر کی گئی۔

حضرت زرتشت کی پیشینگوئیاں۔ (۱) یہ بتایا جا چکا ہے کہ زرتشت ستارہ دوسٹا کا پہلا حصہ وندیداد اور دوسرا یشت ہے۔ فروردین یشت ۲۸ آیتہ ۱۲۹ میں ایک پیشینگوئی بطور استعارہ درج ہے کہ ”جناب زرتشت کی خفیہ اولاد محفوظ ہے جو ان کے بعد اس طرح ظاہر ہوگی کہ ایک عورت حوض کوثر میں نہاے گی..... اس سے ایک مومود بنی۔“

”استوتیریتہ (محمد) یا شاد شینت“ (رحمۃ للعالمین) پیدا ہو گا جو زشتی دین کی حفاظت کرے گا۔ بت پرستی مٹا دے گا اور زرتشتیوں کی اصلاح کرے گا۔

اس پیشینگوئی میں زرتشتیوں کے نزدیک حوض کوثر سے مراد ایک جھیل ہے جو سیستان میں بتائی جاتی ہے جس میں کینخہ (شاہ ایران) غسل کرتا ہوا گم ہو گیا۔ یہی چشمہ حیات ہے جہاں زرتشتیوں کے کینخہ روا اور عام مسلمانوں کے خواجہ غفرا بتک بقید حیات ہیں اور مجھے بے مشکوں کو راستہ بتاتے یا علم سکھاتے ہیں پیشینگوئی کی اصل عبارت پر قرآن مجید کی روشنی میں غور کیجئے تو مفہوم بالکل واضح ہے کسی تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عبارت میں حوض کوثر سے مراد کوئی آبی یا مادی جھیل نہیں بلکہ روحانی پانی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں ماوا الحیات اور اعلیٰ درجہ کی صداقتیں جمع ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔ اور اس کو اِنَّا غَطَّيْنٰكَ اَلْكُوْثُرُ فرما کر دنیا کو بتلایا اور دنیا نے تسلیم کیا جس میں ڈاؤنٹر ترجمہ نداد ستانے مذکورہ بالا آیتہ کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ ”اس کا نام فارخ مہربان استوتیریتہ تعریف کیا گیا یعنی محمد، ہو گا۔ وہ شاد شینت یعنی رحمت مجسم ہو گا جو نہ وہ تمام جہان کے لئے رحمت ہو گا۔ وہ ہاشم ہو گا اس لئے کہ کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے برخلاف مبعوث ہو گا وہ مشرک (بت پرستوں) اور ایماندار لوگوں (زرتشتیوں کی بدلیوں کی اصلاح کرے گا۔

باقی

ادارہ کے قواعد و ضوابط کی کاپی اور سالانہ مطبوعات کی

فہرست طلب فرمائیے

منجبرہ و المصنفین جامع مسجد دہلی

الترغیب والترہیب

مصنفہ حافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذریؒ

از جناب مولوی محمد عبد اللہ صاحب دہلوی حوالہ
اگست ۱۹۷۲ء میں الترغیب و الترہیب کے مولف حافظ زکی الدین
المنذری کا تعارف شائع ہوا تھا زیر نظر مضمون میں اصل کتاب
کا تعارف شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ کتاب بھی جلد شائع ہو رہی
ہے۔ (مُربان)

”ترغیب و ترہیب“ (اعمال خیرہ اجر و ثواب اور بد عملیوں پر زجر و عقاب) کے موضوع
پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا تذکرہ آئندہ کسی فرصت میں کیا جائے گا۔ درست حافظ زکی الدین
المنذری کی کتاب ”الترغیب والترہیب“ کا تعارف، خصوصیات اور اس پر اہل علم کی خدمات
کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حافظ منذریؒ نے کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ میرے ایک سعادتمند شاگرد نے مجھ سے
یہ تمنا ظاہر کی کہ میں ترغیب و ترہیب کے موضوع پر ایک جامع کتاب املا کر دوں جو اسلوا و ظل
کی بحثوں سے خالی ہو اور اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی ہو ان کی درخواست پر مصنفؒ نے
استحارہ کیا اور اس کے بعد یہ کتاب املا کرادی۔

اس کتاب میں صرف وہی حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں مراحت کے ساتھ ترغیب و ترہیب
کا مضمون ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات بالکل نہیں لئے گئے ہیں

اور اقوال میں بھی صرف امر یا صرف نہی کی احادیث نہیں لی گئی ہیں بلکہ بہت سی موصوفیہ کی متنا حدیثوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ یہ آپ کا صرف فعل ہے قول نہیں ہے یا یہ کہ یہ صرف امر یا نہی ہے ترغیب و ترہیب کا مضمون اس میں مراحت کے ساتھ نہیں ہے۔

احادیث کی سندوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے کتب حدیث کے حوالے دیدئے ہیں اور سند کا مقصد چونکہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے رجال کو دیکھ کر حدیث کی صحت یا عدم کا اندازہ کیا جاسکے اور یہ کام صرف ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے مصنف نے اس کا نعم البدل یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی کتاب کی کل احادیث کی باعتبار درجہ استنادین قسمیں کر دیں ائمہ میں سے ہر ایک کی الگ کچھ علامتیں مقرر کر دیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ :-

(۱) وہ حدیثیں جن کی سند صحیح یا حسن یا اس کے قریب قریب ہو۔ ایسی روایات کو وہ لفظ "حسن" سے شروع کرتے ہیں اور آخر میں اس پر کچھ کلام نہیں کرتے۔
(۲) وہ حدیثیں جو مرسل یا منقطع یا معضل ہوں، یا اس کا کوئی راوی مبہم ہو یا ضعیف ہو مگر بعض ناقدین حدیث نے اسے ثقہ کہا ہو یا ثقہ ہو مگر بعض علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہو اور باقی رجال اس کے یا تو ثقات ہوں یا اگر ان پر کلام ہو تو ایسا جو ثبوت میں کچھ مضرنہ ہو۔ یا وہ حدیثیں ایسی ہوں جو مرفوع نقل ہوئی ہوں مگر صحیح ان کا موقوف ہو نا ہو یا متصل نقل ہوئی ہوں مگر حقیقت میں وہ مرسل ہوں۔ یا یہ کہ وہ حدیث ہو تو ضعیف لیکن اس کے بعض مؤخر جین نے اس کو

لے مصنف نے اپنا یہ اصول اس کتاب میں کئی جگہ بیان کیلئے۔ مثلاً الترغیب فی صلوٰۃ

میں ج ۱ ص ۱۳۳ ، الترغیب فی کلمات یقولہن مین یاوی الی فراشہ میں ج ۱ ص ۱۴۲ ، اور اس کے ایک صفحہ بعد ص ۱۴۳ پر اور ان کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر۔

صحیح یا حسن کہا ہو۔۔۔۔۔ ایسی تمام روایات کو بھی لفظ "عن" سے شروع کیا ہے اور حدیث کے اخیر میں اس کی سند کا حال اس کا ارسال والنقطان وغیرہ بیان کر دیا ہے۔

(۳) وہ حدیثیں جن کی سندوں میں کوئی راوی ایسا ہو جس کے متعلق کذب، عتق، مشہور، یجمع علیٰ تحکیم، مجمع علیٰ ضعف، ذہیب الحدیث، حالک، ساقط، وغیرہ الفاظ کہے گئے ہوں۔ یا جن احادیث کی سندوں میں شیعہ یا کسی کا کوئی احتمال ہی نہ ہو۔۔۔۔۔ ایسی تمام روایات کو لفظ "سوی" سے شروع کرتے ہیں اور ان کی سندوں پر کچھ کلام نہیں کرتے، گویا ضعیف احادیث کی پہچان یہ ہوئی کہ وہ لفظ "سوی" سے شروع ہوا اور حدیث کے اخیر میں اس کی سند پر کچھ کلام نہ ہو۔

مصنف نے بیان کیا ہے کہ جو روایات متعدد صحابہ کرام سے نقل ہوئی ہیں ان میں سے کسی ایک کو کا نام ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حوالہ جات میں عموماً چند مآخذ کا ذکر کر کے بقیہ کا تذکرہ قصداً چھوڑ دیا ہے انھوں جو روایت بخاری اور مسلم یا ان میں سے کسی ایک سے لی ہے تو اس کے ساتھ عموماً کسی اور کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔

جوامع و سنن اور معاجم و مسانید میں اس موضوع کی کوئی حدیث حتیٰ الامکان نہیں چھوڑی ہے سوائے ان روایات کے جن کی سند بہت ضعیف یا موضوع ہو، اس موضوع پر اپنے سے پہلے قلم اٹھانے والوں میں سے خاص طور پر مصنف نے ابوالقاسم صہبانی کی کتاب الترغیب والترہیب کا ذکر کیا ہے کہ میں نے اس کی کوئی حدیث نہیں چھوڑی ہے سوائے ان حدیثوں کے جن کا موضوع ہونا یقینی تھا۔

کتاب کے مآخذ | مصنف نے زیادہ تر روایات اپنے بیان کے مطابق ان کتابوں سے اخذ کی ہیں :-

() صحیح مسلم
() سنن ابی داؤد

() مؤطا امام مالک
() مسند امام احمد بن حنبل

- () صحیح بخاری
() کتاب المراسل لابی داؤد
() جامع الترمذی
() السنن الکبریٰ للشیخ
() سنن ابن ماجہ
() کتاب الیوم واللیلۃ سنائی
() المعجم الکبیر للطبری
() المعجم الصغیر
() مسند ابی بکر البزار
() مسند ابی یعلیٰ الموصلی
() صحیح ابن حبان
() المستدرک علی الصحیحین للہکم

ان کے علاوہ کچھ حدیثیں کہیں کہیں ان مآخذ سے بھی لی گئی ہیں :

- () صحیح ابن خزیمہ
() ابن ابی الدنیاء کی کتابیں ۔

کتاب میں حوالجات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن ابی الدنیاء کی کتابوں میں سے مصنف کے پیش نظر یہ کتابیں رہی ہیں :- مکاید الشیطان ، کتاب الصحت ، کتاب العیون ، کتاب الجورح ، کتاب ذم الغیۃ ، کتاب الاولیاء ، اصطلاح المعروف ، کتاب المرض والکفارات وغیرہ۔

شعب الایمان للہیثمی

کتاب الزمہ الکبیر

کتاب الترغیب والترہیب ، لابی القاسم الاصبہانی

مصنف کے بیان کے مطابق اگرچہ اس کتاب کی تمام روایات لے لی گئی ہیں لیکن راقم السطرح کا خیال ہے کہ اس کی صورت بظاہر یہ ہوئی ہے کہ اس کتاب کی مندرجہ روایات دوسری کتابوں کے حوالے سے نقل کی ہیں مثلاً اس کی جو روایات بخاری مسلم وغیرہ میں ہیں وہ بخاری و مسلم ہی سے لی ہیں اس لئے اس کتاب کا حوالہ بہت کم ملتا ہے۔

مزید مآخذ | یہ تو وہ مآخذ تھے جن کا ذکر خود مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے لیکن بہت سے مآخذ اور بھی ہیں جن کا مصنف نے ذکر نہیں کیا ہے اور کتاب میں

جانبان کا حوالہ ہے ہم نے پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی مندرجہ ذیل فہرست مرتب کی ہے :-

ابو بن معاویہ العبدی

لابن عدی

عبد اللہ بن المبارک

مسند حسین بن حسین المرزوی

عبد اللہ بن المبارک

محمد بن نصر المرزوی

ابن حبان صاحب الصبیح

لابن ابی عامر

امام البخاری

لابن یونس

امام البخاری

لابن حبان صاحب الصبیح

لابن السی

لابی منصور الدلمی

جامع الاصول

اکمال

کتاب الزبد

زوائد کتاب الزبد لعبد اللہ بن المبارک

کتاب البر

کتاب الصلوۃ

کتاب الصلوۃ

کتاب الصلوۃ

التاریخ

تاریخ مصر

کتاب الضعفاء

کتاب الف مفاء

عمل الیوم واللیلۃ

مسند القرویس

اس مسودے میں ابتداء میں نے اس کا بھی اہتمام کیا تھا کہ ہر ماخذ کی نشاندہی بھی کریں کہ اس کتاب کا حوالہ ترغیب میں کس جگہ ہے اور ہر کتاب کے نام کے ساتھ تین حدیثیں ان کے باب اور جلد و صفحہ کے ساتھ جمع بھی کرنی تھیں لیکن طوالت کے خوف سے اسے حذف کر کے صرف اسما و کتب نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ جن کتابوں کا حوالہ پوری کتاب میں صرف دو ایک ہی جگہ ہے۔ ان کی نشاندہی گزری گئی ہے۔

زوائد المسند	عبد اللہ بن الامام احمد
کتاب السنہ	ابن ابی عاصم
کتاب العلم	لابی عمرو بن عبد البر النمري
حلیۃ الاولیاء	لابی نعیم الاصبہانی
کتاب الثواب	لابی الشیخ ابن حیان الانصاری

۱۔ یہ زوائد بھی اگرچہ مسند احمد ہی کا جزء ہے اور عموماً ایک ہی نسخہ بھی جاتی ہے لیکن معصفت نے اس کے حوالے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے دئے ہیں اس لئے ہم نے بھی اسے ایک الگ ماخذ قرار دیا ہے۔

۲۔ ابو الشیخ ابن حیان الانصاری المتوفی ۳۵۷ھ صاحب کتاب الثواب و کتاب التوبخ وغیرہ ہیں

اور ایک دوسرے محدث ابن حیان البستی المتوفی ۵۴۷ھ میں جو کتاب الانواع و التقاسیم کے

مصنف ہیں اور اسی کو تصحیح بھی کہتے ہیں۔ یہ مؤخر الذکر جو کچھ زیادہ مشہور ہیں اور نام میں مشابہت ہے

اس لئے اکثر لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے اور ابو الشیخ ابن حیان کو بجائے یاسے مشائخ من تحت کے

بار موحده سے لکھ دیتے ہیں اور یہ غلطی اتنی عام ہے کہ اگر آپ سوچو کہ یہ نام کون کون سے لکھیں گے تو شاید

ستر جگہ باو موحده کے ساتھ لکھا ہوا ملے گا۔ اکثر نئی اور پرانی کتابیں اس غلطی سے پڑ ہیں۔

الترغیب والترہیب میں جہاں فرق ابو الشیخ ہوا ہے اس کو جوہر ذکر پورا نام ابو الشیخ ابن حیان "پوری کتاب میں جو کچھ

جگہ آیا ہے اور میرے ذاتی نسخہ مطبوعہ مکتبۃ المآب المجلدی مصر ۱۳۷۷ھ میں تمام مقالات پر بلا استثناء باو موحده

کے ساتھ لکھا ہے دوسرے نسخوں میں بھی کہیں موحده کے ساتھ لکھا ہے کہیں مشائخ کے ساتھ کشف الخوف میں

بھی بعض جگہ "ی" اور بعض جگہ "ب" سے بشذرات الذہب میں بھی باو موحده کے ساتھ ہی لکھا ہے

اور ان کے علاوہ بھی بہت جگہ یہ دیکھا گیا ہے۔ علامہ ربیعہ لکھتے ہیں کہ قاضی شمس الدین ابو العباس

احمد بن ابراہیم السبکی الحنفی المتوفی ۷۴۰ھ نے "الغایۃ شرح الہدایۃ" میں بیان کیا ہے کہ یہ

ابن حیان صاحب تصحیح نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ باو مشائخ کے ساتھ ابن حیان ہے (غیب اللہ فی تخریج احادیث

الہدایۃ ص ۱۷۷)

لابی بکر بن ابی شیبہ رحمہ

لعبدالرزاق رحمہ

للدارقطنی رحمہ

للدارمی رحمہ

لابی عبدالرحمن السلی رحمہ

لابی نعیم المصباحی

" " "

لابی عبدالبر السمری رحمہ

المصنف

المصنف

السنن

السنن

کتاب الاربعین (فی التصوف)

معرفة الصحابة

کتاب السواک

کتاب القاسم بن اصفیہ

التمهید

۱۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب استاد محترم مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی تحقیق و تعلیمات کے ساتھ منقریب بیروت سے شائع ہونے والی ہے۔

۲۔ اس کتاب سے صرف ایک حدیث لی گئی ہے۔ الترغیب فی العلم۔ حدیث ۱۱۱ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ج ۱ ص ۱۳۳

۳۔ اس سے بھی صرف ایک ہی روایت لی ہے الترغیب فی صلوة العشاء والصبح حدیث ۱۱۱ عن یحییٰ بن یوسف رحمہ اللہ ج ۱ ص ۱۳۳

۴۔ اس سے بھی الترغیب فی السواک کے اخیر میں صرف دو حدیثیں عن ابن عباس رضی اللہ عنہما و عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ج ۱ ص ۱۳۳ نقل کی گئی ہیں۔

۵۔ اس کا سوال بھی صرف ایک ہی جگہ ہے الترہیب من ترک حضور الجماعۃ بغیر عذر کی پہلی حدیث عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ج ۱ ص ۲۸۲

۶۔ اس سے بھی الترہیب من المودین یدی المصلی ج ۱ ص ۳۷ کی صرف آخری ایک حدیث عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کی ہے۔

(کتاب کا نام مذکور نہیں)

ابن جریر الطبریؒ

(" " " ")

ابو حفص عمر بن شایبہؒ

(" " " ")

ہبشہ اللہ الطبریؒ

لابی بکر بن ابی شیبہؒ

کتاب الایمانؒ

للحرطیؒ

مکارم الاخلاقؒ

لابی بکر بن مردویہؒ

تفسیر القرآنؒ

لادم بن ابی ایاسؒ

تفسیر القرآنؒ

۱۔ کتاب کا نام اگرچہ حافظ منذری نے نہیں لکھا ہے لیکن بظاہر ان کی کتاب الترغیب والترہیب سے لی ہوئی جس کا تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں (مقدمے کے گذشتہ صفحات میں) کر چکے ہیں۔ اس سے صرف دو جگہ استفادہ کیا ہے ایک الترغیب فی الاذان۔

۲۔ ان سے صرف ایک روایت الترہیب من ترک الصلوۃ بعد اکی پانچویں حدیث عن ثوبانؒ ج ۱، ص ۲۷۹، اخذ ہے۔

۳۔ اس کا بھی ہماری تلاش و جستجو کی رو سے صرف ایک جگہ حوالہ دیا ہے۔ الترہیب من ترک الصلوۃ بعد اکی کی بیسویں حدیث عن علیؒ ج ۱، ص ۳۸۸،

۴۔ منذری نے اپنی اس کتاب میں خواطی کا حوالہ باج جگہ دیا ہے لیکن کتاب کا نام صرف آخری جگہ الترہیب من اذی الجار کی بیسویں حدیث عن عمرو بن شعیب عن ابنین جدہ میں ج ۳، ص ۲۵۶ پر ذکر کیا ہے۔

۵۔ الترغیب فی قراۃ سورۃ الکہف کی دوسری حدیث عن ابن عمرؒ ج ۱، ص ۱۳۵ اسی سے لی گئی ہے۔ اہد غالباً کہیں اور اس کا حوالہ نہیں ہے۔

۶۔ ہماری تلاش کی رو سے اس کے حوالے سے صرف دو حدیثیں ماخوذ ہیں :-

۱۔ الترغیب فی قراۃ سورۃ الاحقاف ولا قوۃ الا بالذکر کی آخری حدیث ج ۲، ص ۲۷۵ و ص ۲۷۶۔ اور

۲۔ الترہیب من النار کی حدیث ۷۲ عن ابن عباسؒ ج ۲، ص ۲۷۲ و ص ۲۷۳،

لاحق بن راہویہ رحمہ

للبحری رحمہ

لابی الشیخ بن حیان رحمہ

لابی داؤد الطیالسی رحمہ

لابی حفص بن شاذان رحمہ

لابی الشیخ ابن حیان رحمہ

تفسیر القرآن ص ۱

شرح السنۃ ص ۱

کتاب التوضیح

السنۃ ص ۱

فضائل رمضان ص ۱

کتاب النعمایا ص ۱

۱۰ اس کا بھی ہماری نظر میں صرف دو جگہ حوالہ ہے۔

(۱) الترغیب فی لقاۃ الیتیم حدیث ۱۵ عن انس رضی ج ۳ صفحہ ۲۵۔ اور

(۲) الترغیب فی الفقر حدیث ۲۷ عن انس رضی ج ۴ صفحہ ۱۴۴ و ۱۴۵،

۱۱ اس کا حوالہ صرف تین جگہ ہے۔

(۱) الترغیب فی التفسیر علی المعسر کی حدیث ۱۳ عن ابی قتادہ ج ۲ صفحہ ۱۴ اسی سے ماخوذ ہے۔

(۲) الترغیب فی غسل الید قبل الطعام کی جو بھی حدیث عن ابی ہریرہ رضی ج ۳ صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۴

پر اس کا حوالہ ہے۔

(۳) الترغیب من الریاء کی حدیث ۱۲ عن عبداللہ بن سلام رضی ج ۳ صفحہ ۳ پر اگرچہ شرح السنۃ کا نام

نہیں ہے مگر نبوی کا حوالہ ہے جس سے بظاہر ان کی یہی کتاب مراد ہے۔

۱۲ اس کا حوالہ صرف دو جگہ ملا۔

(۱) الترغیب من الغیبة والغش کی آخری حدیث عن عبید ج ۲ صفحہ ۱۱،

(۲) الترغیب من الغیبة کی پندرہویں حدیث عن انس رضی ج ۳ صفحہ ۵۰،

۱۳ اس سے صرف ایک حدیث لی گئی ہے۔ الترغیب فی مدقۃ الفطر کی تیسری حدیث

عن جریر ج ۲ صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳۔

۱۴ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی الانیۃ کی تیسری حدیث عن ابی سعید رضی ج ۲ صفحہ ۱۵ پر ہے۔

کتاب الشامل ۱۵	للام الترمذی رحم
کتاب البعث والنشور ۱۵	للبيهقي رحم
انصاری ۱۵	کتاب کا نام درج نہیں ہے
الصمیم ۱۵	لابی عنوانہ رحم
المستخرج ۱۵	للمبرقانی رحم
کتاب الطل ۱۵	للدائر قطنی رحم
مفتحة الجنة ۱۵	للام البخاری رحم

۱۵ اس سے بھی کل کتاب میں صرف ایک حدیث لی گئی ہے، الترغیب فی التواضع فی الحج کی پہلی حدیث
عن انس ج ۲ ص ۱۸۳،

۱۶ اس کتاب سے جلد دوم میں ایک اور جلد سوم میں دو حدیثیں ہیں اور اس کے بعد الترغیب من النار
کی فصل فی شدۃ حرما وغیرہ تک کی اکثر روایات اسی سے ماخوذ ہیں۔

۱۷ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی التمسح والتکبیر الخ کی آٹھویں حدیث عن ابی امامہ رحم میں ج ۲ ص ۲۲ پر ہے
اس کا حوالہ دو جگہ ہے :-

(۱) الترغیب فی الاقتصاد فی طلب الرزق کی حدیث ۱۵ عن سعد بن ابی وقاص رحم میں ج ۲ ص ۵۳ پر۔

(۲) الترغیب فی الزہد فی الدنیا کی دسویں حدیث عن سعد بن ابی وقاص رحم میں ج ۲ ص ۱۶ پر،

۱۸ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی التواضع کی تیرھویں حدیث عن ابی سعید و ابی ہریرۃ
میں ج ۳ ص ۵۲ پر ہے۔

۱۹ اس کا حوالہ بھی صرف ایک ہی جگہ ہے، الترغیب فی الصدق کی بائیسویں حدیث عن سعد بن ابی وقاص رحم ج ۳ ص ۵۵

۲۰ اس کا حوالہ بھی صرف ایک جگہ الترغیب فی ما طہ الاذی عن الطریق کی نویں حدیث عن السنیر
بن اخضر بن معاویہ عن ابیہ میں ج ۳ ص ۶۱ پر دیا گیا ہے۔

لابی نعیم الاصبہانی رحمہ
للسیاقی رحمہ

مصنفۃ المجتہدۃ
کتاب الرویۃ

یہ تمام نام ان کتابوں کے ہیں جن کا ذکر کتاب میں بطور ماخذ حدیث آیا ہے۔ اس فہرست میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جن کا ذکر مصنف نے کسی حدیث پر کلام کرنے کے دوران کسی مسئلہ فقہیہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کیا ہے۔

اس کے حوالے سے صرف چوتھی جلد میں الترغیب فی المجتہد و نعیما میں تین حدیثیں لی ہیں:-

(۱) حدیث ۱۲ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما ۵۲۳ پر اور

(۲) حدیث ۱۳ عن ابن ابی داؤد رضی اللہ عنہما ۵۳۵ پر اور

(۳) حدیث ۱۴ عن عائشہ رضی اللہ عنہا ۵۴۵ و ۵۴۶ پر

اس کا جو صرف ایک جگہ الترغیب فی المجتہد و نعیما کی حدیث ۱۵۲ عن جابر رضی اللہ عنہما ۵۵۲ ہے۔

اہل علم کے لئے چار نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی: جو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسطدار شائع ہو رہی ہے قیمت مصریہ ۵۰۰ قلمے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے۔ آج ہی بیچ دس روپے بیچگی روانہ فرما کر خریدارین جلدی کتاب تک ۱۳ جلدیں طبع ہو چکی ہیں باقی ۱۶ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ جلالین شریف: یکم مہری طرز طبع شدہ حاشیہ پر مستقل کتابیں (۱) باب النقول فی اسباب النزول للسیوطی (۲) معارف الناسخ والمنسوخ لابن الحرم قیمت مجلد ۲۰ روپے

۳۔ شرح ابن قیم: الفیہ کی شہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے قیمت مجلد ۲۰ روپے

۴۔ شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی سورۃ بقرہ: تین جلدوں میں شائع ہو رہا ہے پہلی جلد آچکی ہے نمونہ طلب فرمائیے۔ چھ: ۱۰ دارہ مصطفیٰ سیہ دیو بند ضلع سہارنپور

علامہ اقبال اور تالیف زمان

انجناب شبیر احمد خان صاحب غوری اہل خانہ طبعیہ کا اعلیٰ لکچر

اسلام کی چہارہ صد سالہ فکری تاریخ میں سوائے فرقہ حرثانیہ کے (جس کے موقف کی تجدید تیسری صدی ہجری میں شہر سنی طبیب ابو بکر محمد بن زکریا الرازی نے کی تھی) اور کوئی "تالیف زمان" (Apotheosis of Time) کا قائل نظر نہیں آتا اور فرقہ حرثانیہ اسلام کے "ہفتاد و دو ملت" میں سے نہیں تھا۔ مگر چودھویں صدی میں اس انداز فکر کی علمبرداری علامہ اقبال نے اپنے ذہنی اور اپنی تمام ذہنی و فکری صلاحیتیں اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔

اقبال فطرتاً "مرد مومن" تھے۔ وہ ایک دیندار خاندان میں پیدا ہوئے اور بڑے دین پسندانہ ماحول میں پرورش پائی غذا پرستی بچپن ہی سے ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور اسی فطری اسلام پسندی نے عہد طفلی میں ان سے کہلوا یا تھا:-

غوثی سمجھ کے شان کریم نے چرنے لے قطرے جبیں پہ تھے خرق انفعال کے
اکی جذبے نیورپ کے لادینی ماحول سے بیزار کر کے ان سے کہلوا یا تھا:-

مژدہ لے پیما نہ برادر خرمستان حجاز بعد مدت کے ترے دیوانوں کو آیا ہے خوش
پھر غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز دل کے ہنکامے مئے مغرب نے کر ڈی خوش
اور اسی امکان محکم پران کا خاتمہ بالآخر ہوا:-

بمطالعہ برساں خوش را کردی ہمہ دست و گریہ و زاری سیدی تمام بولہبی است
اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی بھر علاء مکتبہ اسلام کے لئے کوشاں رہے اور تالیف کا یہ

عظیم محبوب ہے کہ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے انھوں نے "تالزمان" کا سہارا لیا۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی مگر یہاں اجمالاً اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ غلام نے اس عقیدے کا ابتدائی تصور برگسان کے "دوران خالص" (pure ree) سے لیا تھا مگر اس کی تکمیل الیگزینڈر کی کتاب "Space, Time and deity" سے پڑھ کر کی اور جو کسر رہ گئی تھی اس کی تلافی اسپنکس کی "انحلال الغرب" (Decline of the West) کے ذریعہ اسیرانی زروانیٹ سے واقفیت حاصل کر کے کی۔

ان پے پے فکری تاثرات کے نتیجے میں انجام کاراٹن کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ زمانہ ہی "حقیقت مطلقہ" یا "Ultimate reality" ہے یا سیدھے سادے لفظوں میں "زمانہ ہی خدا ہے" (نعوذ باللہ منہ) اور یہ وہ خیال ہے جہاں تک برگسان بھی اپنی فلسفیانہ آزادی رائے کے باوجود جس کے لئے وہ فرانس کے مذہبی حلقوں میں الحاد و بیدینی کے ساتھ متہم تھا) پہنچنے کی جرأت نہ کر سکا۔ مگر غلام کی مطلق العنان تخیل انھیں یہاں تک لے پہنچی۔ یہی نہیں بلکہ اسی جرأت و مردانہ کا فقدان اُن کی نظر میں برگسان کی سب سے بڑی کوتاہی تھا جیسا کہ وہ "خطبات" میں فرماتے ہیں:-

"میں یہ خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ برگسان کی غلطی زمان خالص کو ذات

پر مقدم سمجھنے میں مضمر ہے کیونکہ صرف اسی کے ساتھ دوران خالص محمول ہوتا یا

جاسکتا ہے۔"

بہر حال وہ (۲۸-۱۹۲۹ء) کے دوران میں زمانہ کے "حقیقت مطلقہ" ہونے کے بڑی شدت سے قائل ہو چکے تھے چنانچہ "خطبات" (الہیات اسلامی کی لٹیکس جدید میں ملتے ہیں۔

"جس طرح ہم اپنی ذات میں زمان کے تعاقب و تسلسل کا ادراک کرتے ہیں، اس

کی تنقیدی توجیہ اس بات کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ حقیقت مطلقہ کو دوران

خالص تصور کریں جس کے اندر علم حیات اور ایلانہ (فکر حیات) اور مقصد (اگرچہ

کے ساتھ گھل مل کر ایک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اس وحدت کا تصور ہم صرف اسی حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ذوات کی وحدت ہے۔ ایک برہم محیط قائم بذات ذات۔ جو تمام انفرادی (جوتی) افکار اور حیات کا سرچشمہ ہے۔

بلکہ ہنومان کی دیرینہ اسلام پسندی اس خیال میں مانع تھی۔ لہذا موجودہ عیسوی صدی کے تیسرے عشرہ میں انھیں اس بات کی تلاش ہوئی کہ اس نئے تصور کے لئے اسلامی فکر میں کہیں سند مل جائے۔ بد قسمتی سے چند کوتاہ فکر اجاب نے غلام کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور انھیں بتایا کہ ان کا یہ تصور نہ صرف عربی مدراس میں زیر درس معقولات ہی کی اعلیٰ کتابوں میں موجود ہے بلکہ حدیث کی کتابوں میں بھی ہے جو ایک مرد مومن کے لئے واجب الایمان ہیں۔ مگر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اس درجہ عقیدت مند تھے کہ ان سے اس نئے خیال کی تصویب کرائے بغیر اپنا نام انہیں چاہتے تھے۔ ادھر سید صاحب نے جو اس سنگلاخ وادی کے کبھی رہرو نہیں رہے تھے، غافیت خاموشی ہی میں بھی۔ غوطہ غلام نے اس خاموشی کو ”تعمویب“ سمجھ لیا اور پھر جو اس لکری بیڑہ روی کے قلم نام پیداکار میں غوطہ لگایا تو آخر تک اسی گرواب میں ہاتھ پاؤں مارے رہے اور ساحل نجات تک رسائی آخر تک ممکن نہ ہو سکی۔

بہر کیف علامہ نے مکتوب گرامی مورخہ ۷۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا۔
 شمس باغیہ صدر میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں ایک قول ہے کہ زبان خد ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لا تحسبوا اللہ صانع۔ کیا حکماء اسلام میں سے کسی نے یہ منہ سبب اختیار کیا ہے۔ اگر لیا ہو تو یہ بحث کہاں سے ملے گی یہ

آج اس خط کو لکھے ہوئے ۴۴ سال اور شائع ہونے کوئی ۲۹ سال ہو رہے ہیں اور شائع بھی ہوا تو سید صاحب کی زیر اداوت۔ مگر نہ تو انہوں نے اس مسئلہ کے حل کرنے کی

کوشش کی، اور نہ بعد میں کسی اور شراح یا نقاد نے اس کی تحقیق کی رحمت فرمائی صرف سید صاحب نے "اقبال نامہ" کے اندر اس غلط پر یہ نوٹ دیا ہے :-

"اقبال مرحوم کو اس بحث سے بڑی دلچسپی تھی۔ میں نے اس پر لاہور میں لکھی۔

ایک تقریر بھی سنی تھی، اخیر زمانے میں میرے دل میں علامہ ابن قیم کی تصانیف سے

ایک حقیقت فہم میں آئی جس سے بڑی خوشی ہوئی۔ مگر افسوس کہ اس زمانے میں قوم

بیمار تھے۔ انتظار تھا کہ وہ تندرست ہوں تو ان کو سناؤں۔ مگر افسوس غ

جو کٹ گئی نخل آرزو کی

مجھے یقین ہے کہ وہ اگر اس کو سنتے تو ضرور خوش ہوتے۔"

معلوم نہیں سید صاحب نے علامہ کے مکتوب مورخہ ۷۔ مارچ ۱۹۲۸ء کا کیا جواب دیا۔

لیکن انہوں نے "اقبال نامہ" میں جو نوٹ دیا ہے، اس سے نفس سوال کے جواب پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ یہ تو "اقبالیات"، کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ فلسفہ خودی کے علاوہ علامہ کو مسئلہ زمانہ بالخصوص "دوران خالص" سے بید دلچسپی تھی۔ مگر وہ تقریر کیا تھی جو سید صاحب نے لاہور میں اس موضوع پر علامہ کی زبان سے سنی تھی۔ ہم بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ سید صاحب کم از کم اس کے خطوط خالص سے قارئین کو ضرور واقف کر دیتے۔ رہا ان کا اپنا موقف جو انھوں نے ابن قیم جوزی کی تصانیف کے مطالعے کے نتیجے میں اختیار کیا تھا۔ کاش وہ اسے ہی نقل کر دیتے تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ ابن قیم کی توجہ ان توجہات سے مختلف تھی جو عام متکلمین و فلاسفہ نے بیان کی ہیں، یا نہیں۔

صاحب "شمس بازغہ" (ملا محمود جوہوری) اور صاحب "صدرا" (ممد الدین شیرازی)

کا زمانہ نگار ہوں صدی ہجری ہے، مگر "تاریخ زمان" کا قدیم ترین حوالہ اسلامی فکر میں سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ملتا ہے اور اس کا قائل تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتا تھا اس کی تفصیل تو آئندہ آئے گی سردست تو علامہ کو جو کچھ بتایا گیا تھا اور جس کی وضاحت انہوں نے سید

سلمان مدنی سے چاہی تھی۔ اس کی توفیق کی جارہی ہے۔

سبلہ زمان کی توجیہ ایک جانب حکماء (فلاسف) نے کی ہے اور دوسری جانب حضرت حکمین نے۔ مگر مسئلہ زیر بحث میں زیادہ اہم فلاسفہ کی توجیہ ہے۔

عام طور پر فلاسفہ (بالخصوص شیخ بوعلی سینا کے زمانہ سے) زمانہ کے باب میں اُمسی مذہب کے پیرو رہے ہیں جو ارسطو نے اپنایا تھا۔ اس مذہب کو قاضی عفندی نے ”المواقف فی الکلام“ میں بدیہ طور نقل کیا ہے۔

”وما البعھا ما ذهب الیہ اس سطواند مقدس حرکت الفلاس الاعظم“
(زمانہ کے باب میں مذاہب پنجگانہ میں سے) چوتھا مذہب وہ ہے جو ارسطو نے اختیار کیا تھا اور جس کی رو سے زمانہ فلک اعظم کی حرکت کی مقدار کا نام ہے)
بہر حال شیخ بوعلی سینا نے زمانہ کے اس ارسطو ایسی تصور کو ”کتاب النجاة“ اس طرح واضح کیا ہے۔

”الزمان مقدس للحرکة المستدیو من جهة التقدّم والتاخر لا من جهة المسافة“
(زمان حرکت مستدیو کی مقدار کا نام ہے تقدّم و تاخر کی جہت کے لحاظ سے نہ کے بمقام مسافت کے) مگر زیادہ عروج اشیر الدین ابہری کی تعبیر ہے :-
”الزمان مقدس الحركة“

(زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے)

کیونکہ اشیر الدین ابہری کی ہدایہ الحکمتہ ہی عام طور پر مدارس میں فلسفیانہ تفکیر کی اساس رہی ہے۔ بعد کے متعدد علمائو نے اس پر شرح لکھیں جن میں سے قبول عام دو شرحوں کو حاصل ہوا۔ ان میں سے پہلی تو محقق دوانی کے شاگرد مسیذی نے لکھی تھی اور دوسری میر باقر داماد کے شاگرد صدر الدین خیراڑی (طامدرا) نے اور اسی لئے یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مصنف کے نام پر ”مسیذی“ اور ”طامدرا“ کہلاتی ہیں۔

ملا محمود جو نہ پوری نے فلسفہ میں ایک مستقل کتاب "فہمس بازغہ" کے نام سے لکھی جو کچھ دون پہلے تک مغربی مدارس کے اندر فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں مشمول تھی۔ یہ کتاب متن اور شرح کے مجموعہ کا نام ہے جو دونوں ملا محمود کی تصنیف ہیں۔ متن کا نام "الحکمة البالغة" اور شرح کا نام "فہمس بازغہ" ہے۔ ہدایت الحکمة "تین قسموں پر مشتمل ہے: القسم الاول منطقی میں، القسم الثاني طبیعیات میں اور القسم الثالث الہیات میں۔ ان میں سے قسم اول (حصہ منطقی) کا درس میں رواج نہیں ہے۔ قسم ثانی (حصہ طبیعیات) تین فنون پر مشتمل ہے: الفن الاول بالعم الاجسام کی بحث میں، الفن الثاني فکیات کی اباحت میں اور الفن الثالث عنہریات کی اباحت میں۔ صدر ابو مدر الدین شیرازی کی "شرح ہدایت الحکمة" کا نام ہے) کا وہ حصہ جو درس میں متداول ہے، طبیعیات کے پہلے فن "علم الاجسام" کی شرح پر مشتمل ہے۔ اس فن میں دس فیصل ہیں جن میں سے آخری فصل "زمان" پر ہے۔ شارح (مدرس شیرازی) نے اس فصل کو تین مطالب پر تقسیم کیا ہے (۱) زمان کی ائیت (۲) زمان کی ماہیت اور (۳) زمان کا مبدع (غیر مقطوع) (البدایہ والنہایہ) ہونا لیکن انہوں نے ان مطالب ثلاثہ سے پہلے زمانہ کے باب میں مختلف مفکرین کے مذاہب گنائے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

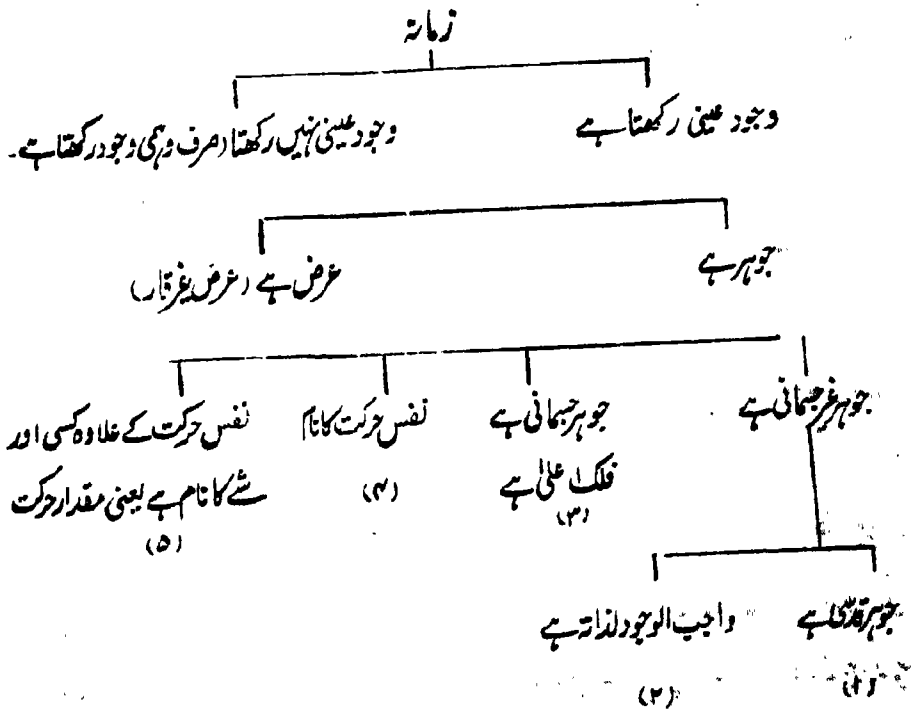
"وقبل الخوض فی المطالب بنی ان
 یحکم ان الناس اختلفوا فی الزمان اختلافاً
 عظیماً فمنہ من اثبت له وجوداً
 نسیاً ومنہ من نفی وجودہ الا بحیث
 والمثبتون لوجودہ : منهم من جعلہ جوہراً
 ومن جعلہ عرضاً والجا علون له جوہراً منهم
 من جعلہ جوہراً قد سیاً غیر جسمانی ورفقہ
 منهم زعمت انه الواجب الوجود لذاته ومنہم

ان مطالب ثلاثہ میں غور و فکر کرنے سے پہلے یہ جان لیتا
 چاہئے کہ لوگوں نے زمانہ کے بارے میں بڑا شدید اختلاف
 کیا ہے :- بعض لوگوں نے اُس کے لئے وجودی ثبوت
 ثابت کیا ہے اور بعض نے اُس کے وجود کی نفی
 کی ہے سوائے وہم میں ملحوظ ہونے کے جن لوگوں
 نے اُس کے وجود (یعنی) کو ثابت کیا ہے ان
 میں سے بعض نے اُسے جوہر اور بعض نے عرض
 بتایا ہے جن لوگوں نے اُسے جوہر بتایا ہے ان

من جملہ جوہر جسمانیہو الفلک الاعلیٰ والیا علیہ
 میں سے بعض نے اسے جوہر قدسی غیر جسمانی قرار دیا ہے
 اور ان میں سے ایک فرقہ نے اسے واجب الوجود قرار دیا
 گردانا ہے بعض لوگوں نے اسے جوہر جسمانی قرار دیا۔
 ہے، وہ (جوہر جسمانی) فلک علی ہے۔ اور جن
 لوگوں نے اسے عرض بتایا ہے ان کا اس کے

(مدد مجتہدی مرقومہ ۱۵۵-۱۶۱)

”عرض غیر قار“ ہوئے ہر اتفاق ہے یہ (عرض غیر قار)
 یا نفس حرکت ہے یا اس کے علاوہ اور کچھ ہے۔ یہ زمانہ کے مذاہب کی تفصیل۔
 مندرجہ ذیل نقشہ سے ان مختلف مذاہب کی وضاحت ہو جائے گی



ان میں سے دوسرے مذاہب کی علامہ کو اطلاع دی گئی تھی جب کہ انہوں نے سید صاحب کے
 نام اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا۔

شمس بازو یا حدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک قول یہ ہے۔

”کر زمان خدا ہے“

”شمس بازو“ حکمت طبعیہ ہے۔ طاحمود اس کی ترویج و تفصیل ارسطو کے انداز پر کرنا چاہتے تھے تجویز یہ تھی کہ یہ لافن ”سماط طبعی“ پر مبنیوں میں دو مقلد ہیں۔ دوسرے مقالہ کا تیسرا باب مباحث حرکت پر ہے۔ انھیں مباحث میں سے زمان، ”کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ کو اس کے متعلق کے ساتھ مصنف علیہ الرحمۃ نے مختلف فصول میں بیان کیا ہے پہلے شیخ بوعلی سینا کے انداز میں زمان کے وجود کو ثابت کر کے مذہب مختار کے مطابق اس کی ماہیت کو متعین کیا ہے؛ پھر زمان کے ”ابلاغ“ پر بحث کی ہے کہ نہ اس کی برایت ہے نہ نہایت۔ وہ حادث ضرور ہے لیکن اس معنی میں کہ اس کے ”محدث“ کو اس پر ”تقدم بالذات“ حاصل ہے نہ کہ ”تقدم بالزمان“ اس فصل میں انہوں نے میراقواماد کے نظریہ ”حدث دہری“ پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ زراں بد مسئلہ ”آن“ کی بحث ہے۔ اور پھر ایک مستقل فصل میں شیخ بوعلی سینا کے مذہب فی الزمان کے علاوہ زمان کے باب میں مفکرین اسلام جن اور مذاہب سے واقف تھے، انھیں نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”قلت فصل: سمات لهم في الزمان
قبل نفع الحكمة ظنون بتفريط و افراط.
فالمرطون فيه منهم من نفاء راساً.....
..... واما المفرطون فمستمع من جملة واجبا
لا متناع العدم عليه لذات، والايمان
لعدمه قبلية على وجوده او بعدية
عنه ولا يكونان الا بزمان“

میں کہتا ہوں فصل:- فلسفہ و حکمت کے پختہ
اور مکمل ہونے سے پہلے مفکرین زمانہ کے متعلق
افراط و تفریط کے ساتھ گمان کیا کرتے تھے جو لوگ
اس باب میں تفریط سے کام لیتے تھے وہ دوسرے
سے اس کا انکار ہی کرتے تھے اور جنہوں نے افراط
سے کام لیا ان میں سے بعض مفکرین نے اسے واجب
قرار دیا کیونکہ اس پر عدم لذاتہ مستغ ہے، ورنہ
اس کے مقطوع البدایہ ہونے کی صورت میں

اُس کا عدم اُس کے وجود سے متقدم ہو گا، اسی طرح (اُس سے مقطوع النہایہ ہونے کی صورت میں) اُس کا عدم اُس کے وجود سے متاخر ہو گا اور یہ دونوں (قبلیت و بعدیت و تقدم و تاخر) صرف زمانی ہی ہو سکتے ہیں اس طرح اُسے معدوم ماننے ہوتے کسی موجود کا متاخر ہو کر کا جو تناقض بالذات قول ہے،

زمانہ کو واجب الوجود ماننے والوں کے قول کی تائید میں اسی قسم کی دلیل ماسدہ مانے دی تھی۔ فرماتے ہیں :-

اور اُن لوگوں کی دلیل، جن کا گمان ہے کہ زمانہ -
 ”واجب الوجود لذاته“ ہے، یہ ہے کہ زمانہ کے عدم ذاتی کے فرض کرنے سے محال لازم آتا ہے اور ہر وہ چیز جس کے معدوم فرض کرنے سے محال لازم آتا ہو وہ ”واجب الوجود لذاته“ ہوتی ہے اس استدلال کا مقدمہ کبریٰ تو ضروری ہے۔ یہ مقدمہ صغریٰ تو اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ اگر ہم زمانہ کے وجود سے پہلے اُس کا عدم فرض کریں یا اُس کے وجود کے لئے اُس کا عدم فرض کریں تو ”قبلیت“ اور ”بعدیت“ زمانی ہی ہوگی اور اس طرح اُس کے معدوم فرض کرنے سے اس کا وجود لازم آئے گا۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے کی تجویز

”و اما حجة من زعم ان الزمان واجب الوجود
 لذاته فهو ان الزمان يلزم من فرض
 عدمه انه امر محال - وكل ما يلزم من
 فرض عدمه محال فهو واجب الوجود
 لذاته اما الكبريٰ فرض ودية و اما الصغرى
 فلا خلافضا عدم الزمان قبل وجوده او بعد
 وجوده لكانت القبلية والبعدية زمانية
 فقد لزم من فرض عدمه فرض وجوده
 فتعجز العلم على التزام متناقض“

(مسدہ صفحہ ۲۰۰-۲۰۱)

مناقض بالذات ہے۔

اسی طرح ملاحمد نے مذکورہ العدد اجمالی دلیل کی تفصیل شروع بدینہ طور کی ہے۔

”اما الذين افرطوا فلما اتقوا خطوه قائماً
بنفسه فمنهم ياتع في التلو فجله واجب
الوجود..... فلذین اتخذوه ائماً واجب
الوجود، انما وقعهم فی هذه الورطة الکلماء
ان الزمان لو فرض معدوماً کان عدمه
قبلیة علی وجوده اولیة و هذه الزمانیة
فیلزم وجود الزمان علی تقدیر فرض
عدمه فکان عدمه مستعلاً لذاته
وما احتنع غداً من لذاته واجب وجوده
القبلیة او البعدیة لیست
واجب لوجوده“

اور جن لوگوں نے زمانہ کے باب میں افراط سے کام
لیا ہے، ان میں سے ایک گروہ نے اسے ”قائم
بنفسہ“ بتایا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں
تک مبالغہ کیا ہے کہ اسے واجب الوجود سمجھ لیا۔۔۔
پس جن لوگوں نے اسے خدا سے واجب الوجود
مانا ہے انہیں اس اندھیری گڑبڑ میں اس (دلیل) نے
ڈال دیا ہے کہ اگر زمانہ کو معدوم فرض کیا جائے تو اس
کے عدم کو اس کے وجود کے ساتھ ”قبلیت“ یا
”بعدیت“ کا تعلق ہو گا اور یہ ”قبلیت“ یا ”بعدیت“
صرف زمانی ہی ہوگی۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے
کو فرض کرنے کی تعدیر یہ اس کا وجود لازم آئے گا۔
اس طرح اس کا معدوم ہونا مستح بالذات ہو گا۔ اور
جس کا عدم مستغ بالذات ہوتا ہے، اس کا وجود
واجب ہوتا ہے۔

لیکن ”تألیف زمان“ کا مذہب اسلامی نگہ میں کوئی ذمہ دار اور سنجیدہ قائل پیدا نہ کر سکا۔ اور
اس کے بعد میں مختلف دلائل وضع کر گئے۔ اس کی تفصیل امام رازی نے ”المباحث الشرعیہ“
میں دی ہے۔ بعد کے علماء میں سے ملاحمد نے اسی مذہب کے بعد میں حسب ذیل دلیل
دی ہے۔

”واجب الوجود استحالہ نحو خا من احدام (قائلین تألیف زمان کی دلیل کا) جواب یہ ہے

عدم لذاتہ کے ارجحاً ہونے کی کوئی سیاحت
اس کے مطلقاً معدوم ہونے کی متاعی نہیں ہوتی
حالانکہ واجب الوجود لذاتہ اس ہستی سے مراد
چے نہیں پر عدم لذاتہ کے جملہ انحاء و جہات مختلفہ
ہوں۔ لیکن زمانہ لذاتہ اس باسے سے لہذا نہیں
کہ تا کہ وہ سرے سے پایا ہی نہ جائے ہر چہ
کہ وہ موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے سے
ابا کرتا ہو۔

اسی طرح مآخذ ہونے اس مذہب رہا زمانہ کی رو سے لکھا ہے :

جس بات سے ان قائمین تالزمان کا شبہ
زائل ہو گیا ہے کہ زمانہ کو معدوم فرض کرنے کی
تقدیر پر اس کا وجود ہی صورت میں لازم آتا ہے۔
جبکہ یہ علم اس کے وجود سے سابق یا اس کے لاحق
فرض کیا جائے یعنی ایک مرتبہ اس کا عدم فرض کیا
جائے اور دوسری مرتبہ اس کے وجود کو فرض کیا
جائے۔ لیکن جب اس کا مطلق عدم فرض کیا جائے
تو اس فرض کرنے سے اس کا وجود لازم نہیں آتا۔
پس اس کی ذات کے لحاظ سے جو امر متعین ہے وہ
المسا عدم ہے جو وجود کے ساتھ ساتھ ہو نہ کہ
"عدم مطلق" پس زمانہ کے لئے مطلق عدم متعین نہیں
ہے۔ حالانکہ واجب ہے کہ اس میں مطلق عدم

لذاتہ لا تقتضی استحالہ مطلق عدم
واجب الوجود لذاتہ ما یمتنع علیہ
جميع انحاء العدم لذاتہ والزم ان لا
یائی لذاتہ ان لا یوجد مطلقاً و ان
ای لذاتہ ان یعدم بعد کوہ موجوداً

والذی یزوج مشبہتہ عدمہ یلزم وجود
الزمان علی تقدیر فرض عدمہ اذا فرض
العدم سابقاً علی الوجود ولا حقاً له ما عی
اذا فرض عدمہ تارة مع وجودہ آخری۔
اما اذا فرض عدمہ مطلقاً بلزم منقض
و لک وجودہ۔ فالمتعین یا انتظر الی ذاتہ
هو نحو العدم المتعین مع الوجود لا نحو العدم
المطلق فلا یمتنع علیہ مطلق العدم۔
والواجب ما یمتنع علیہ مطلق العدم
لا نحو منہ دون نحو

والشمس الغایزہ مطلقاً

متنوع ہونے کے عدم کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر کوئی ایک
نحو (جیت)

اس استدلال سے اس مذہب کی "مروجیت" بھی نہیں بلکہ کثافت بھی متحقق ہو جاتی ہے
اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر علامہ اس کے "مالہ" کے ساتھ "ما علیہ" سے بھی واقف ہو جاتے
تو اس "تال زمان" کا خیال بھی دل سے نکال دیتے۔ مگر علامہ کے زمانہ میں کسی اور عالم کو ان کے
اس اضطراب ذہنی کا پتہ نہ تھا اور جن کو معلوم تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

کا مصداق تھے۔

بہر حال علامہ جس اضطراب ذہنی میں مبتلا تھے، اس سے نجات پانے کے لئے ان کی
مگر انتخاب سید صاحب پر پڑی اور یہی ان کی بنیادی کوتاہی تھی۔ انہوں نے اپنے ملکہ مردم شناسی
پر اپنے جذبہ عقیدت مفرط کو غالب آ جانے دیا۔ سید صاحب کا علم و تجربہ ان کا تاریخی مطالعہ، ان کا ادبی
ذوق ہر چیز اپنی جگہ مسلم۔ مگر

ہر مردے دہر کا رے

آخر تو سید صاحب اسی ادارے کے نمائندے تھے جہاں سے معقولات کو سب سے
پہلے دس نکالا جاتا تھا۔ مگر علامہ کی عقیدت مفرط نے اس نقطہ نظر سے بھی انتخاب کے وقت انہیں
سوچنے نہیں دیا۔ پھر مسئلہ اپنی جگہ اس منفرد نوعیت کا تھا کہ اگر وہ غیر آبادی خاندان کے کسی استاد
سے بھی دریافت کرتے تو شاید وہ بھی علامہ کو مطمئن نہ کر سکتا۔ اس مسئلہ کا شافی جواب تو صرف
دہی علامہ روزگار مہیا کر سکتا تھا جس نے مشرق میں پہلی مرتبہ "development of
"metaphysic of persia" کہی۔ مگر علامہ کی بنیادی سہولت یہی تھی کہ

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تنہا می کردی

وہ حکم دہش چہ سال سید سلیمان ندوی سے استفادہ کی کوشش کرتے رہے، مگر نتیجہ

ڈھاک کے عین بات سے زیادہ نہ نکلا۔ کاش "فلسفہِ نجوم" کا باغی رویہ نہ ہو مگر مصنف جو عہد اسلام کی ما بعد کی سرگرمیوں کے علاوہ ایک جانب ان کے پیشرو یونانی اور ایرانی حکماء کی تفکیری ساسی سے اور دوسری جانب ان کے (مسلمانوں کے) بعد آنے والے علمی فلاسفہ کی سرگرمیوں سے ان کے صحیح پس منظر میں واقف تھا، اگر مختلف مآخذ سے بنفس نفیس فکر انسانی کا ایک منظم جائزہ مرتب کرتا تو پختہ بصیرتِ ایمانی اور خلوصِ دینی کی برکت سے ان غیر اسلامی افکار کے طمس میں نہ پھٹتا بلکہ پرتنبہ کاٹے ان علماء کی خاموشی کی وجہ سے کوئی موقع نہیں مل سکا۔

اس سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ حدیث "لا تسبوا الدھر" کی اس لمبا نہ و دہریہ تاویل کا تھا جو علامہ کو ان کے احباب نے بتائی تھی "سمدرا" و "شمس بازغہ" خیر معقولات کی کتاب میں ہیں، جن سے ناواقفیت کا ہندرا ایک حد تک قابلِ پذیرائی ہو سکتا ہے۔ مگر "بخاری شریف" کو حدیث کی کتاب ہے، اس کے باب میں تو کسی کو تاہی کو قابلِ عقوبت نہیں سمجھا جاسکتا۔

"حدیث" "لا تسبوا الدھر" کے الفاظ مختلف روایات میں جو بھی رہے ہوں مگر اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ علماء تو دور کنار نو آموز طلبہ بھی جانتے تھے کہ اس کے معنی ہیں:-

"دھر (زمانہ) کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مقلبِ دھر اور حوادثِ روزگار کا قائل ہے" یوں چالیس پچاس سال پہلے تک کی بات ہے۔ لیکن جب سے علامہ اقبال کے "خطبات" شائع ہوئے ہیں، صورتِ حال بدلتے لگی ہے۔ انھوں نے فرمایا:-

"This is why the Prophet said, 'Do not vilify time for time is God'"

یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: زمانہ کو برا مت کہو، کیونکہ زمانہ خدا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے:-

"The problem of time has always drawn the attention of Muslim thinkers and mystics. This seems to be due to the prophetic identification of God with (time) in a well known tradition."

(زمانہ کے مسئلہ نے ہمیشہ مسلم مفکرین و متعصبین کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی ہے۔
اس کی وجہ..... یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور
حدیث میں زمانہ (دہر) کو عین باری قرار دیا ہے)۔

مگر یہ اس حدیث کے پس منظر، لکری ماحول اور ان سب سے زیادہ قرآن کریم کی بنیادی
تعلیم سے جو اسلامی فکر کا اصل الاصول ہے۔ بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ پوری بحث تو ایک مستقل مبحث
کی مقتضی ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اساطین علماء نے ہمیشہ اس حدیث کے یہی
معنی لئے ہیں جو ہم نے بیان کئے :- ان میں قرآن کریم کے (دہر) شناس (مفسرین) بھی تھے لہذا
اقوال رسول کے محرم راز (محدثین) نیز شریعت بیضاء کے داہلے راز فقہاء بھی۔ چنانچہ امام
جزیر طبری نے جو طبقہ مفسرین کے گل سرسبد ہیں آیت کریمہ
”وَقَالُوا إِنَّمَا هِيَ إِلاٰ حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَنَحْيَا وَنَمُوتُ وَنَحْيَا وَنَحْيَا وَنَمُوتُ وَنَحْيَا“ الایہ۔

کے شان نزول میں اس حدیث کے سلسلے میں فرمایا ہے:

”وَذَكَرَ لَهَا هَذِهِ الْآيَةُ نَزَلَتْ مِنْ أَجْلِ أَنْ
أَهْلَ الشِّرْكِ كَانُوا يَقُولُونَ الَّذِي يَهْلِكُنَا وَيُهْلِكُنَا
الدَّهْرُ وَالزَّمَانُ ثُمَّ لَنَبْقِيَ مَا لَيْفَعْنِهِمْ وَيُهْلِكُهُمْ
وَيُهْلِكُهُمْ أَنَّهُمْ لَيَقْبِتُونَ بَدَلَكَ الدَّهْرُ وَالزَّمَانُ
فَقَالَ اللَّهُ عَنْ دَجَلٍ لَّهُمْ أَنَا الَّذِي أَفْتَكُمُ وَأَهْلَكُكُمْ
الْمُلْكُ وَالزَّمَانُ وَلَا عِلْمَ بِيْذَلِكَ“

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہی وہ ہوں جو تمہیں فنا اور ہلاک کرتا ہوں نہ کہ دہر
اور زمانہ۔ اور تمہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔

امام ابن جریر طبری نے جو بھی مدعی ہجری کے آغاز میں وفات پائی مگر بعد کے مفسرین کا بھی
یہی موقف رہا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

یہی موقع محدثین کرام کا تھا۔ کتب حدیث کے متون تو کچھ علی مدلوں میں مرتب ہوئے تھے مگر ان کی شرح و تعبیر لازماً ہوتی تھی یا کتب تفاسیر کے ضمن میں۔ چوتھی صدی ہجری میں ہم فحول علماء کو کتب حدیث کی شرح و ایضاح کرتے پاتے ہیں۔ ان میں ایک عظیم شخصیت امام خطابی کی ہے۔ انہوں نے ۳۰۰ھ میں وفات پائی تھی، اپنی جلالت قدر کی بنا پر وہ چوتھی صدی ہجری کے محدثین کے نام سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے ”سنن ابی داؤد“ کی شرح ”معالم السنن“ کے نام سے لکھی تھی۔ اس شرح میں وہ اس حدیث ”لا تسبوا الدھر“ کی تاویل میں فرماتے ہیں :-

”قال الشيخ : تاویل هذا الكلام ان العرب اتما كالوا بسبوت الدھر علی انه حوا لهم بهم فی المصائب والمكاره ولفيفون الفعل فيما ينالهم منها اليه ثم ليسبون فاعلها ، فيكون مرجع السبب في ذلك الى الله سبحانه اذ هو الفاعل لها۔ فقيل علی ذلك لا تسبوا الدھر فان الله هو الدھر ای ان الله هو الفاعل لهذه الامور التي تفنيقونها الى الدھر۔“

شیخ نے فرمایا ہے : اس کلام کی تفسیر ہے کہ اہل عرب دہر کو گالیاں دیا کرتے تھے کہ وہی ان پر مصائب و تکالیف نازل کرتا ہے اور تکلیفیں پہنچاتی ہے اس کی طرف منسوب کرتے پھر اُس کے فاعل کو گالی دینے۔ اس صحت میں گالی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتی کیونکہ وہی ان مصائب و حوادث کا فاعل حقیقی ہے۔ اس پر کہا گیا کہ ”لا تسبوا الدھر فان الله هو الدھر“ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان امور کا فاعل ہے جنہیں

(تم دہر کی طرف منسوب کرتے ہو۔)

محدثین کرام کا یہی مسلک بعد میں بھی رہا چنانچہ امام نوویؒ نے ”شرح صحیح مسلم“ کے اندر اس حدیث کی تاویل میں لکھا ہے :-

”وسبوا ان العرب كان مشا نھا ان نسب الدھر عند النوازل والموت والمصائب النازلة بمجانس موت الدھر اور اس کا سبب یہ ہے کہ عربوں کا دستور تھا کہ وہ مصائب و حوادث کے وقت (مثلاً موت بڑھاپا یا مال کی برباد و غیرہ)

او تلف مال او غیر ذلک فیقولون
یا خبیۃ الدھر ونحو هذا من الفاظ
سب الدھر فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
لا تسبوا الدھر فان اللہ هو الدھر
اے لا تسبوا فاعل انوار ال فانکم
اذا سبتم فاعلھا وقع السب علی اللہ
تعالی لانہ هو فاعلھا ومنزلھا
(شرح صحیح مسلم لآل النوی جلد الثانی صفحہ ۳۳)
فاعل ہے اور وہی ان کا نازل کرنے والا ہے۔

بہر حال محدثین کرام کے نزدیک نہ تو اللہ دہر ہے، نہ دہر اللہ ہے اور نہ ہر یا زمانہ کو دہر
کائنات میں کوئی دخل ہے۔ امام نووی نے اس آخری بات کو بھی صاف کر دیا ہے، یعنی محدثین باوجود
لفظی اختلافات کے بلا کسی استثناء کے زمانہ یا دہر کو حوادث کائنات میں غیر موثر مانتے ہیں۔

”واما الدھر الذی هو الزمان فلا
فعل لہ بل هو مخلوق من جملة خلق
اللہ تعالیٰ“
رہا دہر جو زمانہ ہے تو اس کا کوئی فعل نہیں ہے۔
وہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق دیگر مخلوقات کے
ایک مخلوق ہے۔

یہی نہیں بلکہ حدیث کے چوتھے متن ”فان اللہ هو الدھر“
میں ”دہر“ خبر نہیں بلکہ خبر مخدوہ کا مضاف الیہ ہے چنانچہ امام نووی نے اس بات کو
بالکل صاف کر دیا ہے:-

”ومعنی فان اللہ هو الدھر اے فاعل
النوازل والحوادث وخالق الکائنات۔
اور ”فان اللہ هو الدھر“ کے معنی ہیں اللہ
تعالیٰ ہی، مصائب وحوادث کا فاعل وکائنات
کا خالق ہے۔

جامع فقہاء کے نامہ ہے جو تھی صوری میں امام ابو بکر جعاف رازی اس باب میں قرار دیتے

جاسکتے ہیں۔ ان کی ”احکام القرآن“ آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔ اس تفسیر کے ائمہ اہل بیت کرمیہ: ”وَقَالُوا إِنَّ فِي الْأَحْيَاءِ نَفْسًا وَالْأَنْفُسُ تَحْيَا وَمَيِّتًا ۚ إِنَّكَ أَلَدُّ الْدَهْرِ“ الایۃ کی تفسیر کے ضمن میں حدیث ”لا تسبوا الدہر“ کی تاویل میں فرماتے ہیں:

”تافلہ اهل العلم على ان اهل الجاهلية
كالوا ينسبون الحوادث المعجزة والبلايا
النازلة والمصائب المتلفة الى الدهر
فيقولون فعل الدهر ومنع بناء البيوت
الدهر كما قد جرت عادة كثير من الناس بان
يقولوا اساعينا الدهر ونحو ذلك - فقال
النبي صلى الله عليه وسلم لا تسبوا فاعل هذه
الأمور فان الله هو فاعلها ومحدثها“
(احکام القرآن لام جصاص للزبي: المجلد الثالث ص ۱۷۷)

اہل علم نے اس کی بذمہ طور تاویل کی ہے کہ اہل جاہلیت حوادث و بلایا اور مصائب کو دھڑکی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دہر نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا اور پھر دہر کو گالی دیا کرتے تھے جیسا کہ بہت سے لوگوں کی یہ کہنے کی عادت ہو ا کرتی ہے کہ ہمارے ساتھ دہر نے یہ برائی کی وغیرہ وغیرہ۔ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان امور کے فاعل کو گالی مت دو کیونکہ ان کا فاعل اور پیدا کرنے والا اللہ تبارک تعالیٰ ہی تو ہے۔

یہی نہیں بلکہ دفع دخل مقدر کے طور پر انھوں نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ دہر اللہ تعالیٰ کے سوا محضی میں سے بھی نہیں ہے جیسا کہ بعد کے مضمونین و حکمائے متابعین، نے وہم تراشی کی ہے۔ اور یہ صرف امام جصاص الرازی ہی کا قول نہیں ہے بلکہ انھوں نے عریضہ طور پر صراحت کی ہے کہ ان کی زمانہ (چوتھی صدی ہجری) تک علمائے اسلام میں سے کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں تھا۔

”ولو كان مرفوعا كان الدهر مع الله تعالى وسب
كذلك لان حلقه من المسلمين لا يسي الله
بجملته الا سم“

اور اگر توہر مرفوع ہو تا رہا ہو تو وہ
اس لئے باری میں سے ہوتا مگر ایسا نہیں ہے
کیونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو
اس نام سے موصوم نہیں کرتا۔

البتہ پانچویں صدی ہجری میں اسپین کے مشہور عالم ابن حزم نے دوسری جدت آفرینوں کے ساتھ یہ جدت بھی فرمائی کہ ”دہر“ کو باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں محسوب کیا۔ مگر ابن حزم اول ابن حزم کے انداز پر سوچنے والے حکمائے متابعین اور متعوفین کی یہ جدت آفرینی طبقہ علماء میں مقبول نہ ہو سکی اور انھوں نے بالاتفاق اس کی تالیف کر کے اس موقف سے برأت کا اظہار کیا، چنانچہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے :-

”وقد غلط ابن حزم ومن منحا نحوه ان الدهر من اسماء الله تعالى“
ابن حزم اور ان کے انداز پر سوچنے والوں نے غلطی کی ہے جو انھوں نے ”دہر“ کو اسماء باری میں سے سمجھ لیا۔

رہے متکلمین تو انھوں نے تو زمانہ کے وجود ہی سے انکار کر دیا چنانچہ ”شرح المواقف“ میں ہے -

”انهم اعنى المتكلمين انكروا ايضا الزمان“
انھوں نے یعنی متکلمین نے زمانہ کے وجود خارجی کا بھی انکار کیا ہے۔

اور یہ ان کی تنگ نظری نہیں تھی بلکہ دور رس تھی کیونکہ زمانہ کا تصور ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہی اسے قدیم ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ امام رازی نے ”المباحث المشرقية“ میں ارسطو کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے :-

”قال المعلم الاول : من قال بحدوث الزمان فقد قال بقدمه من حيث لا يشعربه“ (المباحث المشرقية المجلد الاول صفحہ ۶۵۹)

(معلم اول (ارسطو) نے کہا ہے کہ جو شخص زمانہ کے حدوث کا قائل ہے وہ غیر شعری ظہور پر اس کے قدیم ہونے کا بھی متفق ہو جاتا ہے)

اور یہ چیز اسلام کی بنیادی تعلیم (توحید ربوبیت) کے انکار کے مترادف تھی لہذا ان کے لئے زمانہ کے انکار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

غرض حدیث ”لا تسبوا لہ مرء کے الفاظ جو بھی رہے ہوں اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا، علماء تو درکنار نو آموز طلباء بھی جلنے تھے کہ اس کے معنی ہیں :-
”دہر زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مقلب دہر اور حوادث روزگار کا قائل ہے“

اور آج بھی جو حضرات اس حدیث کو پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں، یہی معنی سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔

مگر علامہ اقبال نے غرض شعوری تجدید پسندی کے نتیجہ میں اس حدیث کو انتہائی خطرناک الحاد کی بنیاد بنالیا، چنانچہ وہ کہیں اسے ”جبار و قہار“ بتاتے ہیں اور اس کی زبان سے کہواتے ہیں :-

جنگیزی و تیموری مشتے زہبار من ہنگامہ افرونگی یک جستہ شرار من
انسان و حیات اواز نقش و نگار من خون جگر مرداں سامان بہار من
من آتش سوزانم من روفزہ فوہام

کہیں اسے ”نقش گر حادثات“ بتاتے ہیں :-

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات سلسلہ روز و شب اصل سیاحات
اور کہیں اسے ”اللہ لا الہ الا هو الہی القیوم“ کی طرح ”لا تاخذ کاسۃ ولا نوم“ کی صفت متزنی سے تصف فرماتے ہیں :-

“a deeper insight into our conscious experience shows that beneath the appearance of serial busy work is true duration..... untouched by weariness and unseizable by slumber or sleep.”

مگر علامہ اس فکری بی راہ روی میں بڑی حد تک معذور تھے۔ اسلام کے لئے مرثیہ کی ان کی تشریح، مگر ان کی ذہنی و فکری تشکیل میں جن عوامل نے موثر طریقہ پر حصہ لیا تھا، وہ تقریباً سب کے سب غیر اسلامی تھے، اسلامی عوامل میں یا ان کی تشریح تھی یا ”ہندوستان میں علوم اسلام کی جوئے شیر کے فریاد“ کی نفی تھی۔ مگر

دہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلے

”صدما“ اور ”شمس بازغہ“ نام مقبول بھی اور اس لئے ان کے لئے ناقابل فہم یا ناقابل اعتناء۔ لیکن ”سجاری شریف“، کی حدیث ”التسبیۃ اللہ“ کے متعلق تو وہ ان کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکتے تھے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر وہ علامہ کو لو کہہ دیتے۔

کیس رہ کہ قومی روی تبرکستان است

تو یقیناً وہ اس اعداد علی الباطل سے دست بردار ہو جاتے۔

اس کے ساتھ علماء و روز نگار کی بھی کچھ ذمہ داری تھی۔ آخر تو یہ ”تائر زمان“ ”وحدت الوجود“ اور ”متحدہ قومیت“ کے انکار سے کمتر خفیف نہیں تھا۔ اگر تصوف بالخصوص وحدت الوجود کے انکار کی بنا پر آسمان گر جاسکتا تھا، اگر ”ملت از وطن است“ کے انکار سے ملت میں زلزلہ آسکتا تھا تو کیا۔

“ A critical interpretation of a sequence of time as revealed in ourselves, has led us to a notion of the Ultimate Reality as pure duration ”

کی تبلیغ و اشاعت سے پہلے دین مشین کی بنیاد کھوکھلی نہیں ہو سکتی ہے۔

(بانی)

تبصرہ

ارمغان مالک :- جلد اول و دوم و سوم مرتبہ مجلس ارمغان مالک نئی دہلی، قیمت ہر جلد تین روپے مجموعی صفحات ایک ہزار سے زیادہ۔ پتہ :- مکتبہ جامعہ لیتھو، دہلی۔

جناب مالک رام صاحب اردو زبان کے نامور ادیب، محقق اور مصنف اور غالبیات کے معروف ماہر ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ عربی زبان اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند مقالات کے علاوہ ان کی کتاب "اسلام اور عورت" ان کے اس مطالعہ کی غلی دلیل ہے، وہ جب کسی بھی موضوع پر لکھتے ہیں اس پر پورے طور پر حاوی ہو کر لکھتے ہیں، اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی: کئی برس کی بات ہے، ایک مرتبہ چند حضرات کی معیت میں پروفیسر محمد مجیب نے راقم الحروف سے دریافت کیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے بیعت لیتے وقت اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہے؟ میں سوچنے لگا اور ابھی اس سوال کا جواب نہ دینے پایا تھا کہ مالک رام صاحب جو اس مجمع میں موجود تھے حسب معمول محققانہ پندار کے لب و لہجہ میں بولے: جی نہیں! کبھی نہیں، میں اعداد و ثبات کا تمام ذخیرہ کھنگال چکا ہوں، مجھے کہیں کوئی حدیث اس کے خلاف نہیں ملی، خیر! ان کے علمی اور تحقیقی ذوق کی پختگی اور اس کے فطران ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اعلیٰ سرکاری ملازمت کی خشک اور ہمہ وقت کی معروضیات کے باوجود ان کا تصنیفی سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ جو لوگ اس کی بڑی بڑی تنخواہ پاتے ہیں ان کا کبھی نہیں ہوتا، علم و ادب اور تحقیق میں اس نمایاں امتیاز کے مالک ہونے کے باعث ان کے دوستوں نے جن کا حلقہ

نہایت وسیع ہے۔ اس بات کی خواہش کی کہ موصوف کو ۶۵ برس کی عمر ہونے پر ایک کتاب نذر کی جائے اور کوئی شبہ نہیں وہ اس کتاب کے مستحق تھے۔ یہ وہی کتاب ہے جو تین جلدوں میں ہے، اول اور دوم جلدیں اردو مقالات کے لئے مخصوص ہیں جن کی مجموعی تعداد بتیس (۳۲) ہے۔ تیسری جلد میں سب معنائیں جو گنتی میں ۱۴ ہیں انگریزی میں اور ایک فرانسیسی زبان میں ہے۔ لکھنے والوں میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ یورپ کے بلند پایہ اربابِ علم بھی شامل ہیں۔ معنائیں دو قسم کے ہیں۔ (۱) مالک رام صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل پر اور (۲) خالص علمی مقالات، پہلی قسم کے مقالات میں ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) جو مالک رام صاحب کے ہم گاؤں اور اس بنا پر بچپن کے دوستوں میں سے ہیں اور جناب سید علی جوادی دہلوی کے مقالات بہت دلچسپ اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ دوسری قسم میں دو تین مقالات کو مستثنیٰ کر کے جو سرسری اور سطحی نظر آئے۔ سب بلند پایہ علمی اور تحقیقی مقالات ہیں اور اس حیثیت سے یہ صرف ”ارمغان مالک“ نہیں بلکہ اربابِ علم کے لئے بھی ایک گراں قدر تحفہ ہیں۔ کاغذ کتابت و طباعت اور انگریزی ٹائپ سب نہایت اعلیٰ اور معیاری، امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے شاد کام ہوں گے۔

مکاتیب طیب :- مرتبہ جناب شفیق احمد غفلی۔ کتابت و طباعت بہتر۔
نخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے۔ پتہ: مکتبہ نعمانیہ دلیوبند۔
یہ کتاب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دلیوبند کے ۳۸ خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں زبان کا چٹخارہ بھی ہے اور مکتوب بھی کا بے تکلف پیرائے۔ بیان بھی کہیں کہیں ظرافت اور لطیف مزاح کے چھینے بھی۔
میں وہ منطقی طرز استدلال بھی ہے جو مولانا کی تقدیر کا خاص امتیاز ہے۔

علاوہ ازیں یہ خط اصلاحی بھی ہیں اور علمی بھی۔ آخری اور سب سے زیادہ طویل خط آپ کا مکتوب لندن ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری قوت مشاہدہ کس درجہ تیز اور نکتہ رس ہے اور آپ کس طرح تمدن جدید کی چیزوں کو غور کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اظہار و بیان کا ایسا ملکہ بھی عطا فرمایا ہے کہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اس کا آنکھوں میں سماں بندھ جاتا ہے۔

لندن کے تذکرہ میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو وہاں کہیں بھی، پھر اور کھٹل نظر نہیں آیا تو آپ کو بڑی حسرت ہوئی کہ اپنے ملک کی یہ مخلوق وہاں کہیں نہ دکھائی دی۔ مولانا کی یہ غبارت پڑھ کر تبصرہ نگار کو بسیا خیر یاد آیا کہ دس بارہ جیسے کنیڈا وغیرہ کے قیام کے بعد جب راقم الحروف لندن پہنچا اور ایک دن وہاں ایک پاکستانی مسلمان کے رستوران میں لچ کھانے گیا اور اس وقت ایک کونہ میں ایک بھی اڑتی نظر آئی تو طبیعت اُسے دیکھ کر کس درجہ مسرور ہوئی ہے کہ شکر ہے ہمارے ملک کا یہ نشان امتیاز ابھی دنیا میں باقی ہے اور فنا نہیں ہوا۔ بہر حال یہ خطوط بہت دلچسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی مان کا مطالعہ ہم خرمائیم ثواب کا مصداق ہے۔

مدوۃ المصنفین دہلی

۱۹۶۱ء کی

۱۹۶۰ء کی مطبوعات

- | | | | |
|-------------------------|------------------------------|--------------------------|------------------|
| ۱۴/۰ | ۱۱/۰ | ۱۲/۰ | ۱۳/۰ |
| تفسیر مظہری اردو | تفسیر مظہری اردو | تفسیر مظہری اردو | تفسیر مظہری اردو |
| جلد | جلد | جلد | جلد |
| ۱۱/۰ | ۱۲/۰ | ۱۳/۰ | ۱۴/۰ |
| حیات مولانا سید عبدالحی | بیماری اور اس کا روحانی علاج | خلافت راشدہ اور ہندوستان | ماثر و معارف |
| ۱۱/۰ | ۱۲/۰ | ۱۳/۰ | ۱۴/۰ |
| ۱۱/۰ | ۱۲/۰ | ۱۳/۰ | ۱۴/۰ |
| ۱۱/۰ | ۱۲/۰ | ۱۳/۰ | ۱۴/۰ |

مدوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

دسمبر ۱۹۶۲ء

سنیتا خوش ہے لیکن مالتی منکر سے گھمسی جا رہی ہے۔



سنیتا نے دوراندرشی سے کام لیا اور اپنے کنبہ کو چھوڑ
رکھا۔ اس نے فیملی پلاننگ کے طریقوں کے بارے میں
واقفیت حاصل کی جس سے اس کے لئے اور اس کے کنبہ کے
دوسرے افراد کے لئے پرمٹرز زندگی بسر کرنے کے لئے
اُسے کھل گئے۔

اتنے بار بار بچے پیدا کئے اور اس کی موت
بہتر گئی۔ اور اسے بچے بھی کیسے ملے ...
اور کرمہ

چھوٹا کنبہ ... صحت مند کنبہ

بھارت کے دفاع و ترقی میں شرکت کیجئے

ساتھ ہی
7 1/4 %
سود کمائیے

سالانہ گرمیادی کھاتوں پر
3 سالہ کماتے 7%
1 سالہ کماتے 6%
ان کھاتوں پر اور دیگر ایسے قابل ٹیکس
کھاتوں و ہنڈیوں پر کمایا 3000 روپے
سالانہ تک سود ٹیکس سے بری ہے۔



حوی
پیشہ
کار

تفاسیل کے لئے اپنے ڈاک گھر یا اپنے ضلع کے قومی بچپن کے ضلع
آفس یا سرے پر چرنا چھریجئے۔

copy 72/210

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظِ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغاتِ قرآن" کے ساتھ الفاظِ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی لہجہ سے نکالے جاسکتے ہیں۔ "مکمل لغاتِ قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات ۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر جلد پانچ روپے	جلد چھ روپے
جلد دوم	۳۳۶	"	پانچ روپے	چھ روپے
جلد سوم	۳۳۷	"	پانچ روپے	چھ روپے
جلد چہارم	۳۸۶	"	چھ روپے	سات روپے
جلد پنجم	۵۰۰	"	آٹھ روپے	نو روپے
جلد ششم	۳۲۴	"	پانچ روپے	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

